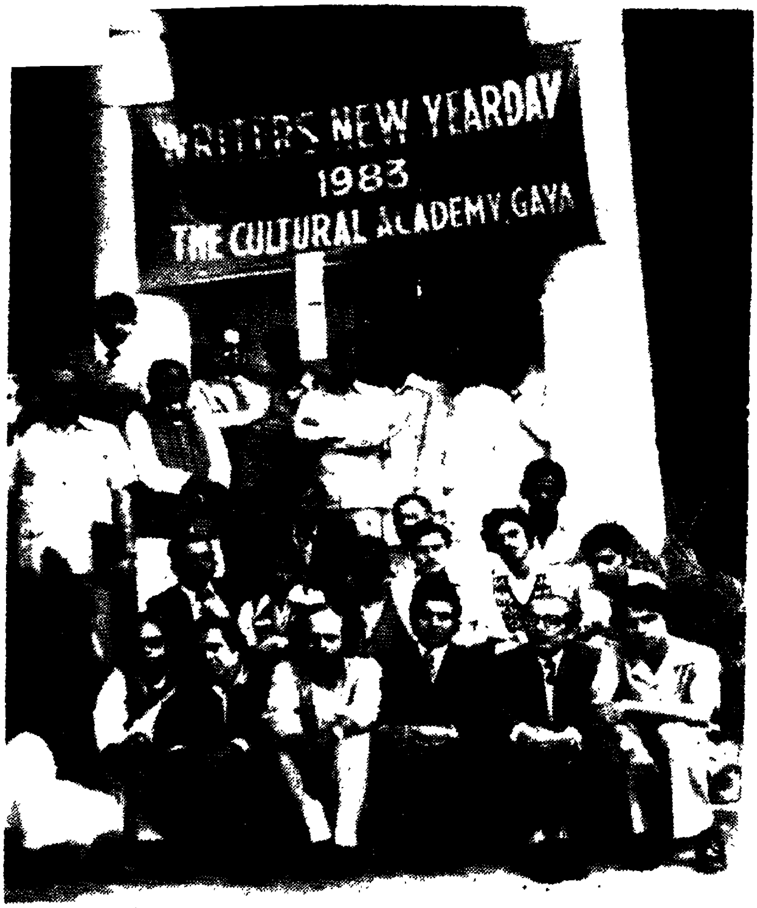
ماہنامہ

آہنگ

گیا



دائیں سے : پہلی قطار ـــــ ارتضیٰ ہاشمی، کلام حیدری، فصیح الزماں، بدنام نظر،
حق اعظمی، قیوم اثر، تاج انور ـــــ دوسری قطار ـــــ شاہین نظر، صغیر الدین
خورشید حیات، احسان تابش، ادیب حسن ادیب، فردوس گیاوی، نثار احمد صدیقی
شکیل خلاقی، نواب حسن نواب ـــــ
تیسری قطار ـــــ کلیم قاسمی، غنی حیدر، [illegible] ظہیر احسن، م۔ق۔خان، احمد یوسف
معین شاہد، حسین حق، عبدالصمد

دی کلچرل اکیڈمی نیہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۴ء

ڈھنگ گیا

ماہنامہ

شرح خریداری

بارہ شمارہ ۲۴ روپے
ایک شمارہ ۲ روپے

فون نمبر۔ 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹر
نوشابہ حق

رفقائے ایڈیٹرز
شفق، عبدالصمد

کتابت: کلیم القاسمی ڈنگروی

طباعت: ہند لیتھو پریس گیا۔

محتویات

SV02

اداریہ

کشکول

نیا سال آہنگ کے لکھنے والوں، پڑھنے والوں، پسند کرنے والوں اور ساری اردو برادری کے علاوہ ساری دنیا کے فن کاروں کو مبارک ہو

ہم جو ایک گوشے میں مدھم سی روشنی جلائے ہوئے ہیں دعا گو ہیں کہ یہ سال امن اور فن کاروں کی عظمت کا سال ہو۔

امن اس لئے کہ فلم کے ایکٹر جب بہت ہی طاقت ور ملک کے حکمراں ہو جائیں تو دنیا کے امن پسندوں کو جاگتے رہنا چاہیئے۔ دنیا نے لیگ آف نیشنز کی بے حرمتی اور آخری نتیجے کے طور پر اس کو بکھرتے ہوئے دیکھا آج یونائیٹڈ نیشنز کی وہی حالت ہو رہی ہے۔ امریکہ اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ رہا ہے۔ اسرائیل امریکہ کی شہہ پر دنیا کے ہر شہر کو بیروت سے بنانے پر کمر بستہ ہے اور عرب ممالک تیل کے مصرف سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں دنیا کے لئے امن کی دعا کرنا اور امن کے لئے کام کرنا فن کاروں کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کسی بھی امن پسند کے لئے۔

ادبی رسالے میں امریکہ، اسرائیل، بیروت ——— ؟ جی ہاں! کیوں کہ تخلیقات کی زندگی کے لئے امن ضروری ہے۔ اور کون فن کار ہے جو اپنی تخلیق کو تیسری عالمی جنگ کی آگ میں جھونک دینے کے لئے تیار ہو سکتا ہے ——؟

اسی لئے ——

اسی لئے "آہنگ" تمام فن کاروں کی سلامتی کے لئے دعا مانگتا ہے۔ ساری دنیا عشق، حوصلے، منصوبے اور خوابوں کے لئے عالمی جنگ کی تیاری کرنے والوں کے خلاف سینہ سپر رہنے کی جرارت کا اظہار کرتا ہے۔

ہم جمالیات کی تخلیق کرنے والے ہیں، ہم کو تخلیق کے لئے امن چاہیئے ہمیں ہیروشیما، ناگاساکی، کوریا، ویت نام اور بیروت نہیں چاہیئے ———

نوجی یا فوجی مزاج حکومتوں کو امن کا دوست کوئی دانشور نہیں مان سکتا ـــــ ہمارے ہاتھ میں قلم ہے۔ تحریر میں جادو ـــــ رائے عامہ کو بیدار رکھنا ہے کہ دنیا میں کوئی جنگ نہ ہو۔ کوئی عالمی جنگ چھیڑنے کی ہمت بھی نہ کر سکے۔

"آہنگ" نئے سال میں زیادہ اچھا، زیادہ معتبر، اور زیادہ پُر اثر بن سکے ـــــ یہ دعا کیجئے، ہم جد و جہد کریں گے۔

صغیر افراہیم

"کفن" اردو افسانہ کا سنگ میل

پریم چند کا ہمارے افسانوی ادب میں ایک منفرد مقام ہے۔ ان کے افسانوں کا محور دیہات ہے۔ انہوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعہ سے عوام کے مسائل سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف قدم اٹھایا ہے[1]۔ پریم چند کے عہد کے دیہاتوں میں اور آج کے دیہاتوں میں نمایاں فرق آچکا ہے مسائل اس وقت بھی تھے اور آج بھی ہیں مگر آج ان کی نوعیت اور تقاضے بدلے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود جدید حالات میں پریم چند کی تخلیقات کی اہمیت برقرار ہے۔ انہوں نے ایک افسانہ نگار اور ادیب کی حیثیت سے ایک مکمل ہندوستانی کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ اور "سماج کے سب سے درماندہ طبقہ پر غیر منصفانہ طبقاتی جبر کو تسلیم نہ کرنے کے لئے ساری زندگی بھر جدوجہد کی" ہے[2]

"پریم چند سے اردو افسانہ نگاری کی ابتدا ہوتی ہے[3]" اور "حقیقت نگاری کی" بھی[4] مختصر افسانہ میں کردار نگاری کو رواج دینے میں اولیت کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے[5]" انہوں نے بے شمار افسانے لکھے، لیکن 'جامعہ' دسمبر ۱۹۳۵ء کے شمارہ میں شائع ہونے والا ان کا افسانہ "کفن" ان کے افسانوی سفر میں آخری عہد کی یادگار، افسانوں میں سب سے کامیاب تخلیق اور فنی چابکدستی کا اعلیٰ مظہر ہے۔ "دنیا کا سب سے انمول رتن" سے لے کر "کفن تک ان کی مسافت" افسانہ نگاری کی روایت کی مکمل تاریخ[6] پوشیدہ ہے۔ اس حد تک مکمل کہ افسانہ جہاں سے شروع ہوا اور فن کے مختلف مدارج اور مرحلے طے کرکے جہاں تک پہونچا۔ اس کی ساری اہم کڑیاں ہمیں پریم چند کے افسانوں میں مل جاتی ہیں[7]۔ اس طرح اردو افسانہ کی تاریخ میں افسانہ کفن سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے[8]" میں اسے اردو کی بہترین کہانیوں میں سمجھتا ہوں۔ اس میں ایک لفظ بھی بیکار نہیں ایک نقش بھی دھندلا نہیں، شروع سے آخر تک چستی، اور تلوار کی سی تیزی، اور صفائی ہے[9]" میں کفن کو بے تکلف دنیا کے افسانوں کے سامنے رکھ سکتا ہوں ـــــ یہ افسانہ (اور بہت سے پہلوؤں کے علاوہ) BLACK HUMOUR کا شاہکار نمونہ ہے۔ اور اردو افسانے میں ایک نئے اسلوب کا آغاز

---

[1] ترقی پسند ادب، علی سردار جعفری، ص ۱۳۹، [2] شانتی کے دوت، پریم چند، امرت رائے، ص ۴۸، [3] ترقی پسند ادب، علی سردار جعفری، ص ۱۳۷، [4] تنقیدی تجربے، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۳۱۴، [5] مختصر افسانہ کا فنی تجزیہ، ڈاکٹر فردوس فاطمہ نصیر، ص ۱۶۶، [6] داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ص ۲۵۹، [7] ایضاً، [8] اردو افسانہ، سلامت اللہ خان، اردو فکشن، مرتب آل احمد سرور، ص ۱۰۱، [9] تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ص ۴۰، ۱۴۱،

کرتا ہے"[1]

کفن کی کہانی بظاہر موجودہ دور کے واقعات سے دور لیکن اس کے حقائق سے بے حد قریب ہے۔" اس میں ایسے دو دیہاتیوں کو افسانہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔ جن کے متعلق چند سال پہلے تک یہ تصور بھی ذہن میں لانا محال تھا کہ وہ زندگی میں اتنے اہم ہو سکتے ہیں کہ ان کے گرد کسی غیر فانی کہانی کا حلقہ بنایا جا سکے۔"[2] کہانی کا مرکزی خیال وہ استحصال ہے۔ جو برسہا برس طبقہ وارانہ تقسیم اور جاگیر دارانہ نظام میں کمزور طبقے کے ساتھ روا رکھا گیا۔ اور جس کے نتیجہ میں ایسے لوگ وجود میں آئے، جن کے افعال و اعمال سے گھن محسوس ہوتی، جن کی ظاہری شکل و صورت، عادات و اطوار قابل نفریں معلوم ہوتے۔ بدترین حالات کے شکار یہ مجبور لوگ غلاموں کی سی زندگی بسر کرتے، اور اچھوت یا شودر کہلاتے، جن کے سائے سے بھی لوگ پرہیز کرتے وہ نہ تو مقدس کتابوں کو چھو سکتے۔ اور نہ مندروں میں جا سکتے تعلیم کا سوال تو ان کے لئے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ پینے کا پانی بھی ایک مسئلہ ہوتا۔ ہر بستی کے باہر ایک کنواں ان کے لئے مخصوص ہوتا۔ مادی اور معاشی ترقی کے تمام راستے ان کے لئے مسدود تھے، دو وقت کی روٹی صحیح معنوں میں ان کو میسر نہ ہوتی۔ گھر کے سارے افراد کی محنت پر پیٹ بھرتا تو تن ڈھکنے کے لئے کپڑا نہ ہوتا۔ کپڑا میسر ہوا تو پیٹ خالی رہتا۔ ان کی اپنی نہ کوئی زمین ہوتی اور نہ کھیت سال بھر بیگار کرتے، فصل پر اتنا دیا جاتا کہ مشکل سے گزر ہو پاتا۔ دکھوں کا جو حصہ انہیں کھانے کو ملتا۔ سالہا سال جانوروں کی طرح انہیں برتا اور کچلا گیا کہ ان میں زندہ رہنے کی جدوجہد کا جذبہ ہی ختم ہو گیا۔ اس طبقہ کا یہ احساس کہ محنت کا صلہ ملتا نہیں تو پھر وہ محنت کس لئے اور کس کے لئے کریں۔ عجیب بے بسی میں مبتلا کرنے والا تھا۔ اس پس منظر میں وہ طبقہ نفسیاتی گتھیوں کا شکار ہوتا گیا۔ جس کے نتیجہ میں نسلاً بعد نسلٍ شودروں میں ایسے افراد ابھر کر سامنے آئے جن کو پریم چند نے اپنے افسانہ کفن میں مرکزی کرداروں کی جگہ دے کر دیہاتی سماج کی نہایت بھیانک مگر سچی تصویر کشی کی ہے"[3]

تین حصوں پر مشتمل کفن کی کہانی کا محور ہندوستان کا ایک روایتی گاؤں ہے۔ وہاں کی بیشتر آبادی مزدوروں اور کسانوں کی ہے۔ کہانی کے پہلے حصہ میں رات کا وقت ہے، ایک جھونپڑے سے بدھیا کی دلخراش چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ باہر دروازے پر گھیسو اور مادھو بجھے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھے ہیں۔ ذات کے چمار، ان لوگوں کی زندگی غربت اور افلاس سے پُر ہے۔ گھیسو مادھو کا باپ اور بدھیا مادھو کی جوان بیوی ہے۔ باپ بیٹے انتہائی کام چور اور کاہل ہیں یا اپنا پیٹ بھرنے کے لئے آلو، مٹر یا گنے وغیرہ چرا لاتے، یا پھر کبھی درخت سے لکڑی کاٹ کر اسے بیچ آتے۔ اور اپنا کام چلاتے محنت و مزدوری سے کتراتے، بہو کے آنے کے بعد دونوں اور بھی حرام خور ہو جاتے ہیں۔ بدھیا ان سے مختلف ہے وہ جفاکش اور مخلص ہے۔ محنت و مزدوری کر کے ان کا پیٹ بھرتی ہے۔ لیکن ایک سال بعد جب وہ دردِ زہ سے پچھاڑیں کھاتی، تو ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اندر جا کر اس کو دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے، الاؤ کے نزدیک بیٹھے، بھنے ہوئے گرم گرم آلو نکال نکال کھاتے، پانی پیتے اور وہیں پڑ کر سو جاتے ہیں۔

---

[1]. پریم چند کے اسلوب کا ایک پہلو، شمس الرحمٰن فاروقی دارکان بمبئی ۱۹۸۰ء، ص ۱۷۵

[2] داستان سے افسانے تک، وقار عظیم، ص ۲۲۴

[3] پریم چند قومی یکجہتی کے علم بردار، خواجہ احمد عباس دارکان بمبئی ۱۹۸۰ء، ص ۱۵۹

کہانی کے دوسرے حصہ میں رات صبح میں ڈھل کر اور زندگی موت سے ہمکنار ہو کر سامنے آتی ہے۔ مادھو اندر جاتا تو بدھیا کو مرا پاتا ہے۔ وہ بھاگ کر گھیسو کو خبر کرتا۔ دونوں مل کر ایسی آہ و زاری کرتے کہ پڑوسی سن کر دوڑے آتے اور رسم قدیم کے مطابق ان کی تشفی کرتے لیکن کریا کرم کی فکر انہیں زیادہ رونے دھونے سے باز رکھتی ہے۔ دونوں پہلے زمین دار کے پاس پہونچے، اپنی بپتی جھوٹ کے سہارے بڑھا چڑھا کر بیان کرتے، موقع کی نزاکت دیکھ کر زمین دار ان کو دو روپے دے دیتا۔ پھر دونوں زمین دار کا حوالہ دے کر دیگر آبادی سے بھی تھوڑا تھوڑا وصول کرتے، اس طرح ایک گھنٹے میں ان کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو جاتی ہے۔ کہانی کے تیسرے حصہ میں دونوں کفن خریدنے بازار جاتے ہیں۔ گھومتے پھرتے شراب خانہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وہاں وہ خوب پیتے اور لذیذ کھانوں سے اپنا پیٹ بھرتے، سارا روپیہ اڑا دیتے، بدمست ہو کر ناچتے گاتے اور مدہوش ہو جاتے،

کفن میں مرکزی کرداروں کے مکالمے، افسانہ نگار کے وضاحتی بیانات اور جابجا بکھرے ہوئے سانحی تشبیہ و خراز کہانی کے لہجہ کو طنز کا ایسا آہنگ دیتے ہیں۔ کہ تمام تشکیلی عناصر اس میں جذب کردہ جاتے اور کہانی ایک مکمل طنز کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ کہانی اپنی ابتدا سے ہی رنج والم میں لپٹی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ غم و اندوہ اور اداسی سے رچی بسی فضا میں پروان چڑھتی ہوئی انجام کو پہونچتی ہے۔ یہی فضا کہانی کے آہنگ سے گلے مل کر اس کی تیزی اور تندی کو آگے بڑھا دیتی ہے "نفسیاتی حقیقت[1]" پر مبنی کہانی میں مرکزی کرداروں کی گفتگو خاصی معنویت رکھتی ہے۔ پریم چند نے ان مکالموں کے سہارے کہانی کو مختلف فنی منازل سے گزار کر انجام تک پہونچایا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان کی آپسی باتوں کے درمیان افسانہ نگار کی مہیا کردہ تفاصیل نے کہانی کو جیتی جاگتی دنیا سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ کرداروں کا مکمل تعارف، سماجی پس منظر اور محرکات، وعوامل کہ جنھوں نے ان کی نشو و نما میں حصہ لیا ہے۔ اور دیگر جزئیات مکالموں کے درمیان اس طرح سموئے گئے ہیں۔ کہ ان کے قول و فعل کا جواز پیدا ہو جاتا اور قاری خود کو ایک حقیقی لیکن کلفتوں سے بھرپور جہاں میں سفر کرتا ہوا محسوس کرتا۔

کہانی کے ابتدائی جملے فنی اعتبار سے خاصے اہم ہیں۔ پریم چند نے ان جملوں سے کئی معرکے سر کئے ہیں۔ کہانی کے مرکزی کرداروں، ان سے متعلق جزئیات، اور پس منظر کو سریت کے عنصر میں ڈبو کر اس طرح متعارف کرایا ہے کہ پڑھنے والے کی پوری توجہ آئندہ آنے والے واقعات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وہ پوری دلجمعی سے کہانی پڑھنے کے لئے خود کو تیار پاتا ہے۔ اور انجام جاننے کے لئے بیتاب رہتا ہے:

> "جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا
> دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے
> خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اندر بیٹے
> کی نوجوان بیوی، بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں
> کھا رہی تھی۔ اور رہ رہ کر اس کے منھ سے
> ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ
> تھام لیتے تھے، جاڑوں کی رات تھی، فضا
> سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں
> جذب ہو گیا تھا۔"

کہانی کے پہلے جملے میں باپ اور بیٹا ایک بجھے ہوئے الاؤ

---

[1] پریم چند، ہنس راج رہبر، ص ۲۷۵

کے سامنے خاموش بیٹھے بتائے گئے ہیں۔ یہ بجھا ہوا الاؤ گویا وہ پورا سماجی نظام ہے جس کے اندر اپنے کوئی نئی چنگاری، کوئی نوائے سینہ تاب باقی نہیں۔ جو اپنے امکانات ختم کر چکا۔ اور اب شخصیتوں کو کچلنے والا بوجھ بن چکا ہے۔ جاڑے کی رات ہے فضا سناٹے میں غرق ہے۔ تمام گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا ہے۔ گویا دو افراد اور ان کے سامنے کا یہ الاؤ پوری کائنات سے کٹا ہوا ایک تنہا منظر ہے۔ جس کے سارے رشتے اور سبھی کڑیاں اور رابطے ٹوٹ چکے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ٹوٹے ہوئے رابطوں اور رشتوں کے منظر نامے میں باپ اور بیٹے (اور دروازے تک آتی ہوئی بیٹے کی بیوی کی درد میں ڈوبی کراہ) ہی کا رشتہ باقی ہے۔ جو انسانی استحصال کے نسلاً بعد نسلاً چلے آتے ہوئے سلسلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ اس بچے تک پھیلتا نظر آتا ہے۔ جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ اور جس کی پیدائش ماں کو دردِ زہ میں مبتلا کئے ہوئے ہے"[1]

تمہید کے بعد گھیسو اور مادھو کی ابتدائی گفتگو صورت حال کی سنگینی میں اضافہ کرتی ہے۔ اور قاری کے ذہن اور اعصاب کو متاثر کرتی ہے۔ اس جگہ کرداروں کا تفصیلی تعارف خاصہ اہم ہے۔ افسانہ نگار اس تعارف کے سہارے کہانی کے پس منظر کو ابھارتا ہے۔ اس کے ماحول کو دھرتی کی فضا سے ہمکنار کرتا ہے۔ مجموعی تاثر کے لئے راہیں بناتا، سنوارتا ہے۔ اور قاری کے ذہن کو پیش آئند واقعات کے لئے ہموار کرتا ہے اس کے باوجود ان کی اگلی گفتگو اور قلبی واردات سے واقف ہو کر قاری شدید ذہنی صدمہ سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کو ان کی حرکات و سکنات غیر فطری معلوم دیتی ہیں۔ وہ خوف اور دہشت کے احساس تلے دب جاتا ہے۔ بہو اندر لب دم ہوتی ہے باہر ان کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بات چیت میں مگن، مزے سے آلو کھانے اور پیٹ بھرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ صورت حال قاری کے ذہن کو کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کا یقین کہانی کی صداقت پر متزلزل ہو جاتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار قاری کو اپنا ہمنوا بنانے کے ہنر سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ سماجی ناانصافیوں کا ذکر شروع کر دیتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ کس طرح استحصال کے نتیجہ میں منفی ردعمل کے طور پر ان کرداروں کا وجود عمل میں آیا ہے۔ ان کا یہ احساس کہ کام کرنے سے بھی ان کے لئے بہتری کی کوئی صورت نکلنی ممکن نہیں۔ تو پھر آخر وہ محنت اور مشقت کیوں کریں۔ جبکہ فارغ البالی ان کے لئے ہے جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سماجی "شکنجہ ـــــ آخر ان کے توڑے تو ٹوٹ تو نہیں سکتا"[2] اس کی گرفت ایسی سخت اور اس کے پنجے اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ اس سے نکلنا گویا فولاد کی دیوار سے سر ٹکرانے کے برابر ہے۔ اور راستہ صرف یہ ہے کہ اس سے چرا کر دو سانس سکھ چین کی لے لی جائیں"[3] ان کے لئے اتنی ہی تسکین کافی ہے کہ اگر وہ خستہ حال ہیں۔ تو کم از کم انہیں کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی، اور ان کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔ ان کے اس طرز فکر، احساسات لگاتار فاقے، تہی دستی، اور مجبوری نے ان کو اس مقام تک پہونچا کر اس طرز عمل کا ذمہ دار بنایا ہے۔ افسانہ نگار نے پہلی بار ان کے اعمال و افعال کے لئے جواز فراہم کیا ہے۔ وہ گھٹے ہوئے ماحول سے قاری کو نجات دلانے کے لئے گھیسو کی زبانی بارات کی داستان سنا کر خوش گوار یادوں کی ایک بستی آباد کرتا ہے۔ اور قاری کو وہاں پہونچا کر اس کے لئے راحت کے چند عارضی لمحے مہیا کرتا ہے۔

---

[1] پریم چند، زمانہ، ذہن اور آرٹ، محمد حسن، (آج کل اگست [illegible]) ص ۸، [2] ایضاً، [3] ایضاً

سٹھا کر کے بارات کے ذکر نے کہانی کی آہستہ روی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ماضی کے طلسم سے قاری باہر نکلتا ہے۔ تو دونوں پانی پی کر وہیں سو چکے ہوتے ہیں۔ جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں۔ دونوں کا دو بڑے اژدر کی طرح بے فکری سے سو جانا ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتا ہے۔ اور دعوت فکر و عمل دیتا ہے۔ یہ دونوں افراد اسی سماج کے پیدا کردہ ہیں جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ اور جن کو آبادی سے پرے باڑوں میں جانوروں کی طرح زندگی گزارنے کے لئے مجبور کر دیا گیا تھا تعلیم سے بے بہرہ، فاقوں کے مارے ہر طرح سے مجبور، بے کس اور لاچار کچھ کر سکنے کے قابل کیسے اور کس طرح ہوتے درد زہ میں وہ کیونکر مددگار ہو سکتے۔ بے بسی کی انتہا مستقبل سے ان بے نیازوں کو فرار کا راستہ دکھلاتی۔ اور وہ پڑ کر وہیں سو جاتے۔

افسانہ نگار اگلے حصہ میں بدھیا کی موت کی خبر سناتا ہے۔ کہانی کے سارے تانے بانے اسی عورت کے گرد بنے گئے ہیں۔ جبکہ اس کا عملی وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ صرف اس کی دلخراش چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ کہانی کی ابتدا بھی کشمکش اور اس کے نتیجے میں اعصابی تناؤ کا آغاز جن چیخوں سے ہوتا ہے۔ انجام کار اس کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ بدھیا کی بے کس موت قاری کو خوف و دہشت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

"صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں، سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔"

بدھیا کہانی کا اہم ترین کردار ہے۔ اس کی موت کے بعد بھی اس کا تعلق بدستور کہانی سے قائم رہتا ہے۔ اور اس تعلق سے تمام تشکیلی عناصر سرگرم رہتے ہیں۔ بدھیا کی موت نے دونوں کرداروں کو متحرک کر دیا ہے۔ اس کی زندگی میں صرف باتیں بنانے والے اس کے مرنے کے بعد اتنے چاق و چوبند ہو جاتے کہ ایک گھنٹہ کے اندر پانچ روپے کی رقم چندہ جمع کر لیتے ہیں۔

سریت کا عنصر کہانی میں ابتدا ہی سے تجسس کو بیدار رکھتا ہے۔ لیکن آخری حصہ میں اس کا غلبہ اس حد تک ہوتا کہ قاری کہانی کے آنے والے لمحہ کو جاننے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ کہانی کے اس حصہ کا مکمل انحصار باپ بیٹے کے مکالموں پر ہوتا ہے۔ ان مکالموں کے وسیلے سے کہانی تیز رفتاری سے تمام مراحل طے کرتی ہوئی انجام کو پہونچتی ہے۔ اور کرداروں کی تہہ دار شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ پریم چند نے اس موقع پر ان کرداروں کے ذریعہ سماج کے عقائد توہمات اور رسم و رواج پر بڑے معنی خیز انداز میں کاری ضرب لگائی ہے۔ اور اس پورے معاشرے پر طنز کیا ہے جو ان کی خستہ حالی کا اصل ذمہ دار ہے۔ گھیسو کہتا ہے:

"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے، اسے مرنے پر نیا کفن چاہیئے، یہی پانچ روپے پہلے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے ۔۔۔ کفن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا، کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا"

دونوں کفن نہ خرید کر رسم و رواج کو موضوع سخن بناتے اس پر لعن و طعن کرتے، کفن کی اہمیت کو کم کرنے کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پیسہ آجاتے تو دنیاوی قدروں کو پامال کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل کی سوچتے، دونوں باپ بیٹے بازار پہونچ کر ادھر ادھر گھومتے ہیں۔

یہاں تک کہ شام ہوگئی" اس مقام پر حساس قاری کا ذہن سوچنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ کہ گاؤں کے بازار میں ایسی کون سی جگہیں تھیں، جہاں دونوں افراد گھومتے رہے۔ یا وہ بازار کس قدر وسیع تھا کہ گھومتے گھومتے ہی شام ہوگئی۔ لیکن کہانی کی اگلی سطور قاری کے ذہن کو فوراً ہی اپنی طرف متوجہ کو لیتی ہیں۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانہ کے سامنے آپہونچتے ہیں۔ خاموشی سے اندر داخل ہوجاتے ۔ گھیسو ایک بوتل شراب اور کچھ گزک خریدتا اور دونوں پینے بیٹھ جاتے، شراب ان کو سرور میں لے آتی، تو گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہوجاتا۔ آدھی بوتل ختم ہوجاتی تو کھانے کا سامان منگا لیتے۔

"دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے
ہوئے پوڑیاں کھا رہے تھے، جیسے جنگل
میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ
جواب دہی کا خوف تھا۔ نہ بدنامی کی
فکر، ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے
بہت پہلے طے کرلیا تھا"

افسانہ نگار نے اس سے پہلے بھی ابتدا میں ان دونوں کے تعلق سے بہت کچھ بتایا ہے:

"کاش دونوں سادھو ہوتے، تو انہیں
قناعت اور توکل کے لئے ضبط نفس کی
مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی
صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی۔ ان لوگوں
کے گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے
سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے
اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے، دنیا کی فکروں
سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے، گالیاں
بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں"

پریم چند نے ان افراد کو کہانی میں مرکزی کرداروں کی جگہ دے کر وقت کے اہم ترین مسئلہ کی جانب قاری کو متوجہ کیا ہے۔ اور ایک نقیب کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ ان دونوں کی کردار سازی چند سالوں کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ صدہا صدیوں کی مرہون منت ہے۔ نسلاً بعد نسل ان کا موجودہ وجود عمل میں آیا ہے۔ ان کی تشکیل اس سماج نے کی ہے۔ جو دنیاوی اخلاق و ضابطوں سے پوری طرح بندھی ہوئی ہے۔ اور اعلیٰ قدروں کی آڑ میں ہر طرح کا ظلم ان پر روا رکھتی ہے۔ پھر ان اصولوں اور قدروں کا ان پر اطلاق کہاں تک مناسب ہوسکتا ہے۔ اور ان کی شخصیت کو پرکھنے کا معیار وہ ضابطے کیوں اور کیسے ہوسکتے ہیں۔ اس دنیا نے جو کچھ بھی انہیں دیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنی الگ دنیا بسائی ہے۔ جہاں ان کے اپنے ضابطے اور اصول ہیں۔ جس پر وہ مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہتے ہیں:

"گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ
سال کی عمر کاٹ دی، اور مادھو بھی
سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش
قدم پر چل رہا تھا۔ بلکہ اس کا نام اور بھی
روشن کررہا تھا"

بہت سے رموز اس وقت آشکارا ہوتے ہیں۔ جب نشہ ان پر غالب آکر ان کی ظاہری شخصیت کو تہہ و بالا کردیتا اور ان پر چڑھے ہوئے غلاف کو اتار پھینکتا ہے۔ تہہ دار شخصیتوں میں پنہاں نفسیاتی گرہیں کھل کر ان کے مکالموں کے ذریعہ سامنے آجاتی ہیں۔ وہ اعلیٰ انسانی قدروں کو زیر بحث لاتے اور اس سماج پر طنز کرتے ہیں۔ جو بظاہر ان کی دلجوئی کرتا اور ان پر رحم کھاتا ہے۔ اس کے اظہار کے لئے مالی امداد کرتا ہے۔ لیکن یہ رحم کبھی مذہبی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لئے، کبھی ظاہری شان و شوکت دکھا

کے لئے اور نہ ہی سماجی و اخلاقی قدروں کو پیش نظر کیا جاتا ہے۔
وکہ یہی لوگ اس زنجیر کی کڑی ہوتے ہیں جس کے شکنجہ میں
بلکہ اس طبقہ کا استحصال کیا گیا ہے۔ زمین دار توان کا اعلیٰ
ین نمائندہ ہوتا ہے مگر وہ بھی دونوں باپ بیٹے کی امداد
کے لئے مجبور ہے کیونکہ اس کو سماج کے اندر اپنی برتری برقرار
ھنی ہے۔

"زمین دار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر
گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا
تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں، چل دور ہو یہاں
سے، لاش گھر میں رکھ سڑا، یوں تو بلانے
سے بھی نہیں آتا، آج جب غرض پڑی تو آ
کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا، بد
معاش، مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں
تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک
دیئے، مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے
نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں۔ گویا
سر کا بوجھ اتارا ہو"

ہانی کا تناؤ اور کلائمکس اس وقت اپنے انتہائی عروج پر
ہونچتا، جب وہ کفن نہ خرید کر ساری رقم شراب و کباب میں
اڑا دیتے، اور بدمستی کی حالت میں سماجی قانونوں اور مذہبی
اخلاقی اصولوں کا مضحکہ اڑاتے، اس کے کھوکھلے پن پر طنز
رتے، اس کی منافقت اور مصلحت پسندی کو بے نقاب
رتے، یہ سلسلہ جاری رہتا اگر شراب انہیں مغلوب نہ کر لیتی
مست ہو کر ناچتے گاتے ہوش و حواس کھو کر گر پڑتے، اور
پڑے رہ جاتے۔ اس طرح کہانی اپنے انجام کو پہونچ کر قاری کو
حیرتوں کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دیتی، جہاں وہ بیکراں سناٹے
ور تنہائی میں خود کو گھرا پاتا، اور اس کا ذہن نارسی کے اس
انسانی المیہ میں کھو کر رہ جاتا،

کہانی کا ابتدائی مطالعہ ہمیں خوف اور دہشت میں
مبتلا کر دیتا ہے۔ انسانیت و شرافت دم توڑتی نظر آتی ہے
محبت و مروت کا کہیں پتہ نہیں چلتا، باپ اور بیٹے پیٹ بھرنے
کی فکر میں نظر آتے ہیں جب کہ بہو قریب المرگ ہوتی ہے۔
اس پس منظر میں ہمیں گھیسو اور مادھو سے نفرت کا احساس
ہوتا ہے۔ وہ لوگ بدھیا کی تکالیف کو دور کرنے کا کوئی جتن
نہیں کرتے، اس لئے کہ وہ فطری طور پر کاہل، حرام خور، اور
بد اطوار ہیں:

"گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام،
مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا
تو گھنٹہ بھر چلم پیتا ـــــ گھر میں مٹھی بھر
اناج ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی"

ان کی آرام طلبی اور بے حسی اس وقت عروج پر پہونچتی ہے۔
جب بدھیا مادھو کی بیوی بن کر ان کے گھر آجاتی ہے۔ وہ دن
رات محنت کرتی، ان کا پیٹ پالتی، دونوں باپ بیٹے بیٹھے
روٹی کھاتے اور اکڑ دکھاتے، تبھی سے ان کا رویہ رعونت
آمیز رہتا:

"جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب
اور آلسی ہو گئے تھے۔ ایک کچھ اکڑنے بھی
لگے تھے، کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی
کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے"

ان برائیوں کے علاوہ ان میں انسانی ہمدردی کے جذبے کا
فقدان بھی نظر آتا ہے۔ بدھیا جیسی قریب ترین عزیز کے دکھ د
درد سے بھی متاثر نہیں ہوتے، اور نہ اس کی بے کراں اذیت
میں جا کر دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ دونوں کو دھڑکا
لگا رہتا ہے کہ ایک کہیں [illegible] دوسرا سارے آلو چٹ
نہ کر جائے۔

لیکن کہانی [illegible] سا تاثر زیادہ دیر قائم نہیں رہ

معمولی غور و فکر سے اس تاثر کو زائل کر دیتا ہے۔ دونوں
توں سے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مادھو
ہنی کرب اور قلبی تکلیف ڈھکی چھپی نہ رہ پاتی، مزاج میں
لیسی بے چارگی، اور بے کسی اور اس کا دردناک لہجہ
ر کر دیتا ہے "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی" بدھیا کی
ف اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ مجھ سے تو اس
بینا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔ اس پر گزرنے والی
انی کیفیت اور قلبی واردات کہ تنگ دستی اور مفلسی میں کف
وں ملنا تو ممکن ہے مگر دوا دارو کا بندوبست ممکن نہیں۔
س بات سے ظاہر ہو جاتی ہے:

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا
سونٹھ، گڑ، تیل، کچھ تو نہیں ہے گھر میں۔"

ی طرف کربناک چیخوں کا سامنا ہوتا تو دوسری طرف بھوک
شدت، بھوک مٹانے کا سامان موجود ہوتا لیکن بدھیا
تکلیف سے نجات دلانے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔ یہ بھوک
احساس تمام صعوبتوں پر غالب آجاتا۔ یہ بھوک کا ہی اثر
تھا کہ جلتے ہوئے آلو حلق سے اتارتے چلے گئے، کیونکہ کل سے
چھ کھایا نہ تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہونے دیں۔ افلاس
کے زیر سایہ پنپنے والی محرومیوں کا اندازہ مادھو کی اس بات
سے بھی ہو جاتا ہے کہ "آج جو بھوج ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا" اس
کے باوجود پیٹ بھرے ہوتے تو وہ کھانے کا بچا سامان سنبھال
کر رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کرتے، اور مادھو پوریوں کا
پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیتا۔ آخر میں بدھیا کی
موت پر اپنے خیالات کا اظہار وہ روتے ہوئے اس طرح کرتا
ہے۔ "بیچاری نے زندگی میں بڑا دکھ بھوگا مری بھی کتنا دکھ
جھیل کر"، اس ایک جملہ میں کتنی بے چارگی، اپنائیت اور
مجبوری کا احساس دم توڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جو مادھو
کے ذہنی کرب کا پتہ دیتا ہے:

گھیسو مادھو کے مقابل میں کہیں زیادہ جہاندیدہ ہے
ساٹھ سالوں میں بے شمار زخموں کو جھیل کر وہ دنیاوی آلام
کا خاصہ تجربہ رکھتا ہے۔ اس کو بھی بدھیا کی تکلیف کا پورا
احساس ہے۔ اس کی پنہاں قلبی اذیت اس کی باتوں سے ظاہر
ہو جاتی ہے:

"معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں، سارا دن تڑپتے
ہو گیا، جا دیکھ تو آ۔"

بدھیا کی تکلیف سے متاثر ہو کر وہ مادھو کو ڈانٹتے ہوئے کہتا ہے:

"تو بڑا بے درد ہے بے، سال بھر جس کے
ساتھ زندگانی کا سکھ بھوگا، اسی کے ساتھ
اتنی بے وفائی ——— میری عورت جب
مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی
نہیں"

گھیسو سماج کے رکھ رکھاؤ سے بخوبی واقف ہے۔ اس کو یہ
واقفیت ذاتی تجربوں سے حاصل ہوئی ہے۔ اس کو ۹
بچے ہوئے ان مواقع پر ایسے مراحل سے دوچار ہونا پڑا اس
کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔ مادھو اپنے ہونے والے بچے کی
جانب سے فکرمند ہوتا ہے۔ تو اس کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

"سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو،
جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں
وہ تب بلا کر دیں گے، میرے نو لڑکے ہوئے
گھر میں کبھی کچھ نہ تھا۔ مگر اسی طرح ہر بار کام چل
گیا"

وہ زمانہ کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے ہے۔ انسانوں کی فطرت،
منافقت، سماج کی ظاہر داری اور کھوکھلے پن کو جانتا ہے۔ اس کا
ایسے سماج پر اعتقاد جو ان کی موجودہ حالات کا ذمہ دار ہے۔
بلا وجہ اور باعث خود و تمام ہے کیونکہ یہی اعتقاد کسی حد
تک ان کے طرز عمل کا ذمہ دار بھی ہے:

"تو کیسے جانتا ہے اسے کچھ نہ ملے گا، تو مجھے
ایسا گدھا سمجھتا ہے میں ساٹھ سال دنیا
میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کچھ
ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم
دیتے ــــ وہی لوگ دیں گے جنھوں
نے اب کی دیا، ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ
نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر
ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کچھ
تیسری بار ملے گا۔"

دونوں کو مذہبی قدروں پر یقین کامل ہے۔ مادھو بھگوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ "تم انتر جامی ہو" اور گھیسو کا یہ کہنا کہ "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہوگا" اس بات کی علامت ہے کہ نیکی اور دان پن کا تصور ان کے یہاں موجود ہے۔ مہذب سماج کے غیر انسانی سلوک نے ان کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ لیکن ان کے اس یقین کو متزلزل نہیں کر سکا ہے، مسلسل حق تلفیاں اور غیر منصفانہ رویہ ان کی فکر پر اثر انداز ہوا ہے:

"ہاں بیٹا، بیکنٹھ میں جائے گی، کسی کو ستایا
نہیں، کسی کو دبایا نہیں، مرتے وقت ہماری
زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔
وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی، تو کیا یہ موٹے
موٹے لوگ جائیں گے، جو گریبوں کو دونوں
ہاتھ سے لوٹتے ہیں۔ اور اپنے پاپ کو دھونے
کے لیے گنگا میں جاتے ہیں۔ اور مندر میں
جل چڑھاتے ہیں۔"

ان کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں تو وہ بھی عام انسانوں کی طرح دنیا کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مادھو بھکاری کو کھانے کا بچا سامان دیدیتا ہے۔ گھیسو بھکاری سے کہتا ہے:

"لے جا، کھوب کھا اور اسیرباد دے۔ جس
کی کمائی ہے وہ تو مر گئی مگر تیرا اسیرباد اسے
جرور پہونچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے
اسیرباد دے، بڑی گاڑھی کمائی کے
پیسے ہیں۔"

ان کے ذہنوں میں آخرت کا تصور پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس اعتبار سے گھیسو کا مادھو کو سمجھانا قابل توجہ ہے:

"کیوں روتا ہے بیٹا، کھس ہو کہ وہ مایا جال
سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔
بڑی بھاگوان تھی، جو اتنی جلدی مایا موہ
کے بندھن توڑ دیے۔"

گھیسو اور مادھو کے کردار پریم چند کی بے پناہ قوت مشاہدہ کا نتیجہ ہے۔ دونوں کرداروں کا وجود مسلسل ناکامی، حقارت توہین اور تضحیک کا پتہ دیتا ہے۔ یہ دونوں کچلے ہوئے پس ماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو بیزاری، جذباتی، بغاوت، اور منفی ردعمل کے طور پر وجود میں آئے ہیں۔

کفن پریم چند کی بڑی کامیاب فنی تخلیق ہے۔ اس میں ان کا مشاہدہ، فکر و تخیل، زبان و بیان اور فنی صلاحیتیں معراج کمال پر پہونچی ہوئی ہیں ــــ "فلمی تکنیک[1]" پر لکھی کہانی کا انداز بیان بالکل حقیقی محسوس ہوتا ہے۔ سارے واقعات از اول تا آخر ڈرامائی انداز میں بتدریج رونما ہوتے ہیں۔ کہانی کے تمام ضروری اجزا انتہائی سلیقہ سے گتھے ہوئے ہیں۔ زندگی کی کشمکش اور مسائل ابتدا ہی سے سامنے آتے ہیں۔ اور ان کا تذکرہ رفتہ رفتہ اس طرح آگے بڑھتا ہے۔ کہ پڑھنے والے کی دلچسپی اور تجسس قائم رہتا ہے۔ گھیسو خوف، دہشت، رقت اور اسرار کے تمام عناصر اپنے اندر

[1] کفن کا تجزیاتی مطالعہ، باقر مہدی (امکان بمبئی ۸۰ء) ص ۱۶۲

جگن ناتھ آزاد

ہندوستان کے تہذیبی عناصر کی تشکیل میں اردو کا حصہ

اس سوال پر بحث کرنے سے قبل کہ ہندوستان کی تہذیبی عناصر کی تشکیل میں اردو کا کیا حصہ رہا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تہذیبی عناصر یا ہندوستانی ثقافت کے بارے میں تھوڑی سی بنیادی بات دبحث کرلی جائے، لیکن اس سے بھی اہم سوال اس بات پر غور کرنا ہے کہ تہذیب یا کلچر کیا ہے۔ اور کیا چند الفاظ میں اس لفظ کی تعریف ممکن ہے۔

آج سے تیئیس برس پہلے ۱۹۵۰ء میں جب ہندوستان میں انڈین کونسل فار ریلیشنز کا قیام عمل میں آیا تھا۔ تو پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا تھا کہ کلچر کیا ہے۔ اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں اس لفظ کی کوئی جامع تعریف نہیں پیش کرسکتا۔ کیونکہ مجھے اس کی کوئی جامع تعریف دستیاب نہیں ہوسکی۔

انہوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس بحث کو اور آگے بڑھایا۔ اور کہا کہ ہر قوم کا ایک اپنا تصور مدنیت ہوتا ہے۔ یہ تصور مدنیت اپنی ایک تہذیب کی تشکیل کرتا ہے۔ اور اسے پروان چڑھاتا ہے۔ اور اس تہذیب اور ثقافت کے آغاز کی اگر کھوج کی جائے تو اس کی جڑوں تک پہونچنے کے لئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال ماضی کی طرف سفر کرنا پڑے گا۔ یہ سینکڑوں سال کے سفر میں یہ بات اکثر دیکھنے میں آئے گی کہ مدنیت کا ایک دھارا دوسرے دھارے کے ساتھ مل کر بہہ رہا ہے۔ اور یہ تسلسل اس رجع القہقری میں بعد اول تک چلا جائے گا۔ اس لئے آج کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ اس کی تہذیب کا دھارا دنیا کی تمام تہذیبی دھاروں سے الگ تھلگ بہہ رہا ہے۔ جس طرح آج روئے زمین پر کوئی فرد یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ خالصۃً فلاں نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

اس بحث کے دوران جواہر لال نہرو چند سوالات کرتے ہیں۔ اور پھر خود ہی ان کا جواب دیتے ہیں۔ مثلاً

کیا تہذیب سے مراد انسان کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی ترقی ہے؟

"بے شک یہ بھی تہذیب کے کاموں میں ایک کام ہے"

کیا تہذیب اس جانچ کا بھی ایک پیمانہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے کیا برتاؤ کرتا ہے؟

"یقیناً اچھا برتاؤ سکھانا بھی تہذیب کا ایک مقصد ہے"

کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو سمجھنے کی پوری کوشش کرے؟

"ہاں یقیناً اس کا یہ بھی مقصد ہے"

کیا تہذیب کا یہ بھی کام ہے کہ ہم اپنے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کریں جن کی بدولت دوسرے بھی ہمیں بخوبی سمجھ سکیں؟

جواہر لال نہرو اس سوال کا جواب بھی اثبات میں دیتے ہیں۔ اور پھر اس نتیجے تک پہونچتے ہیں۔ کہ یہ سارے کرشمے اس ہزاروں برس پرانے تمدنی دھارے کے ہیں جو کسی ملک

کی تاریخ کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اور اس ملک کی تہذیب کی بنیاد کہلاتا ہے۔ ہاں سینکڑوں ہزاروں برس کے سفر میں اس دھارے میں اور دھارے بھی ملتے رہتے ہیں۔ اور یہ مل جل کر ایسی اکائی پیش کرتے ہیں۔ جو اس ملک کی تہذیبی اکائی کہلاتی ہے۔

جب اس آئینے میں ہم ہندوستان کی تہذیبی تصویر دیکھتے ہیں۔ اور سب سے پہلے اس رنگا رنگ تہذیب پر نگاہیں پڑتی ہیں۔ جسے ویدک زمانے کی تہذیب کہتے ہیں۔ بعد میں وید کے زمانے کی یہی آریائی تہذیب ہندو دھرم اور ہندو تہذیب کی صورت اختیار کرتی ہے۔ فوراً بعد اس تہذیبی دھارے میں ایک اور تہذیبی دھارا آکر شامل ہو جاتا ہے۔ اور یہ بدھ دھرم کا تہذیبی دھارا ہے۔ ہندوؤں اور بدھوں کی یہ ملی جلی ثقافت پتھر اور دھات کے مجسموں میں اپنی انتہا کو پہونچتی ہے۔ اور ایشیا بلکہ دنیا میں جہاں جہاں یہ تہذیب قدم رکھتی ہے۔ پتھر اور دھات کے یہ فن پارے بھی ساتھ ہی جاتے ہیں۔ یہ فن پارے آج افغانستان کی مٹی سے بھی برآمد ہو رہے ہیں۔ اور انڈونیشیا اور ملایا کی سرزمین سے بھی۔

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ہندوستان کی ثقافت کی بنیاد مذہب اور مذہبی رواداری پر قائم ہے بدھ دھرم ابتدا میں ایک الگ ثقافتی نظام کی صورت میں چلا ہو تو اور بات ہے۔ لیکن انجام کار ہندو دھرم اور بدھ دھرم دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے کہ ہندو فن تعمیر اور بدھ فن تعمیر کی جھلکیاں ایک دوسرے کی تعمیروں میں نظر آنے لگیں۔ آج بھی مہاتما بدھ کی اکثر مورتیاں کنول کے پھولوں پر بنی ہوئی ملتی ہیں۔ جیسے ہندو دھرم میں ابدیت کی ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مہاتما بدھ کو ہندوؤں نے اپنا ایک دیوتا تسلیم کر کے اس کی پوجا شروع کر دی۔

ان دو ملے جلے دھاروں میں تیسرا عظیم دھارا جو آگے ملا وہ اسلامی تہذیب کا دھارا ہے۔ اسلامی تہذیب نے ہندوستان کو ایک شدید جمالیاتی احساس دیا۔ جو فنون لطیف میں مختلف پہلوؤں سے نمایاں ہوا۔ اس جمالیاتی حس کا سب سے زیادہ منفرد اظہار فن تعمیر میں ہوا جس کے نقوش مسلمان ماہرین کی زیر نگرانی ہندو اور مسلمان کاریگروں نے مل کر ابھارے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندو ماہرین فن تعمیر اپنی ساری قدرت فکر مندروں کی تعمیر پر صرف کیا کرتے تھے۔ ان مندروں کو دیکھ کر آج بھی پرانے ہندو ماہرین فن تعمیر کے تصور جلال و جمال کی صحت مندی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات ہندوؤں کا جذبۂ عقیدت مورتیوں کو اتنی بھاری تعداد میں ایک چھوٹی سی جگہ پر لا بٹھاتا تھا کہ وہ حسن جو سادگی کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ نظروں سے مفقود ہو جاتا تھا۔ مسلمانوں کا یہ فن تعمیر اپنے ساتھ صرف پرکاری ہی نہیں لایا بلکہ سادگی بھی لایا۔ اور جب فن تعمیر میں یہ سادگی رونما ہوئی۔ تو نگاہوں کو اس فن میں ایسا حسن نظر آیا جو اس وقت تک نظر سے اوجھل تھا۔ تاریخ اس فن تعمیر کو انڈو اسلامک یا ہند اسلامی۔ یا بعض اوقات ہند ایرانی فن تعمیر کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اور آگرے کا تاج محل اس فن کا ایک جلیل ترین اور جمیل ترین مظہر ہے۔

ہندو دھرم اور اسلام کے علاوہ ایک اور مذہب جس نے ہندوستان کے تہذیبی عناصر کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا، عیسائیت ہے۔ انگریزوں پر یہ الزام لگانا کہ انہوں نے حکومت کے زیر سایہ عیسائی دھرم یا عیسائی تہذیب کو ہندوستان پر ٹھونسا بڑی حد تک ایک غلط الزام ہے۔ بلکہ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب انگریزوں نے مشرقی وضع کے اسکول ہندوستان میں کھولنا شروع کیا۔ تو نامور ہندوستانی دانشور راجہ رام موہن رائے نے اس بات پر

نہ دیا اعتراض کیا اور کہا کہ اس طرح ہمارے بچے نئی تعلیم کے اثرات
سے بالکل بیگانہ رہ جائیں گے۔ اس لئے ہندوستان میں ایسے
سکول کھولے جائیں جن میں انگریزی تعلیم دی جائے۔

تینوں مذاہب ہندو دھرم اسلام اور عیسائیت
ایک دوسرے میں مدغم تو نہ ہوئے، جیسے
بدھ دھرم ہندو دھرم میں مدغم ہو گیا۔ لیکن آپس میں قریب
آکر ایک دوسرے کو اس طرح سے متاثر کرتے رہے کہ ان کے باہمی
اتصال نے ہندوستان میں رواداری اور بردباری کی ایک
فضا پیدا کر دی، اور یہ وہ فضا تھی جس میں مشترکہ ہندوستانی
تہذیب نے پروان چڑھنے [illegible]

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس ثقافت کی تشکیل میں
اردو زبان وادب نے کیا حصہ لیا۔ اردو زبان کی ابتدا کے
بارے میں مختلف نظریات ہمارے سامنے ہیں۔ بعض محققین
کے نزدیک اس کی ابتدا شاہ جہاں کے دور حکومت میں ہوئی
بعض اس کی قدامت کے پیش نظر اس کا تعلق محمود غزنوی
کی فتوحات سے جوڑتے ہیں۔ بعض حضرات اس کی ولادت اس
دور میں دکھلاتے ہیں جب محمد بن قاسم کی فوجیں سندھ میں
داخل ہوئیں۔ اور بعض اس کی ابتدا کا سراغ امیر خسرو کی
شاعری میں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم
فرماتے ہیں کہ شہاب الدین غوری جب فاتحانہ شان سے
دہلی میں داخل ہوا تو اردو دہلی کی گلیوں میں گھٹنوں چلتی تھی
حافظ محمود شیرانی نے اردو کو پنجابی کی بیٹی قرار دیتے ہوئے
یہ کہا ہے کہ اردو کا جنم پنجاب میں ہوا۔ اور اکثر محققین کی رائے
یہ ہے کہ اردو کا آغاز شمالی ہند سے بہت دور دکن میں ہوا
لیکن شاہ جہاں کا دور حکومت ہو یا امیر خسرو کے علاوہ
علاقوں کا، یا دکن کے فرمانرواؤں کا۔ اردو کو ہر جگہ ایک
ایسا ماحول میسر آیا جس کی بدولت یہ زبان ہندوستان
کی تہذیبی رنگا رنگی کی وحدت کا آئینہ بن گئی۔

مسلمان بادشاہوں کی حکومتیں نہ ... حکومتیں تھیں
نہ مذہب سے لاتعلق تھیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان
حکمرانوں نے مذہبی اقدار کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اور
ان سے کبھی بے اعتنائی نہیں برتی۔ ایک ہمیشہ مذہب کے اس
پہلو کو پیش نظر رکھا جسے رواداری کا پہلو کہتے ہیں۔ اور جو صحیح
معنوں میں تہذیبی اقدار کو جنم دیتا ہے
امیر خسرو کی غزل:

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

صرف ایک بڑے شاعر کا صوفیانہ نسخہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس
ماحول کی صدائے بازگشت بھی ہے جس میں امیر خسرو کی شاعری
پروان چڑھی۔

ہر ادب جہاں اپنے ماحول کی تخلیق ہوتا ہے۔ وہاں وہ
اپنے ماحول کو متاثر بھی کرتا ہے۔ اردو ادب بھی اس کلیئے سے مستثنیٰ
نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ہندوستان ازل
سے ایک ایسا ملک رہا ہے جس میں مختلف مذاہب کی
رنگا رنگی نے ہمیشہ ایک تہذیبی وحدت کی صورت میں اپنا جلوہ
دکھایا ہے۔ تلسی داس نے راماین میں رام راجیہ کی وضاحت
کرتے ہوئے اس کی مختلف خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی گنوائی
ہے کہ یہ ایک ایسا راج ہے جس میں مختلف عقائد کے لوگ
اپنے اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کریں۔ کثرت میں
وحدت کا یہ حسن ہندوستان نے ہمیشہ برقرار رکھا ہے۔

ہمارے ملک میں مسلمان بادشاہوں کا دور حکومت
اس باطنی یک رنگی اور ظاہری رنگا رنگی وحدت کی ایک تصویر ہے
ان بادشاہوں کے دور میں نہ ہندو مسلم تنازعہ کا کوئی سراغ
ملتا ہے۔ نہ حکومت کے خلاف فرقہ وارانہ احتجاج کا۔ نہ ہی اس
بات کا کہ ملک کے کسی حصے سے ہندو آبادی ہجرت کر کے ملک
سے باہر چلی گئی ہو۔ نہ ہی اس دور کے ہندو راجوں نے

اسنوں سے مسلمانوں نے کبھی نقل مکانی کیا۔ یہ تمام
انگریز کے دور حکومت کے ہیں۔ اور اس دور حکومت
ی راجوں اور نوابوں کی ریاستیں فرقہ واری کی اس
ن سے بری ہو رنگ پاک رہیں جس سے برطانوی ہند کا
ن اکثر داغدار رہا۔ انگریز نے اپنی تین سو سالہ حکومت میں
ر ستان کی مٹی میں جو زہر بویا وہ آخر کار رنگ لایا۔ اور اس
ی اکائی کو تسلیم نہ کرنے والوں نے اپنے لئے ایک الگ ملک
لگ انتظام حکومت کی بنیاد ڈالی۔

آج اردو کے یہ ظاہر جانی اور درپردہ مخالف لوگ اردو
یۃ مسلمانوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تاریخ
نظریئے کو قدم قدم پر جھٹلاتی ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ
ہندوستان اور ایران، کی تہذیبوں کا ایک مقام اتصال
ان دو تہذیبی دھاروں کا ایک سنگم ہے۔ اردو کا دامن دیوان
نہیں ہے۔ بلکہ دیوان عام ہے۔ اس میں ہر مکتبۂ فکر اور ہر
رہ سکتا ہے۔ یہ ہندوستانی معاشرے کی ایک جاندار
تصویر ہے۔ یہ سرزمین وطن کا ایک ایسا نگار خانہ ہے جس
تہذیب کے لاتعداد پہلو جگمگا رہے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی تاریخ
تسلسل ہے۔ اور اس تسلسل میں ایک ہی رو جاری و
ی ہے۔ اور وہ وحدت تہذیب ہند کی رو۔

یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ اردو کی ابتدائی
ری اور نثری تصانیف کے موضوعات ویدانت، تصوف
ویانت اور وطنیت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں۔
اس کا سبب تاریخ کا یہی مذکورہ تسلسل ہے حضرت خواجہ
نواز گیسو دراز کی تصنیف "معراج العاشقین" اردو نثر
تبدائی رسالوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جس کی زبان
سے ۵ پانچ سو سال پہلے کی زبان ہے۔ یہ رسالہ تصوف
ویدانت کی تصنیف سے لبریز ہے۔ اردو کے پہلے صاحب
ان شاعر قلی قطب شاہ کا کلام ایک نظر دیکھیے، ہندوستان

گیا

کی تہذیبی جلوہ گری قدم قدم پر نظر آئے گی۔ قلی قطب شاہ کے
ذکر صرف یہ کہنا کافی نہ ہو گا۔ کہ اس نے ہندوستان کے رسم و
رواج اور تہواروں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ یا اس کی
شاعری دکن کے پھلوں کی شیرینی سے لبریز ہے۔ اور دکن کے
پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی ہے۔ یا وہ بسنت کا بھی عاشق
ہے۔ اور شب برات کا بھی، اور اس کی شاعری میں ہندی
شاعری کا گہرا اثر ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ یہ وہی بادشاہ
ہے جس نے حیدرآباد میں چار مینار بنوا کر اس کی چھت پر آمنے
سامنے مسجد اور مندر کی عمارتیں تعمیر کرائیں۔

محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کا شاعر نصرتی ملک الشعرائے
بیجاپور کی تخلیقات دیکھئے۔ اس کی تین قابل ذکر تصانیف میں
ایک گلشن عشق ہے۔ اور باقی دو کنور منوہر اور مدمالتی کے
قصے ہیں۔

وسعت نظر ہندوستانی تہذیب کا روشن ترین پہلو
ہے۔ یہ وسعت نظر اردو ادب میں طرح طرح سے جلوہ گر ہوئی،
مسلمان شعرا نے (اگرچہ میں ذاتی طور پر شاعر کو ہندو اور مسلمان
کے خانوں میں تقسیم کرنے کے خلاف ہوں) ہندوؤں کے تہواروں
اور ہندو شعرا نے مسلمانوں کے رسم و رواج اور تہواروں کے
متعلق اتنا کچھ لکھا ہے۔ کہ ہر موضوع پر الگ الگ دفتر تیار
ہو سکتے ہیں۔ ان شعرا میں نظیر اکبرآبادی کا نام سرفہرست
ہے۔ ان کی نظمیں جنم کنہیا جی، بال پن بنسری بجیا، بانسری،
لہو و لعب کنہیا، کنہیا جی کی شادی، رسم کتھا، ہر کی تعریف
میں، درگا جی کی درشن، بھیروں کی تعریف اور مہادیو کا بیاہ
اور اس کے علاوہ بسنت، ہولی، دیوالی، اور راکھی وغیرہ
کے موضوعات پر جو کچھ کہا ہے۔ اسے مذہبی رخ نہیں بلکہ خالص
تہذیبی رخ عطا کیا ہے۔ یہ نظیر کی روشن خیالی کی دلیل ہے۔ نظیر
نے اٹھارھویں صدی میں جب بالغ اور رچے ہوئے شعور
کی بدولت ہندو دھرم کی روایات کو خالص ہندوستانی

حقیقت میں زمیں سے آسماں تک ہے وطن میرا
یقیناً وسعتِ کون و مکاں تک ہے وطن میرا

میراجی کے یہاں آکر سرزمین وطن اور اس کی روایات سے لگاؤ دھرتی پوجا کی حد تک پہونچ گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں:

"میراجی کی روح دھرتی ماتا کی روح سے ہم آہنگ ہے۔ اور اس کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز قدیم ملکی روایات، تاریخ اور دیو مالا سے مملو ہے۔ دوسرے لفظوں میں میراجی نے ایک بھگت، درویش یا پجاری کی طرح اپنی دھرتی کی پوجا کی ہے"

محض رسمی طور پر وطن دوستی کی تحریک کا ساتھ نہیں دیا۔

شعراء و نثر نگاروں میں یہاں ولی، چندر بھان برہمن، سودا، درد، میر تقی میر، دیا شنکر نسیم، غالب، ماسٹر رام چندر، انیس، واجد علی شاہ اختر، بہادر شاہ ظفر، محمد حسین آزاد، کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، منیر شکوہ آبادی، صدر الدین آزردہ، داغ دہلوی، ظہیر دہلوی، حکیم آغا جان عیشی، سرسید احمد خاں، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، شبلی نعمانی، درگا سہائے سرور، سید علی بلگرامی، رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، اقبال، برج نارائن چکبست، خواجہ حسن نظامی، برج موہن دتاتریہ کیفی، مولانا ظفر علی خاں، محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، شاد عظیم آبادی، پریم چند، مجنوں گورکھپوری، مہاراج بہادر برق دہلوی، جگت موہن لال رواں، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، احمق پھپھوندوی، اثر لکھنوی، عبدالقادر سروری، روش صدیقی، سر عبدالقادر، افسر میرٹھی، آزاد انصاری، تاجور نجیب آبادی، جوش ملسیانی، آنند نرائن ملا، فراق، جگر، احسان دانش، احتشام حسین، علی جواد زیدی، عرش ملسیانی، جمیل مظہری، اقبال احمد سہیل، اختر شیرانی، سکندر علی وجد، پریم ناتھ در، گوپال متل، کرشن چندر، مجاز، مخدوم محی الدین، فیض، جذبی، سردار جعفری، رفعت سروش، مطلبی فرید آبادی، رشید احمد صدیقی، جاں نثار اختر، شمیم کرہانی، یحییٰ اعظمی، دیا نرائن نگم، غلام احمد فرقت، مسعود اختر جمال، پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، ظ انصاری، قتیل شفائی، مالک رام، خواجہ احمد فاروقی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر قمر رئیس، رام لعل، ڈاکٹر خلیق انجم، گوپی چند نارنگ، نثار احمد فاروقی، نریش کمار شاد، شاہد صدیقی، وامق جونپوری، کیفی اعظمی، آل احمد سرور، گوپی ناتھ امن، سلیمان اریب، ساحر لدھیانوی، غلام ربانی تاباں، کمال احمد صدیقی، راہی معصوم رضا، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی اور سلام مچھلی شہری کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جن کے نثر پاروں اور نظموں نے ادب میں مشترکہ تہذیبی عناصر کو اور زیادہ پختہ کیا۔ حسرت موہانی کی نظم ؎

متھرا سے اہلِ دل کو وہ آتی ہے بوئے انس
دنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا

ظفر علی خاں کی نظم ؎

شری کرشن کا میں احترام کرتا ہوں
اور اس میں روز نیا اہتمام کرتا ہوں
ہنود بھول گئے ہیں کرشن کی تعلیم!
گلہ میں ان سے یہی صبح و شام کرتا ہوں

حفیظ کا گیت ؎

کاہن مرلی والے نند کے لال۔
بانسری بجائے جا

اور ساغر کی نظم ؎

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

اور قومی تہذیب کی جھلکیاں بنا کے پیش کیا وہی رچا ہوا شعور مختلف منزلیں طے کرتا ہوا دو سو سال بعد اقبال اور جواہر لال نہرو کے حصے میں آیا۔ اقبال نے جب جاوید نامے میں شیو جی مہاراج کو قدیم ہندوستانی تہذیب کے نمائندے کی حیثیت سے دیکھا۔ یا مثنوی میں گنگا کے بارے میں ہمالہ کی زبانی یہ کہلوایا کہ گنگا شیو جی کی جٹاؤں سے نکلی ہے۔ تو وہ صرف ہندو دیومالائی تصور کے ایک پہلو ہی نظم نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ ان کے پیش نظر اس کثرت میں وحدت کو اپنے کلام میں اجاگر کرنا تھا۔ جس سے مختلف الخیال لوگوں کے ظاہری اختلافات کے باوجود ہندوستان کی باطنی یک رنگی عبارت ہے۔

یہی دلآویز نکتہ بعد میں ہندوستان کے لعل جلیل جواہر لال نہرو کی وصیت بن کر ہمارے سامنے آیا۔ جب انہوں نے مذہبی تصور سے ہٹ کر گنگا کی ایک جھلک ہمیں دکھائی اور اسے ہندوستان کی وحدت کی ایک علامت کے طور پر پیش کیا۔

اس وسعت نظری نے اردو ادب کی وسعتیں دور دور تک پھیلا دیں۔ جوش کا یہ کہنا ؎

آب و گل ہند سے ہوں اور ہندی ہوں
نسل آدم سے ہوں اور انساں ہوں

صرف ایک فرد ہی کی آواز نہیں ہے۔ بلکہ اس سے اس ساری قوم کے کردار کا پتہ چلتا ہے جس کے جذبے اور فکر کی نمائندگی اردو شاعری نے کی۔ سیماب اکبر آبادی اپنے وطن کے بارے میں کہتے ہیں ؎

ہمارے جھونپڑوں سے کوئی آخر سرگراں کیوں ہو
کوئی نا شادماں کیوں ہو
ہمارا باغ ہے ہم اس میں محو گل فشانی ہیں،
کہ ہم ہندوستانی ہیں
وطن کی خاک میں ملنا ہمارا دین و ایمان ہے
یہیں مرنے کا ارمان ہے
شباب زندگانی، یا خراب زندگانی ہیں،
کہ ہم ہندوستانی ہیں
کہاں کی فرقہ بندی اور جماعت سازیاں کیسی
یہ کثرت سازیاں کیسی
ہمیں ہندی کہو، ہم ربط قومیت کے بانی ہیں
کہ ہم ہندوستانی ہیں
جو قوت تھی دلیروں میں کبھی ہے آج ہم میں بھی
نہیں مایوس غم میں بھی
ہم اپنے مسلک اسلاف کی زندہ کہانی ہیں
کہ ہم ہندوستانی ہیں

اور یہی مذکورہ مسلک اسلاف جب انہیں دنیا کے ہر انسان سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ تو اس وقت صرف ہندو مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستانی اور ایرانی، عراقی اور جاپانی کی قید بھی اٹھ جاتی ہے۔ اس وقت اسی شاعر کی زبانی ہم یہ پیغام سنتے ہیں ؎

غلط سمجھا خط ہندوستان تک ہے وطن میرا
جہاں تک حد امکاں ہے وہاں تک ہے وطن میرا
میں انساں ہوں، انسانی کرہ ہے آج تک میرا
جہاں جاؤں، جدھر جاؤں، زمیں میری فلک میرا
ہوا میں سانس لوں تو کون مجھ کو روک سکتا ہے
بھرے دریا پہ سیرابی سے کوئی ٹوک سکتا ہے
میسر ہر جگہ ہے دھوپ خورشید درخشاں کی
ضیا ہر قدم پہ چاندنی ہے ماہ تاباں کی
چمک تاروں کی راتوں کو رہ منزل بتاتی ہے
کسی کا ہو چمن، خوشبو مجھے پھولوں کی آتی ہے

اور ان کے علاوہ متعدد دوسرے ادبا اور شعرا کے اسی طرح کے ادب پارے کوئی وقتی تخلیق نہیں ہیں۔ بلکہ اس شعور کی نمائندگی کرتے ہیں جس نے ہندوستان کی تہذیب میں پرورش پائی۔ ہندوستان کی یہی تہذیب سچے فن کاروں کے مزاج کا، شعور کا، بلکہ ساری زندگی کا جز بن جاتی ہے۔ محروم نے پاکستان سے ہجرت کرتے وقت پاکستان سے ان لفظوں میں خطاب کیا ہے

الوداع اے ارض پاکستان ہمیشہ کے لئے
یاد رکھیں گے تیرے احسان ہمیشہ کے لئے
جائے سامان معیشت داغ حسرت لے چلے
سبزۂ بیگانہ تھے ہم تیرے گلشن سے چلے
دیکھئے کیا رنگ ہو آگے تیری تاریخ کا
خون ناحق سے ہے پہلا باب تو رکھا گیا
تو پھلے میرے ہی ایسے تجھ پہ یہ کرم اللہ کا
؟ ؟ سے تیرے شعلہ ہماری آہ کا
تو ہوا دشمن ہمارا ہم تیرے دشمن نہ تھے
تو ہوا کیوں ہم سے بدظن تجھسے ہم بدظن نہ تھے
اب بھی آباد ہیں تجھ میں اپنے ہمارے سینکڑوں
جاننے پہچاننے والے ہمارے سینکڑوں
جو مسلماں ہیں مگر کہتے نہ تھے کافر ہمیں
اپنی مجلس میں بٹھاتے تھے وہ آنکھوں پر ہمیں
آہ ایسے مخلصوں سے بھی جدا ہونا پڑا
وہ وفا پرور تھے ہم کو بے وفا ہونا پڑا
داغ ہیں ان کی جدائی کے دل غمناک پر
بعد مردن بھی رہیں گے جو ہماری خاک پر
ہم بُرا چاہیں تیرا ممکن نہیں، ممکن نہیں
تیرے حق میں بد دعا ممکن نہیں ممکن نہیں

خیر سے تجھکو محبت اور شر سے عار ہو
تاکہ پاکستان کہلانے کا تو حقدار ہو

یہ تو خیر اس دور کی بات تھی جب دو نظریوں میں ٹکراؤ بہت واضح طور پر پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس نے ہزاروں لاکھوں کی آبادیوں کی نقل مکانی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اور شاعر خود بھی اس نقل مکانی کا شکار رہا۔ لیکن اس وقت بھی جبکہ ٹکراؤ کی کوئی واضح تصویر پردۂ وقت پر نہیں ابھری تھی محروم کی شاعری میں ان نظموں کی ایک نمایاں حیثیت رہی ہے۔ جو مشترکہ تہذیب کی ایک رنگا رنگ تصویر پیش کرتی ہے۔ ہلال عید، ترجمہ گلستان سعدی، قرآب جہانگیر، نور جہاں کا مزار، مرزا غالب، غم نادر، ماتم گرستی سلام و پیام، شام جدائی امام ہند، تخلیق مقاصد، جوئے نالاں، بیتے کے بندے، اہل ہند کا سوئے دوست اور بہادر شاہ ظفر، غالب، ناصر علی، صائب اور شیخ سعدی کے اشعار کی تضمین، ملا کمال، اور ڈاکٹر اقبال ہندو مسلمان، انقلاب دہر، پھر بھی لڑتے ہیں، بنام عدت، زندانیوں کی عید، غم زدوں کی عید، مشرق کے آسمان پر، کمیونل الوارڈ، رفاقت، راہبر راہ رفاقت، پنجاب ہمارا بچھڑے ہوئے پنجاب سے، اہل وطن کی خدمت میں، پنجاب کی آبرو، مناب وطن، سیرت نبوی کی ایک مثال، بے زبانوں پر رحم، شہادت حسین، کربلا، امیرالمومنین حضرت علی کی زندگی کا ایک واقعہ، ارشاد حضرت علی در بارۂ عقل، ملت اسلامیہ کا ذوق سخن، حضرت مسیح اور بچے، گورو نانک، تصویر رحمت خوان نعمت، مرہم شفا، خفتگان خاک سے، اور دریائے سندول باد وغیرہ، بعض ایسی نظمیں ہیں جن کی بنا پر محمد قلی قطب شاہ اور نظیر اکبر آبادی کے بعد محروم کی شاعری کے اس تہذیبی پہلو کو ان کی شاعری کو نمایاں ترین خصوصیت قرار دینا پڑتا ہے ان منظومات میں میں محروم کی ان نظموں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جو تقسیم کے بعد کہی گئیں۔ مثلاً پاکستان کو الوداع، پاکستان،

---

* بعد یہ نظم اس شعر پر ختم ہوتی ہے ؎

مدنی اللہ داد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، یا دتہ والی، ماتم زاد. نفرِ غم سے جا پیام ایک غریب الدیار کا وغیرہ۔

غالباً ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ نوائے وقت لاہور میں ملیق قریشی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا موضوع تھا "اردو شاعری میں علاقائی رنگ"۔ اس میں فاضل مقالہ نگار نے جو اگرچہ پاکستان میں مسلم لیگ کے ایک رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ اگر ہم اردو شاعری میں مغربی پاکستان کے کلچر کی نشاندہی کرنا چاہیں تو تلک چند محروم کے کلام سے زیادہ بہتر مثال کہیں نہیں مل سکتی۔

یہاں میں نے اس نعتیہ کلام کا ذکر نہیں کیا جو ہندو شعرا کے قلم بلکہ دل سے نکلا، کون نہیں جانتا کہ درگا سہائے سرور کی ایک نعت مدتوں مولود شریف میں پڑھی جاتی رہی مجھے وہ زمانہ آج بھی یاد ہے۔ جب لاہور میں دو نعتیں بچے بچے کی زبان پر تھیں۔ ایک پنڈت ہری چند اختر کی نعت،

"ایک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا"

دوسری مولانا ظفر علی خاں کی،

"وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں"

تصویر کا یہ رخ منشی کنہیا لال شاد کے رسالہ "علم تصوف" منشی پریم چند کے افسانوں اور ناولوں اور بالخصوص "ناول کربلا" اور بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے آیات کلام پاک کے ترجموں کے بغیر نامکمل رہے گا۔

منشی روپ چند نامی اردو کے ایک بہت اچھے کہنے والے شاعر تھے عشرت لکھنوی نے ان کا ذکر اپنے تذکرے ہندو شعرا میں کیا ہے۔ عشرت لکھنوی لکھتے ہیں کہ ان کی ہر غزل میں ایک نعتیہ شعر ضرور ہوتا تھا۔ ایک شعر انہوں نے درج کیا ہے سہ

آیا جو نام پاک محمد بات پر
صلی علی کا شور اٹھا آسمان پر

ان کے علاوہ مشہور و معروف شعرا میں مرزا، ہرگوپال تفتہ مہاراجہ کشن پرشاد، پیارے لال رونق، چندی پرشاد شیدا دوارکا پرشاد دانش، اور مہاراج بہادر برق دہلوی، ایسے نام ہیں جن کے کہے ہوئے سلام اور مرثیے، آج بھی اردو ادب کی زینت ہیں۔

نادر محقق مالک رام کی تصنیف "عورت اور اسلام" کے بارے میں میرا کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی موضوع اس کتاب کا اسلام اور عورت ہے۔ آیات قرآنی اور حدیثوں کے حوالے سے اتنے بڑے علمی موضوع کا ذکر ہو۔ تو میں کیا اور میرا کچھ کہنا کیا۔ اس لئے میں اس کتاب اور اس مصنف کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے چند الفاظ نقل کر دینا زیادہ مناسب خیال کرتا ہوں۔ جو انہوں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھے تھے، وہ الفاظ یہ تھے:

"قرآن اور تفسیر کے علاوہ مصنف کی نظر
حدیث پر بھی بہت وسیع ہے۔ کم از کم تبصرہ
نگار سے زیادہ"

کرشن بھگوان کی تعلیمات کے سلسلے میں مولانا ظفر علی خاں اور حسرت موہانی کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ وہ ذکر اردو شاعری کے تعلق سے تھا۔ یہاں میں ایک نثر پارے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ ہے خواجہ حسن نظامی کے مقالے "قلمی چہرے" کا ایک جزو، کرشن جی کے عنوان سے خواجہ حسن نظامی مرحوم لکھتے ہیں:

متھرا میں آدھی رات کو نکلنے والا چاند،
گوکل میں گوؤں اور بے زبانوں کا نگہبان
بندرابن میں تلوار کھینچ کر کنس پر چڑھ جانے
والا خدائی بہادر، من موہن، حسن پیدائی
کی قدرت، رب العالمین، جگ داتا کی

رحمت عام کا سبق پڑھانے والا ہندوستان
کا سب سے بڑا محبوب سب سے زیادہ پیارا
کرشن کنہیا۔
اس کی بانسری کی کوک آج تک سنائی دیتی
ہے کان ہوں تو سنو۔ اس کے معجزانہ کرشمے
اب بھی نظر آتے ہیں۔ آنکھ ہو تو دیکھو۔ اس
کا کلام گیتا میں پوشیدہ نہیں ہے جو نمودار
ہونا چاہئے۔ اس کی نمود کو پڑھئے کہ ہر زیست
کا نمود و سلامتی کا سبق اسی میں ہے۔
ہندوستان اپنے کرشن کنہیا پر فخر کرتا ہے
ہندوستان سے کہو کہ اپنے فخر کو سب اقوام
میں جو اس ملک کو مادر وطن کہنا چاہیں کہ
کرشن کنہیا کے نام اور کام سے اس ملک کی
آبرو یورپ اور امریکہ تک ہے۔
اسی آنکھ والے! نظر اٹھا اور نگاہ کا ایک
تیر اپنے داس کو دے، کہ وہ بے تابانہ پکارتا
ہے ؎
ایک تیر پھینکتا جا بانکی کمان والے۔

یہ تحریر دلپذیر جو خواجہ صاحب کی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے۔ شری کرشن ان کی عقیدت کا ایک پرتو ہے۔ یہ عقیدت کن دھند بنیادوں پر قائم ہے اس کا اندازہ خواجہ صاحب کی اس تصنیف سے ہوتا ہے جس کا نام ہے گئے کی جان بچانے کا بیان" خواجہ صاحب نے اس کتاب میں گائے کے مسئلے پر قرآن و حدیث کے تعلق کے لحاظ سے روشنی ڈالی ہے۔

مہاتما گاندھی ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کی ایک علامت ایک جیتی جاگتی تصویر بن کر آئے۔ اور مہاتما گاندھی کا اثر جس طرح اردو ادب نے قبول کیا۔ وہ تاریخ ہند کا ایک اہم حصہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اردو نے مہاتما گاندھی کے میدان عمل میں آنے سے قبل ہی اسی تہذیب اسی ثقافت کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے اردو ادیب نے گاندھی جی کے انداز فکر کو قبول کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اردو شاعروں، ادیبوں اور افسانہ نگاروں میں اکبر الہ آبادی، اقبال، آرزو لکھنوی، افسر میرٹھی، سیماب اکبرآبادی، پروفیسر محمد مجیب، جمیل مظہری، یحییٰ اعظمی، برج نرائن چکبست، دیا نرائن نگم، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، لالہ لاجپت رائے، پریم چند، ظفر علی خاں درگا سہائے سرور، محروم، حیات اللہ انصاری، آنند نرائن ملا، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، اور امن لکھنوی گاندھی جی سے براہ راست متاثر ہوئے، بعد کی نسل میں ساغر نظامی روش صدیقی، شمیم کرہانی، مجاز، آل احمد سرور، سکندر علی وجد، احسان دانش، علی جواد زیدی، خواجہ احمد عباس، نشتر واحدی، اور رام لعل کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جہاں انہوں نے اور ان کے علاوہ متعدد ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں نے ہندوستانی تہذیب کو ادب کا جزو بنایا۔ وہاں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین نے تعلیم اور تہذیب و تمدن کے موضوعات کو اس کی روشنی سے منور کیا۔

آل احمد سرور نے آزادی کے چار برس بعد ۱۹۵۱ء میں ایک نظم کہی تھی "سعی وفا" یہ نظم جہاں شاعر کے جمہوری نظام پر اعتماد کی ایک تصویر ہے۔ وہاں ہندوستانی تہذیب کی ان تمام پنہاں قوتوں کو بھی آشکار کرتی ہے جن کی بدولت کسی بھی سماجی یا جمہوری نظام کو پختگی اور استحکام نصیب ہو سکتا ہے۔ سرور اس نظم میں کہتے ہیں ؎

وہی مے آج بھی ہے [illegible] کے جام بلوریں میں
اودھ کے نام کے وہ میکدے آباد ہیں اب بھی
بہاریں میری مہ برسائی چمن بندی کا حاصل ہیں
لب تاریخ کو میرے فسانے یاد ہیں اب بھی
قفس کیا حلقہ ہائے دام کیا رنج اسیری کیا

یقیں کی روشنی جاگے تو دل ہیں آزاد اب بھی
بہار جنت کشمیر سے نارحن کا ویری !
وطن میں میری کتنی نکہتیں آباد ہیں اب بھی
یہ صدیوں کی بندی کبھی تو رنگ لائے گی
بہاروں میں مری سعی وفا بھی جگمگائے گی،

ی وفا تنہا شاعر ہی کی نہیں ہے ۔ بلکہ یہ ساری اردو زبان
، اردو ادب کی سعی وفا ہے ۔ جس کی بدولت یہ زبان کی
ـوستان کی تہذیبی رنگا رنگی کی وحدت کا آئینہ بنی ۔

اردو ادب کی حریم میں ہندوستانی ثقافت کا
اغ آج بھی روشن ہے ۔ اگرچہ کبھی کبھار باد مخالف کے
ھونکے اسے بجھانے کی کوشش میں بھی مصروف نظر آتے
، لیکن مقام مسترت یہ ہے کہ اس چراغ کی روشنی پہلے سے
دہ تیز ہوتی چلی جارہی ہے ۔ اس وقت جبکہ ہمارا ملک بعض
روفی اور بیرونی خطرات سے دوچار ہے ۔ ہمارے نظام فکر
ـب سے بڑا سہارا یہی ہے ۔ کہ ہم اپنی اس مشترکہ تہذیب کا
ن مضبوطی سے تھامے رہیں ۔ ۱۹۶۵ء میں جب پاکستان
ہندوستان آپس میں محو کشاکش تھے ۔ اور ہندوستان
ا اسی تہذیبی روایت کا سہارا لے کر پاکستان کے مقابلہ میں
ف آرا ہوا تھا ۔ تو ساحر لدھیانوی نے ہندوستانی زاویہ
اہ کو بڑی خوب صورتی سے اپنی ایک نظم یہ جان نے پاکستان
ں میں بیان کیا تھا ؎

طاقت سے جھکائے ترقی بس یہ کام نہیں آسان
شیر کی چمکتی تیغ ہیں ہم ، ارجن کا دہکتا بان !
وہ وقت گیا وہ دور گیا جب دو قوموں کا نعرہ تھا
وہ لوگ گئے اس دھرتی سے جن کا مقصد بٹوارہ تھا
اب ایک ہیں سب ہندوستانی اب ایک ہے ہندوستان
تاج اور اجنتا کے وارث اتہاس بنانے نکلے ہیں
کاشی اجمیر ، امرتسر کے سنگم کو بچانے نکلے ہیں ،

اس راہ میں جو بھی خون بہے تہذیب پہ ہے احسان

ساحر نے ان اشعار میں پاکستان کے خلاف کسی عسکری طاقت کے مظاہرے کا اعلان نہیں کیا ۔ نہ ہی کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگانے کی کوشش کی ہے ۔ بلکہ اس نے ہندوستان کے اس تہذیبی کی طرف اشارہ کیا ہے جو امن میں بھی ہمارے لئے چراغ راہ ہے اور جنگ میں بھی ۔ یہی بات جاں نثار اختر نے اسی زمانے میں ان الفاظ میں کہی تھی ؎

دیکھنا سنگم کے ماتھے پہ سیاہی پھر نہ جائے
تاج کا کوئی مینارہ تھرتھرا کر گر نہ جائے
اس فضائے حسن پرور کی حفاظت فرض ہے
یہ ہمارا گھر ہے ۔ اس گھر کی حفاظت فرض ہے

یہاں ایک ایسے شاعر کے احساسات کو پیش کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو ۱۹۴۷ء میں لٹ لٹا کر پاکستان سے ہندوستان آیا تھا ۔ لیکن جب ۱۹۶۰ء میں دونوں ملکوں جنگ چھڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی انڈو پاک کا مشاعروں کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔ تو ہندوستان میں اس سلسلے کو از سر نو شروع کرنے والوں کی کوششوں کو تقویت پہونچانے کے لئے اس شاعر نے ان الفاظ میں اپنے سرحد پار کے دوستوں کو دعوت نامہ بھیجا ؎

مل کر جو ہند و پاک کے دور رہنماؤں نے
تاریکیوں میں شمع جلائی ہے دوستو !
اس شمع کی ضیائے محبت فروز میں ،
ہم نے پھر ایک بزم سجائی ہے دوستو !

اس بزم میں تمہارے پرانے رفیق سب
بیٹھے ہیں یہ جراحت پنہاں لئے ہوئے
ماحول میں ہوائے رفاقت کی ہے شمیم !
آؤ کہ تم بھی درد کا درماں لئے ہوئے

ثاقبہ رحیم الدین (پاکستان)

مزاح

شوخیٔ قلم

یہ مضمون میں نے اسلام آباد میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ البتہ اسے کراچی آ کر مکمل کیا۔ اس بات کا تو مجھے بارہا خیال آتا رہا ہے کہ اردو ادب میں مزاح کا نسائی رنگ پھیکا ہوتا چلا جا رہا ہے یقین جانئے اس رنگ کو بکھیرنے کا خود کبھی ارادہ نہ کرتی۔ اگر میں مسلم خواتین کی چار روزہ قومی کانفرنس میں شریک نہ ہوتی۔

کانفرنس کے یادگار دنوں میں ایسے دلچسپ معرکے ہوئے، اور نوک جھونکوں کی ایسی پھلجھڑیاں چھوٹیں کہ خود بخود ہنسی آتی تھی۔ اس خوشگوار داستان میں مذاق مذاق کی خاطر ہے یعنی خوش طبعی محض دل لگی ہے۔

سلمیٰ اب تو حد کر دی تم نے، ہنسی ہے کہ بے ساختہ آئے جا رہی ہے۔ واہ بھئی واہ....... انجم بے چین تھی اور مسلسل سوچے جا رہی تھی۔ دونوں دوست کالج کے لان میں درخت تلے بیٹھی ہوئی تھیں۔ سلمیٰ منہ پھیر کر پھر سے ہنسی، انجم سے رہا نہ گیا۔ کہنے لگی، خدایا ایسی بھی کیا شوخی، بس کھلکھلائے جا رہی ہو، سچ تمہیں دیکھ کر، کوئی مسکرائے بنا رہ نہیں سکتا۔ آخر کار سلمیٰ نے مزے لے لے کر اپنے کزن کے سیاسی لیڈر بننے، عشق کرنے، اور ناکام ہونے پر دوبئی چلے جانے کی داستان سنائی، اتنے میں ہسٹری کی کلاس شروع ہونے کا وقت ہو گیا اور دونوں کھڑی ہو گئیں۔

پچھلے دو چار دنوں سے سلمیٰ، مسلم خواتین کی قومی کانفرنس کے بارے میں پڑھ رہی تھی۔ اس کے والد تو اسے اسلام آباد بھیجنے پر تیار تھے۔ مگر اس کی والدہ نے بڑی مشکل سے کالج سے دو پانچ دن کی چھٹی دلائی، ایک تو وہ اس کی لاابالی طبیعت سے واقف تھیں، اور دوسرے بے تکے فیشن اور انداز سے نالاں تھیں۔ بہت کیفیت... جیسے ہی اجازت ملی، سلمیٰ نے تیاری شروع کر دی، ایک نیا جوتا اور پرس خریدا۔ دو نئی قمیضوں کے ساتھ دوپٹے میچ کر کے خریدے، ایک نئی نوٹ بک پرس میں رکھ دی ہاں ایک عینک بھی لی....... اپنی بڑی بہن سے کہا آپا آخر ڈاکٹر کیوں دخل دے، ہماری آنکھوں اور عینک کے معاملے میں۔ د آپا کے لاکھ سمجھانے کے باوجود عجیب و غریب اور بڑے سے فریم کی عینک لی۔ اس کے شیشے ہلکے گلابی رنگ کے تھے، فریم بات کرنے سے پھسل کر ناک پر آ جاتا تھا۔ بقول اس کی دوست عالیہ کے وہ عینک پہن کر CUTE اور SMART

لگ رہی تھی۔ ۲۶ اکتوبر کی صبح کو وہ اپنے بھائی کے ساتھ ایئر پورٹ پہونچی، بھائی اور بھابی دونوں کہہ رہے تھے "بڑا THRILLING FUNCTION ہے تم بڑی LUCKY ہوجا رہی ہے ——— سلمی جلدی جلدی چیونگ گم کھاتی ہوئی بڑا سا بیگ کندھے پر ڈالے اور ہاتھ ہلاتی ہوئی جہاز میں بیٹھ گئی۔

کراچی سے اسلام آباد پہونچنے میں تھوڑا ہی وقت لگتا ہے۔ ایک بریگیڈیر کی بیٹی سے سلمی بات چیت کرتی رہی اس نے شاید کچھ پوچھا تھا۔ تو اسے زور وشور سے سمجھا رہی تھی۔ دیکھو بھئی، نہ کسی کے بلانے کی بات ہے۔ اور نہ پوچھنے کی، جی ہمارا یہ حق ہے۔ ہم جس کانفرنس میں چاہیں شامل ہوں اور جس میٹنگ میں چاہیں تقریر کریں۔ کیا سمجھیں۔ جہاز اسلام آباد پہونچا، اور سلمی ٹیکسی سے کر اسلام آباد ہوٹل روانہ ہوئیں۔

۲۷ اکتوبر کی صبح کو پاکستان کے تمام صوبوں سے اور آٹھ نو مسلم ممالک سے خواتین قومی کانفرنس میں شرکت کیلئے اسلام آباد ہوٹل میں موجود تھیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ سلمی کون اور کہاں سے آئی ہے۔ چلئے ہم دیکھیں کہ سلمی اس قومی کانفرنس میں کہاں کہاں گھوم رہی ہے۔ کس کس کی باتیں سن رہی ہے اور کیا کیا دیکھ کر یاد رکھ رہی ہے۔ وہ جانے کون سے اب ولہجہ اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے محظوظ ہو رہی ہے۔ ہم بھلا کیا کہہ سکتے ہیں کہ اتنی سنجیدہ اور قومی اہمیت کی تقریب کے موقع پر وہ بغیر مسکرائے کیوں نہیں رہ سکتی۔

ذرا غور فرمائیے قومی کانفرنس کے موضوعات میں ہم خواتین کو مذہبی الجھاؤ کو مٹانا، حقوق کی حفاظت، اور ذمہ داریوں کا احساس کرنا ہے۔ علم وادب کی شمع فروزاں کرنا ہے۔ ملک میں صحت مند افراد کی تعداد معین کرنا ہے۔ غرض کہ خواتین کے سامنے وسیع اور بلند پایہ مقاصد ہیں۔ اور انہیں تحریک کا روپ دینے کا قصد ہے۔

ہاں تو صاحبو! ہم یہ جواز پیش کریں کہ ایسے دل موہ لینے والے موقعوں پر بھی، چند لبوں پر شوخی اور شوخ کھلی رہتی ہے۔ کچھ نگاہیں بجلیاں گراتی رہتی ہیں۔ اور چند آوازیں ترنم بکھیرے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ آپ سے ایک بات کہوں۔؟

جب دوپہر میں دھوپ کی شدت ہو۔ اور زمین تپ کر انگارہ بن جائے، ہر طرف ہو کا عالم ہو۔ تو کبھی کبھی اچانک ایک چھوٹا سا بادل کا ٹکڑا پوری فضا میں لہراجاتا ہے۔ پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ دھوپ ہلکی پڑ جاتی ہے۔ کچھ موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ پڑنے لگتی ہیں۔ لمحہ بھر کو ہوا بھی سرسرانے لگتی ہے۔ بوندیں پڑتے ہی مٹی سے سوندھی خوشبو پھوٹتی ہے ہم سب خوشی کے اس اچانک لمحے اور ٹھنڈک سے لطف اٹھاتے ہیں۔ فوراً ہی ابر کا ٹکڑا ہوا ہو جاتا ہے۔ اور بہت دور چلا جاتا ہے۔

ذرا سوچئے تو کہ مینہ برس رہا ہو۔ ساون بھادوں کی گھٹائیں ہوں بارش سے ساری دھرتی جل تھل ہو جائے چاروں طرف پانی ہی پانی اچانک تیز بارش تھم جائے، دھوپ نہ نکلی ہو۔ کرنوں کا دلنشیں اجالا پھیلا ہو۔ اور اسی سمے نازک نازک رنگوں والی دھنک چھا جائے۔ اس حسن کا جواب نہیں ہم سب نظروں ہی نظروں میں محظوظ ہوتے ہیں۔ ادھر اک جھپکی، ادھر دھنک غائب، بس تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ابر کا چھوٹا سا ٹکڑا ہو مٹی کی سوندھی خوشبو ہو۔ یا خوش رنگ کومل دھنک، یہ سب زندگی کو ایک کیفیت شادمانی عطا کرتے ہیں۔ ایک راہ پر چلتی ہوئی زندگی اور معمول پر گزرتے ہوئے شب و روز بھی آخر تازگی اور مسرت کے متلاشی ہیں۔ ہمارے جینے کے رنگ گدلے اور دھندلے ہونے لگیں۔ تو خود جیون کو بھی شوخ رنگوں کی آرزو ہوتی ہوگی۔

آپ خوش رنگ اور دوسروں میں خوشیاں بانٹنے

ایک بے سیکھا اور بن بتایا فن ہے۔ اس کی بنیاد میں کوئی منطق اور کوئی فلسفہ پنہاں نہیں۔ خالص ظرافت کو یوں سمجھئے کہ جیسے ایک کمسن لڑکی پیپلی کی چھاؤں تلے کھڑی ہے تیز ہوا کے جھونکے سے اسے پھول گر رہے کہ وہ ساری جھولی بھر لے جب اس کی ہمجولیاں آئیں تو وہ ہنس کر جھولی اچھال دے پھول بکھر جائیں۔ کچھ زمین پر اور کچھ ان پر۔ جو ہنسی اور جو مسکراہٹ ایک پاک اور نیک دل سے ابھرے اور دوسروں کو محض لطف و فرحت کی دولت دے۔ اصل ذوقِ مزاح ہے۔

جی ہاں! یہ بالکل درست ہے۔ کہ میں خود سب خواتین کی طرح گم ہوں۔ مگر بات کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ سلمیٰ اصل دروازے پر ہے۔ اور اسے ایک پرانی دوست جو میٹرک کلاس میں ساتھ تھی۔ مل جاتی ہے۔ دونوں سے گلے ملا یا جاتا ہے۔ دونوں بیچ دروازے میں کھڑی تیز تیز باتیں کرتی ہیں اندر داخل ہوتے وقت خواتین ڈویژن کے ایک بیج لگے ہوئے مرد ممبر نے شناختی کارڈوں کے بارے میں پوچھ لیا۔ دونوں مسکرائیں۔ سلمیٰ پلکیں جھپکا کر کرکٹ میچ کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ اور اس کی دوست مسلسل بٹنوں سے جوڑا درست کرتی رہی۔ اس سے قبل کہ وہ ممبر کچھ اور کہہ سکتا۔ دونوں سہیلیاں ہاتھ میں ہاتھ دیئے اندر داخل ہو گئیں۔

آج کانفرنس کا پہلا دن ہے۔ ہر طرف گرم جوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔ آپس میں شکوے شکایت بھی ہو رہے ہیں۔ ایک خاتون دوسری خاتون کو بالکل پہچان نہیں پا رہی ہیں۔ جن کو پہچانا نہیں جا رہا ہے وہ بالکل چپ ہیں۔ مگر ان کی ایک کزن کہہ رہی ہیں۔ ناہید دو سال سے اس قدر YOUNG لگنے لگی ہے کہ کوئی کیسے پہچانے، قسم سے SLIMMING بھی اتنی کرتی ہے۔ کہ اس کا داماد بھی شوپنگ کرتے ہوئے مل جائے، تو ریسپکٹ WAVE کرتا رہتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ مسز ارشاد اور گلو کو ایسی ہنسی آئی کہ ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی چھلکنے لگی۔

بڑے دروازے سے داخل ہو کر دو خواتین نے آ مارا۔ ایک نے اسٹینڈ سے برقعہ چوری ہونے کا قصہ سر

اتنے میں انتظامیہ کمیٹی کے ایک مرد ممبر نے کانفرنس کے کے کاغذ دیئے، دونوں نے اس نامحرم کی طرف نگاہ بھی اٹھائی، اور بے نیازی سے کاغذات پرس میں رکھ لئے۔ با چیت روانی سے جاری ہے کہ پرس سے ایک لپ اسٹک کر گر پڑی، ایک اپنی بھانجی کے ابا کے فنکشن شامل ہو کا واقعہ سنا رہی ہیں۔ اور دوسری آواز دے کر اپنی چھو بچی کو بلا لیتی ہیں۔ فرماتی ہیں ——— پیچھے سے، ایڑی پاس سے ذرا ساڑھی کو کھینچ دینا۔ توبہ توبہ آنٹی اس جلدی مچاتی ہیں۔ میری چابیاں گم ہو گئیں۔ اور وہ کا بیٹھ کر ہارن دے رہی ہیں۔ آخر ساڑھی کیسے پہنی جا ...... پہلی خاتون نے اس حادثے پر ہمدردی کا کیا۔

اتنے میں ہماری نظر پڑی کہ چند بہت الٹرا موڈرن خواتین، براؤن پردے کو بیک گراؤنڈ بنا کر تصویر اتروا ہیں۔ اگرچہ فوٹوگرافر کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔ جانے کیوں دھکوں سے مسلسل ادھر ادھر چلنے لگ جاتا ہے۔ واقعی ا کے اخلاق و عادات اچھے ہیں۔ بار بار مسکراتا ہے۔ معافی ما ہے۔ اور فوکس کرنے لگتا ہے۔ خواتین کا پورا گروپ لے جسم کو تنا کر سیدھا ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ہونٹوں مسکراہٹ لاتا۔ اور قدرتی انداز سے ایک کندھے سے کو ڈھلکا دیتا ہے خدا خدا کر کے پوز کامیاب رہا۔ اور تق انتری۔

مسز رحیم الدین بلوچستان کے وفد کے ساتھ آئی کئی بار ان کو سینڈوچ اور گرم گرم پیٹیز پیش کئے گئے، .... دیکھو بار بار اپنے HEAVY LUNCH کا ذکر کر رہی

ایک آواز آئی ـــ کیا بیگم صاحبہ نے لوہے کا گولہ اندر رکھا ہے؟
ہے ؟"۔ دوسری بولی ، ارے کچھ نہیں ۔ بس یونہی رہی ہیں ـــ"
پاس کھڑی صوبہ سندھ سے آئی ہوئی ایک صاحبہ نے فرمایا ۔
ملو بابا ، ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں ۔ یہ جو ہیں نا ، اپنی
PERSONALITY بنا رہی ہیں ـــ مسز رحیم الدین تیز تیز
قدموں سے اندر ہال کے جانے لگتی ہیں ۔ تو سنائی دیتا ہے ـــ "
ہمیں کیا ہے جی ، کھائیں یا نہ کھائیں ۔ بس سارے کے سارا
ATMOSPAERE خراب کر دیا ہے ۔ او ہو ۔ بیرے ادھر آنا ،
سنا تم نے گرم گرم چلئے اور لاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس حلقے کے قریب
کھڑے ہوئے پانچ چھ لوگوں نے زوردار قہقہہ لگایا ۔

بیگم محمودہ سلیم ، اور رشیدہ پٹیل صاحبہ واقعی لائق
خواتین ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ ملک میں بچوں کی بڑی تعداد نے
عورتوں کی صحت اور زبان کمزور سے کمزور تر کر دی ہے ۔ عائلی
قوانین کا اجلاس زندگی سے بھرپور ہے ۔ ایک خاتون نے کار
روائی کے دوران ہاتھ اوپر اٹھا کر چلانا چاہا ۔ تو تنگ سلک کی
کی قمیض بغل کے پاس سے ایک سریلی آواز کے ساتھ پھٹ گئی
خیر کوئی بات نہیں ۔ ہمت عوراں مدد خدا ۔ ۔ ۔ ۔ ـــ (نہیں نہیں
کچھ غلط کہہ دیا) ایک خاتون نے انڈونیشیا میں مہر دینے کے
اچھے انداز کو سراہا ۔ یعنی دلہن ہنی مون کے بجائے حج کرنے
جاتی ہے ۔ اس بات پر خوب تالیاں بجیں ۔ ہمیں خالہ جان نے
یہ معنی بتائے کہ دیکھو بیٹا دولہا دلہن سے حج کرانے کا وعدہ
کر لیتا ہے ۔ یعنی مومنوں کے لئے ہنی مون اور مہر کیا دعوت
رکھتا ہے ۔ پر دلہن بھی خوش ہے ۔ کہ حج کے بعد وہ مدینے کر
مدینے میں شاپنگ کر سکے گی ۔ بہرحال شور و غل ہونے لگا ۔ رشیدہ
پٹیل صاحبہ اور ماجدہ صاحبہ ہراساں نظروں سے دیکھ رہی
ہیں ۔

اسی اجلاس کا دوسرا حصہ لنچ کے بعد شروع ہوا ہے
ایک کم عمر کونسلر نے انقلابی انداز سے عورت کی بیداری کا نعرہ
لگایا ۔ اس پر بڑی واہ واہ ہوئی ، عورت کی مظلومی ، صدیوں
کی قید ، اور ظالم سماج کا ذکر ہو رہا ہے ۔ جوش خروش کا یہ
عالم ہے کہ کون بڑی آواز سنائی نہیں دیتی ہی ہے ۔ کراچی
کی انیتا غلام علی صاحبہ مقبول عوامی لیڈر کے انداز میں مجمع کو چیخ
چلانے سے روک رہی ہیں ۔ یہاں تک کہ ٹی وی والے بجائے
لوگوں کے آوازوں پر تیز روشنی ڈال رہے ہیں ۔ اچانک مسز
رشیدہ سلیم کو یاد آیا ـــ جاؤ شمی جلدی فون کر آؤ ، سلیم کو
سمجھا دینا کہ بے بی کو چار بجے کی FEED سے پہلے فرکس ضرور
کھلائے ، اور ہاں ـــ عاشو کو الٹی والی دوائی کے دو قطرے
ہی دیں ۔ اب چار چار نہیں دینے ، کیا سمجھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ جملہ
سامنے کی رو میں بیٹھی خواتین نے سنا تو کھلکھلا کر ہنس پڑیں

لاہور سے آئی ہوئی دو خواتین خاندانی منصوبہ بندی
پر اہم گفتگو کر رہی ہیں ۔ چہروں پر سنجیدگی ہے ۔ اور بیرونی ممالک
ممالک کے مسائل پر بھی اظہار خیال ہو رہا ہے ۔ ایک تیسری
پشاور سے آئی محترمہ نے گفتگو میں حصہ لیا ۔ مگر ان کی دوست
نے صاف صاف کہہ دیا ـــ میں تمہی کو صاف بتا چکی ہوں ۔
کہ عام ہمارے لئے کافی ہے ۔ آخر STANDERD کیسے
MAINTAIN کیا جائے ۔ ؟ ساری دنیا ، مثلاً برطانیہ ، امریکہ
جاپان ، جرمنی ، اور چین سبھی فیملی پلاننگ کر رہے ہیں ۔ اسی
وقت ایک خاتون کا بیان پورے ہال کو زعفران زار بنا گیا
ہے ۔ سنئے ـــ شاہینہ باجی کا ڈ ۔ تمہیں پتہ ہے چین میں
ایک جوڑا بس ایک بچہ پیدا کر سکتا ہے ۔ بلکہ مجھے پتہ چلا ہے
کہ جیسے ہی شادی ہو ۔ ان کا سپریم [illegible] یہ تک حکم دے سکتا ہے
کہ فی دن اور فی رات ایک جوڑا کتنے KISSES کر سکتا ہے
مجال کوئی قواعد کی پابندی نہ کرے تو سائرن بج جاتا ہے
پورے شہر میں ۔

خالد اسحق صاحب اور ڈاکٹر اجمل صاحب اجلاس
کے وقفے کے دوران چائے نوش فرما رہے ہیں ۔ مسز قادر [illegible]

چند قانونی نکتے دریافت کئے۔ مسز درانی جو کوئٹہ سے آئی ہیں۔ قانون کو سمجھنا چاہتی ہیں۔ رفتہ رفتہ سوالات کی بوچھاڑ تیز ہو رہی ہے۔ اب تو مسز رحیم الدین، بیگم عیسیٰ اور ایک جرنلسٹ لڑکی بھی اسی گروپ میں شامل ہو گئیں۔ اتنے میں دائیں جانب بیرے نے کولڈ ڈرنکس کی ٹرے گرادی، لائق اور محترم استاد لوگ عموماً کمزور دل رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ کچھ اچھل گئے، دو بیگمات کو حد سے زیادہ ہنسی آرہی تھی۔ اس لئے وہ بے قابو ہو کر ہم سے ٹکرا گئیں۔ کسی کا کہا ہوا سنائی دیا، "ادا و ناز کو ظالم تیری شمشیر کہتے ہیں" ابھی ابھی کالج کی لڑکیوں نے ڈاکٹر اجمل سے آٹوگراف لینے شروع کر دیے ہیں ایک صاحبہ برابر اصرار کر رہی ہیں کہ وہ ڈاکٹر خاور چشتی صاحبہ اور خالد اسحٰق صاحب کے ساتھ تصویر اتروائیں گی سب خواتین ایک قدرتی اور فطری انداز سے اس فنکشن کو جاری و ساری بنائے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں مسز رحیم الدین سمجھائے جا رہی ہیں ــــ علامہ اقبال نے بنی نوع انسان کو ایک مرد کامل کا تصور دیا۔ اسی طرح بارہا بندہ آزاد کی اصطلاح بھی استعمال کی۔ اور زندگی کے تمام رموز سمجھائے مگر ہمارے مرد حضرات بڑے خود غرض ہیں۔ جو بندہ آزاد سے اشارہ اپنی طرف سمجھنے لگے۔ حالانکہ اقبال بندہ آزاد خواتین ہی کو کہا کرتے تھے۔ اتنا سن کر سنجیدہ حضرات بھی ہنسنے پر مجبور ہو گئے۔ شاید وہ بڑی دیر سے ضبط سے کام لے رہے تھے۔

یہ سچ ہے کہ زندگی کا ارتقاء حرکت اور مسلسل حرکت میں ہے۔ نانا، نانا، میں نام کیوں لوں۔؟ سیالکوٹ اور اور نواب شاہ سے منتخب ہوئی کونسلرز نے ذہنی، زبانی، روحانی، اور جسمانی صلاحیتوں کے مظاہرے بھی کئے واقعی صلاحیتوں کا معیار اعلیٰ رہا۔ شاعر کے نزدیک عورت ہمیشہ سے سراسر جمال ہے۔ اور جمال میں ایک صورت جلال بھی پنہاں ہوتی ہے۔ چنانچہ جمال کے ساتھ جلال کا ٹکراؤ بھی بھی ہو گیا۔ مقابلۂ قوت کوئی دس پندرہ منٹ کے لئے منعقد ہوا ہے۔ چند زلفیں برہم ہوئیں۔ پوسٹرز کی اونی بیلٹ کھل گئیں۔ اور فائلوں کی اوراق خط رقیب کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، بھویں تنیں، رخساروں پر شفق پھیلیں، اور آوازوں میں سوز، جھنکار، ابھری، پھر انترہ بڑھ رہا ہے۔ لیکن ادھر سے بروہی صاحب آتے دکھائی دیئے، بروہی صاحب دانش اور فرض شناس انسان ہیں۔ ان کی آمد کی اطلاع سے یہ قومی میچ DROW ہو کر ختم ہو گیا۔

کانفرنس کے دوسرے دن اجلاس سے کچھ پہلے کا وقت ہے۔ ایک خاتون پشاور سے آئی ہیں۔ اور ایک حیدر آباد سے، پشاور والی محترمہ کو مسلسل پہچاننے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مردوں نے ہر کام میں تحقیق اور جستجو سے منہ موڑ لیا ہے خواتین گرچہ "ادب لطیف" کی طرح نرم و نازک ہیں تحقیق کا مشکل عمل بھی جاری رکھے ہوئے ہیں جن کو پہچانا جا رہا ہے وہ اس موڈ میں نہیں کہ کسی کو کامیابی عطا کریں۔ آپ بات چیت سنئے،

الف: آپ انکل ضیاء الدین کے زمانے میں ضرور لاہور ہوتی تھیں، یاد آیا جب گلبرگ میں نئی نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں ......

ب: میرے تو ضیاء الدین نام کے کوئی انکل نہیں ہیں۔ میں تو ابھی ہفتہ بھر پہلے لاہور گئی تھی۔ ورنہ میرا کبھی وہاں جانا نہیں ہوا ہے۔

الف: اوہو ــــ جب نئی نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ آپ کے انکل اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لائے تھے...... بڑی ہی سخت اسمارٹ لڑکی تھی۔

ب: بات سنئے میری، میں انکل اور ان کی لڑکی کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آپ کو غلطی لگی ہے۔

الف: نہیں نہیں۔ جب آپ ہورس شو میں آئیں تو آئی

پتلی تھیں...... ہائے اتنی CUTE لگتی تھیں۔
اور ہاں آپ کی چھوٹی بہن ہے نا........... DARK
BLUE شال میں...... وہ آنا سن کر ادھر سے جواب
آیا....

ب: جی جی...... میری کوئی چھوٹی بہن نہیں۔ ہاں دو
بہنیں مجھ سے کافی بڑی ہیں۔ اس بات پر بھی پہلی
خاتون نے بُرا نہ مانا۔ ایک کراچی کی لکچرار خاتون
قریب آئیں۔ اور ان سے A.B.C اور ان میں
ARK رحمٰن کا لائٹ شیڈ کم دستیاب ہونے کے بارے
میں باتیں کرنے لگیں۔ اس گفتگو سے پاس کھڑی
ہوئی چند خواتین بے حد محظوظ ہو رہی تھیں۔ اور
مسکرا مسکرا کر پان چبا رہی تھیں۔

ذرا دھیان دیجئے کہ کانفرنس کی کارروائی کا دوسرا
دن اختتام پر ہے۔ اور پانچ خواتین آپس میں صلاح و مشورے
کر رہی ہیں۔ آخر تعلیم اور تجربات انسان کو متانت اور میل
جول کا درس دیتے ہیں۔ لیجئے وہ خواتین ڈاکٹر ہاشمی صاحب
اور ڈاکٹر اجمل صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں۔ درخواست
یہ ہے کہ آپ دونوں ہمارے ساتھ گروپ تصویر کھنچوائیے۔
ایک صاحبہ نے بلیغ اردو میں فرمایا ـــــ یہ ہم سب کے لئے
باعث عزت و افتخار ہوگا۔ اگر آپ چند لمحوں کی زحمت گوارا
کرکے، ذرا اس طرف آجائیے، اس گروپ میں سے ایک خاتون
نے اور بہت سی خواتین کو بلایا۔ یہ سننا تھا کہ ایک بہت بڑا
سا حلقہ خواتین آگے لپکا۔ ہل چل مچ گئی۔ ان دونوں حضرات
کے ارد گرد کھڑی خواتین کسی طور مطمئن نہ تھیں۔ کوئی آگے کوئی
پیچھے۔ اور تعداد بھی بڑھتی گئی۔ اسی لمحے کسی کی کوئی پرانی ملنے
والی مل گئی ہے تو لپک کر گلے لگ گئیں۔ ایک دوسرے کی ساڑی
پر تحسین آفریں کی گئی۔ آخر وہ وقت بھی آیا کہ جب تصویر اتار
لی گئی۔ دوسرے دن چائے کے وقفے کے دوران یہ نظر آیا کہ

ایک سفید لفافے سے ایک تصویر نکال کر سب ہی دیکھ رہے
ہیں۔ اور ایک دوسرے کو دکھا رہے ہیں۔ ہم نے بھی کوشش کی
اور ایک تصویر حاصل کی۔ بھئی خدا کی قسم لطف ہی آگیا۔ ڈاکٹر
ہاشمی صاحب کے سوٹ کا کچھ حصہ نظر آتا تھا جس سے وہ
اپنی شناخت کر سکتے ہیں۔ دوسرے ڈاکٹر اجمل صاحب کی
عینک اور چہرے کا آدھا حصہ خواتین میں خاصہ گرفتہ نظر
آتا ہے۔ اللہ اللہ رے، ہمارے معاشرے کا ظلم و ستم۔ یہ
بے چارے دونوں مردوں کے دکھ درد کس نے سمجھنے ہوں گے
یہ فطرت کا قانون ہے۔ کہ بعض کاموں میں ہم انسان
حد درجہ بے بس اور لاچار ہیں۔ خواتین ڈونرز کے اہل کار
ہزار ہزار جتن کر رہے ہیں کہ ان تمام مقالوں کو اجلاس سے
پہلے جمع کرلیں۔ تاکہ ان کی تین چار سو کاپیاں ٹائپ کروالیں
اور حاضرین میں تقسیم کرسکیں۔ انتظامیہ کمیٹی سے منسلک
ایک محترمہ نے اول تو یہ بات مہمان خواتین سے پیار سے
کہی۔ پھر کچھ تیز لہجے سے پھر چلا کر، اور آخر میں ابرو چڑھا کر
غصے سے دھمکی دی۔ ایسے لگ رہا ہے۔ گویا کہتی ہوں۔ آپ کو
دو ایک دن پہلے اپنا مقالہ نہیں دے سکتی ہیں۔ تو ہم آپ پر
دستی بم گرا دیں گے ـــــ مگر واہ رے صنف نازک......
ایسی شان بے نیازی کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ ہر طرف سے
مختلف جواب آرہے ہیں ـــــ میں جی آپ کو کیوں اور کس
لئے مقالہ دے دوں۔؟ آپ کا کوئی ٹھیک ہے ـــــ اور
ـــــ واہ واہ بہن تمہیں کیا اس سے ہماری مرضی ہم جب
چاہیں آپ کو دیں۔ ایک زیادہ صحت مند خاتون کہہ رہی
ہیں ـــــ میں کہتا ہوں سوچ کر بات کرنا ہماری ایک
زبان ہے۔ آغا ہم کو دیتی ہے۔ تو میں تم کو دیتی ہوں۔ اسی
لمحے ایک صاحبہ جو کنیئرڈ کالج لاہور سے کیمبرج یونیورسٹی چلی گئی
تھی۔ سامنے آرہی ہیں۔ انہوں نے بھی لپک کر [illegible]
ممبر مقالہ مانگ رہے ہیں۔ [illegible]

چاہئے کام میں نظم و ضبط ہونا چاہئے۔ وہ پوچھنے والی کو شکریہ ادا کر رہی ہیں۔ انکار پر دیگر موضوعات پر بات چیت ہو رہی ہے مسز لطیف بڑا پیارا سا COMPLIMANT ان کے ہیر اسٹائل پر دے رہی ہیں۔ خاصی دیر میں مسز لطیف کو یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنا مقالہ عنایت فرمائیں۔ وہ پرس کھول کر مسکرا کر جواب دیتی ہیں ——— اوہ I AM SORRY وہ تو گھر پر ہی رہ گیا ہے۔ مگر آپ MIND نہ کریں ایک مقالہ تو آپ رات جلدی جلدی ٹائپ کروا سکتی ہیں۔ کون کسے سمجھائے۔

ابھی صبح کے دس بجے ہیں۔ ہال خواتین سے بھرا ہے خالد اسحٰق صاحب نے عائلی قوانین اور شریعت اسلامی پر، پُر مغز اور فکر انگیز تقریر کی۔ وہ بغیر جھکے ہوئے اور بڑی روانی سے اپنا نقطۂ نظر سمجھاتے رہے۔ خواتین نے ان کی باتوں میں اپنا پن محسوس کیا۔ اور ان کو یہاں تک سمجھانا پڑا کہ روتے ہوئے بچے کیسے چپ کرائے جا سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی لائن سے اتر گئے۔ حد ہو گئی جناب اب قرآن پاک کے حوالوں سے مرد و زن کی برابری سمجھا رہے ہیں۔ اب خواتین کے سوالوں کا ملا جلا تاثر ایسا ہو رہا ہے ——— شوہر افضل ہے یا نہیں ——— شوہر افضل کیوں ہے ——— وہ افضل ہے تو کیسے ہے۔ کیونکر ہے ——— ؟ بہرحال سائلیں ہمارے بھی تو حق ہیں ——— آخر معزز اسپیکر قانون کے ماہر ہو نکلے ہیں؟ اب دیکھئے وہ جواب دینے میں عربی میں قانون کی بڑی دقیق سی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں۔ وہ آگے بڑھ گئے، خواتین الجھ کر رہ گئیں۔ اور غور کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

لیجئے چائے کا وقفہ ہو چلا۔ لوگ بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ دو خواتین سندھ سے آئی ہیں ایک لاہور، یا سیالکوٹ سے۔ سب کی سب منتظر چند بجائے صحت مند ہیں۔ صوفوں کی کشن نکال

کر قالین پر ڈالتی ہیں۔ اور لمبی لمبی لیٹ جاتی ہیں۔ ہائے صنف نازک کی اداؤں پر جنگیں ہوئیں۔ تخت و تاج لٹ گئے۔ اور ہزار طوفان اور زلزلے آئے، کچھ خواتین شرما رہی ہیں۔ اور پیر اٹھا کر صوفہ پر رکھ لیتی ہیں۔ ایک نئی شادی شدہ لڑکی نے اپنی دوست سے کہا۔ سونیہ تو تین تین گھنٹے میں FEED لیتی ہے .... چپ چپ مجھے دیکھو میں نے آدھا گھنٹہ لیٹ یہ سوچا ....

اتنا کہہ کر ہونٹ گول گول کر کے منہ ایسا بنایا جیسے خود FEED کے لئے رو رہی ہوں۔ ایک بڑی بہن کی گھڑی بند تھی ان کے کسی "پرانے شعلے" نے آگے بڑھ کر ٹائم پوچھا اور آگ لگا دی۔ وہ چھوٹی بہن پر برس پڑیں کہ تم نے اپنی طوطا ساڑھی کی وجہ سے میری گھڑی لے لی، کیونکہ اس کا اسٹریپ بھی بلو تھا۔ اب مجھے پرلائٹ والی بہت اچھی مسز حیات کا جوڑا دائیں جانب کچھ گھوم گیا تھا۔ انہوں نے مسز شیکی کو بلایا مسز شیکی پہلے ناظم آباد میں رہنے کے زمانے میں بیگم اشفاق علی تھیں۔ مگر ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں آتے ہی مسز شیکی کہلانے لگی تھیں۔ انہوں نے مسز حیات کے سر سے دو پنیں برآمد کیں۔ اپنے گلابی ہونٹوں میں دبائیں جوڑے کو سیٹ کر کے دوبارہ پنیں داخل کیں۔ ہمیں بھی کیا پتہ ——— ایک صاحب اس عمل پر بہت توجہ سے غور و خوض فرما رہے تھے ....

آج کا دور ہر لحاظ سے مساوات چاہتا ہے۔ اگر خدا چند عورتوں کو اسٹیج پر بٹھا دے تو کیا ہوا؟ سب عورتیں بہنیں بہنیں ہیں۔ اگر کوئی مقالہ پڑھ لیتی ہے۔ تو کون سا سرخاب کا پر لگ جاتا ہے۔؟ دیکھئے ابھی بیگم سائشتہ اکرام اللہ اور ڈاکٹر خاور چشتی صاحب نے عدل و انصاف اور روشن خیالی کا مینار روشن کرتے ہوئے بہنوں کو سوال پوچھنے کی دعوت دی۔ راوی کے فرائض ادا کرنے

والی نے کہا۔ آپ سوال کریں۔ تقریر نہ کریں۔ جواب آیا۔ واہ
بھئی واہ، ہم عورتیں آزاد قوم کا آدھا حصہ ہیں۔ تم ادیب کھڑی ہو کر
کیوں اترا رہی ہو؟ اس کے ساتھ ہی پشت ورے آئی تجاہل بیگم
نے ایک سوال نمبر ۲ کے بغیر ہی پڑھ دیا۔ ایسا سماں بندھا کہ
سب سوچتے رہ گئے۔ ڈاکٹر جستی کی ذہانت کو جانے کیا ہوا،
وہ صرف مسکرا رہی ہیں۔ اور با ادب انداز سے ڈاکٹر فاروقی
صاحب کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ محترم اور لائق ڈاکٹر صاحب
کو سب تحسین کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ وہ ابھی تک سوال
کو سمجھ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے بیٹھی دو خواتین ان کو سمجھا رہی
ہیں۔ ہمت بندھ گئی ہے اور دار دو بولنا چاہ رہے ہیں۔ مگر
سامعین کو احساس ہو رہا ہے کہ اردو کافی پتلی اور کمزور ہے
وہ اس کا اعتراف بھی کر رہے ہیں۔ ہال میں جوشیلے نعرے
گونج رہے ہیں۔ طاہرہ بیگم اب سوال نمبر ۳ کی ابتدا کر رہی ہیں
چوتھی صف سے آواز آئی ـــــ ہم سوال نمبر ا بھول چکے ہیں
لہٰذا پہلے اسے دہرایئے، ماحول میں گرما گرمی پیدا ہو چکی ہے۔
ایک صاحبہ اسٹیج پر آگئیں۔ بے ساختہ مائیک چھین کر حاصل
کر لیا ہے۔ ایک فاتح کے انداز میں قانون، مذہب، سماج
کو نظرانداز کرتے ہوئے مہنگائی روزگار اور امتحان کے نتائج
پر تقریر کر رہی ہیں۔ واقعی خواتین کیسی حساس ہستیاں ہیں۔
دو تعلیم یافتہ خواتین اداس ہو گئیں کہ ہم کہاں ہیں۔ کدھر جا رہے
ہیں۔ اور یہ تقریری سوال کب ختم ہو گا۔

تیسرے دن تو سماں ہی نرالا ہے۔ چار پانچ لڑکیاں
اندر آنا چاہتی ہیں۔ لیکن خواتین "ڈوسرن" والے بار بار آنکھیں
دکھا رہے ہیں۔ کہ آپ یہاں نہیں بلائی گئی ہیں۔ ایک صاحبہ
کہا یہ دے کر خود سے آگئیں۔ اور مائیک ہاتھ میں لے کر یہ اعلان
کر دیا۔ میں مختصر سی تقریر کیوں نہ کروں۔ جبکہ خلوص سے سینہ پھٹا
جا رہا ہے۔ وہ فرما رہی ہیں ـــ آنا میرا کرایہ لگا اور پانچ
دن کی چھٹی خراب ہوئی۔ میرے ڈیڑھ سو طالب علم ہیں۔ ان کا

نقصان ہوا ـــ " ہم تو واقعی سوچ میں پڑ گئے۔ اور ہمارا
میں آنسو آگئے۔ مگر کوئٹہ اور راولپنڈی کی طالبات کا
نے زوردار آ بھری۔ آواز آ رہی ہے۔ واہ واہ آپ نے
نے کیا یادگار دن گزارے ہوں گے۔ بس گلزار بانو تم
خوش رہو۔ آہاہا، آرزوؤں کی تکمیل، خوشیوں کی
سب طرف قہقہے گونج رہے ہیں۔

تو جناب مسلم خواتین کی قومی کانفرنس کا چوتھا
ہے۔ بروہی صاحب پرامن ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں
وقت عجیب بات ہے۔ کہ مرد عورت گاڑی کے
ہوئے بھی عورت جیم ہو رہی ہے (آپ حضرات جیلی یا
سمجھ رہے ہیں) ہاں تو اب سامعین کو بار بار جتایا
کہ اجلاس ختم ہوا چاہتا ہے ساری کی ساری غلطی دا
اور مفکروں کی ہے۔ کہ چار چار دن کی کانفرنس منع
ہیں۔ عورت نفیس اور لطیف شے ـــ تھک گئی ہ
کیا ـــ ؟

ہم نے خود ذہن پر زور ڈالا کہ صدر صاحب
کیوں بلوا رہے ہیں۔ کس سے بلوا رہے ہیں۔ اور ہاں
جلدی کیا ہے؟ ہم سب نے لنچ کھایا۔ پان اڑایا۔ ما
پھر سے درست کیا۔ اب کہیں ایڈ ہوک کمیٹی بنا
فیصلہ کس بات کا ہونا ہے؟ بھئی نادیدہ تمہیں سمجھ آ
ایک کونے سے سوال کیا گیا ہے۔ یہ ساری کہ ساری
ڈال رہی ہیں۔ بہرحال ہنگامے، قہقہے اور تیز تیز آوازا
ساتھ اجلاس ختم ہوا۔ چائے کا دور چلا۔ مذاق ہوتے
کاٹے کیا گیا۔ واپسی کے پروگرام بنے، ہمیں اس صورت
تھا بھاڑ آیا۔ کہ سب خواتین پریشان تھیں مگر یہ [illegible]
ہوئی۔ اور بعد مغرب خواتین ڈوسرن [illegible]
اور بدحواس تھے۔ اس کانفرنس [illegible]
آپ [illegible] نے بھی [illegible]

—— لوجی اور سنو۔ اسٹیج پر ایسے سنجیدہ سمیتں اور اب کیا گپیں مار رہی ہیں۔ ایک تیر چلا مسز رحیم الدین پر مار گیا خواتین ہنس ہنس کر لوٹے جا رہی تھیں —— پیاری ماؤ، بہنو، اور بیٹیو،! مسلم خواتین کی قومی کانفرنس ہمارے درخشندہ تابندہ اور درخشندہ ہونے کی دلیل ہے۔ عزیز خواتین گر چہ آپ FAIR SEX کہلاتی ہیں۔ یا اردو ترجمہ میں اجلی جنسیں ہیں دماغوں پر زور ڈالیے کہ آپ قومی کانفرنس کے چار روز میں اور کیا کیا کر سکتی تھیں۔؟ اور کیا کیا کرنے کے امکانات روز روشن کی طرح عیاں کیے جا سکتے تھے۔؟ ابھی یہ تابناک اور پاکیزہ تقریر جاری ہی تھی۔ مگر ان کی دوستوں نے قہقہوں سے چھت اڑا دی۔

۳۰ اکتوبر کی شب ہے، مشاعرہ جما ہوا ہے۔ کراچی سے آئی ہوئی مندوب وحیدہ نسیم صاحبہ بر آمد ہے۔ اسلامی شریعت دخلع و طلاق کے لوگوں نے جانے کیوں ٹھوس مسئلہ بنا لیا ہے۔ نسیم صاحبہ نے دو دلوں کے پیار کی بندھن کی بات ہے کہہ کر سب کچھ حل کر دیا ویسے ان کا یہ شعر دل کو بھایا ہے

دیکھا یہ میں نے مرد بھی پردے میں آگئے
جب عورتوں نے نوچ کے پھینکا ہے حجاب

ایک خاتون شاعرہ کی آواز غزل گاتے ہوئے "پیاری" ہو جاتی تھی اور "بی" بھی پڑ جاتی تھی ۔ مگر وہ لمبی بحریں گائے جا رہی ہیں۔ احمد فراز صاحب کی رگ شرارت بھڑک رہی ہے کہہ رہے ہیں —— بھئی اس پر تو خدارا ترنم کیسے چلاؤ —— بہت خوب کیا پر خلوص رائے ہے۔ جدید جمہوریت کے زمانے میں بھی ڈاکٹر عطیہ عنایت اللہ صاحبہ، ایک دو کپ سبز چائے دو شیخ خواتین کو اپنے دست نازک سے پیش کر دیتی ہیں۔ اسٹیج پر بیٹھی خواتین ان کی طرف خونیں آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں۔ بہت ہنسی کی بات آتی ہے۔ گر بھی سوکھتا ہے۔ ہمارا کھانا نہ آیا۔ اسٹیج کے پیچھے ایک محترمہ نے نعرہ لگایا تا خو

مشاعرہ اختتام کو پہونچا۔ ایک رائے سننے میں آ رہی ہے کہ کل شاید ابر ہو۔ لاہور، کراچی، اور کوئٹہ، وغیرہ جہاز کیسے جائیں گا۔ سلمیٰ ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جا رہی ہے۔ P.I.A. کے لوگوں کو چاہیے کہ ابر کی صورت میں دن بھر اپنے دروازوں کی کنڈیاں چڑھائے رکھیں —— ہاں اور کیا —— ہم تو صرف صلاح ہی دے سکتے ہیں۔

سلمیٰ تو خوش اور مگن ہے۔ تھکن دور دور نہیں۔

مگر ہم چلتے ہیں۔ شب بخیر۔

ع۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ ●●

بقیہ: ایک بے نام اجتماع کی روداد

ریل پیل کو بنیاد ٹھہرایا۔ کسی نے اس کا ڈانڈا معاشی لعابت سے ملایا۔ کسی نے اسے تواریخ کا ایک سلسلہ قرار دیا —— مخالف پارٹیوں نے اس کے لئے حکمراں جماعت کو ذمہ دار قرار دیا۔ اور حکمراں جماعت نے حزب مخالف پر الزام لگایا۔ لیکن ایک بات پر سبھی متفق تھے کہ ریاستی حکومت کی نا اہلی پوری طرح ثابت ہو چکی ہے۔ اس لئے اسے فوراً استعفیٰ دے دینا چاہیئے۔

خود حکمراں جماعت میں بھی حکومت کے مخالفوں نے اس کے استعفیٰ کی زبردست مانگ کی اور یہ سلسلہ چل نکلا۔

اس کے ٹھیک تیسرے ماہ ریاست کے وزیر اعلیٰ نے صحت کی خرابی اور دوسری ذاتی وجوہات کی بنا پر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ جو افسوس کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔ ●●

جیلانی بانو

اپنے مرنے کا دُکھ

یار صادق! بڑے افسوس کے ساتھ تمہیں اطلاع دی
تی ہے۔ کہ تمہارا انتقال پُر ملال ہو چکا ہے ــــ فون پر
ادق کا دوست منیر کہہ رہا تھا۔

کیا ــ ؟ تم کیا کہہ رہے ہو منیر ــــ صادق
نجھلا گیا۔ یہ شخص بیشتر یوں ہی فون پر مذاق کرتا ہے۔

یہ کہہ رہا ہوں کہ تمہارے گھر سے ٹیلی گرام آیا ہے۔
ان تمہارے مرنے کی اطلاع پہونچ گئی ہے۔ وہ جو کل پلین
ہے نا۔ اس میں تم مر چکے ہو۔ اب وی۔ سی آر پر ننگی
رتوں کو دیکھنا چھوڑ دو، اور جنت میں ملنے کو تیار ہو جاؤ منیر
نکھٹ سے فون رکھ دیا۔

ـــ؟ میں مر گیا ہوں؟ ــــــــ اپنی موت کا
م سنتے ہی وہ خوف کے مارے لرزنے لگا۔ اس نے فون ہاتھ
یوں رکھا جیسے درخت سے شاخ کٹ کر گرتی ہے۔ میں
ر چکا ہوں ــــ امی۔ ابا، ثریا، سب مجھے رو چکے
یا ــــــ؟

وہ منہ کھولے آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھنے
لا۔ ــــ میرا مرنا اتنی معمولی سی بات ہے کیا! اس
جب بھی اپنی موت کا تصور کیا تو زمین و آسمان اپنی
نہ ہل گئے تھے۔ پوری کائنات تہہ و بالا سی ہو گئی تھی ــــ
بھی کل تک وہ کتنا خوش تھا ــــ۔ وہ جس پلین سے انڈیا

جانے والا تھا۔ وہ گر گیا۔ اور خوش قسمتی سے صادق اس
میں سوار نہیں ہوا تھا۔ موت اس کے سر پر سے گزر گئی تھی
ــــــ ساری رات صادق اس واقعہ کی تفصیل ثریا
کو لکھتا رہا کہ کیسے عین وقت پر اس کی سیٹ CONFERM
نہ ہو سکی۔ اور وہ بال بال بچ گیا ــــ

لیکن اب تم مر چکے ہو، بڑے افسوس کے ساتھ تمہیں
اطلاع دیجاتی ہے کہ تمہارا انتقال، پر ملال ہو چکا ہے ــــ
اس کے دوست منیر کی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔

اس نے اپنے زندہ ہونے کا یقین کرنا چاہا۔ سامنے
پڑے ہوئے ثریا کے خط کو اٹھانا چاہا۔ لیکن مرے ہوئے
انسان کا ہاتھ کہیں اٹھ سکتا ہے۔

تم مر چکے ہو ــــــ چاروں طرف سے منیر کی
آواز گونج رہی تھی ــــ کیونکہ اس پلین میں اسی کا ہم نام
ایک اور صادق سوار ہو چکا تھا۔ جس نے اپنے ساتھ صادق
کی زندگی بھی جلتے ہوئے پلین میں جھونک دی تھی ــــ

اب وہ اپنے پیاروں کے لئے مر چکا ہے۔

اس بات کا یقین نہ کرنے کے لئے کیا رہ گیا ہے۔
یہ امریکن سینٹ کی خوشبو میں مہکتا ہوا سوٹ، سات ہزار
روپے کمانے والا جفاکش بدن، ثریا کی محبت میں سرشار دل
ــــ سب کو لوگ مٹی میں ملا چکے ہیں ــــ

صادق گھبراہٹ کے مارے سمٹنے لگا ـــــ غلطی میری ہے ـــ میں نے ثریا کو لکھا تھا ۵ ؍ کو آرہا ہوں مگر سیٹ ابھی کنفارم نہیں ہوئی ہے ـ مجھے فوراً دوسرا خط بھیجنا چاہیئے تھا ـ ذرا سی غفلت کیا ہوئی کہ لوگوں نے اسے مار ڈالا ـــــ پہلے میری موت کی تصدیق کر لیتے ـــــ اور اس منیر کو دیکھو میرا مذاق اڑا رہا ہے ـــــ گھر میں کیسا کہرام مچا ہوگا ـ اس نے لرز کر سوچا، ابا دل کے مریض ہیں ـ امی کو ہائی بلڈ پریشر ہے ـ اور ثریا ـــــ آج ثریا تو غم کے مارے پاگل ہوگئی ہوگی ـــ ثریا کو حاصل کرنے کے لئے اس نے پانچ برس تک اس کے باپ کی خوشامدیں کی تھیں ـ اور پھر اپنے نام کے ساتھ کلرکی کا داغ مٹانے کے لئے وہ گھر سے اتنی دور آگیا تھا ـ ماں باپ، بیوی، بچوں کو چھوڑ کر اکیلا اس صحرا میں ریت کے ذرے کی طرح تپ رہا تھا ـ دوزخ کی طرح بھڑکتی ہوئی لوہے کی بھٹی میں وہ دن بھر کام کر کے نکلتا، تو چہرہ سرخ ہوجاتا تھا ـ ہاتھ پاؤں کانپتے تھے ـ رات دوسری دوزخ میں گزارنا پڑتی، عرب کی جان لیوا گرمی میں وہ ریت کے اوپر ٹینٹ کے نیچے ساری رات گزار دیتا تھا ـ اپنے خاندان کو سکھ کی چھاؤں میں بٹھانے کے لئے وہ سوتے جاگتے ان دونوں کے خواب دیکھتا جب ثریا سچ مچ اس کی باہوں میں ہوگی ـ دونوں بچے اس کی گود میں بیٹھے ہوں گے ـ وہ اپنے گھر میں فوم کے گدّے پر فین کے نیچے لیٹا ہوگا ـ اس کا گھر اس کی جنت تھا ـــ چھٹیوں میں گھر جاتا تھا تو جی چاہتا سارا دن بستر پر لیٹا رہے ـ چھٹیاں ختم ہونے کے خیال سے جی گھبراتا تھا ـ
ایک ہفتے کی چھٹی اور بڑھا لوں گا ـ وہ خوش ہو کر ثریا سے کہتا تھا ـ

کتنی تنخواہ کٹ جائے گی ـــــ ثریا گھبرا کر پوچھتی

کٹنے دو ـــ تمہیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا ـ

وہ ثریا کو اپنی طرف کھینچ لیتا ـ

اب ثریا بیوہ ہوگئی ہے ـــــ میں اس کے لئے مر گیا ہوں ـــــ

گھبرا کر اس نے ثریا کے تصور کو دور دھکیلا ـــــ

سامنے سعودی ایر لائین کا کیلنڈر لگا تھا ـ جدہ ایر پورٹ کی شاندار عمارت اندھیرے میں جگمگا رہی تھی ـ یہ روشنیاں جو آج ہر نوجوان کے خوابوں میں جھلملاتی ہیں ـ صادق نے بھی چھ برس تک دھکے کھائے تھے ـ یہاں پہونچنے کے لئے ـ نوکری دلانے والے ایجنٹوں نے چکمے دیئے ـ عزیز رشتہ داروں نے برسوں نوکری دلانے کے بہلاوے دیئے ـ آگے جھکائے رکھا ـ ثریا نے دن رات غریبی کے طعنوں سے کلیجہ چھلنی کیا ـ اماں ابا کو اس سے بڑھ کر کوئی نا خلف نظر نہیں آتا تھا ـ

اس کے پڑوسی اکرم صاحب دوبئی گئے، تو اچانک ان کے سارے گھر کا رنگ نکھر گیا ـ ٹوٹا پھوٹا کھپریل کا کچا گھر، سرسوں کے پودے کی طرح راتوں رات اوپر اٹھتا گیا ـ اکرم کے یہاں سے جب ٹیپ ریکارڈ پر مہدی حسن کے گانے کی آواز آتی تھی، تو صادق کو جانے کیوں غصہ آتا تھا ـ ان کے یہاں گرینڈر پر بادام پیسے جاتے تو امی کی کمزوری بڑھ جاتی ـ ثریا نے اکرم کی بیوی سے دوستی ختم کر دی ـ سلکیں کی ساریاں اور چمکتی ہوئی میکسیاں پہن کر جب کیوں اِتراتی ہے وہ ـــــ

مگر اب کیا ہوگا ـــــ ؟

کہیں ابا اس صدمے سے مر نہ جائیں، وہ بھاگتا ہوا اپنے باس کے کمرے میں پہونچا ـ

سر! مجھے ایک ارجنٹ کال انڈیا کو بک کرنا ہے ـ

کیوں خیریت تو ہے نا ـــــ ؟ صادق کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کا امریکن باس گھبرا گیا ـ کہیں ماں کے مرنے کی جھوٹی خبر سنا کر ایک ہفتے کی چھٹی نہ مانگ بیٹھے وہ ان ہندوستانی کام چوروں کی رگ رگ سے واقف تھا ـــ

کیا بتاؤں سر، عجیب بات ہوگئی ہے ـ صادق

نے جھلّاتے ہوئے کہا۔ وہ جو پلین کا حادثہ ہوا ہے نا۔ میں اسی پلین سے انڈیا جانے والا تھا۔ جو میرے مرنے کی اطلاع میرے گھر پہونچ گئی ہے ــــ بات ختم کر کے وہ رو پڑا۔ جیسے اپنی موت کا دکھ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو۔

ہاہاہا ــــــــ FARTASTIC

بوڑھا امریکن ہنسنے لگا۔

تم کیوں گھبرا رہے ہو ــــ ابھی فون مت کرو۔ ذرا اپنے مرنے کا تماشہ دیکھو ــــ اس کے باس نے فون اٹھا کر اپنے پاس رکھا۔ اور جھک کر فائلیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔

اپنے مرنے کا تماشہ دیکھوں، ہونہہ یہ بے مروت سفید چمڑی والا امریکن کیا جانے کہ اس وقت میرے گھر میں کیسی قیامت مچی ہوگی۔ یہ سالے تو اپنے بوڑھے ماں باپ کو کسی آرام گھر پہونچا دیتے ہیں۔ اب تک جانے کتنی بیویوں کو طلاق دے چکا ہوگا۔ جانے اس کے کتنے بچے یتیم خانوں میں پل رہے ہوں گے۔

سر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

میری بیوی کہیں اس صدمے سے جان نہ دیدے

اوہ ــــ اتی سی ــــ بوڑھے امریکن نے عینک ماتھے پر سرکا کر اسے غور سے دیکھا ــــ تو کیا انڈیا میں مسلم عورت کو بھی ستی کر دیا جاتا ہے؟ اس نے آنکھیں پھاڑ کر

اچھا ــــ

ابے چپ سالے، صادق نے دل ہی دل میں اسے گالی دی، انڈیا میں کسی بھی عورت کو ستی کرنے کیلئے مجبور تھوڑی ہی کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی ہر عورت شوہر کے مرنے کے بعد خود ہی موت کو ترجیح دیتی ہے ــــــــ

میرے بغیر ثریا کے لئے بھی اب دنیا میں کیا رہ جائے گا؟

وہ کتنی محبت بھرے خط لکھتی ہے ــــــــ

صادق کے سامنے بال بکھرائے، سفید کپڑے پہنے، سونی کلائیاں لئے ثریا آ گئی، جو رو رو کر دیواروں پر اپنا سر پٹک رہی تھی۔ اور سارے رشتے دار اسے تھامے بیٹھے تھے ــــ

اسے تھامے رہو، میرے آنے تک کہیں وہ اپنے کپڑوں میں آگ لگا کر مر نہ جائے۔ اپنی موت کے صدمے سے خود ہی اس کا کلیجہ دہل رہا تھا۔ اب تک ثریا اپنی ہری، لال چوڑیاں، ساریاں زیور، میک اپ کا سامان جلا چکی ہو گی، ابا کو کسی طرح ہوش نہیں آ رہا ہوگا۔

صادق گھبرا کر پھر لپکا، ٹیلی فون بوتھ پر، مگر انڈیا کی لائین نہیں ملی، اپنے مرنے کا تماشہ دیکھو، بار بار امریکن باس کی بات اسے یاد آ رہی تھی ــــــــ فون کون اٹھائے گا ــــ؟ ثریا ــــ؟ مگر وہ تو غم کی شدت سے بے ہوش ہو گی ــــ امی ــــ؟ انہیں تو اب تک کسی کلینک میں شریک کر دیا گیا ہوگا ــــ ابا ــــ؟ بھلا اپنے اکلوتے بیٹے کے مرنے کی خبر سننے کے بعد کیا ابا اب تک زندہ ہوں گے۔

چھ سال پہلے جب وہ گھر سے پہلی بار چلا تھا، تو اس کے گھر کی چھتیں امی کی آنکھوں کی طرح ٹپک رہی تھیں ــــ دیواریں ثریا کی پھٹی ساریوں کی طرح میلی اور بدصورت تھیں ــــ ٹرین میں سوار ہونے سے پہلے وہ بار بار اپنے دوست عمران کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہا تھا ــــ

گھر کا خیال رکھنا، ابا کے پاس آتے جاتے رہنا ــــ

سچ مچ عمران نے اس گھر کو سنبھال لیا، ابا ہر خط میں لکھتے ــــ

عمران بالکل تمہاری طرح ہے۔ سب کا خیال رکھتا ہے۔ بجلی کا بل، گھر کا ٹیکس، بچوں کی فیس، ثریا کی [illegible] ہر ذمہ داری اس نے اپنے سر لے لی تھی۔ یہاں تک کہ [illegible]

اور ثریا کے درمیان پیسہ خرچ کرنے پر جو آئے دن کھٹ پٹ ہوتی تھی۔ وہ جھگڑے بھی عمران کو ہی طے کرنا پڑتے۔

دو برس بعد ایرپورٹ کے لاؤنج میں سب سے پہلے اسے عمران نظر آیا، جو اس کے نئے بچے کو گود میں سنبھالے ہوئے تھا۔

دو برس تک صحرا کی خاک چھاننے کے بعد گھر کے نرم گدے پر لیٹے کروٹیں لوں گا۔ جیسے کسی اور کے گھر آگیا ہو یہی تو گھر اس کے خوابوں میں بسا ہوا تھا۔ یہی سکھ تو زندگی کا آدرش تھا جی چاہتا صبح بستر سے نہ اٹھے، کوئی اس کے سامنے دوبئی جانے کا نام مت لو،

بس اب کی بار اوور ٹائم لگا کر خوب پیسے سے لوٹوں گا پھر کہیں نہیں جاؤں گا گھر چھوڑ کر ۔۔۔ مگر اوور ٹائم کے نام ہی سے پسینہ آجاتا تھا۔ دن بھر ماتھے سے پسینہ پونچھے بغیر کام کرنے کے بعد، تھوڑی دیر آرام کئے بغیر پھر کام میں جٹ جاؤ، رات کو بارہ بجے لیٹو تو کمر ٹیڑھی ہو جاتی، ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں۔ مگر صبح ۵ بجے اٹھنے کا خوف سونے بھی نہ دیتا تھا

لو ۔۔۔ آخر دوبئی جانے کا منحوس دن آگیا۔

اماں ۔۔۔ امام ضامن باندھکر کہتیں۔

خیریت کے ساتھ پہونچو۔

اب کی بار میرے لئے سونے کی چوڑیاں لانا۔ ثریا گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی

میرے لئے بادام ۔۔۔ میرے لئے گڑیا ۔۔۔ کپڑے ۔۔۔ ٹیپ ریکارڈر ۔۔۔

بہت دنوں تک اس کا کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ ثریا کتنی صحت مند ہو گئی ہے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ۔۔۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ثریا اسے خوابوں میں ملے ۔۔۔ بچوں کے فوٹو کو پیار کر کے جی بہلائے اور اس کے گھر میں ہر طرف عمران دوڑتا پھرے،

اس نے پھر گھر فون کرنے کی کوشش کی۔

وہ جب بھی گھر جاتا تھا اتنے دنوں کی جدائی پر ثریا اسے خوب جلاتی، ترساتی تھی۔ وہ جھوٹ موٹ کے غصہ میں ہاتھ جھٹک دیتی تھی۔

اری دیکھ تو میری جان، تیرے لئے کیا لایا ہوں۔

وہ جیب میں سے سرخ کاغذ میں لپٹی ہوئی سنہری چوڑیاں نکالتا۔

اللہ ۔۔۔ یہ تو سونے کی ہیں ۔۔۔ وہ خوشی کے مارے اچھل پڑتی۔ اور چوڑیاں اس کے ہاتھ سے چھین کر باہر کی طرف بھاگتی۔

عمران ۔۔۔ عمران ۔۔۔ ذرا دیکھ تو صادق میرے لئے کیا لائے ہیں۔ وہ چوڑیاں پہن کر اپنے گورے ہاتھ عمران کی طرف بڑھا دیتی تھی۔

صادق نہال ہو جاتا تھا ۔۔۔ اس خوشی کی خاطر اوور ٹائم کی ساری تھکن اتر جاتی تھی۔

ادھر اماں ابا کو تو جیسے جینے کا ہوکا سا ہو گیا تھا۔ اپنی صحت بنانے کی فکر میں گھلے جاتے تھے۔ ہر خط میں زیادہ پیسے بھیجنے کی فرمائش ہوتی۔ میوہ ۔۔۔ مٹھائیاں ۔۔۔ دودھ بادام ۔۔۔ سارا دن دونوں سوچتے رہتے کہ اب کیا کھائیں۔

۔۔۔ کچھ نہ مانگتا تو عمران ۔۔۔ اتنی خدمت کرنے پر بھی سر جھکائے شرمندہ سا کونوں میں چھپتا پھرتا۔

آج بھی وہی سب کو سنبھالے بیٹھا ہوگا۔

اس کے رونے کی آواز سن کر ٹینٹ میں سونے والے لوگ جاگ پڑے،

کیا ہوا۔ ؟ کیوں رو رہے ہو صادق بھائی ؟

میں مر گیا ہوں۔ ؟ وہ چلانے لگا۔

یار، اس آدمی کا دماغ کچھ سرک گیا ہے آج،

وہ سب پھر سونے لگا۔

اب کی بار اس نے فون ملایا۔ تو اپنے گھر میں گونجتی ہوئی بیل کی آواز سنائی دی،

ہیلو ــــ آپ کون صاحب بات کر رہے ہیں؟

ثریا کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا ــــ (اپنے مرنے کا تماشہ دیکھو) بوڑھا امریکن اس سے کہہ رہا تھا۔

میں ــــ میں صادق ــــ صادق کا دوست منیر بات کر رہا ہوں۔

اچھا منیر بھائی ہیں ــــ میں خود آپ کو فون کرنے والی تھی۔ (ثریا کتنی پرسکون معلوم ہو رہی تھی ــــ نہیں یہ جھوٹ ہے۔ اس کے مرنے کی اطلاع گھر نہیں پہونچی ہے) منیر بھائی ذرا یہ معلوم کیجئے کہ صادق کے پراویڈنٹ فنڈ کا کتنا روپیہ ہے۔ یہ سب روپیہ مجھے ملنا چاہئے۔

بہت بہتر ــــ اور کچھ ــــ؟ گالوں سے بہتے ہوئے نمکین آنسوؤں نے اس کا منہ کڑوا کر دیا۔

جی اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ بات یہ ہے کہ میری ساس اور خسر مجھ سے بہت لڑائی جھگڑے کر رہے ہیں (روپے کیلئے) میں بیچاری بیوہ ــــ

بند کرو بکواس ــــ اس نے غصہ میں فون پٹک دیا۔ خود غرض، مکار عورت، مجھ سے محبت کا ناٹک کھیلتی رہی۔ میرے ماں باپ کو بدنام کر رہی ہے۔ کیا میری لاش کے سامنے بھی گرامی ابا میرے روپے کو یاد کر سکتے ہیں۔ اس عورت کو اب طلاق دینا ہوگی ــــ ابھی ابا سے بات کرتا ہوں ــــ غصے کے مارے اس کی سانس پھول رہی تھی ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔

ہیلو ــــ (کہیں ابا میری آواز سن کر خوشی کے مارے مر نہ جائیں)

جی ــــ میں خالق بات کر رہا ہوں۔ صادق کا دوست۔

جیتے رہو بیٹا ــــ (ابا کی بے حد کمزور نحیف آواز آرہی تھی) ہم پر تو مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ ہماری بہو صادق کا تمام روپیہ خود لینا چاہتی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ہم دونوں کا کیا بنیگا ــــ

جی ــــ جی ــــ صادق کی آنکھوں سے پھر آنسوؤں کی دھار بہنے لگی۔

خالق میاں، کچھ تمہیں اندازہ ہوگا صادق کا کتنا روپیہ بینک میں ــــ

روپیہ ــــ اس نے اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹ دیئے ــــ

میرے سامنے تو صادق کی لاش پڑی ہے۔ یہ بتلایئے اس کا کیا کروں ــــ؟ (اگر ابا سامنے ہوتے تو یہ بات ان کی گردن پکڑ کر پوچھتا)

اسے تم دفن کر دو بیٹا ــــ ابا نے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ کہا۔

●●

عبد الصمد

ایک بے نام اجتماع کی رُوداد

سرمایہ داری اور سیاست کی گاڑی کو ایک ساتھ ہانکنے والے سرمایہ دار (اور سیاست داں) کے بنگلے کی تیسری تہہ کا وہ کمرہ تھا جہاں تک پہونچنے کے راستے سے صرف سرمایہ دار واقف تھا۔ یا پھر وہ وفادار اور قابل بھروسہ نوکر جو اس کی صفائی اور دیکھ بھال پر مامور تھے۔ اس موقع پر تو کمرے کی حفاظت کے لئے بہت سی خفیہ آنکھیں بھی لگا دی گئی تھیں۔ اور موقع یہ تھا کہ حکمراں جماعت کے وہ افراد یہاں جمع تھے۔ جو اندر ہی اندر ٹانگ کھینچنے کا کام کرتے تھے، پھر حزب مخالف کے وہ لیڈران بھی مدعو تھے جو ہر جماعت میں اپنا دوست بنا کر رکھنے میں مصلحت سمجھتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ریاست کا حکمراں گدی سے یوں چمٹا تھا کہ اس نے دوسروں کے سارے مواقع بند کر رکھے تھے۔ ٹکڑے بانٹتے وقت وہ اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھتا اور اپنے دشمنوں کو زک پہونچانے میں اپنا کمال دکھاتا تھا —— ٹکڑے بانٹنے کے اوصاف کی بنا پر حکمراں جماعت کا ایک بڑا طبقہ اس کی جان و مال کو ہر وقت دعائیں دیا کرتا تھا۔ اور چرب زبانی اور مناسب وقت پر مناسب در پر سر جھکا دینے کی خصوصیت کی وجہ کر وہ خفیہ ہاتھ ہمیشہ اس کے سر پر سایہ کئے رہتے، جو بنانے اور بگاڑنے کی طاقت رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں اس کے دشمن کمزور پڑ جاتے۔ لیکن اپنی دشمنی سے باز نہیں آتے تھے۔ کہ یہی دشمنی ان کی آس تھی۔

جب وہ سرمایہ دار کی میزبانی سے اچھی طرح فیضیاب ہو چکے تو واضح رہے کہ پہلے سرمایہ دار حاکم وقت کے ناک کی بال ہوا کرتا تھا لیکن اس حاکم وقت نے بغیر کسی معقول وجہ کے اس کے مقابلے میں ایک دوسرے سرمایہ دار کی پشت پناہی شروع کر دی تھی۔ پھر اپنے مقصد کی طرف متوجہ ہوئے کہ وہ بڑی مشکلوں سے یکجا ہوئے تھے اور صرف اس کام کے لئے انہیں خاصا وقت اور محنت صرف کرنی پڑی تھی۔ کہ وہ میڈیکل چیک اپ کے لئے جا رہے ہیں۔ ان کی یکجائی اس لئے بھی اہم تھی کہ حاکم وقت کو ہٹانے کی ان کی ساری کوششیں رائیگاں جا چکی تھیں۔ اور اب انہیں کوئی لائحہ عمل تیار کرنا ہی تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے وہ سبھی عوامل موجود تھے۔ جن کی وجہ سے حاکم وقت گدی کو چھوڑتا اور نہ گدی حاکم وقت کو، وہ اپنے فن میں یکتائے روزگار اور اپنے کام میں ہوشیار و طاق تھا۔ عوام اس سے خوش تھے۔ اس نے ان سے اتنے لمبے چوڑے خوشنما وعدے کر رکھے تھے کہ عوام کو ان کی موجودگی میں اپنی تکلیفوں کا کبھی خیال بھی نہ آتا کہ جو رنگ غالب ہوتا ہے وہ دکھتا ہے اور حاکم وقت کے وعدے یقیناً تکلیفوں پر غالب تھے اس سے بالاتر کچھ خفیہ ہاتھ ایسے ضرور تھے جو ایک جنبش سے اس پر اثر انداز ہو سکتے تھے لیکن ان ہاتھوں پر حاکم وقت نے کچھ اپنی زبان سے اس قدر روغن مل رکھا تھا کہ وہ ہاتھ جنبش کی صلاحیت کھو بیٹھے تھے تیسرا راستہ قانون رہ جاتا تھا لیکن وہ راستہ حاکم وقت نے یوں بند کر رکھا تھا کہ اس نے اس راستے کی ہر کمزور رگ پر اپنی انگلیاں رکھیں تھیں نیز یہ کہ وہ کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا بھی جانتا تھا یوں اس کے خلاف اٹھنے والی سبھی آوازیں

فضاؤں میں گم ہو جاتی تھیں جسے سجائے کمروں میں تیار ہونے
والی اسکیمیں میدانوں میں جا کر اپنا بھرم کھو دیتی تھیں اور اس
کے خلاف لگنے والی سبھی طاقتیں کونے میں اپنا منہ چھپاتی پھرتی
تھیں ـــــ اس لئے لائحہ عمل ایسا تیار کرنا تھا۔ جو میدانوں
کے راستے سے کمروں میں پہونچے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام
نہیں تھا کیونکہ میدانوں کا پورا نقشہ حاکم وقت کے ذہن میں
ثبت تھا۔ پرانے زمانے میں بھی گدی تک پہونچنے کا راستہ
میدانوں سے ہو کر جاتا تھا۔ اور یہ راستہ اب بھی برقرار تھا
صرف طریقہ کار بدل گیا تھا۔ اور دنیا طریقہ کار کے فرق کے
نقطے ہی پر ناچتی تھی۔

کافی دیر کے غور و خوض کے بعد حکمراں جماعت کے اس
فرد نے جو اپنی دس سالہ سیاسی زندگی میں آٹھ بار وفاداریاں
تبدیل کر چکا تھا۔ اور ہر بار اسے فائدہ ہی ہوا تھا۔ صرف آخری
بار وہ کسی وجہ کر چوک گیا تھا۔ چنانچہ وہ تین بار ڈپٹی منسٹر دو
بار اسسٹنٹ منسٹر، ایک بار منسٹر، اور ایک بار اہم سرکاری
ادارے کا چیرمین رہ چکا تھا۔ یہ رائے دی کہ حاکم وقت کو
بدنام کرنے کے لئے انتظامیہ کی مشینری کو ناکارہ ثابت کیا
جائے، اور اس کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی جائے،

تجویز نہایت معقول تھی۔ لیکن پھر اس کے بعد سوال
یہ تھا کہ اس کے لئے کون سی تدبیر اختیار کی جائے۔ یوں اتفاقیہ
طور پر ایسی کئی باتیں ہوئی تھیں۔ جن سے انتظامیہ بدنام ہو سکتی
تھی۔ لیکن حاکم وقت بھی بلا کا کائیاں تھا۔ اس نے ہر بار اپنی
عقل و فراست اور طاقت کو اس طرح کام لایا تھا۔ کہ ہر بات
شروع ہوتے ہی دب گئی تھی۔ اور اسے پھیلنے کا موقع ہی نہیں
مل سکا تھا۔ اس لئے تدبیر بھی ایسی اختیار کرنی تھی جس میں
کامیابی کی سو فیصدی امید ہو۔ اور بھلے لاٹھی ٹوٹ جائے تو
ٹوٹ جائے۔ لیکن سانپ ہر حال میں مر جائے،

حزب مخالف کے ایک فرد نے جو حکومت میں رہنا
رہتے ہوئے بھی نامعلوم ذرائع سے لاکھوں کما چکا تھا۔ اور سیاسی
کھیل میں بے دریغ خرچ کرتا تھا۔ مسکرا کر وہ کمال فن کاری
سے ایک آنکھ داب کر یوں کہا کہ اس کے پاس ایک ایسی تدبیر
ہے جس سے سانپ بھی مر جائے، اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ کہ اس
کام میں لاٹھی کا ٹوٹ جانا اناڑی پن ہے ـــــ

اس کے یوں کہنے پر لوگوں کے چہروں پر تابناکی، آنکھوں میں
روشنی، اور جسموں پر حرکت کے آثار نمایاں ہوئے۔ اور سبھی بہت
ہی پر امید ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ کہنے والے نے ایک بار
سبھی چہروں کو غور سے دیکھا۔ پھر اپنی بغل میں بیٹھے ہوئے لیڈر
کے کان میں کچھ پھونکا۔ جو اپنی تیس سالہ سیاسی زندگی میں تین
بار منسٹر، ایک بار قائم مقام چیف منسٹر اور لگاتار ممبر اسمبلی رہتا
آیا تھا۔ اس نے اپنی بغل والے لیڈر سے کچھ کہا ـــــ تیسرے
نے چوتھے سے کہا چوتھے نے۔ یہ سبھی لوگ سیاسی اکھاڑے میں اپنے
سبھی داؤ پیچ آزما چکے تھے۔ اور اس کھیل میں ان کی ترکش کے
سبھی تیر ضائع ہو چکے تھے۔ اور یوں وہ سبھی ٹھکے کھائے اور
آزمائے ہوئے مہرے تھے۔ ان کے علاوہ جو لوگ تھے وہ سیاسی
میدان کے رنگروٹ تھے۔ جن کو آسانی کے ساتھ اس کھیل میں
استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کوئی ایک پلڑا بھاری
کرنے کے فرائض انجام دیتے تھے۔ لیکن وہ چونکہ آزمائش کی
گھڑیوں سے نہیں گزرے تھے۔ اس لئے ان کے سامنے رازداری
کی باتیں نہیں کی جا سکتی تھیں۔ اس لئے ان کو چھوڑ کر سبھی لیڈران
دوسرے کمرے میں آگئے۔ اور جب سبھی سر جوڑ کر اور گھیرا بنا کر بیٹھ
گئے۔ تب کہنے والے نے اپنے لب یوں کھولے جیسے وہ سونے
کی ایک ایسی ڈبیہ کھول رہا ہو جس کے اندر ایک بہت
ہی قیمتی پتھر رکھا ہو ـــــ اس کی تجویز تھی
کہ فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکا دیا جائے اس سے فضا میں اتنی
آگ لہلہا اٹھے گی۔ کہ انتظامیہ بھی اپنے آپ کو اس آگ میں
جلا بیٹھے گی۔

حکمران جماعت کے ایک ایسے فرد نے جو گاندھی جی کے زمانے سے کر آج تک بس ایک ہی جماعت سے چپٹا رہا تھا اپنی اس عادت کی وجہ سے کچھ پا نہیں سکا تھا۔ احتجاج کیا کہ یہ تو کھلم کھلا ظلم ہوگا۔ اور صرف بدنام کرنے کے لئے اتنا خطرناک رُخ اختیار کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

لیکن اس کا احتجاج کسی کو متاثر نہیں کر سکا۔ کہ انتظامیہ کو بدنام کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر تو اختیار کرنی ہی تھی۔ اور یہ تدبیر اتنی معقول تھی کہ اس میں کامیابی ہی کامیابی نظر آتی تھی۔

تب حزبِ مخالف کے ایک دوسرے فرد نے جس کے جلوس میں پانچ ہزار آدمی آسانی سے جمع ہو جاتے تھے۔ اس خدشے کا اظہار کیا کہ کسی بھی سمجھدار آدمی کے سمجھ میں یہ بات آ سکتی ہے کہ یہ سب کچھ کیا کرایا ہے۔ لیکن جب اس سے سمجھدار آدمیوں کی ایک لسٹ طلب کی گئی تو وہ اپنا نام بھی شامل کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔

جب یہ اجتماع رات گئے اپنے اختتام کو پہونچا۔ تو یہ تجویز بالاتفاق رائے پاس ہو چکی تھی۔ جو لوگ اس سے مکمل طور پر اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ یا نصف متفق تھے۔ یا ان کے دلوں میں اس سلسلے میں ذرا بھی کوئی بات تھی تو وہ وہیں پر رہ گئی تھی سرمایہ دار نے شاندار مہمان نوازی کے ساتھ ساتھ پیسہ اور افراد کی فراہمی کا حتمی وعدہ کر لیا تھا ——— بار سے سب لوگ اٹھے تو ایک ہی بات ان کے ذہنوں میں گونج رہی تھی

——— جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔۔۔۔۔۔

جنگ اور محبت میں ۔۔۔۔۔۔ جنگ اور محبت میں ۔۔۔۔۔۔۔

ٹھیک دسویں دن ملک کے ایک مشہور روزنامے کے چوتھے صفحے کے آخری کالم میں ایک خبر چھپی ———

"——— ۔۔۔۔ میں فرقہ وارانہ فساد، شہر کی جامع مسجد کے دروازے پر سور کے گوشت کے لوتھڑے پائے گئے جس سے فرقہ وارانہ جذبات بھڑک اٹھا۔ تین افراد کے ہلاک ہونے کی اطلاع ملی ہے۔ سو افراد گرفتار، حالات قابو میں بتائے جاتے ہیں۔ پولس کی گشت جاری"۔۔۔۔۔۔

دوسرے دن تیسرے صفحے کے دوسرے کالم کی خبر۔۔۔

"صوبے کے کئی شہروں میں فساد ——— مندروں میں گائے کے گوشت اور مسجدوں میں سور کے گوشت کے لوتھڑے پھینکے گئے۔ کل ملا کر بیس افراد ہلاک، اور چار سو زخمی، ایک ہزار سماج دشمن افراد گرفتار، ریاستی پولس کے مزید دستے طلب۔ ہوم سکریٹری نے حالات قابو میں ہونے کا دعویٰ کیا"

تیسرے روز پہلے صفحے کی سرخی ———

۔۔۔۔۔۔" پوری ریاست میں زبردست فرقہ وارانہ فساد چھڑ گیا۔ تقریباً سو افراد کے ہلاک ہونے کی خبر اور چار ہزار زخمی۔ آٹھ ہزار افراد گرفتار ہوئے۔ فوج کے دستے طلب کر لئے گئے۔ ریاستی پولس اور انتظامیہ کی نااہلی ثابت ہو گئی" ———

وزیر اعلیٰ کا فساد زدہ علاقوں کا دورہ، اور حالات پر مکمل کنٹرول کا دعویٰ۔۔۔۔۔۔

چوتھے روز سے بارہویں روز تک فسادات کی اخبار کی سرخی پر اجارہ داری قائم رہی۔ فساد رُک رُک کر ہوتے رہے اور فساد زدہ علاقوں کو فوج کے حوالہ کر دیا گیا۔ ملک کے سات روزناموں نے اس پر اداریہ لکھا۔ اور انتظامیہ پر زبردست بوچھار کی۔ خاص طور پر وزیر اعلیٰ کو آڑے ہاتھوں لیا گیا ——— اس درمیان ملک کے وزیر اعظم نے فساد زدہ علاقوں کا طوفانی دورہ کیا۔ اور ریاستی حکومت کے اعلیٰ حکام کے ساتھ بات چیت کی۔ فوج کو مزید تیار رہنے کا حکم دیا گیا۔ فساد زدہ علاقوں میں ہفتوں کرفیو برقرار رہا۔ اور اکا دکا واقعوں کی خبر مہینوں آتی رہی

فساد ایک قومی موضوع بن گیا۔ کسی نے فساد کو غیر ملکی سازش بتایا۔ کسی نے باہر سے آنے والے پیسے کی

رحمن احمیدی

پنجہالہ کے سودائی

مدتوں سے وہ سانسوں کے لق و دق دوزخی صحرا اور تنفس کی پرپیچ اور دلدل میں بھٹک رہا ہے۔ وہ ازل سے پیاسا اور تشنہ ہے۔ اسے پنجہالہ کی عدم موجودگی خار مغیلاں کی طرح چبھتی رہتی ہے۔ اس نے اسی صحرا میں آنکھ کھولا ہے۔ اور اسی دشت میں پرورش پائی ہے۔ اسی لئے وہ کاغذی پیرہن اور کاغذی پھول کی حقیقت، ماہیت اور رنگ و نسل کی اصلیت سے آگاہ ہے۔ اس جنگل کی بیرونی سطح پہ ہریالی ہی ہریالی ہے لیکن اندر سے بالکل اجاڑ اور ویران ہے۔ خشک اور ٹنڈ منڈ درخت، پر ہریالی کا دیدہ زیب نقلی غلاف ہے۔ وہ گہری نگاہ ایک سائے پر ڈالتی ہے ——— سیدھے … جو ابدار موتی رکھنے والوں کو … جھیل۔ کہ شاق … کو، ازلی پیاس کی عارضی سکون پر متوالے چہروں کی، عوامی اذیت … کا مقابلہ کر … بے حجابانہ نازوں کو، شیشے میں پیکر اتارنے والوں کو نہیں ——— لیکن … ——— لیکن نقلی جسم کا اصلی چہرہ مدغم ہے۔ کاغذی پیرہن میں خندہ زن کلی کی طرح متبسم ہونٹ، سر جانے، پہچانے، چہرے میں ایک ہی نوعیت کی آتش شعلہ زن ہے۔ مچلتا ہوا سیماب آتشی نمائش میں … کے لئے بے تاب ہے ———

سامنے … وہ پانی کا نقرئی جھیل دیکھ رہا ہے

پنجہالہ کی چاہت … سمندر کی ناگن کی طرح سانس کے زیروبم پہ ہچکولے کھا رہی ہے۔ وہ روز بروز اور گھٹتی جا رہی ہے۔ کھردری اور ننگی شاہراہ کی مانند۔

تاریک جنگل اور لق و دق صحرا میں اس کے خالی ہاتھوں کو مشعل کی حاجت ہے۔ کوئی سمت راہ نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ ہر سو تاریکی ہی تاریکی ہے۔ ——— بحر ظلمات میں وہ آبلہ پا ہو رہا ہے۔ اور شدت خوف سے کانپ رہا ہے۔ کہ کہیں موسم بہار گزر نہ جائے، اور اسے بازار مصر سے تہی دست واپس نہ ہونا پڑے ——— رسم و رواج سے بے نیاز، رفتار دہر سے غافل، عقل و خرد سے بے پرواہ، ہوش و حواس سے بیگانہ کہیں دور، بہت دور، بوالہوسی کی شاہراہ پر دوڑ رہی ہے جسم کے آتشیں تقاضے کی جم غفیر میں شاید کوئی متحرک سایہ مل جائے۔ اور اس کے پنجہالہ کی آرزو پوری ہو جائے۔

عورت کی جوانی محیط بیکراں ہے۔ اور عورت جوانی کے جسم میں قطرہ بہ قطرہ فنا ہوتی ہے۔ اور پھر وہ جنگل کی سوکھی لکڑی یا خشک ندی کے مانند ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اس کے جسم و جاں میں سیمابی بے چینی ہے۔ ساکت اور … … کی … میں رواں …

آبیاری کر رہی ہے ـــــ اور حیات کی رفتار کا دیوتا ہوا سے باتیں کر رہا ہے۔ اور اس کے خوفناک پنجے کا ناخن زلف رخسار سے ہوکر ابھرے ہوئے گوشت میں چبھ رہا ہے خون قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے۔ ہر متحرک سائے میں طلسم کی آنکھ اور پاؤں میں کتے کی چال ہے۔ وہ تکمیل آرزو کی شوق میں صبح و شام حد نگاہ تک دیکھتی رہتی ہے ـــــ

دفعتاً وہ تھک جاتی ہے۔ اس کی رفتار میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ آئینہ خانے میں وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے ٹوٹے جسم کے بکھرے اعضا ٹٹولتی ہے۔ خضاب میں ڈوبی ہوئی زلفیں چہرے کی شکن آلود لکیریں اور سوکھے ہوئے پھل بنجہالہ کے امیدواروں سے چغل خوری کرتے ہیں۔ اس کے قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ بے مائگی اور بے چارگی کا احساس بڑھتا ہے۔ اور وہ اپنے ہی جسم کے جنگل کی آگ میں جلنے لگتی ہے۔ آگ ہی آگ پھیل جاتی ہے اس کے جسم کا رواں رواں جل اٹھتا ہے۔ صرف لاش رہ جاتی ہے ـــــ سانس کے دریا میں ڈوبتی، ابھرتی زندہ لاش ـــــ جس پر فاقہ زدہ گدھ، تشنہ کرگس اور حریص کوے چونچ مار کر دائمی بھوک کی عارضی سکون حاصل کرتے ہیں ـــــ لیکن وہ لاشوں کے محل میں تنہا نہیں ہے۔ اور بھی زندہ لاشیں سسک رہی ہیں ـــــ بھیگی بھیگی چیخ اور برف آلود آہ و فغاں۔

سوکھا درخت پھر سے ہرا ہو جاتا ہے۔ پتوں سے ہوائیں ٹکراتی ہیں۔ نغمگیں اور مترنم آواز پیدا ہوتی ہے۔ دشمنوں اور رقیبوں کی آنکھیں فرط مسرت سے ناچتی ہیں نیلم باکی پتھر لدی ہوئی کشتی کی مانند ڈوب رہی ہے ـــــ

ـــــ اس بار درخت کی ہریالی میں خاردار پتیاں بھی ہیں۔ وہ بے رحم مالی کی طرح خاردار پتوں کو توڑتی ہے۔ اس کے ہاتھ لہولہان ہیں۔ اس کے ہونٹوں سے تیزاب ٹپکتا ہے سانسوں سے زہر خارج ہوتا ہے۔ اس کے نقلی روپ میں اصلی سے زیادہ جاذبیت ہے۔ بنجہالہ کے لئے حیات کی شاہ راہ پر وہ کئی روپ دھارن کر چکی ہے ـــــ لہراتی، بل کھاتی ناگن پھر سے تماشہ بینوں کا مرکز بن گئی ہے ہر خریدار اس کا رنگین خون چکھتا ہے۔ اور زہر کی ایک بوند اٹھا کے لے جاتا ہے ـــــ اور پھر اس کے وجود سے آخری چیخ خوفناک شکل میں رونما ہوتی ہے۔ اس کا سارا وجود لرز اٹھتا ہے۔ متزلزل احساس اور منتشر حواس کے مابین آخری علامت نمودار ہوتی ہے ـــــ وہ اپنی پوری قوت سے چیختی ہے۔ بنجہالہ کو آواز دیتی ہے۔ سانس کے لق و دق صحرا میں دور دور تک اس کی کربناک چیخ گونج رہی ہے۔ لیکن ایک بھی سایہ گوش برآواز نہیں ـــــ

اور ـــــ اور ـــــ وہ تھک کر آدم کی دھرتی پر گہری نیند سو جاتی ہے۔ بے چین و بے قرار روح کی طرح صحرا کے ریگ زار سے آوازیں آ رہی ہیں ـــــ اسی نے ہم سب کو بھیجا ہے۔ اور ہم سب کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

●●

شام بارک پوری (بنگلہ دیش)

آٹھ کروڑ کا زخم

اگر بنگلہ دیش کے نقشہ پر نظر ڈالی جائے تو ایک دریا نظر آئے گا جو جنوب مغرب سے ہوتا ہوا بنگلہ دیش کے بالکل درمیان سے گزرتا ہوا خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ اس کا نام پدما ہے۔ "پدما" کے معنی پھول کے ہیں۔ جس طرح مصر کا نیل، پاکستان کا دریائے سندھ اور ہندوستان کا دریائے گنگا اپنے ملک کو سیراب کرتا ہے اور ملک کی معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہی حیثیت بنگلہ دیش میں پدما کی ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر جو لوگ آباد ہیں۔ ان کی گزر اوقات کا ذریعہ کاشت کاری اور ماہی گیری ہے۔ چونکہ بنگلہ دیش میں اسی فیصد عوام گاؤں اور دیہاتوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس لئے پدما کی حیثیت ان کے لئے زندگی سے بڑھکر ہے سچ تو یہ ہے کہ ان کی موت اور زندگی "پدما" کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہ کہانی جو میں نے شروع کی ہے۔ اس کا موضوع پدما ہے۔ صدیوں سے یہاں کے باشیوں کی زندگی دریا کی لہروں کے ساتھ ڈوبتی ابھرتی رہی ہے۔ دونوں کناروں کے لوگ عیش و عشرت اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی بسر کرنے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ بلکہ تن ڈھانکنے کو معمولی کپڑا اور پیٹ بھرنے کو موٹے چاول پر ہی قناعت کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے معصوم لوگوں کو چند خود غرض، با اقتدار، اور ہوس پرست سیاست دانوں نے اپنے دام میں پھانس کر اپنے اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا تھا۔

دونوں کناروں پر بسنے والے ہزاروں خاندانوں میں سے صرف ایک خاندان کی کہانی بیان کرتا ہوں۔ جو اپنے راستے سے بھٹک گیا تھا اور زمانے کے ستم سہتے سہتے خستہ اور بدحال ہو گیا ہے۔ آج سے چند سال پہلے رمضان شیخ پدما کے کنارے اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ چین کی زندگی گزار رہا تھا اس کا سرمایہ حیات مچھلی پکڑنے کا جال، ایک کشتی، اور کاشت کاری کے لئے تھوڑی سی زمین تھی۔ ان سے جتنی آمدنی ہوتی یہ چھوٹا سا خاندان بہت ہی خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا جب مقدر خراب ہو تو جو کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے اور رمضان شیخ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ملک میں سیاسی تبدیلیاں ہوئیں، اور سارے ملک میں آگ بھڑک اٹھی، اس لئے وہ بھی اپنا دامن نہیں بچا سکا۔ جب تخریب کاروں کے قلع قمع کے لئے گاؤں اور دیہاتوں میں فوجی اقدام ہوا۔ تو وہاں کے چیرمین نے اپنے چہرے پر معصومیت کا نقاب ڈال کر تخریب کاروں کی پشت پناہی کی کیونکہ اسی میں اس کا اپنا مفاد مقصود تھا ڈبل رول سے اپنے مستقبل کا راستہ ہموار کر رہا تھا یہ بات صرف گاؤں تک ہی محدود نہ تھی قصبوں اور شہروں میں بھی افسران ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آزادی کا ایک

سنہرا خواب دیکھ رہے تھے، تاکہ جلد از جلد ترقی پا سکیں۔ اور رشوت خوری۔ لوٹ کھسوٹ سے ساری قوم کا خون چوس سکیں۔ رمضان شیخ بھی اپنی جان کے خوف سے بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ صرف اس امید پر کہ آزادی کی نئی صبح اس کی زندگی کے اندھیروں کو دور کر دے گی۔ اور سیاست دانوں کے کئے ہوئے وعدوں کے مطابق بیس روپے من چاول اور ۵ روپے کی ساڑھی ملے گی۔ اس طرح وہ نو مہینوں تک اپنی بیوی بچوں کی یاد سینے سے لگائے سنہرے خواب کے تانے بانے بننے میں مصروف رہا۔

جب ۱۶ دسمبر کو آزادی ملی تو وہ بھی اپنے گاؤں آیا بیوی بچوں سے مل کر خوشی کے مارے اس کی آنکھوں سے پدما اور میگھنا کے دھارے بہہ نکلے۔ ایک بچہ اس ہنگامہ لقمۂ اجل ہو چکا تھا۔ بیوی کی اس دلجوئی پر کہ اب زندگی کا سورج چمکنے والا ہے۔ اسے ڈھارس بندھی، ہمارا اپنا ملک اپنی حکومت ہے۔ پاکستانیوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ اب غم کی گھٹائیں چھٹ جائیں گی ــــــ لیکن اس کے برعکس رمضان شیخ کی زندگی میں ہر آنے والا دن ایک نیا زخم لے کر آتا۔ چند ہی دنوں میں چاول جو پاکستان کے زمانے میں بیس روپے من ملتا تھا ــــــ اسی روپے، پھر ڈیڑھ سو روپے، یہاں تک کہ چار سو روپے من تک فروخت ہونے لگا۔ تن ڈھانکنے کو جب کپڑا انہیں ملنے لگا۔ تو مچھلی پکڑنے کا جال ستر پوشی کا کام آنے لگا۔ ضروریات زندگی کی چیزیں عنقا ہو گئیں۔ ہاں انہیں ملا کیا۔؟ ایک نیا بابائے قوم،، اور دوسرا اپنا قومی پرچم ــــ لیکن زندہ رہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ پینے کا پانی کو بھی آدمی ترسنے لگا۔ جن لوگوں کی زندگی پدما سے وابستہ ہو اگر انہیں پانی نہ ملے تو اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔؟ زندگی یوں ہی مصیبت اور تکلیف سے گزر رہی تھی جس پر پڑوسی ملک نے ایک اور بھرپور زخم لگایا۔ پدما جس پر انہیں ناز تھا۔ فرخا بند کی وجہ سے اس کا پانی بند ہو گیا جس دریا میں زندگی کی کشتی رواں دواں تھی۔ آج وہ وہ کشتی اپنے ٹوٹے ہوئے بادبان کے ساتھ ریت میں پھنسی ہوئی تھی۔

رمضان شیخ ندی کے کنارے بیٹھا ماضی کی یاد میں کھویا ہوا تھا۔ عین اسی وقت چند لوگ اس کے قریب سے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے گزرے،

کہاں جا رہے ہو بھائی؟ رمضان شیخ نے پوچھا!

ہم لوگ رئیس پور پیر کی درگاہ جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بولا۔

کیوں؟

اس لئے کہ جس ندی سے ہم لوگوں کی قسمت وابستہ تھی سوکھ کر چٹیل میدان ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے وہاں مراد مانگنے جا رہے ہیں۔ تا کہ ہم اس مصیبت سے نجات پا سکیں،

یہ سن کر رمضان شیخ بڑا خوش ہوا۔ اور ان سے التجا کی کہ اسے بھی ساتھ لیتے جائیں، کیونکہ میری زندگی بھی پدما کی طرح ویران ہو چکی ہے۔

پانچ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد یہ لوگ پیر کی درگاہ پر پہونچے، لاکھوں لوگوں کا مجمع تھا۔ مختلف شہروں سے لوگ جوق در جوق آئے ہوئے تھے، نعت و قوالی کی محفل جاری تھی۔ دیگوں پر کھانا چڑھا ہوا تھا۔ کوئی ندامت کے آنسو بہانے آیا تھا۔ کوئی جلد از جلد بام عروج پر پہونچنے کے لئے ــــــ کوئی دن دونی رات چوگنی ترقی کے لئے ــــــ سب ہی لوگ اپنی اپنی مراد کی حصول کے لئے پیر کے حضور میں حاضری دے رہے تھے، جب رمضان شیخ کی باری آئی تو پیر صاحب نے پوچھا! تمہیں کیا چاہئے۔؟

کچھ نہیں حضور! میری صرف ایک ہی آرزو ہے کہ پدما میں ایک بار پھر سے زندگی کی لہریں دوڑنے لگیں پانی سے ہم لوگوں کی قسمت کی سیاہی دھل جائے گی۔!

پیر صاحب نے سرخ سرخ آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور جلالی انداز میں کہا۔ بکواس بند کر۔ کم بخت۔ تم لوگ اپنی قسمت بگاڑنے کے خود ذمہ دار ہو۔ یہ تم لوگوں کے گناہوں کا پھل ہے۔ قہر الٰہی ہے۔ اس کے لئے تم لوگوں کو قربانی دینی ہوگی۔ دوسروں کو چھوڑ۔ تو جا ــــ اور اللہ کی راہ میں کسی جاندار شئے کی قربانی دے۔ اور وقت کا انتظار کر۔

پہلے تو رمضان شیخ سٹپٹایا ــــ متفکر ہوا ــــ پھر گھر کی طرف روانہ ہوا راستے میں چلتے چلتے سوچنے لگا۔ کہ کھانے کا ٹھکانہ نہیں۔ پھر جانور کہاں سے لائے قربانی کے لئے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کے بچے کے پاس پالتو مرغی ہے جس کے ساتھ وہ دن بھر کھیلتا ہے۔ آخر یہ مرغی کس کام آئیگی شاید اس قربانی سے اللہ تعالیٰ مہربان ہو جائے۔

گھر پہونچ کر سارا ماجرا بیوی سے بیان کیا۔ بیوی بھڑک کر بولی نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بچے کا ہی بہلانے کا وہی ایک سہارا ہے۔ اس کو بھی چھین لوگے تو اس کے نازک دل پر بہت برا اثر پڑے گا۔ لیکن وہ ماننے کیوں لگا؟

رمضان شیخ بضد تھا جس طرح بھی ہو وہ مرغی حاصل کرنی ہے۔ اگر پدما میں دوبارہ پانی آجائے تو ہماری خوشحالی کے دن پھر آئیں گے۔ پھر ایک کیا سینکڑوں مرغیاں ہو لیں گی۔

دونوں نے مل کر طے کیا کہ منا سو جائے گا تو وہ چپکے سے مرغی لے جائے گا۔ پھر بچے کو یہ کہکر بہلا دیا جائے گا۔ کہ مرغی چوری ہو گئی ہے۔ چنانچہ پروگرام کے تحت ایسا ہی ہوا۔ قربانی دینے کے بعد اسے امید تھی کہ ندی میں پانی کی لہریں ٹھاٹھیں مارینگی اس آس میں روزانہ وہ ندی کے کنارے جا کر بیٹھتا۔ لیکن بجائے پانی بہنے کے زندگی کی لہریں کم ہونے لگیں۔ خشک سالی اور خستہ حالی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

ایک شام جب وہ سوکھی ندی کے کنارے اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کا جائزہ لے رہا تھا۔ تو قریب کے گاؤں سے آہ و بکا کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا اور اطلاع دی۔ امجد علی سکھدار کا انتقال ہو گیا ہے۔ ایم پی کا حلقہ میں قبرستان ہے۔ وہاں مردہ دفن کرنے نہیں دیا جائے گا اس کے عوض اسے زمین کے لئے تین سو روپے دینے ہونگے

رمضان شیخ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، قبرستان میں دفن کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو پدما ہم لوگوں کی موت کا سبب بنی ہے۔ اس کے بیچ "چوچر" (مٹی کا چھوٹا جزیرہ) نکل آیا ہے۔ اس سے عمدہ قبرستان نہیں ہو سکتا چلو وہیں قبر کھود دیں۔ تاکہ دنیا والوں کو پتہ چلے کہ زندگی عطا کرنے والی پدما میں آج قبرستان بنا ہے۔

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی اس آدمی کے ساتھ جنازہ میں شرکت کے لئے چلا گیا۔ جنازے سے واپس آنے کے بعد وہ غمزدہ سا جھونپڑی کے برآمدے میں پیڑھی پر بیٹھ گیا اسے افسردہ دیکھکر بیوی نے پوچھا۔ کیا بات ہے؟

یہاں کی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے بھوک سے سسک سسک کر روزانہ کوئی نہ کوئی آدمی مر رہا ہے۔ اس لئے زندہ رہنے کے لئے ہمیں کوئی نہ کوئی نئی جگہ تلاش کرنا پڑے گی۔

اس کی بیوی ناراض ہو کر بولی۔ چودہ پیڑھی کی جگہ چھوڑ کر نئی جگہ آباد ہونے کے بارے میں تم نے سوچا کیوں؟ سوائے خود فریبی کے اور کچھ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں ہماری حالت اس سے بھی بدتر ہو جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں خوشحال دیکھنا چاہیں گے۔ تو یہی علاقہ سبزہ زار بن جائے گا۔ نیچے پدما اور اوپر اللہ سہارا ہے۔

بہرحال بیٹھے بیٹھے زندگی کی گاڑی نہیں کھینچی جا سکتی اس لئے رمضان شیخ روزگار کی تلاش میں دوسرے گاؤں روانہ ہوا ــــ اور بیوی چاول سبزی مانگنے دوسرے گھر

پہلی گئی۔ گھر میں بچہ اکیلا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات آچکی تھی کہ تمام مصیبتوں کی یہ جڑ پدما ہی ہے۔ اور جب تک پدما سے پانی کا سوتا نہیں پھوٹتا۔ والدین کے چہرے پر خوشیوں کے پھول نہیں کھلیں گے۔ اس کی سمجھ میں صرف یہ نہ آسکا کہ وہ دریا جو پہلے چھوٹا سا سمندر تھا۔ آج خشک ہو کر ریگستان کیوں بن گیا۔ وہ ننھا دوڑتا ہوا پدما کے بیچوں بیچ ابھرے ہوئے چر پر چڑھ گیا۔ اور اپنے ننھے منے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھرپا سے مٹی کاٹنے لگا۔ تاکہ شاید پانی ابل پڑے اور سوکھی زمین سیراب ہو سکے، لیکن مٹی کا ٹیلہ ظالم کے دل سے بھی زیادہ سخت تھا۔

اسی شام آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں۔ بارش کے آثار نظر آنے لگے۔ یہ دیکھ کر دونوں کناروں کے باشی خوشیوں سے جھوم اٹھے۔ ڈھول تاشے کے ساتھ میگھ ملہار گاتے ہوئے رقص شروع کر دیا۔ اللہ نے ان کے دل کی بات سن لی تھی۔ اب پیاسی زمین کی پیاس بجھ جائے گی۔ تالاب دریا میں پانی جمع ہو جائے گا ـــــ لیکن ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بجائے بارش ہونے کے طوفان آگیا چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تنکوں کی طرح اڑ گئیں، سر چھپانے کی جگہ تھی اب وہ بھی نہ رہی۔

دوسرے دن دیکھا گیا کہ پدما کے دونوں کناروں پر بستی کے لوگ قافلے کی شکل میں نئی جگہ کی تلاش میں چل پڑے تھے۔ رمضان شیخ بھی اپنی بیوی اور بچے کے ہمراہ اس قافلے میں شامل تھا۔ ان لوگوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور نہ کوئی مستقبل تمام لوگ روتے سسکتے اپنے وطن کی سرزمین سے جدا ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی "پدما" بہہ رہی تھی، فرخا موت کا دیوتا بنا کھڑا تھا۔ آج یہ بچا ہے اس کی وجہ سے رو رہے ہیں، کل یہ آٹھ کروڑ عوام کے رونے کا سبب بن جائے گا۔

●●

غزل

بیاباں اداس دلوں کی کہانیاں ہو جائیں
اور اس پہلے کہ الفاظ بے زباں ہو جائیں!

ہمارے بچوں کو وہ معجزہ نصیب کہاں!
نہیں تو شہر میں چشمے بہت رواں ہو جائیں

کماں کھینچنے والوں کا اعتبار کریں
چلو کبھی کبھی تیروں سے بدگماں ہو جائیں

اب اتنا سچ بھی نہ بولو کہ وہ یقیں نہ کرے!
اب اتنے لفظ نہ لکھو کہ رائیگاں ہو جائیں

عرفان صدیقی

اقبال نیازی

نیم پلیٹ

باپ کے مرتے ہی اس نے نیم پلیٹ نکال لی۔

اور اب وہ دروازے پر اپنے نام کی تختی آویزاں کررہا تھا۔ جس پر بڑے بڑے حرفوں میں اس کا نام چمک رہا تھا ـــــ ہرکشن داس

دروازے پر اپنے نام کی تختی لگا کر وہ بہت خوش ہوا۔ وہسکی کی بوتل کھولا۔ خود پیا، دوستوں کو پلایا،.... شاندار پارٹی دیا، رات بھر عیاشی کیا۔

اب روز آتے ہی وہ دروازے پر رکتا۔ اپنے نام کی تختی پڑھتا۔ پیار سے اس پر ہاتھ پھیرتا، اور مسکراتا ہوا اس قبر میں داخل ہو جاتا۔ جس کے باہر کتبہ لگا تھا۔ ہرکشن داس

ایک دن اچانک ہی اسے ایک فون ملا۔ ہیلو ہرکشن داس۔ تم بڑے آدمی ہو، تم دولت مند ہو، تمھیں معروف رہنا چاہیئے، تمہارا سوسائٹی میں نام چمکنا چاہیئے..... تم گھر میں کیا کررہے ہو؟ ہیلو تم سن رہے ہو نا..... تمہیں بزی رہنا چاہئے، بزی..... تم سن رہے ہو نا.......؟

وہ مسکرایا اور بزی ہو گیا۔ دولت سمیٹنے میں...

دولت آتی رہی۔ دروازے پر لگی نیم پلیٹ پرانی ہوتی گئی۔ وہ تجوری میں نوٹیں جماتا رہا اور دروازے پر لگی نیم پلیٹ پر گرد جمتی رہی۔

وہ معروف ہوا..... گرد جمی،

نوٹیں آئیں ..... گرد جمی

سوسائٹی میں نام ہوا..... گرد جم گئی۔

اب قبر میں داخل ہوتے ہوئے وہ کتبہ پر نظر بھی نہیں ڈالتا..... دونوں ہاتھوں میں، جیبوں میں نوٹ لے کر داخل ہوتا..... تجوری میں بھرتا..... چلا جاتا.......

دروازے پر لگی نیم پلیٹ پڑھنے کی اسے فرصت ہی کہاں تھی؟ کہ وہ بزی ہو گیا تھا۔ سوسائٹی میں نام ہو رہا تھا۔ نوٹیں جمع کر رہا تھا........ اور نیم پلیٹ پر گرد جم رہی تھی۔ وہ جانتا تھا بلکہ ساری سوسائٹی روزانہ اسے چیخ چیخ کر اسے اس کا نام یاد دلاتی رہتی..... وہ جانتا تھا وہ کون ہے ...... سیٹھ ہرکشن داس،

ایک دن پھر ایک فون آیا.....

اور وہی ہوا جو کبھی نہ کبھی ہونا تھا..... ہیلو، کون؟ ہرکشن داس جی، تم سن رہے ہو نا! سنو، تم کنگال ہو گئے،..... تم مفلس ہو گئے..... تم غریب ہو گئے.. اب تم دولت مند نہیں رہے..... ہیلو تم سن رہے ہو نا! ایسا ہی ہوتا ہے...... یہ قدرت کا کھیل ہے.... ہیلو سیٹھ..... معاف کرنا ہرکشن داس جی..... تم مرچکے ہو!

اس نے سن لیا کہ وہ کنگال ہو گیا۔ اس کی تجوری کو زنگ لگ گیا۔۔۔۔ اب اس کے پاس ایک ہی دولت تھی۔۔۔۔ وقت کی دولت ۔۔۔۔ سارا دن گھر پر گزرتا۔ ۔۔۔۔ مصروفیات نوٹوں کے ساتھ کسی چور دروازے سے بھاگ گئی تھیں۔۔۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سارا سارا دن کیا کرے۔۔۔۔؟

اور ایک دن ۔۔۔۔ وہ بہت دنوں بعد مسکرایا۔ ۔۔۔۔ باہر گیا۔۔۔۔ دروازے کی نیم پلیٹ پر گرد کی تہہ نے قبضہ کر رکھا تھا۔ جس کے پیچھے اس کا نام چھپ گیا تھا۔۔۔ اس نے بڑے پیار سے اس پر ہاتھ پھیرا اور گرد صاف کی۔ گرد نیم پلیٹ سے یوں اڑ گئی، جیسے تجوری سے نوٹیں۔۔۔ جیسے سوسائٹی سے نام ۔۔۔۔ نیم پلیٹ کے صاف ہوتے ہی تحیر سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔۔۔۔۔ نیم پلیٹ پر اس کا نام نہیں تھا۔۔۔۔ بلکہ اس کی جگہ اب اس کے بیٹے کا نام سنہری حرفوں میں کندہ تھا ـــــ موہن داس

اس دن پھر ایک فون آیا۔۔۔۔

ہیلو! سیٹھ موہن داس! تم سن رہے ہو نا! تم ایک عزت دار آدمی ہو ایک کامیاب بزنس مین۔۔۔ تمہارا سوسائٹی میں نام ہے۔ تم مصروف ہو۔۔۔۔ ہیلو سیٹھ موہن داس! تم سن رہے ہو نا۔۔۔۔ ●●

بقیہ کفن اردو افسانہ کا سنگ میل

سوئے ہوئے یہ افسانہ اختتام پر اپنا بھرپور اور مکمل تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ یہ تاثر دماغ میں چنگاریاں سی پیدا کر دیتا ہے۔ تاریخ کی تاریک ترین حقیقت پر غور کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ کہ کس طرح سماجی شکنجے میں ایک طبقہ کو دبایا، کچلا

اور پیسا گیا۔ کہ ان کی ساری شخصیت ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی، اور وہ سماج کے لئے ایک مسئلہ بن گئے، اس طویل لرزہ خیز داستان کو پریم چند نے بڑے تمثیلی انداز سے چند سطروں میں قلم بند کیا ہے۔ اور ہندوستان کے دیہاتوں کے افلاس کی عریاں حقیقت کو اس کی پوری سفاکی کے ساتھ پیش کر کے[1] وقت کے نازک ترین ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے ہیں ●

بقیہ ہندوستان کے تہذیبی عناصر...

ہم اہل دل کی بزم سجانے ہیں آج ہر
وارث کے میکدے سے لئے درد لے کے آؤ
غالب کے دیس میں ہے جو محفل سجی ہوئی،
اس پہ اخلاق کے ساتھ جاں کو بھی لٹاؤ

آؤ مزار حضرت عالی مقام پر!!
اقبال کے دیار سے پیغام جاں لئے
لاتے رہے ہو تم جو جواہر کے دیس میں
آجاؤ پھر وہی لحن دلستاں لئے،

کل سوئے لندن گاہ بزم جا کے تھے ہم نے بازی
اب بزم جمہ گاہ سہت ہم اپنے قدم اٹھائیں
ملتی تھی داستان کل آوروں کے خون سے
آج اپنے خون دل میں ڈبو کر قلم اٹھائیں

[1] پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی پہلو، اصغر علی انجینیر، (آج کل اگست ۱۹۸۰ء) ص ۱۵

اختر یوسف

رات، ایک ندیا سماں

چاند..... اوپر اٹھ گیا ہے
تم کہاں ہو
رات
ایک ندیا سمان
دھیرے دھیرے
مرے ہاتھوں سے پھسلتی
جا رہی ہے

تم کہاں ہو
آخری لوکل
شہر کو چھوڑ کر
اب جنگلوں کو جا رہی ہے
شہر کی ویران سڑکوں پہ
ٹریفک کا سپاہی
اونگھتے کتوں پہ لاٹھی رکھ کے
مردہ سا بیٹھا ہے
لال بتی کی چمکتی آنکھ میں
گہرا اندھیرا ہے۔

ایک سناٹا ہے باہر
ایک سناٹا ہے اندر
برف جیسے جنگلوں میں
دھیرے دھیرے گر رہی ہے
رات کی ٹھنڈک سلگتی
جا رہی ہے

رات ایک... ندیا سماں
مرے ہاتھوں سے تھم تھم
پھسلتی جا رہی ہے۔
تم... کہاں ہو

انتظار میں حیرت نہیں

بنگلہ: اسد چودھری
اردو: احمد سعدی
(بنگلہ دیش)

گیا

میری لالن سے ارشی[1] میں ملاقات ہوئی
میں نے حالانکہ اسے کشتیا[2] میں ڈھونڈا مگر وہ نہ ملا۔
اب بھی لالن کو وہی فیری کی دشواری ہے کیا؟

اکثر ایسا ہی میرے ساتھ ہوا
کوئی ایک شخص کسی اور ٹھکانے پہ رہا بیٹھا ہوا۔
کیوں گیا؟ کب گیا؟ اس کی نہ رہی مجھکو خبر،
میں عبث اس کے لئے مفت پریشان ہوا

ایسا بھی کوئی بات ہوئی
شب و دیدار میں کب تک کسی کی راہ تکوں
کیسے دل ایسے میں بیزار نہ ہو
جس میں راحت بھی نہیں،
کوئی حیرت بھی نہیں
اس کی مدت بھی نہیں۔

گھر کا دروازہ کھلا رہنے پہ بھی
گھر کے اندر جو ملاقات نہ ہو
گھر کے باہر بھی ملاقات نہ ہو
گھر کے باہر کسی دروازے کے بارے میں مجھے علم نہیں

میں نے حالانکہ اسے کشتیا میں ڈھونڈا مگر وہ نہ ملا
جستجو جب نہ رہی
اب اچانک وہ میرے سامنے آیا تو ملاقات ہوئی
مجھکو حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی ہوئی،
(بستمو ئے نئے پر لکھا ہے)

---

[1] اسٹیمر گھاٹ، [2] شمالی بنگال کا ایک شہر

ظہیر غازیپوری

انتشار

یہ سبز احساس
نیلی وادیوں کا افسوں
سیہ امیدوں پہ سرخ نقطے
کھلی ہوئی روشنی کی آنکھیں
شفق کے ہونٹوں پہ سرمئی
جھلملاتا آنچل
کوئی تلاطم نواز ساعت
کوئی طرح دار جسم موزوں
لچیلے ریشم کی سرسراہٹ
مری نوا پرفشاں ہوئی ہے
کہ مرے لفظوں کو
عصر نو کی غذا ملی ہے۔؟

ترسیل

صبح الفاظ کا جاں فزا بانکپن
فکر کی ہر کرن
ٹوٹ جاتا ہے جب
جادوئے نیم شب
جاگ اٹھتی ہے تالاب میں جسم کے
زرفشاں نیلگوں تاب و تب
سحر سے یخ بستگی ذہن کی۔
ختم ہو جائے تو
میں دریچوں کو خود کھول دوں
تازگی کے لئے
روشنی کے لئے

فضا ابن فیضی

غزل

گرے تو ذہن پہ شیشوں کے پتھر ایسا بھی
کبھی مزاجِ قلم ہو سکندر، ایسا بھی

تم اس کو توڑ کے دیکھو تو میں دکھا دوں
شکست آئینہ دکھلاتا ہے منظر ایسا بھی

صبا کا لمس ہے اقدامِ قتل سے بھی سوا،
کلی کے سینے پہ، رکھو نہ خنجر ایسا بھی

جو چہرہ چہرہ کھلے، ہونٹ ہونٹ مسکائے
کوئی تو خواب ہو آنکھوں کے اندر ایسا بھی

پیا[illegible] ہوں، کہ تشنگی نے مری
پلا دیا ہے مجھے اک سمندر ایسا بھی

زمانہ تیرہ نصیبوں کا درد پہچانے
کبھی تو سایہ پڑے روشنی پر ایسا بھی

کتاب مجھ پہ جو اتری، تو کفر اور بڑھا
ترے جہاں میں خیر اک پیمبر ایسا بھی

تجھے جو لفظ بھی ڈھونڈیں تو نامراد پھریں
اُتر نہ گہرے معانی کے اندر ایسا بھی

قلم کی لو پر سلگتا رہا جو ساری عمر،
فضا کے شہر میں ہے اک سخنور ایسا بھی

صدیق مجیبی

غزلیں

(احمد یوسف کیلئے)

یادوں کے جگنو پھرتے ہیں روح کے اندر جیسے!
شام پڑے روشن ہوتے ہیں گاؤں کے مندر جیسے

دوری اور مجبوری کا اندر د پُرانا ٹھہرا
تم بھی پیار کرو یوں مجھ سے چاند سمندر جیسے

شیتل چھاؤں میں بیٹھ کے ساری دل کی تھکن دھلی
راہ میں اب بھی مل جاتے ہیں پیڑ قلندر جیسے

اس کے پھول سے چہرے کو اک بوسے نے کیا رنگ دیا
اک دیئے سے کھل اٹھتا ہے مٹی کا گھر جیسے

مست پون۔ بارش کی رم جھم کیا کیا دھیان میں آیا
پگڈنڈی میں باج رہی ہو شوخ کی جھانجھر جیسے

آج اچانک یوں کمرے میں ہم کو ہوا محسوس
شام سلونی گھر آئی ہے، دلہن بن کر جیسے

دل میں کسی کا پیار مجتبیٰ یوں ہے خوف زدہ!
پھول کے سینے سے لپٹی ہو خوشبو ڈر کر جیسے!

عجیب عالم میں ہم بہم تھے۔ بدن لہو کے سرور میں تھا!
نہ رات اپنی سیاہیوں میں۔ نہ دن اجالوں کے نور میں تھا

زباں نشے میں تر بہ تر تھی کہ سانپ نے ڈس لیا تھا اسکو
نفس میں اک بین بج رہی تھی وجود تحت الشعور میں تھا

شفق کہ گلنار ہو چکی تھی۔ فضا کہ سرشار ہو چکی تھی
نگاہ و دل کا لطیف نغمہ سکوت لب کے ظہور میں تھا

دھنک کے جھولے میں دل کا موسم وصال کے گیت بن رہا تھا
مجھے تو یہ بھی خبر نہیں تھی کہ دور تھا یا حضور میں تھا

کسی کے پیکر میں ڈھل گیا تھا تمام تر رنگ و نور و نشہ
نہ ماہ و انجم کی آرزو تھی نہ ذہن حور و قصور میں تھا

میں تھک چکا جب تو اپنی کشتی بھنور کے خود ہی سپرد کر دی
ہزار طوفان تھے بادباں میں کھلا سمندر غرور میں تھا

رفیق کو کیوں رقیب کر لوں حکایت شب سنا کے اپنی
کہ شام سے تا سحر مجتبیٰ۔ نہ پوچھ کس کے حضور میں تھا

غزلیں

ڈاکٹر نریش

جھوٹی تسلیوں کی قبا دے گئے مجھے،
احباب تازہ زخم انا دے گئے مجھے

کیا کیا گلا تو نے جدائی کے موڑ پر
جاتے ہوئے وہ کیسی سزا دے گئے مجھے

کیا رند تھے کہ تشنہ لبی کے جواب میں
پیمانہ اک چھلکتا ہوا دے گئے مجھے۔

قصداً رہا خموش کہ بیدار تھا عزیز
لیکن یہ میرے اشک دغا دے گئے مجھے

اب میں ہوں اور شکست کا احساس ہے نریش
وہ کیا گئے کہ دشت بلا دے گئے مجھے،

مصور سبزواری

ہر آنکھ سر بریدہ یتیموں کی نہر ہے!
یہ شہر بے وفا وہی کوفے کا شہر ہے!

بچوں سے کہہ نہ چھو مناؤ اس لواح میں
ہر شیر خوار طفل کی باچھوں میں زہر ہے

سارے افق ہیں دست دعا سے لٹے ہوئے
پھیلاؤ ہاتھ لوگو کہ یہ پھیلا بہر ہے!

میں نے تو صرف کاٹی تھیں پیڑ کی انگلیاں
کیوں پور پور موت سی برفیلی لہر ہے!

میں ایک مردہ پیاس جو زندہ نہ ہو سکی
تو اب بھی ٹھاٹھیں مارنے دریا کی لہر ہے

ہم لمبے جنگلوں کی سی عمر دراز ہیں
سر پہ کسی بزرگ دعاؤں کا قہر ہے!

ڈاکٹر وی، آئی، لیو رشیدا حسینی

غزلیں

غم سے بیگانہ ہوا دل تو کدھر جائے گا!
روح سے ہو کے الگ جسم بکھر جائے گا
چارہ سازی کا نہیں، غم تو یہ ہے، میرے بعد
شعلہ بھڑکا ہوا، ہمسائے کے گھر جائے گا
کسی ٹھہرے ہوئے موسم کا بھروسہ کیا ہے
ایک واماندہ مسافر ہے گزر جائے گا
جذبۂ عشق کو قربت کی تمازت سے بچا
مثل سیماب ہواؤں میں بکھر جائے گا
ایک طرف شہر تمدن ہے تو اک سمت ہے دشت
جانے کس رُخ پہ نئی رت کا سفر جائے گا.
تو کیوں پشیماں ہے تو کشتیٔ انا لوٹ کے دیکھ
پیار باہنوں کے جزیرے میں اتر جائے گا
ایک لمحہ جو ترے ساتھ گزارا ہے ابھی
منجمد ہو کے ان آنکھوں میں ٹھہر جائے گا
رنگ میں خود کو مصور کے سمو دے رشیدا
اس سمندر میں جو ڈوبے گا ابھر جائے گا

شہپر رسول

کون ان کے بیاں سے چھوٹ گیا
جانے قصہ کہاں سے چھوٹ گیا
بچ کے جانے کا اب سوال کہاں
تیر اس کی زباں سے چھوٹ گیا
وہ ہے پتھریلے راستے کا نشاں
ساتھ سب کا وہاں سے چھوٹ گیا
گُل ہوا جب سے آرزو کا دیا
میں لہو کے زیاں سے چھوٹ گیا
جنگلوں نے کیا ہے کیا جادو
شہر لالہ رُخاں سے چھوٹ گیا
خالی آنے سے آخری "بس" کے
میں شہپرؔ گماں سے چھوٹ گیا

غزلیں

نشتر جعفری

یہ نہیں کہ صرف الفت ان کی قاتل ہو گئی
کچھ عداوت قبل کی بھی تھی جو شامل ہو گئی

سوزشِ عشق و جنوں نے دل کو صحرا کر دیا
خشک ہو کر کچھ زمیں دریا کی ساحل ہو گئی

عشوہ و ناز و ادا نے سخت پہرہ کر دیا
راہ کوئے حسن کی اب اور مشکل ہو گئی

جاں بچا کے ہر طرف سے آیا تیرے روبرو
یاں ادائے رخ ہی تیری دل کی قاتل ہو گئی

دیکھ کر پروانے پر حضرت پرویز کی
فطرت اہلِ سخن خاموش و کاہل ہو گئی

حق کو پہچانا نہیں سجدے غلط کرتے رہے
عمر بھر کی حشر میں محنت ہی باطل ہو گئی

اس قدر رسوا کیا نشتر کو تیری چاہ نے
اب طبیعت چاہنے والوں سے بد دل ہو گئی

ایاز جالنوی

ذرۂ ناچیز کو کس کا ہمسر کر دیا
میں کہ قطرہ بھی نہ تھا اک سمندر کر دیا

چند لمحوں کے لئے غم کی چاہت تھی مجھے
عمر بھر کیواسطے کیوں میسر کر دیا

طنزیہ کلمات نے، جبریہ حالات نے،
کان بہرے کر دیئے، دل کو پتھر کر دیا

دینے والے نے مجھے زندگی تو خوب دی
ہائے لیکن موت کا دن مقرر کر دیا

وقت نے ہر قافلہ منزلوں پر روک کر
سست رو کو تیز رو کے برابر کر دیا

پاسبانِ عقل نے چارہ جوئی بھی تو کی
وحشتِ دل نے مجھے گھر سے بے گھر کر دیا

اے ایاز اس کا کرم بھولجائیں کیسے ہم
اب خوشی دی جب مجھے غم کا خوگر کر دیا

اشفاق حسین کینڈا

رفاقتوں کے سائباں کھو گئے
بس اک میری ذات تھی سو رہ گئی

وہ صبح معتبر کے ہم خیال لوگ
یہ راستے، یہ لوگ بھی نئے سے ہیں

چراغ ہجر لے کے ان کو ڈھونڈ اب
تلاش بے نشاں میں عمر کٹ گئی

اندھیرے اس زمیں پہ چھاتے رہے

ترے قدم کے سب نشان کھو گئے
ہوا چلی تو بادبان کھو گئے،

کہاں یہ شام امتحان کھو گئے،
مری گلی کے سب مکان کھو گئے

جو تیری بزم کی تھے جان کھو گئے
زمیں ملی تو آسمان کھو گئے

نمودِ صبح کے نشان کھو گئے

اداسیاں بتا رہی تھیں گاؤں کی
کہ جنگ میں سبھی جوان کھو گئے

بدر اورنگ آبادی

مرے رفیق تم عہدِ کہن کی بات کرو
حصار توڑ کے صحنِ چمن کی بات کرو

کہانیاں نہ کبھی ختم زندگی صحرا کی
رکو، اور اک کے تم سرو و سمن کی بات کرو

محبس ہا ہوں نئی دھوپ کی تمازت سے
خدا کیواسطے گنگ و جمن کی بات کرو

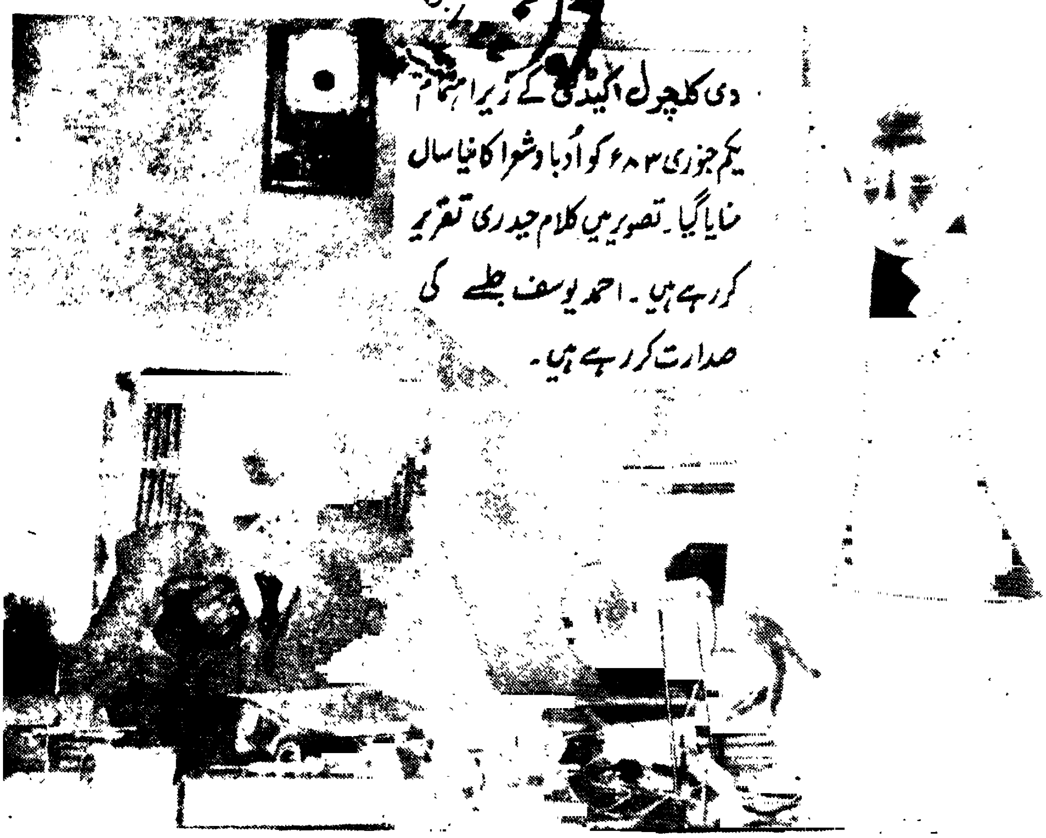
ابھی تو دن ہیں بہار کے پھول کھلنے کے
یہ کیا ستم ہے کہ دار و رسن کی بات کرو

ابھی بھی بدر کے زخموں کی ٹیس باقی ہے
مگر یہ ضد ہے کہ فکر و سخن کی بات کرو

R. N. Regd 4253/64
P. T. Regd No. Gy. 7
Phone—432

THE Aahang Urdu Monthly

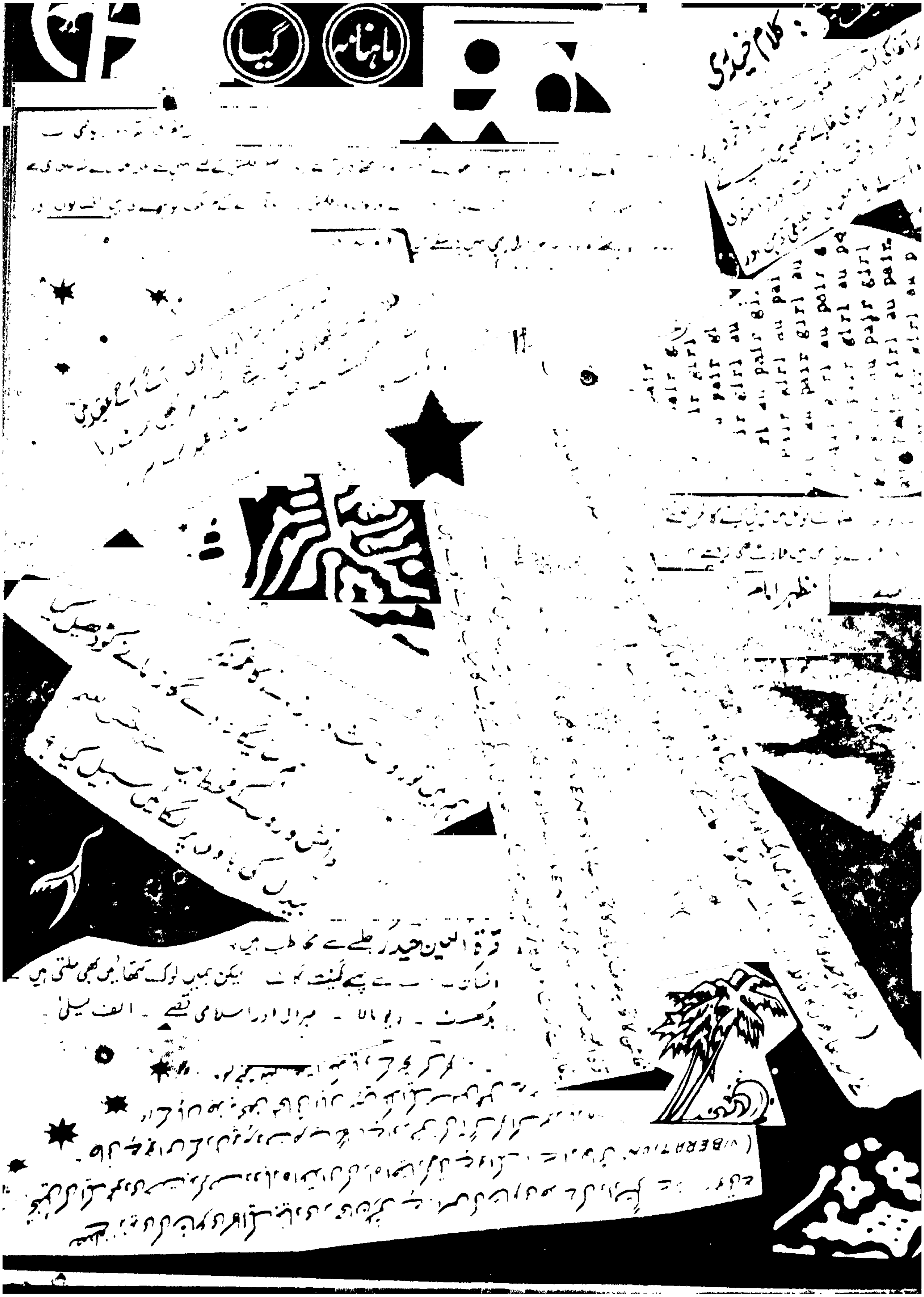
BAIRAGI, GAYA



دی کلچرل اکیڈمی کے زیر اہتمام
یکم جنوری ۸۳ء کو اُدبا و شعرا کا نیا سال
منایا گیا۔ تصویر میں کلام حیدری تقریر
کر رہے ہیں۔ احمد یوسف جلسے کی
صدارت کر رہے ہیں۔

uary 1983

Price-Rs. 2-00



ماہنامہ
گیا
کلام حیدری
girl au pair
قرۃ العین حیدر جلسے سے مخاطب ہیں

دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۷۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

بارہ شمارہ ——— چوبیس روپے
ایک شمارہ ——— ۲.۰۰ دو روپے

فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹر

نوشابہ حق

رفقاء ایڈیٹرز

شفق، عبدالصمد

کتابت: کلیم النقاسی ڈمری
طباعت: ہندوستان پریس گیا

محتویات

غزلیں

تبصرے

کشکول

آہنگ کا یہ شمارہ ہم پیش کرتے ہوئے اس بات کی مسرت ہے کہ وقت پر اسے شائع کر سکے ہیں۔ یہ اس لئے ہو سکا ہے کہ آہنگ سے منسلک کام کرنے والوں نے خاص توجہ کی۔ اور اس لئے اب توقع کی جاسکتی ہے کہ ہر ماہ وقت پر آہنگ قارئین تک پہونچ سکے گا۔

"آہنگ" ہم قارئین کی خدمت میں بڑی احتیاط کے ساتھ روانہ کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہمارے پاس خطوط آتے ہیں کہ پرچہ نہیں ملا۔ اور نتیجے میں دوبارہ، سہ بارہ بھیجنا پڑتا ہے۔ اس گرانی کے زمانے میں یہ ممکن نہیں ہے۔ کہ ہم سو دو سو کاپیاں زیادہ چھاپ کر رکھیں۔ اس لئے ہم مجبوراً دوبارہ پرچہ نہیں بھیج پاتے۔ دراصل ادھر کچھ عرصے سے ڈاک کا نظم اتنا خراب ہو گیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ لفافوں پر لگے ٹکٹ اکھاڑ لئے جاتے ہیں لطیفے کے طور پر یہ بات بھی مشہور ہے کہ سردی بہت پڑ رہی ہو تو سو لفافے، پوسٹ کارڈ وغیرہ کو جلا کر آگ تاپی جاتی ہے یہ صحیح نہ بھی ہو، تو یہ کم از کم صحیح ہے کہ ڈاکخانے ذمہ داری کو نبھا نہیں رہے ہیں۔ یہ صورت حال کم و بیش ہر شعبے کی ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں ہمارے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت غیر ذمہ داری کیوں ہو گئی ہے۔ اور آخر اس کا علاج کب ہوگا اور کیسے ہوگا؟

بہار اردو اکیڈمی پٹنہ نے جناب کلام حیدری ——— اور چند اور ادیبوں، شاعروں کو اردو زبان و ادب کی خدمات کی قدر کرتے ہوئے ایوارڈ دینے کا اعلان کیا ہے۔

دی کلچرل اکیڈمی گیا کے صدر کلام حیدری کی ادبی خدمات کی قدر دانی ایک طرح سے کلچرل اکیڈمی کی خدمات کا اعتراف ہے جس کیلئے کلچرل اکیڈمی بہار اردو اکیڈمی کی ممنون ہے۔

(نتاس)

اس شمارے میں احمد یوسف کا مقالہ محققین کے لئے خاصے کی چیز ہے۔ احمد یوسف خاموش طبیعت اور فقیرانہ روش کے ساتھ اپنی زبان اور ادب کی خدمت کرنے والوں میں ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ تحقیقی میدان میں ان کے کارناموں سے ادبی حلقے ہندو پاک میں واقف ہیں۔ ہمیں بہار اردو اکیڈمی سے یہ مطالبہ کرتے ہوئے کوئی باک نہیں ہے کہ وہ احمد یوسف کی خدمات کی قدر دانی کی طرف توجہ کرے۔ اور پٹنہ میں ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھائے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم پر کئی اہم کتابوں پر تبصروں کا قرض باقی رہ گیا ہے۔ ان میں "خدابخش جرنل" کا قرض بڑا اہم ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے خدابخش خاں لائبریری کو ایک زندہ تحریک بنا دیا ہے اس کی ایک نئی عمارت بن کر تیار ہے۔ جس کا افتتاح صدر ہندوستان ۲ر فروری کو کرنے والے ہیں جناب عابد رضا بیدار کو ہم ان کے کارناموں کے لیے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

احمد یوسف

ایک بڑا عالم اور نادر محقق ــــ فصیح الدین بلخی

آج میں ایک ایسی شخصیت کو احاطہ تحریر میں لے رہا ہوں۔ جو سراپا عمل تھی۔ اور جسے نہ ستائش کی تمنا تھی، نہ صلے کی پرواہ۔

ان دنوں بھی مرادپور سے یونیورسٹی کے مقابل فٹ پاتھ پر کباڑی کتاب کی دوکانیں سجائے بیٹھا کرتے تھے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا کہ فصیح الدین بلخی صاحب کوٹ اور پینٹ میں ملبوس دوکان کے آگے فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھے ہیں عینک پیشانی کی بلندیاں چھو رہی ہیں۔ اور وہ کسی پرانے نسخے میں گم ہیں۔

یہاں اکثر بڑے کام کی اور نادر چیزیں مل جاتی ہیں بھئی" میرے استفسار پر وہ جواب دیتے۔ میں کچھ دیر ان کے ساتھ اسی انداز میں بیٹھا رہتا پھر علیک سلیک کے بعد میں اٹھ کر آگے کی طرف چل دیتا۔ اور وہ دوبارہ اپنے نسخے میں ڈوب جاتے۔

میں نے غلط کہا۔ آگے کی طرف تو وہ جا رہے تھے۔ میری منزل تو زیادہ سے زیادہ سبزی باغ ہوا کرتی۔ جہاں کچھ دیر ٹھہر کر اور لوگوں سے مل ملا کر میں گھر لوٹ جاتا۔ گہرا نقش تو ایسے ہی لوگ چھوڑتے ہیں۔ جن کی علم کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔ بلخی صاحب کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا کہ ان کی علم کی پیاس کبھی نہیں بجھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بے حد گراں قدر کام کیا۔ ان کی ایسی تحریریں جو بظاہر غیر اہم نظر آتی ہیں۔ ان کے بعد آنے والوں کے لئے ایک بے حد اہم SOURCE MATERIAL ثابت ہوں گی۔

بلخی صاحب کا خیال تھا کہ جو بھی مواد ملے جمع کر لینا چاہئے۔ یہی مواد کل کلاں کسی بڑے کام کے لئے انتہائی بیش بہا شے قرار پائے گا۔ یہی وہ رجحان ہے جو ہمیں محنت اور عمل پیہم کی ترغیب دیتا ہے۔ یوں بلخی صاحب کی حیثیت ایک رجحان ساز (TREND SETTER) کی تھی۔ میرے خیال میں دانشور کی صحیح تعریف یہ ہونی چاہیے کہ وہ TREND SETTER ہو۔

ان کے اکلوتے صاحبزادے نادم بلخی میرے ایسے دوستوں میں ہیں جنہیں صحیح معنوں میں ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز کہا جا سکتا ہے۔

گھر وہ تھا جس میں کبھی علی عباسی حسینی رہا کرتے تھے یہ گھر پٹنہ سیٹی میں محمڈن اسکول کی پشت پر ایک گلی میں واقع تھا۔

شام کا وقت ہے میں آواز دے رہا ہوں۔

نادم صاحب!

نادم صاحب!

دوسری آواز کے بعد ایک کمرے کا دروازہ کھلتا

اور بلخی صاحب اپنی عینک کا زاویہ درست کرتے ہوئے باہر نکلتے ہیں۔

"کون ہے بھئی! اچھا اچھا آپ ہیں۔"

"آیئے آیئے!"

"ابراہیم (نادم) تو ابھی کالج سے نہیں لوٹے ہیں، بیٹھئے اب آنے ہی ہوں گے۔"

اسی کے بعد وہ ان کاموں کے متعلق گفتگو شروع کر دیتے، جو ان دنوں ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ پھر سنہرشن سگریٹ کا پیکٹ کھولتے۔ اور میری طرف بڑھاتے۔ میں نے ان کے سامنے کبھی سگریٹ نہ پیا۔ لیکن ان کی یہ ایک وضع تھی کہ میرے آگے پیکٹ ضرور بڑھاتے تھے۔ اور ہر بار یہ ہوتا کہ میں انہیں جھک کر سلام کرتا اور کہتا کہ "حضور میں نہیں پیتا ہوں"

اسی کے بعد وہ سگریٹ کو ہونٹوں میں دبا کر جلاتے اور پھر پہلے کش، کے بعد سگریٹ کو پہلی دو انگلیوں میں آگے کی جانب اس طرح دباتے کہ محسوس ہوتا سگریٹ اب گری اور تب گری۔

کمرے میں ایک دفتر تو وہ ہوتا جسے بلخی صاحب اپنی گفتگو کے دوران کھولتے اور بند کرتے دکھائی دیتے۔ اور دوسرا دفتر وہ ہوتا جو کتابوں کی متعدد الماریوں میں مقفل ہوتا۔ اور اس کے علاوہ تخت پر، بستر پر، میز پر اور کرسیوں پر بکھرا رہتا۔

پھر چائے آتی، اور کوئی گھنٹے بھر بعد نادم خود بھی آجاتے، اور تب بلخی صاحب اپنے کسی پوتے کو گود میں لے کر اندر کی طرف چلے جاتے۔

فصیح الدین بلخی انیسویں صدی کے اواخر کے آدمی تھے۔ (پیدائش ۱ فروری ۱۸۸۰ء) انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے امتیازی شان سے انٹر پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ والد کی وفات کے سبب تعلیم جاری نہیں رکھ سکے۔

۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء تک پونا ملیٹری اسکول میں معلم رہے۔ پھر ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک فورٹ ولیم کالج میں معلمی کی۔ اس کے بعد جزیرۂ فجی کی عدالت عالیہ میں بحیثیت مترجم بحال ہوئے، لیکن خرابی صحت کی بنا پر وہاں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے۔ اور وطن واپس آگئے۔ یہاں کوآپریٹو کورس کا امتحان دے کر ملازمت شروع کی۔

فوجی ملازمت کے سلسلے میں پہلی جنگ عظیم میں سیر مصر، فلسطین، بیروت، دمشق، اور بیت المقدس وغیرہ میں رہے۔ وہاں سے واپس آئے تو سب ڈپٹی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں عدم تعاون کی تحریک سے متاثر ہو کر اس نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ کئی برسوں تک سخت معاشی بحران میں مبتلا رہے۔ بالآخر ۱۹۲۶ء میں ریاست سرائے کیلا میں REVENUE OFFICER اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے بحال ہوئے، اور وہاں سے ۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہونے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی میں شعبہ مخطوطات کے ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں وہاں سے بھی ریٹائر ہو گئے۔ ۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء میں انتقال ہوا۔

ان کی تصنیفات کی تفصیل درج ذیل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے مطبوعہ تصنیفات کا ذکر کیا جائے۔

تاریخ مگدھ

یہ کتاب سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند نمبر ۲۰۵ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں خصوصیت سے آنجہانی سر تیج بہادر سپرو اور بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان حضرات سے بلخی صاحب کے گہرے مراسم تھے۔

کتاب ۱۰ × ۵ کی تقطیع پر ہے۔ اور اس میں کل ۹۶۴ صفحات ہیں۔ کتاب میں ۲۰ ابواب ہیں۔ اور اس کا مقدمہ خود بلخی صاحب نے لکھا ہے۔

تاریخ مگدھ سنہ ۶۴۳ ق م سے شروع ہو کر سنہ ۱۹۴۳ء پر ختم ہوئی ہے۔ صوبہ بہار کی اس تاریخ کا پہلا باب ابتدائی حالات سے نند خاندان کی تاریخ پر ختم ہوتا ہے کتاب میں مجموعی طور پر بیس CHAPTERS ہیں

باب اول

(۱) ابتدائی حالات (۲) مگدھ کے راجہ جراسندھ کے متعلق مہابھارت کا بیان (۳) مسلمانوں کی تاریخوں میں بعض روایتیں (۴) راجہ سین ناگ سنہ ۶۴۲ ق م (۵) راجہ بیمبسار سنہ ۵۸۲ ق م تا سنہ ۵۵۴ ق م (۶) مہاتما گوتم بدھ (۷) جین دھرم کے بانی مہابیرجی کا حال، بدھ اور جین دھرم کا اختلاف (۸) راجا اجات سترو سنہ ۵۵۴ ق م تا سنہ ۵۲۶ ق م، (۹) پاٹلی پترا کی بنا اور وجہ تسمیہ (۱۰) راجا درسکا ۵۲۶ ق م تا سنہ ۵۰۳ ق م، (۱۱) راجہ اودے سنہ ۵۰۳ ق م تا سنہ ۴۶۹ ق م، (۱۲) راجہ نندی وردھنا اور مہانندی سنہ ق م تا سنہ ۴۱۲ ق م، (۱۳) نند خاندان کا حال سنہ ۴۱۳ ق م تا سنہ ۳۲۱ ق م (۱۴) آنند راجہ کے متعلق یونانی تاریخ کا بیان۔

باب دوئم، موریہ خاندان کی حکومت

سنہ ۳۲۲ ق م تا سنہ ۱۸۳ ق م

(۱) راجہ چندرگپت موریہ سنہ ۳۲۲ ق م تا سنہ ۲۹۹ ق م (۲) پاٹلی پترا کے متعلق یونانیوں کا بیان (۳) وار الحکومت پاٹلی پترا کا انتظام اور چندرگپت کے باقی حالات (۴) راجہ بندوسار امتراگھات سنہ ۲۹۸ ق م تا سنہ ق م (۵) راجہ اشوک سنہ ق م تا سنہ ۲۳۲ ق م، (۶) اشوک کی یادگاریں، (۷) اشوک کی مدت حکومت کے متعلق ایک نکتہ (۸) اشوک کے ورثا و جانشین، (۹) راجہ دسرتھ سمپتی، اور برہدرتھ سمپتی سنہ ۲۳۲ ق م سے سنہ ۱۸۴ ق م۔

باب سوئم

سونگا اور کانوا خاندان کے زمانے سے آندھرا کی حکومت کے بعد سنہ تک

(۱) پشیامتر سونگا سنہ ۱۸۵ ق م تا سنہ ۱۴۹ ق م، (۲) پشیامتر سونگا کے جانشین سنہ ۱۴۹ ق م سے سنہ ق م تک۔ (۳) کانوا خاندان کی حکومت سنہ ق م سے سنہ ۲۳ ق م تک (۴) مگدھ میں آندھرا کی حکومت (۵) سنہ ۲۷ ق م تا سنہ تک کا حال۔

باب چہارم

گپت خاندان کی حکومت سنہ تا سنہ ۳۱۹

(۱) راجہ گپت اور گھٹوت کچھ سنہ ۲۷۱ تا سنہ ۳۱۹ء (۲) راجہ چندرگپتا سنہ ۳۱۹ تا سنہ ۳۳۰ء (۳) راجہ سمدرگپتا سنہ ۳۳۰ سے سنہ تک (۴) راجہ چندرگپتا بکرماجیت سنہ ۳۳ تا سنہ ۴۱۲ء (۵) فاہیان چینی کا بیان سنہ تا سنہ ۴۱۳ (۶) راجہ کمارگپتا (۷) راجہ سکندگپتا سنہ ۴۵۵ تا سنہ ۴۶۷ء (۸) راجہ پورگپتا سنہ ۴۶۷ (۹) راجہ نرسنگھ بالادت گپتا۔ سنہ تا سنہ ۴۷۳ (۱۰) نالندہ کی تعلیم گاہ (۱۱) راجہ کمار گپتا ثانی اور بدھ گپتا سنہ ۴۷۳ تا سنہ ۵۳۴ء (۱۲) گپت خاندان کا آخری دور (۱۳) مگدھ میں شہنشاہ چین کا وفد۔

باب پنجم

بت شکنی راجہ ساسانیکا کے حملے اور ۷۳۰ء تک کے متفرق حالات۔

(۱) بت شکنی برہمن راجہ ساسانیکا کے حملے ۶۰۶ء (۲) راجہ ہرش وردھن ۶۰۶ء تا ۶۴۷ء۔ (۳) ہوان چوانگ چینی یاتری کا بیان (۴) پاٹلی پترا کا آخری منظر (۵) اشوک کا جنم (۶) راجہ ارجن اور چینی کا دوسرا وفد (۷) ترہت کا محاصرہ، ارجن کی گرفتاری اور نیپالیوں کا راج (۸) ۶۵۰ء تا ۷۳۰ء، عام کیفیت

باب ششم

پال خاندان کی حکومت ۷۳۰ء تا ۱۱۹۷ء

(۱) راجہ گوپال ۷۳۰ء تا ۷۴۰ء (۲) مگدھ کا نام بہار ہونا۔ (۳) راجہ دھرم پال ۷۴۰ء تا ۷۹۲ء (۴) راجہ دیو پال اور اس کے اثرات ۸۰۵ء تا ۹۸۰ء (۵) کمبوج راجہ (۶) مہی پال اول ۹۸۰ء تا ۱۰۳۰ء (۷) نیپال اور دگرہ پال ۱۰۳۰ء تا ۱۰۸۰ء (۸) مہی پال دوئم ۱۰۸۰ء تا ۱۰۸۴ء (۹) راجہ رام پال ۱۰۸۴ء تا ۱۱۳۰ء (۱۰) پال خاندان کے آخری راجاؤں کا حال (۱۱) بنگالے کے سین راجاؤں کا مختصر حال۔

باب ہفتم

(اقطاع بہار میں اسلامی حکومت کا آغاز)

(۱) قدیر بہار میں مسلمانوں کی سکونت (۲) اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی ۱۱۹۲ء تا ۱۲۰۶ء (۳) عزالدین محمد شیران ۱۲۰۶ء تا ۱۲۰۷ء (۴) قائماز رومی ۱۲۰۷ء تا ۱۲۰۸ء (۵) علی مردان خلجی ۱۲۰۸ء سے ۱۲۱۰ء تک (۶) حسام الدین عوض حسین متلقب بہ غیاث الدین ۱۲۱۰ء تا ۱۲۲۶ء (۷) علاء الدین جانی ۱۲۲۷ء (۸) ناصر الدین التمش اور سلطان غیاث الدین عوض حسین ۱۲۲۶ء (۹) عزالملک علاء الدین جانی ۱۲۲۹ء تا ۱۲۳۱ء (۱۰) ملک سیف الدین ایبک ۱۲۳۱ء تا ۱۲۳۳ء (۱۱) عزالدین طغرل طغان خاں ۱۲۳۳ء تا ۱۲۴۳ء (۱۲) قمر الدین سالار خاں ۱۲۴۳ء تا ۱۲۴۵ء (۱۳) اختیار الدین ایبک طغرل طغان خاں ۱۲۴۶ء تا ۱۲۵۵ء (۱۴) جلال الدین مسعود جانی عزالدین بلبن، ارسلان خاں سنجر اور تاتار خاں (۱۵) مغیث الدین طغرل تا ۱۲۸۱ء

باب ہشتم

بہار بنگالے میں خاندان بلبن کی حکومت

(۱) سلطان ناصر الدین بغرا خاں ۱۲۸۲ء تا ۱۲۹۱ء (۲) ناصر الدین بغرا کی اولاد (۳) حکومت بنگالہ کے متعلق ابن بطوطہ کا بیان (۴) رکن الدین کیکاؤس ۱۲۹۲ء تا ۱۳۰۲ء (۵) شمس الدین فیروز ۱۳۰۳ء سے ۱۳۲۱ء (۶) ناصر الدین کا ذکر اور ایک تاریخی غلطی کا ازالہ (۷) غیاث الدین بہادر شاہ بھورا ۱۳۱۰ء تا ۱۳۳۳ء (۸) ترہٹ کے سفر سے ایک مشہور مجاور سے کا تعلق۔

باب نہم

بہار و بنگالے میں طائف الملوکی اور آزادانہ حکومت کا آغاز۔

(۱) ملک بیدار خلجی ۱۳۲۵ء تا ۱۳۳۹ء مورخہ ۱۳۲۵ء تا ۱۳۳۹ء (۲) علاء الدین علی شاہ ۱۳۳۹ء تا ۱۳۴۵ء (۳) مورخوں کا اختلاف (۴) نشتر گربہ کی کیفیت (۵) علی مبارک اور حاجی الیاس کے متعلق ریاض السلاطین کا بیان (۶) حاجی الیاس متلقب بہ سلطان بھنگرہ ۱۳۴۵ء تا ۱۳۵۱ء (۷) ملک ابراہیم جیو۔ ۱۳۵۱ء تا ۱۳۵۲ء (۸) سکندر بن الیاس شاہ ۱۳۵۹ء تا ۱۳۹۰ء (۹) فیروز تغلق کا بہار کی راہ سے سفر کرنا (۱۰) بہار کا سلطان دہلی کے زیر اثر رہنا (۱۱) سلطان غیاث الدین اعظم شاہ ۱۳۹۰ء تا ۱۳۹۸ء (۱۲) سلطان غیاث الدین اور حافظ شیرازی (۱۳) اعظم شاہ اور قاضی سراج الدین (۱۴) غیاث الدین اعظم شاہ کی اولاد (۱۵) راجہ کانس اور اعظم شاہ

کے متعلق اسٹینین کا بیان (۱۶) ملک کافی ضیاء الحق اور خواص الملک کا ذکر۔

باب دہم

(بہار میں سلاطین شرقیہ کی حکومت)

(۱) ملک الشرق خواجہ جہاں ۱۳۹۳ء تا ۱۳۹۹ء (۲) مبارک شاہ شرقی تا ۱۴۰۱ء (۳) ابراہیم شاہ شرقی ۱۴۰۱ء تا ۱۴۴۰ء (۴) محمود شاہ شرقی ۱۴۵۸ء (۶) حسین شاہ شرقی ۱۴۷۹ء (۷) حسین شاہ شرقی اور سکندر لودی ۱۴۹۶ء تا ۱۵۰۱ء (۸) زکوٰۃ اور زیارت مزار کے متعلق سکندری لودی کا حکم (۹) حسین شرقی کا باقی حال (۱۰) سکندر لودی کے زمانے میں بعض قابل ذکر واقعات۔

باب یازدہم

(بہار میں پٹھانوں کی حکومت)

(۱) پٹھان کی وجہ تسمیہ (۲) دریا خاں لوحانی ۱۴۹۹ء تا ۱۵۱۷ء (۳) بہادر خاں ملقب بہ محمد شاہ ۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۴ء (۴) بابر کی آمد اور جنگ ۱۵۲۹ء (۵) جلال خاں لوحانی ۱۵۳۱ء تا ۱۵۳۹ء (۶) فرید الدین خاں ۱۵۲۶ء تا ۱۵۴۷ء (۷) شیر خاں ہمایوں، محمود لودی اور سلطان محمد دوانی (۸) قلعہ پٹنہ کی تعمیر ۱۵۴۵ء (۹) شیر شاہ کی موت اور اس کے ورثا کا حال (۱۰) شجرۂ خاندان شیر شاہ سوری (۱۱) شیخ علائی اور شیخ بدہ طبیب (۱۲) سلیمان خاں کرارانی ۱۵۶۳ء تا ۱۵۷۲ء (۱۳) بایزید خاں ۱۵۷۲ء (۱۴) داؤد خاں ۱۵۷۲ء تا ۱۵۷۶ء۔

باب دوازدہم

بہار میں شہنشاہ اکبر کی حکومت ۱۵۷۶ء تا ۱۶۰۵ء

(۱) پٹنہ بدست اکبر (۲) حاجی پور کی فتح (۳) داؤد خاں کا فرار اور اکبر کا تعاقب (۴) پنج پہاڑی کا ذکر۔ (۵) منعم خانخاناں ۱۵۷۴ء تا ۱۵۷۵ء (۶) داؤد خاں کی ملاقات اور خانخاناں سے صلح (۷) خانخاناں کی موت (۸) حسین قلی خاں خان جہاں ۱۵۷۵ء تا ۱۵۷۸ء (۹) مظفر خاں تربتی ۱۵۷۹ء تا ۱۵۸۰ء (۱۰) بہار اور بنگال میں بغاوت (۱۱) معصوم خاں کابلی کی بغاوت ۱۵۸۰ء تا ۱۵۸۱ء (۱۲) خان اعظم مرزا عزیز کوکا ۱۵۸۲ء تا ۱۵۸۳ء (۱۳) شہباز خاں ۱۵۸۴ء تا ۱۵۸۸ء (۱۴) انگریز سیاح کا ذکر (۱۵) راجہ مان سنگھ ۱۵۸۹ء تا ۱۶۰۵ء (۱۶) سعید خاں مغل کا ذکر (۱۷) آصف خاں جعفر ۱۶۰۴ء۔

باب سیزدہم

جہانگیر کا دور ۱۶۰۵ تا ۱۶۶۵

(۱) قطب الدین کوکاتاش ۱۶۰۱ء (۲) شریف خاں ۱۶۰۳ء تا ۱۶۰۴ء (۳) جہانگیر قلی خاں اول ۱۶۰۵ء تا ۱۶۰۶ء (۴) نواب اسلام خاں ۱۶۰۶ء (۵) افضل خاں ۱۶۰۷ء تا ۱۶۱۱ء (۶) پٹنہ میں جعلی خسرو کا ہنگامہ ۱۶۱۰ء (۷) ظفر خاں ۱۶۱۲ء تا ۱۶۱۳ء (۸) ابراہیم فتح جنگ ۱۶۱۲ء تا ۱۶۱۴ء (۹) راجہ دولا فرزند لیبر سنگرام (۱۰) فتح ولایت کھوکرہ اور ہیرے کی کان (۱۱) جہانگیر قلی خاں دوم ۱۶۱۶ء تا ۱۶۱۸ء (۱۲) مقرب خاں ۱۶۱۹ء تا ۱۶۲۰ء (۱۳) پٹنہ انگریز تاجروں کی آمد (۱۴) شاہزادہ پرویز ۱۶۲۲ء تا ۱۶۲۵ء (۱۵) بہار پر خرم کا باغیانہ قبضہ ۱۶۲۴ء تا ۱۶۲۵ء (۱۶) مرزا رستم صفوی۔

باب چہاردہم

شاہ جہاں کا دور ۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء

(۱) خان عالم ۱۶۲۷ء (۲) سیف خاں مرزا صافی ۱۶۲۸ء تا ۱۶۳۲ء (۳) تربیت کے دو عجیب برہمن شاگرد (۴) عبد اللہ خاں فیروز جنگ ۱۶۳۲ء تا ۱۶۴۳ء (۵) فتح جو

۱۶۳۲ء (۶) پٹنہ میں پیٹر منڈی تاجر کی آمد (۷) نواب شائستہ خاں (۸) اعظم خاں (۹) میر محمد باقر خاں ۱۶۴۲ء تا ۱۶۴۴ء (۱۰) سعید خاں ۱۶۴۵ء (۱۱) عبد الملک جعفر خاں ۱۶۵۱ء تا ۱۶۵۳ء (۱۲) اللہی خاں ۱۶۵۳ء تا ۱۶۵۸ء (۱۳) بہار میں دارالشکوہ، شجاع اور اورنگ زیب کے معرکے۔

باب پانزدہم

اورنگ زیب کا عہد ۱۶۶۰ء تا ۱۷۰۶ء

(۱) داؤد خاں قریشی ۱۶۶۰ء تا ۱۶۶۵ء (۲) پلاموں کی فتح ۱۶۶۱ء (۳) داؤد خاں کے زمانے کے قابل ذکر واقعات (۴) فتح پلاموں مع اور اہل پلاموں کا کچھ حال (۵) دو یورپین سیاح کا بیان (۶) لشکر خاں ۱۶۶۶ء تا ۱۶۶۸ء (۷) ابراہیم خاں ۱۶۶۸ء تا ۱۶۷۲ء (۸) امیر خاں ۱۶۷۳ء تا ۱۶۷۵ء (۹) تربیت خاں ۱۶۷۵ء تا ۱۶۷۷ء (۱۰) شہزادہ اعظم ۱۶۷۷ء تا ۱۶۷۸ء (۱۱) سیف خاں، وصفی خاں ۱۶۷۹ء تا ۱۶۸۳ء (۱۲) بزرگ امید خاں ۱۶۸۵ء تا ۱۶۹۴ء (۱۳) فدائی خاں ۱۶۹۵ء تا ۱۷۰۱ء (۱۴) شمشیر خاں ۱۷۰۱ء تا ۱۷۰۳ء (۱۵) شاہزادہ محمد عظیم ۱۷۰۲ء تا ۱۷۰۵ء (۱۶) پٹنہ کا عظیم آباد ہونا ۱۷۰۲ء۔

باب شانزدہم

سلاطین مغلیہ کے ورثا کا دور ۱۷۰۷ء تا ۱۷۴۳ء

(۱) حسین علی خاں بہادر اور فرخ سیر ۱۷۰۸ء تا ۱۷۱۱ء (۲) فرخ سیر کا عظیم آباد میں جلوس ۱۷۱۱ء (۳) میر جملہ قاضی عبد اللہ جوازی (۴) سر بلند خاں ۱۷۱۵ء تا ۱۷۱۸ء (۵) دھر زمین دار کی بغاوت اور قتل (۶) نظام الملک کا نامزد ہونا (۷) عقیدت خاں ۱۷۲۱ء تا ۱۷۲۲ء (۸) نواب فخر الدولہ ۱۷۲۵ء تا ۱۷۳۳ء

باب ہفت دہم

۱۰ بہار کا بنگالے میں شامل ہونا

(۱) شجاع الدین رسد جنگ ۱۷۳۱ء تا ۱۷۳۹ء (۲) علی وردی خاں مہابت جنگ ۱۷۳۳ء تا ۱۷۴۰ء (۳) سرفراز خاں کا قتل ۱۷۴۰ء (۴) زین الدین احمد خاں، ہیبت خاں ۱۷۴۰ء تا ۱۷۴۸ء (۵) بھوجپور پر ہیبت جنگ کی فوج کشی، (۶) روشن خاں تراب کا قتل۔ (۷) مرہٹوں کا زغرا اور ہیبت جنگ کا بنگالہ جانا ۱۷۴۲ء تا ۱۷۴۲ء (۸) محمد شاہ سے کمک کی درخواست (۹) عظیم آباد میں صفدر جنگ کی آمد (۱۰) بالاجی راؤ مرہٹہ کی آمد (۱۱) ہیبت جنگ کی واپسی اور ہدایت علی خاں کا برطرف ہونا ۱۷۴۳ء (۱۲) عظیم آباد کے حصار گلی کی مرمت (۱۳) ببر جنگ کی بغاوت ۱۷۴۵ء (۱۴) گر صن د آرہ کی جنگ ببر جنگ کا مارا جانا۔ (۱۵) محب علی پور کی جنگ ۱۷۴۵ء (۱۶) پٹھانوں کی شورش اور ہیبت جنگ کا قتل۔ (۱۷) جنگ مقام رانی سرائے ضلع پٹنہ ۱۷۴۸ء (۱۸) آمنہ بیگم زوجہ ہیبت جنگ کی رہائی (۱۹) شمشیر خاں کے اہل و عیال کے ساتھ مہابت جنگ کا سلوک (۲۰) جانکی رام نائب صوبیدار ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۱ء (۲۱) پٹنہ میں سراج الدولہ کا ہنگامہ (۲۲) راجہ رام نرائن موزوں کی صوبیداری ۱۷۵۳ء تا ۱۷۶۳ء (۲۳) سراج الدولہ کی حکومت ۱۷۵۶ء تا ۱۷۵۷ء (۲۴) شوکت جنگ کی شکست اور قتل ۱۷۵۶ء

باب ہژدہم

حکومت میں انگریزوں کا دخل و رسوخ

(۱) سراج الدولہ کی ہار اور قتل ۱۷۵۷ء (۲) انگریزی فوج کا عظیم آباد آنا ۱۷۵۷ء (۳) میر جعفر کی امارت ۱۷۵۷ء تا ۱۷۶۰ء (۴) میر جعفر اور رام نرائن موزوں نائب ناظم (۵) بعض خیر و خیریت کا ذکر (۶) مرزا شمس الدین اور کلالو کے گدھے کا لطیفہ (۷) شہزادہ علی گوہر اور جنگ عظیم آباد ۱۷۵۹ء (۸) شہزادے کا

بادشاہ ہونا۔ رام نرائن اور انگریزوں کی شکست سنہ ۱۷۶۰ء (۹) قلعہ عظیم آباد پر شاہ عالم کا دوسرا حملہ اور شکست سنہ ۱۷۶۰ء (۱۰) میرپور کی جنگ سنہ ۱۷۶۰ء (۱۱) خادم حسین کا تعاقب اور میرن کی موت (۱۲) میر جعفر کی معزولی اور میر قاسم کی امارت سنہ ۱۷۶۱ء تا سنہ ۱۷۶۳ء (۱۳) جنگ سیوان اور پٹنہ میں شاہ عالم کی تاج پوشی سنہ ۱۷۶۱ء (۱۴) رام نرائن اور میر قاسم کا معاملہ (۱۵) بہار کے جنوبی علاقے اور بھوجپور کا انتظام (۱۶) میر قاسم کی طرز حکومت اور حسن تدبیر (۱۷) بتیا سے نیپال کی طرف فوج کشی (۱۸) عالی جاہ اور انگریزوں کی مخالفت سنہ ۱۷۶۳ء (۱۹) قلعہ پٹنہ پر انگریزوں کا قبضہ ہونا اور اسی دن بے دخل ہونا سنہ ۱۷۶۳ء (۲۰) میر جعفر کی دوبارہ مسند نشینی اور عالی جاہ اور انگریزوں کی جنگ سنہ ۱۷۶۳ء (۲۱) رام نرائن کا قتل سنہ ۱۷۶۳ء (۲۲) انگریز اسیروں کا قتل سنہ ۱۷۶۳ء (۲۳) عالی جاہ کا بہار سے نکلنا سنہ ۱۷۶۳ء (۲۴) عالی جاہ، نواب، وزیر اور بادشاہ سنہ ۱۷۶۴ء (۲۵) آخری جنگ عظیم آباد سنہ ۱۷۶۴ء (۲۶) بکسر کی جنگ سنہ ۱۷۶۴ء (۲۷) عالی جاہ کی تباہی اور موت (۲۸) میر جعفر کی وفات اور اس کے جانشینوں کا حال

باب نوزدہم

انگریزی حکومت ...... سنہ ۱۷۶۵ء تا سنہ ۱۸۵۸ء

(۱) انگریزی کمپنی کو دیوانی ملی اور لارڈ کلائیو کا نظم (۲) بہار میں دیوانی اور نظم کونسل کا انتظام سنہ ۱۷۶۵ء تا سنہ ۱۷۷۰ء (۳) قحط سنہ ۱۷۷۰ء (۴) نظامت کے متعلق کونسل کی تحقیقات سنہ ۱۷۷۰ء (۵) دیوانی کا براہ راست انتظام، مظفر جنگ اور شتاب رائے پر الزام سنہ ۱۷۷۱ء تا سنہ ۱۷۷۲ء (۶) کلیان سنگھ کا برخواست ہونا اور صوبے دار کا معتمد (۷) راجہ چیت سنگھ والی بنارس کی بغاوت (۸) ذبح کا ر خانے کی ضبطی سنہ ۱۷۸۱ء (۹) غلہ اور اجناس کا نرخ (۱۰) ترہت میں نیل کی کاشت سنہ ۱۷۸۲ء (۱۱) تعہد ٹوٹنے پر علاقوں کا بندوبست (۱۲) قحط کے اثرات (۱۳) گول گھر کی تعمیر سنہ ۱۷۸۶ء (۱۴) ضلع بہار مقرر ہونا سنہ ۱۷۸۷ء (۱۵) بہار میں زمینداریاں اور دوامی بندوبست (۱۶) پروونشل کورٹ (۱۷) ترہت اور چمپارن میں انگریز اور گورکھوں کا معاملہ سنہ ۱۷۸۹ء تا سنہ ۱۸۱۶ء (۱۸) کاشت کاری اور عام حالات کی تحقیقات سنہ ۱۸۰۷ء تا سنہ ۱۸۱۴ء (۱۹) فارسٹ صاحب کے چشم دید حالات سنہ ۱۸۲۴ء (۲۰) ضلع پٹنہ مقرر ہونا، سنہ ۱۸۲۵ء (۲۱) سنہ ۱۸۳۳ء کا زلزلہ (۲۲) فارسی زبان کا رواج پا جانا سنہ ۱۸۳۷ء (۲۳) پٹنہ کے وہابیوں کی سرگزشت (۲۴) امیر خاں و حشمت خاں کا مقدمہ (۲۵) خواجہ امین علی خاں پر بغاوت کا الزام (۲۶) صوبہ بہار میں تار برقی اور ڈاکخانے کی ابتدا۔ سنہ ۱۸۵۴ء (۲۷) پٹنہ میں باغیوں کی ایک شورش (۲۸) داروغہ وارث علی اور علی کریم کی گرفتاری (۲۹) بہار میں سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے واقعات (۳۰) بہار میں ایسٹ انڈین ریلوے سنہ ۱۸۶۲ء

باب بستم

سلطنت برطانیہ کی براہ راست حکومت

سنہ ۱۸۵۸ء تا سنہ ۱۹۳۰ء

(۱) انگریزی کمپنی کا انجام (۲) (۳) قحط سنہ ۱۸۶۵ء تا سنہ ۱۸۶۶ء (۳) پرنس آف ویلز کی آمد سنہ ۱۸۷۵ء (۴) قحط سنہ ۱۸۹۷ء (۵) سنہ ۱۹۰۰ء کا طاعون (۶) سنہ ۱۹۰۱ء کا سیلاب (۷) پٹنہ میں لارڈ کرزن کی آمد (۸) نکل سلور کے نئے سکے سنہ ۱۹۰۷ء تا سنہ ۱۹۲۰ء (۹) مظفر پور میں بم کا واقعہ سنہ ۱۹۰۸ء (۱۰) بہار کا بنگال سے جدا ہونا سنہ ۱۹۱۱ء (۱۱) جدول نمبر ۱ اسماء گورنر بنگالہ (۱۲) جدول نمبر ۲ اسمائے گورنر جنرل سنہ ۱۷۷۴ء تا سنہ ۱۸۵۴ء (۱۳) جدول نمبر ۳ اسماء لفٹننٹ گورنر بنگال و بہار سنہ ۱۸۵۴ء تا سنہ ۱۹۱۲ء (۱۴) جارج پنجم کی آمد سنہ ۱۹۱۲ء (۱۵) سنہ ۱۹۱۲ء کا سیلاب (۱۶) عدالت عالیہ اور دارالعلوم کا افتتاح سنہ ۱۹۱۶ء تا سنہ ۱۹۱۷ء (۱۷) ضلع شاہ آباد

کا جلسہ ۱۹۱۱ء (۱۸) پرنس آف ویلز ممدوح کی آمد دہلی ۱۹۲۱ء (۱۹)
(۱۹) ۱۹۲۳ء کا سیلاب (۲۰) ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۳ء تک کے گورنروں
کا ذکر (۲۱) بعض حادثوں کا ذکر (۲۲) شدید زلزلہ ۱۹۳۴ء (۲۳)
تبدیلی وزارت ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۶ء (۲۴) جدید اصلاحی قانون کا
نفاذ اور کانگریسی حکومت کا آغاز ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۹ء (۲۵)
صوبہ بہار میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ۱۹۳۸ء (۲۶) رام گڑھ
میں آل انڈیا کانگریس کا جلسہ ۱۹۴۰ء (۲۷) کانگریسی گروہ
کا علی الرغم دوسرا جلسہ (۲۸) مردم شماری (۲۹) دربھنگہ میں تقریب
(۳۰) قصبہ بہار شریف اور اطراف میں شدید فساد ۱۹۴۱ء
(۳۱) جدید تحریکات ۱۹۴۲ء (۳۲) کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری
پر باغیانہ فسادات ۱۹۴۲ء (۳۳) موجودہ حالات ۱۹۴۳ء
(۳۴) خاتمہ۔

دوسری مطبوعہ تصنیف ہے

"انشاد شاد"

اس کی تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ہے اور اس میں ۳۲ صفحات ہیں
انشاد شاد قومی پریس بانکی پور سے ۱۹۴۰ء میں شائع
ہوئی۔ اس کتاب میں شاد عظیم آبادی کی شاعری پر تبصرہ
و تنقید ہے۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں چودہ سرخیاں ہیں۔
کتاب میں بیشتر شاد کے کلام کے نقائص بیان کئے گئے ہیں۔
سرخیاں درج ذیل ہیں۔
(۱) شاد عظیم آبادی کی شاعری (۲) زبان و محاورات
کی غلطیاں (۳) تناقص (۴) شتر گربہ (۵) حشو و زوائد،
(۶) ردیف کا چسپاں نہ ہونا (۷) زبان اور فن سے ناآشنائی
(۸) سرقہ کلام (۹) عروض کے عوض جبوط (۱۰) اصلاح و ترمیم
(۱۱) شاعری کا اشتہار اور شاگردوں کی بیگار (۱۲) شاد کے یہاں
اختراع و تصرف (۱۳) مقدمہ نگار کی تلاش (۱۴) "پچاس
سال کی ابشاعری ہماری ہے" (شاد)

تیسری مطبوعہ تصنیف ہے۔

تذکرۂ نسوان ہند

سائز ۲۰×۳۰/۱۲ ۔ صفحات ۳۲۵ ۔ یہ کتاب شمسی پریس
پٹنہ سیٹی سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی
اس کتاب کے ۵ پانچ حصے ہیں۔
(۱) شاعرات (۲) مصنفات (۳) کاملات (۴)
شہیرات (۵) مقدسات۔
پہلے حصہ میں ۲۸۶ شاعرات کے حالات مع نمونۂ
کلام شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں ۵ اور تیسرے حصے میں
۱۶ خواتین کا ذکر شامل ہے۔ چوتھے حصے میں کہ جس کی سرخی
شہیرات ہے۔ ۱۰۱ خواتین کے حالات ملتے ہیں۔ پانچویں
حصے یعنی مقدسات میں اہم خواتین کے حالات درج ہیں
اس طرح اس کتاب میں تقریباً ۴۰۸ مستورات کے
حالات موجود ہیں۔ اس کا مقدمہ خود مصنف نے لکھا ہے
چوتھی مطبوعہ تصنیف ہے۔

تذکرۂ ہندو شعرائے بہار

یہ فصیح الدین بلخی کی چوتھی تصنیف ہے۔ یہ کتاب
نشنل بک سینٹر نے ان کے صاحبزادے ناظم بلخی سے اجازت
لے کر شائع کی ہے۔
کتاب کا سائز ۲۰×۳۰/۱۶ اور اس میں کل ۱۶۹
صفحات ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ مصنف نے خود اپنی
زندگی میں ۳۱ جولائی ۱۹۶۱ء کو قلم بند کیا تھا۔
اس کتاب میں احوال ضروری کے عنوان سے ناظم
بلخی کی ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء کی تحریر بھی ملتی ہے۔ اس مضمون میں
انہوں نے بلخی صاحب کی مختصر سوانح اور مطبوعہ اور غیر
مطبوعہ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ کتاب میں بلخی صاحب کی

تصویر بھی شامل ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔

پہلے حصے میں ۱۲۰۰ھ تک کے ہندو شعرا (اردو اور فارسی) کے۔ دوسرے میں ۱۲۰۱ھ سے ۱۳۰۰ھ تک کے اور تیسرے حصے میں ۱۳۰۱ھ سے ۱۳۵۰ھ تک کے شعراء کے تذکرے مع نمونۂ کلام موجود ہیں۔

متقدمین شعرائے ہند و بہار میں ۲۰ شعرا کا ذکر ہے۔ متوسطین میں ۲۰ شعراء اور متاخرین میں ۲۸ ہندو شعرائے بہار سے ہم متعارف ہوتے ہیں۔

شعرا کی فہرست درج ذیل ہے۔

حصہ اوّل

۱۔ نند لال گویا
۲۔ اجاگر چند الفت
۳۔ راجہ رام نرائن موزوں
۴۔ منشی سب سکھ لال خاکستر
۵۔ منشی بلاس رائے رنگین
۶۔ لالہ تخت مل مکین
۷۔ راجہ بینی بہادر بہادر
۸۔ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق
۹۔ منشی آشا رام ذوق
۱۰۔ جوانی سنگھ بہادر گریاں
۱۱۔ منشی گر سہائے لال رقیم
۱۲۔ منشی بینی پرشاد دل
۱۳۔ لالہ جیون رام تحقیق
۱۴۔ منشی بھاون لال بیدار
۱۵۔ راجہ بہادر راجہ
۱۶۔ لالہ رام چند فرحت
۱۷۔ لالہ منگل سین الفت
۱۸۔ بابو مکند لال شورش
۱۹۔ بابو شیو گوپال شوق
۲۰۔ سنتوکھ رائے بیتاب

حصہ دوم

۲۱۔ راجہ پیارے لال الفتی
۲۲۔ منشی گنگا لال داغ
۲۳۔ کنور ہیرا لال ضمیر
۲۴۔ منشی بھگوان دین نائب
۲۵۔ راجہ بابو خفی
۲۶۔ لالہ ٹیک پرشاد شوق
۲۷۔ منشی ہیرا لال شکیب
۲۸۔ کنور راج بہادر شوکتی
۲۹۔ منشی شمبھو دت رفعتی
۳۰۔ موہن لال پانڈے
۳۱۔ منشی ہری ناتھ مخفی
۳۲۔ منشی دھرم لال دھرم
۳۳۔ لوک ناتھ سہائے فقیر
۳۴۔ لالہ لچھمی نرائن وکیل
۳۵۔ منشی پرشن لال پرشن
۳۶۔ لالہ درشن لال اختر
۳۷۔ منشی بہاری لال نصرت
۳۸۔ بابو بیدری ناتھ شبنم
۳۹۔ منشی کیولا پرشاد فقیر
۴۰۔ جنگ بہادر رنگ بہادر
۴۱۔ لالہ سیوک رام فدوی
۴۲۔ لالہ خوب لال مختار
۴۳۔ بابو گنگا پرشاد شاد
۴۴۔ لالہ کملا پرشاد عاجز
۴۵۔ بابو ہری چرن نسیم
۴۶۔ بیج ناتھ پرشاد غنیمت
۴۷۔ سیتاپت شاد
۴۸۔ کالی پت فرد
۴۹۔ ملا دین حشمتی
۵۰۔ گنگا پرشاد بدر
۵۱۔ درگا پرشاد شاد
۵۲۔ پنجاب رائے طاہر
۵۳۔ للت پرشاد شائق
۵۴۔ پرمیشور سہائے شمسی
۵۵۔ جگت بہاری لال قاصر
۵۶۔ نند کشور سنگھ گیسو
۵۷۔ امر چند جمیل
۵۸۔ ملدیو پرشاد خبیر
۵۹۔ بابو دیو داس نظر
۶۰۔ پرمانند سنگھ افسر
۶۱۔ میوا لال عاجز
۶۲۔ پربھو نرائن صادق
۶۳۔ درگا پرشاد ستم
۶۴۔ کشن نرائن بیتاب
۶۵۔ اننت رام الفت
۶۶۔ مند لال بسمل
۶۷۔ حکیم لچھمی پرشاد منکد
۶۸۔ شیوناتھ سہائے [illegible]

۶۹۔ کنور سکھ لال بہادر رحمتی
۷۰۔ سوا پرشاد حسرتی
۷۱۔ گھمنڈی لال حامد
۷۲۔ پیارے لال فرد
۷۳۔ جگیشر لال حیرت
۷۴۔ بھولا ناتھ ہمدم
۷۵۔ نند کشور لال مست
۷۶۔ جگل کشور جابر
۷۷۔ برہم دیو سہائے صید
۷۸۔ جگرناتھ عاشق
۷۹۔ بھوانی پرشاد آزاد
۸۰۔ شیو نرائن چودھری عارف
۸۱۔ بدری ناتھ شاد

حصہ سوئم

۸۲۔ رائے ایسری پرشاد عطا
۸۳۔ بھولا ناتھ مائل
۸۴۔ رائے کنور جہانی صبا
۸۵۔ بدری نرائن فرہاد
۸۶۔ گوبند پرشاد کشش
۸۷۔ گوبردھن پرشاد امیر
۸۸۔ جدو بیر سہائے جودت
۸۹۔ پریاگ رام نندو
۹۰۔ ٹھاکری نند کشور اسیر
۹۱۔ ٹھاکری شیتل پرشاد ماہر
۹۲۔ امبیکا سہائے صنم
۹۳۔ ہرنما پرشاد دیہاتی
۹۴۔ رام پرشاد [illegible]
۹۵۔ بھوانی پرشاد گوہر
۹۶۔ بھگوتی پرشاد ہمراز
۹۷۔ ہیشور پرشاد جوش
۹۸۔ پریاگ دت نادان
۹۹۔ سجیت نرائن نطق
۱۰۰۔ منشی بجرنگ سہائے صنوبر
۱۰۱۔ پریا لال خطرتی
۱۰۲۔ گور بجی مست
۱۰۳۔ رادھے لال جوہر
۱۰۴۔ امرت لال درد
۱۰۵۔ رام لوچن سہائے نام
۱۰۶۔ بچہ مادت لال افسر
۱۰۷۔ رنجیت سنگھ فرد
۱۰۸۔ کلدیپ سہائے فدا
۱۰۹۔ ٹھاکر کلدیپ نرائن کلدیپ
۱۱۰۔ لچھمی نرائن لچھمی
۱۱۱۔ نند کشور لال کشور
۱۱۲۔ اودھ کشور کشتہ
۱۱۳۔ جگیشر پرشاد خلش
۱۱۴۔ بشن نرائن ماتھر نگین
۱۱۵۔ کامتا پرشاد ہوش
۱۱۶۔ امرناتھ اثر
۱۱۷۔ لالہ رام جی زیبا
۱۱۸۔ رام پرشاد کھوسلا ناشاد
۱۱۹۔ پرمیشور پرشاد گلدار
۱۲۰۔ رائے گوپال کرشن رائے
۱۲۱۔ چھیدی لال رنگین
۱۲۲۔ بیجناتھ سہائے سنگی
۱۲۳۔ بی۔ ڈی مہا بشیر
۱۲۴۔ شیوناتھ پرشاد بہار
۱۲۵۔ ٹھاکری شیو نندن پرشاد بہار
۱۲۶۔ پنڈت مہابیر مہابیر
۱۲۷۔ اجودھیا پرشاد غنیمت
۱۲۸۔ پروفیسر شیام نرائن لال
۱۲۹۔ بابو اما جی سہائے اما

ان تصانیف کے علاوہ بہت سارے مضامین ایسے ہیں۔ جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ وقتاً فوقتاً نشر ہونے والے ریڈیو ٹاک کی بھی اچھی خاصی فہرست ہے۔

رسائل میں شائع شدہ مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ شوق قدوائی اور شوق نیموی کا ایک شاگرد، شائع شدہ کومل ڈالٹن گنج اپریل ۱۹۶۳ء صفحہ ۴ تا ۵
۲۔ امیر مینائی، صبح نو، ص ۲۹، شمارہ اگست ۱۹۵۸ء
۳۔ مخالفت قیاس، ماہنامہ اشارہ پٹنہ، مارچ اپریل، ص ۹ تا ۱۳
۴۔ اطرف پورنیہ کے بعض صوفیائے کرام، النسان، پورنیہ نمبر ۱۹۵۶ء
۵۔ روز و ماہ و سال کی سرگزشت تہذیب، دسمبر ۱۹۵۲ء
۶۔ عظیم آباد کا ایک جواں مرگ شاعر، تہذیب، اگست ۱۹۵۲ء

۷۔ اردو قواعد و لغات کی تدوین، تہذیب اپریل ۱۹۶۵ء

۸۔ احاکرچند الفت، اشارہ، جنوری فروری ۱۹۶۱ء

۹۔ پلاموں کی تاریخی سرگذشت، کوئل، ڈالٹین گنج، ستمبر ۱۹۶۶ء

۱۰۔ تاریخ شعرائے بہار کا موقف، اشارہ ۱۹۶۱ء ص ۶ تا ۱۲۔

۱۱ شبلی نعمانی، صبح نو، اگست ۱۹۶۱ء

۱۲۔ موسیقی اور شاعری، معاصر، پٹنہ جولائی ۵۶ء

۱۳۔ راسخ عظیم آبادی، صنم، پٹنہ بہار نمبر ۵۹ء

۱۴۔ امیر مینائی اور داغ دہلوی کی تحریریں، صبح نو مئی ۵۸ء

۱۵۔ فدوی کی ایک مسدس، معاصر، پٹنہ جلد دوم، ص ۷، ۱۹۵۲ء

۱۶۔ لالہ رام نرائن موزوں، اشارہ، پٹنہ، ۵۹ء

۱۷۔ سرقہ اور توارد، اشارہ پٹنہ

۱۸۔ صوبہ بہار میں غالب کی مقبولیت، نگار، لکھنؤ

۱۹۔ عظیم آباد کا ایک خوش نویس شاعر، صدائے عام خاص نمبر

۲۰۔ عظیم آباد میں شعرا کے مزارات، معاصر پٹنہ،

۲۱۔ وزیر علی عبرتی، اشارہ پٹنہ

۲۲۔ نواب امداد امام اثر،

۲۳۔ منیر و بہار میں مسلمانوں کی آمد، ندیم بہار نمبر ۱۹۳۲ء

۲۴۔ قلعہ رہتاس کی تاریخ، ندیم گیا

۲۵۔ مثنوی گوہر جوہری، اشارہ پٹنہ

۲۶۔ شوق نیموی

۲۷۔ مولوی شجاع الدین، صبح نو، پٹنہ۔

فصیح الدین بلخی کے وہ مضامین جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں شامل ہیں۔

۱۔ علی ابراہیم خان خلیل۔ ۲۔ ملا غلام یحییٰ بہاری۔

ان کے کچھ اہم ریڈیو ٹاک درج ذیل ہیں۔

۱۔ صوبہ بہار کی تاریخی اہمیت

۲۔ بہار شریف کا میلہ

۳۔ محمود گاوان

۴۔ ملک محمد جائسی اور پدماوت

۵۔ اکبر کے نورتن میں فیضی اور ابوالفضل

۶۔ تاریخی کتابوں کی بہ طور ماخذ اہمیت۔

فصیح الدین بلخی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ علم نجوم، سائز ۵×۱۰ صفحات ۱۰۹

۲۔ تحریک وہابیہ بہار میں۔ THE WAHABI MOVEMENT IN BIHAR (انگریزی میں)

۳۔ آثار بلخیہ

۴۔ آثار قدیمہ

۵۔ دستور سخن۔

علم نجوم (مخطوطہ)

باب اول بروج، یہ باب آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے۔

(۱) فصل اول، تعداد و اسمائے بروج (۲) فصل دوم، حالات بروج، (۳) فصل سوم درجات بروج، (۴) فصل چہارم زمانہ و قیام بروج (۵) فصل پنجم تعلقات بروج (۶) فصل ششم نوالسا۔ (۷) فصل ہفتم اعداد بروج (۸) فصل ہشتم، خواص بروج،

باب دوم (منازل یعنی نچھتر)

(۱) فصل اول تعداد و اسمائے نچھتر (۲) فصل دوم بیان حروف متعلقہ نچھتر، (۳) فصل سوم خواص نچھتر۔

باب سوئم ۔ تاثرات ۔

(۱) فصل اول ، ایام و اوقات ولادت (۲) فصل دوئم خاصیت ماہ تولد (۳) فصل سوئم خاصیت سنہ ہجری ، (۴) فصل چہارم ۔ خاصیت تاریخ یعنی قمری (۵) فصل پنجم خواص روز ، (۶) فصل ششم خواص لوانسا (۷) فصل ہفتم خواص کرن ۔

باب چہارم ۔ ستارگان ۔

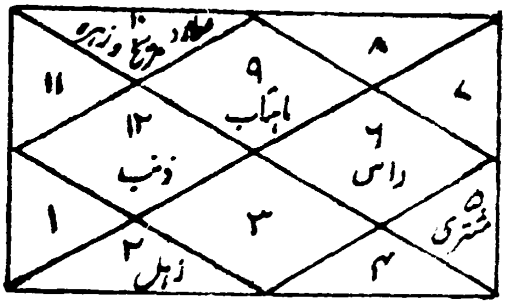
(۱) فصل اول تعداد و اسما ستارگان ، (۲) فصل دوئم حالات ستارگان (۳) فصل سوئم دوستی و دشمنی ستارگان ۔ (۴) فصل چہارم ، اموات ستارگان (۵) فصل پنجم سختی و نرمی ستارگان (۶) فصل ششم مدارج ستارگان (۷) فصل ہفتم جمعیت و استقامت ستارگان (۸) فصل ہشتم صورت کسیر ستارگان (۹) فصل نہم ، خواص از روئے مدارج ستارگان ، (۱۰) فصل دہم ، تعلقات ستارگان ۔

باب پنجم

(۱) فصل اول طریقہ کنڈلی بنانے کا (۲) فصل دوئم حقیقت طالع (۳) فصل سوئم ، امتحان صحت زائچہ ، (الف) امتحان اول پدر و مولود و قمر کا (ب) مکان پیدائش (ت) امتحان مکان نوزت ، امتحان تعداد عورت زائچہ خانہ (ج) امتحان چراغ زائچہ خانہ (ح) امتحان چار پائی حاملہ (خ) طریقہ دریافت بابہ (د) امتحان صحت پرسش کنڈلی (زائچہ سوال) (۴) فصل چہارم ، اقسام خانہ (۵) فصل پنجم منسوبات دروازہ خانہ (۶) فصل ششم سرخ مدارج ستارگان (۷) فصل ہفتم خواص ستارگان مطابق دروازہ خانہ ۔

مجموعی طور پر اس کتاب میں ۵ ابواب ہیں ۔ ہر باب میں علم نجوم سے متعلق رموز و نکات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے ۔ جا بجا ڈائی گراموں اور جدول سے بھی کام لیا گیا ہے ۔ اگر کبھی یہ کتاب شائع ہوئی تو اردو میں اپنی نوعیت کی بے حد منفرد تصنیف ہوگی ۔

زائچہ پیدائش جو بلجی صاحب نے خود ہی بنایا تھا



۱۰ فروری ۱۸۸۵ء مطابق ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ روز چہارشنبہ ۳ بجے شب مطابق پھاگن بدی ۱۹۴۱ سمبت

"تحریک وہابیہ بہار میں"

"THE MOVEMENT IN BIHAR"

یہ کتاب انگریزی میں ہے ۔ اور اس میں کل ۱۴ ابواب ہیں ۔ ابواب کی تفصیل درج ذیل ہے ۔

(1) THE WAHABI CREED

(2) PATNA MADE A CENTRE OF THE MOVEMENT

(3) CHARACTER OF PATNA MUSLIMS

(4) PATNA MAULVIS JOIN SYED AHMAD

(5) THE DOCTRINE OF HIJRAT

(6) WAR ON THE FRONTIER

(7) THE BALAKAT DISASTER

(8) MAULVI NASIRUDDIN S DEFEAT OF GHAZNI

(9) WAHAYAT ALI AND ENAYAT ALI AS LEADERS
(10) ARR' HANPUR
(11) PESUMPTION OF ACTIVITIES IN 1850 AND SERMON IN THE FORT DELHI
(12) NON COOPERATION PASSIVE RESISTANCE AND PARALLEL GOVERNMENT
(13) ENAYET ALI AGAINST THE BRITISHERS
(14) ARREST OF WAHABI BRETHREN
(15) BRITISH MILITARY EXPEDITION 1857 TO THE FRONTIER
(16) MOULVI ABDULLAH RESUMES LEADERSHIP
(17) AMBALA TREAL OF 1864
(18) PATNA TREAL OF 1869
(19) CONFISCATION OF PROPERTIES AND DESTRUCTION OF GRAVES
(20) THE AFTER MATHS
(21) ARREST AND CONVICTION OF AMIR KHAN AND HASHMAT DAD KHAN 1869-70
(22) INDISCRIMINATE PROCEEDING
(23) RELEASE IN 1884

علمائے صادق پور کے گھروں اور قبرستان کے نقشے وغیرہ خصوصی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے سے برٹش سامراج کے مظالم کی بڑی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

کتاب کے آخر میں مجموعی طور پر ۱۰ APPENDIXES ہیں۔ جو ۳۲ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب کلاسیکل پبلشنگ کمپنی نئی دہلی سے جلد شائع ہو جائے گی۔

آثار بلخیہ

بلخی صاحب کی یہ تیسری غیر مطبوعہ کتاب ہے یہ تاریخی نام ہے جس سے مادۂ تاریخ ۱۳۶۹ھ نکلتا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں بلخی صاحب کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں حضرت ابراہیم ادہم بلخی، حضرت شمس منظر بلخی، حضرت حسین نوشہ توحید بلخی جیسے نامور اولیا اور ان کے خاندان کا حال قلم بند کیا گیا ہے۔ ساتھ میں خاندان بلخیہ کا نسب نامہ بھی ہے۔

اس کے بعد کے باب میں شہر بلخ کے حالات اور حضرت ابراہیم ادہم بلخی کے ملفوظات ملتے ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان ہے "بلخیوں کی ہندوستان و بہار میں آمد" آگے ایک چھوٹی سی سرخی ملتی ہے "بلخی شہزادے کا باغ"

چوتھے باب کا عنوان ہے "مولانا شمس بلخی" پانچواں باب ہے "مولانا برہان الدین شمس منظر بلخی" ساتویں باب کی سرخی ہے حضرت حسین ملقب بہ نوشہ توحید بلخی۔ آٹھویں باب کی سرخی مولانا حسن بلخی ہے۔ نویں باب کی سرخی ہے "مخدوم احمد بلخی ملقب بہ لنگر دریا بلخی"

دسویں باب کی سرخی ہے مخدوم ابراہیم بلخی المعروف بہ سلطان بلخی۔ اس باب میں مخدوم محمود بلخی اور مخدوم ابراہیم بلخی کا بھی ذکر ہے۔ اور لکھا ہے کہ مخدوم حافظ بلخی، مخدوم ابراہیم بلخی کے سنبھالے بیٹھے تھے۔ آپ ہی کی آل اولاد ہے جو خانقاہ معظم

ولسق دیکھتی ہے۔ اس کے بعد مخدوم شاہین بلخی، مخدوم محمد
بن ابراہیم بلخی کا مختصر ذکر ہے۔
گیارہویں باب کی سرخی ہے مخدوم درویش بلخی۔
کے بعد دو چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں۔ ان کی سرخیاں یوں
"مولوی محمد واحد بلخی ابن قاضی طہارت التوحید بلخی" و
ی ضمیر الدین بلخی متخلص بہ اوّج" ہے۔ یہاں یہ کتاب ختم
اتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اور بھی کچھ لکھنا
ا تھا۔ اس کے بعد کے لوگوں کے احوال، لیکن اسے موقع نہیں

— فصیح الدین بلخی کا نسب نامہ پدری

حضرت عبد مناف
حضرت ہاشم
حضرت عبدالمطلب
حضرت ابو طالب
حضرت علی
حضرت امام حسین
حضرت زین العابدین
حضرت امام علی اصغر
سیدنا قاسم
امیر سید محمد
سید زید
سید اسحٰق
سید احمد
سید یعقوب
سید محمد
سید ناصر الدین
سید امیر سلمان
سید سلطان ابراہیم ادہم بلخی قدس سرہ

گیا

سیدنا محمود بلخی
سیدنا سراج الدین بلخی
سیدنا حمید الدین بلخی
سیدنا علی بلخی
سیدنا شمس الدین بلخی
(در زمان سلطان محمد تغلق عہدہ در دیوان شاہی یافتن)

مولانا قمر الدین بلخی، مولانا سید معز بلخی، مولانا امین بلخی
(خلیفہ مخدوم چرم پوش)

حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی
حضرت مخدوم حسن بنی فردوسی
مخدوم احمد لنگر دریا بلخی
مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی
مخدوم شاہین بلخی
مخدوم ابراہیم بلخی
مخدوم جنید بلخی
حضرت دیوان معین الدین بلخی
حضرت دیوان منور شاہ بلخی
حضرت دیوان فخر اسلام بلخی
حضرت فہیم اللہ بلخی
قاضی سید طہارت التوحید بلخی
سید واحد بلخی
مولوی سید ڈاکٹر غیاث الدین بلخی

حفیظ الدین بلخی، عزیز الدین بلخی، نظام الدین بلخی، فصیح الدین بلخی
نادم بلخی

فصیح الدین بلخی کا نسب نامہ مادری

ارکن الدین منیری از اولاد حضرت مخدوم تاج فقیہ در قصبہ منیر شریف
ملا عبدالشکور
ملا عبدالحکیم
ملا عبدالحلیم
ملا عبدالرقیب
ملا غلام شرف
ملا غلام یحییٰ
قاضی کمال الحق
قاضی امین الحق
قاضی واعظ الحق

مولوی سید عبدالحق — بی بی مدینہ زوجہ امیر الدین بلخی

بی بی ہاجرہ زوجہ ڈاکٹر غیاث الدین بلخی

ضیاء الدین بلخی، عزیز الدین بلخی، نظام الدین بلخی، فصیح الدین بلخی
نادم بلخی

فصیح الدین بلخی کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی زیادہ دنوں تک بقید حیات نہیں رہیں۔ دوسری بیوی سے تین اولاد ہوئیں ان میں صرف ایک نادم بلخی رہ گئے۔

آثار قدیمہ

اس کتاب کا ذکر فصیح الدین بلخی نے اپنی کتاب تاریخ مگدھ کے مقدمہ میں کیا ہے۔ یہ مخطوطہ مجلد ہے۔ اور خوشخط نستعلیق تحریر میں ہے۔ سائز ۸ × ۱۲ اور صفحات ۲۴۳ ہیں۔

اس مجلد مخطوطہ میں کل ۲۶۰ سرخیاں اس طرح ہیں۔
عظیم آباد کے جغرافیائی حالات، گنگا ندی، سون ندی

پن پن ندی، مورہر، دردہا ندی پھلگو، منتواس مہانہ اور شکری ندی۔ پہاڑی، عام کیفیت نباتات، شمار فصل ربیع گوبی، آلو کی کاشت، اشجار و ثمر،

قصبہ منیر کا حال ۹۹۸ھ کی مسجد، لشکر علی خاں کی قبر ۹۸۳ھ بڑی درگاہ اور سد ہور کا ذکر، بڑی درگاہ کی مسجد ۱۰۱۴ھ، چھوٹی درگاہ، مخدوم دولت کا مقبرہ ۱۰۳۲ھ، مقبرے کا کتبہ ۱۰۳۶ھ، چھوٹی درگاہ کی مسجد ۱۰۲۸ھ، مخدوم دولت کا مقبرہ، شاہ دولت کی وفات کا کتبہ ۱۰۱۷ھ، مقبرے کی تعمیر کا کتبہ ۱۰۲۵ھ وقصبہ منیر کی مسجد ۱۱۰۳ھ دوسری مسجد کا کتبہ ۱۲۱۲ھ بعض قبور کا ذکر، شیر پور کی مسجد ۱۱۵۷ھ۔

قصبہ داناپور کی بی بی گنج کی مسجد ۱۱۹۷ھ، شاہ محمد اکبر ابوالعلائی قدس سرہ کی خانقاہ، کھگول کی مسجد ۱۳۳۴ھ۔ لال سے شاہ درگاہ ارزاں تک، باقر گنج کی مسجد ۱۲۵۷ھ۔ تبارک علی کی مسجد ۱۲۵۷ھ ایک مسجد کا کتبہ جو قبر پر لگا ہوا ہے ۱۱۴۲ھ میں محمد شاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی، اجالت خاں کی مسجد ۱۲۲۴ھ، مسماۃ لوزن کی مسجد ۱۱۳۲ھ۔ سکنا پہاڑی، درگاہ شہداء ارزاں کا مزار کتبہ ۱۰۳۸ھ، درگاہ کا کتبہ ۱۰۵۲ھ، شاہ سہلال کا مزار، ۱۰۶۳ھ، شاہ شہباز کا مزار ۱۴۳۳ھ، شاہ لبھنت کا مزار ۱۰۸۵ھ، شاہ کرم اللہ کا مزار ۱۱۶۷ھ، شاہ غلام حسین کا مزار ۱۲۱۱ھ، شاہ کریم بخش کا مزار ۱۲۵۳ھ، عباد اللہ شاہ کا مزار ۱۲۶۰ھ کتبہ عیدگاہ ۱۲۵۸ھ، درگاہ کی مسجد ۱۰۷۰ھ شاہ غلام علی کا مزار ۱۳۰۸ھ

نمونیہ سے پچھم دروازے تک۔

پچھلی سڑک انگلش روڈ کے اطراف کا حال۔ شاہ رستم کی قبر ۱۲۳۰ھ، کتبہ ۱۹۲۷ء ایک نامعلوم شخص کی قبر اور گنبد، دمنکے کی اہلی کی مسجد ۱۱۹۶ھ۔ ایک اور مسجد، ایک نامعلوم قبر اور گنبد، مسجد ۱۲۱۷ھ، شاہ باقر کے تکیے کا کتبہ شاہ حمزہ علی کا کتبہ اور مزار ۱۲۳۶ھ، شاہ ... کے کا مقبرہ ۱۲۱۲ھ

آہنگ

لال کی مسجد سنہ ۱۲۵۵ھ

عدالت کے احاطے میں میجر ناکس کی قبر سنہ ۱۱۷۲ء، بی بی
مان کی مسجد سنہ ۱۲۱۳ بی بی مان کی قبر سنہ ۱۲۲۵ھ کا کتبہ
مراد پور، خدا بخش لائبریری۔ مراد پور کی مسجد سنہ ۱۲۳۳
سنہ ۱۲۴۳ حمام کا کتبہ پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی کے مکانات، انجنیر
کالج، گولک پور کی مسجد سنہ ۱۲۴۵، خادم علی کی مسجد سنہ ۱۲۵۵، تاجہ
کی مسجد سنہ ۱۳۱۴۔ سنہ ۱۲۸۲ کی مسجد، پتھر کی مسجد سنہ ۱۰۳۶، موہن ڈھالی
کی مسجد سنہ ۱۲۶۳ ایک انگریز کی قبر سنہ ۱۸۲۰، جلابت خاں کی قبر کا
کتبہ سنہ ۱۲۲۶، حاجی چاند کی مسجد سنہ ۱۲۵۴، بی بی لطیف کی قبر کا
کتبہ سنہ ۱۲۷۶، گلزار باغ میں اثنا عشریہ کی مسجد سنہ ۱۲۶۱، شیخ
تیغ علی کی مسجد سنہ ۱۲۵۵، بی بی مدار بخش کی قبر سنہ ۱۲۵۸، شاہ عالم
بادشاہ کی جلوس گاہ سنہ ۱۲۶۵، پیر بخش سنہ ۱۲۶۵ھ،

لودی کٹرہ سے خواجہ کلاں گھاٹ تک :-

تکیہ شاہ کی تعمیر سنہ ۱۲۵۷ حسینی بیگم کا قبر، مسماۃ جعفری
کی قبر سنہ ۱۲۰۳ دیلی گھاٹ میں بی بی مخدومن کی مسجد سنہ ۱۱۹۰، بانی
مسجد میر ابراہیم کی قبر سنہ ۱۱۹۹، شیش محل کی دوسری مسجد سنہ ۱۲۶۴
ولندیز کا کتبہ، متین گھاٹ کی مسجد اور حضرت منعم پاک کا مزار
حضرت شاہ عشق کا تکیہ، حاجی تقی کی مسجد اور مقبرے کا ذکر، محمد
کریم شاہ کی قبر سنہ ۱۳۳۳، بخشی گھاٹ اور ڈاکٹر فدیٰ کا مکان، رائے
صاحب کا کتبہ، حویلی بیگماں۔

پچھم دروازے سے پورب دروازے تک کا حال۔
مرزا معصوم کی قبر سنہ ۱۰۳۳، محلہ گذری کی عمارتیں،
مرزا علی کی قبر سنہ ۱۲۶۵، شیخ رضا کی مسجد اور ایک قبر، شاہ محل، دیوان
اور بادشاہ نواب مارکیٹ، نواب لطف علی خاں یا دلی کی
مسجد سنہ ۱۲۰۳، منیر الدولہ کی قبر سنہ ۱۱۸۸، سیٹی ہسپتال اور رحیم النسا
کی قبر سنہ ۱۱۶۰ انگریزوں کا گورستان اور متصل سنہ ۱۱۶۰، محلہ گورہٹہ
کی بڑی مسجد سنہ ۱۲۱۴، محلہ گورہٹہ کی چھوٹی مسجد سنہ ۱۲۱۴، پادری

گیا

کی حویلی سنہ ۱۱۴۳، لیڈی روز امام کی قبر سنہ ۱۹۲۶، بخشی محلہ، نواب
جعفر علی خاں کا گورستان، اشرف النسا بیگم کی قبر سنہ ۱۳۳۳، نواب
تصدق حسین خاں کی قبر سنہ ۱۳۰۴، مولوی اکرام الحق کی مسجد سنہ ۱۳۳۶
(جو بلجی صاحب کی مسجد کہلاتی ہے) ارشاد علی عرف چھٹن کی
قبر سنہ ۱۳۳۳، بہاری علی عرف بنن کی قبر سنہ ۱۳۲۴، محمدی جان کی مسجد
سنہ ۱۳۰۵، کوچہ کمنگر کی مسجد سنہ ۱۲۶۱، محلہ خواجہ میر کلاں، ڈاکٹر صادق
خاں کی مسجد سنہ ۱۲۹۹، مخدوم حسن علی کا مزار سنہ ۱۳۴۴، جعفر خاں کی عدالت
سنہ ۱۰۷۴، حسن علی کا دارالعلوم سنہ ۱۱۴۲، مسجد بیگو حجام سنگم وا
حسین شاہ کے عہد کی بنی ہوئی ہے۔ ۹۱۶ھ، بیگو حجام والا کتبہ
سنہ ۱۰۵۶، اورنگ زیب کی مسجد جو روضہ کی مسجد کہی جاتی ہے سنہ ۱۰۹۲
فخر الدولہ کی مسجد سنہ ۱۲۰۳، گدام کی مسجد متصل کٹرہ شائستہ خاں
سنہ ۱۲۶۲، چوک کی مسجد سنہ ۱۲۵۱، خواجہ کمبر کی مسجد سنہ ۱۱۰۰، مدرسہ
سیف خاں کے مدرسے کی مسجد سنہ ۱۰۳۸، عمارت چہل ستون و قلعہ
عظیم آباد، قلعے کے باہر کی ایک مسجد سنہ ۱۲۲۹ شاہ معروف کی قبر،
مغل پورہ کے کتبے۔

صغریٰ بیگم کی قبر سنہ ۱۳۱۳، صغریٰ فاطمہ کی قبر سنہ ۱۳۳۲ھ
سعید کرامت کی قبر سنہ ۱۳۶۳ شیخ محمد رضی کی قبر و مولوی نوادر علی
کی قبر سنہ ۱۳۶۳، شیخ احمد علوی کی مسجد سنہ ۱۲۵۴، شیخ بہاری کی مسجد
سنہ ۱۲۴۸، خواجہ عطاء اللہ کی قبر سنہ ۱۲۶۳، علی حسین عرف سنجو کی قبر،
سنہ ۱۳۲۰، حاجی عباس کی قبر سنہ ۱۳۲۷، مظہر حسین کی مسجد سنہ ۱۳۲۶ھ
مظہر حسین کی مسجد سنہ ۱۳۰۴ میاں خاں کی قبر سنہ ۱۲۰۱

جگی چوراہا، گلشن حیدری، کنگھیا ٹولہ، سوناٹولی
شاہ کی املی، لودی کٹرہ اور روندی بازار کا حال۔

بام صاحب کی مسجد سنہ ۱۲۴۳، بلاقی کی مسجد سنہ ۱۲۰۸، میر
قطب الدین کی قبر سنہ ۱۱۹۳، گورستان سید علی عظیم کی قبر سنہ ۱۲۳۴
سید نظام الدین کی قبر سنہ ۱۳۰۵، کمسو بی بی کی قبر سنہ ۱۳۱۷، گلشن
حیدری و گلشن حیدری کی مسجد، امام باڑہ و گلشن حیدری کا
جزا کتبہ سنہ ۱۲۵۱، سید نجف علی کی قبر سنہ ۱۲۶۱، نواب یوسف مرزا

…کی قبر ۱۳۱۱ھ، عبدالحق خاں کی قبر ۱۳۱۰ھ، قبر کلثوم بی بی
…ارث حسین کی قبر ۱۳۰۸ھ، محمد ذاکر کی قبر ۱۳۳۲ھ، سونار ٹولی میں
…مشوق کی قبر ۱۳۱۲ھ، محلہ میر گلابی میں شاہ وارث علی کی قبر ۱۲۲۲ھ، محمد
…کی ٹولی میں ایک مقبرہ ۱۲۱۲ھ، کشمیری کوٹھی میں فضل علی کی مسجد ۱۲۵۹ھ، گنگیا
…میں چند کتبے، شیخ غلام یحییٰ حضور کی مسجد ۱۲۰۰ھ، شیخ غلام یحییٰ کی قبر، مراد
…نار کی مسجد ۱۲۳۳ھ، ٹوڑی گھرو میں دوسری مسجد ۱۲۰۳ھ، حکیم احمد حسین
قبر ۱۱۹۹ھ، ایک گنبد کی مسجد، پادو ندی بازار کی مسجد ۱۰۹۹ھ، ایک
…کتبہ ۱۰۵۰ھ

مکل رو ڈ کا حال۔

پیارالنسا کی قبر ۱۱۹۹ھ، مکل تالاب چوک شکار پور
مسجد ۱۲۸۵ھ، چوک شکار پور کی دوسری مسجد، حاجی تاتار کی
…مسجد، منشی کاظم علی کی مسجد ۱۲۴۱ھ، منشی کاظم علی کی قبر کا کتبہ ۱۲۴۸ھ
…جی منظور علی خاں کی مسجد ۱۲۱۷ھ، محلہ دھل پورہ شیر شاہی
…مسجد، محمد مراد شہید صوفی کا کتبہ ۹۴۹ھ، اشرف علی خاں خاں
…قبر کا کتبہ ۱۱۸۶ھ، مرزا عزیز کی قبر ۱۲۲۳ھ، حسینی بیگم کی مسجد
…۱۲۳۲ھ، قبر سید اقبال رضوی بن سید حیدر علی رضوی المعروف
شاہ جمال حسینی ۱۲۲۹ھ۔ فیض النسا بیگم کی قبر ۱۲۶۶ھ، ڈھائی
…گرہ کی مسجد ۱۰۴۲ھ، ڈھائی کنگرہ کی مسجد کا دوسرا کتبہ ۱۲۶۲ھ
…قبرستان، سادوستان کچی باغ کمیدان کی مسجد ۱۲۱۱ھ، میر لو
…مسجد ۱۱۸۵ھ، مسماۃ فاطمہ کی قبر ۱۱۸۸ھ، میر افضل کا مقبرہ ۱۱۸۳ھ
…میر اشرف کی وفات کی قطعہ تاریخ ۱۱۸۸ھ، میر فرحت حسین کی
مسجد ۱۲۹۳ھ، افضل راج کی مسجد، شاہ منصور کی قبر۔

نواب ہیبت جنگ کا مقبرہ۔

واقعہ محلہ بیگم پور ۱۱۸۵ھ، افضل حسین کی قبر ۱۰۹۲ھ
حاجی علی بخش کی مسجد، کلثوم النسا کی مسجد، شاہ کمک کی مسجد
شاہ کرمک کی مسجد ۱۳۵۲ھ، شاہ کرمک کی قبر، سرائے کی
مسجد اور آمنے سامنے والی مسجد، عبدالرحمٰن سجاد کی مسجد،
۱۱۵۰ھ، تھانہ مال سلامی میں ایک قبر کا کتبہ بغیر نام و تاریخ،
ڈلیس کوٹھی اور برنر کی قبر ۱۴۹۰ء، مسجد سبز و سیر کے پاس

ایک لڑکے کی قبر ۱۲۲۹ھ، مسجد پیرو مڑیا گنگا ندی کے کنارے
منجھلی بیگم کی قبر ۱۲۸۲ھ، شاہ دمڑیا کی قبر، محلہ لون گولہ کی مسجد
شاہ قاسم علی کا مقبرہ، شاہ للن کا مقبرہ، شاہ علیم اللہ کی قبر
۱۱۵۵ھ، محمد حسین ولد مصنف سیر المتاخرین غلام حسین کی قبر ۱۱۹۸ھ
باڑے کی مسجد ۱۲۱۷ھ، عالی النسا بیگم کی مسجد ۱۲۲۹ھ، بزرگ احمد
کی مسجد ۱۱۱۱ھ، شاہ غلام حسین کی مسجد ۱۲۵۵ھ، مولوی نہال حسین
کی قبر ۱۲۹۰ھ، فرزند علی کا امام باڑہ ۱۲۳۰ھ، کنگن کا مقبرہ، کٹرہ
مال سلامی میں ایک قدیم مسجد پولس چوکی کے پاس۔ ایک مندر،
باغ جعفر خاں، قدم رسول کی مسجد، نادر گنج محمد علی خاں کی
قبر ۱۱۷۸ھ، نوری چور کا مقبرہ، بیواجی کی باؤلی، سبل پور کا
حال، مخدوم شہاب الدین پیر جگجوت کا مزار (کچی درگاہ)،
شاہ آدم صوفی (کچی عیدگاہ)، اللہ جلالی کی قبر ۱۳۳۲ھ، جھٹلی کی
مسجد ۱۳۱۰ھ،

مجلد حصے کے علاوہ اسی سائز پر قصبہ سہسرام کا حال
درج ذیل ہے۔

قصبہ سہسرام و عالمگیری مسجد آثار قدیمہ سہسرام و تاما
چنڈی مندر، حسن سور کا مقبرہ، حسن سور کے مقبرے کی مسجد۔
شیر شاہ کا مقبرہ، ایک عجیب صفت، عیدگاہ کے کتبے، داہنے
جانب والا کتبہ، درمیانی کا کتبہ، دکھنی جانب والا کتبہ، مسرت
خاں کا روضہ، علاول خاں کا روضہ، صفدر جنگ کا قلعہ
حمام چندن، پہاڑی کے پاس مسجد ۱۲۰۲ھ، ایک قبر کا کتبہ ۱۱۹۳ھ
مہدی حسن کی قبر ۱۲۰۱ھ امام باڑے کا کتبہ ۱۱۹۱ھ، جانی بازار
میں ایک مسجد ۱۱۵۰ھ، جانی بازار میں امام باڑہ ۱۲۰۰ھ، کرن
سرائے کی مسجد ۱۰۹۸ھ، ۱۱۹۷ھ کا عجیب کتبہ۔
اس کے بعد کاپی سائز پر آٹھ صفحات میں اورنگ
آباد کا حالات درج ہے۔
قصبہ اورنگ آباد۔
عبدالولی خاں کی مسجد ۱۱۳۰ھ، موضع سرس شمس الدین

خاں کی مسجد ۱۱۵۲ء، غلام مصطفیٰ کی قبر ۱۲۰۵ء، نواب غلام حسین کی لڑکی کی قبر کا کتبہ ۱۱۸۳ء، قصبہ داؤ دنگر، مسماۃ فراست کی کی قبر ۱۲۶۶ء

دستورِ سخن

بلخی صاحب اس کتاب کا صرف پہلا حصہ صاف کر سکے تھے باقی اوراقِ پریشاں کی صورت ان کے پوتے سید مظفر بلخی کے پاس محفوظ ہے۔ جو ان پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں

صاف شدہ حصے کے مندرجات۔

اردو کی ماہیت، وجہ تسمیہ، اردو کا ارتقاء، حروفِ تہجی کی قسمیں، حروف تازی کی قسمیں، اور اعراب وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

اس کے بعد ایک سرخی اصطلاحات کی ملتی ہے۔ جس میں حذف، ترمیم، تخفیف اشباع وازالہ، تحریک وتسکین، قلب ونقل، الواب، مترادف، مشترک، وتوادی، قیاس وسماعی اشتقاق کے متعلق لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد فصاحت کی سرخی ملتی ہے۔ اس میں تنافر، اتصال، توالی، اضافت، ضعف تالیف، مخالفت قیاس، فک اضافت، اور استیقاط کا بیان ملتا ہے۔

اس کے بعد تکرار اور حشو کی سرخیاں ملتی ہیں۔ اس کتاب میں حروف تہجی سے لے کر قواعد، فن، عروض وغیرہ سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

آپ نے دیکھا ایک ہی شخصیت نے کتنے مختلف النوع کام کئے ہیں۔

وہ تاریخ داں تھے۔ (تاریخ مگدھ، آثار بلخیہ، آئینہ تذکرہ بہار میں وہابی تحریک) وہ محقق تھے (انشاد وشاد، ہندو شعرائے بہار اور تذکرہ نسواں ہند) ماہر لسانیات اور عروض داں تھے (دستورِ سخن) اور ماہر علم نجوم بھی تھے، (علم نجوم)
لیکن ہم انہیں ایک اور جہت سے بھی جانتے ہیں۔

وہ شاعر بھی تھے، فی الوقت میرے پاس ان کی چودہ غزلیں ہیں ہر غزل سے دو دو اشعار پیش کر رہا ہوں۔

(۱)

یوں دل کی آرزو دلِ مضطر میں رہ گئی
آندھی سی اٹھ کے گنبدِ بے در میں رہ گئی
مثلِ حباب غرق ہوئے بحرِ عشق میں
پانی کی بوند مل کے سمندر میں رہ گئی

(۲)

جاتی ہے جان، مال کے جانے کا ذکر کیا
لعل و زمرد، زر د جواہر کیوں نہ جائے
واعظ کو ذکرِ کوثر و تسنیم سے ہے کام!
ہر چند آبرو سرِ منبر ہی کیوں نہ جائے

(۳)

راحت مجھے کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی
دو گز کسی گلی میں زمیں مل ہی جائے گی
کس کس طرح سے ہم نے چھپایا ہے رازِ عشق
داد اس کی تجھ سے پردہ نشیں مل ہی جائیگی

(۴)

دل پر ستم جو کم ہے اثر میں زیادہ ہے
تھوڑا ہی لطف ہے تو نظر میں زیادہ ہے
گھر سے اٹھا کے لاتے ہیں احباب دوش پر
منزل سے چین راہ گزر میں زیادہ ہے

(۵)

دو دن کی زندگی بھی ہمیں تو وبال ہے
کیا عمرِ جاوداں کی تمنا خضر کریں،
دعویٰ سخن کا ہم کو گوارا نہیں فصیح
پیشِ نظر ہو عیب جو عرض ہنر کریں

(۶)

اس نے اگر کرم بھی کیا تو غضب ہوا
کھینچا ستم سے ہاتھ جو میں جاں بلب ہوا
شکوہ بتوں کے جور کا بے جا ہے اے فصیح
تجھ پر خدا کا قہر، خدا کا غضب ہوا

(۷)

جو بات چاہئے، رہی چاہی نہ جائے گی
اہلِ ہوس سے چاہ نباہی نہ جائے گی
بدلا ہزار رنگ زمانہ مگر فصیح
بختِ سیہ کی اپنی سیاہی نہ جائے گی۔

(۸)

پوچھے کوئی تو عشق کا انجام کیا کہوں
تو ہی بتا دے اے دلِ ناکام کیا کہوں
طوافِ حرم کے واسطے تقویٰ لباس ہے
دو، چار دن کو جامۂ احرام کیا کہوں

(۹)

عشق میں اس بت کی آخر لو لگی اللہ سے
شوق بن کر اک چراغ زیرِ داماں رہ گیا
قتل ہو کر بھی مجھے حاصل سبکدوشی نہیں
سر کے بدلے تیغ کا گردن پہ احساں رہ گیا۔

(۱۰)

ناصح کی گفتگو کا خموشی جواب ہے
تقریر لا کلام کئے جا رہا ہوں میں
دنیا ہے رہ گزر، یہ ٹھہرنے کی جا نہیں
گھر کی طرح قیام کئے جا رہا ہوں میں

(۱۱)

ہاں خوگرِ ستم کی تسلی اسی میں ہے۔
جب تک کہ یہ زمیں ہے یہی آسماں ہے
صہبا ہو اور صحبتِ احباب زندہ دل
پیری میں بھی فصیح طبیعت جواں رہے

(۱۲)

کیا لطف زندگی کا، کوئی آرزو نہ ہو
پہلو میں دل تو دل میں تمنا بھی چاہیئے
زندہ ہمیں سے نام ہیں فرہاد و قیس کے
اب ان کے بعد ذکر ہمارا بھی چاہیئے

(۱۳)

پیری میں کیا کروں، ہوس عشق و عاشقی
بجھتے ہوئے چراغ کو دوں اشتعال کیا
اللہ نے مجھے دلِ بے مدعا دیا!
آئے مری زباں پہ حرفِ سوال کیا

(۱۴)

جب تک نگاہِ شوق کو لپکا ہے دید کا
ممکن نہیں کہ دل کی کوئی روک تھام ہو
اس عالمِ خراب کو جنت بنائیے
دنیا میں جو کبھی نہ ہوا ہو وہ کام ہو

فن تاریخ گوئی بھی ایک مستقل فن ہے۔ جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اس فن میں بھی لوگوں نے بڑے بڑے جوہر دکھائے ہیں۔ اور بہت سے تجربے کئے ہیں۔

بلخی صاحب نے بھی چند قطعات کہے تھے، فارسی کے دو قطعے مجھے ملے ہیں۔

(۱) اپنے بڑے بھائی حفیظ الدین (مزار برما) کی تاریخ کہی ہے ؎

مسجد کہنہ در وطن نو کرد او
از برائے رضائے رب قوی
سال نویسش دل حزیں فصیح

گفت فردوس آشیاں بلگی

۱۳۵۴ھ

(۲) قطعہ تاریخ وفات برائے لوح مزار سید جمال الدین بلگی

عزیز ما جمال الدین بلگی!
لئیق و حق شناس و نیک گستر!
دارالخلد شد داخل سن فوت
غم ایں مرگ ہم تاریخ دیگر

۱۳۶۱ھ

یونیورسٹی سے گھر اور گھر سے یونیورسٹی یہی ان کی زندگی تھی۔ نہایت ہی صوفی صافی قسم کے متقی پرہیزگار اور صاف دل بزرگ تھے۔ بس اپنے کام سے کام نہ کسی سے کچھ لینا اور نہ کسی کو کچھ دینا۔ دنیاوی معاملات میں بالکل ہی صاف ستھرے،

نادم کے دوستوں کے ساتھ بے انتہا شفقت برتتے، میری شادی ہوئی تو انہوں نے میری اہلیہ کو تحفے میں تذکرہ "نسوان ہند" کی ایک جلد پیش کی تھی۔

آثار قدیمہ کے لئے تو انہوں نے کافی FILD WORK بھی کیا تھا۔ یاد آتا ہے کہ ایک دن گرمی کی دوپہر میں مسیر یہاں پہونچے، صبح کی کچہری تھی اس لئے اباجان کچہری سے واپس آچکے تھے۔

وہ کچھ دیر اباجان کے پاس بیٹھے، زیر تصنیف کتاب آثار قدیمہ کے سلسلے میں باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک پوچھ بیٹھے آپ کے باغ میں جو مسجد ہے اس کا سن تعمیر کیا ہے۔؟

اباجان نے کہا کتبہ تو اس میں لگا ہے۔

تب ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے، کسی کو میرے ساتھ کر دیجئے میں اسے ابھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ ایک ملازم ان کے ساتھ کر دیا گیا۔ وہ بغل میں ایک بانس کی سیڑھی دبائے آگے آگے جا رہا تھا۔ اور بلگی صاحب اس کے پیچھے چل رہے تھے۔

مسجد میں پہونچ کر ملازم نے نیچے سیڑھی سنبھالی اور وہ اپنی کاپی اور قلم لے کر اوپر پہونچ گئے۔ اور پھر عینک اوپر چڑھا کر کتبہ نوٹ کر لیا۔

ہمارے یہاں بلگی خانوادہ داغ کی شاعری کا بڑا معتقد تھا۔ سنتے ہیں کہ جب داغ کے داماد سائل پٹنہ آئے تو کسی مشاعرے میں ان کے اس مصرعے پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

ع انگلیاں اٹھنے لگیں داغ کا داماد آیا۔

فصیح الدین بلگی کے بڑے بھائی نظام الدین بلگی اس مشاعرے میں موجود تھے۔ انہوں نے وہیں کھڑے ہو کر "انگلیاں اٹھنے لگیں" کو صحیح ثابت کرنے کے لئے داغ کی سند پیش کی۔

بلگی صاحب کہا کرتے تھے۔ داغ مطلعوں کا بادشاہ ہے۔ وہ کہا کرتے تھے داغ کے بیشتر مطلعوں کی خوبی یہ ہے کہ کہ مصرع اولیٰ کو اگر مصرع ثانی بنا دیں تو معنویت میں ذرا بھی فرق نہیں آتا۔ اور شعری حسن بھی قائم رہتا ہے۔ مثلاً:

ع غضب کیا ترے وعدے کا اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

اگر اسے اس طرح بھی پڑھا جائے، تو معنویت اور مطلع کے حسن میں کوئی فرق نہیں آتا۔

تمام رات قیامت کا انتظار کیا
غضب کیا ترے وعدے کا اعتبار کیا

یوں بھی وہ داغ کی شاعری کے بے حد معترف تھے کہتے تھے کہ داغ کے یہاں زبان و بیان کا لطف ہے۔ اور یہاں سے وہاں تک شاعری میں کوئی عیب نہیں ملتا۔

باتوں ہی باتوں میں بہت کچھ سکھا دیتے، پرانے اسکول کے آدمی تھے، لیکن حسن نعیم کی اس زمانے کی غزلوں کو بھی انہوں نے پسند کیا۔ اور زبان و عروض کے سلسلے میں کچھ مفید مشورے دیئے، جنہیں حسن نعیم نے اپنی گرہ میں باندھ لیا اور وقتاً فوقتاً ان سے استفادہ بھی کیا۔

مجھ سے اکثر کہا کرتے، "کچھ نہ کچھ لکھتے رہئے" اگر آپ روزانہ ڈائری بھی لکھتے رہیں۔ تو آج سے پچاس سال بعد وہ بھی ایک قیمتی دستاویز بن جائے گی۔

۵۱ کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

راحت بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی
دو گز کسی گلی میں زمیں مل ہی جائے گی

دس پندرہ آدمیوں کے جلو میں گلیوں سے ہوتا ہوا جب ان کا جنازہ اکیلے قبرستان میں پہونچا۔ جس کا راستہ ایک گوبھی کے کھیت سے تھا۔ تو ہم لوگوں کو بڑی عبرت ہوئی۔ لیکن اس خاموشی سے کام کرنے والے مرد دانا کی شاید یہی خواہش بھی تھی۔ یہاں بھی وہ ایک ایسا گوشہ چاہتے تھے جہاں انسان گمنامی کے عالم میں سکون سے پڑا رہے۔ اور جب بھی جی چاہے اپنے سرہانے کی اس کھڑکی کو کھول لے جو فردوس میں کھلتی ہو۔

حسن عسکری صاحب جنازے میں شریک تھے۔

اور اس گھڑی کہ ایک تاریخ دفن ہو رہی تھی دوسری زندہ تاریخ ہم سب سے محو کلام تھی

تاریخ ساز اور انجمن ساز ہستیاں آنے والی نسلوں کے لئے بہت کچھ چھوڑ جاتی ہیں۔ ●●

پروفیسر مجتبیٰ حسین (پاکستان)

خشک آنکھوں کی شاعری

کرار نوری صاحب سے میری شناسائی ہے دوستی نہیں ہے۔ میں ان سے بارہا ملا ہوں۔ کئی مشاعروں میں ان کو سنا بھی ہے۔ مشاعروں میں وہ شاعرانہ بلکہ جنگ جویانہ انداز میں پڑھتے ہیں۔ آواز میں کڑاکا۔ انداز میں داد جھپٹ لینے کی پے در پے کوشش۔ آنکھوں میں جلال کے ساتھ شرارت آمیز تبسم کی جھلکیاں۔ میرے خیال میں مشاعروں میں وہ کامیاب کم فتح یاب زیادہ رہے۔ میں نے جب بھی مشاعرے میں انہیں سنا۔ وہ مجھے پسند نہیں آئے۔ رواں دواں شعر، لہراں دواں انداز شعر خوانی۔ بس یہی تاثر مجھ پر کل تک ان کی شاعری کا تھا۔

مگر کل جب میرے کرم فرما حکیم محمود احمد برکاتی صاحب ان کا کلام لے کر میرے غریب خانے پر آئے تو میں پریشانی، تشویش اور ایک گونہ حیرانی میں پڑ گیا۔ بلکہ مبتلا ہو گیا۔ ۲۷ جنوری ۸۲ ڈھائی بجے دن کو مولانا کا میرے مکان کی تلاش میں گلیوں میں پھرنا اور بعد از خرابی بسیار مکان تلاش کر لینا، اور علیک سلیک کے بعد کرار نوری کے کلام پر لکھنے کی فرمائش کرنا کچھ ناقابل یقین سی بات معلوم ہوئی۔

برکاتی صاحب کی ذات اس بے اعتبار دور میں بڑی معتبر ہے۔ وہ طبیب، عالم، علم دوست، اچھے محقق اور مصنف ہیں۔ چمکنے چمکانے، مرعوب کرنے اور مرعوب ہونے سے کوسوں دور ہیں۔ بے جا بات کہنے، اور سننے سے وہ ہمیشہ بچتے رہے ہیں۔ اسی لئے کرار نوری صاحب کا کلام ان کے ہاتھ میں دیکھ کر میں نے ان کا اور اپنا از سر نو جائزہ لیا۔ میں ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ مگر دماغ برابر سوچتا رہا کہ کرار نوری صاحب سے اپنے تعلقات سلسلہ سلسلہ ہیں۔ ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ دو روز قبل ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں کرار نوری صاحب سے میری سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ جس میں انہوں نے اپنے کلام کی طباعت کا مژدہ سنایا تھا۔ اور مجھ سے لکھنے کے لئے کہا تھا۔ میں نے اخلاقاً حامی بھر لی تھی۔ مگر خیال تھا کہ کرار صاحب کو نہ میرا گھر ملے گا نہ لکھنے کی نوبت آئے گی۔ اب جب برکاتی صاحب ان کے ساتھ آ ہی گئے۔ تو راہ فرار مسدود ہو چکی تھی۔ انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

خیر مولانا اپنی نرم اور ادب آموز تبسم اور دلپذیر شفیق باتوں کے بعد چلے گئے اور میں سوچتا رہا کہ اب کیا کروں۔ خیال آیا کہ اسی طرح سے اس کلام پر بھی لکھ دوں جس طرح کتابوں کے لئے پیغام کے طور پر لکھ ڈالا ہے۔ سہل انگاری کا ایک نمونہ اور سہی کون کتابوں کو پڑھتا ہے۔ اور کون ہماری رائے کے بارے میں سوچتا ہے۔ یہ دور پڑھنے سوچنے پر اتنا بھروسہ نہیں کرتا۔ جتنا دیکھنے اور سننے پر۔ سننے کے لئے تقریبات اور ریڈیو ہے۔ دیکھنے کے لئے ٹی وی

اعر وادیب کا حلقۂ ارادت مندان۔ اس خیال سے ڈھارس
بندھی۔ مگر لکھنے سے جان چرانا چونکہ عادت بنتی جارہی ہے۔
اس لئے ذہن پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔ شام ہوگئی
اور بوجھ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ رات آگئی اور طبع بہانہ جو
نے ایک اور راہِ فرار اختیار کی۔ ابھی کئی دن باقی ہیں اطمینان
سے لکھیں گے جلدی کیا ہے لیکن یہ نسخہ بھی کارگر نہ ہوا۔ حکیم
کاتی صاحب کا آنا مجھے لکھنے کا حکم دیتا رہا۔ زچ ہو کر میں نے
کرار نوری صاحب کا مسودہ کلام بے دلی سے اٹھایا۔ پہلا ہی
شعر پڑھا تھا کہ بوجھ کچھ ہلکا ہونے لگا۔ ع

وہ حیات میں کوئی چراغ ہی نہ ملا
کسی دماغ سے اپنا دماغ ہی نہ ملا

بڑے لہجے کا شعر ہے۔ جو تنہائی کے اندر سے رِستی چمک اٹھا ہے
بری بات ہو، یا اچھی بات ہو۔ کرار نوری صاحب اس میں
موجود ہیں۔ میں عرض کرچکا ہوں کہ مجھے اتنے قریب ہونے کا کبھی
موقع نہیں ملا۔ ان کے تیور مجھے کبھی نہیں بھلائے، ان میں
ایک قسم کی جارحیت اور آمادۂ تکرار آدمی کی جھلک ملتی رہی ہے
لہٰذا یہ شعر ان کی شخصیت کے عین مطابق ہوا۔ پھر جیسے جیسے ان
کے اشعار پڑھتا گیا ان کی شخصیت جارح کم اور مظلوم زیادہ
معلوم ہونے لگی۔ مظلوم آدمی کمزور نہیں ہوتا۔ وہ جارح
سے زیادہ توانا اور زندگی بخش ہوتا ہے۔ اس کی زخم خوردگی
ہی اس کے اور دوسروں کے لئے مرہم بنتی ہے۔ کرار نوری
کے اشعار میں زخم و مرہم کا یہ سلسلہ ملتا رہتا ہے۔ ان کے اشعار
ان کی زندگی کے تجربات کے ترجمان ہیں۔ شاید ان کے معاصر
شعراء میں کم ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے اتنی سچائی کے ساتھ اپنی
ترجمانی کی ہو۔ ان کے اشعار کو پڑھ لینا ان سے مل لینا ہے
آپ نے اس دور کے کئی شعرا کو پڑھا ہوگا۔ ان کے کلام میں
آپ کو ذات کا فلسفہ، معاشرے کی ریاکاری پر طنز اور سیاست
کی کارفرمائی ملی ہوگی۔ مگر اس شخص سے شاید ملاقات نہیں
ہوئی ہوگی۔ جو شعر کہہ رہا ہے۔ کرار نوری صاحب اپنی بات
اپنے لہجے میں کہتے ہیں۔ آئیے ان سے ملیں۔

برباد کر گئی مرے لہجے کی تمکنت
تھا میرا انکسار بھی پندار کی طرح

مری سرشت میں عنصر منافقت کا نہیں
متاعِ زیست یہی ہے کہ محبت کرتا رہوں

دو میٹھے بول ہیں، فقیروں کا مول ہے
یہ تم بھی جانتے ہو کہ ارزاں نہیں ہیں ہم

ناکامیوں نے اور بھی سرکش بنا دیا
اتنے ہوئے ذلیل کہ خوددار ہو گئے

اے دوست میری تندکلامی سے درگزر
میں حرف تیر تو ہوں مگر بے گزند ہوں

اور یہ شعر دیکھئے عجیب وغریب شعر ہے

میں اس دور کا موسیٰ ہوں کہ جس کو ماں نے
پیاس دکھائی نہیں، دریا میں بہایا بھی نہیں

میرا خیال ہے کہ یہ چند اشعار کرار نوری صاحب
کی ذات و صفات سے آشنا کرنے کے لئے کافی ہیں۔
معلوم نہیں ان اشعار کا آپ پر کیا اثر ہو۔ مگر میں اپنی بات
کہتا ہوں۔ مجھے ان اشعار نے ان کی درویشی سے آشنا
کیا۔ البتہ درویشوں میں کچھ جلالی درویش بھی ہوتے
ہیں۔ کرار نوری صاحب مجھے کچھ اس قسم کے آدمی معلوم ہوئے
یہ اشعار وہی کہہ سکتا ہے جو اپنے کو نقصان پہنچانے کا
حوصلہ اور ہمت رکھتا ہو۔ نئے شعراء نے بہت کھل کر اپنا

کے اندر یہ بیاسی کو دکھایا۔ اور پست قدروں کا مذاق اڑایا ہے
مگر کرار نوری صاحب نے کسی کی تذلیل اور تحقیر کر کے اپنی
بڑائی نہیں بنائی ہے۔ وہ محض اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔
اور جو لکھتے ہیں اس میں صداقت ہوتی ہے۔

ابھی جو اشعار آپ نے پڑھے ہیں۔ ان میں تلخی تو آپکو
ملی ہوگی۔ مگر الم ناکی کا کوئی عنصر نمایاں نہیں ملتا۔ اب چند اور
اشعار سنئے۔ یہ اشعار شاعر کی اس شخصیت کی طرف رہنمائی
کرتے ہیں جو اپنے گھر میں بھی تنہائی کی بد دعا لے کسی طرح زندگی
کاٹ رہی ہے۔ زندہ رہنا دکھ ہو یا سکھ ہو۔ یہ الگ بحث ہے
مختلف طبائع اور مختلف حالات کے ساتھ زندگی کے نظریات
بدلتے یا متعین ہوتے رہتے ہیں۔ مگر تنہائی کا عذاب سہتے
ہوئے زندہ رہنا ایک ایسی خلا میں آدمی کو پہنچا دیتا ہے
جہاں نہ دکھ ہے نہ سکھ ہے۔ صرف "بے آدمیت" ہے۔ کسی کا
نہ ہونا ایک عجیب سا احساس ہے یہ ایک عذاب ہے۔ جس
میں کوئی شریک ہو کر آدمی کو نجات نہیں دلا سکتا۔ کرار نوری
صاحب کی خودداری، پُر تمکنت، مستقل، اور بلند کرتی ہوئی
آواز کے پیچھے بھی اس "عذاب" میں مبتلا آواز سنائی دینے لگی

تنہائیوں کے دائرے یعنی یہاں کے گھر
ہر اک ہے اپنے آپ میں گویا بسا ہوا

مرے ہی بیچ میں بولا ہے گھر کا سناٹا
کچھ اس قدر در و دیوار سے کلام کیا

ادھر ادھر سفر زندگی تمام کیا
کسی نے بات نہ پوچھی جہاں قیام کیا

شہر میں تنہا تھا لیکن کرب تنہائی نہ تھا
گھر سے باہر رہ کے میں اتنا تو سودائی نہ تھا

کوئی ہمارا بتا ہی نہ سکی تنہائی
لوگ رہنے کو تو رہتے ہیں مرے گھر کے قریب

خدا کرے در و دیوار کان رکھتے ہوں
زمانہ گزرا ہے روداد غم سناتے ہوئے

نام لے کے کبھی ہم کو بھی پکارے کوئی
گھر کا دروازہ کسی روز تو کھولیں ہم بھی

ہم بھی دن بھر کی کشاکش کے تھکے ہارے ہیں
کوئی گوشہ کہیں مل جائے تو سو لیں ہم بھی

وہ کس امید پہ گھر میں رہے کہ جس گھر میں
نہ آنے والا ہو کوئی، نہ جانے والا ہو

رات آئی ہے ہم کدھر جائیں
گھر ہو کوئی تو ہم بھی گھر جائیں

بے گھری اور بے دری پر کرار نوری صاحب نے
اتنے اشعار کہے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کو
انہوں نے بالکل اسی طرح اپنے لئے مخصوص کرنے کی کوشش
کی ہے جس طرح ریاض خیرآبادی کے یہاں خمریات اور
اور پیارے صاحب رشید کے یہاں پیری کے موضوعات
مخصوص ہو گئے ہیں۔

اس موضوع پر دورِ جدید کے تقریباً ہر شاعر نے
کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے۔ تنہائی اور کوچہ گردی کچھ مقدر سا بن
گئی ہے۔ کرار نوری صاحب یہاں تنہا نظر نہیں آتے۔ وہ
اس جم غفیر کے ساتھ ہیں جو شاہراہ حیات پر اگرچہ شانہ

نشانہ چل رہا ہے مگر تنہا ہے۔

"بے در و دیوار سا اک گھر بنانے" میں وہ سب کے شریک ہیں۔ یہاں وہ فرد نہیں افراد میں تحلیل ہو کر گم ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان میں اور دوسروں میں ایک فرق ہے دوسرے موقع اگر مل جائے تو گھر تو کیا محل بنا لیتے ہیں مگر وہ معروف ہو جائیں۔ موقع کا نہ ملنا اکثر و بیشتر ان کی تنہائی کا جواز ہے۔ کرار نوری صاحب کے یہ اشعار بتاتے ہیں کہ وہ موقع ملنے کے باوجود بھی اس سے "فائدہ اٹھانے کے اہل" نہیں ہیں۔

موقع پرستی غالباً ان کی سرشت میں نہیں ہے۔ ان کے پُرتاثیر اور برق بن کر چمک اٹھنے والے اشعار وہی ہیں جن میں عدم مفاہمت کی آواز کبھی گرجتی اور کبھی برستی ہے۔ یہ خشک آنکھوں کی شاعری ہے۔ بڑی سختی کے ساتھ کرار نوری صاحب نے اپنے دل کو سنبھالا ہے۔ اس شاعری میں جدت طرازی الفاظ، اتنی ادا انفرادیت پیدا کرنے کی دوڑ میں سب سے آگے نکل جانے کا "کوئی ہوکا" آپ کو نہ ملے گا۔

نئے ستاروں کو پڑھتے پڑھتے وہ جو اشعار کو ایک خاص قسم کی جذباتی، رومانی، تماشی، اور مبہم فضا میں پہنچ کر پسند کرنے کی ہم میں عادت سی پڑ گئی ہے۔ اسی کی بنا پر ممکن ہے کہ کرار نوری صاحب ہمیں پسند نہ آئیں۔ مگر کرار نوری صاحب کو پسند کریں یا ناپسند کریں وہ کرار نوری ہی رہنے پر مصر ہیں۔ اور ہمیشہ "وہی" رہیں گے جو ہیں۔ ان میں پرشاعری کا کوئی "لپکا" نہیں ہے۔

میں جناب محمود احمد برکاتی کا ممنون ہوں کہ ان کی وجہ سے کرار نوری صاحب کے کلام اور کلام کی وساطت سے ان کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھ سکا۔ ان کو پڑھ سکا ان سے بدگمانی دور ہو گئی۔ البتہ اپنے سے بدگمانی شروع ہو گئی کہ اب تک میں اس کلام سے کیوں دور رہا۔

ان کی شاعری سچی، اچھی، اور بڑی حد تک عجیب ہے۔ یہ باتیں جس شاعری میں بھی پائی جائیں۔ اسے نظر انداز کرنا اپنی بدذوقی کا اعلان ہے۔

شرون کمار ورما

انشائیہ

ہوا خوری

ہوا خوری ایک قطعی بے ضرر اور ذاتی قسم کا شوق پل خوری یا رشوت خوری کے لئے کم از کم دو اشخاص کا ہونا ا ہے۔ ہوا خوری تنہا کی جا سکتی ہے۔ رونے کی طرح اکیلے سیر خیال میں بہتر طور پر کی جا سکتی ہے۔

صرف سڑکوں پر چلنے یا گھومنے کو ہوا خوری نہیں کہتے۔ یہ ا ہے۔ اور اسے فن کا درجہ دلانے میں ریٹائرڈ سرکاری ت اور پرانے رئیسوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ گو ان کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے اس طرف توجہ دی لیکن وہ اس میں مہارت ی حاصل نہیں کر سکے۔ تھک کر بیٹھ رہے۔ ہوا خوری کے ت اور پیسہ درکار ہوتا ہے۔ اور یہ صرف ان ہی کے پاس ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی رہائش گاہیں عموماً ایسے علاقوں اقع ہوتی ہیں۔ جہاں گھر سے نکلتے ہی ہوا خوری شروع کی ی ہے۔ ان کی عادات و اطوار بھی ہوا خوری کے لئے موزوں ہوتی ہیں۔ مثلاً کم بولنا، موسم، اور کتوں، اور افسران اعلیٰ کے ے میں معلومات رکھنا اور اس خدا کی تعریف کرنا جس نے انہیں بنائیں اور وہاں انہیں آباد کیا۔

اعلیٰ ظرف رکھنے والے ہوا خور گھر سے تنہا نکلتے ہیں۔ سے زیادہ ایک کتا اور ایک چھڑی ساتھ رکھتے ہیں یہ، وہ منصب نظر آئیں۔ ریٹائر ہونے تک اکثر لوگ کی بیماریوں ذہنی، جسمانی دونوں میں مبتلا ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے صبح جلد ہی اٹھتے ہیں۔ ان علاقوں کے نقشے اور بسنے والے تقریباً ایک سے ہوتے ہیں۔ اس لئے آہستہ آہستہ لوگ ساتھ آتے جاتے ہیں۔ اور قافلہ بنتا جاتا ہے۔ کیونکہ اس قافلے کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ ایک ایسا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جو ان کی باتوں کی طرح گول ہوتا ہے۔ یہ لوگ پھول توڑنے یا عیب جوئی کے لئے کہیں نہ کہیں رکتے ہیں۔ حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہیں۔ جس سے کسی کا بھلا یا برا نہیں ہوتا۔ عاقبت کے خیال سے اللہ کو بھی یاد کرتے ہیں۔ لوٹ کر یہ لوگ اگلی صبح تک کے لئے گھروں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور اسے سولائزڈ ہونا کہتے ہیں۔

ہوا خوری کرنے والے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو اپنی مرضی سے نہیں، وید حکیم کے مشورے سے اس طرف راغب ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو پیٹ کی خرابیوں کے کارآمد اور شرطیہ علاج اور ماہر حکیموں کے بارے میں اپنی اولاد سے زیادہ علم ہوتا ہے۔ یہ لوگ نم گھاس پر چلتے ہیں۔ لمبے لمبے سانس لیتے ہیں۔ اور اس طرح گنے ہوئے سانس کم کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ جب گھر سے نکلتے ہیں تو لگتا ہے۔ کسی مہم پر جا رہے ہیں۔ گھر کے افراد اور پڑوسیوں کے لئے الارم ٹائم پیس کا کام کرتے ہیں۔

کہتے ہیں ہوا خوری کے لئے وقت موسم اور جگہ کا انتخاب اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کامیاب اور پر امن زندگی گزارنے

کے لئے بیوی کا۔ وقت تو صبح کا ہی موزوں سمجھا جاتا ہے۔ طلوع آفتاب سے پہلے کے سب چرند پرند اس وقت جاگتے ہیں۔ طلوع آفتاب کے بعد یہ شوق آوارہ گردی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور صرف جوانوں اور بیکاروں کو زیب دیتا ہے۔

عورتوں نے اس طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ خدا جانے ان کو اوزون (OZONE) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا درختوں، پرندوں، اور ملگجی اجالوں میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ کہ وہ مردوں کو تو ہوا خوری کے لئے بھیجنے کی سر توڑ کوشش کرتی ہیں۔ خود پیچھے رہتی ہیں۔ نپولین نے کہا ہے۔ مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت ضرور ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو اچھا ہوا خور ہونا بھی ایک کامیابی ہے۔ ہوا خوری کے لئے تو کوئی خاص لباس مخصوص ہے نہیں۔ پھر بھی تجربہ کار ہوا خور فلیٹ شوز، چھڑی اور نیکر کو لازمی سمجھتے ہیں۔ توفیق و ترمیت ہو تو کچھ لوگ اس میں کتے کا اضافہ کر لیتے ہیں۔ عورتیں ان چیزوں سے کتراتی ہیں۔ چھڑی اور فلیٹ شوز تو عورت کی شخصیت کو مسخ کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اگر عورت اس حلیہ میں دیکھی جائے تو لگتا ہے سٹریم لائنڈ کار کو بیل گاڑی کے پہیے لگا دیئے گئے ہیں

ہوا خوری کے معنی تو ہوا کھانے کے ہی ہیں۔ لیکن ان کا استعمال الگ الگ مواقع پر کیا جاتا ہے۔ ہوا خوری آدمی اپنی مرضی یا شوق سے کرتا ہے۔ اس میں اسے کچھ فائدہ ہی نظر آتا ہے۔ یعنی وہ وقت جو آنکھ کھل جانے کے بعد اور سورج طلوع ہونے سے پہلے گزارنا پڑتا ہے۔ بستر اور کمرے سے کہیں بہتر طور پر کسی باغ یا ندی کے کنارے گزر جاتا ہے۔ یہ وقت طالب علموں اور نوبیاہتا جوڑوں کے لئے تو گھر میں کسی کشمکش کا باعث ہو سکتا ہے۔ ریٹائرڈ زندگی گزارنے والے کا ازلی دشمن ہے۔ نہ سونا، نہ جاگنا، بس پڑے پڑے جاگتے رہنا۔ بیماریوں اور بڑھاپے کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان اور خوفزدہ ہونا۔ عقل مند آدمی فوراً ہوا خوری کے لئے نکل جاتے ہیں۔ یوں بھی ہوا خوری کا فیصلہ آدمی خود کرتا ہے۔ جبکہ ہوا کھانے کا مشورہ ہمیشہ وہ شخص دیتا ہے۔ جو دامن بچانا چاہتا ہو۔

ہوا خوری کے لئے چونکہ صبح جلدی اٹھنا اور اس کے لئے رات جلدی سونا لازمی ہے۔ اس لئے یہ خیال عام ہے کہ ہوا خور انگریزی مقولہ کے مطابق صحت مند، دولت مند اور عقل مند ہوتا ہے۔ یہ جاگیردارانہ دور میں سچ ہوگا۔ اس صنعتی دور میں ایسا نہیں ہوتا۔ آج کل امیر آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ رات دیر سے سوئے اور صبح دیر سے بیدار ہو۔ وہ ہوا خوری کرنے کی بجائے ریڈیو پر یا اخبار میں ہوا خوری کے بارے میں سن یا پڑھ لیتا ہے۔ بڑے صنعتی شہروں میں ہوا خوری ایک مسئلہ ہے۔ کہ اس کے لئے میلوں دور تک موزوں جگہ ملنا محال ہو گیا ہے۔ اس لئے بڑے لوگ تو اپنے فلیٹس میں منی پلانٹ، کیکٹس، اور تصویریں لٹکا کر بالکونی میں چہل قدمی کر لیتے ہیں۔ البتہ غریب غربا مضافات سے شہر کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ اسے ہوا خوری کہنا زیادتی ہوگی۔ سہولت کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ ہوا کھاتے ہیں۔ ●●

شوکت حیات

کانٹا

تقریباً آدھی رات سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے جھنجھوڑ کر اٹھا رہا ہو۔ میں نے نیم غنودگی کے عالم میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ نیند کے غلبہ میں ذہن پر بہت زور دینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید میں نے خواب میں یہ محسوس کیا کہ مجھے کوئی جھنجھوڑ کر اٹھا رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے اس گمان کی تکذیب ہو گئی۔ یقیناً میرے کمرے میں میرے علاوہ کوئی اور تھا جس کے وجود کی آہٹ تحت الشعور کی نامانوس راستوں سے ہوتے ہوئے حواس تک پہنچ رہی تھی۔

معاً مجھے خوف کا احساس ہوا۔ میں اپنے دفتر کے تبادلے کے تحت نیا نیا اس شہر میں آیا تھا۔ بڑی مشکل اور تلاش و جستجو کے بعد وہ کمرہ کرائے پر مل سکا تھا۔ کسی زمانے میں یہ گھوڑے کا اصطبل رہا ہوگا۔ جسے مالک مکان نے آدمیوں کے لئے کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ اکثر ہوا کے تازہ جھونکے کے ساتھ گھوڑے کی لید کی مہک اٹھتی۔

جب مالک مکان سے اس بات کا تذکرہ کرتا۔ کہ اگر یہ گھوڑے کا اصطبل تھا تو اسے کرائے پر دینے سے پہلے شریف آدمی کی طرح اس بات کو پوشیدہ نہیں رکھنا چاہئے تھا۔ مالک مکان، خدا، رسول اور قرآن اٹھانے کس کس کی قسم کھا کر میرے اس شبہ کو رد کرنے کی کوشش کرتا۔ اور جب جواب دیتے ہوئے لید کی مہک خود اس کی قوت شامہ کو بھی جھنجھوڑتی اور اس کے نتھنے بھی پھڑپھڑانے لگتے تو وہ ناک پر انگلیاں پھیرتا ہوا بات بناتا۔

آپ کی بات اس حد تک صحیح ہے کہ گھوڑے کی لید کی بو آتی ہے۔ لیکن یہی کمرہ اس کا منبع ہے۔ یہ غلط ہے۔ آس پاس جو پرانے جاگیرداروں کے مکانات ہیں۔ دراصل وہ لوگ کسی زمانے میں گھوڑے پالتے تھے۔ وہیں سے یہ بدبو......

میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن میرا چارہ کیا تھا۔ ظاہر ہے اس شہر میں آدمیوں کے لئے گھوڑے کا طویلہ نصیب ہو جانا بھی قسمت کی بات تھی۔

نیند کا اثر پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ نیم غنودگی کے عالم میں یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی کہ اس وقت آدھی رات میں میرے اٹھنے کا سبب کیا تھا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کسی نے پھر مجھے جھنجھوڑ دیا۔ چشم زدن میں سمجھ گیا کہ کسی انجان آدمی نے میرے آس پاس اپنے ہونے کا ثبوت دینے کے لئے میری نیند توڑی تھی —

—— کوئی تھا کوئی تھا جو میری توجہ کا طالب تھا، مجھے بار بار جگا رہا تھا۔

کمرے کے اندرونی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جس کی دوسری جانب مالک مکان کا کمرہ تھا۔ یہ کھڑکی

...س طرف سے بند رہتی تھی۔ میں نے اندھیرے میں اس
...ڑکی کی جانب دیکھا۔ اندھیرے میں کھڑکی نظر نہیں آ رہی تھی
...نے باہری دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ جاڑے کی
...ندنی رات کی روشنی کے سبب دروازے کے تختوں کی دراڑ
...اس طرف کسی آدمی کا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔

اس اجنبی شہر میں اتنی رات گئے مجھ سے ملنے کون
...ئے گا .... ہو مالک مکان کا کوئی مہمان ہو سکتا ہے۔

سائے نے پھر دستک دینا شروع کر دیا۔ بستر پر بیٹھے
...وئے میری نگاہیں دروازے کی دراڑ میں اٹکی ہوئی تھیں۔
...ئی جواب نہ پا کر اجنبی نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ پہلے دھیمے
...یمے پھر زور زور سے۔ میں نے سوچا کہ اندر کی دیوار میں
...ی کھڑکی پر دستک دے کر مالک مکان کو اٹھا دوں۔ اور
...س کے مہمان کی اطلاع اسے دے دوں۔ لیکن یخ بستہ ٹھنڈک
[illegible] بستر سے اٹھنے کی میری ہمت نہیں
...ہو رہی تھی۔

اچانک باہر کے دروازے پر رونے کی دردناک
...آواز ... میرے لئے تعجب خیز ہی تھی۔ یا خدا معاملہ
...کیا ہے ... کوئی ... دماغ میں طرح طرح کے اندیشے سر
ابھارنے لگے۔ پھر باہر سے کوئی دلدوز صدا دی۔ بہت
...دوستی ہوئی ... جیسے کوئی گہری زمین ... اندر
...اندر قصد ہی ہو۔

- بھائی صاحب ... ... میرے بھائی کا انتقال
ہو گیا ہے ... ... انہوں نے زندگی میں بڑی تکلیفیں
اٹھائیں ... ... ان کی میت پڑی ہوئی ہے ......
خدا کے لئے آپ لوگ چل کر ان کی تجہیز و تکفین کا کام پورا کر دیں۔

میں ایک عجیب مخمصے میں تھا۔ نہ تو دروازہ کھولتے بنتا
تھا اور نہ اندر کی کھڑکی پر دستک دے کر مالک مکان کو جگانے
کی ہمت ہو رہی تھی۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ بہت دھیرے سے اندر
والی کھڑکی کھلی۔ پھر کسی کے سرگوشی کرکے مجھے پکارنے
کی آواز آئی۔ مالک مکان سرگوشی کے انداز میں بول رہا تھا۔
سنئے ..... جناب ...... ذرا .... سنئے

سر سے پیر تک اچھی طرح کمبل لپیٹ کر میں دبے پاؤں
کھڑکی کے قریب آیا۔ ٹارچ جلا کر مالک مکان نے کہا۔
" دروازہ مت کھولئے ..... مصیبت میں مبتلا
ہو جائیے گا "

- کون ہے وہ ...... شاید آپ کا ہی کوئی مہمان ہے

" میرا مہمان نہیں ہے .... وہ ایک دیوانہ ہے۔
.... جس کے بڑے بھائی کو فسادیوں نے کئی سال پہلے
ہلاک کر دیا۔ اور اس کی لاش کو نذر آتش کر دیا تھا۔ ہر سال
آج کی رات اس پر دیوانگی طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ ملک
کے جس کونے میں بھی ہوتا ہے۔ آج کی رات یہاں چلا آتا ہے
اور رات بھر ہر دروازے پر دستک دے کر لوگوں کو اٹھاتا
ہے۔ اور اسے مرحوم بھائی کی لاش دفن کرنے کی درخواست
کرتا ہے ... شروع میں لوگ ......"

اس کے دردناک انداز میں رونے کی آواز دھیرے
دھیرے تیز ہو گئی۔ میں نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا
مالک مکان نے کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر میرا کندھا پکڑ لیا
" دیکھئے بھولے سے بھی دروازہ مت کھولئے گا۔
ورنہ وہ آپ کو اپنے ساتھ گھر میں لے جائے گا۔
بھائی کے بستر کی طرف اشارہ کرے گا۔ اور لاش نہ دیکھ کر آپ
پر ٹوٹ پڑے گا کہ آپ ہی اس کے بھائی کی شہادت اور
لاش کی گمشدگی کے ذمہ دار ہیں ......"

میں نے مالک مکان کو کہا کہ جناب جس شخص کے لئے
آپ دروازہ بند رکھنے کی ہدایت کر رہے ہیں مجھے اس سے
بے پناہ ہمدردی ہو رہی ہے۔ وہ قابل رحم ہے۔ انصافہ

بقیہ صفحہ ۳۴ پر

علی امام

بیچ کا آدمی

پہلے وہ کبھی کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اب وہ صرف ایک ہی بات کرنا چاہتا ہے ــــــ اور روز مرہ کے حادثے اسے ایسا کرنے کے لئے تقویت بھی دیتے ہیں۔ اور اگر اس کے لئے کوئی شک و شبہ کی چیز ہے تو وہ گیتا ہے۔ جو اس کے کینسر زدہ باپ کے جزدان میں بند رہتی ہے۔

وہ جیسے ہی گیس لائٹر کے شعلے سے اپنی انگلیاں مس کرنا چاہتا ہے ــــــ گیتا کے ورق آندھی کے جھکڑ سے پھڑپھڑانے لگتے ہیں۔ اور اس بے چارے کی انگلیاں بے حس ہو جاتی ہیں۔

واقعہ نمبر ۱

اس گاؤں کے سورج ونشی اور چندر ونشی گھرانوں کے چند احباب چاندی کے ڈھیر پر لات مارتے ہیں۔ اور سونے کے "اگل دان" میں پیک ڈالتے ہیں ــــــ ہیرے جواہر کے اندھے سوداگر ہیں۔ یعنی وہ لوگ جہاں تک دیکھ پاتے ہیں۔ وہاں تک بس موتی، ہیرے اور نیلم ہی نظر آتے ہیں اپنے ونش کے علاوہ۔ سارے لوگ الو، گدھے، شتر بگن کے جیسے دکھائی پڑتے ہیں۔

واقعہ نمبر ۲

اس گاؤں میں اکثریت مٹی کے لال کی ہے ــــــ مٹی کھاتے، مٹی پہنتے، اور آسمان اوڑھتے ہیں۔ چاند اور سورج کی پرستش کرتے ــــــ بم بم بھولے شنکر کا شکریہ لاتے، اور خوب ناچتے گاتے ــــــ جیون کی صرف ایک علامت بھوک کو اولیت دیتے ہیں۔

واقعہ نمبر ۳

وہ بے چارہ بیچ کا آدمی ہے ــــــ جب گاؤں میں وہ اپنے اندر کی کائنات کا عکس دیکھ نہیں پاتا ہے۔ تو اس کے اندر بہت ہلچل مچتی ہے ــــــ اس کے اندر کی کائنات روز بروز ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوتی جا رہی ہے ــــــ وہ گاؤں کی چہل پہل میں بھی خود کو بالکل تنہا بالکل الگ اور اکھڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اور ایک مدت سے اس کی زندگی کو بھوگ رہا ہے ــــــ گیتا کا لمس اس کے لئے مقدم ہے۔ کیونکہ گیتا گیان تو ضرور ہے۔ لیکن جھجک زدہ بالکل کالی۔ اور ہونٹ پھولے پھولے بالکل بھدے۔ ــــــ اکیلی ــــــ باپ کوئی دو ماہ کا مہمان ہے ــــــ وہ باپ کے سرہانے بیٹھ کر صرف باپ کو سوچتی ہے۔ اپنے آپ کو بالکل نہیں۔ کیونکہ اس کا اپنا آپ صرف اس کا باپ ہے ــــــ !

واقعہ نمبر ۴

اس کے اندر بڑی تیزی سے ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی اور اس بے چینی میں اس نے گاؤں کے پچھم کی طرف پوال کے مچان کو اپنے گیس لائٹر سے پچ کر دیا۔ آگ کی لپٹوں نے مچان کو آناً فاناً اپنے حصار میں لے لیا۔ چاروں دشائیں بھسم ہونے والی تھیں کہ کسی طرف سے پٹاک پٹاک پان کی پیک گری اور آگ بجھ گئی۔

واقعہ نمبر ۵

اس کو ایک عظیم شرمندگی سے دوچار ہونا پڑا۔ گو شرمندگی اس کے جیسے لوگوں کے لئے ہی پیدا ہوئی ہے وہ کئی ماہ تک اپنے گھر کے سیلن زدہ کمرے میں بند رہا۔ بیوہ ماں اکثر اپنے آنچل سے ہوا دے جاتی۔ تو وہ سکون کی چند گھڑیاں سو لیتا۔ ورنہ وہ خود کی شناخت میں مصروف رہا کرتا۔ اپنے اندر کی کائنات کو ترتیب دیتا۔ اپنی آزادی کا مفہوم تلاش کرتا —— مگر ہر چیز گڈمڈ نظر آتی —— ایک طرف سمیٹتا تو دوسری طرف ادھڑ جاتا۔ اور دوسری طرف سمیٹتا تو پھر تیسری طرف ...... غرض نئے نئے گوشے کھلتے رہتے۔ اور اس کی بے چینیاں بڑھتی رہتیں —— کبھی کبھی تو وہ یہ بھی بھول جاتا کہ آخر تلاش کیا کرنا چاہتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس بات پر تعجب کرتا کہ وہ جیتے ہوئے یہاں تک کیسے آ پہونچا ہے —— پھر کبھی وہ بالکل بے سدھ بے حس حالت میں پڑا رہتا ہے۔

واقعہ نمبر ۶

آج وہ بہت منظم نظر آ رہا ہے۔ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا ہے۔ اور ہر علاقے، ہر گلی اور ہر موڑ کا جائزہ لے رہا ہے۔ رات اندھیری ہے۔ اس کا اپنا ہاتھ بھی دکھائی نہیں پڑ رہا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کراسن تیل کا ایک بھرا ہوا کنستر لے رکھا ہے۔ اور ہر سوکھی ہوئی چیز پر کراسن تیل ڈال رہا ہے۔ وہ ہر گوشے اور ہر حصے میں کراسن تیل چھڑک چکا ہے۔ صرف گیتا کے بوسیدہ مکان کو اس نے مائنس کر دیا ہے ——

اب وہ اپنی بنائی ہوئی مشعل کو کراسن تیل میں ڈبوتا ہے۔ لائٹر پر اس کی انگلیاں پھسلتی ہیں۔ مشعل شعلہ بردار ہو جاتی ہے۔ وہ مشعل کو لپے بنائے ہوئے اپنے ٹریک میں لے کر کود جاتا ہے۔ کہ عظیم کھیل کا افتتاح شاید اسی طرح ہوتا ہے۔ وہ مشعل سے ان تمام جگہوں کو پچ کرتا جا رہا ہے۔ جن کو اس نے پہلے سے نشانہ بنا لیا تھا۔ وہ بالکل عربی گھوڑے کی طرح چھلانگ لگاتا ہوا اپنا کام کر گذرا —— گاؤں میں ایک ہل چل مچ گئی۔ خوف اور دہشت بگل بجانے لگے۔ لوگ اپنی اپنی جان لے کر اپنے اپنے گھروں سے بھاگ رہے ہیں۔ افراتفری ہے۔ زندگی چیخ رہی ہے۔ فریادی ہے۔ وہ گیتا کو چاروں طرف تلاش کر رہا ہے۔ گیتا اپنے گھر میں نہیں ہے وہ ادھر ادھر کہیں نظر نہیں آتی۔ پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ گیتا اور اس کا باپ اس طرف جلتے ہوئے دکھائی پڑے ہیں۔ جس طرف اشارہ کیا گیا ادھر سمنٹ بالو اور لوہا لگائے ہوئے مکانات تھے۔ آگ آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ اس طرف دوڑ پڑا۔ آگ میں کود گیا۔ لوگ حیران تھے۔ سب ہی اپنی اپنی جان بچانا چاہتے تھے۔ مگر وہ جس کے اندر کی کائنات بکھر چکی ہے۔ اب اس کے اندر ایک سجاوٹ سی نظر آتی ہے۔ کچھ دیر بعد جلا بھنا ہوا وہ آگ سے باہر نکلا —— گیتا اس کے بالمقابل کھڑی ہوئی تھی۔ آگ سے نکل کر گیتا اور وہ بالکل ایک جیسے معلوم پڑ رہے تھے۔ گیتا بری طرح جل چکی تھی۔ وہ چند لمحے

بعد اس کے بازو میں کسی کسی ڈھیلی ہو گئی ـــــ وہ چیخنے لگا نہیں ماں ـــــ نہیں گیتا ـ ـ تمہیں ثبوت کے طور پہ زندہ رہنا چاہئے تھا ـــــ میں تو اس گاؤں کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ کیا ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اکثر جو نہیں ہونا چاہئے۔ وہی ہمارے ساتھ ہوتا ہے ـ کیونکہ ہم تو اپنے اندر اپنی ایک دنیا رکھتے ہیں۔ جہاں تعزیت کا چراغ جلنے نہیں دیا جاتا ہے۔

واقعہ نمبر ۳

گاؤں کے لوگوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہیں۔ اور زمین پر اسے پٹخ دیا گیا ہے۔ مکھیا جی اپنی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ آگ تم نے لگائی ـــــ ؟ ہاں مکھیا جی آگ میں نے لگائی ہے ـــــ صرف میں نے لگائی ہے۔ ـــــ کسی دوسرے کو اس میں شامل نہ سمجھئے ـــــ اور یہ مت پوچھئے کہ میں نے آگ کیوں لگائی ـ ـــــ میرے جسم پر جو آبلے ہیں۔ میرے سر پر جو کالک ہے۔ وہ اگر کچھ آپ سے کہہ رہی ہے۔ تو اس کی بات سن لیجئے۔ مجھ سے کچھ مت پوچھئے، صرف یہ جان لیجئے کہ آگ میں نے لگائی ہے ـــــ اس لاٹھی کی قسم ـــــ گیتا کی قسم ـــــ اپنی بستی اور مٹی کی قسم ـــــ آگ میں نے لگائی ہے ـــــ

مکھیا جی کا حکم ہوا۔ اس سالے کو سو کوڑے لگائے جائیں ـــــ بچو تمہاری کیا رائے ہے ـ ؟ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں مکھیا جی، مگر اس میں تھوڑا سا جوڑ دیجئے کہ پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں دیا جائے گا۔ پانچ سو مکانات جل کر راکھ ہو گئے ہیں۔ اور دو جانیں اس کی وجہ سے گئی ہیں۔ اور سالا فلسفہ بگھار رہا ہے۔ اس کے جسم پر کوڑے برسنے لگے۔ وہ کراہتا ہوا بھی مسکرانے کی جد وجہد میں ہے جیسے کسی عظیم فتح کا اعلان کرنا چاہتا ہو۔ ۱۹، ۲/۰، ۲۱،

۲۲، ۲۳، ....

مکھیا جی چیخ رہے ہیں۔ ماسٹر ہالی بالکل دکوت، ـــــ ان کو اس بات کا غصہ ہے۔ کہ ان کی قیمتی بندوق کا کندا جل گیا ہے ـــــ چنانچہ وہ چیخ رہے ہیں۔ ماسٹر جاؤ........

اس کی بیوہ ماں مچھلی کی طرح زمین پر تڑپ رہی ہے حالانکہ جھٹک کر بھی کوئی کوڑا اس پہ نہیں پڑ رہا ہے ـــــ مکھیا جی مونچھ پر تاؤ پھیر رہے ہیں ـــــ کہ کسی نے ان کے کان میں کچھ کہا اور وہ بھاگتے ہوئے اپنی حویلی کی طرف چل پڑے ـــــ اب سرپنچ صاحب کرسی پر براجمان ہیں۔ ان کو غصہ اس بات کا ہے کہ انہوں نے جو ووٹر لسٹ ماسٹر صاحب کی مدد سے تیار کرائی تھی۔ اور جس میں انہوں نے اپنے گھر کے بکری، گھوڑا، بلی، مرغا، مرغی، کا بیکار و نام درج کروا یا تھا وہ سرکاری تحویل میں پہنچنے سے پہلے جل گئی ـــــ

چنانچہ سرپنچ صاحب چیخ رہے ہیں۔ کہ اب میں کوئی برہوں اور میرا فیصلہ ہے کہ سالے کو میری طرف سے سو بید لگائی جائیں پہلے جو کچھ ہوا وہ تو مکھیا کا حکم تھا۔

اس پر شامت بید پڑنے لگی ـ ـــــ چمڑی ادھڑنے لگی ـــــ خون کا قطرہ قطرہ دور دور تک پھیل کر گرتا رہا۔ گاؤں کے لوگ اس کے خون سے سیراب ہوتے رہے۔ جگہ جگہ سے اس کی ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ آنکھیں باہر کی طرف نکلی آ رہی ہیں ـــــ ـ وہاں دھرتی پر پھیل چکی ہے مگر سرپنچ صاحب چیخ رہے ہیں۔ ماسٹر سباؤ مگر اسی وقت ان کے کان میں کوئی کچھ آ کر کہتا ہے۔

اور وہ اول نمبر کے ممبر کو اپنی کرسی پر بٹھا کر بھاگ جاتے ہیں ـــــ اور یہ اول نمبر کا آدمی چلاتا ہے۔ اور اپنی کمر سے سائیکل کی چین کھول کر براہیل جی کو دیتا ہے ـــــ اس چین سے جو چین سالے کو الٹ پلٹ کرکے۔

جیسے قصاب گوشت کو الٹ پلٹ کر قیمہ بناتا ہے۔ اس کو صدمہ اس بات کا ہے کہ پچاسوں گانے کی ٹوکریاں اور زینا دو نوٹوں کی چھپائی کا کارخانہ جل کر اس سلسلے کی وجہ سے بھسم ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ چیخ رہا ہے۔ جلدی جاؤ باہر نکلو کو مت لیکن اس کے زخمی ہونٹ ابھی پتہ نہیں کس فتح کے اعلان کے لیے مسکرانا چاہتے ہیں۔

آخری واقعہ

کھیا جی اور سرپنچ صاحب دونوں اپنی اپنی آتش زدہ حویلی کی طرف بے تحاشہ دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ اور چیخ رہے ہیں چھوڑ دو، چھوڑ دو،

ادھر لال نمبر کا آدمی جلاد سے چھین چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے۔ اور بے تحاشہ اس کے جسم پر وار کر جا رہا ہے۔ اس کی ماں عورتوں کے گروہ کو توڑ کر آگے آتی ہے اپنے لال کے جسم کے ٹکڑوں سے لپٹتی ہے۔ کہ اپنی چھاتی سے بچا لے

کھیا جی اور سرپنچ بے تحاشہ چیختے ہوئے لال نمبر کا جسم کو دھکا دے کر ہٹاتے ہیں —— چھوڑ دو —— چھوڑ دو ——

مگر وہ دھرتی کو اپنے زور دار، ٹوٹے ہوئے بازوؤں سے جکڑے ہوئے ہے۔ اور اس کی ماں اپنے لال کے سرخ سرخ خون سے اپنے چہرے کو رنگ رہی ہے۔

آخری واقعہ کے بعد کا واقعہ

گاؤں کے لوگ اپنے جلے ہوئے مکانات کی راکھ اٹھا کر اس کے مردہ جسم پر اکٹھا ڈال گئے ہیں۔ عورتوں نے اس کی ماں کو اس کے گھر تک پہنچا دیا ہے۔ وہ جلے ہوئے مکانات کی راکھ کے ڈھیر تلے سو چکا ہے۔

سنا گیا ہے: جب کبھی ہریالی پر کسی قسم کی آنچ آتی تو اس کے اوپر کی راکھ کا ڈھیر مندر ثابت ہوتا ہے — ●

ارشد حلیم

صدا گنبدِ بے در ـــ

سمندر روشال تھا ـــــ مگر وہ دونوں سمندر میں غوطہ کھا رہے تھے۔ ڈوب رہے تھے، ابھر رہے تھے۔ ساحل کی تمنا ان کے دلوں میں جوش اور امنگ پیدا کر رہی تھی۔ انہیں کنارے پہونچنا ہی تھا۔ کبھی سمندر کی بپھری ہوئی تیز لہروں کا خوف کبھی اتھاہ گہرے بھنور میں کھو جانے کا ڈر، اور کبھی بے رحم تھپیڑوں سے۔ ہاتھ پاؤں تھک کر جسم و جاں سے الگ ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ لیکن قوت جیسے انہیں کسی پاور ہاؤس سے سپلائی ہو رہی تھی ـــــ

کلجگ ایک ایسا ہی ڈرامہ تھا۔ جس کے اسٹیج ہوتے ہی انہیں امید تھی۔ کہ راست قبیلے کے ستم زدہ لوگوں کی دھندھو تی ہوئی آنکھیں اپنا صحیح راستہ دیکھ لیں گی۔ ان کا خیال تھا کہ آج اس صدی کا سب سے بڑا المیہ خدا کی بستی میں وہاں رونما ہوا ہے۔ جہاں کبھی مقدس لوگوں نے اپنا مسکن بنایا تھا۔ اور صداقت اور شانتی کے دیپ جلائے تھے۔

وہ دونوں سنجیدہ تھے۔ مگر کھولتے ہوئے سمندر اور سیاہ آندھی کی زد میں تھے ـــــ!

وہ دیکھ رہے تھے کہ راست قبیلے کی تہذیب، روایت اور معصومیت کے سینے پر خنجر کے بے در پے حملے کرتے رہنے سے آج وہ کتنی خوش ہے۔ جو انسان کو تخلیق کرنے کے بعد اس دھرتی پر ماں کہلائی۔ ماں کا تصور کتنا پاکیزہ ہے ـــــ ماں ـــــ

کتنا چھوٹا سا لفظ۔ مگر جس کے چہرے اور دل سے تقدس اور محبت کی کتنی ہی پاکیزہ کرنیں پھوٹتی رہتی ہیں۔

اور ـــــ کوئی عورت اگر حکمراں بھی ہو۔ تو وہ قوم کی ماں کا درجہ رکھتی ہے ـــــ مگر صد حیف کہ راست قبیلے کی حکمراں سردارنی ماں کی عظمت کھو چکی ہے ـــــ!

اور ـــــ جب سمندر کی آبی گپھا نے سورج کو رات کا مہمان بنا لیا۔ تو وہ دونوں اپنے تھکے ہوئے وجود کو بے رنگ لباس سے ڈھک کر سلوچنا کے فلیٹ پر پہونچے، دستک دی۔

دروازہ کھلا۔ سلوچنا دہلیز پر آئی، اور مسکراہٹوں کی بے شمار قندیلیں ان کے چہرے کے محراب پر سجا کر ایک طرف کو ہٹ گئی کہ انہیں راستہ ملے، اندر کمرے میں روشنی ہر شئے سے چمٹی ہوئی تھی

چند ہی لمحے بعد باتیں تکون دائرے میں شروع ہو گئیں سمے کی جٹا سے لمحے قطرہ قطرہ ٹپک رہے تھے۔ کہ شاید آپسی سمجھوتے کی بنا پر ـــــ ہاں شاید یہ آپسی رضامندی ہی تھی۔ کہ چمٹی ہوئی روشنی کمرے کو اندھیرے کی تحویل میں دیکر رخصت ہو گئی۔ مگر جاتے جاتے روشنی نے اپنا ایک بیضوی عکس سلوچنا کے چہرے پر چھوڑ دیا تھا۔ اور بس ـــــ بقیہ سارا کمرہ اندھیرے کی تحویل کا بوجھ اٹھائے رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ کمرے میں بھاری آواز گونجنے لگی۔

سلوچنا کا صرف چہرہ ہی روشن تھا۔ لقیہ جسم کا سارا

پھیلی ہوئی ہے۔ فرعونیت ہر شعبۂ حیات کو جھنجھوڑ رہی ہے
قبیلے والے اس طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ جیسے سمندر میں طغیانی
آئی ہوئی ہے۔ اور ان کی کشتی بغیر ناخدا کے ڈول رہی ہو ——
اسی فیصد قبیلے والے یا تو آدھے پیٹ کھا کر زندگی کا جبر سہہ
رہے ہیں۔ یا بھوکے رہ کر موت کی وادی میں آہستہ آہستہ
سسک سسک کر اتر رہے ہیں —— ہمارے قبیلے
کی حکومت کا محافظ دستہ بھی لوگوں پر جبر و تشدد کرنے
سے باز نہیں آتا۔ تحفظ کے نام پر کہیں ریپ ہے۔ کہیں لوٹ تو
کہیں قتل —— ہمارے محافظ ڈاکو اور فاسد عناصر
سے ساز باز رکھے ہیں۔ —— دارست قبیلے کی یہ حقیقت
جو بہ زبان خود اپنی توجہ آپ کی طرف مبذول کرانا چاہتی ہے اور
پوچھتی ہے کہ اس آواز کا اپنا رنگ۔ اپنا آہنگ اور اپنا چہرہ
کس نے چھین لیا ہے —— ؟ ؟ ؟ چیختی ہوئی آواز چند
لمحے کے لئے رکی، پھر جیسے ٹیپ کی ہوئی آوازیں کمرے میں
دہشت اور بربریت پھیلانے لگیں۔ سارا کمرہ جیسے بھیانک
منظر میں تبدیل ہو گیا —— بہت سارے لوگ بھاگ
رہے تھے۔ اور چیخ رہے تھے، جیسے کوئی جنگلی اور خونخوار جانوروں
کا غول کہیں انسانوں کی بھیڑ میں گھس گیا ہو۔ کبھی ایسا
لگتا کہ کوئی آدمی ذبح کیا جا رہا ہو، کبھی ایسی آوازیں آتیں کہ
جیسے کوئی رو رہا ہو —— ٹوٹے کھنڈر یا جلے ہوئے مکان
میں جیسے کوئی سسک رہا ہو —— یکایک آوازیں رک
جاتی ہیں۔ اور اب تیز تیز سانسیں چلنے کی آواز سکوت میں ارتعاش
پیدا کر دیتی ہے۔ کہ قدرے تھکی ہوئی آواز پھر ابھری ——
جگن —— لائٹ آن کردو۔ فوراً ہی کمرے میں جیسے روشنی
کی فصل اگ آئی۔ پردے کے پیچھے سے وہ دونوں نمودار ہوئے
ان میں ایک شانتی تھا۔ اور ایک جگن۔ ابھی چند ہی لمحے پہلے
جو آواز گونج رہی تھی۔ وہ آواز شانتی کی تھی۔ سلوچنا کا چہرہ
پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ [illegible] سینہ دھونکنی کی طرح چل

رہا تھا۔
میرے تو حواس ہی جاتے رہے —— سلوچنا جیسے اپنی
دنیا میں واپس آ چکی تھی ——
میں نے روشنی اس لئے گل کروا دی تھی کہ آپ کا تاثر
دیکھ سکوں۔ اس لئے صرف آپ کے چہرے پر ہی روشنی رہنے
دی تھی ——
جب یہ ڈرامہ اسٹیج ہو گا تو آگ لگ جائے گی۔
سلوچنا بولی۔!
آواز پس منظر سے ابھرتی ہے۔ اور پیش منظر میں
آواز کے ساتھ کردار، واقعات اور حادثات جو مجھے نظر آئیں گے
یعنی اسٹیج پر کردار آواز کو جسم روپ اور لباس بخشیں گے ——
شانتی نے وضاحت کی اور چند منٹوں تک ڈرامے کو اسٹیج
کرنے کی شکایت پر روشنی ڈالتا رہا۔ تھوڑے وقفے کے بعد وہ پھر
بولا —— سلوچنا جی —— آپ کو اس ڈرامے میں مرکزی
کا رول ادا کرنا ہے ——
"کلجگ" کو اسٹیج کا کرنے کا مقصد کیا ہے —— ؟
محض فن یا اداکاری کا مظاہرہ یا .... آخر تم کیا چاہتے
ہو۔ میرا مطلب ہے کیا دکھانا چاہتے ہو لوگوں کو —— ؟
سلوچنا نے تھوڑی اور وضاحت چاہی۔
فن اور اداکاری کے مظاہرے کے علاوہ ہم کونے
کونے میں دارست قبیلے کی سچی تصویریں EXPOSE کرنا
چاہتے ہیں۔ یہ ایک احتجاج انسانوں کے ضمیر کی عدالت کے
سامنے —— ان لوگوں سے جو مصلحت کے اسیر ہیں۔
—— ان سے بھی جو اعزاز و اکرام کی لالچ میں اپنے قلم کی
نب کو حقیقت بیانی کی طرف موڑنے کے بجائے۔ بے جا
تحسین اور قصیدے میں گھس رہے ہیں —— اور ان
بندہ لوگوں سے بھی جو قبیلے کے لوگوں کو پستے ہوئے [illegible]
کو دیکھ رہے ہیں لیکن خاموش ہیں —— [illegible]

حصہ تاریکی نے خود میں جذب کر رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے
چند گز کے فاصلے پر تاریکی میں ہی ایک باریک سا پردہ جھول رہا
تھا۔ غالباً آواز اسی پردے کے پیچھے سے آرہی تھی۔ آواز جس
میں کاٹ دینے والی دھار تھی۔ گونج رہی تھی۔ مکمل تاریکی پہلے
ہی کمرے کو پراسرار بنائے ہوئے تھی —— اور ——
روشنی کا ایک بیضوی عکس سلجھ کے چہرے پر تھرتھرا رہا تھا
کہ دھاریوں کاٹتی چلی گئی —— ہم راستت قبیلہ کے
لوگ آپ سے مخاطب ہیں۔ ہماری بھی اپنی تہذیب، روایت
اور رسم و رواج ہیں۔ مگر ہماری شناخت فضاؤں کی کثیف
دھویں میں کہیں کھو گئی ہے۔ کہ جب ہم خود شناخت بھی کے
ہم سانس بھی لیتے ہیں تو قرض کی صورت کہ اس کا سود ہمیں ادا
کرنا پڑتا ہے ——

ہم مرکز کے سائے میں ہیں —— مگر ہم پر قبیلہ
کی سرداری کی حکمرانی ہے جس کی ظلم کی انتہا یہاں سے وہاں تک
...... وہاں سے یہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہماری گردنیں
ہر لمحہ خنجر کی نوک پر رکھی ہوئی ہیں —— سرداری کا حکم
پتھر کی لکیر ہے۔ چاہے اس حکم سے معتبر انصاف پشیمان ہی کیوں
نہیں ہو رہا ہو ——

سرداری کا خواب ——؟ تھوڑی دیر کے
لئے گونجتی ہوئی آواز نے سوالیہ نشان چھوڑ کر اندھیرے کمرے
میں سکوت کی مہر لگا دی ...... سلجھ کی آنکھیں پلکیں جھپکانا
بھول چکی تھیں۔ جیسے کسی نے اس پر مسمرزم کر دیا ہو۔

آواز پھر گونجی —— سرداری کا خواب خاندانی
اور موروثی حکومت کی بنیاد رکھنی ہے۔ اس کے تیور بتلا رہے
ہیں، کہ طوفان کو قطعی بند کر دیا جائے گا۔ جب کہ راستت قبیلہ
والوں کا بھی زمانہ قدیم سے اپنا ایک اصول رہا ہے۔ ان کا
اپنا انتخاب کا ایک ڈھنگ رہا ہے۔ وہ اپنا حکمران اسی اصول
اور ضابطے سے منتخب کرتے آئے ہیں۔ لیکن آج قبیلہ کا انتخاب
ایک فرمان جاری کردہ گیا ہے۔ چور، ڈاکو، اور بدمعاش عناصر
اس کے محافظ ہیں۔ گویا انہیں اشارہ ہم پر کسی بھی طرح، دباؤ اور ظلم
ہی سہی مسلط کر دیں —— ہر قسم کا زور، زیادتی ایسے موقعوں
پر روا رکھی جاتی ہے۔ بعض موقعوں پر لوگوں کا خون بہنے کی جگہ
پر چھلکنے بھی نہیں دیا جاتا ——

ہم نے سرداری کو قبول کیا —— بار با قبول کیا
ایک وقت تھا کہ سرداری ہمارے قبیلے کے دلوں میں رہتی تھی
اس نے پرکشش نعرے کئی بار دیئے، اور ہر بار قبیلے
کے لوگوں نے اعتبار اور یقین کیا۔ اس دفعہ بھی کیا۔ لیکن یہ
صرف اقتدار حاصل کرنے کی حد تک خوب صورت تھے
آج بھی یہ چاپلوس، مکاری پر فریب نعروں سے ہمارے دلوں کو لبھانا
چاہتی ہے۔ لیکن قبیلے کے لوگ اب معصوم نہیں رہے۔ اپنی
میں ہر طرح سے ناکامیاب رہنے کے باوجود گدی کی لالچ نے
اسے خود غرض، ظالم اور جاہ پرست بنا دیا ہے۔ دراصل جب کسی
کو مطلق العنانیت کا چسکا لگ جاتا ہے۔ تو وہ خود سر اور
بے لگام ہو جاتا ہے —— شیر یا چیتے کو انسانی خون
گوشت کا مزہ مل جاتا ہے۔ تو سوائے انسانی خون اور
گوشت کے اسے کسی اور چیز میں لذت نہیں محسوس ہوتی ——
(توقف)

سرداری نے حواریوں، خوشامدیوں، خون خوار درندوں
اور جی حضوری کرنے والوں کی ہر جگہ ٹولی بنا رکھی ہے۔ یا
کہا جائے کہ یہ لوگ سرداری کے سحر سے مفلوج اور مجبور
محض ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان لوگوں پر صرف سرداری کا ہی
ہے۔ مگر یہ لوگ قبیلے والوں کے سینوں پر مونگ دل رہے
ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے کام کے عوض انہیں کسی نہ کسی طرح خوش
رکھنا ہے۔ بیشتر سرداری کے گماشتے کے چہرے کے اندر بھی ایک
چہرہ ہے۔ جو مکروہ ہے۔ مادیت پرست ہے۔ موقع پرست
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج راستت قبیلے کے چپے چپے میں بد

تھیلے کی طرز کی حکومتوں کو دنیا کی کتنی قومیں جھیل رہی ہیں ـــــ شانی جیسے نیم کی شاخیں چبا رہا تھا تھوڑے توقف کے بعد وہ سلوجہ اور جگن کو بغور دیکھتے ہوئے پھر بولا۔

ـــــ راست قبیلہ ایک سلگتی ہوئی علامت ہے۔ ایسی حکومتوں کی جو عوام پر مسلط کی جاتی ہیں۔ مگر عوام کے لئے نہیں ہوتیں۔ بادشاہ وقت کی ہوتی ہیں۔ اور دعویٰ یہ کیا جاتا ہے یہ عوام کے ذریعہ عوام کے لئے عوام پر کی جاتی ہیں۔ یہ نظریہ اقتدار پسندی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ اور ـــ اور یہ نعرہ بازی طوائف کی ایک خوبصورت ادا کے سوا کچھ نہیں ـــ سب جھوٹ ہے ـــ سب جھوٹ ہے ـــــ شانی کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اور منہ سے کف اڑ رہا تھا اور بولا ـــــ ہمارا مقصد ہے اگر ایسی حکومت دنیا میں کہیں قائم ہے۔ تو اسے پامال کرنا ہوگا ـــــ احتجاج کو قلعہ بند نہیں کیا جا سکتا ـــــ

استحصال اور جبر کے خلاف ہم آہنگ ہو کر ہمیں ایسی حکومت کے تار پود کو بکھیر دینا ہوگا ـــــ ! یہ جگن تماجیس کے ہونٹوں کا کمان سے تیر نکل رہے تھے۔ سلوجہ کے چہرے سے گویا ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے اندر کچھ کھول رہا ہے۔ اور یہ کہ وہ باہر آگئے تو ممکن ہے۔ اطراف کی ساری چیزیں جھلس جائیں۔ لہٰذا اس نے اپنی زبان کو شدت جبر سے دبائے رکھا۔

شانی نے مسودہ سلوجہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ـــــ یہ کلنگ کا مسودہ ہے۔ اسے آپ فرصت کے لمحے میں غور سے مطالعہ کریں گی۔ ہم پھر ملیں گے تو آپ کی رائے کو اسٹیج کرنے کے متعلق قطعی فیصلہ کریں گے۔ سلوجہ نے مسودہ لے لیا۔ اور چند منٹوں تک الٹ پلٹ کر دیکھتی اور پڑھتی رہی پھر ایک سرد سانس کھینچ کر بولی ـــــ ہوں ـــــ تو تم لوگ چاہتے ہو کہ میں مرکزی کردار ادا کروں اور ڈرامے کے دوسرے کرداروں کے مطابق سردارنی کے بیٹے کا رول تم دونوں کرو گے ـــــ ؟

ہاں۔ کیونکہ ہم کہانی کی روح میں اتر چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے سلوجہ جی کہ جیسے اس دور نے ہمیں تخلیق کیا ہے مگر ...... افسوس ...... ؟؟؟ شانی ڈوبی ہوئی آواز میں بولا اور نم آلود نگاہوں سے جگن کی طرف دیکھا جگن کی آنکھوں میں بھی ساون تھرتھرا رہا تھا۔ اور جب دونوں نے سلوجہ کی طرف سر اٹھایا تو سلوجہ کی آنکھوں میں بھی شبنم کانپ رہی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ کر اور کس کیفیت سے مغلوب ہو کر ان کے چہرے کی تصویر بنی تھی ـــــ ؟

مجھے ایک ایسی عورت کا کردار ادا کرنا ہوگا جو میرے اندر کی عورت قبول نہیں کر رہی ہے۔ فنکار کے لئے یہ ایک چیلنجنگ مرحلہ ہوتا ہے ـــــ سلوجہ کی آواز میں بیچارگی پوشیدہ تھی۔ مگر چند ہی لمحے بعد اعتماد سے بولی ـــــ مگر مجھے "کلنگ" کی اس عورت کو اوڑھنا ہوگا ـــــ اوڑھنا ہی ہوگا ـــــ

اور ہم سردارنی کے اس بیٹے کو اپنی روح کے اندر اتار لیں گے جو کبھی قید و بند کے ماحول میں سردارنی کی شہہ پا کر سارے شہر میں کہتا پھرتا تھا کہ سورج کی تیز اور تیکھی کرنوں سے اپنے موسمی کھلونے بچا کر رکھنا۔ جس کے پاس جتنے ہیں اسی پر قناعت کرے، ورنہ اس کے جسم سے پانی کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا جائے گا ـــــ پھر ایسا ہوا کہ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ کسی وادی کی طرف لوٹا دیا گیا جہاں سے پھر کوئی واپس نہیں آتا ـــــ

سلوجہ جی! انسان فطری طور پر اپنے دائرہ حیات میں کتنا ظالم ہوتا ہے۔ جابر ہوتا ہے ـــــ شانی کی مٹھی کھلی کو پسینے سے تر تھی

اور ہم اس سردارنی کی باقی اولاد کو اپنے اوپر مسلط کریں گے جس کی میں ابھی تک [illegible] ابھر رہے ہیں ـــــ جگن [illegible] کی پلکوں کو تڑپاتے ہوئے کہا ـــــ سندر و بالک تھا کر وہ [illegible]

خورشید حیات

طوفان سے پہلے اور طوفان کے بعد

باہر کے سارے دروازے بند تھے، اور اندر ایک ہیجان سا برپا تھا۔ سکون کی تلاش جاری تھی۔ اور ہر ایک کا چہرہ اترا ہوا تھا، گھبرایا گھبرایا سا۔ شاید کہ وہ کسی بڑے خطرے کے انتظار میں تھے۔ اچانک باہر کے دروازے پر دستک ہوئی، اور سب لوگ سراسیمہ سے ہو کر خاموش ہو گئے۔

دستک ہوتی رہی اور لوگ سنتے رہے۔ کیونکہ وہ ڈرے ہوئے تھے۔ باہر کا دروازہ کھلنے پر کہیں طوفان نہ نازل ہو جائے مگر طوفان کا راستہ کب روکا جا سکتا ہے۔ طوفان کو جب نازل ہونا ہوتا ہے تو نازل ہو کر رہتا ہے۔ طوفان کا راستہ بدلا جا سکتا ہے طوفان کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ مگر طوفان کو روک لینا اب تک ممکن نہیں ہو سکا۔

دروازہ پر دستک تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور محسوس ہوتا تھا کہ دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ سارے لوگ خوف و ہراس کھاتے ہوئے اوپر کی منزل پر جانے لگے۔ اور باہر دستک کی آواز شدت سے شدید تر ہوتی گئی۔ لوگوں کو محسوس ہوا کہ وہ غلط کر رہے ہیں۔ دروازہ کھول ہی دینا چاہئے۔ مگر دروازہ کھلنے پر مدافعت کی کیا صورت ہوگی اس پر کسی نے غور نہیں کیا تھا گھبراہٹ میں غور کرنے کی فرصت بھی کسے تھی۔

اندر کے ایک جیالے نے دروازہ پر آ کر پوچھا —

کون ہے؟

دستک رک گئی مگر کوئی جواب نہیں ملا! کیونکہ دروازہ پر دستک دینے والا اجنبی تھا۔ اور اجنبی کے پاس شناخت کے لئے کچھ نہ تھا کہ وہ اندر والے کو بتلا سکتا کہ وہ کون ہے خاموشی نے تجسس، تحیر اور خوف میں اضافہ کیا مگر اس جیالے کے آگے بڑھنے سے اتنا ہوا تھا کہ اندر کے سارے لوگوں کو طاقت مل گئی تھی۔ اور وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آ کر دروازہ کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔

ایک نے کہا —— دروازہ کھول دو

دوسرے نے کہا —— سالا کوئی جواب ہی نہیں دیتا

تیسرے نے کہا —— وہ تنہا اکیلا ہے۔ ہم لوگ اتنے ہیں وہ کیا کر لے گا۔ کھول دو دروازہ۔

چوتھے نے کہا —— ذرا غور کر لو، کوئی آفت نازل نہ ہو جائے۔

پانچویں نے کہا —— کیا ہم سب مل کر آفت کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ کھول دو دروازہ کیا کرے گا۔ موت برحق ہے۔ موت پر ایمان ہے۔ تو وقت پر آئے گی"

چھٹے نے کہا —— مصلحت بھی کوئی چیز ہے مصلحت سے کام لو۔

ابھی یہ سرگوشیاں ہو ہی رہی تھیں کہ دستک پھر تیز ہو گئی۔ اور اندر والوں میں سے اس جیالے نے دروازہ

کھول دیا۔

باہر کھڑا فقیر اپنا اجنبی چہرہ لئے ہوئے ہاتھ پھیلاتا ہوا اندر کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ اور اندر کے لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔ فقیر کچھ عجیب شکل و شباہت کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ عجب قسم کی کشش تھی۔ وہ بڑا باوقار اور رعب دار تھا لوگ پیچھے ہٹے اور اس نے انہیں تسلی دی۔

گھبراؤ نہیں میں بھی انسان ہوں تمہارے ہی جیسا۔ میں تمہارا کچھ لینے نہیں آیا ہوں۔ کچھ دینے آیا ہوں۔ تم بے چین تھے۔ سکون کے لئے راستہ تلاش کر رہے تھے۔ اندر کی دنیا کے سمٹے سمٹائے لوگ تمہیں باہر کی دنیا کی دعوت دینے آیا ہوں چلو میرے ساتھ آگے قدم بڑھاؤ۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہاری قیادت کروں گا۔

سارے کے سارے لوگ جو گھبرائے ہوئے تھے۔ ایک سکون کا احساس کرنے لگے۔ مگر شکوک کی منزل ابھی بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ مشکوک نگاہیں ابھی بھی انہیں گھور رہی تھیں۔

اس کے پیچھے چلنا کہاں تک مناسب ہوگا۔ یہ سکون کہاں سے وہ پائے گا۔ اس کے پاس ہے کیا۔؟ چہرہ بھی ہے تو عام انسانوں سے الگ۔ وضع قطع بھی ہے تو ہم سب سے جدا، نہ جانے کہاں لے جائے گا یہ؟ کس منزل پر لے جا کر چھوڑے گا ہمیں۔؟ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ تم واپس جا سکتے ہو۔ ایک نے ہمت کر کے کہا۔

دوسرے نے کہا ــــــ نہیں، نہیں تم جا سکتے ہو! تم کیوں چلے آئے، بھیتو، کیسے پتہ چلا کہ ہم سکون کی تلاش میں ہیں۔

تیسرے نے کہا ــــــ یہ کوئی بہت بڑا جادوگر لگتا ہے۔ ہماری باتوں کو جان چکا ہے۔ اور اب کسی گمراہی کے راستے پر لے جانا چاہتا ہے۔ نہیں، ہم نہیں جائیں گے تم تنہا جاؤ۔

نووارد کو کوئی ذریعہ ابھی تک حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ ان کا اعتماد حاصل کر سکتا۔ اس نے کہا۔ شک مت کرو دیکھو میری طرف دیکھو، میں تمہارا کچھ لینے نہیں آیا ہوں۔ میں تم کو غلط راستے پر بھی لے جانے نہیں آیا۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارے سکون کی خاطر آیا ہوں۔

ایک نے پھر دریافت کیا ــــــ سائیں تم کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم سب اضطراب میں ہیں اور سکون کی تلاش میں ہیں۔ نہیں بھائی۔ اپنا راستہ لو، ہم دروازہ بند کریں گے

نووارد نے کہا ــــــ دروازہ بند نہیں ہوتا میرے عزیز، دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ دروازہ کے بند کرنے سے کئی دروازے کھل جائیں گے۔ اور ہر دروازہ تمہیں نئی آواز دے گا۔ اور اس وقت فیصلہ تمہارے بس میں نہیں ہوگا۔ تم پاگل ہو جاؤ گے، تمہاری قوت فکر تمہیں جواب دے جائے گی ایک ہی راستہ ہے دروازہ کھلا رہنے دو۔ اور پھر دیکھو کہ فطرت کیا چاہتی ہے۔؟ ہم کیا چاہتے ہیں۔؟ تم کیا چاہتے ہو ــــــ ؟

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مغرب کی جانب سے آسمان میں بادل امنڈ آئے، اور تاریکی چھا گئی۔ زناٹے دار ہواؤں نے دروازہ کے پٹ توڑ ڈالے، اور بڑے زوروں کی گرج آسمان میں پیدا ہوئی۔

طوفان آگیا! طوفان آگیا!!

ہر طرف آندھیاں ہی آندھیاں ہیں۔ کس کمرے میں جاؤ گے نووارد نے کہا۔ کس دروازے کو بند کرو گے، ؟۔ نووارد نے سوال کیا۔ کہاں پناہ لو گے میرے عزیز! طوفان بڑھتا جا رہا ہے۔ جلدی فیصلہ کرو۔ اب تو دیواریں ہلنے لگی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا گھر منہدم ہو جائے اور تم ....

کہو! کہاں ہے سکون؟ کس کس دروازے کو بند کرو گے،؟ اب تو صحرا البسیط میں طوفان کا سامنا کرنا تمہاری قسمت ہو چکا ہے۔ چلو میدان کی جانب ہم بھی نکلیں، تم بھی چلو، دھرتی ڈول رہی ہے۔ ہیبت ناک آواز آ رہی ہے

پل میں پرے ہونے کو ہے۔ بادلوں کی گرج، ہواؤں کے زنانے
وادی کی آواز۔ انتشار، انتشار ـــ انہدام، انہدام
ـــ تخریب، تخریب ـــ اور سکون کی تلاش میں
تمہارا ذہن اب مفلوج ہو جائے گا عزیزم! چلو چلو۔ وہ دیکھو
عقب کی دیوار گر پڑی ـــ آگے کا راستہ ابھی کھلا ہے۔ نہیں
سب لوگ نو وارد کے پیچھے پیچھے خاموشی کے ساتھ
چلنے لگے۔ کہ اس وقت بچاؤ کا بس یہی ایک راستہ تھا۔

نو وارد انہیں لے کر آگے بڑھتا رہا۔ اور طوفان کے
اس سرحد پر لا کھڑا کر دیا۔ جہاں شعلے برس رہے تھے۔ دماغ جل
رہا تھا۔ انسان، انسان نہ رہنے پر مجبور تھا۔ کوئی صورت نہ تھی
کہ حالات کو سازگار بنایا جا سکتا۔

طوفان کب رکے گا؟ کون جانتا ہے؟ طوفان کی
اپنی فطرت ہے یہ کس فطرت کے تحت آتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا
سکتا۔ انسان طوفان سے نبرد آزمائی کرتا رہتا ہے۔ کوئی اجنبی
رہبر مداوائے درد جگر کے لئے کوئی کتاب لے کر نازل ہوتا ہے
پھر طوفان رک جاتا ہے۔ نئی روشنی پھیلتی ہے۔ نئی کونپلیں
انسانیت پھر فروغ پاتی ہے۔ اور زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے
نو وارد اب بھی ٹھہرا ہوا ہے مگر ہمارے دروازے بند ہیں
دستک ہو رہی ہے۔ لیکن ہم نو وارد سے مشکوک ہیں۔ نو
وارد کی مشکل یہ ہے کہ وہ ہمارا اعتماد حاصل نہیں کر پاتا۔
کشمکش اور اضطراب۔ اضطراب اور کشمکش
سکون کا پیش خیمہ، اور سکون اضطراب کا پیش خیمہ ـــ
فطرت مسکراتی رہتی ہے۔ اور کارخانۂ حیات چلتا رہتا ہے ●

"ایسے سنگین موقعوں پر بھی آپ دروازہ نہیں کھولتے
......اور ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی منع کرتے ہیں..
یہ افسوس کی بات ہے......"

"ارے بھائی میں آپ کے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں
...... کہیں یہ بدروح خود ہی دروازے سے گھر کی طرف بڑھ جائیگا
...... ویسے آپ اس شہر میں نئے ہیں۔ اس لئے بتا رہا
ہوں...... پچھلے کرایہ دار اس چکر میں آکر مہینوں بیمار
رہے تھے اور آخر......"

میں اپنے جذبۂ ترحم اور ہمدردی کی شدت کے باوجود
بنیادی طور پر ڈرا ہوا تھا۔ آکر لیٹ رہا۔ اور پھر باقی آدھی
رات اندر کی کھڑکی کی سرگوشی اور باہر کے دروازے کی
دستک کے درمیان کروٹیں بدلتے ہوئے بے چینی کے عالم
میں بسر ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ادھر جاؤں
یا ادھر۔ اسی ادھیڑ بن میں پوری رات کٹ گئی۔

صبح دروازہ کھولا تو کوئی ٹھنڈا اکڑا ہوا شخص مجھ سے
ٹکرایا۔ جھٹکے کے ساتھ میں چاروں شانے چت گرا۔ اور
میرے اوپر وہ آ رہا۔ مرنے کے بعد بھی اس کے دھاڑیں مار
مار کر رونے کی آواز چاروں طرف سے آرہی تھی ـــ
مجھے لگ رہا تھا کہ میرے سینے پر کوئی سیاہ گلاب کی ڈال
رکھی ہوئی ہے۔ اور اس کا کوئی کانٹا میرے سینے میں بہت
اندر تک چبھ گیا ہے۔ ●

بقیہ: کانٹا

بلا کر دلاسا دینا چاہئے۔ اور علاج و معالجہ......
"ہرگز نہیں...... ہرگز نہیں...... پڑوسی کی
حیثیت سے میرا یہ مشورہ ہے کہ آپ دروازہ......"

کرشن موہن

چار مختصر نظمیں

سونے کا سکہ

یونانی مرنے والے کے ہاتھ میں اک سونے کا سکہ رکھ دیتے تھے۔
تاکہ جو شیطان رستہ روکے
وہ سونے کا سکہ پا کر رستہ چھوڑے
اور سہل ہو اس مردے کی گگن یاترا

چہیتا

اس کا اپنا چشمہ سوکھ گیا تھا
اسی لیے تو
اوروں کے چشموں سے پانی لیتا تھا وہ
ویسے بھی لوگوں کا چہیتا تھا وہ
ورنہ ڈوب ہی جاتا
سوکھے چشمے کے غم میں وہ ڈوب ہی جاتا

پاون

منو نے کہا تھا
کہ عورت کے سانس اور پستان
ہون کا دھواں ہیں۔
یہ پاون ہیں ایسے
دعا ایک بچے کی جیسے

INTHE INCOME TAX DEPRTT

آیکر وبھاگ میں

میرا شباب کٹ گیا خرد کی دوڑ بھاگ میں
اسی لیے تو آج بھی
بزرگ ہو کے آیکر وبھاگ میں
یہ آمدوں میں گھومنے کا شوق ہے

جمال الدین ساحل

سرد موسم کا درد

اے میری ہمراز برفیلی ہواؤ
آؤ میرے پاس
میرا اونگھتے کمرے میں آؤ
میں — کہ آتش دان یادوں کا جلائے
میں — کہ اپنے زخم خوردہ دوش پہ کمبل اٹھائے
کب نکل جاؤں سفر میں۔
کیا پتہ — کب باندھ لوں رخت سفر
کیا پتہ — کب یاد آجائے کسی کی رہگذر
آؤ اے ہمراز برفیلی ہواؤ۔
تم تو شاہد ہو میری بے چارگی کے
جب سنہری شام چٹانوں پہ خیمہ زن ہوا کرتی
اور اک سیمیں بدن، مومی شمع سر پر جلائے
عہد و پیماں کی لکیریں کھینچ کر
اوجھل نگاہوں سے ہوا تھا —!
اے مری ہمراز برفیلی ہواؤ
تم نے دیکھی ہے مری آوارگی
لیکن وہ دن رخصت ہوئے
اب دھواں سا اک غبار ناتواں ہوں
معتبر یادوں کی چنگاری پہ ہر دم نوحہ خواں ہوں
اونگھتے لمحے مری جاگیر بن کر جا چکے ہیں۔
معتبر سینے سے ملوث ہو کے سائے جا چکے ہیں۔
اے مری ہمراز برفیلی ہواؤ
تم مرے کمرے میں آتش دان کے نزدیک آؤ۔

سلطان اختر

غزل

کانوں میں رس گھول کہ دنیا فانی ہے
میٹھی بولی بول کہ دنیا فانی ہے

میرے گناہوں کی میزان مجھے دیدے
اپنی نیکی تول کہ دنیا فانی ہے

آج نہیں تو کل ان اونچے محلوں کی!
کھل جائیگی پول کہ دنیا فانی ہے

جو گذری سو گذری اس کی فکر نہ کر!
اب بھی آنکھیں کھول کہ دنیا فانی ہے

لوگوں میں بھی بانٹ قناعت کے سکے!
بھرا نہ رکھ کشکول کہ دنیا فانی ہے

چمکتا چاند اور ڈھلتا سورج روز و شب
پیٹ رہے ہیں ڈھول کہ دنیا فانی ہے

اس کی قیمت جان کہ دینا ہے جس کی
دنیا کا کیا مول کہ دنیا فانی ہے

ہر لمحہ دو چار جنم کا سرمایہ!
ہر اک دن انمول کہ دنیا فانی ہے

حرمت الاکرام

غزل

کلیوں کی چٹک کہنے کو خوش کوش بڑی ہے
خنجر کی طرح سینۂ فطرت میں گڑی ہے

سلگائی تھی کل قافلے والوں نے جہاں آگ
شب گزری تو دیکھا کہ وہاں راکھ پڑی ہے

اس کی طرف آتا ہی نہیں کوئی مسافر
ساحل پہ بڑی دیر سے اک ناؤ کھڑی ہے

اترے جو سڑک پر تو کریں ہم بھی ملاقات
ہوتی ہے سحر، دھوپ ابھی پیڑوں پہ چڑھی ہے

لوگوں نے جسے گھر سے نکالا تھا بصد غصہ
چوراہے پہ وہ رات بصد ناز کھڑی ہے

مجھکو بھی نہیں جس کے تصرف کا سلیقہ
وہ دولت پنہاں ابھی مدفون پڑی ہے

زندان شب و روز میں اک دل کے علاوہ
دیوار کھڑی ہے نہ کوئی ہاتھ گھڑی ہے

گندی ہوئی راتوں کا فسانہ یہ کہے کیا
دروازے کا منہ بند ہے زنجیر چڑھی ہے

دیوار کی بانہوں سے ہے لپٹا ہوا چھپر
دہلیز کو تھامے ہوئے دیوار کھڑی ہے

حرمت کوئی مجھ سا ہو تو سونپوں یہ امانت
ہیرے کی کنی دل کی انگوٹھی میں جڑی ہے

غزلیں

عین تابش

غم کی وحشت درد کی خوشبو نہیں ہے شہر میں
شور و شر اتنا ہے بس اک تو نہیں ہے شہر میں

رنگتیں دھندلا گئیں۔ سب نقش مدھم ہو گئے
پیاس لب کی آنکھ کا آنسو نہیں ہے شہر میں

ایک پاگل جس نے تیرا نام روشن کر دیا
موت اس کی ہو گئی یا تو نہیں ہے شہر میں

جستجو صحرا جہاں میں خاک اڑا کر سو گئی
اور اب آرام اک پہلو نہیں ہے شہر میں

بے یقینی کی گھٹن سانسوں پہ حاوی ہو گئی
اب تو کوئی شخص قبلہ رو نہیں ہے شہر میں

شاہد کلیم

کسی سے کچھ نہ کہا ہونٹ سی لیا ہم نے
تمام عمر اسی طرح جی لیا ہم نے

زمیں کی کوکھ میں پانی کے کچھ ہی قطرے تھے
سفر کے نام پہ بے وجہ پی لیا ہم نے

گزشتہ رات فقیروں کی صف میں شامل تھے
اٹھا کے اس نے دیا جو وہی لیا ہم نے

وہ اپنا جسم ندی میں بھگو کے آیا تھا
نمی کے نام پہ لمس نمی لیا ہم نے

تمہارے واسطے وہ چارہ گر رہا ہوگا
اسی سے تو نمک دشمنی لیا ہم نے

چراغ عہد ہے عرفان ذات اے اقبال
تمہارے شعر سے درس خودی لیا ہم نے

غزلیں

لطف الرحمٰن

اگر ضد ہے کہ سیل اشک اس دریا سے لیجائے
سسکتی بے بسی بھی سینۂ صحرا سے لے جائے
خرابوں سے کھنڈر تک سب ہی بے عکس منظر ہیں
وہ جو چاہے مرے سرمایۂ تنہا سے لے جائے!
لئے پھرتا ہے اک شہر بے کردار لمحوں کی
نہ جانے کس ہوس میں کیا سر سودا سے لیجائے
یہی کہنا تھا اس سے کوئی آشنا اس سے کہہ دیتا
سما ہی ہو سکے تو اب شب وعدہ سے لیجائے
عجب لامنظری اجڑی ہوئی راہوں میں لرزاں ہے
وہ اپنی ساری پچھلی ساعتیں جادہ سے لیجائے
کوئی شامل نہیں میری روانی میں تو یہ کیوں ہے
سحر کا خوف، شب کا ڈر، دل سادہ سے لیجائے
چراغ آرزو اب بھی پس انفاس روشن ہے
یہ در پردہ اجالا بھی مری دنیا سے لیجائے

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

مثال زخم جلی دل میں اس کی بات جو تھی،
کئی صدی پہ تھی بھاری وہ ایک رات جو تھی
فروزاں پلکوں پہ کرتے ہی رہے وہ شمعیں
الم نصیب ہوئی شرح التفات جو تھی
سفر طویل تھا بوجھل مگر قدم نہ ہوئے
مری نگاہ تصور میں تیری ذات جو تھی
تری طلب کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں
میں تجھکو سونپ چکا میری کائنات جو تھی
نبھایا ساتھ جو غم نے تو عمر بھر کے لئے
خوشی ملی تو گھڑی بھر کو بے ثبات جو تھی
خود اپنی لاش کو شانوں پہ لئے پھرتی رہی
کسی کے کام نہ آئی مری حیات جو تھی
کھڑا تھا سنگ ملامت کی زد پہ بھی سعدی
ہر اک لب پہ تھی زباں صورت حالات جو تھی

غزلیں

سلطان سبحانی

نشانہ پہ تیرے ہمیشہ رہوں گا
مگر تجھکو اپنا مسیحا کہوں گا

جہاں ایک قطرے کی خاطر تو تڑپے
وہاں میں سمندر سنبھالے ملوں گا

جو معنی کی سولی پہ کھینچوگے مجھ کو
تو ہر لفظ سے شہر پیدا کروں گا!

تری ذات ایسی کہ تشنہ لبوں تک
تجھے لے خدا میں کہاں تک بڑھونگا

وہ بے نام ناموں کے سانپوں سے لپٹے
مگر زہر سارا ہی میں چوس لونگا

کوئی تو اٹھے مجھ سے آگے سفر کو
اثاثہ اسے اپنا سب بخش دونگا

جب ہر لفظ ماضی کی عظمت میں بھاگے
نئے دور کا مرثیہ کیا لکھوں گا!

کرشن کمار طور

واقف رخ ضرر ہے تو میں بھی
ریزہ گرد سفر ہے تو میں بھی

اندھی تقلید کے اندیشوں میں
آنکھ بھر صرف نظر ہے تو میں بھی

ایک ہی درد کے اب دونوں ہیں اسیر
سایۂ قطرۂ شجر ہے تو میں بھی

کچھ نہ ہونے کی صدا غور سے سن
ساعت رفتہ اثر ہے تو میں بھی!

سبز امکانی ہی موضوع طلب
طور اک جستہ خبر ہے تو میں بھی

فرحت شہزاد (کینیڈا)

ہم نے کہا نہ تھا کہ نہ یہ دوستی کرو
اب ننگ وحشت غم دل زندگی کرو

دامن میں ایک تار بھی باقی نہیں بچا
ہاں! اور شہرِ عشق میں صحرا دلی کرو

ملبوس ہے لبادۂ غفلت میں سر نظر
کچھ تم ہی پاس مسلکِ دیوانگی کرو

ہر فکر پر محیط ہے تاریکیوں کا عکس
زخمِ جگر جلاؤ، ذرا روشنی کرو

زخموں سے چور ہو گیا سینہ تو کیا ہوا
ہنس کر ادائے حق غمِ عاشقی کرو

جو لکھ دیا گیا ہے وہ لاریب ہو گیا
ممکن ہو تو دعاؤں سے پہلو تہی کرو

کچھ ٹوٹ سا رہا ہے نشہ شکستِ ذات
تصویر اس کی دیکھ کے خود کو دکھی کرو

کیا پاؤ گے کرید کے شہزاد خاکِ دل!
کس نے کہا تھا آگ سے یوں دل لگی کرو

پرکاش تیواری

خوش رنگیٔ طرب کے ورق ڈھونڈتے رہے
شام و سحر فروغِ شفق ڈھونڈتے رہے

وہ تنگ آ کے گردشِ دوراں سے مر گیا
لوگ اس میں زندگی کی رمق ڈھونڈتے رہے

شہرِ بتاں میں دولتِ ایماں لٹا کے ہم
بوئے وفا رنگِ شفق ڈھونڈتے رہے

چلتی رہیں فرض کی ہم پہ برچھیاں
ورنہ جو اور لوگ تھے حق ڈھونڈتے رہے

جلتے ہوئے مکانوں میں جھلسے ہوئے مکیں
پہلی لغاقتوں کی رمق ڈھونڈتے رہے

تا عمر بار بار کتابِ حیات میں
بے نام ساعتوں کے ورق ڈھونڈتے رہے

یہ مشغلہ عجب تھا کہ پایان لحد تک
پرکاش ہم علاجِ قلق ڈھونڈتے رہے

مسرت اعجازی

مجلس چکا ہوں بہت اب تو سر چھپانا ہے۔
ترے بدن کے سمندر میں ڈوب جانا ہے۔

کسی کو فرصتِ آوارگی نہیں یارو
ہمارے دور کا ہر لمحہ تاجرانہ ہے

فضائے قلب پہ چھائی ہوئی ہے مایوسی
یہ اور بات ہے موسم بہت سہانا ہے،

بنامِ رخصتِ انفاس دوستوں کا ہجوم
یہ جشن تو ہمیں ہر حال میں منانا ہے

ہے حادثوں کو تلاشِ پناہ بستی میں
میں جانتا ہوں مراد رہی ٹھکانا ہے

حیات دورِ تذبذب کو یوں سمجھ لیجے
کہ چھوئی موئی کے پودے پہ آشیانہ ہے

یہ بزمِ ناز تو منزل نہیں ہے ترؔ کی
ابھی تو دور بہت دور مجھکو جانا ہے

تیرگی دل میں بلا کی ہے مٹا لی جائے
اس کے یادوں کی کوئی شمع جلا لی جائے

تو جو چاہے کہ ملے تجھ کو لقب حاتم کا
در سے تیرے نہ کبھی دستِ سوالی جائے

رقص کرتی نظر آتی ہے فضا چاروں طرف
زندہ رہنے کی کوئی راہ نکالی جائے

شوق سے ساری تمنائیں نکالے دل کی
کہہ دو قاتل سے کوئی وار نہ خالی جائے

وہ جو رکھتا مجھے بڑھ کے دل و جاں سے عزیز
بات کس طور سے اس شخص کی ٹالی جائے

جس میں ہو سارے زمانے کی بھلائی مضمر
آج دنیا کی فضا ایسی بنا لی جائے،

وفور شمسی گیاوی

غزلیں

تبصرے

کلام حیدری

کتاب کا نام	پڑاؤ
صنف	ناول
مصنف	غیاث احمد گدی
سال اشاعت	۱۹۸۰ء
ناشر	صبا پبلشیر جھریا
قیمت	۲۰ روپے
مبصر	کلام حیدری

غیاث احمد گدی اردو افسانہ نگاری میں ایک مستند اور معتبر نام ہے۔

"پڑاؤ" اس کا پہلا ناول ہے۔

ابتدائیہ میں غیاث نے لکھا ہے:

"دراصل کہانی کا اپنا کوئی آغاز نہیں ہوتا" اگر غیاث نے کہا ہوتا کہ "کہانی کا آغاز نہیں ہوتا" تو بات دوسری ہوتی مگر "اپنا کوئی آغاز نہیں ہوتا" کہا ہے تو سوال ہے کہ پھر کہانی میں کس چیز کا آغاز ہوتا ہے؟ اگر کہانی کا اپنا آغاز نہیں ہوتا

دراصل غیاث احمد گدی فنکار ہے۔ ابتدائیہ وغیرہ لکھنے کا کام اس کا نہیں ہے۔ اس لئے میں اس کے اس ہنر پر پانی ڈال کر کیا کروں گا۔

اختتامیہ میں غیاث نے کہا ہے:

جس طرح کہانی کا کوئی آغاز نہیں ہوتا، اسی طرح اس کا کوئی انجام بھی نہیں ہوتا۔" یہاں "اپنا" نہیں ہے۔ دراصل ابتدائیہ اور اختتامیہ وغیرہ (یعنی دیباچہ، تبصرہ وغیرہ) کے لئے غیاث کے یہاں قابل ذکر بات کی تلاش بے کار ہے۔

"پڑاؤ" کے دوسرے باب میں انگریزی کے چار مصرعے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ غیاث انگریزی نہیں جانتا۔ انگریزی شاعری تو خیر بہت دور کی بات ہے ——— کوئی فنکار تخلیق کرنے کے لئے دوسری زبان کے اشعار استعمال تخلیقی طور پر بھی کر سکتا ہے۔ جب وہ اس زبان کو جانے ——— کلیم الدین احمد سے یا فاروق سے پوچھ کر اسے اپنی کہانی یا ناول میں فٹ کرے تو یہ واقعی MASK چھپانے والی بات ہے

چہرہ، چہرہ سے جائیے نیا خوبصورت چہرہ ......

"پڑاؤ" غیاث کی طویل کہانی ہے۔ ناول ہے کہ نہیں یہ بحث طلب امر ہے۔ مگر "پڑاؤ" غیاث کو اپنے مقام سے گراتا نہیں ہے۔ اسے اوپر بھی اٹھاتا نہیں ——— یہ داد کے لائق ہے۔ اس لئے غیاث نے صفحہ ۱۱ پر ٹھیک ہی لکھا ہے:

داد ——— ایک مصنف کی حیثیت سے تعین کیجئے مجھے یہی نعمت ملے گی۔

داد، کو غیاث جیسا فنکار نعمت کہتا ہے۔ حالانکہ اس کا فن داد کے لئے نہیں ہونا چاہئے انبساط اور نئی دنیا میں پہونچ جانے کی مسرت ہونی چاہئے۔

نام کتاب — آگ الاؤ اور صحرا
نام مصنف — قمر احسن
صنف — مختصر افسانے
ناشر — شب خون، کتاب گھر الہ آباد
سال اشاعت — ۱۹۸۰ء
قیمت — ۲۵ روپئے
تعداد اشاعت — ایک ہزار
مبصر — کلام حیدری

کتاب مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جسے منتخب و مرتب نیر مسعود صاحب نے کیا ہے۔ یہ دھوم دھام مارکیٹ ویلو بڑھانے کے سوا کچھ نہیں ہے جس طرح دنیا کے بہترین مصنفین کے مجموعے (انتخاب) اہم ناقدین مرتب کرتے ہیں۔ ان کی طرح گویا اس کتاب کو بھی پیش کیا ہے کہ جیسے قمر احسن دوستو۔وسکی، ٹالسٹائی، یا ویلس، لو یا ہمنگ وے ہیں کہ سب کے افسانوں کا ایک انبار ہے اور اس میں سے ایک انتخاب کیا گیا ہو۔ حالانکہ قمر احسن کا شمار ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کے افسانہ نگاروں میں ہی شمار ہوتا ہے۔

فرمائشی پیش لفظ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ جو سولہ صفحات پر مشتمل ہے — حالانکہ سولہ صفحے کا کوئی افسانہ بھی نہیں ہے۔

نئے افسانے کے پیدا ہونے کے سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا نظریہ (صفحہ ۸) یہ ہے۔

"نیا افسانہ کفن اور پھندنے دونوں کی روشنی میں برآمد ہونے والے ادبی اظہار کے طریقوں اور نظریات سے عبارت ہے"

یہ دیباچہ قمر احسن جیسے نئے لکھنے والے فن کے لئے پھندنا ہے۔ اور اگر وہ اس سے خوش فہمی میں مبتلا ہوئے تو ان کے مستقبل کا کفن بھی۔

ایک افسانے "یا مصطفٰے" پر ست آٹھ سطور لکھنے کے بعد فاروقی نے جو فیصلہ دیا ہے وہ یوں ہے (صفحہ ۱۳)

"اگر افسانہ نگار اپنی شخصیت کو تھوڑا اور پردے میں رکھتا اور اس بات کو پوری طرح واضح نہ کرتا کہ وہ خود افسانہ میں ایک کردار (بلکہ واحد کردار) ہے۔ تو افسانہ کی فنی تکمیلیت اور بھی بھرپور ہو جاتی"

عام طور پر قمر احسن کے ان ابتدائی افسانوں میں خود فن کار افسانے پر مسلط رہتا ہے۔ اور فن کی باریکیوں سے ناواقف نظر آتا ہے۔ کہانی لکھنے سے زیادہ ان کو یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اپنی عربی دانی کا مظاہرہ کریں ——— "مظاہرہ" فن کاری کا دشمن ہے۔ اپنا مظاہرہ تقریباً ہر افسانے میں موجود ہے۔ خود ان کے دیباچہ نگار نے یہی لکھا ہے۔

کتاب کا عنوان ان کے ناولٹ کا عنوان ہے جو آخر میں شریک اشاعت ہے۔

دیباچہ نگار نے قمر احسن کے ساتھ کافکا کا نام کئی جگہ لیا ہے۔ لیکن فاروقی جانتے ہیں کہ معمولی قاری کافکا کے ساتھ قمر احسن کا نام پڑھ کر مرعوب ہو جائیں گے۔ مگر لوگ فاروقی کو غلط بات لکھنے پر ضرور ٹوکیں گے، اس لئے انہوں نے یہ لکھا

"ان (قمر احسن) کے یہاں ابھی کافکا کی [illegible]
شدت بیانیہ کی پراسرار اشکاری قوت
شاہانہ لاشخصی انداز بیان کا پتہ بھی نہیں"

ابھی قمر احسن کو خوش کرنے کے لئے ہے کہ ابھی نہیں مگر گھبراؤ نہیں آگے یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ لیکن "پتہ بھی نہیں" کہہ کر مستقبل کے امکانات کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے

مجموعی طور پر یہ مجموعہ (ترک و احتشام اور سولہ صفحے کے دیباچے کے باوجود) معمولی ہے۔

کتاب کا نام	ادھورے چہرے
مصنف	شمیم صادقہ
صنف	مختصر افسانے
ناشر	بھوپال بک ہاؤس ابراہیم پورہ بھوپال
سال اشاعت	۱۹۸۰ء
قیمت	۱۶ روپے
مبصر	کلام حیدری

شمیم صادقہ کے سات مختصر افسانوں کا یہ مجموعہ افسانوی مجموعوں کی بھیڑ بھاڑ میں اپنی پہچان رکھتا ہے۔ ایک نئے لکھنے والے کے لئے یہ اہم بات ہے۔ خود احتسابی ایک اور خوبی ہے۔ جو شمیم صادقہ کے فن کار ہونے کی دلیل ہے۔ انہوں نے صرف سات افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ شائع کرایا ہے۔ اس کا مطلب ہے انہوں نے سخت انتخاب کیا ہے۔ اور اپنے افسانوں کے سلسلے میں عام طور کا تالے دوڑے کے رجحانات سے خود کو الگ رکھا ہے۔

انہوں نے کسی جید دیباچہ نویس کا سہارا بھی نہیں لیا ہے۔ سیدھے قاری تک افسانہ پہونچا دیا ہے۔ عرض حال کے عنوان سے خود جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ان کی ایمانداری اور انکساری کا ثبوت ہے۔ اس دوسرے مجموعے کے افسانے "کرچیاں" کے افسانوں سے تھوڑا آگے ہے۔ ارتقا کی اس کیفیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمیم صادقہ کا فن اور پختہ ہوگا۔ اور ایک دن وہ اردو کی ممتاز افسانہ نگار ہو کر بہار کے ادبی وقار کو بڑھائیں گی۔

بجھی ہوئی تیلی، کا افسانہ یوں شروع ہوتا ہے۔

"جب کوئی گھر کا نہیں ہوتا تو بازار اسے اپنا لیتا ہے"

ختم یوں ہوتا ہے:

لیکن تیلی! ایک مجھ ہی نہیں جلتی ....

تیرا اور اس کا رشتہ کتنا گہرا ہے۔ ضرورت اور ضرورت"

"........ اور بجھی ہوئی تیلی میں گھر کے باہر پھینک دی"

شمیم صادقہ کے ساتوں افسانے ستھرے نکھرے ہوئے اور روشن تر مستقبل کی ضمانت ہیں۔

کتاب کا نام	سمندر کا خواب
مصنف	رحمان سانتر
صنف	افسانے
ناشر	سید پبلشرز حیدرآباد
سال اشاعت	۱۹۸۰ء
تعداد اشاعت	ایک ہزار
قیمت	دس روپے
مبصر	کلام حیدری

اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد یہ بات سوچ کر ندامت ہوتی ہے کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں کہاں کہاں کیسے کیسے ہیرے پڑے ہیں۔ لیکن ہمیں خبر نہیں ـــــــ یہ الگ بات ہے کہ یہ ہیرے تراش و خراش اور دیگر باتوں کے محتاج ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر ہیرے ہیں تو ان پر توجہ دی جانی چاہیے۔

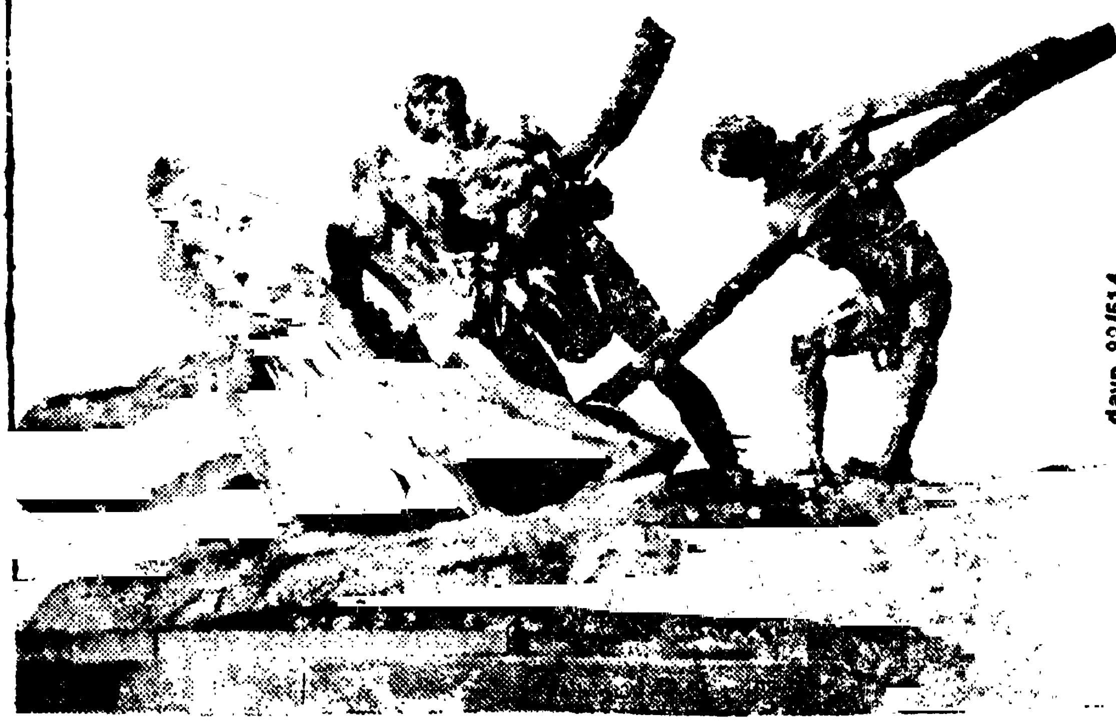
اس مجموعے کے اکثر افسانے اوسط درجے کی فنکاری کے نمونے ہیں۔

"سمندر کا خواب" رحمان سانتر سے تقاضہ کرتا ہے کہ وہ اپنے وجدان کو آزاد چھوڑ دیں۔ اسے کسی حصار میں لینے کی کوشش نہ کریں۔ رحمان سانتر مستقبل کا اہم افسانہ نگار ہوگا ـــــ ایسا مجھے لگتا ہے۔

"غریبی دُور کرنے کا ایک ہی منتر ہے ——
اور وہ ہے واضح مقصد اور ڈسپلن کے
احساس کے ساتھ سخت محنت"

—— اندرا گاندھی

ستیہ میو جیتے —— سترم ایو جیتے



R. N. Regd 4253 64
P. T. Regd No. Gy 7
Phone 432

THE Aahang Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

February 1983 **Price-Rs. 2-00**

एकता मंच, गया



فیاض حالی   کلام حیدری   راج بہادر گوڑ

March 1983   Price—Rs. 2-00

دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا
قائم شدہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

ایک سال کیلئے ——— چوبیس روپے
فی کاپی ——— ۲،۰۰ روپے
فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹر
نوشابہ حق

رفقاء ایڈیٹرز
شفق، عبدالصمد

کتابت: کلیم القاسمی ڈہرگردی
طباعت: ہند لیتھو پریس گیا۔

محتویات

پاکستان میں وزیر آغا کے علاوہ کئی بہت اچھے انشائیے لکھنے والے ہیں۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں انشائیوں کے خالق بگڑے شاعروں" کے مرثیہ گو ہوجانے کا ثبوت فراہم کرنے والے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ہیں جو اردو ادب میں کئی صنفوں کے مانے ہوئے منفرد فنکار ہیں۔ ہندوستان میں بھی اچھے انشائیہ نگار ہیں۔ مگر یہاں عالم یہ ہے کہ جن کو کچھ نہیں آتا، یہاں تک کہ تذکیر تانیث، واحد جمع، وغیرہ کی تمیز نہیں ہے۔ انشائیہ نگار ہی نہیں بلکہ اس کے موجد، سربراہ اور سرپرست بنے بیٹھے ہیں۔ اپنے کلاس روم کی جہالتوں کو جب اردو کے بعض رسائل میں لاتے ہیں تو "کارطفلاں" کا حشر بھی معلوم ہوجاتا ہے بعض تو انشائیہ کیا ہے؟ وغیرہ قسم کے مضامین اس زعم کے ساتھ لکھتے ہیں کہ جیسے انہوں نے انشائیوں کا اور اس فن کا باضابطہ مطالعہ کیا ہو۔ اور اس پر سوچا بھی ہو ——— ایسے ہی ایک صاحب جو پروفیسر شپ کی دھن میں انشائیوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں عجیب عجیب نظریات کو نمونے پیش کر رہے ہیں۔ "انشائیہ ذہنی ترنگ ہے"

کسی نے پوچھا صاحب! انشائیہ جل ترنگ کیوں نہیں ہے؟

بولے! آپ سے کون بحث کرے؟

ظاہر ہے بحث کرنے میں مزہ اور علم دونوں اسی سے حاصل ہوسکتا ہے جو "مزہ" اور "علم" دونوں صحیح لکھ سکے۔ اس لئے پوچھنے والا خاموش ہوجانے کو غنیمت سمجھتے ہوئے باتوں کا موضوع بدل دیتا ہے مراد ہماری یہ ہے کہ سب سے پہلے صحیح اردو لکھنا چاہیئے۔ داغ نے جو کہا ہے وہ تو بہت بعد کی چیز ہے۔ کہ اردو زبان آتے آتے آتی ہے ——— یہاں تو عالم یہ ہے کہ کسی بھی اردو کتاب کے چار صفحات کا "DICTATION" ان اردو مند پروفیسر شپ "حضرت فدوی" کو دیدیا جائے تو وہ کم از کم چھ فاش غلطیاں فی صفحہ کے حساب سے یقیناً کریں گے۔ ایسے لوگ انشائیہ لکھیں گے تو اپنے شہر، صوبے، اور زبان کی رسوائی نہ ہوگی تو کیا ہوگی؟

مارچ کا آہنگ پیش خدمت ہے ہمیں مسرت ہے کہ ہم رسالہ وقت پر شائع کر رہے ہیں اور ——— اس کا فیصلہ قارئین کریں گے کہ یہ کیسا ہے۔؟

کلام حیدری

کے مختصر افسانوں کا

چوتھا مجموعہ

لہو رو کے لکھا

زیر طبع

دی
کلچرل اکیڈمی گیا

شاہد کلیم

شاعری میں مصوری

فنون لطیفہ کی پانچ قسمیں ہیں —— شاعری، مصوری، تعمیر، رقص اور موسیقی، یہ فنون لطیفہ انسانی روح تک اترنے اور احساس خفتہ کو بیدار کرنے کے ذرائع سے عبارت ہیں۔ کروچے اظہار اور فنون لطیفہ دونوں کو ایک ہی سطح پر سمجھا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"ALL ART IS EXPRESSI ON THEREFCRE ALL EXPRESSION IS ART"

بہرحال یہاں صرف یہ پیش کرنا مقصود ہے کہ شاعری میں کس حد تک مصوری ہوئی ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے شاعری اور مصوری کی تعریف کا مطالعہ کیا جائے علم معاشیات کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ جہاں چھ ماہر معاشیات ہوں گے وہاں علم معاشیات کے سلسلے میں سات طرح کے خیالات کا پیدا ہونا اگزیر ہے۔ ٹھیک اسی طرح شاعری کے بارے میں بھی مختلف لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔ ملٹن کے مطابق شاعری کو حساسی، جذباتی اور آسان ہونا چاہیئے۔ ورڈزورتھ کے مطابق یہ شدت احساس کا من مانا بہاؤ ہے جو شانت ماحول میں جنم لیتا ہے۔ کالرج کے نزدیک اچھی شاعری وہ ہے، جس میں سب سے اچھے الفاظ اچھی ترتیب میں پیش کئے گئے ہوں۔ میتھو آرنالڈ شاعری کو زندگی کی تنقید سمجھتا ہے۔ تو کار لائل شاعری میں صرف موسیقیت کا متلاشی ہے۔ میراجی فرماتے ہیں کہ حقیقت کو اگر خواب کی صورت میں بدل دیا جائے تو خالص شاعری حاصل ہو جائے گی،

بہرحال محولہ بالا تعریف سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاعری کا اثاثہ الفاظ، نغمگی اور شدت احساس ہے ان کے بغیر شاعری کا تصور ممکن نہیں۔ شاعری الفاظ کے وسیلے سے کسی خیال، کسی موضوع، اور کسی جذبہ کا اظہار کرتی ہے۔ اور حواس خمسہ کو بیدار کرنا چاہتی ہے۔ والٹر پیٹر نے کہا ہے:

"الفاظ ادب کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ لہذا انہیں استعمال کرنے کے لئے انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے"

شاعر کے سامنے زندہ متحرک اور فعال الفاظ کے علاوہ بے رنگ مردہ اور مجہول الفاظ کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور موضوع کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرتا ہے اور انہیں استعمال میں لاتا ہے۔ وہ بے رنگ الفاظ میں رنگ بھرتے، بے جان اور مردہ الفاظ میں جان دینے اور انہیں مفہوم و معنی کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔ سارتر نے کہا ہے:

THE FUNCTION OF A WRITER IS TO CALL A SPADE A SPADE. IF WORDS ARE SICK. IT IS UP TO US TO CURE THEM.

(THE SICKNESS OF THE LANGUAGE)

الفاظ بے مفہوم و بے مطلب ہوا کرتے ہیں یہ ہمیشہ ماحول اور SITUATION کے پس منظر میں مفہوم و معنی کا جامہ پہنتے ہیں بظاہر نہ یہ خوب صورت ہوتے ہیں اور نہ یہ بد صورت، اسی لئے شاعری میں محاکات کا ذکر آتا ہے۔ شاعر موضوع کے مطابق اپنی شاعری میں ماحول اور سماں باندھتا ہے اور ماحول سے مطابقت رکھنے والے الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں اپنی باتوں کی مزید وضاحت کے لئے I. A. RICHARDS کے قول کو پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ کہتا ہے:

WORDS HAVE NO INTRINSIC LITERARY CHARACTERS. NONE ARE EITHER UGLY OR BEAUTIFUL. INTRINSICALLY DISPLEASING OR DELIGHTFUL, EVERY WORD HAS INSTEAD A RANGE OF POSSIBLE EFFECTS VARYING WITH THE CONDITIONS INTO WHICH IT IS RECEIVED"

(RHYTHM AND METERE)

مصوری کی تعریف بھی شاعری کی تعریف سے ملتی جلتی ہے۔ یہ بے الفاظ شاعری کے نام سے عبارت ہے۔ یہ خاموشی اور بے زبانی کے ساتھ روح تک اترنے اور حواس خمسہ کو بیدار کرنے کا سلسلہ ہے۔ یہ روح انسانی اور فطرت کے مابین تعلق بنائے رکھنے کا ذریعہ ہے۔ بہت سے خیالات ایسے ہیں جن کا اظہار لفظ کے وسیلے سے نہیں ہو پاتا۔ بہت سے کوائف ایسے ہیں جو الفاظ کا جامہ نہیں پہن پاتے۔ ایسی حالت میں ان خیالات و کوائف کو صرف احساس کی ترازو پر ہی تولا جا سکتا ہے۔ اس طرح فن مصوری بھی انسانی زندگی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ "سلطان سبحانی" "ہم زبان" کے شمارہ نمبر ۱ بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء میں رشید آرٹسٹ کا تعارف کراتے ہوئے فن مصوری کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

"خطوط اور رنگوں کو منظوم کرنے کا نام مصوری ہے۔ اس لئے مصوری بھی شاعری ہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ آرٹسٹ لفظوں کی بجائے خطوط اور رنگوں کو ذریعہ اظہار بناتا ہے۔ اور موضوع جسم اور معنویت عطا کرتا ہے۔"

فنون لطیفہ کی اساس کیا ہے؟ اس سلسلہ میں جناب وزیر آغا اپنی کتاب "تخلیقی عمل" میں لکھتے ہیں کہ:

"آہنگ فنون لطیفہ کے لئے اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر یوں ہوتا ہے کہ جب اس پر جسم حرکت کرتا ہے۔ تو فن کی صورت رقص کہلاتی ہے۔ جب آواز اس پر حرکت کرتی ہے۔ تو موسیقی جنم لیتی ہے۔ جب خطوط لطیفہ

اندر اس آہنگ کو سمو لیتے ہیں۔ تو تصویر ابھرتی ہے۔ اور جب اس پر الفاظ اور تصورات جنبش میں آنے ہیں تو شعر پیدا ہوتا ہے،،

مصوری کا تعلق فطرت سے ہے، فطرت بے زبان اور گونگی ہوتی ہے۔ اس طرح مصوری بھی گونگی ہے فن مصوری میں تصویروں کے ذریعہ احساس کو جگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فطرت کے رنگارنگ نظارے کینوس پر برش اور رنگوں کے ذریعہ منتقل کئے جانے ہیں۔ اس طرح مصوری کے لئے برش رنگ اور کینوس کا ہونا ضروری ہے۔

یہ اور بات ہے کہ اسکن نے بہ بانگ دہل کہا کہ کانسٹیبل[۱] کی تصویروں میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ ڈکنس نے ملے[۲] (MILLAIS) کے ایک شاہکار کو ذلیل مکروہ، کراہت انگیز اور نفرت انگیز بتایا۔ ٹالسٹائے کا خیال تھا کہ مانے[۳] (MANET) اور مونے[۴] (MONET) کی تصویریں انتہائی بدصورتی کی مظہر تھیں۔ ایل گریگو[۵] (ELGEREGO) کا خیال تھا کہ مائیکل اینجیلو کو تصویر بنانے نہیں آتا تھا مائیکل اینجیلو تیستان (TITIAN) کو برا بھلا کہتا تھا۔

ویلاس کوئے (VILAS QUEZ) نے اقبال کیا، رفائیل مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ ۱۸۶۳ء کی فرانسیسی کمیٹی نے جن کو مہمل اور مردود قرار دیا۔ ان میں مانے، کوربے[۶] اور وسلر[۷] بھی شامل تھے۔ وسلر بنام اسکن کے ایک مقدمہ میں ایک صاحب نے حلفیہ بیان دیا کہ وسلر کی تصویریں فن مصوری کے اعتبار سے تصویریں تھیں ہی نہیں۔ روزیٹی[۸] کا خیال تھا کہ ملے کی تصویریں زیادہ تر آڑی ترچھی لکیریں ہیں۔ جب وسلر کو سیزان کی ایک مشہور تصویر دکھائی گئی تو اس نے کہا اگر کسی دس سال کے بچے نے یہ تصویر اپنی سلیٹ پر بنائی ہوتی اور اس بچہ کی ماں واقعی ایک اچھی ماں ہوتی تو وہ اس کی خوب ٹھکائی کرتی، اور خود سیزان صاحب نے وین گاگ سے کہا ایمان کی بات ہے کہ تمہاری تصویر کشی بالکل مجنونانہ ہے۔ سرفرینک ڈکسی نے جب وہ رائل اکاڈمی کا صدر تھا کہا:

"حسن کا معیار وہی ہو سکتا ہے جو سفید اقوام نے مقرر کیا ہو"

(مصوری کے مشہور نقاد ٹامس باکسن کے بیانات۔ شب خوں کے شمارہ ۶۳۵ بابت اگست ۱۹۷۲ء سے ماخوذ)

۱ے انیسویں صدی کا انگریز مصور جس کے بارے میں اب کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا عظیم ترین لینڈ اسکیپ نگار تھا۔

۲ے انیسویں صدی کا مشہور فرانسیسی مصور،

۳ے ۴ے انیسویں صدی کے دو مصور جنہوں نے اس فن کی کایا پلٹ دی مانے پورٹریٹ میں انقلاب لایا۔ اور مونے لینڈ اسکیپ میں، مونے IMORESSIONISM کا بانی تھا۔

۵ے سولہویں صدی کا اسپینی مصور جس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ اپنے طرز کا موجد اور خاتم تھا۔

۶ے سترھویں صدی کا اسپینی مصور مشہور پورٹریٹ نگار۔

۷ے انیسویں صدی کا عظیم لینڈ اسکیپ اور پورٹریٹ نگار فرانسیسی مصور،

۸ے انیسویں صدی کا انگریز مصور جس نے جاپانی مصوری کے بہت سے اصول مغربی فن میں برتنے۔

۹ے انیسویں صدی کا انگریز شاعر اور مصور PRE-RAPHAELITE تحریک کا بانی۔

اس حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ شہیر نے اندرون کرب سے نجات حاصل کرنے کے لئے مصوری کا سہارا لیا۔ فنکار ہمیشہ موضوع کو اپنے احساس کی بھٹی میں تپا کر پیش کرتا ہے۔ وہ ریاض اور خون جگر سے اپنے فن کو جلا اور رنگ بخشتا ہے۔ اور کسی حقیقت کا انکشاف کرتا ہے۔ ایک سائنس داں اور فن کار میں اسی سطح پر نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے سائنس داں جس موضوع کو پیش کرتا ہے۔ اس کا واسطہ حقیقت سے ہوتا ہے۔ مگر اس میں احساس اور جذبہ کی شدت مفقود ہوتی ہے۔ ایک فنکار اپنی تخلیق میں اپنے احساس اور جذبہ کو اس حد تک سمو دینا چاہتا ہے۔ جہاں تک وہ ضروری سمجھتا ہے۔ قاری اپنے اندر انہیں وہیں تک جذب کرتا ہے جہاں تک اس کے بس میں ہے۔ اس طرح فن کار اور قاری کے درمیان تناسب قائم ہو یہ ضروری نہیں۔ یہ تناسب قائم ہو بھی سکتا ہے۔ اور نہیں بھی۔ LUSTEIN نے اپنی کتاب "APPRECI - ATION POETRY AND PAINTING" میں اس بات کی وضاحت یوں کی ہے:

"HEARD MELODIES ARE
SWEET BUT THOSE
UNHEARD ARE SWEETER
MAY APPLY AS A MO-
-ZART BUT NOT TO
ORDINARY BEINGS"

اب تک کی تمام باتیں تخلیق کی پسندیدگی سے واسطہ رکھتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اردو شاعری میں مصوری شامل ہے کہ نہیں۔ یعنی ایسے الفاظ کا استعمال اردو شاعری میں ہے کہ نہیں جو اپنی شبیہ رکھتے ہیں۔ یا اشعار میں رنگوں کا استعمال کس حد تک ہوا ہے۔ یہ جاننے کے لئے اگر کلام سلف کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اردو میں ایسے اشعار کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے جن میں ایسے الفاظ کا استعمال ہوا ہے جو بے رنگ اور جن کی کوئی شبیہ نہیں ہے۔ میر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جنوں کا عبث میرے مذکور ہے
جوانی دوانی ہے، مشہور ہے

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ذوق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

دین و ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا اس وقت میں
اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

قسمت ہی سے ناچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

مومن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کھا گیا جی غم نہاں افسوس
گھل گئی غم کے مارے جاں افسوس

ناکامی امید پہ صبر آئے تو کیا آئے
ہر کام پہ کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوتا

داغ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

طور بے طور ہوئے جاتے ہیں
وہ تو کچھ اور ہوئے جاتے ہیں

یہ سن سن کے مرنا پڑا ہر کسی کو
نہیں مرتے دیکھا کسی پر کسی کو

درج بالا اشعار سے واضح ہے کہ ان میں ایسے الفاظ کا استعمال نہیں ہے۔ جو اپنی شبیہ رکھتے ہیں۔ نہ تو ان اشعار میں نظارہ فطرت کا انعکاس ہے۔ اور نہ رنگوں کا پرتو۔ سیدھے سادے الفاظ میں ہلکے پھلکے خیالات کا اجتماع ہے۔ مگر یک لخت ان کی شاعری کو نظارہ فطرت سے عاری اور رنگوں سے محروم شاعری کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ جا بہ جا ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں فطرت کی جلوہ گری اور رنگوں کی تابانی موجود ہے۔ امیر مینائی اور عزیز لکھنوی نے رنگ میں اپنی دلچسپی کا جا بہ جا ثبوت پیش کیا ہے ؎

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہے ایک کمسن کے لئے،

(امیر مینائی)

ہے فنا آموز ہر اک خط تیری تحریر کا
رنگ اڑتا کہہ رہا ہے پیکر تصویر کا

(عزیز لکھنوی)

غالب کے یہاں بھی بے رنگ و پیکر اشعار مل جاتے ہیں۔ مگر ایسے اشعار کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ؎

تری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اس نے تو اپنی شاعری میں بھرپور مصوری کی ہے۔ ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں ایسے الفاظ کا استعمال ہے۔ جو اپنی شبیہ رکھتے ہیں۔ اور جن کا تعلق رنگوں سے ہے لہو کا ذکر اس کے ہاں بار بار آتا ہے۔ ہرے رنگ کا استعمال جا بہ جا ملتا ہے ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

تا کہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

اوپر جو جائزہ لیا گیا ہے اس کا تعلق صرف غزلیہ شاعری سے ہے۔ مصوری کی صلاحیت کے اظہار کے اعتبار سے بلاشبہ غزلوں سے زیادہ اردو شاعری کی طویل اور مختصر نظمیں، مراثی، اور مثنویوں کے مختلف حصے اہمیت کے حامل ہیں۔ مثنویوں میں بہاریہ منظر یا محفل رقص و طرب کی منظر کشی کے سلسلے میں اردو شاعروں نے مصوری کا حق ادا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں قدیم مثنویاں اور عہد وسطیٰ میں لکھی گئی مثنویاں اہمیت رکھتی ہیں۔ جیسے نشاطی کی "پھول بن" ملا وجہی کی "قطب مشتری" میر حسن کی سحر البیان اور دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم وغیرہ۔

نظموں میں مصوری کے اعتبار سے نظیر اکبرآبادی تمام شعراء میں اہمیت رکھتے ہیں۔ نظیر نے ہولی پر نظم لکھتے ہوئے نہ صرف مفرد رنگوں کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ مرکب رنگوں کی عکاسی بھی کی ہے۔ ان کی نظمیں مصوری کی مختلف تکنک رکھتی ہیں۔ انہوں نے متعدد موضوعات پیش کی ہیں۔ اور ہر جگہ اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے دیہات کے ماحول، میلے ٹھیلے کے مناظر، نیز سبزیوں اور مٹھائیوں کے رنگ کی بڑے حسین انداز میں عکاسی کی ہے۔ ان کی نظم ہولی کا ایک بند پیش ہے ؎

قاتل جو میرا اوڑھے اک سرخ شال آیا
کھا کھا کے پان ظالم کر ہونٹ لال آیا
گویا نکل شفق سے ابدر کمال آیا

جب منہ پہ وہ پری رو مل گلال آیا!
اک دم تو دیکھ اس کو ہولی کا حال آیا

اس طرح جوش نے جنگل کی شہزادی، کوہستان دکن کی عورت، گنگا کے گھاٹ پر، جمنا کے کنارے، نظارہ ماضی اور دوسری نظموں میں رنگ و منظر کو کاغذی پیرہن عطا کر دیا ہے۔ ان کے یہاں احساس تصویر بن جاتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی قوت بیان کے سہارے انہوں نے ان مناظر اور رنگ و منظر کو پیش کر دیا ہے۔ جن سے وہ محظوظ ہوتے ہیں ؎

دیوی ہے سحر کی جلوہ گر!
جھونکے ہیں نسیم کے معطر!
خاموش ندی پہ ہے دھواں سا
سبزہ پہ ہے دھوپ کا گماں سا
کیا مست ہوائیں آرہی ہیں
کوکو کی صدائیں آرہی ہیں

(نظم نظارہ ماضی)

میر انیس کا موضوع اگرچہ محدود تھا۔ لیکن اس محدود موضوع سے متعلق اصطلاحوں اور رنگ و پیکر کے استعمال کے لحاظ سے ان کی اہمیت کسی دوسرے شاعر سے کم نہیں۔ صبح کے منظر ہوں یا جلتی دوپہر کی کیفیت۔ جنگ کی سماں ہو، گھوڑوں کی ٹاپ سے نکلتی ہوئی چنگاری ہو۔ یا چمکتی ہوئی تلوار کی روشنی، غرض انیس نے مصوری کا سہارا لے کر اظہار میں ابلاغ کی خصوصیات پیدا کی ہیں۔

اقبال کی شاعری میں بھی متعدد مقامات پر مصوری اور پیکر تراشی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ رنگوں کے سلسلے میں اقبال رنگ اخضری کے مداح ہیں۔ اس رنگ کا ذکر انہوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ اور مخصوص رنگ و نقش کی ترتیب قائم کی ہے ؎

پھول ہیں گلشن میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن۔

انہوں نے اپنی طویل نظم کے ابتدائی حصے میں بالعموم یہ خصوصیت پیدا کی ہے۔ اقبال چونکہ خارجی مناظر کے اظہار میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں مصوری کی خصوصیات سے بہر حال دلچسپی لینی ہی پڑی ہے۔ ان کی نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ؎

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو،
طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

(نظم ایک آرزو)

فیض نے غزل و نظم کے مختلف اشعار میں اور مخدوم نے نظموں میں عام طور پر مصوری کی اصطلاحوں اور اس کے اجزا سے کام لیا ہے ؎

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز

ساز دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمار کیف آگیں
آرزو، خواب تیرا روئے حسیں
(نظم سرود شبانہ، فیض احمد فیض)

یہ کوئی رستہ ہے جس رستہ میں
نہ کوئی پھول نہ پتہ
نہ کوئی پیڑ نہ پھل
ایک ہیولائے سیاہ
حد نظر
جس طرف دیکھو کھنڈر
(نظم درۂ موت۔ مخدوم محی الدین)

مصوری کے اجزا میں جہاں رنگوں کی بنیادی اہمیت ہے۔ وہاں لکیروں، زاویوں، اور مختلف شیڈس - (SHA-DES) بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ مخدوم کی نظموں میں یہ شیڈس جگہ جگہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ فیض کی چشم بصیرت قطر سے مختلف رنگ کا احساس حاصل کر لیتی ہے۔ مثلاً فیض کے یہاں درخت، کہکشاں، ساز اور مخدوم کے یہاں پھول پتہ، پیڑ، پھل اور کھنڈر جیسے الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔

غرض فیض اور مخدوم نے بھی شعری اظہار میں لاشعوری طور پر مصوری کے اجزا سے کام لیا ہے۔ اس لئے کہ ان کے پیش نظر صرف [illegible] مزدوروں، کسانوں اور نچلے طبقے کے لوگوں کے ہی مسائل ہیں۔ انسان کی مجبوری، بے بسی۔ اور کربناکی کا سبب سماجی ناانصافی، معاشی بدنظمی، طبقاتی استحصال، اور سیاسی جبر و استبداد ہے۔ اور اس طرح یہ انسان کے انفرادی، دکھ درد۔ اور اس کے نجی مسائل کو معاشی اور سماجی انقلاب کے ذریعہ حل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تخلیقات بھی اسی نقطۂ نظر کے زیر اثر صرف وجود میں آتی ہیں۔ یہاں تک کے سرخ رنگ بھی ان کے یہاں جھنڈے کا نشان بن جاتا ہے

ذوق حسن اور احساس جمال کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اس طرح ان کے ہاں ادب صرف تحریک کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اور ادب کا کسی تحریک سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

ترقی پسند ادب کے بعد جمالیات کا انداز بدلا۔ نقطۂ نظر میں تبدیلی ہوئی۔ نئی قدروں کی آگہی نے آرٹ اور فنون لطیفہ کی پرانی قدروں سے ہٹ کر نئی قدروں کی دریافت کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ جدید اردو شاعروں نے بھی شاعری میں مصوری کی اصطلاحوں کو نئے اشاروں کے ساتھ پیش کیا۔ عہد جدید تک آتے آتے مصوری بھی نئی قدروں کی خوگر ہو گئی۔ اس کی اصطلاحوں میں تبدیلی ہوئی۔ عالمگیر طور پر شہرت یافتہ مصوروں نے اس فن کے نئے اصول وضع کئے۔ مفرد رنگوں کا جو تصور پہلے تھا وہ اب مرکب آمیزہ کی شکل میں پیش ہونے لگا۔ پہلے جو زاویوں کی ترتیب میں تنظیم ہوا کرتی تھی۔ وہ اب موج خرام یار بن گئی۔

غرض فن مصوری کی بنیادی تصورات میں تبدیلیاں ہوئیں یہی وجہ ہے کہ اردو کے جدید شاعروں نے بھی اس تبدیلی کا انعکاس اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اور نظموں کے اقتباسات اس امر کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ اردو کے جدید شعرا بھی مصوری کی اصطلاحوں سے وابستہ رہے ہیں سے

یہ آسمان میں سیاہی بکھیر دی کس نے
ہمیں تھا شوق بہت اس میں رنگ بھرنے کا
(باقی)

سبز ٹیلے ہیں جہاں سرخ چھتوں کے گھر ہیں
میری آنکھوں میں وہی خواب کی بستی کیوں ہے
(پرکاش فکری)

بحر احمر کی ہوا ہے اسے کیوں روکتے ہو
ننگے اشجار کو ملبوس طلائی دے گا
(حامدی کشمیری)

پیچھے پڑی ہوئی ہے زمانے کی تیز دھوپ
سر پر سیاہ وقت کا سایہ بھی دیکھئے
(سلطان اختر)

سیاہ لفظ کے جنگل میں راستہ ہے نہ سمت
وہ انتظار میں دروں کے سو گئی ہو گی
(شمس الرحمٰن فاروقی)

ڈوبتے منظروں میں جلتی ہوئی نیلی پیلی لکیروں کا کیا نام تھا
چپ کے ماحول میں دیر تک بے صدا عکس کی چیخ کا ایک کہرا سا تھا
(علیم اللہ حالی)

دل کی خوشبو سے ہے زندہ انکے رنگوں کی دھنک
وقت سارے خواہشوں کی تتلیاں لے جائیگا
(آزاد گلاٹی)

نظم کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ؎
کبڑے پیڑوں کے جنگل ہیں
پتوں کی کالی دیواریں
دیواروں میں لاکھوں روزن
روزن ــــ آنکھیں ہیں جنگل کی
وحشی آنکھیں ہیں جنگل کی
(نظم جنگل ۔ وزیر آغا)

نیند کے کنج میں یادوں کے شگوفے چٹکے
کانچ کی نیلگوں چادر پہ یہ کچے موتی
کوئی در آئی رگ گل کا شلوکا پہنے
خواب کے کھیتوں میں نیلم کے نگینے بوئی
(نظم نیند کی وادی میں، شاذ تمکنت)

یہ کس کا خواب تماشہ ہے
میں جس میں اکیلا گھومتا ہوں
ہر سمت وہی پیلی آندھی
اور اندھے جھکڑ مشعلوں کے
پل پل میں ابھرتی اور چٹخ کر ٹوٹتی گرتی چٹانیں ہیں
(نظم خواب تماشا ۔ کمار پاشی)

رنگ سب مٹ چکے مگر شاید
یہ سیاہی فنا نہیں ہو گی!
یہ امانت ہے روح فردا کی!
یہ اجل آشنا نہیں ہو گی!
(نظم سیہ بر سفید، مخمور سعیدی)

ان شعرا کے علاوہ مندرجہ ذیل شعرا نے بھی طبعی طور پر فن مصوری سے دلچسپی لی ہے۔ اور شاعری میں اسے موضوع بنایا ہے۔ بلراج کومل، فضیل جعفری، بشر نواز، حسن نعیم، زبیر رضوی، مظفر حنفی، مظہر امام، عادل منصوری، ندا فاضلی، بشیر بدر، منصور سبزواری، ظہیر غازیپوری، بدنام نظر، صدیق مجیبی، بمل کرشن اشک، عتیق اللہ، صادق حمید للباس، زاہدہ زیدی، ظہیر صدیقی، لطف الرحمٰن، رونق گیاوی، نجم عثمانی، ساحل احمد، فرحت قادری، حق اعظمی، عالم خورشید اور [illegible] وغیرہ۔

درج بالا اشعار اور نظموں کے اقتباسات سے واضح ہے کہ ان میں رنگوں کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سرخ، سبز، زرد، سیاہ، نیلا وغیرہ، علاوہ ازیں ان الفاظ کا بھی استعمال ہے جو اپنی شبیہ رکھتے ہیں۔ مثلاً سورج، آسمان، چادر، سنجر، ریت، چٹان وغیرہ۔ اس طرح جدید شاعروں نے برش اور کینوس کے بغیر الفاظ کے سہارے اپنی شاعری میں مصوری کی ہے۔ ان کی شاعری میں ایسے الفاظ کا استعمال نسبتاً زیادہ ہے جو اپنی شبیہ رکھتے ہیں۔ اور جن کا رنگوں سے تعلق ہے۔ اس طرح جدید شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعہ قاری کی روح تک اترنا چاہا ہے ــــ ان کے احساس خفتہ کو بیدار کرنے کی سعی کی ہے۔

اگرچہ اردو شاعری اپنے ہر دور میں مصوری سے

بقیہ صفحہ ۳۸ پر

نسیم نسرکھی (پاکستان)

بند لبوں کی چیخ

طاہر نقوی کا افسانوی مجموعہ

قافلہ مسافروں کی راہ تو طے کر دیتا ہے۔ لیکن میر کارواں مسافروں پر وقتاً فوقتاً اپنے احسانات جتاتا رہتا ہے۔ اس میں کسی زیر شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ گروپ جماعت بالنظریہ کسی فرد کی صلاحیت کو فروغ دینے میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ یقیناً فرد کی صلاحیت ایک مخصوص پروپیگنڈے کے تحت اور ایک میکانیکی عمل کے ذریعہ بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی ہے۔ لیکن یہی میکانکی عمل جب دوسرے شخص پر APPLY کیا جاتا ہے۔ تو پہلے شخص کی رفتار آہستہ آہستہ گھٹنے لگتی ہے۔ ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اس کا بڑھا ہوا معیار درجہ صفر پہ پہونچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک تنہا مسافر اپنی منزل کا راستہ خود طے کرتا ہے۔ اس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ راہ چلتے ہوئے اس پر کوئی نظر نہیں ڈالتا۔ بلکہ وہ سب کو دیکھتا رہتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسے انجانی اور دشوار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنا سفر مکمل کر لیتا ہے۔ تو پھر پیچھے پلٹنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ مزید آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ غیر جانب داری اپنا سفر آہستہ آہستہ طے کرتی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی پروپیگنڈہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی میکانکی عمل۔ ہوتا یہ ہے

کہ ہر گروپ ہر جماعت پہلے غیر جانبدار شخص کو ٹھکراتی ہے اسے کوئی نہیں سمجھ پاتا۔ لیکن وہ سب کے اندر گھس کر بڑے سکون کے ساتھ سب کا تجزیہ کرتا رہتا ہے۔ اس میں اپنی تنہائی کا بھی احساس رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی سست رفتاری زوال پذیر نہیں ہوتی۔ یوں بھی ہم علم جومیٹری کی رو سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ پوائنٹ یا نقطہ اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے۔ وہ کم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مختلف سمتوں میں اس سے پیدا شدہ خطوط آگے بڑھتے ہیں۔ یہاں پر طاہر نقوی بھی مجھے اپنی منزل کے تنہا مسافر اور ادبی گروہ بندیوں سے الگ تھلگ ایک غیر جانب دار افسانہ نگار نظر آرہے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں طاہر نقوی کی افسانہ نگاری کے بارے میں کچھ کہوں۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کی شخصیت کا کچھ جائزہ لیا جائے۔ کیونکہ میرے خیال میں کسی فن کار کی شخصی جبلت اس کے فن کی محرک ہوتی ہے۔ طاہر نقوی طبعاً نہایت خاموش اور کم گو انسان ہیں انکساری بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے یہی وہ جذبہ ہے جو بلند مدح سرائی اور ہوس شہرت سے پرہیز کرتا ہے الکساری اپنے آپ کو بڑے کے سامنے چھوٹا سمجھنے کے اس عمل

تصویر کھینچ لیتی ہے۔ طاہر کی شخصیت میں تنہائی کا عنصر بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس رویے نے انہیں ادبی گروہ بندیوں سے الگ تھلگ رکھا۔ وہ ایک غیر جانبدار رائٹر کی حیثیت سے ابھر کر منظر عام پر رونما ہوئے طاہر کی تنہائی نے کتاب کی بجائے انسان اور سوسائٹی کو پڑھنے کا درس دیا۔ طاہر میں کم گوئی بھی پائی جاتی ہے۔ کم گوئی انسان کی شخصیت کا ایک مستحکم عنصر کہا جاسکتا ہے۔ کم گوئی میں جھجک دمک نہیں ہوتی بلکہ اس کا سفر عمل کے ذریعے طے پاتا ہے۔ جانا کہ ایک رائٹر کی کم گوئی کسی ادبی محفل میں زینت نہیں بن سکتی۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو EXPOSE کرنے سے بچ جاتا ہے۔ اس کی ENERGY ضائع نہیں ہوتی۔ وہ اپنی انرجی کو تقریر کی بجائے تحریر میں صرف کرتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ طاہر کی کم گوئی نے ادبی نشستوں اور نجی محفلوں کی بجائے اپنی صلاحیت کو تحریر کے ذریعہ کاغذی [illegible] دیا ہے۔ جو نہایت ہی قلیل مدت میں ایک پائیدار اور مستحکم شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ طاہر کے مزاج میں انتہا پسندی، جذباتیت، اور تلاطم کا فقدان ہے حقیقت یہ ہے کہ طبیعت میں ملائمیت، شائستگی اور بھولا پن پایا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تحریر میں مطمح نظر بیان کرتے وقت نہایت ہی دھیمے لہجے سے کام لیتے ہیں ان میں غصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ تکلیف دہ حالات کو بڑے صبر و سکون سے برداشت کرنے کی عادت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہی سبب ہو کہ ان کی کہانیوں میں کوئی ایسا کردار نظر نہیں آتا جو اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کرے۔

جہاں تک طاہر نقوی کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے وہ تقریباً ۱۲، ۱۴ برس سے لکھ رہے ہیں۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو اٹھارہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ تمام کہانیاں مختصر ہیں افسانہ نگار نے کم سے کم وقفے میں زیادہ سے زیادہ خیال کو پھیلایا ہے۔ ان تمام کہانیوں کے پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں مجموعی طور پر جو تاثر ابھرا وہ یہ ہے کہ افسانہ نگار کو انسانی نفسیات پر عبور حاصل ہے۔ قریب قریب ہر کہانی ایک نفسیاتی پہلو کے سہارے آگے بڑھ رہی ہے۔ کرداروں کی خود کلامی، ان کا انجانا خوف و ہراس، ان کی کشمکش اور ان کا تذبذب یہ سب انسان کا نفسیاتی عمل ہے۔ جسے افسانہ نگار نے بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ذاتی کرب ہو یا معاشرتی کرب اس کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک ظاہری، دوسری باطنی۔ باطنی شکل ایک پہلو اور اختیار کرتی ہے۔ جسے ہم نفسیاتی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا اظہار وقتاً فوقتاً دوسرے روپ میں ہوتا رہتا ہے۔ کبھی سایہ، کبھی آہٹ، چاپ اور کبھی تھرتھراہٹ۔ اور کبھی خوف چہروں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی وہ علامات ہیں جن کا سہارا لے کر افسانہ نگار نے اپنی کہانیوں کی تکمیل کی ہے۔ ایسی ہی کیفیت میں لکھی گئی جاندار کہانیاں "کھلی فضا کی گھٹن" "اجنبی خوف کی دستک" اور "سکون" ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری کہانیوں کے موضوعات وہی ہیں۔ جن سے ہم سب آئے دن دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کو ان کہانیوں میں اپنی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ کہانیوں میں کم سے کم کردار استعمال کئے گئے ہیں۔ جو ایک اچھی کوشش ہے۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے ایک بات اور کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ ہے افسانہ نگار کا مشاہدہ۔ عموماً ہر افسانہ نگار کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مطالعے کے ذریعے اپنے تجربات میں اضافہ کر کے کہانی کو جنم دیتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ روزمرہ کے اپنے

ذاتی تجربات وحادثات کا سہارا لے کر فن پارے کو تخلیق کرتا ہے۔ طاہر کی کہانیاں پڑھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ افسانہ نگار نے اپنے ذاتی تجربات سے کہانیوں کا مواد حاصل کیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ہم کسی تجربے سے گزرتے ہیں۔ تو ہمارے مشاہدے کی قوت زیادہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر انگلینڈ، فرانس، یا امریکہ کی کوئی کہانی پڑھ کر اس سے اپنی کہانی کا مواد حاصل کریں۔ تو عین ممکن ہے کہ کہانی ہم بڑی جدید اور خوب صورت لکھ دیں۔ لیکن ہمارا مشاہدہ اس میں یقیناً کمزور ہوگا۔ کیونکہ اس تصویر کو ہم نے صرف کتاب میں دیکھا تھا۔ اس کے برعکس ہمارا ذاتی تجربہ ہمارے اردگرد لاکھوں چلتے پھرتے انسانوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ طاہر نقوی کی کچھ کہانیاں خصوصاً جن میں دفتری ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ مشاہدہ اس قدر قوت بخش ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ شاید افسانہ نگار بذات خود کسی عہدے میں دفتر سے منسلک رہا ہوگا۔ "گھر کی بات" اور "بند لبوں کی چیخ"، میں افسانہ نگار کی مضبوط گرفت ہے۔ دونوں کہانیوں میں آفس ماحول کے چپراسی، کلرک، ٹائپسٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ، اور ڈائریکٹر صاحبان کی نفسیات کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے۔ یوں تو آئے دن ہر افسانہ نگار ان ماحول پر قلم اٹھاتا ہے۔ لیکن طاہر نے بڑی سادگی سے بڑی اہم باتوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ اس مجموعے کی کہانیوں میں شامل ایک کہانی "بے صدا لفظ" ہے۔ جو ان تمام کہانیوں میں سب سے اچھی کہانی لگی۔ یہ میرا ذاتی تاثر ہے۔ ہو سکتا ہے دوسرا اس سے اتفاق نہ کریں۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کہانی لافانی ہے۔ اور وہی موضوع ہے جس پر ان گنت کہانیاں لکھی گئی ہیں، اور لکھی جا رہی ہیں لیکن یہاں پر افسانہ نگار نے نہایت اختصار سے کام لے کر اپنے موضوع کا احاطہ کیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ قاری کی کچھ امیدیں ہوتی ہیں۔ لیکن افسانہ نگار ان توقعات کو آہستہ آہستہ بدلتا جا رہا ہے۔ اور یہ اختتام پر پہنچ کر ایک ہلکی سی جھلک پر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ پوری کہانی میں مرد اور عورت کی نفسیات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ کہانی پر کسی طرف سے بھی زیادہ دباؤ نہیں ہے۔ نہ بوجھل فقرے، نہ فلسفیانہ سطریں۔ نہایت سیدھی سادی زبان میں کہانی ترتیب دی گئی ہے۔ یہاں میں نے اختصار سے بچنے کے لئے ان کی چند ہی کہانیوں کی نشاندہی کی ہے۔

اب کچھ افسانہ نگار کی تکنیک کے بارے میں۔ اس وقت ایک افسانہ نگار کے سامنے کئی راہیں ہیں۔ جن میں تجریدی، علامتی، تمثیلی، اور بیانیہ، افسانہ نگار اپنی کہانی کہنے کا کوئی بھی راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن اتنا تو ضرور ہونا چاہئے کہ کچھ نہ کچھ اس کا ابلاغ ہو۔ اور اس میں کہانی پن بھی ہو۔ جو قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ طاہر نقوی کی کہانیوں میں کہانی پن موجود ہے۔ نہایت ہی صاف اور واضح ہیں۔ جو کچھ افسانہ نگار کہنا چاہتا ہے۔ میرے خیال میں ہر قاری آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اور اس طرح مجموعی طور پر طاہر کی کہانیاں بیانیہ اور علامتی دو طرز تحریر پر مبنی ہیں۔ جن میں بیانیہ انداز کا پلّہ بھاری ہے۔ لیکن "کھرنڈ" "بے سمتی" اور "آخری کہانی" "روزِ حشر" اپنے نئے پن کے لحاظ سے بڑی جاندار اور بھرپور کہانیاں ہیں جنھیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ افسانہ نگار بیان سے علامت کی جانب بڑھ رہا ہے۔

صفدر

"دوسرا کنارہ" ــ ایک مطالعہ

"دوسرا کنارہ" ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ بقول مشتاق احمد یوسفی وزیر آغا اس صنف ادب کے موجد ہیں۔" اوراق" کے ذریعہ وزیر آغا نے انشائیہ نگاری کی تحریک چلائی۔ اور آج برصغیر میں انشائیہ نگاروں کی فصل کھڑی ہے۔

"دوسرا کنارہ" کے عنوان کے تحت وزیر آغا صاحب نے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ اس میں انشائیے کی تعریف، اس تعریف کی توضیحات، انشائیے کی شناخت اور اس کے مقصد سے بحث کی گئی ہے۔ اس پیش لفظ کی روشنی میں ہم انشائیے کے تعلق سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:

۱۔ غزل، نظم اور افسانے کی طرح انشائیہ بھی ایک منفرد صنف ادب ہے۔ لہٰذا اس کی حدود کا تعین ضروری ہے

۲۔ انشائیہ میں یہ تین صفات بیک وقت موجود ہوتی ہیں۔

الف، زبان کا تخلیقی استعمال۔ اسلوب کی تازگی،

ب، معنی کے مخفی گوشوں کی دریافت،

ج، شعور کی توسیع کا اہتمام،

۳۔ انشائیہ نگار کی پہچان یہ ہے کہ "وہ افکار کی ظلمت اور جذبات کے کہرام کو محسوس تو کرتے ہیں مگر ان سے مغلوب نہیں ہوتے"

۴۔ انشائیے کی کوئی ہیئت نہیں ہوتی،

وزیر آغا صاحب نے انشائیے کی جو تعریف پیش کی ہے۔ اور اس تعریف کی توضیح کرتے ہوئے جو تین صفات بیان کی ہیں۔ وہ انشائیے سے مخصوص نہیں ہیں۔ کوئی ادب پارہ خواہ وہ کسی ہی صنف ادب کے زمرے میں آتا ہو، ان صفات کا حامل ہوتا ہے۔ قصیدہ کو منہا کر دیجئے، تو مجموعی حیثیت سے سارا ادب ہمیں زندگی اور اس کے مظاہر کے بارے میں زیادہ باخبر بناتا ہے۔ وارث علوی کہتے ہیں "بڑی شاعری ہمیں بُرے پیمانے پر ڈسٹرب کرتی ہے۔ تو انشائیہ ایسی صنف نہیں ہے جو قاری کو سلاتی نہیں بلکہ جگاتی ہے"۔ لہٰذا زبان کا تخلیقی استعمال معنی کی نئی سطحوں کی دریافت اور شعور کی توسیع کے ذریعہ انشائیے کو شناخت نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ تنقید کی زبان وضاحتی بیان کی زبان ہو۔ تخلیقی زبان میں بھی تنقید ممکن ہے۔ جب وضاحتی زبان عاجز ہوتی ہے۔ تو تخلیقی زبان تنقید میں راہ پاتی ہے وزیر آغا صاحب کے یہاں اکثر یہی صورت حال نظر آتی ہے اس پیش لفظ میں بھی یہی ہوا ہے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں

انشائیہ نگار ایک ایسے جزیرے کی طرح ہے
جو چاروں طرف سے متلاطم سمندر میں گھرا

ہوا ہے۔ چونکہ بیسویں صدی افکار و محسوسات
کے اعتبار سے ایک مواج صدی ہے۔ لہٰذا
اس میں جا بجا جزیرے نظر آنے لگے ہیں۔
یعنی ایسے تخلیق کار جو افکار کی حدت اور
جذبات کے کہرام کو محسوس تو کرتے ہیں۔
مگر ان سے مغلوب نہیں ہوتے۔

مزید رقمطراز ہیں:

آج سمندر میں جزیرہ بن جانا ہی انشائیے
کا اہم ترین وصف ہے۔

یہ بھی ایک علمی طریقہ کار ہے غیر جذباتی فکر کے نتائج
میں درجہ اعتبار کو پہنچتے ہیں۔ وزیر آغا صاحب ۶۰ برس
کو انشائیہ نگاری کے لئے موزوں عمر خیال کرتے ہیں۔ یعنی اس
وقت آدمی "بارھواں کھلاڑی" ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بصیرت اپنی
انتہا کو چھو رہی ہوتی ہے۔ مگر زندگی کے میدان میں کود
پڑنے کی نہ ضرورت ہوتی ہے۔ نہ شوق ہوتا ہے۔ یہ بات بھی
نئی نہیں ہے۔ یہ طرز فکر ہماری شاعری میں موجود ہے۔ مثلاً

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

میرا خیال ہے کہ دوسرے کنارے پر کھڑے ہو کر دنیا اور اپنے آپ پر نظر ڈالنا غالب کی شاعری کا بہت نمایاں اور شاید سب سے منفرد پہلو ہے۔ تو کیا "دوسرا کنارہ" انشائیے کا شناختی نشان ہو سکتا ہے۔؟

فکر کی سطح پر جذبات سے غیر مغلوب ہو کر لکھنا قطعی غیر معمولی بات ہے۔ اس کے لئے غالب کا سا عبقری ذہن اور ایسے ضبط کی ضرورت ہے۔ جو بہت ریاض طلب ہے۔ یہ ایک متجسس ذہن کا ذاتی وصف ہے۔ ایک صنف ادب کیلئے لازمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

انشائیے کی حدود کے تعین کے لئے اس کی ہیئت سے گفتگو شروع کی جا سکتی ہے۔ میری ناقص رائے میں انشائیے کی شناخت کے الجھے لچھے کا سرا یہی ہے۔ میں وزیر آغا صاحب کی اس رائے سے متفق ہوں کہ انشائیے کی کوئی ہیئت نہیں ہوتی دراصل بے ہیئتی ہی انشائیے کی ہیئت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انشائیہ کسی بھی ہیئت میں لکھا جا سکتا ہے۔

میں ایک مثال سے اس بات کو واضح کرنا چاہوں گا چاند کا ایک حصہ سورج کی روشنی میں نہایا ہوا ہے۔ وہاں ایک بڑھیا بیٹھی سوت کات رہی ہے۔ اس روشن حصے کے کوائف ایک منطقی ربط کے ساتھ بیان ہوں گے۔ یہ مضمون نگاری ہے۔ انشائیہ نگار اس کے عقب میں جا پہنچتا ہے یہاں اپنی مٹھی کھول دیتا ہے۔ جس میں بصیرت کے جگنو چمک رہے ہیں۔ روشنی کے ان ننھے ننھے حلقوں میں تاریک دنیا کی سچائیاں چمک اٹھتی ہیں۔ انشائیہ نگار انہیں اپنی گرفت میں لیتا ہے اسی لئے انشائیے کی کوئی ہیئت نہیں ہوتی۔ اسی لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ بے ہیئتی ہی انشائیے کی ہیئت ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک دیوانے مجنوں کی گفتگو، یا مجذوب کی بڑ، جس میں ربط و تسلسل نہیں ہوتا انشائیہ ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ مجذوب کی بڑ

میں ربط و تسلسل نہیں ہوتا۔ مگر مرکزیت بھی نہیں ہوتی۔ جبکہ انشائیہ مرکزیت کا حامل ضرور ہوتا ہے۔ اس میں وزیر آغا صاحب کی بیان کردہ تینوں صفات بھی ضرور ہوں گی، اس لئے نہیں کہ یہ انشائیہ ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ ایک ادبی صنف تحریر ہے۔ ادبیت کی تلاش میں ہمیں یہ چیزیں دیکھنی ہوں گی، زبان کا تخلیقی استعمال، معنی کی نئی سطحوں کی دریافت شعور کی توسیع کا اہتمام، میرے خیال میں انشائیہ نگار دو طرح سے اپنی فکر کو بروئے کار لاتا ہے۔

۱۔ منظر کو مرکز مان کر ایک دائرہ بنانا،

۲۔ محیط کے مختلف نقطوں سے ایسی توسیں کھینچنا جو مرکز (منظر) کو مس کرکے گزرتی ہیں۔

پہلے طریقۂ کار میں منظر کے انسلاک میں ماحول کے مختلف زاویوں کو سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے طریقۂ کار میں ماحول کے اختلاف میں منظر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

وزیر آغا صاحب کا جزیرہ آخر الذکر طریقۂ کار اپناتا ہے۔ مگر کہیں کہیں یہ دونوں طریقے خلط ملط بھی ہو جاتے ہیں۔ طنز نگار بھی یہی دونوں طریقے بروئے کار لاتا ہے۔ انشائیے کی ہیئت کسی کارخانے سے بن کر نہیں آتی ہے۔ اس اسلوب نگارش نے انشائیہ کی ہیئت کو دریافت کیا ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ انشائیے کی ہیئت میں لکھا گیا طنزیہ انشائیہ کیوں نہیں۔

جو چیز انشائیے کو لقراطیت یا پند و نصائح ہونے سے بچاتی ہے۔ وہ شگفتگی ہے۔ شگفتہ بیانی طنز و مزاح کو راہ دیتی ہے۔ وزیر آغا صاحب کے انشائیوں میں بھی یہی زبان استعمال ہوئی ہے کہ

ہم زندس کے قلقل مینا کہیں جسے

وزیر آغا صاحب کہتے ہیں کہ طنز یا مزاح انشائیے کے لئے شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ معاملہ دراصل یہ ہے کہ اس سے دامن بچانا بہت مشکل ہے۔ وزیر آغا صاحب طنزیہ نگارشات کو انشائیے سے ممیز کرتے ہیں۔ تو کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں خوف ہو کہ لوگ انہیں طنز و مزاح نگار نہ سمجھ بیٹھیں، ؟ جبکہ واقعہ بھی یہ ہے کہ وہ اصلاً طنز و مزاح نگار نہیں ہیں۔

شاعری کی تعریف صدیوں کے غور و خوض کے بعد بھی نامکمل ہے۔ مشرقی تنقید نے اسے وزن و قافیہ سے شناخت کیا۔ مغربی تنقید نے وجدان کو شاعری کا جوہر بتایا۔ شبلی اور فاروقی کفایت لفظی کو شاعری کی بنیادی پہچان بتاتے ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ ان میں کوئی ایک تعریف شاعری کی مکمل تعریف نہیں ہے۔ اسی طرح انشائیے کی مکمل تعریف اگر ہمارے پاس نہیں ہے تو یہ زیادہ فکرمند ہونے کی بات نہیں ہے۔ اس سلسلے میں گفتگو جاری رہنی چاہئے۔

وزیر آغا صاحب کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ ان کی پیش کردہ تعریف مکمل نہیں ہے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ کسی صنف ادب کی صحیح تعریف کرنا، اور اسے شناخت کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ یہ بات ایک روسی مضمون نگار کی بصیرت کو پرکھ کر کہی گئی ہے۔ مگر تحریر سے یہ آشکارا ہے کہ آغا صاحب اپنی پیش کردہ تعریف سے خود بھی مطمئن نہیں ہیں۔

یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ ہندوستان میں انشائیے کے نام سے جو طنز و مزاح تخلیق ہو رہا ہے، "دوسرا کنارا" کے انشائیوں کا مزاج ان سے قطعی مختلف ہے۔ یہ انشائیے قطعی طور پر تازہ کار فکر و اسلوب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ "دوسرا کنارا" جو تصور انشائی فکر کے لئے وزیر آغا صاحب نے دیا ہے۔ اس کتاب کا ہر انشائیہ اس کی غمازی کرتا ہے۔ نتیجتاً ہمارے سامنے بکھری ہوئی اور صدیوں برتی ہوئی پامال چیزیں انشائیہ نگار کے فکر کا لمس پاکر ایک دم نئی معنویت کے ساتھ جاگ اٹھتی ہیں۔ اس طرح سے

فرسودگی کا غلاف تار تار ہو گیا ہے۔ وہ طنز و مزاح نگار کی لغزشوں اور مضحکہ خیزیوں کی ٹوہ نہیں لیتے۔ بلکہ سامنے کی طرح برتی ہوئی چیزیں یک بیک ان پر اپنے اسرار کھولنے لگتی ہیں انشائیوں کے عنوانات ہی سے ان کی فرسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً حقہ پینا، معافی مانگنا، کھڑکی، کچھ مسکراہٹ کے بارے میں اکلاپا اور تنہائی، میرا البم، چلنا، ہینڈ بیگ، وغیرہ۔ آغا صاحب کی دروں بینی اور تازہ کار اسلوب تحریر نے انہیں ایک نئی زندگی بخش دی ہے۔ مثلاً ہینڈ بیگ پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلی بار ہینڈ بیگ کو دیکھ رہے ہیں۔

اب مشتے نمونہ از خروارے چند مثالیں پیش کرتا ہوں یہ انتخاب نہیں ہے۔ میں یوں ہی ورق پلٹ کر نقل کر رہا ہوں

(۱) میرا ہینڈ بیگ اتنا ہی وسیع اور پیچیدہ ہے جتنا کسی ملک کا سکرٹریٹ۔ جس میں صحت، معاشیات، تعلیم، ثقافت، سیاست دفاع اور تعلقات عامہ ایسے متعدد محکموں کے مرکزی دفاتر انتہائی ذمہ داری سے اپنے فرائض پورے کر رہے ہوتے ہیں

(ہینڈ بیگ)

(۲) آج رات جب اس نے (اپنے جسم نے) مجھے جگایا کہ اسے غسل خانے تک لیجاؤں تو اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ ذات شریف تو میرا محتاج ہے اور میرے بغیر ایک قدم اٹھانے پر بھی قادر نہیں۔ تب میں نے بڑے فخر کے ساتھ ...... اس سے پوچھا۔ بولو! کیا تم میرے بغیر رہ سکتے ہو؟ ؟ ...... معلوم ہے پھر اس نے کیا جواب دیا۔؟ ...... بولا نہیں میں اپنے سامنس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(سائنسی علم دریاؤ)

(۳) لیٹنے کی انسٹی ٹیوشن شاید روز اول ہی سے افیونیوں اور لوسیتوں کی تحویل میں ہے اور بیٹھنے کا پورٹ فولیو ان لوگوں کے سپرد ہے جو فطرتاً بڑے گھاگ ہوتے ہیں۔ مگر چلنے کا عمل آزاد منش افراد کی میراث ہے"

(چلنا) ●●

بقیہ: ایک مطبوعہ انشائیے کا جائزہ

میں دودھ کیلئے کنستروں کا لفظ بالکل صحیح ہے۔ لیکن تازہ تاڑی کنستروں میں بھیجی جاتی ہو۔ اس سے مجھے اتفاق نہیں میں نے ہر جگہ تاڑی کے لئے مٹی کے گھڑے یا مٹکے استعمال ہوتے دیکھے ہیں۔ ہو سکتا ہے مضمون نگار نے کسی ایک موقع پر ایسا دیکھا ہو تو بھی قابل اعتبار نہ سمجھا جائے گا۔ ممکن ہے زیادہ پانی ملائے ہوئے دودھ والے کنستر پر سفیدی اور پتلے پن کی وجہ سے موصوف کو تاڑی کا گمان گزرا ہو۔

ازیں قبیل اور بھی بہت سی خامیاں ہیں جن کا اعادہ ممکن ہے۔ سامعین کے لئے بار خاطر ہو جائے اس انشائیہ مضمون کے مطالعہ کے بعد مجھے فطری طور پر انشائیہ نگار کے تعارف کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور جب مجھے ان کی شخصیت، علمی، صلاحیت اور مشغلہ کا علم ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ صاحب مضمون ایسی معمولی غلطیوں کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے مسودہ لکھوانے میں کسی بے ادب شاگرد کا واسطہ درمیان میں آگیا ہو۔ پھر بھی موصوف کو لفظ ثانی نہ کرنے پر مورد الزام ٹھہرایا ہی جائے گا۔ ●●

نشتر جعفری

ایک مطبوعہ انشائیے کا جائزہ

میں ضلع دربھنگہ کے ایک دیہی علاقہ کا رہنے والا ہوں حصول تعلیم کے سلسلہ میں پندرہ بیس سال تک پٹنہ اور لکھنؤ کے عربی اور انگریزی تعلیمی اداروں سے وابستہ رہا۔ بزرگوں کی تمنا تھی کہ عربی کی تعلیم مکمل کر کے میں عالم و فاضل بن جاؤں۔ لیکن اپنی خواہش کا رجحان انگریزیت کی طرف زیادہ تھا۔ مگر ضروری دینی مسائل جاننے کے بعد اسی کشمکش نے مجھے نیم عالم اور نیم صاحب بنا کے رکھ دیا۔ بہر طور ایک علم نے مجھے کچھ بحمد للہ کم از کم بے دینی سے بچا کے رکھا۔ تو دوسرے نے روزی روٹی کا سامان سرکاری ملازمت کی شکل میں فراہم کر دیا جو آج تک باقی ہے ملی بہت ہی کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ لیکن ادبی ماحول کی پرورش اور صحبت اساتذہ نے سخن فہمی کی صلاحیت ضرور بخشی ہے۔ دنیائے ادب میں میری حیثیت نہ فن کار کی ہے اور نہ قلم کار کی اس لئے میں کسی اہل قلم پر تبصرہ یا تنقید کی جرأت نہیں رکھتا ہوں۔

مطالعہ سے مجھے جنون کی حد تک دلچسپی ہے۔ اور ہر صنف سخن کی کتابوں کا پڑھنا میرے معمولات میں شامل ہے۔ مجھے اپنے محدود علم کے پیمانہ پر جہاں اچھا کلام اپنی ندرت اور فکری سنجیدگی کی وجہ سے متاثر کرتا ہے۔ وہیں اس کا ہلکا پن بہ اعتبار موضوع و بیان، و دیگر ادبی خامیوں میرے دل و دماغ کو پراگندہ بھی کر دیتا ہے۔

اسی ذوق کتب بینی کے دوران "زبان و ادب" کے شمارہ اپریل تا جون ۸۲ء میں ایک انشائیہ بہ عنوان "سفر اور صریر سفر" نظر نواز ہوا۔ جس کے خالق جناب حسین عظیم آبادی صاحب ہیں۔

اس انشائیہ کے پہلے کچھ حصے میں جو خامیاں نظر آئیں وہ میں نے حسب عادت کاتب صاحب کی بے چارگی کے سپرد کر دیں۔ مگر جب نظر غائر سے اس مضمون کو اختتام تک پہونچایا تو محسوس ہوا کہ اس کی خلقت ہی میں فنی اور ادبی کمزوریوں کا خمیر شامل ہے۔ میں اپنی کم علمی کا پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں اس لئے اس تحریر کو میرے تنقیدی شعور پر محمول نہ کیا جائے بلکہ صرف اظہار واقعہ پر، اراکین "بزم ادب" سے میری یہ التجا ضرور ہے کہ کسی بھی اہل قلم کی نگارشات کو شرف طباعت بخشنے سے پہلے ان کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے مکمل جائزے کے بعد ہی انہیں قارئین تک پہونچانے کی سعی فرمائیں۔ تاکہ پرچہ اپنے نام کے معیار کو سبک نہ ہونے دے۔

پہلے تو مجھے اس انشائیہ کے عنوان ہی سے اختلاف ہے۔ "سفر اور صریر سفر" صریر کے معنی قلم کی آواز کے ہیں، یہاں سفر وہ بھی ریل کے سفر میں قلم کی آواز کا سفر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اور اس لفظ کا استعمال کہاں تک صحیح ہوگا۔ یہ اہل نظر ہی فیصلہ کریں۔ انشائیہ نگار نے اس عنوان کے

تحت جو کچھ بھی پیش کیا ہے وہ گیا سے پٹنہ تک کے سفر میں رونما ہونے والے واقعات ہیں جس کی موصوف نے منظر کشی کی ہے۔ پھر بھی لفظ صریر کا استعمال اس جگہ غیر صحیح اور معنوی اعتبار سے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انداز بیان میں روانی اور گیا تا پٹنہ کے سفر کی صحیح عکاسی ضرور ہے۔ مگر اس روا روی اور سفر کے ہنگاموں میں کچھ لفظوں اور جملوں کا بہ حیثیت واحد و جمع، تذکیر و تانیث، غلط استعمال سرزد ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ نمونے مضمون کے نصف حصہ سے اقتباس کر کے پیش خدمت کر رہا ہوں۔ جو توجہ کے محتاج ہیں

۱۔ پیراگراف ۱: "ایک مقولہ ہے سفر بے شرط مسافر نواز بہتر ہے" یہ مقولہ نہیں بلکہ ایک مصرع ہے۔ "عزم بازار ہو یا بمبئی" یہاں خدا حافظ کے شعوری یا لاشعوری طور پر ادا کرنے یا ہو جانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ سفر کی مناسبت سے عزم بازار کا استعمال ذرا کبیدہ خاطر بنا دیتا ہے۔ اس لئے کہ بازار جانا سفر کے مترادف نہیں ہو سکتا۔

۲: "میرا سفر بامقصد ہو یا بلا قصد" یہ غلط تو نہیں البتہ جملہ فصاحت سے عاری ہے۔ بامقصد کے ساتھ بے مقصد یا بالقصد کے ساتھ بلا قصد ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا

۳: "مثلاً آپ نے ٹوائلٹ کا رخ کیا معدہ یا مزاج کے بموجب وہاں مقیم رہے" یہاں پر معدہ کے عمل و دخل کو اگر صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کے ساتھ مزاج کا لفظ بار سماعت ہو جاتا ہے۔ مزاجاً کوئی آدمی بھی ٹوائلٹ میں "مقیم" ہونا پسند نہیں کرے گا۔ "سفری مطبوعات میں اپنے مذاق کی چیزیں پسند کرلی" یہاں چیزیں کے بعد کر لیں ہونا چاہئے تھا۔ جو یہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔

"میرے سفر کی نوعیت تین ہیں" یہاں تین ہیں میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ تو ابتدا میں نوعیت کے بجائے نوعیتیں یعنی جمع کا ہی لفظ آنا چاہئے۔

پیرا ۳: "جس کی ہیئت فی زمان سن اور مفلوک الحال عورت کی ہو گئی ہے" اردو میں فصحا نے فی زمان کا استعمال کہیں نہیں کیا ہے۔ اگر اسے ترکیب عربی پر محمول کیا جائے تو زمان پر اعراب کسرہ لگانا ہوگا۔ فی زمانہ لوگ بولتے ہیں۔ مگر یہ بھی غیر مستحسن ہے۔ اس لئے کہ فی عربی لفظ ہے

۴: "آتی جاتی ٹکٹ اور قیام و طعام" لفظ ٹکٹ غالباً تذکیر میں مستعمل ہے۔ جیسے پہلے آمد و رفت کا ٹکٹ دستیاب ہوا کرتا تھا۔ "آتی جاتی ٹکٹ" ایک دیہاتی آواز میں ہی قوت سامعہ برداشت کر سکتی ہے۔

۷۔ پھلوں کے تذکرہ میں "موم پھلی" اور "تاربوز" کا نام گیا ہے۔ میرے خیال میں اسے مونگ پھلی اور تربوز یا تربوزہ ہونا چاہئے۔

۸ "یوں سمجھئے کہ پٹنہ کی خوبیاں اور گیا کی خرابیاں خلاع شدہ مرد اور مطلوقہ عورت کا معانقہ ہو رہی ہیں" یہ پورا جملہ ہی محض بکواس ہے۔ اور ایک اچھے انشائیہ کے بالکل غیر مترادف، "مطلوقہ" سے مراد موصوف نے شاید طلاق دی ہوئی عورت کو لیا ہے۔ یہ لفظ ہی صحیح نہیں ہے۔ اگر اسے لکھنا ناگزیر ہی تھا تو مطلقہ عورت لکھا ہوتا

۹ "مستی بھری چال سے چلتی ٹرین جیوں جیوں (جیوں جیوں غلط ہے ۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی) پٹنہ سے قریب ہوتی جائے گی اس کی رفتار مجلوق کی جوانی ہو جاتی ہے"۔ مستی بھری چال وہ بھی ایک مجلوق کی بالکل غیر فطری اور مہمل اظہار خیال ہے۔ پھر بھی مجلوق کی جوانی میں صحت لفظ کا کم از کم نشان ضرور ملتا ہے۔ لیکن مجلوق کی جوانی" میں اس کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔

ایضاً: "اور دروازے تازہ دودھ اور تازہ تازی بھرے کنستروں سے SEAL ہو جائیں گے" اس لائین

بقیہ صفحہ ۱۹ پر

انور خاں

چھاپ تلک

یکایک وہ ٹی وی کے شیشے پر نمودار ہوئی ہے۔
آسمانی رنگ کے تیراکی کے لباس میں وہ ڈرائیونگ بورڈ پر کھڑی ہے۔ اس کا دودھیا جسم بالکل بے حس و حرکت ہے اور نظریں جھکی ہوئی ہیں۔ جیسے کوئی راہبہ مصروف دعا ہو۔
دل ایک لمحے کے لئے دھڑکنا بھول گیا ہے۔ پھر زخمی پرندے کی مانند سینے میں پھڑپھڑانے لگا ہے۔
اچانک اس نے قلابازی کھائی ہے۔ اور فضا میں ٹھہر گئی ہے۔ پھر بڑی آہستگی اور رچاؤ کے ساتھ شیشے میں تحلیل ہو گئی ہے۔

SOORY MICROWAVE RECEPTION WEAK,

کچھ دیر بعد لہروں کی رسد ٹھیک ہوئی ہے مگر اب نیوز ریڈر اپنے معمولی لب و لہجے میں خبریں پڑھ رہی ہے۔
مرشد فرماتے ہیں، دنیا کی محبت سارے خطاؤں کی جڑ ہے۔ قلب کو ماسوی اللہ سے پاک کرنا بس یہی مقصود ہے فلاح پا گیا وہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا،
پہلا سوال لازمی ہے۔ خالی جگہوں کو پر کیجیے۔ میں ذکی کو جواب نقل کروا رہا ہوں۔
غلط اچانک میرے عقب سے ایک مترنم آواز آئی ہے۔ اور امتحان ہال سریلی گھنٹیوں کی آواز سے گونج اٹھا ہے۔

سپروائزر چلتے چلتے رک کر مڑا ہے۔ دبیز شیشوں کی عینک میں سے اس کی آنکھیں تیزی سے جھپکنے لگیں ہیں۔ سب ہنس پڑے ہیں۔ وہ خود بھی بوکھلا کر مسکراتے ہوئے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا ہے۔
پھر صحیح جواب کیا ہے۔؟ ذکی نے اس سے پوچھا ہے
اس کا جواب سن کر میں نے فوراً چیک کیا ہے۔ اس کا جواب صحیح ہے۔
تھینک یو، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور ہم لوگ پھر اپنے کام سے لگ گئے ہیں۔
امتحان ہال سے باہر آتے ہی ہم دونوں خوب ہنستے ہیں
نام کیا ہے یار اس کا؟ میں نے ذکی سے پوچھا ہے۔
بورڈ پر تو ذکیہ عزیز لکھا ہوا ہے۔ چہرہ کچھ نیپالیوں، جیسا لگتا ہے۔
چپٹی،
آواز البتہ یار بڑی لیک دار ہے۔
ہم لوگوں کو اس کا ذرا قرینے سے شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا
کوئی بات نہیں ابھی دیکھ لیتے ہیں۔
ہم دونوں نے اسے تلاش کیا، مگر وہ جا چکی تھی۔
خیر کل سہی۔
اگلے روز ہم ہال میں پہنچے، وہ اپنی سیٹ پر بیٹھی۔

ہوئی تھی۔

کل آپ نے ہماری بڑی مدد کی۔ لکھتے لکھتے میرا گلا خشک ہو گیا۔

اس نے سر اٹھا کر ایک نظر میری طرف دیکھا۔ اور نظریں جھکا لیں۔ بڑی بڑی بیضوی آنکھیں، اور دراز پلکیں دل کو مسلتی چلی گئیں۔

اس کے آگے کچھ کہنے کی ہماری ہمت نہیں ہوئی۔ اور ہم چپ چاپ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔

کیا بات ہے آج ابھی تک تم باہر نہیں گئے۔ میری بہن پوچھ رہی ہے۔

کچھ دیر بعد جاؤں گا

کیوں۔؟

بس یوں ہی۔ میں نے خود کو صوفے پر پھیلا دیا۔

شاید دس بجے کی خبروں میں وہ شارٹ پھر آئیگا۔

سعید۔؟

کیا ہے۔؟

تمہارے دوست بلا رہے ہیں۔

ان سے کہو۔ میں کچھ دیر بعد ملوں گا۔ ذرا مصروف ہوں۔

اچھا۔!

آج تیراکی کے مقابلے میں رفعت عزیز ______

ایک بار پھر وہ تیراکی کے آسمانی لباس میں ڈائیونگ بورڈ کے تختے کے کنارے کھڑی ہے۔

اچانک اس نے قلابازی کھائی ہے۔ اور اسکرین بے تصویر ہو گیا ہے۔

یہ بار بار لہروں کی رسد کیوں بگڑ جاتی ہے۔

ٹھیک تو ہے ___ تم اپنی آنکھوں کا معائنہ کرا لو۔

میں نے اپنی آنکھیں رومال سے صاف کی ہیں۔

حسب سابق نیوز ریڈر اپنے معمولی لب و لہجے میں خبریں پڑھ رہی ہے۔ یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے۔ مرشد کہتے ہیں۔ دل انسانی جسم کا قطب نما ہے۔ جیسے قطب نما کی سوئی کے بال برابر فرق پڑنے سے جہاز اپنی منزل سے میلوں دور پہونچ جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانی قلب میں معمولی سا فرق آجائے تو۔

اسی لئے تو کہتی ہوں۔ امی کی آواز نے خیالات کا تسلسل توڑ دیا ہے۔ ابھی امتحانوں سے فرصت ہوئی ہے۔ اور ان کے رتجگے شروع ہو گئے۔ دن بھر تو تم لوگ گپ شپ کرتے ہی ہو۔ آخر ایسی کون سی باتیں ہیں۔ جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں

میں چپ چاپ اٹھا ہوں۔ اور بش شرٹ چڑھا کر چپل چٹخاتا ہوا باہر آ گیا ہوں۔

اے سماع میں نہیں چلنا ہے۔ ذکی پوچھ رہا ہے۔

چلو، ہمیں تو آج کی شب پو پھٹنے تک جاگنا ہو گا۔ اور سب کہاں چلے گئے۔

وہ تو کب کے جا چکے۔ میں تمہارے لئے اب تک رکا ہوا ہوں۔

تو چلو پھر سگریٹ پیا جائے یا نہیں؟

ہاں، ہے میرے پاس۔

محفل شباب پر ہے۔

بندۂ عیب دار کس نخرد،

با ہزاراں گناہ خرید مرا،

ایک قلندر رہو ہو کرتا ہوا کانپتے ہوئے اٹھا ہے۔ اور جھومنے لگا ہے۔ با ہزاراں گناہ خرید مرا۔ با ہزاراں گناہ خرید مرا، قوال تکرار کر رہے ہیں۔ سب کھڑے ہو گئے ہیں۔ چند ایک نے قلندر کے گرد حلقہ باندھ لیا ہے۔

با ہزاراں گناہ خرید مرا۔

رفعت عزیز تیراکی کے لباس میں قلا بازی کھاتے ہوئے فضا میں ساکت ہو گئی ہے۔ لہروں کی رسد؟ کل آپ نے ہماری بڑی مدد کی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا ہے۔

اس کی بڑی بڑی بیضوی آنکھیں ـــــ مرشد سے آنکھیں چار ہوگئیں ہیں۔ قلب میں شعلے سے کیوں لپک رہے ہیں۔ ؟

قوالوں نے دوسری قوالی شروع کی ہے۔

چھاپ تلک سب چھینی
موسے نظریں ملائے کے!

الا اللہ۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا ہے۔

مرشد نے پھر میری طرف دیکھا ہے۔ اور میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا ہوں۔

چھاپ تلک سب چھینی، موسے نظریں ملائے کے،

چھاپ تلک سب چھینی، ہر چیز گردش میں ہے۔ مرشد، احباب، محفل، قوال، برقی قمقمے، رفعت، مرشد یا یہ، میں گردش کر رہا ہوں۔

چھاپ تلک ـــ مرشد
چھاپ تلک ـــ رفعت
چھاپ تلک ـــ مرشد
سب چھینی ـــ رفعت
سب چھینی ـــ رفعت
چھینی ـــ مرشد
چھینی ـــ مرشد
چھینی ـــ مرشد

مرشد، مرشد، مرشد، سب چھینی مرشد، چھاپ تلک سب چھینی مرشد،

آنکھیں کھلی ہیں۔ اور میں مرشد کے قدموں میں ہوں۔

مرشد میری پیٹھ تھپتھپا رہے ہیں۔

میں اٹھ کر خالی خالی نگاہوں سے سب کو تکتا اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا ہوں۔

حضرت یہ آپ کو آج کیا ہو گیا۔ محفل بعد ایک قوال مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ آج تو آپ نے ہمارا گلا ہی سکھا دیا۔

واقعی ؟ میں نے تعجب سے پوچھا ہے۔

اور نہیں تو کیا۔ ؟ ذکی کہہ رہا ہے۔ پریشان ہو گئے ہم تمہیں سنبھالتے سنبھالتے۔

کیوں بھائی یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ؟ مرشد پوچھ رہے ہیں کھینچ لیا آج مرشد نے۔ بہت ناز تھا کہ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ارے بڑا بدمعاش ہے یہ۔ مرشد کہہ رہے ہیں۔ اس پر اثر وثر کیا ہوتا۔ یہ کسی اور ہی دھن میں ہوگا۔ کیوں بھئی۔ ؟

ذہن بالکل سادہ اور شفاف ہے۔ بالکل خالی۔

سگریٹیں بھی ختم ہو چکی ہیں۔ رات بھیگ چلی ہے۔ بھوک پوری شدت پر ہے۔ سنسان سڑکوں پر گھر لوٹتے ہوئے بس اپنے ہی قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ چھاپ تلک سب چھینی۔ یکایک ذکی نے ہانک لگائی ہے۔ اور چپ ہو گیا ہے۔ لیکن گنبد کی صدا کے مانند یہ لفظ میرے خالی ذہن میں گونج اٹھتے ہیں۔ اور گونجتے چلے گئے ہیں۔ ●●

م، ق خاں

وقت کی صلیب

منا ابھی ابھی صاف صاف نہیں بول پاتا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟

توتلی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ جیسے ممّی، پپّا، ددّ۔۔ ادا ہوتے ہیں۔

لیکن اس کی صاف شفاف آنکھوں میں اس کی گول مٹول چہرے پر ساری باتیں اپنا عکس چھوڑ جاتی ہیں۔ ان پر وہ سارے جذبات کندہ ہوئے ہیں جنھیں وہ زبان سے اظہار نہیں کرتا۔ جنھیں وہ الفاظ کا وہ پیکر نہیں عطا کر سکتا۔

ابھی ابھی وہ کمرے سے نکل کر چوکھٹ کے پار کوریڈور کے بیچ فرش پر لیٹ گیا ہے۔ وہ رہ رہ کر کنکھیوں سے ماں کو دیکھ لیتا ہے۔ ان آنکھوں میں ممتا کی باہوں میں جھولنے کی پیاس ہے، غصہ بھی ہے اور خوف بھی۔

ذکیہ قدِ آدم آئینہ کے پاس بیٹھی تھی۔ مُنّا پہلے ہی سے جھنجھلایا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں پپا کو ڈھونڈ کر تھک چکی تھیں۔ دادی امی کے پاس سے بھی جھڑکی سن کر ہی آیا تھا ایسے میں وہ اپنی ممی کے پاس آیا تھا اور آتے آتے وہ ماں کے بلاؤز کے اندر ہاتھ ڈالنے لگا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ ہاں؟ مجبور تھی۔! یہ تو آنے والے مہمان کا حصہ ہو چکا تھا

ذکیہ نے منا کے ہاتھوں میں ایک کنگھی پکڑا دی۔ اور اپنا میک اپ درست کرنے لگی۔

ایک چھناکے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ منے نے پونڈز کریم کی شیشی فرش پر گرا دی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور منہ پر کریم کی گہری لیپ دیکھکر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

وقت کو آگے بڑھنے کی جلدی تھی۔ اور وہ وقت کے اڑان بھرتے پنچھی کو مٹھی میں بند رکھنا چاہتی تھی۔ ذرا سی دیر ہو جاتی تو پرنسپل کی پیشانی پر بل آ جاتے۔ آنکھیں سمٹ جاتیں۔ اور وقت کی قیمت اور پابندی پر اسے لکچر سننا پڑتا تھا۔ دس بج چکے تھے۔ اور دس بجکر پچاس منٹ سے اس کا کلاس تھا۔ بس کے لئے اسٹاپ پر کتنی دیر انتظار کرنا ہوگا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

سوچا تھا ایک اسکوٹر خرید لے گی لیکن آئے دن کی بڑھتی قیمت سے اس کے سارے سپنے ٹوٹ کر بکھر گئے تھے۔ اس کے ڈیڈی اپنے ہونے والے داماد کو اسکوٹر دینے کا ارادہ رکھتے تھے ــــــ کاش یہی ہوتا۔

لیکن اس میں بھی تو خود اسی کا قصور تھا۔ اس نے ظفر سے اپنی پسند اور مرضی سے شادی کی تھی۔ اور ماں باپ نے جہیز کے بہت سارے سامان میں کٹوتی کر دی ظفر نے شادی کے پہلے کوئی شرط نہیں پیش کی تھی۔ اس موقع کو غنیمت جان کر کتنی ہی چیزیں اس کی جوان ہوتی بہن نفیسہ کے لئے رکھ لی گئیں۔ ذکیہ کو محبت کا سودا مہنگا پڑا

لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ محبت تو ایثار و قربانی چاہتی ہی ہے۔

ذکیہ نے منے کو ڈانٹا تھا۔ ایڈیٹ، تم نے یہ کیا کر لیا ہے۔ وہ بلک کر ذکیہ کے کپڑوں سے لٹک گیا۔ اس کے منہ اور ہاتھوں میں لگی کریم ذکیہ کے کپڑوں میں لگ گئی۔ ذکیہ کی برداشت کا دامن تار تار ہو گیا۔ اور اس نے منا کے گال پر ایک طمانچہ جڑ دیا۔ منا گال سہلاتا ہوا وہاں سے ہٹ کر چوکھٹ کے پار فرش پر لیٹ گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں بے پناہ احتجاج تھا ——— احتجاج ——— جس کے اظہار کے لئے اس کے پاس زبان نہیں تھی ——— صرف اس کا گول مٹول سا چہرہ تھا۔ یا صاف شفاف آنکھیں ——— یا رونا۔ ..

...... لیکن رونا تو وہ جیسے بھول چکا تھا۔ یا شاید روتے روتے اس کی آنکھوں کے آنسو ہی خشک ہو چکے تھے۔ یا آواز۔ رونے کی آواز بے اثر ہو چکی تھی۔

منا کے پاس زبان گویا ہوتی۔ اپنے جذبات کے اظہار کی صلاحیت ہوتی تو وہ ضرور کہتا۔

ابھی تو میں بہت چھوٹا ہوں۔ دوسرے کی کیا ضرورت آ پڑی تھی۔؟

لیکن وہ غریب کیا جانتا ہے کہ ساری باتیں ضرورت کا انتظار نہیں کرتیں۔ کچھ آپ ہی آپ ہو جاتی ہیں جنہیں محض اتفاق کہا جانا چاہئے ——— اس میں کسی کے ارادے کا دخل نہیں ہوتا ہے

ذکیہ بھی کیا کر سکتی تھی۔؟ اب وہ کنواری نہیں تھی نن، راہبہ یا کیتھولک بھی نہیں تھی۔

ظفر کو بھی کیا کہتی؟ ظفر کا بھی اس میں کیا قصور تھا؟ سارا قصور تو اسی کا تھا ———

لیکن اس کا بھی کیا قصور تھا؟ ——— اتنی

مشغول زندگی میں وہ CONTRACEPTIVE دوا وقت کی پابندی شاید نہ کھا سکی تھی۔ کبھی کبھی ناغہ ہو جانا بھی لازمی تھا۔ کہ یادداشت پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جا سکتی تھی ——— اور اسی کا نتیجہ تھا کہ منا ابھی محض ڈیڑھ سال کا تھا۔ چھ مہینے پہلے ہی تو اس کا برتھ ڈے دھوم دھام سے منایا تھا۔ اور آج چھ مہینوں کی دوسری زندگی پروان چڑھ رہی تھی۔ اپنے وجود کا ٹھوس ثبوت دے رہی تھی۔ دوسرے مہمان کی آمد آمد کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

ذکیہ نے کئی بار چاہا تھا اس بن بلائے مہمان سے چھٹکارا حاصل کر لے، اس کے لئے ابورشن ہی ایک راستہ تھا لیکن اس کے لئے بھی کئی باتیں پیش نظر تھیں۔ فرصت کا، پیسے کا سوال تھا۔ اپنے گھر والوں کے ماحول اور خیالات کا مسئلہ تھا۔ اور ساتھ ہی ایک زندگی ——— اپنے خون سے بنی ایک زندگی کو مٹانے کا سوال تھا۔ بہت ساری مشکلات بہت سارے مسائل تھے۔

دونوں کماتے ضرور تھے۔ لیکن پھوٹی کوڑی نہیں بچا پاتے۔ منا کے دادا ابا کو اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینا اور شطرنج کھیلنا ہی تو رہ گیا تھا۔ صبح سے آدھی رات تک کوئی پچاس پیالی چائے کا خرچ تھا۔ ادھر منا کی دادی امی کو ہر دو مہینے کے بعد بیمار پڑنے کی جیسے عادت تھی۔ انہیں پرہیز کرنے کی ہدایت کون کرتا؟۔ اور ان کی بیماری کا مطلب ڈاکٹر کی فیس دواؤں کی قیمت، اور ظفر کی دو شادی شدہ بہنوں کی آمد، ان کے بچوں کی دھما چوکڑی، عیادت میں آنے والوں کی خاطر و مدارات۔

ظفر کی چھوٹی بہن نازیہ ——— اسے تو بس کالج جانا اور اس کے بعد آرٹس اسکول کا چکر لگانا تھا۔ باقی وقت میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کمرے میں بند ہو کر گپ شپ

کرنا۔ ذکیہ سوچتی گھنٹوں ایک گھر میں بند یہ جوان لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔ کیسا راز و نیاز ہے جس کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہیں؟ کبھی بھولے سے بھی جو منا کو گود اٹھا لیتی ــــــ کیسے گود اٹھاتی .... ؟ منا کے گندے ہاتھ پاؤں سے اس کے کپڑوں میں داغ لگ جاتے۔ منا کبھی باہیں پھیلا کر اس کی جانب بڑھتا تو وہ چیخ کر یوں پیچھے ہٹ جاتی جیسے منا ایک معصوم بچہ نہیں۔ غلاظت کی ایک گٹھری ہو۔

ظفر کا چھوٹا بھائی شاید ــــــ اس سے منا کس قدر مانوس ہے۔ لیکن وہ گھر میں ٹکتا ہی نہیں۔ غریب ٹکے بھی کیسے۔؟ ایک تو گھر کا سودا سلف لانے میں اس کا وقت صرف ہوتا۔ دوسرے گھر پر ہوتا تو ابا اسے دوڑتا ہوا پہیہ بنانے پر تلے رہتے۔ جاؤ مرزا کو بلا لاؤ، انہیں شطرنج کے پارٹنر کی ضرورت ہوتی۔ یہ دوا لے آؤ، اس دوا کو واپس کر آؤ۔ وہ کتاب نواب صاحب سے مانگ لاؤ، اور یہ خط خاں صاحب کو دے آؤ، اتنی باتیں ہی ہوتیں تو بھی وہ شاید گھر سے یوں نہ بدکتا۔ یہاں تو ہر دو تین دنوں کے بعد اس کپڑوں اور بال پر سخت تنقید ہوتی۔ وہاں بیٹھے لوگوں کے سامنے آج کے نوجوانوں کا مضحکہ اڑایا جاتا ــــــ اور تو اور ــــــ کہیں ان کی نظر شاید پر اس وقت پڑ جاتی جب منا اس کی گود میں ہوتا تو وہ پھٹکار سنتا۔ عزیزم! بچے سے آپ کو کیوں اس قدر انسیت ہے۔ کہ گود میں اٹھائے پھر رہے ہیں۔ اس طرح بچے کمزور ہو جاتے ہیں۔ ان میں پیروں سے چلنے کی طاقت نہیں آتی۔ ایسے بچوں میں آگے چل کر خود اعتمادی نہیں پنپ پاتی۔

اب اس عمر میں ابا حضور کو کون سمجھاتا کہ خود اعتمادی پیدا کرانے کی یہ عمر نہیں ہوتی۔ ابا حضور کو کوئی بہانہ ملنا چاہئے۔ ذکیہ انہیں کیسے موقع دیتی کہ وہ ہنگامہ برپا کرنے کو تیار رہتے۔ وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کر لیتی۔

گھر میں رہ گئے ظفر۔ اور ان کے سر میں اپنے پروموشن کا ایسا سودا سمایا ہوا تھا کہ وہ ہر وقت اپنے باس کی خوشامد میں لگے رہتے۔ صبح و شام باس کے گھر چکر لگانا ان کا پہلا کام تھا۔ گھر پر جتنی دیر رہتے ان کی دلچسپی منا سے ضرور ہوتی۔ ایسے میں کوئی ٹولے محلے سے کوئی عورت آ جاتی۔ تو انہیں ظفر کی امی پاس بلا لیتیں۔ چھالیہ کترتی جاتیں اور سناتی جاتیں۔ بہن زمانہ کیسا بدل گیا ہے۔ ظفر میاں ہیں کہ دن رات بیوی بچے سے چپکے بیٹھے ہیں۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ ظفر کے ابا فجر کی اذان سن کر باہر نکلتے تو پھر شاید عشا کی نماز کی بعد ہی زنانخانے میں قدم رکھتے۔ اور وہ تب کہ گھر میں کوئی مہمان نہ ہوتا۔ اور سارے لوگ سو چکے ہوتے تھے ــــــ گود میں بچہ، مجال تھی کہ ان کا کوئی بڑا موجود ہو۔ اور وہ کسی بچے کو گود اٹھا لیں گود لینا تو در کنار، بچے کو انگلی بھی نہیں پکڑا سکتے تھے ــــــ اور یہاں ــــــ باپ نہ ہوئے بچے کے لئے دائی کھلائی ہوئے۔

ذکیہ ان باتوں کو سن کر اندر اندر کھولتی۔ لیکن وہ کیا بولتی۔ اس پر ایک سنگین الزام تھا۔ کہ اس نے ظفر کو دام محبت میں پھانس لیا۔ ورنہ ظفر کی شادی تو پروین ظفر کی خالہ زاد بہن سے ہوتی۔ پروین کے ابا کا لاکھوں کا کاروبار تھا۔ اور وہ ظفر کو مالا مال کر دیتے۔ اب گھر میں ہر کسی کی ذمہ دار ذکیہ ہے۔

اب تک ذکیہ کئی نوکرانی رکھ چکی تھی۔ ایک آئی تو ذکیہ کے سنگار کے سامان کا صفایا کرنے لگی۔ اور ہر وقت اس کی نظر ظفر پر ہوتی۔ دوسری آئی تو وہ منا کو لے کر باہر نکل جاتی۔ اور محلے پر عشق لڑاتی جس کے نتیجے میں ایک دن منا ایک موٹر کار کے پیچھے لگ گیا۔ کچھ

دور جانے کے بعد بھکارن نے منا کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ تو خیر کہیئے کہ محلے کے ایک بھلے آدمی نے منا کو پہچان لیا ورنہ زندگی بھر کا قلق رہ جاتا۔ اس عشق کی ماری نوکرانی کا کیا بگڑتا وہ غائب ہو جاتی۔

اب وہ منا کے لئے کیا کرے۔ ؟ نوکری چھوڑ دے تو خرچ کی گاڑی کیسے چلے ؟

اس نے گھڑی دیکھی۔ اب دس بجکر پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ ایک بار پھر منے کو منانے کی کوشش کی۔ تو وہ فرش پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ ذکیہ نے اسے گود میں اٹھالیا۔ جمر کا دادا اور دادی کے پاس دے دیا۔

منا کی دادی نے نفرت بھری نگاہوں سے ایک بار ذکیہ کو نیچے اوپر دیکھا۔ منا سسکتا سہما ذکیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اور ذکیہ ممتا کی لاش کو روندتی ہوئی آگے بڑھ گئی بس وقت پر نہیں ملی تو کالج دیر سے پہونچے گی۔

منا کا چہرہ دھیرے دھیرے پرنسپل کی پیشانی پر ابھرتی شکنوں میں کھو گیا۔ منا کی سسکیاں سڑک کی ٹرافک میں گم ہوتی چلی گئیں۔ ●●

رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ میرے اندر سناٹا بڑھ رہا ہے۔ اور میری آواز مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ تب میرے لاشعور پر ایک قبر جیسی شئے ابھری۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔ اپنے قریب بلا رہا ہے۔ تو میں ایک دن اپنے گھر سے نکل پڑا۔ اور ویرانوں، صحراؤں اور جنگلوں میں اپنی آواز اور اپنی قبر کو ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہونچا۔ اور جب یہاں بھی میری آواز میری قبر نہ ملی۔ تو میں تھک کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی لاش اپنے کاندھے سے اتار کر زمین پر رکھدی۔ اور خود کو ہلکا محسوس کرنے لگا۔

اور پھر باری باری سبھی لوگوں نے اس کہانی کو دہرایا اور تب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ تابوت جیسی شئے کسی بزرگ کا مزار نہیں۔ بلکہ ان سبھوں کی لاشیں ہیں۔ اب میرا بھی جی چاہنے لگا تھا اپنی آواز اور قبر کی جستجو میں خود کو تھکانے سے بہتر اپنے کاندھے لاش اتار کر خود کو ہلکا پھلکا کر لینا ہے۔

لیکن جب میں نے اپنے کاندھے سے اپنی لاش اتارنے کی کوشش کی تو لگا کہ میری لاش مجھ سے زیادہ وزنی ہے۔ اور میں نہایت کمزور اور نحیف۔ ●●

بقیہ: شاعری میں مصوری

وابستہ رہی ہے۔ مگر فنون لطیفہ کی مکمل اکائی کا احساس جدید شاعروں کے یہاں زیادہ گہرا ہے۔ دراصل اچھی شاعری ایک تنہا آرٹ نہیں ہے۔ بلکہ یہ دوسرے فنون لطیفہ کی جزوی خصوصیات اپنے اندر سمو کر اور مرکب کی شکل میں اپنا حسن دیتی ہے۔ جدید عہد میں ایک فن دوسرے فنون سے روشنی حاصل کر رہا ہے۔ شاعری نے رقص اور مصوری کی متعدد اداؤں کو مقید کر لیا ہے۔ اس وحدت نے اردو کی جدید شاعری کو کئی حیثیتوں سے نمایاں کر دیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے متعدد ایسے الفاظ استعمال میں آئے ہیں جو تصویری

احساس کو اجاگر کرتے ہیں۔ جدید شاعری نے مصوری کو [illegible] میں ضم کر لیا ہے۔ آج کنکریٹ، پوئٹری کی طرف بڑھتی ہوئی دلچسپی بھی مصوری کے نقوش اور زاویوں [illegible] تخلیقی دلچسپی کی علامت بن چکی ہے۔ اب مصوری کی [illegible] نے جدید شاعروں کو مردہ، مجہول اور بے رنگ الفاظ کے مقابلے میں، زندہ، متحرک، فعال اور اپنے رنگوں سے اپنی شناخت دینے والے الفاظ کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اب ان تمام خصوصیات کے باوجود قاری اور جدید شاعروں کے درمیان تناسب قائم نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری قابل اعتنا نہیں سمجھی جاتی۔ تو یہ اور بات ! ●●

ممتاز احمد خاں (پاکستان)

تین مناظر

پوری گلی سنسان پڑی ہے گھروں میں روشنیاں بجھ گئی ہیں۔ پورا ماحول گہری نیند سویا ہوا ہے۔ پر ایک سایہ ہے جو اسی گلی کے ایک چھوٹے سے بوسیدہ مکان کی پہلی منزل پر بے حس و حرکت کھڑا ہے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک اور سایہ تھرتھراتا ہوا بالکل چراغ کی لوخری لو کی طرح وہاں آتا ہے۔ دونوں کے درمیان کوئی مکالمہ نہیں ہوتا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد دونوں سائے بولنے لگتے ہیں۔

رضیہ اتنی رات گئے یہاں کیوں کھڑی ہو ؟

آپ سے مطلب ؟

یہاں بہت اندھیرا ہے۔

کیا اپنی زندگی میں کوئی اجالا ہے ؟

بے وقوف لڑکی،

سامنے قبرستان دیکھتی ہیں آپ ؟

روز دیکھتی ہوں

یہ لوگ کس قدر پرسکون ہیں۔

نیچے چلو، ورنہ اگر تمہارے بیمار باپ نے دیکھ لیا تو؟

تو کیا ہوگا ؟

انہیں صدمہ ہوگا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ان کو خوش رکھو

دوسرے کی خوشی کا گلا گھونٹ کر ؟

پاگل لڑکی۔ ضدی لڑکی۔

پھر دونوں سائے نیچے اتر جاتے ہیں۔

۲

ہوائی جہاز کی پرواز سے قبل ایک دلکش آواز لوگوں کو امیگریشن کاؤنٹر کی جانب بلاتی ہے۔ جہاز لندن جانے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ اسی اثنا میں ایک نو بیاہتا لڑکی سرخ جوڑے میں ملبوس کاؤنٹر کی جانب چلنے لگتی ہے۔ جیسے زبردستی چل رہی ہو۔ وہ بار بار مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھتی جاتی ہے پیچھے اس کا بوڑھا باپ کھانستا ہوا اس کی بوڑھی ماں آزردہ سی مسکراتا ہوا۔ ساس ہنستی ہوئی، بڑا بھائی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان لئے ـــــــ کھڑے ہیں۔ اس کا شوہر چند گھنٹوں بعد لندن ایرپورٹ پہ آنے والا ہوگا۔ نکاح کے بعد سے معلوم کام کی وجہ سے وہ واپس چلا گیا تھا۔ اپنے ماں باپ کا وہ بڑا سعادت مند بیٹا تھا جس نے ان کی مرضی سے شادی کی تھی اس کے ماں باپ کا یہ کہتے کہتے منہ سوکھتا تھا۔ کہ ان کا بیٹا دس سال سے لندن میں موجود ہے۔ لیکن اس نے کسی گوری لڑکی سے شادی نہیں کی، کچھ لوگ یہ سن کر رشک کرتے تھے، کچھ دعائیں دیتے تھے۔ لیکن رنگین خواب دیکھنے والے نوجوان ان کے بیٹے کو احمق اور گاؤدی سے تعبیر کرتے تھے۔

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ

اندر سے بہت سہما ہوا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سے وہ باتیں کرے، پیاری، پیاری — کچھ اس قسم کے جملے بولے — میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا — تم میری زندگی میں بہار بن کر آئی ہو — اس نے اس قسم کے جملے خواتین کے پرچوں میں چھپنے والے افسانوں میں تواتر کے ساتھ پڑھے تھے۔ آخر اس نے خود ہی مہرِ سکوت توڑی۔

آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟

میں بالکل ٹھیک ہوں رضیہ!

آپ نے میرے خطوط کے جواب نہیں دیئے،

یہاں بڑی ہنگامہ خیز زندگی ہے۔ کچھ یاد ہی نہیں رہتا کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

ہاں بھئی! کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس نے جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا تھا۔؟

وہ شادی کے پانچویں دن لندن واپس چلا آیا تھا۔ یہ شادی بہت جلدی میں ہوئی تھی۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ کی طرز پر — بس سکندر کے ماں باپ نے اسے اس کے حسین ہونے کی بنا پر فوراً پسند کر لیا تھا۔ اس نے بہترا احتجاج بھی کیا لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی حالانکہ اس کے چچازاد بھائی کا رشتہ بھی آیا ہوا جسے وہ بے تحاشہ چاہتی تھی لیکن اس کے باپ نے کہا کہ وہ ایسی جگہ رشتہ کریگا جہاں وہ مالی طور سے مطمئن رہے۔ اور ان کا بھتیجہ محض سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اور رشوت لینے کو گناہ سمجھتا تھا۔

پھر وہ بچوں کی سی حیرت کے ساتھ لندن کا ماحول دیکھتی رہی۔

بڑی دیر بعد ہمت کر کے بولی۔ گھر کتنی دور ہے۔

قریب ہی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا،

اس نے سکون کا سانس لیا۔ اب اس نے خود ہی بات کا آغاز کیا۔ رضیہ انسان کو ہمیشہ کسی بھی غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہئے۔ میرے ایک استاد تھے..... بھلا سا نام تھا ان کا۔؟...... اس وقت کچھ یاد نہیں آرہا ہے........ وہ کہا کرتے تھے کہ خواب ضرور دیکھو مگر عملی زندگی میں ذہنی دھچکوں کے لئے بھی تیار رہو۔ جھٹکے یا یوں کہہ لو شاکس SHOCKS — سمجھ گئیں نا۔ بی اے پاس تو ہو — مگر پاکستان کا بی اے پاس طالب علم ہونہہ

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے — یہ کہہ کر وہ رومال اپنے پرس میں سے نکالنے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔

سکندر پر اس بات کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔

نیگرو ٹیکسی ڈرائیور نے کھٹ سے ٹیکسی روک دی۔

اور کہنے لگا، سر وہ یہ ہی ہے۔

ابھی تم ٹیکسی چلاؤ — سکندر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ نیگرو ٹیکسی ڈرائیور نے چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا اور پھر ٹیکسی چلانے لگا۔

اپنے اپارٹمنٹ کے پاس پہونچنے سے قبل سکندر نے اسے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ میں زیادہ سوالات کرنے والے کو ناپسند کرتا ہوں۔ اس بات کا خیال رکھنا۔ ورنہ ....

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور ٹیکسی سے اتر کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اندر پہونچکر اس نے اسے فرج میں منجمد مرغی حوالے کر دی۔ اور کہا کہ وہ اسے جس طرح چاہے پکالے،

بس ذرا مصالحہ کم — مجھے یہاں کی عادت ہو گئی ہے۔

یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔

کھانے کے وقت اس نے موسیقی سننا شروع کر دی، اور سر جھکائے اپنے کام میں مشغول رہا۔ رضیہ کو محسوس ہوا گویا موسیقی اس کا گلا دبوچنا چاہتی ہو۔ اس نے ہذیانی انداز سے آگے بڑھ کر کیسٹ ریکارڈ کا بٹن آف کر دیا — وہ دھاڑا

غ خراب ہے تمہارا ـــــ خبردار، جو آئندہ ایسی بدتمیزی والی
ت کی۔ آخر ہو نا اپنے ملک کی اجڈ خاتون۔ نان سینس،
یہ کہ کر اس نے کیسٹ پھر سے آن کر دیا۔
وہ بہت دیر تک سوچتی رہی کہ کس ردعمل کا اظہار
ے، ؟ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کرنے پائی تھی کہ وہ تقریباً
تے ہوئے بولا۔ اس پارٹمنٹ میں تمہارا قیام صرف ایک
نہ ہوگا۔ پھر ہم لوگ دوسری جگہ شفٹ ہو جائیں گے۔
جیسی آپ کی مرضی ـــــ اس نے بڑی حسرت کر
جواب دیا۔
اچانک کال بیل کی آواز گونجی۔ وہ اکتاہٹ سے
اتھ اٹھا اور دروازہ کھول دیا ـــــ اس کے ساتھ ہی ایک
سی انگریز عورت اور نیلی آنکھوں والی ایک پانچ سالہ بچی
ر داخل ہوئی۔
تم ـــــ تمہیں تو وینس VENICE
ں ہونا چاہیئے تھا۔
وہ انگریز عورت سوٹ کیس ایک طرف رکھتے ہوئے
ں دراصل انکل رچرڈ سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ اور میں واپس
ئی۔ لیکن کیا تم میرے پیچھے اس ایشیائی بازاری عورت سے اکیلے
ں دل بہلا رہے تھے۔ ؟
یہ بازاری عورت نہیں ہے۔ میری پاکستانی بیوی ہے
اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑے اطمینان سے
ہا۔
اوہ ـــ نہیں ـــ یہ نہیں ہو سکتا ـــ تم بڑے
ینے ہو ـــ اول درجے کے دھوکے باز ـــ ذلیل ـــ
ر دنیا کے گھٹیا ترین انسان ـــ
اس کا انداز بڑا ہسٹریکل تھا۔
کیتھرین ـــ اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا
ے موقف کو پہلے سن لو ـــ پھر جتنی گالیاں چاہو دے لینا

کیسا موقف ؟ وہ چیخی، اب میں سمجھی کہ اپنی ماں کی
عیادت کا بہانہ کر کے تم پاکستان دوسری شادی رچانے
گئے تھے۔
سکندر کا لہجہ ویسا ہی رہا۔ وہ بولا، کیتھرین۔ میرا
باپ دل کا مریض ہے۔ اور میری ماں بہت زود رنج عورت
ہے۔ اگر میں انہیں بتا دیتا کہ میں شادی شدہ ہوں اور
پاکستان میں شادی نہیں کر سکتا۔ تو وہ دونوں یکے بعد دیگرے
مر جاتے،
پھر اس نے لمبی آہ بھری اور کیتھرین کو ملتجیانہ نظروں
سے دیکھنے لگا۔
بزدل انسان ـــــ کیتھرین نے دانت پیستے ہوئے
کہا ـــ!
سکندر نے پھر کہا ـــــ کیتھرین ان دونوں نے
مجھے انتہائی مصیبت سے پالا تھا۔ خود فاقے کر کے مجھے
کھانا کھلایا۔ میں انہیں ذہنی اذیت میں مبتلا نہیں کر سکتا تھا
رضیہ ان دونوں کی انگریزی میں گفتگو کو صحیح معنوں
میں سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے ان دونوں کی باتوں
کو سن رہی تھی۔ اور یہ سمجھ رہی تھی گویا دو مگرمچھ کے درمیان
مچھلی کی حیثیت رکھتی ہو۔
میں کچھ نہیں جانتی ـــــ اس کتیا کی بچی کو یہاں سے
ابھی باہر نکالو، ورنہ میں اسے خود دھکے دے کر نکال دوں گی
آہستہ بولو کیتھرین ـــ ہمارے پڑوسی کیا سمجھیں گے ؟
پڑوسیوں کو جہنم میں جانے دو ـــــ اور ہو سکے
تو اس کتیا کی بچی کو بھی وہیں بھیج دو۔
سکندر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور کیتھرین کو گھسیٹتا
دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس دوران رضیہ کو کیتھرین کی
چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر اسے محسوس ہوا گویا کمرے
کی چیزیں ادھر ادھر پھینکی جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد،

سکندر ہانپتا کانپتا واپس آیا۔ اس کی قمیص جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں میں سے خون رس رس کر باہر نکل رہا تھا۔

وہ رات اس نے تنہا اپنے کمرے میں گزاری۔ ان آوازوں کے درمیان جو کراچی سے اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ یہ آوازیں سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں ——

بیٹی، سدا سکھی رہو۔ رضیہ میں نے تمہیں خوشحال مستقبل دیا ہے۔ ورنہ میرے بھتیجے کے یہاں تم گھٹ گھٹ کر مر جاتیں۔ میرا بیٹا بڑا کماؤ ہے۔ وہ تمہیں لندن میں شہزادی بنا کر رکھے گا —— میرے بیٹے سکندر کو کوئی تکلیف نہ دینا۔ رضیہ، کیونکہ میں نے اسے بڑی محبتوں کے ساتھ پالا ہے ——

اور وہاں اسے آمادہ کرنا کہ اپنی ماں کے پاس چلے چلو۔ آخری وقت میں وہ تمہارے سامنے مرنا چاہتی ہے ——

آخری آواز اس کے چچازاد بھائی کی تھی —— وہ کہہ رہا تھا رضیہ —— میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ زندگی کی آخری سانسوں تک —— لیکن تم مجھے بھلا دینا۔ کیونکہ تم کسی کی بیوی ہو۔

پھر صبح کے کسی حصے میں وہ سو گئی۔ دن چڑھے سکندر اس کے کمرے میں آیا۔ اور اسے سامان تیار کرنے کا حکم دے کر واپس چلا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ایک ٹیکسی میں اس کے ساتھ بیٹھی چلی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ راستے میں اس نے پوچھا۔

سکندر آپ مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں؟

پتہ چل جائے گا ابھی —— سکندر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ کم بخت وقت سے پہلے آ گئی۔ ورنہ میں نے سوچا تھا کہ اس عرصے میں دوسرا اپارٹمنٹ کا بندوبست کر کے میں تمہیں وہاں شفٹ کر دوں گا۔

پھر آپ میرے ہی پاس رہیں گے نا۔؟

اوہو —— چپ کرو —— اپنے سوالات سے میرا دماغ خراب مت کرو۔

اس نے تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔

وہ خوف زدہ ہو کر کونے میں دبک گئی۔

پھر ٹیکسی ایک غلیظ سے علاقے میں آ کر رکی۔ جہاں ہندوستانی اور پاکستانی قسم کی مخلوق چاروں طرف نظر آتی تھی اس نے سکھوں کی رنگ برنگی پگڑیوں کو بڑی حیرت سے دیکھا اسے اپنے دوپٹے یاد آنے لگے۔ جنھیں وہ مختلف رنگ دے کر سکھانے کے لئے ڈالا کرتی تھی۔ اور جب ہوا چلتی تو یہ دوپٹے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر عجیب سی قوس و قزح کا نقشہ پیش کرتے۔

جس مکان میں وہ آئے وہ چھوٹے چھوٹے سے کمروں پر مشتمل تھا۔ کہ جن میں سے سیلن کی بو آ رہی تھی۔ اس گھر کا مکیں ہاشم اسے بار بار گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی میلے سے کپڑے پہنے ہوئے چائے بنانے میں مشغول تھی۔

سکندر نے اسے بتایا۔ رضیہ، ہاشم بھائی بنگلہ دیشی ہیں کسی زمانے میں یہ کراچی میں رہتے تھے۔ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ یوں سمجھو میرے بڑے بھائی ہیں۔ اب تم یہاں پر رہو گی جب تک کہ مستقل انتظام نہ ہو جائے

تم ادھر خوش رہو گی۔ عائشہ تم سے بہنوں کا مافک محبت کریں گی۔

ہاشم نے دانت کھوسنیا کر کہا۔

عائشہ چائے بنا کر لائی۔ اس نے رضیہ کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اور اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔

ایک مہینے تک سکندر واپس نہیں آیا۔ رضیہ نے ہاشم سے کہا۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے سکندر کے پاس لے چلو ——

ہم کو سکندر کا گھر کا نہیں پتہ، پر ہم ڈھونڈ لیں گا۔

______ آدمی تو خدا کو ڈھونڈنے سکتا۔

ہاشم نے یہ بات کہہ کر دانت نکوسے، رضیہ نے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ چند لمحوں بعد ہاشم وہاں سے دفعان ہوگیا۔

دوسرے دن وہ دونوں سکندر سے ملنے جا رہے تھے راستے میں ہاشم بولا ___ ہم بوت مصیبت سے سکندر کا گھر معلوم کیا۔ اس کا ایک پورانا دوست ہم کو مل گیا تھا ___ ہا، ہا، ہا۔

اس نے خواہ مخواہ قہقہہ لگایا۔

کیتھرین نے ان دونوں کو اندر لا کر بیٹھایا۔ اور خود رونے لگی۔ رضیہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے محسوس ہوا گویا اسے کوئی بری خبر ملنے والی ہے۔ پھر کیتھرین نے اسے بتایا کہ ایک ہفتے قبل سکندر ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ لیکن رضیہ کے آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ وہ بہت دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی۔ ہاشم اپنی الٹی سیدھی انگریزی میں کیتھرین سے نہ معلوم کیا کہتا رہا۔ پھر وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

وہ ہمارا بوت اچھا فرینڈ تھا۔

رضیہ ہنوز خاموش تھی۔

چلتے وقت کیتھرین نے چند خطوط رضیہ کو دیئے۔ جو اس کے باپ نے اسے اور سکندر کو لکھے تھے۔ اور جن میں انہوں نے کسی قسم کی خیریت نہ بھجوائے جانے کا شکوہ کیا تھا۔ کیتھرین اسے ٹیکسی تک چھوڑنے آئی، اور اس نے سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔ راضی آ، شاید ہم دونوں بدنصیب ہیں۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ رضیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا کیتھرین ابھی تک سڑک پر کھڑی تھی۔ اور پھر وہ رومال میں منہ ڈھانپ کر رونے لگی ___ پتہ نہیں یہ غم سکندر کے لئے تھا یا کیتھرین سے ہمدردی کا اظہار۔

جب وہ دونوں گھر پہونچے تو دیکھا کہ وہاں ایک مجمع لگا ہوا ہے۔ وہاں چند پولیس والے بھی کھڑے تھے۔ ہاشم گھبرا کر اندر گھس گیا۔ وہاں دروازے سے متصل کمرے میں اسکی بیوی کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ ___ ایک پڑوسی نے اسے بتایا کہ چند نقاب پوش قسم کے نوجوان لڑکے اس کے گھر میں ڈکیتی کی غرض سے گھس آئے تھے۔ انہوں نے ڈکیتی کی واردات کے بعد اس کی بیوی کو قتل کیا۔ اور فرار ہوگئے۔

ہاشم نے جلدی سے الماری کا رخ کیا۔ اور وہاں سے ایک بہت ہی پرانی قسم کی منقش صندوقچی نکال کر لایا جو بالکل خالی تھی ___ پھر وہ دھاڑا ___ اس میں ہمارا ایک ہجار (ہزار) پاؤنڈ تھا۔

اتنی دیر میں پولس والے لکھت پڑھت کرنے لگے تھوڑی دیر بعد ایمبولینس بھی آگئی۔ اور پولس والے لاش کو پوسٹ مارٹم کی غرض سے اٹھا کر لے گئے۔

عائشہ کو دفنا کر آنے کے بعد ہاشم بستر پر دراز ہوگیا اور خالی خالی آنکھوں سے دیواروں کو گھورنے لگا۔ پھر یکایک اسے نہ معلوم کیا ہوا کہ اس نے عائشہ کے کپڑے نکالے اور ایک ایک کپڑے کو دیوانہ وار چومنے لگا ___ رضیہ خاموشی سے ٹکٹکی باندھے اس کی حرکت دیکھتی رہی پھر اس نے کپڑے اٹھائے اور باہر پھینک دیئے۔

یہ تم نے کیا کیا۔؟

رضیہ نے پوچھا!

ہم کو ایسا لگتا ہے جیسے عائشہ زندہ ہے۔ ہم اس کا کپڑا دیکھ کر پاگل ہونے سکتا۔

ہاشم نے یہ کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

پھر وہ دو تین دن تک واپس ہی نہیں آیا۔ رضیہ کا خوف کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ وہ اس عرصے میں دروازہ بند کئے پڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا

کہ اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے ؟

پھر وہ اچانک رات کو گھر آیا۔ رضیہ کو محسوس ہوا گویا وہ نشے میں دُھت ہے۔ اس کی اس حالت کو دیکھکر وہ اس قدر دہشت زدہ ہو گئی کہ وہ یہ بھی نہ پوچھ سکی وہ کہاں رہا۔؟

اب ہم تمہارے ساتھ رہیں گے۔ ہی، ہی، ہی، ہاشم نے عجیب سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

پاگل ہوئے ہو کیا تم۔؟ رضیہ نے ہمت کر کے زور سے کہا چپ کرو، یہ سب تمہارا وجہ سے ہوا ہے۔ تم منحوس ادھر آیا۔ تو تمہارا شوہر مر گیا۔ پھر ہمارا عائشہ مر گیا ــــ تمہارا قدم بڑا منحوس ہے ــــ تم پورے انگلینڈ کو ختم کریں گا۔ نان سنس

یہ کہہ کر اس نے تیزی سے الٹی کردی۔ رضیہ برابر والے کمرے میں چلی گئی اور اسے اندر سے بند کرلیا۔ ہاشم پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے دیوانوں کی طرح دروازہ کھٹکھٹانا شروع کردیا۔ جب اس نے کافی دیر تک دروازہ نہیں کھولا تو وہ چیخا۔ اگر تم دروازہ نہیں کھولا تو ہم تمہارے کو قتل کردیں گا دیکھو ہم دس تک گنتی بولیں گا۔ اس کے بعد ہم تم کو سکندر کے پاس پہونچا دیں گے ــــ ایک ــــ دو ــــ

رضیہ نے فوراً دروازہ کھولدیا۔ وہ جھومتا جھامتا اندر پہونچا۔ اور پوچھنے لگا۔ تم کاہے کو ڈرنے کو مانگتا۔؟ اب ہمارا اور تمہارا تقدیر ایک ہے ــــ بالکل ایک ــــ

یہ کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر کچھ اس انداز سے رضیہ کو دبوچا۔ کہ ایک لمحہ کو وہ ششدر رہ گئی۔ پھر دونوں میں دھینگا مشتی شروع ہو گئی۔ ہاشم نے اسی دوران اس کا منہ اپنے فولادی ہاتھ سے ڈھانپ دیا۔ اور پھر رضیہ کو محسوس ہوا کہ جیسے کہ اس کے جسم کی طاقت آہستہ آہستہ خارج ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور وہ خود کسی پاتال میں گرتی جا رہی ہے۔ اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کے حواس معطل ہونے لگے۔ اور پھر اسے اتنا یاد رہا کہ جیسے ہاشم کی بدبودار سانسوں نے اس کے وجود کو کسی شکنجے میں کس دیا ہو ــــ اور وہ پتھر کی بن گئی ہو۔

ہوش آنے پر اس نے دیکھا کہ ہاشم اس کے پہلو میں لیٹا بے خبر سو رہا ہے۔ ایک لمحے کو اسے محسوس ہوا گویا وہ ہاشم نہیں سکندر ہو۔ سکندر نہیں۔ بلکہ دنیا کا ہر مرد ہو۔ جو عورت کی قسمت بنانے اور بگاڑنے پر قادر ہو ــــ پھر وہ اپنے ماضی میں کھو گئی۔ اور اس کی نظروں کے سامنے اس کے باپ ماں، ساس، سسر، بڑا بھائی، اور چچازاد بھائی کہ جو اس سے محبت کرتا تھا۔ سب بھوتوں کی مانند رقص کرنے لگے۔

چند ہفتوں تک یہی ہوتا رہا کہ دونوں تلخ کلامی کرتے ہاتھا پائی کرتے، ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے، اور سو جاتے، ہاشم اس سے اکثر کہا کرتا کہ وہ اب اس کی بیوی ہے۔ اور پھر ایک دن ایک چھوٹی سی مسجد میں جا کر انہوں نے اپنا نکاح بھی پڑھا لیا ــــ یوں وہ سکندر کو بھول گئی۔ اور ہاشم نے عائشہ کا نام لینا بند کردیا۔

یوں کئی موسم بیت گئے۔ رضیہ نے اپنے ماں باپ سے کوئی رابطہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہاشم نے اس سے کئی بار کہا کہ وہ اپنی زندگی کے اس نئے موڑ سے متعلق انہیں مطلع کردے، لیکن ہر بار اس نے سر جھٹک دیا۔

سب کچھ فضول ہے۔ میری پوری زندگی لایعنی ہے۔ وہ اکثر کہا کرتی۔ اور اس کے ان جملوں کو ہاشم ہونقوں کی طرح سنا کرتا۔ اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہتا ــــ لیکن ایک دن اس نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ رضیہ۔! ہم اپنے ساس اور سسر کو دیکھنے کو چاہتا۔ ہم پاکستان جائیں گے۔ ہم لالوکھیت بھی جائیں گے۔ ادھر ہم لوگ ایک پل کے نیچے جھونپڑی میں رہتا تھا ــــ رضیہ ــــ کراچی اب

بوت بڑا (ہوگیا) ہوئیں گا ـــــ لندن کا مافک ـــــ ہرطرف آدمی
ہرطرف موٹرگاڑیاں ـــــ چلیں گا نا۔؟ بس ہمارا یہ خواہش
پورا کر دو۔ پھر ہم تم سے کوئی اور فرمائش نہیں کریں گا۔ بولو
ـــــ چلیں گا نا۔؟

رضیہ کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ وہ کچھ نہ بولی اور
اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس طرح اس نے تین سال
ہاشم کے پاکستان جانے کے خیال کی مزاحمت کی۔ لیکن جب
اس کی لڑکی پیدا ہوئی تو ہاشم نے کچھ اس انداز سے اس کی
خوشامد کی وہ مان گئی ـــــ لیکن وہ یہ اکثر سوچتی کہ اس
کے ماں باپ ہاشم کو دیکھکر نفرت کا اظہار نہ کریں گے ؟

پھر ایک دن اس کے ذہن کے کسی کونے سے آواز
آئی۔ اب تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب تم پر کوئی اثرانداز
نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ خود ہی ہنس دی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ بڑی
مطمئن سی ہو گئی ہو اس بچے کی طرح جس نے اپنے سے بڑے
بچے کو پچھاڑ کر اسے بے بس کر دیا ہو۔

---

(۳)

وہ کئی برسوں بعد اپنی گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ رات
نے اپنے سائے ساحل پر پھیلانا شروع کر دیئے تھے۔ اس نے
اپنے گھر سے چند قدم پہلے ٹیکسی والے کو رکوا لیا۔ اور آتے
جاتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ اچانک اس نے ایک بوڑھی عورت
کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ یوں چل رہی تھی۔ گویا اس کی
آنکھوں کی روشنی بہت کم ہو۔ اس نے اسی بوڑھی عورت سے
انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

اماں! ارشد علی صاحب کا مکان کون سا ہوگا۔؟

بوڑھی عورت نے لمبی آہ بھری اور بولی۔ اجی وہ تو
گزر گئے۔ داماد کے مرنے کا سن کر جب لیٹے تو اٹھنا نصیب نہ
ہوا۔ اور اس کے ایک سال کے اندر اندر بیوی بھی گور میں جا (لیں)

ان کا لڑکا بھی تو تھا۔؟

اس کی کیا پوچھو ہو بیٹی۔؟ وہ تو ولایت گیا۔ در در
کی خاک چھانی، پر اسے بہن نہ ملی ـــــ روتا دھوتا چلا آیا۔
سنا ہے کہ کروڑپتی ہو گیا ہے۔ ڈبے جیسے مکان بنا دے ہے۔

ڈبے جیسے مکان؟ یہ کہہ کر وہ مسکرا دی۔

ہاں بیٹی، وہ ہی نا ـــــ؟ یاد آیا فلیٹ، لیکن وہ
اب بہت دور کہیں کوٹھی میں رہتا ہے۔ ادھر کبھی آتا ہی نہیں
بڑا آدمی ہو گیا ہے نا۔؟

یہ کہہ کر بوڑھی نے رضیہ کو غور سے دیکھنا شروع کیا
اور چند لمحوں بعد پھر بولی۔ مجھے صاف نظر نہیں آتا۔ ویسے یوں
لگے ہے جیسے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔

رضیہ اپنی بوڑھی پڑوسن کو پہچان گئی تھی۔ لیکن
اپنی شناخت نہیں کرانا چاہتی تھی۔ ادھر ہاشم اپنی بیٹی کو
گود میں لئے بیٹھا یہ سب باتیں بڑی بے چینی سے سن رہا تھا۔
جب اس سے برداشت نہیں ہوا۔ تو اس نے پوچھا۔

رضیہ ادھر کوئی چکر مکر ہے کیا؟

بوڑھی عورت آگے کو چل دی۔ رضیہ نے کچھ دیر
توقف کیا اور سکندر کا جملہ دہرایا۔ بھولے ہاشم! ہمارے
پہلے شوہر نے ایک بار کہا تھا۔ کہ انسان کو ہر لمحے کسی بھی غیر
متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہنی طور سے تیار رہنا
چاہئے۔

ہاشم کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ہاشم کی حالت (بھی) دیدنی
ادھر ٹیکسی والے نے جھنجھلا کر پوچھا۔
کدھر چلے؟ آپ کا سامان کدھر اتارے، بیگم صاحب
ایرپورٹ چلو، رضیہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا
ہاشم کے منہ سے گھٹی سی آواز نکلی "ایرپورٹ"
رضیہ نے ذرا ترش لہجہ میں ڈرائیور سے کہا۔

کیا تم نے سنا نہیں۔؟

انور قمر

پرندہ کہاں ہے؟

تم یہ کورس جائن کرلو
کونسا؟
اس نے بروشر میری طرف بڑھادیا۔
نیلے آکاش میں ایک خوش رنگ پرندہ پر پھیلائے اڑ رہا تھا۔
اپنے آپ کو پہچانئے۔
بروشر پر باریک حرفوں میں لکھا تھا۔
میں نے سوچا۔
کیا میں پرندہ ہوں؟ کھلی فضا میں اڑنا چاہتا ہوں؟
وہ بولا۔
یہ کورس تمہارے لئے بڑا مفید ثابت ہوگا۔ تم پر بار بار ڈپریشن[1] کا دورہ پڑتا ہے۔ اور تم اکثر انگزائیٹی کا شکار رہتے ہو۔ اور........
وہ دھیمے سُروں میں میرے امراض مجھ ہی کو گناتا رہا۔
اپنے مصائب کا حال دوسروں کی زبانی سنانا کسے پسند ہے۔؟ میں نے بے توجہی سے ورق الٹا۔
دیکھئے....... اپنے دفینے تلاش کیجئے.....
آپ کے اندر بے پناہ قوت پوشیدہ ہے''
ہاں ہے تو! مجھے خوشی ہوئی۔ بروشر میں سچ لکھا تھا۔
آپ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، آپ جوں کے توں رہیں گے، ہم آپ کو آپ کے اندر چھپے ہوئے شخص سے متعارف کرائیں گے

ہاں! میں اپنے آپ کو جاننا چاہتا ہوں۔ میں اپنے اس وجود سے ملنا چاہتا ہوں۔ کہ جو برسوں سے میرے ساتھ ہے۔ لیکن اب تک اجنبی سا ہے۔
لیکن میرا ذہن محض اس نکتہ ہی پر مرکوز نہیں رہتا۔ بھٹک بھٹک جاتا ہے۔
سوچتا ہوں
وہ کیوں مجھے نہیں سمجھتا؟
میں کیوں اسے سمجھ نہیں پاتا؟
ہم دونوں میں کیا مشترک ہے۔ اور کیسا اختلاف ہے۔؟ میں تو چاہتا ہوں کہ نہ صرف وہ بلکہ آپ بھی میرے اندر اتر آئیں۔
اندر بہت اندر........
پھر دیکھیں........ کیا میں آپ کو ویسا ہی نظر آتا ہوں کہ جیسا ہونے کی آپ کو توقع ہے۔
ممکن ہے کہ آپ میرا سُرخ سُرخ گوشت، باریک باریک نسیں اور سفید سفید ہڈیاں دیکھ کر مایوس ہوجائیں۔
ممکن ہے مجھ کو اندر سے دیکھ کر آپ کو گھن آئے،
اور جب آپ میرے ذہن کے اندر سفر کررہے ہوں۔
اور آپ کو وہاں کئی خوف، کئی دکھ، اور کئی آشائیں نظر آئیں........ لیکن یہ انتہا نہ ہوگی، میرے اندر آپکے سفر کی کیونکہ میرے مکمل وجود کا راستہ ان ہی تہہ خانوں سے آگے بہت آگے

11 DEPRESATION (1) ...

جاتا ہے۔

اسی لئے میں اس بچھڑی ہوئی چربی کے فضلے کو، دھجیوں کے ڈھیر کو، اور ہڈیوں کی چھیلن کے انبار کو کسی بھی ترکیب سے نکال دینا چاہتا ہوں۔

مجھے نجات حاصل کرنی ہی ہوگی۔

وہ بولا۔

یہ کورس تمہارے اندر کے دیت نام کو ٹھنڈا کر دے گا تم سکون سے جی سکو گے۔

سچ ...... کیا یہ ممکن ہے، میرے منہ سے نکلا،

بروشر کے اگلے صفحے پر لکھا تھا۔

"آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیونکر ممکن ہے؟ دیکھیے لاکھوں لوگوں کو اس کورس نے ذہنی آسودگی بخشی ہے۔ انہیں اپنے جہنم سے باہر نکالا ہے"

میں نے تہیہ کیا ......

میں کل ہی یہ کورس جائن کر لوں گا۔ یہ دھن دھن کرتے ہتھوڑے مجھے لرزا لرزا دیتے ہیں۔ یہ چیختی چلاتی ابابیلیں مجھے سکتے میں ڈال دیتی ہیں۔ دبے قدموں سے تعاقب کرنے والے سائے میرا دم گھونٹتے ہیں۔ سفید پوشوں کی مسکراہٹ میری آل اولاد کے خون میں ڈوبی نظر آتی ہے۔

میں سفید کو کالا، در کو روزن، اور زمین کو پاتال کہنے لگا ہوں۔ مجھے چھوتے ہی لوگوں کو جھٹکا لگتا ہے۔ اور چھپتے چھپتے ہی میں بکنے لگتا ہوں۔ مجھے اپنے علاج کے لیے ریپیر کی اشد ضرورت ہے۔

لکھا تھا:

آپ کا نہ ازم بدلے گا، نہ مذہب، آپ کی نہ سوچ بدلے گی، نہ فکر، آپ جوں کے توں رہیں گے، ...... لیکن آپ میں ایک حیرت انگیز تبدیلی آ چکی ہوگی ——— آپ پراسرار طور بدل چکے ہوں گے۔ لیکن جسے آپ نہیں دوسرے محسوس کریں گے۔"

میں خلا میں معلق ہوں۔ میرے چاروں اور تاریکی ہے۔ زمین اپنی دلفریب رنگینیوں اور رعنائیوں سے مجھے اپنی طرف بلاتی ہے۔ اور میں ہاتھ ہلا ہلا کر نہیں ...... نہیں کئے جا رہا ہوں۔

میں ...... میں یہ کورس جائن کرنا چاہتا ہوں جلد از جلد جائن کرنا چاہتا ہوں۔

وہ مسکرایا۔

گویا اس نے اپنے ذہن کی اسکرین پہ میرا خرابہ دیکھ لیا ہو

اس پر تاریخ دی گئی ہے۔ تم کل ہی جا کر فیس جمع کر دو۔ کورس اگلے ماہ شروع ہوگا۔

یہ سنتے ہی میں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ مجھے اپنے دکھوں سے جلد ہی نجات ملنے والی تھی۔

ورق الٹتے الٹتے میں بروشر کے آخری صفحہ پر پہونچا لکھا تھا:

"کورس کی آمدنی آپ ہی کی طرح دوسروں کے دکھوں بھرے دوا میں صرف ہوگی ——— جلدی کیجئے"

میں نے مسکرا کر بروشر بند کر دیا۔

یہ کیا ...... بروشر کی پشت کوری تھی ......

نہ آکاش تھا ...... نہ پرندہ ...... سلیٹی رنگ اوپر سے نیچے تک چھایا ہوا تھا ......

میں چیخا۔ پرندہ کہاں ہے، پرندہ کہاں ہے۔؟

پرندہ کسی گہری دھند میں غائب ہو چکا تھا۔! ●

زین العابدین (بنگلہ دیش)

اجنبی اور بچہ

میری کہانی بہت پرانی ہے" راوی نے کہا" مگر اتنی پرانی نہیں کہ اسے پڑھ کر نئے پن کا احساس نہ ہو۔ میری کہانی جتنی پرانی ہے اتنی ہی نئی بھی ہے۔ صرف اس کہانی پر وقت کی دھول جمی ہوئی ہے پھونک کر ہٹا دو۔ پھر یہ نئی کہ نئی ہو جائے گی۔ راوی نے کہا۔ تو، لو پھر سنو!

ایک شہر کے ایک محلے میں ایک مسجد تھی۔ یہ مسجد مٹی کی تھی۔ اسے ان لوگوں نے بنایا تھا۔ جو خود مٹی کے تھے۔ چونکہ مٹی کا اپنا کوئی رنگ نہیں۔ سو مسجد کا بھی اپنا کوئی رنگ نہ تھا۔ مٹی آگ سے پیدا ہوئی ہے۔ اور آگ نے اندھیرے سے جنم لیا ہے۔ لہٰذا آج بھی مٹی سورج کے نیچے تپ رہی ہے۔ آج بھی آگ اور مٹی کا سمبندھ ہے۔ اور اس وقت تک رہے گا جب تک یہ مسجد ہے!

اس مسجد کے چاروں اور لمبی لمبی دیواریں ہیں۔ اور ان دیواروں اور مسجد کے درمیان جو صحن ہے۔ وہاں کئی قبریں ہیں۔ ان قبروں میں مردے نہیں ہیں۔ بالکل خالی ہیں۔ خندقیں ہیں۔ ان میں خودرو پودے اُگ آئے ہیں۔ مگر ان دیواروں سے باہر بہت ساری قبریں ہیں۔ جو مردوں سے اٹی پڑی ہیں۔ ان مردوں میں ایسے لوگ شامل ہیں۔ جو پیدا ہونے سے پہلے مر گئے تھے۔ اور جو مر گئے تھے سو مر گئے تھے۔ جو زندہ تھے وہ بھی مردہ تھے۔ بالکل لاش، چلتی پھرتی لاش۔ جن کے چہروں پر چاند کے سے دھبے تھے۔ اور سورج کی ساری سیاہیاں تھیں۔

کہتے ہیں کہ یہ مردے پہلے اس مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی نماز پیش امام کو ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی تھی۔ کیونکہ نماز پڑھتے وقت یہ مردے پیش امام کی تکبیر پر سجدے نہیں کیا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ پیش امام کی پیشانی پر سیاہ دھبے دراصل اس کی پرہیزگاری کی نشانی نہیں۔ بلکہ اس کے سیاہ کرتوتوں کی نشانی ہے۔ پیش امام کا دل جذبۂ عشق سے خالی ہے پھر کیسے اس کے پیچھے نماز جائز ہو سکتی ہے۔ لہٰذا پیش امام کو ان مردوں کی نافرمانی پر طیش آ گیا۔ پس اس نے الٹی آیت الکرسی پڑھی۔ اور فضا میں اچھال دی۔ آناً فاناً مسجد کے گرد چہار دیوار کھڑی ہو گئی۔ تب مردوں نے بھوکوں کی طرح اس چہار دیواری کو چاٹنا شروع کر دیا۔ پیش امام کو پھر غصہ آیا۔ اس نے دوبارہ آیت الکرسی پڑھی۔ اور مردوں پر پھونک ماری۔ سارے مردے کیڑوں کی طرح رینگتے ہوئے قبروں میں چلے گئے۔ مگر آیت الکرسی پڑھنے سے پہلے پیش امام وضو کرنا بھول گیا تھا جبھی تو لوٹے میں وضو کا پانی آج بھی جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔

اس واقعہ کے بعد مسجد میں تالا پڑا ہوا ہے۔ اب کوئی اس مسجد میں نماز پڑھنے نہیں جاتا ہے۔ اب مسجد آسیب زدہ ہے چہار دیواری کے باہر قبروں پر گھنے پودے اُگ آئے ہیں جنھوں نے مسجد کو ڈھانپ رکھا ہے لیکن گنبد نظر آتا ہے۔ یہ گنبد ہماری ماں کی چھاتیوں کی طرح گول ضرور ہے۔ لیکن دودھ سے خالی ہے

یہ دودھ خون سے بنتا ہے۔ جس کے ایک قطرے کو چکھ کر خدا کی آنکھیں احترام کے جذبے سے بھر آئی تھیں۔ مگر آنسو گرنے سے قبل فرشتوں نے لوٹا بڑھا دیا تھا۔ اور پھر یہ آنسو وضو کا پانی بن گیا اس گنبد کا رنگ بند ہے اس سانپ کے زہر کی طرح جو خود اپنے بچوں کو ہڑپ لیتا ہے تاکہ وہ اس کے ہم عصر نہ بن جائیں اور آدمی بننے کی صلاحیتیں نہ پیدا کر لے۔ اس گنبد پر رنگ برنگ کے کبوتروں نے اپنے اپنے گھر بنا رکھے ہیں۔ جن کی کھڑکیوں سے اس قبرستان کی طرف تک رہے ہیں۔ جہاں مردوں کا ہجوم قبروں میں لیٹا لوڑ کی آواز سننے کے لئے کان کھڑے کئے ہوئے ہے سنا ہے کہ اس گنبد سے ایسی آواز آتی ہے۔ جو کوہ ندا سے بالکل مختلف ہے۔ جس کو سن کر نہ کوئی بھڑ جاتا ہے اور نہ کوئی ذات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ اس کی آواز میں زہر کی مٹھاس ہے۔ جس کو سن کر محلے والے گہری نیند سو جاتے ہیں۔ اس کی آواز کبھی آذان، کبھی دیوتا کے سامنے بجائے جانے والے سنکھوں سے ملتی جلتی ہے۔ کبوتر اس آواز سے بڑے مانوس ہیں۔ جبھی تو وہ خوف نہیں کھاتے صرف غٹرغوں کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار اڑنے کے لئے پر تولتے ہیں۔ مگر مکڑیوں کے جالوں نے ان کے پر باندھ رکھے ہیں اس گنبد کے نیچے لیٹا پیش امام قبروں کے اندر رینگنے والے مردوں کو دیکھ رہا ہے۔ ان کی سرگوشیوں کو سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیونکہ اسے احساس ہے کہ کبھی نہ کبھی الٹی آیت الکرسی کا اثر زائل ہوگا۔ اور مردے ننگے پاؤں قبروں سے نکل آئیں گے۔

القصہ! اسی شہر کے اسی محلے سے کچھ دور ایک مندر بھی ہے۔ اس کے اندر بھانت بھانت کے دیوی دیوتا ہیں۔ ان کے رنگوں اور ڈھنگوں کے بارے میں صدیوں پرانے ان دیکھے صحیفوں کے پہلے باب میں لکھے گئے اشلوک سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کون تھے۔ اس مندر کے اوپر ایک کلس ہے۔ جو نہ جانے کس دھات کا بنا ہوا ہے۔ اور آج تک مندر کے اوپر یوں کھڑا ہے۔ جیسے شیو جی کی لنگ ہو۔ جب اس کلس پر سورج کی پہلی کرن پڑتی ہے۔ تو رام کے چرکھے پر کھڑی موٹی آنکھوں والی برہنہ سیتا نظر آتی ہے۔ یہ سیتا جو کبھی مر ہے۔ اور کبھی پدماونی، محلے کی اس گلی میں رہتی ہے۔ جہاں دھوبی اس کے میلے کپڑے دھوتا ہے۔ اور ان کپڑوں کے میل اکٹھا کرتا ہے تاکہ وہ میل کو ارجن کے جسم پر لگا کر اس پوچھے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ جو ہر رات سیتا کے کپڑے میلے کر جاتے ہیں۔ لیکن رالو دھوبی کو آج تک کوئی ارجن نہ مل سکا جو اس کے سوال کا جواب دیتا۔ ویسے بھی رالو دھوبی رات ہوتے ہی تیز دارو پی کر سو جایا کرتا ہے۔ اور صبح ہوتے ہی سیتا کی ستر پوشی کے لئے اس کے میلے کپڑوں کو دھونے میں لگ جاتا ہے۔

ایک دن جب وہ کپڑے دھونے میں مصروف تھا تو ادھر کہیں راون نکل آیا۔ اور رالو دھوبی سے پوچھا۔ یہ کس کے کپڑے ہیں۔؟

رالو دھوبی چپ رہا کیونکہ وہ کسی اجنبی سے باتیں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب راون نے اسے دارو کی بوتل دکھائی، تو وہ بولا تم سے مطلب۔

بس یوں ہی، اور راون نے دارو کی بوتل اس کی طرف بڑھا دی، جسے رالو دھوبی ایک ہی سانس میں پی گیا "سیتا کے ہیں یہ کپڑے" رالو دھوبی نے کہا۔ بڑے مزے کی چیز ہے بابو، اس کے ننگے جسم کو پڑھو تو اس کی ہر سطر میں ایک ایک معنی چھپا ہوا ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحہ رالو دھوبی خراٹے لینے لگا۔

سو ایک دن راون کہیں سیتا کے برہنہ جسم کو دیکھ لیا۔ سچ مچ اس کے انگ انگ سے دوب کی باس آ رہی تھی وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اور دن کے اجالے میں اس سے ملنے گیا۔ مگر رام نے سیتا کی جھونپڑی کے ارد گرد منتر پڑھ کے

پھونک دیا تھا۔ سو راون اس منتر کی لکیر کو پھلانگ نہ سکا۔ کیونکہ اس سے جل کر بھسم ہونے کا خدشہ تھا۔ اگر وہ راکھ کا ڈھیر ہو جاتا تو پھر کون سیتا سے پیار کرتا۔ لہٰذا راون نے ایک ترکیب سوچی، جھٹ وہ ہرن بن گیا۔ جسکو سیتا دیکھ کر باولی ہو گئی وہ لکیر کے حلقے کو توڑ کر ہرن کے پیچھے بھاگی۔ ہرن قلانچیں مارتا ہوا یہ جا وہ جا۔ سیتا چونکہ گنیش کی سیلی سے نکلی تھی۔ بھلا وہ ہرن کی دوڑ کا کہاں تک ساتھ دیتی۔ وہ ہانپتی ہوئی گلر کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی۔ اور چیخی۔

اب مجھ میں بھاگنے کی سکت نہیں۔ یہاں رام نہیں آسکتا۔ سیتا پر سے رام کے منتر کا اثر اتر چکا تھا۔ اور اب وہ راون کے منتر کے اثر میں تھی۔ راون ایک وجیہہ شکل کا آدمی بن چکا تھا۔ سیتا اس کی چھاتی سے لگ کر بولی۔ رام مجھ سے محبت نہیں کرتا ہے کیونکہ اسے مجھ پر اعتماد نہیں۔ جبھی تو اس نے میرے پاؤں میں منتر کی بیڑیاں ڈال دی تھیں۔

سیتا رو رہی تھی۔ میں پیار کی بھوکی ہوں راون۔ تمہاری دیوانی ہوں جبھی تو سارے بندھن توڑ کر تمہارے پاس چلی آئی ہوں۔ راون نے اسے اپنے بازو میں سمو لیا۔ اور اسے مسجد کے گنبد کے نیچے لے آیا۔ تاکہ وہ اس کے پیار کا گواہ رہے۔ لیکن گنبد نے مندر کے کلس کو بتایا۔ پھر کلس نے رام کو، راون اور سیتا کی پیار کی کہانی سنا دی۔ رام کے ہاتھ میں تیر کمان تھا اس نے تیر کمان پھینکا اور ہنومان کے سر پر بیٹھ کر اس جگہ پہونچا جہاں راون اور سیتا شیو جی کی کتھا دہرا رہے تھے۔ رام نے سیتا کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتا ہوا لے آیا۔ سیتا چیخی، روئی، اس کے سات پرکھوں کی دہائی دی۔ کہ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ دے، لیکن رام تھا بھگوان کا اوتار وہ کیسے سیتا کا ہاتھ چھوڑ دیتا۔ اس نے ایک نہ سنی، اگر سن لیتا تو رام اور سیتا کی کہانی جنم نہ لیتی۔ رام نے سیتا کو قوموں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس کے جسم پر پڑے ہوئے داغ دھبوں کو

گیا

دکھایا۔ اور کہا کہ سیتا نے بھگوان کے وشواس کو ٹھیس پہونچائی ہے۔ اسے سزا ملنی چاہیئے۔ لیکن ہجوم میں کھڑے ہوئے کچھ ایسے نیک دل پروہت بھی تھے جو سیتا کی آنکھوں سے پریم کرتے تھے۔ بولے، اسے اپنی پارسائی کا موقعہ دیا جائے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سیتا کا جسم غلیظ ہے مگر آتما پوتر ہے گنگا جل کی طرح، سیتا نے جلتی آگ کے اندر جونہی قدم رکھا آگ کے سرخ انگارے پھول بن گئے۔ اور اس کے پاؤں سے لپٹ گئے۔ سیتا نے پھولوں کا لمس محسوس کیا۔ اور آنکھیں کھول کر نخوت سے رام کی طرف دیکھا۔ رام اپنی شکست پر لوکھلا گیا اور لنکا جلا کر راکھ کر ڈالا۔

القصہ نہ آج رام ہے نہ سیتا، راون ہے نہ دھمن۔ مگر آج بھی جنگ جاری ہے۔ کبھی ریگستان میں تو کبھی نخلستان میں۔ کبھی برفوں کے اندر، تو کبھی شہر کی گلی کوچوں میں، کبھی جمشید پور میں ذکی انور زندگی کا شکار ہوتا ہے۔ تو کبھی میرٹھ اور محمود پور میں طالب اور اللہ رکھا بھاشاؤں پر بھینٹ چڑھا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ کیسے بتائے کہ عورت ہر مرد کے اندر ہے۔ اس کے بغیر آدمی آدھا رہتا ہے۔

القصہ، اس شہر کے اس محلے میں جہاں بہت سارے لوگ رہتے ہیں۔ وہاں مجنوں، پرکاش، نوشاد، نارنگ رشید احمد، ستیش بترا، انتظار اور سوکانت جیسے لوگ بھی رہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اب تک اس بات پر الجھے ہوئے ہیں کہ سیتا کس کی بیوی ہے۔ رام کی یا راون کی۔ زلیخا آج بھی کیوں سرِ بازار نیلام ہو رہی ہے۔ کیوں یوسف کو اب تک اندھے کنوئیں میں بند رکھا گیا ہے۔ اور مریم کے بطن سے کس طرح یسوع مسیح پیدا ہوئے، جبکہ مریم کے ساتھ کسی کا بھی ازار بند کا رشتہ نہ تھا۔ اپنی باتوں پر وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ نہ اب مسجد میں مقتدی جاتے ہیں۔ اور نہ مندر میں پوجاری۔ جبکہ مسجد کے اندر ایک گ۔ نے میں لوٹے کے

اندر وضو کا پانی جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ اور دیوی دیوتا پر چڑھانے کے لئے گنگا جل اب بھی تازہ ہے۔ اب بھی شاکر اور کرشن ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ جبکہ دونوں ہی اسی محلہ میں رہتے ہیں۔ اور آدمی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

القصہ! جب شاکر اور کرشن ایک دوسرے کی قمیضوں کو پھاڑ کر اور چلا چلا کر اپنے ارد گرد سارے محلے کو اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہ اچانک گنبد کے اندر گڑگڑاہٹ سی ہوئی۔ اور کلس سے شعاعیں پھوٹیں۔ پھر فضا میں ایک کرخت آواز ابھری۔

شہر کے مشرقی دروازے کو مقفل کر دو۔ تا کہ کوئی اجنبی گھس نہ آئے، اور ہمارے جشن میں خلل نہ ہو۔

دوسرے ہی لمحہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔ اور سارے لوگ شہر کے مشرق کی اور دوڑ پڑے اور دروازے پر قفل ڈال دیا۔

پھر کرشن اور شاکر ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑنے اور بال نوچنے میں لگ گئے۔

اچانک ہجوم کے اندر سے ایک ہاتھ ابھرا۔ اس میں ایک تارہ تھا۔ کرشن اور شاکر ہکا بکا رہ گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ انہوں نے خود ہی دروازے پر تالا ڈالا تھا۔ اگر پروہت اور امام کو معلوم ہو گیا تو .... کیا ہو گا؟ انہوں نے سوچا!

کرشن آگے بڑھا اس نے اجنبی سے پوچھا۔ کون ہو تم؟

آدمی! اجنبی نے ایک تارہ پر اپنی انگلی کو جنبش دی۔ مگر ایک تارہ کی جھنکار شاکر کے قہقہے میں ڈوب گئی شاکر نے نہایت تمسخرانہ انداز میں کہا۔ آ ــ د ــ م ــ ی، ــ تم!

اجنبی نے دوبارہ ایک تارہ پر اپنی انگلی کو جنبش دی۔ شاکر آواز کے کرب کو سن کر سکتے میں آ گیا۔

پھر شاکر نے سوال کیا۔ کس دیش کے ہو؟

میرا کوئی دیش نہیں۔ یہ سب دیش میرا ہے۔ مجھے منش سے پیار ہے۔ اجنبی نے جواب دیا۔ اور ایک تارہ پر انگلیاں نچاتا ہوا آگے کی طرف بڑھ گیا۔ شاکر اور کرشن حیران اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اب وہ اپنے جھگڑے کو بھول چکے تھے۔ انہیں یاد تک نہیں رہا کہ وہ گنبد کے امام اور مندر کے پروہت کو اس کی اطلاع کرتے۔

ایک تارہ کی جھنکار سن کر سارا محلہ جاگ پڑا تھا۔ سب اپنے اپنے گھروں کی چوکھٹوں پر کھڑے تھے۔ اور ایک تارہ پر رقص کرتی ہوئی انگلیوں کو دیکھ رہے تھے۔ مگر ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اپنے اپنے گھر کی چوکھٹوں کو چھوڑ کر سڑک پر نکل آتے۔

محلے والوں کی یہ حرکت اجنبی کو عجیب سی لگی۔ اس نے ایک تارہ بجاتے ہوئے سوچا انہیں کس کا خوف ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اس کے خیال کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ جب ایک بچے نے اس کی انگلی پکڑ لی۔ اور اپنی توتلی زبان میں کہا۔ "تمہارے گیت سے ہماری نیند میں خلل پڑتا ہے" جاؤ، کتوں اور گدھوں کے سامنے ایک تارہ بجاؤ۔

اجنبی بچے کی اس بات پر مسکرا پڑا۔ کیونکہ وہ بچے کی باتوں کی تہہ میں نہیں پہونچ سکا تھا۔ اس نے اپنی انگلی چھڑائی، اور جوں ہی ایک تارہ کے تار کو جھنجوڑا۔ بچہ رونے لگا۔

اجنبی بچے کو روتا چھوڑ کر مندر اور مسجد کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیا۔

بچہ رو رہا تھا اور محلے کے سارے لوگ اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر بچہ تھا کہ روتے چلا جا رہا تھا۔

پھر کچھ لوگوں نے اسے ڈرایا دھمکایا۔ مندر اور گنبد کے بھوتوں کی قسمیں دیں۔ مگر بچے کی آنکھوں سے موسلا دھار رواں تھا۔ جتنا بھی اسے چپ کرانے کی کوشش کی جاتی۔ اتنا ہی وہ چیختا۔ دھاڑیں مارتا۔ اس کی آنکھوں سے گرنے والی موٹی موٹی بوندوں کی دھاریں دھرتی کو جل تھل کر رہی تھیں۔

رونے کی آواز سن کر مندر کی کلس اور مسجد کے گنبد کے جن اور بھوت نے اپنا رقص بند کر دیا۔ اور امام اور پروہت سے پوچھا کہ یہ آواز کیسی ہے۔ پروہت اور امام نے ایک ساتھ جواب دیا۔!

"یہ آواز خطرناک ہے"

تو پھر اسے بند کیوں نہیں کر دیتے۔؟ ایک بھوت نے کہا!

ممکن نہیں! امام نے جواب دیا۔

کیوں؟ ایک جن نے پوچھا

الٹی آیت الکرسی کا اثر زائل ہو رہا ہے۔ اور دیکھا کہ مسجد کے گنبد سے نیلے رنگ کا جھاگ نکل رہا ہے۔ اور کلس لرز رہا ہے۔ پروہت زمین پر لیٹ گیا۔ اور منتر ورد کرنے لگا۔ اور مسجد کا امام بھی الٹی آیت الکرسی پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

مگر بچہ رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وضو کا پانی اور گنگا جل بہہ رہا تھا۔ اور مسجد کی چہار دیواری اور مندر کے اندر بے سدھ پڑے ہوئے دیوی دیوتا کے چرنوں کو چھو رہا تھا تب لوگوں نے محسوس کیا کہ آنسو کا پانی اس کے گھٹنے تک آ پہونچے ہیں۔ وہ لوگ گھبرا گئے۔ پانی سے نکلنے کے لئے اچھلنے کودنے لگے۔ ان کی اچھل کود کو دیکھ کر بچے نے رونا بند کر دیا کیونکہ بچے کو کھلونا چاہیے تھا۔ اور پانی میں اچھلتے کودتے لوگ تو کھلونا ہی تھے۔ اب بچہ ہنس رہا ہے۔ کھلکھلا رہا تھا۔ قہقہہ لگا رہا تھا۔ اور اجنبی ہاتھ میں ایک تارہ لئے ہوئے انگلی کو جنبش دیتا ہوا مسجد کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

پھر اچھلتے کودتے لوگ اجنبی کی طرف دوڑے اور اسے

پکارا۔ اور مسجد کے اندر جانے سے باز رکھنا چاہا۔

اندر مت جاؤ، اندر مت جاؤ، لوٹ آؤ، اندر جن ہے، بھوت ہے، احمق نہ بنو۔ اندر مت جاؤ۔

لیکن اجنبی ایک تارہ بجانے میں مگن مسجد کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اور جیسے ہی وہ مسجد کے دروازے پر پہونچا۔ مندر کا کلس جاگا۔ اور قبل اس کے کہ کلس سے ابھرتی ہوئی شعاعیں اجنبی کے ہاتھ میں پڑے ہوئے ایک تارہ کو جلا کر راکھ کر دیتی۔ اجنبی نے ایک تارہ مسجد کے دروازے پر پڑے ہوئے تالا پر دے مارا۔ تالا ٹوٹ گیا۔ مسجد اور مندر کے جن اور بھوت آکاش کی طرف بھاگے مگر کبوتروں نے انہیں اپنی چونچوں سے دھر لیا۔ ان کے پر اب آزاد تھے۔

پھر اجنبی نے بچے کی آنکھوں سے وضو کا پانی لیا۔ اور گنبد پر چھڑک دیا۔

مسجد کی چہار دیواری منہدم ہو گئی۔ قبروں سے سارے مردے نکل آئے۔ اور امام کو تلاش کرنے لگے لیکن امام غائب ہو چکا تھا۔ پھر پروہت کو ڈھونڈنے لگے۔ اس کا بھی پتہ نہیں چلا۔ کہتے ہیں کہ ان دونوں کو سیلاب کا پانی بہا لے گیا۔

راوی نے کہا۔ یہی وہ کہانی ہے۔ جو میں ہر آنے والی نسلوں کو سناتا رہوں گا۔ تاکہ کوئی بچہ روئے اور دھرتی کا سارا دکھ اپنے آنسوؤں سے دھو دے۔

رات چھٹ گئی اور آسمان پر سرخی دکھائی دینے لگی ●

نوید ہاشمی

نجات

کبھی کبھی مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور جب میں اس کیفیت میں ڈوب جاتا ہوں۔ تو میرے لاشعور پر ایک قبر جیسی شئے ابھرتی ہے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مجھے آواز دے رہا ہے۔ اپنے قریب بلا رہا ہے۔

میں آواز کی انفرادیت پر غور کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ وہ آواز میری ہے۔ اور میرے اندر سے نکل کر کسی ویرانے میں پناہ گزیں ہے۔ اور وہ قبر میری لاش کی منتظر ہے۔ مجھے اپنے اندر ایک ہلکی سی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اپنے کاندھے پر برسوں سے رکھی ہوئی لاش کو اس قبر کے حوالے کر دوں۔ اور اپنی کھوئی ہوئی آواز اپنے اندر سمیٹ لوں۔ اور پھر مطمئن ہو جاؤں۔ یہی سوچ کر میں سمت کا تعین کر کے اپنے قدموں کو بڑھاتا ہوں۔

سڑک کی دونوں جانب گھنے درختوں کا سلسلہ ہے۔ درخت بالکل خاموش ہیں اور اپنے آپ میں گم صم ہر طرف ہو کا عالم ہے۔ اور گہرا سناٹا، میرے اندر کا سناٹا مجھے ویرانے کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اور میں سب کچھ تیاگ کر اس سمت چلنے پر مجبور ہوں۔ یہ مجبوری کیوں ہے؟ کون جانتا ہے؟

کون جانتا ہے کہ قابیل نے ہابیل کو کیوں ہلاک کیا تھا۔؟

کوئی کچھ نہیں جانتا۔ یا پھر جان کر انجان ہے ——

میں زندگی کی اس سرحد پر آ پہونچا ہوں۔ جہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ نہ بیوی کی مسکراہٹ۔ نہ دوستوں کی محفل۔ اور نہ فیکٹری کے ہنگامے۔

کچھ دور چل کر میں ایک جگہ رُک جاتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گھنے درختوں کے درمیان کوئی سایہ رینگ رہا ہے۔ میں اس سائے کو غور سے دیکھتا ہوں۔ تو لگتا ہے کہ وہ کوئی عورت ہے۔ اس ویرانے میں عورت کا!! گمان مجھے حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن فوراً مجھے فیکٹری کے آفس میں فائلوں کے درمیان گھورتی ہوئی دو مشکوک نگاہوں کا احساس ہوتا ہے۔ اور پھر وہی نگاہیں مجھے دوستوں کی محفل میں نظر آتی ہیں۔

چلی جاؤ چلی جاؤ یہاں سے کہ تم نے میرا جینا ....

میں جھنجھلا جاتا ہوں۔ لیکن میری آواز میرا ساتھ نہیں دیتی۔ اور اس لمحے مجھے یاد آتا ہے کہ میری آواز تو شادی کی پہلی رات میرے اندر سے نکل کر فرار ہو چکی تھی۔ اور میرے اندر سناٹا بھر گیا تھا۔

میں کولتار کی چکنی سڑک پار کر کے کچے راستے پر چلنے لگا۔ راستے کی دونوں جانب سپاٹ میدانوں کا سلسلہ ہے کہیں کہیں خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔ جو اپنی بے بسی کی کہانیاں سنا رہی ہیں۔ لیکن ان کی کہانیاں سننے والا یہاں کوئی

بھی نہیں ۔ ایک لمحے کو جی چاہا کہ ان جھاڑیوں کے پاس رک جاؤں ۔ اور ان کی کہانیاں سنوں ۔ لیکن یہ سوچ کر میری کہانی کیا کم ہے ۔ جو میں ان خاردار جھاڑیوں کی کہانیاں سنوں ۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں ۔

کچھ راستے پر چلتے چلتے میں نے دور تک اپنی نگاہیں دوڑائیں کہ کہیں بھی وہ قبر نظر آجائے ۔ اور میں اپنی لاش اس کے حوالے کر کے اطمینان کی سانسیں لوں ۔ لیکن دور دور تک نہ وہ قبر نظر آئی ۔ اور نہ ہی اس آواز کا انکشاف ہو سکا جو مجھے اپنے قریب بلا رہی تھی ۔

میں عجیب تذبذب میں تھا کہ اب میں کیا کروں کیا نہ کروں ۔ کہ اچانک میری نگاہ کچھ دور ٹمٹماتی ہوئی ایک ہلکی سی روشنی سے جا ٹکرائی ۔ اور پھر مجھے ایسا لگا کہ اس روشنی کے اردگرد کئی سائے جھوم رہے ہیں ۔ اور ان سایوں کے درمیان ایک تابوت جیسی شئے پڑی ہوئی ہے ۔ میں سمجھ گیا کہ وہ تابوت جیسی شئے کسی بزرگ کا مزار ہے ۔ اور عام طور پر مزار کے آس پاس قبروں کا سلسلہ ہوتا ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ میری قبر بھی وہیں کہیں ہو ۔

اور میری آواز ۔ ؟

اور مزار کے اردگرد بیٹھے ہوئے وہ لوگ ؟

میرا ذہن سوالوں کی میزان پر ڈولنے لگا ۔ کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ میری طرح بہت سے لوگ ہیں جو اپنی طبیعت سے نہیں جی پاتے ۔ یا حالات جنھیں چین سے جینے نہیں دیتے اکثر ایسے لوگ مزاروں صحراؤں اور جنگلوں کا سہارا لیتے ہیں ۔

میں تیز تیز چل کر مزار تک پہونچا ۔ مزار کے آس پاس کئی لوگ بیٹھے جھوم رہے ہیں ۔ ان پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہے ۔ پوری فضا اگربتی اور لوبان کی خوشبوؤں سے معطر ہے اور مزار کے سرہانے ایک چراغ ٹمٹما رہا ہے ۔

میں ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہوں ۔ اور چاروں طرف نگاہیں دوڑاتا ہوں ۔ تو لگتا ہے کہ اس مزار کے علاوہ کہیں کچھ نہیں ہے ۔ اور اگر کچھ ہے تو صرف سناٹا ہے ۔

اب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی آواز اور اپنی قبر کے بارے میں کس سے پوچھوں کہ یہاں بیٹھے ہوئے سبھی لوگ اپنے آپ میں گم ہیں ۔ ان کی یہ بے فکری اور روحانی آسودگی دیکھ کر جی چاہا کہ میں بھی اس کیفیت میں ڈوب جاؤں ۔ میں جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا ۔ اور ان کی طرح میں بھی جھومنے لگا لیکن بہت دیر تک جھومنے کے بعد بھی مجھ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی ۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے ذہن کی تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں ۔ اور کئی چہرے باری باری ان کھڑکیوں سے جھانک رہے ہیں ۔ میں جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا ۔ تعاقب کا یہ سلسلہ برسوں پرانا ہے ۔ جب میں نے گھر کی چہار دیواری سے گھبرا کر اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دفتر میں گزارنا چاہا تو بھی چہرے فائلوں کے درمیان نظر آئے ۔ اور جب دفتر سے نکل کر دوستوں کی محفل میں آیا تو وہاں بھی ان چہروں کو موجود پایا ۔ اور اب جب سب کچھ تیاگ کر خود کو فراموش کرانے کی خواہش میں ویرانے تک پہونچا تو وہی چہرے ....

آخر تم لوگ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے ۔ میں شدت کرب سے بلبلا اٹھا ۔ !

میری آواز کہاں ہے ؟ میں دیوانہ وار چیخا چلایا ۔ !

میری قبر کیوں نہیں ملتی ۔ ؟ میں اپنے سر کے بال نوچنے لگتا ہوں !

اور تب اسی لمحے مزار کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ اپنے آپ سے باہر نکلے ۔

تم کون ہو بھائی اور اس ویرانے میں کیوں آئے ہو ؟

اپنی آواز کی تلاش اور اپنی قبر کی جستجو میں ۔

گویا کہ تم بھی ہم میں سے ہو ۔ ؟ ایک شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھے گلے سے لگا لیا ۔ اور پھر باری باری سبھی لوگ اس عمل سے گزرے ۔ اور پھر پہلا شخص مجھ سے مخاطب ہوا ۔

بقیہ صفحہ ۴۸ پہ

بنگلہ :۔ شمس الرحمٰن

اردو :۔ احمد سعدی

وہ ایک مٹی کا گھر

شہر کی بے نام ، بے رونق گلی کے درمیاں
ایک مٹی کا مکاں تھا ، میں جہاں پیدا ہوا
کتنی مدت ہوگئی ہے پھر بھی اب تک جب کبھی
غیر ارادی طور پر میرا یہ ہات
ناک تک پہونچا تو سانسوں میں عجب سی سوندھی خوشبو بھر گئی
میں نے پہلی بار آنکھیں کھول کر جس گھر کو دیکھا تھا وہاں
دھوپ میں امرود کا اک پیڑ رہتا تھا سدا سایہ کناں
اب بھی وہ سایہ مری آنکھوں میں ہے چھایا ہوا
سبز پتوں سے ڈھکے امرود کے اس پیڑ کی ،
میری رگ رگ میں محبت آج بھی ہے جاگزیں
اس کی شاخوں پر ہر اک موسم میں رہتا تھا پرندوں کا ہجوم
چہچہاتی ، ناچتی ، گاتی ہوئی چڑیوں کا شور
اب بھی مجھکو یاد ہے
میری پیدائش ہوئی جس گھر میں وہ نغموں کا گھر ہرگز نہ تھا
گھر کے اس راحت فزا ماحول میں
کوئی سارنگی بجی نہ ہی ستار ، اسراج یا کوئی سرود
نہ کبھی گونجی کسی طبلے کی تھاپ
نہ کبھی جاگی کوئی میٹھی سی تان
نہ کبھی لہرا کوئی شعلہ کسی آواز کا

پھر بھی بچپن ہی میں اس بے نام بے رونق گلی کے درمیاں
جانے کب اک راہ رو چپکے سے آدھی رات کو
ساحل دریا کی اک تصویر میرے دل کے گوشے میں جگا کر
پیچ و خم میں راہ کے گم ہوگیا تھا
اب بھی مجھکو یاد ہے .
شب کی تنہائی میں اب تک جب کبھی
جاگتا رہتا ہوں یا ہوتا ہوں افسردہ ملول
پاؤں میں سپنوں کی پائل باندھ کر
رات گا گا کر سناتی ہے مجھے درباری راگ
بار بار آنکھوں میں میری جھانکتی ہیں ان گنت پرچھائیاں
میری یادوں میں چھپا اک آدمی
ناچتا رہتا ہے کٹھ پتلی کا ناچ
میں اسے پہچانتا ہوں ۔
اپنے بچپن میں ترشواتا تھا اس سے سر کے بال
اس کا اک سیلون تھا
سستے پوڈر ، پھٹکری ، صابن کی خوشبو میں بسی رہتی تھی ۔
اس کی وہ دکاں
اس کے سر پر ہوتی تھی پگڑی بندھی
دو بھجالی کی طرح استادہ رہتی اس کی مونچھ
اس کی جو شلوار تھی اس میں شکن اندر شکن
دور انجانے کسی اک ملک کے پربت کے تصویروں کی گہری
چھاپ تھی
میرا گھر ترشے ہوئے بالوں کا اب اک ڈھیر ہے
ایک دوشیزہ اسی ڈھیری سے برآمد ہوئی ،
اس کی آنکھیں جیسے شاداب و شگفتہ دو گلاب
اس کی گردن جیسے میرا کا بھجن
ہونٹ اس کے چاند کا عکس جمیل

مٹی کے گھر میں وہ داخل ہو گئی اور میرے شوق کو بھڑکا گئی
گاہ میں کیا دیکھتا ہوں
اپنی یادوں کے جزیرے میں کھڑا ہوں
میری امیدوں کی کلیاں
بجلی کے تاروں میں ہوا الجھی ہوئی جیسے پتنگ
ماند پڑتا جا رہا ہو لمحہ لمحہ جس کا رنگ
دیکھتا ہوں چاند کی جانب کبھی
چودھویں کے چاند جیسی خوبصورت منبر کے دونوں طرف
دو جواں ملاح بیٹھے تاش ہاتھوں میں لئے
وہ رمی کے کھیل میں مصروف تھے۔
ایک کا تھا ہونٹ پتھر کی طرح لٹکا ہوا۔
دوسرے کے ہونٹ سے چپکی ہوئی۔
ایگل کی آنکھوں کی طرح اک پائپ تھی
مشک عنبر سے معطر عطر دانی
لانبی نلکی حقے کی نے

پالتو طوطے کا پنجرہ
طاق پر "غم کا سمندر" اک کتاب
ایک آنکھ
میرے نانا کی گرجتی گونجتی آواز
نانی کی ابھرتی ٹھنڈی سانسوں کا شریک
اب وہ گھر میرے بطن میں گم شدہ
جب کبھی یاد آتی ہے اس مٹی کے گھر کی مجھے
وہ کہیں بھی اب نظر آتا نہیں۔

(نئے ایک مائر گھور)

حفیظ آتش

سایہ

جوان تم بھی
جوان ہم بھی
جوان وہ بھی
جو مخملیں
فرش پر
کھنکتی کٹوریوں سے
سلگتی سانسوں کے
ٹھنڈے رشتوں کو جوڑتا ہے
مگر وہ بوڑھا
جو ہم سے پہلے
جواں ہوا تھا
ہم اس کی کمزور
ہڈیوں میں
ہر اک لمحہ
سکڑ رہے ہیں۔

حمید الماس

دس مختصر نظمیں

۱

دوڑتی کاروں سے چھٹ کر
ہانپتی ہیں
ان گنت تنہائیاں

۲

ریگ ساحل پہ
گرسنہ بچے
کھینچتے ہیں پھلوں کی تصویریں

۳

پانچ بوڑھے
سکیدہ کی چھاؤں میں
قوم کے کردار کی تشکیل میں
مصروف ہیں

۴

میں نے کل تک
پتھروں سے جو تراشے تھے صنم
آج وہ محو دعا ہیں کہ
انہیں سانس کی دولت ملے

۵

کل کی کھرچن ہی
بھکاری کے لئے
رزاق امروز ہے

۶

کشتیوں میں گھومنے والوں کو
پانی میں نظر آتے ہیں
اپنی اپنی قبروں کے نشاں

۷

دن میں چپ رہتی ہے لیکن
رات بھر
ٹوکتی ہے مجھکو میری آگہی

۸

خواب
یعنی
کوہساروں پہ ہو جیسے
جھلملاتی روشنی

۹

کھو گئی جو روشنی
فکر آزردہ ہوئی
گم نہ ہو جائیں
اس کے سارے حرف بھی

۱۰

آخری موسم نے آتے ہی کہا
جلد اس کا مرثیہ لکھ کر
سناؤں میں اسے

تماشا

چندر بھان خیال

میں اس کی قبر پر ہر شام جا کر لوٹ آتا ہوں۔
یقیناً میں بھی اپنی قبر کا نقشا بناتا ہوں
ہوا چپ چاپ بہنا چاہتی ہے میرے پہلو میں
مگر آنگن کا سناٹا اسے بہنے نہیں دیتا
میں کہنا چاہتا ہوں کچھ مگر کہنے نہیں دیتا
یہ سناٹا مجھے بھی چین سے رہنے نہیں دیتا
کہاں سے لاؤں خود کو شکل دینے کی ہنرمندی
کہ سیکھا تھا جو اپنوں سے وہ سب مقتل میں کام آیا
بس اک دیوار ہے اور ہی دیوار کی چھایا
جسے میں نے سلگتی دھوپ میں بھی تلخ تر پایا
مرے دل کو پھر ٹھکراتی ہے جہاں خواہش کی چنگاری
قریب مرگ خوشبو کے تڑپتے جسم پہ اکثر
اکٹھا کر رہا ہوں میں ابھی سے بے صدا پتھر
جو رکھے جائیں گے میری جگہ تابوت کے اندر
مری خواہش پرستی کا تماشا دیکھنے والا
نہ مجھکو دیکھ پائے گا نہ خود کو جان پائے گا

فضا ابن فیضی

غزل

لہو لہو ہوئے کتنے وجود پھول ایسے
اُگے ہیں اب کے مرے باغ میں ببول ایسے

یہ کس تضاد کے پیکر ہیں صاحبانِ نظر
خیال ہو جیسے گل، چہرے دھول دھول ایسے

خود اپنے زخموں پہ ہنسنے کا حوصلہ رکھو
کہ آدمی کبھی رہتا نہیں ملول ایسے

صلیب جس کی ابوجہل خود اٹھائے پھرے
ہمیں ملے اتنے رسولوں میں اک رسول ایسے

ہم اس سلیقے سے سچ بھی نہ بول پائیں گے
یہ جھوٹ بولنے والے ہیں با اصول ایسے

سمجھ نہ ہوتی تو قصہ ہی ختم تھا لوگو!
ذرا سی بات نے کھینچا ہے کتنا طول ایسے

قدم قدم پہ یہ دنیا تجھی کو ٹوکے گی!
مجھے بھلا دے، مگر خود کو تو نہ بھول ایسے

خود اپنے آپ کو لازم ہے پہلے رد کرنا
کسی کو ملتی نہیں دولتِ قبول ایسے

تو اپنے آپ میں اک روز ڈوب جا پیارے
شعورِ ذات کا ممکن نہیں حصول ایسے

افق کے سبزے پہ جیسے سحر کی اوس گرے
ہوا ہے ذہن پہ افکار کا نزول ایسے

لہو سے باطنِ اظہار کو لبالب رکھ
تری نوا ہے فضاؔ محبت فضول ایسے

غزلیں

مظفر حنفی

ہے تیرگی کا راج ہمارے مکان پر
تارے چمک رہے ہیں تو دور آسمان پر
یاروں کو رشک ہے مری ترچھی اڑان پر
کانٹا بنے ہوئے ہیں مرے دھان پان پر
سینے پہ لارکاں کے چلائے کوئی مجھے
کب سے کھنچا ہوا ہوں بدن کی کمان پر
بندوق چیخ مار کے بے ہوش ہو گئی
جب شیر نے چھلانگ لگائی مچان پر
میں ہاتھ کی لکیر پہ ہی فاتحہ پڑھوں
الزام کیا لگاؤں کسی مہربان پر
اب دیکھنا ہے کون کسے آزمائے گا
میں بھی ایک امتحان ہوں تیرے امتحان پر
نرغے میں مجھکو میرے ہی اپنوں نے لے لیا
مارا گیا خود اپنے لہو کے نشان پر
صفحے کا نرم موم زبر کاٹنے لگا
گرمی بہت ہے لیٹ رہو سرد لان پر
کٹتی نہیں بدولت مظفر غزل کہو!
تیشہ اٹھاؤ وقت کی کالی چٹان پر

منصور سبزواری

چھپے تھے جس کی پناہ میں تم پگھل گئی وہ چٹان دیکھو
چلی ہے بہہ کے سمندروں کی طرف کو لے کر ڈھلان دیکھو

وہ بوڑھا مانجھی ہے بستر مرگ پر بھی اک ٹکٹکی لگائے
بھنور میں ملاح چیختے ہیں، نشان دیکھو نشان دیکھو

گئے تعلق کی شاخ شاداب سی وہ غم جسکو ہم سمجھتے تھے
ہوئی لو اس میں بھی سنسناہٹ وہ نکلی پتوں کی جان دیکھو

گلی میں اک بچہ چل رہا ہے، جھلکتے بچپن کی انگلی پکڑے
پلٹ کر مت دیکھو ہو گا اس پر بھی تم اپنا گمان دیکھو

غزلیں

ڈاکٹر نریش

کیوں پریشان ہو تا سحر ہی تو ہے
ہجر کی شب سہی مختصر ہی تو ہے

سوچتا ہوں تو دیوار و در اجنبی
دیکھتا ہوں تو یہ میرا گھر ہی تو ہے

اس پہ لغزش کی تہمت دھروں کس لئے
راہ بر بھی مرا ہم سفر ہی تو ہے

اجنبی راستے، بے نشاں منزلیں
چل رہا ہوں یہ عزمِ سفر ہی تو ہے

کیوں نریشؔ اس کو نسبت ندامت سے دیں
جھک گئی ہو گی آخر نظر ہی تو ہے

جمیل عظیم آبادی (پاکستان)

گل کھلا جاتی ہے اکثر موج میں پاگل ہوا
کھینچ لیتی ہے سروں سے بے محل آنچل ہوا

چھیڑ جاتی ہے رگِ جاں کو عجب انداز سے
جب بھی چلتی ہے، مچلتی، کھیلتی چنچل ہوا

غم کے ماروں کو سلا جاتی ہے اکثر رات کو
جب گزرتی ہے تر و تازہ سبک کومل ہوا

پیکرِ رحمت کی صورت کشتِ ویراں میں کبھی
لے کے آ جاتی ہے اپنے دوش پر بادل ہوا

غیظ میں آ کر ہوا شعلوں کو دیتی ہے کبھی
برق بن کر پھونک دیتی ہے کبھی جنگل ہوا

کیا گھٹن ہوتی ہے اس دم زندگی کی راہ پہ
سست رفتاری سے چلتی ہے اگر بوجھل ہوا

صورتِ صرصر اگر صحرا میں در آئی جمیلؔ
قافلے کے حق میں بن جاتی ہے پھر دلدل ہوا

غزلیں

جناب بیتابؔ پیلی بھیتی

پتھر کے دیوتا کی طرح بے زباں ہیں لوگ
کھولیں زباں تو شعلۂ آتش فشاں ہیں لوگ

ساون کی دھوپ سایۂ ابرِ رواں ہیں لوگ
اب اعتبار کرنے کے قابل کہاں ہیں لوگ

پہلے سے اس زمانے میں ملتے کہاں ہیں لوگ
اب تو فقط خلوص کی اک داستاں ہیں لوگ

کہنے کی کچھ کسی سے ضرورت نہیں کہ اب
اپنے غموں کے آپ ہی خود ترجماں ہیں لوگ

باتوں میں آ نہ جائیو، معصوم ہو ابھی
اس فن میں باکمال ہیں جادو بیاں ہیں لوگ

تنہائی میں کہنا مناسب ہے حالِ دل
کچھ دیر چپ رہو کہ ابھی درمیاں ہیں لوگ

مڑ کے کسی کی سمت کوئی دیکھتا نہیں
منزل ہے اپنی اپنی رواں اور دواں ہیں لوگ

میں نے کچھ کسی کا بگاڑا نہیں کبھی
پھر بات کیا ہے مجھ سے جو یوں بدگماں ہیں لوگ

دنیا تو روز ملتے ہیں بیتابؔ سب ہی لوگ
جو اب خلوص دل سے ملیں وہ کہاں ہیں لوگ

مس محمودہ نغمیؔ بی اے

وہ اپنے وقت کا سقراط نہ سکندر تھا
عجیب شخص تھا گہہ موم گہہ وہ پتھر تھا

تمام عمر ترستا رہا جو قطرہ کو
وہ اپنی ذات میں پھیلا ہوا سمندر تھا

نہ مل سکی اسے کوئی کرن بھی مانگے سے
اندھیری رات میں جو روشنی کا پیکر تھا

حصارِ جسم سے نکلا تو پھر نہ ہاتھ آیا
وہ ایک زخمی پرندہ جو اپنے اندر تھا

ملے جو ان سے تو اک حرف بھی نہ یاد رہا
سبق خلوص کا جو راستے میں ازبر تھا

کوئی تو شیشۂ دل اس کا دیکھتا نغمیؔ
وجود جس کا جہاں کی نظر میں پتھر تھا

تبصرے

"اقبال اور مغربی مفکرین"

مصنف	پروفیسر جگن ناتھ آزاد
ناشر	مکتبہ عالیہ انارکلی لاہور
قیمت	بیس ر وپیے

کتاب کے پہلے فلیپ پر جگن ناتھ آزاد کا تعارف ہے پہلا پیراگراف آزاد کی سوانح سے متعلق ہے۔ دوسرے پیراگراف میں لکھا ہے:

"پروفیسر آزاد اردو کے معروف شاعر و ادیب ہیں مگر اس سے بھی زیادہ اہم بات علامہ اقبال سے ان کی غیر معمولی شیفتگی و عقیدت مندی ہے"

خود جگن ناتھ لکھتے ہیں:

"اصل میں جہاں تک کلام اقبال پر قلم اٹھانے کا تعلق ہے۔ اس کی دل کشی، تازگی، رعنائی اور شگفتگی ہمیشہ میری راہ میں حائل رہی ہے لیکن میں یہ کہہ کے اس مقالے کی خامیوں کے لئے وجہ جواز پیدا کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں"

پوری کتاب یعنی مقالے کو توجہ سے پڑھنے کے بعد جگن ناتھ آزاد کی اس رائے سے میں متفق ہوں کہ اقبال پر لکھتے ہوئے ان کے اور تنقید کے درمیان کچھ ضرور حائل ہے اس لئے تنقید کی بجائے اظہار عقیدت مندی ہو جانا قدرتی امر ہے۔ اب یہ اقبال کے کلام کی دلکشی ہو۔ تازگی ہو، رعنائی ہو یا غیر معمولی شیفتگی اور عقیدت مندی۔

اس کے نتیجے میں تنقید جگن ناتھ آزاد کا منہ تاکتی رہ جاتی ہے اور اپنے ساتھ انصاف نہ ہو سکنے کی مایوسی اس کے چہرے پر چھا جاتی ہے۔ نقاد کے لئے شاید ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے تمام تعصبات کو پرے رکھ دے، مگر یہ سو فیصدی کی حد تک ناممکن ہے۔ پھر بھی جہاں تک ممکن ہو تنقید کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یہی چیز صحیح تنقید اور جگن ناتھ آزاد کے درمیان پوری کتاب میں حائل نظر آتی ہے۔

"آزاد کا یہ بھی خیال ہے کہ ان کی اس کتاب سے پہلے:

اقبال کے فکر پر اس وقت تک جو کچھ بھی کام ہوا ہے۔ وہ اس قطعیت کے پس منظر میں ہوا ہے کہ اقبال صرف اسلامی تفکر سے متاثر ہوئے ہیں"

بات یہ ہے کہ خود یہ کتاب بھی اس قطعیت سے نہیں بچ سکی ہے اور اس لئے نہیں بچ سکی کہ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے یہاں چاہے فکر و رجحان مغربی مفکرین اور فلسفیوں کا آیا ہو مگر غالب فکر اسلامی ہی ہے انہوں نے تمام فلسفوں کو PURIFY کرنے کے لئے اسلامی فکر کا اضافہ کر دیا ہے۔ انہیں دھو کرایا ہے۔ اسلام دراصل کوئی

فلسفہ نہیں ہے۔ یہ کارزار حیات میں زندگی بسر کرنے کا طریقہ ہے عمل اور اجتہاد اسلامی تعلیمات کی روح ہے۔ اقبال نے جہاں جہاں عمل کا دخل پایا وہاں وہاں اس کی مدح سرائی کی۔ اور اسے قبول کیا۔ مارکس کی یہی بات انہیں بھائی۔ لیکن خودی ہو، جمہوریت ہو، تسلسل پسندی ہو، انقلاب ہو۔ ڈوائن کامیڈی ہو۔ ہر ایک کے ساتھ صالح اقدار کو اقبال نے اسلامیات کے زیر اثر سب سے ضروری قرار دیا ہے۔ دانتے کا سفر (بقول آزاد) تزکیۂ نفس کے لئے ہے۔ اور اقبال کا سفر تسخیر کائنات کے لئے جو تزکیۂ نفس کے بعد کی منزل ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"ایک نمایاں فرق جو ڈوائن کامیڈی اور جاوید نامہ کے مباحث میں نظر آتا ہے یہ ہے کہ ڈوائن کامیڈی کے مباحث کا تعلق زیادہ تر حیات بعد الموت سے ہے۔ اور جاوید نامہ کے مباحث انسان کی حیات سے متعلق ہیں ممکن ہے کہ اس کے سبب کا سراغ ہمیں دانتے اور اقبال کے مذہبی عقائد میں ملے (صفحہ ۱۴۲)"

میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ اقبال مذہب سے الگ ہو کر نہ دیکھ سکتے تھے نہ سن سکتے تھے نہ سوچ سکتے تھے۔ اسی لئے اقبال صرف اسلامی تفکر سے متاثر ہوئے ہیں۔ خود آزاد کو بھی یہی کرنا پڑا۔ اور جاوید نامہ کی مباحث کی جڑ کی تلاش میں وہ اقبال کے مذہبی عقائد تک پہونچ گئے۔

آزاد نے (صفحہ ۱۵۵) اعتراف کیا ہے کہ ڈوائن کامیڈی کا کینواس جاوید نامہ کے کینواس سے کہیں زیادہ وسیع ہے مگر حاشئے میں جو نوٹ دیا ہے۔ وہ دلچسپ ہے یہ بتلانے کے لئے کہ ڈوائن کامیڈی کا کینواس کیوں بڑا ہے۔ اور جاوید نامہ کا کیوں چھوٹا ہے۔ انہوں نے محض عقیدت مندی کے زیر اثر یہ جواز گڑھا ہے کہ:

دانتے ... نے ڈوائن کامیڈی ۱۸ برس میں مکمل کی۔ جاوید نامہ اقبال کے تین برس کی کاوش کا نتیجہ ہے"۔

ادبی تخلیقات کی بلندی، گہرائی اور وسعت کو ناپنے کا فیتہ ماہ وسال نہیں ہو سکتے۔ مگر آزاد کیا کریں۔؟ اقبال سے ان کی غیر معمولی شیفتگی اور عقیدت مندی انہیں نہیں چھوڑتی۔

آزاد نے اس تاثر یا خیال کو دور کرنے کی کوشش کی ہے (صفحہ ۱۲۶ یا ۱۲۸) کہ اقبال نے جاوید نامہ کے تانے بانے کا تصور دانتے کے ڈوائن کامیڈی سے مستعار لیا ہے۔ اور خود اقبال کا حوالہ دیا ہے۔ اقبال نے خواجہ الف ایم شجاع کے نام ۱۹۳۱ء کے شروع میں لکھا تھا:

"آخری نظم جاوید نامہ جس کے دو ہزار اشعار ہوں گے ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ممکن ہے مارچ تک ختم ہو جائے۔ یہ ایک قسم کی ڈوائن کامیڈی ہے۔ اور مثنوی مولانا روم کے طرز پر لکھی گئی ہے"۔

آزاد کہتے ہیں:

"جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہے اس میں جاوید نامہ اور ڈوائن کامیڈی کی مشابہت کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ملتا ہے۔ یہ خط اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کہ ڈوائن کامیڈی کو دیکھ کر اقبال کو جاوید نامہ لکھنے کا خیال آیا"۔

صرف اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت یا مفکرانہ بڑائی اتنی بڑی نہیں ہے۔ جتنی آزاد کو شاید نظر آتی ہے۔

ایک مبصر کے لئے یہ غالباً ممکن نہیں ہے کہ اتنے اہم موضوع پر تقریباً دو سو صفحات کی کتاب پر کوئی سیر حاصل بحث کر سکے۔ تاہم اس کتاب کا تعارف مندرجہ بالا سطور سے ہو جاتا ہے۔

آزاد نے جگہ بہ جگہ اقبال کو ایک وسیع المطالعہ شاعر کہا ہے۔ وسیع المطالعہ ہونے کے بعد تخلیق کی صلاحیت کو آزاد اور زرخیز رکھنا بڑا کٹھن کام ہے۔ آزاد نے پوری کتاب میں یہ نہیں بتایا یہ کٹھن کام اقبال سے ہو سکا کہ نہیں۔

پیش نظر کتاب آزاد کے وسیع المطالعہ ہونے کی دلیل ضرور ہے مگر اقبال پر لکھتے ہوئے ان کے اور صحیح تنقید کے درمیان جو چیز حائل ہو جاتی ہے۔ اسے وہ دور کر سکتے تو ان کی تنقید کا مرتبہ اونچا ہو جاتا۔

کلام حیدری

اردو کے مسائل

مصنف حکم چند نیر
ناشر خود مصنف
قیمت بارہ روپے

جناب ڈاکٹر حکم چند نیر صدر شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کی یہ کتاب اپنے نام کے ذریعہ پڑھنے والوں کو گمراہ کرتی ہے کیونکہ اس کتاب میں انہی کے قول کے مطابق ان کے چند تحقیقی مضامین ہیں۔ اور ان ہی کے قول کے مطابق:

"ان مضامین کا تعلق زیادہ تر اردو زبان کی سیاسی اور سماجی تاریخ سے ہے"

گویا یہ کتاب اردو مسائل پہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق اردو زبان کی صرف سیاسی اور سماجی تاریخ سے ہے۔ کتاب کا نام "اردو کے مسائل" ہے۔ اس عنوان کا کیا جواز ہو سکتا ہے جبکہ خود مصنف کے کھلے اعترافات یہ کہہ رہے ہیں کہ اس کتاب میں شامل شدہ مضامین کا تعلق کہیں سے اردو کے مسائل سے نہیں ہے۔

چھٹا یعنی آخری مضمون جسے شاید کھینچ تان کر کتاب کے نام کا جواز کہا جائے۔ وہ بھی اردو کے مسائل کا مجموعی طور پر احاطہ نہیں کرتا۔ وہ مضمون اردو کی تعلیم کے مسائل سے ہی متعلق ہے

سات مضامین پر مشتمل یہ کتاب حکم چند نیر صاحب کے نامکمل کام کی ذیلی پیداوار ہے کیونکہ وہ اپنی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میں پچھلے تین چار برسوں سے اردو زبان کی سیاسی اور سماجی تاریخ لکھ رہا ہوں"

زیر مطالعہ کتاب ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ پچھلے پانچ برس کے عرصہ میں (اگر اس میں تین چار برس ۱۹۷۷ء کے پہلے کا عرصہ جوڑ دیا جائے) یعنی ۹ برس کے عرصے میں وہ اردو زبان کی سیاسی اور سماجی تاریخ مکمل کر سکے، میں یا نہیں بہر حال یہ بات اس تبصرے سے خارج ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ پر سوالیہ نشان ضرور چھوڑ جاتی ہے کہ آخر ایسے مضامین جو قومی آواز وغیرہ اخباروں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی کتنے سال کی ہو سکتی ہے۔

پہلے مضمون کا عنوان ہے "عدالتوں اور دفتروں سے فارسی کا اخراج" یہ مضمون تحقیقی ہے جو انگریزوں کے فرمان حکم ناموں اور مراسلات پر مبنی ہے۔ اس مضمون کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے:

"زبان اور رسم خط کے اس قضیے نے ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے نفاق اور نفرت کا ایسا بیج
بو دیا جس نے ایک طرف ہماری قومی
سالمیت کو پاش پاش کر دیا اور دوسری
طرف اس کا کوئی موزوں اور مناسب حل
آج تک نہیں نکل سکا"

قومی سالمیت کے پاش پاش ہونے کے ذکر سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکم چند نیر کا اشارہ غالباً ہمارے ملک کی تقسیم ۱۹۴۷ء کی طرف ہے۔ تقسیم ملک کے سلسلہ میں اتنی سادہ لوحی کے ساتھ بظاہر معصوم نتیجہ نکال لینا اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم ملک کے سیاسی حالات، سیاسی تحریکات، اور سماجی عوا

سے غفلت کہی جائے گی۔

دوسرا مضمون "اردو زبان کا المیہ اردو کے لئے رومن رسم خط کی تحریک" کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون بھی کم و بیش اگلے مضمون کا ضمیمہ ہے۔ حکم چند نیر اسے اردو کے المیے سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہ ہندی اور اردو والوں نے مل کر رومن رسم خط کی مخالفت نہیں کی۔ پتہ نہیں اس سے موصوف کا مفہوم کیا ہے؟

اس کے بعد جو مضمون ہے اس کا عنوان ہے "۱۸۵۷ء تک برطانوی حکومت بہار کی لسانی پالیسی" اس میں پچھلے دونوں مضامین کے مواد کی تکرار ہے۔ جو شاید دور نہیں کی جا سکتی تھی۔ چونکہ ایسے مضامین میں پچھلے مضامین کی باتوں کی تکرار ناگزیر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس مضمون کے حاشیے میں خود حکم چند نیر کے پچھلے دونوں مضامین کے حوالے موجود ہیں اور جو دوسرے حوالے ہیں وہ بھی پچھلے دونوں مضامین اور اس مضمون میں مشترک ہیں۔

اردو کے پچھلے المیے کے بعد صفحہ ۱۳۱ سے جو مضمون شروع ہوتا ہے اس کا عنوان ہے "اردو کا عظیم ترین المیہ ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کا فیصلہ" اس فیصلے سے قبل ہی عدالتوں میں ناگری رسم خط میں بلا معاوضہ درخواستیں لکھنے کے لئے ہر ضلع کی عدالت میں ایک تنخواہ دار ناگری نویس محرر مقرر کرنے کی کوشش کی گئی ۱۹۰۳ء میں پہلا محرر بنارس کی عدالت میں مقرر ہوا۔

اس مضمون میں ہندی ساہتیہ سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا کی تحریکات کا تاریخی طور پر جائزہ کرتا ہے۔ اور ان تحریکات سے انگریز حکام کی دلچسپی کے تاریخی شواہد بھی دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ صفحہ ۱۳۴ پر یہ سطور ملتے ہیں:

> سامراجی حکام ہندی اور ناگری کو عدالتوں میں رائج کرنے کے لئے ہر طرح سے کوشاں تھے۔ ڈاکٹر گریرسن اس زمانے میں شمالی مغربی صوبجات کے لسانی جائزہ کا کام کر رہے تھے موصوف ناگری پرچارنی سبھا کے رکن اور ہندی دیوناگری کے زبردست حامی تھے انہیں کے اشارے پر سبھا نے عام مردم شماری میں مادری زبان کے اندراج کا مطالبہ کیا تھا"

اس مضمون میں تاریخی واقعات اور ان کے مستند حوالے موجود ہیں۔ جو آگے منظم اور منضبط کام کرنے والوں کے لئے بے حد قیمتی اور مفید ہوں گے

۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کے مطابق ناگری اور اردو دونوں لپیوں کا جاننا لازمی قرار دیا گیا۔ اسے حکم چند نیر نے اردو زبان کا عظیم ترین المیہ قرار دیا ہے۔

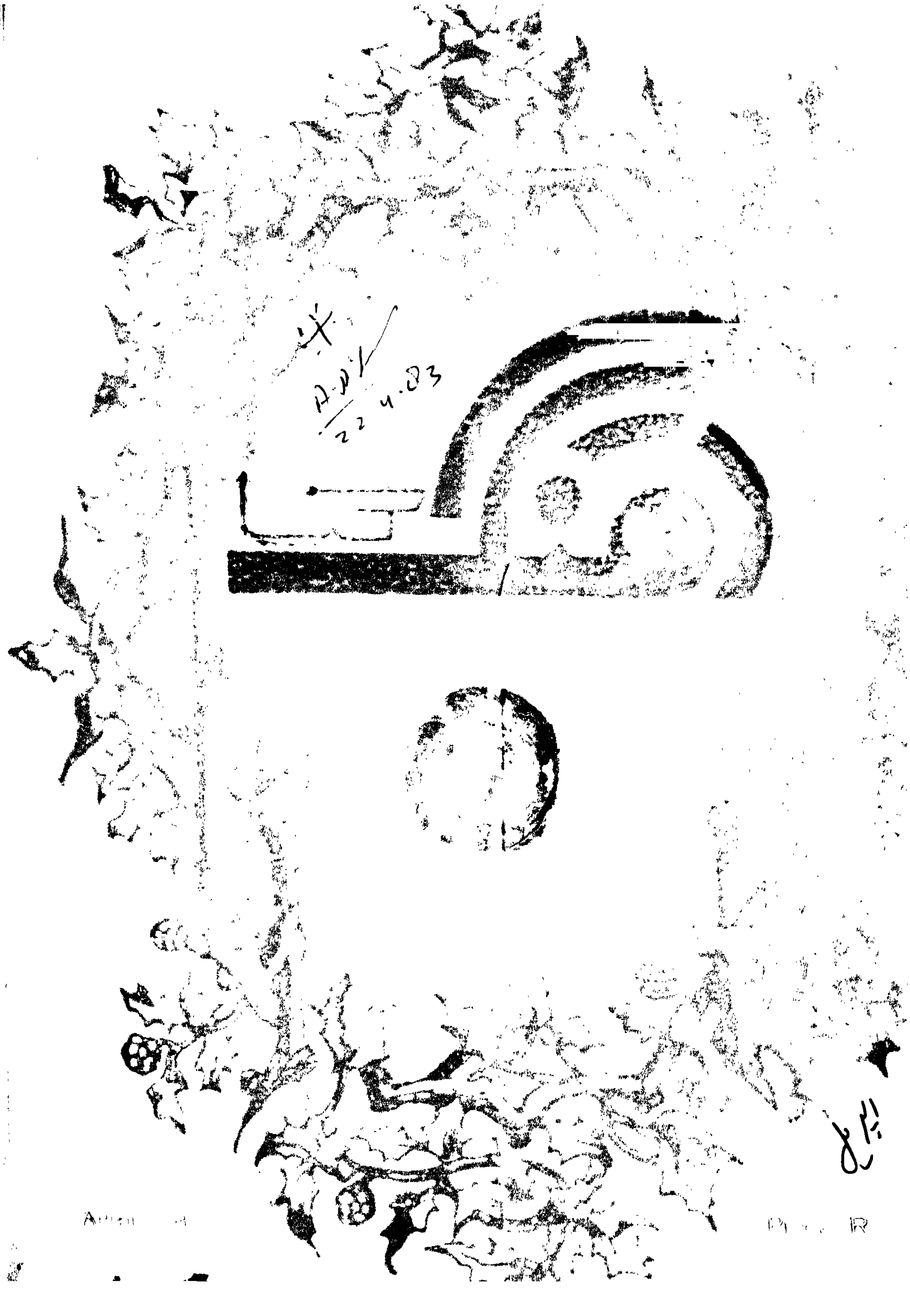
صفحہ ۱۴۸ سے جو مضمون شروع ہوتا ہے۔ اس کا عنوان ہے "اردو زبان اور ہندی والوں کے خیالات اور سوالات" یہ مضمون دراصل ہندی روزنامہ "بھارت" کے سوالنامے کا حکم چند نیر صاحب کی زبانی جواب پر مشتمل ہے۔ زبان کا مذہب کا تعلق، اردو ہندوستانی زبان ہے یا بیرونی، عربی، فارسی الفاظ کو اردو سے دور کر دیا جائے تو وہ اردو رہے گی یا نہیں۔ کیا عربی و فارسی کے عام فہم الفاظ کے اردو زبان کو نہیں سنوارا جا سکتا۔ کوئی زبان دوسرا رسم خط اختیار کرے تو وہ مرتی ہے یا نہیں۔ اور اردو کو دیوناگری رسم خط میں لکھا جائے تو کیا نقصان ہو وغیرہ وغیرہ۔ ڈاکٹر حکم چند نیر نے ان سوالات کا ہندی روزنامے کو عالمانہ اور استدلالی جواب دیا ہے۔ اور اس جملے پر اپنے جواب کو ختم کیا ہے کہ:

> "ہماری نئی نسلیں اگر اردو رسم خط سے بے بہرہ ہوں گی تو وہ اردو ادب کی روح تک رسائی حاصل نہیں کر سکیں گی"

مجموعی اعتبار سے حکم چند نیر کی یہ کتاب اپنے نام سے قطع نظر ایک معلوماتی اور تحقیقی کتاب ہے جس میں مستند تاریخی شواہد کے ساتھ بحثیں

THE AAHANG URDU MONTHLY MAR. 83

THE Aahang Urdu Monthly



دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگ جیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

ایک سال کیلئے ـــ چوبیس روپے
ایک شمارہ ـــ دو روپے
فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

رفقاء ایڈیٹرز
شفق ، عبدالصمد

ایڈیٹر
نوشابہ حق

کتابت : کلیم القادری دنگروی

طباعت : ہند التصویر پریس گیا

محتویات

کشکول

اُردو میں نثر کی تنقید کو اتنا ہی آسان یا مشکل سمجھا جاتا ہے جتنا شاعری کی تنقید کو۔ حالانکہ بیشتر محسوس کیا گیا ہے کہ نثر کی تنقید شاعری کی تنقید سے مشکل تر ہے۔ دراصل نثر پر تنقید اردو میں تقریباً نہیں ہے۔ اسٹائل وغیرہ پر باتیں کر کے لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے نثر پر تنقید کا حق ادا کر دیا۔

نثر کی تنقید مشکل تر کیوں ہے؟ شاعری میں بحر، ردیف، قافیہ، بند وغیرہ ایسی شکلیں ہیں کہ جن کا اثر قاری پر فوراً پڑتا ہے۔ مگر نثر کی ظاہری بے چہرگی اپنا اثر جلد نہیں ڈال پاتی۔ نثر کی یہ بے صورتی صرف فریب نظر ہے۔ بہت کم قارئین اور نقاد کی سماعت اور بصارت نثری آہنگ اور ڈھانچے کے اثرات کو محسوس کرنے کے لئے ضروری تربیت کے مالک ہوتے ہیں۔

پریم چند کے کسی ناول کے ایک یا دو پیراگراف کو لے کر "عملی تنقید" کا ہدف بنانا اردو میں نئی بات کی حد تک گوارہ ہو سکتی ہے۔ مگر یہ نثر کی تنقید نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ شاعری کی عملی تنقید میں ایک مکمل (پوری) نظم ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ یا کم از کم اپنے طور پر مکمل کوئی حصہ عملی تنقید کا نشانہ ہوتا ہے مگر نثری ٹکڑا ہمیشہ محض ایک اقتباس ہی ہو سکتا ہے۔ اور اسی باعث اس کی شکل و صورت کے بارے میں رائے قائم کرنا مشکل تر ہو جاتا ہے۔ نقاد محض ایک اقتباس کی بنا پر یہ دیکھنے سے قاصر رہ جاتا ہے کہ نثار کے مقصد اور وسیلے کے درمیان کیا رشتہ ہے۔

علاوہ ازیں نقاد یہ سخت اور غیر تخلیقی رویہ اپنا لیتے ہیں جیسے وہ اچھی نثر کے تمام رموز سے واقف ہیں۔ حالانکہ نثر کا تنوع اتنے تنگ دائرے میں محصور نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اچھے نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھی اور بری نثر کے تمام معیاروں پر بھروسہ نہ کرے۔

نثر نگار اپنے مقصد کو اچھی طرح پیش کرنے کے لئے کامیاب وسیلہ اختیار کرے گا تو وہ اچھی نثر کہلائے گی۔ اور اگر مقصد اچھی طرح پورا نہ ہوا تو وہ نثر بھی خراب کہی جائے گی۔

نثر کے تنقید نگار کو یہ دیکھنا چاہئے کہ نثر نگار کیا کہہ رہا ہے؟ اور وہ یہ چاہے کہ نثر نگار کا مقصد کیا ہے۔ یہ کر لینے کے بعد وہ یہ دیکھنے کی کوشش کر سکتا ہے کہ نثر نگار نے زبان کو کتنے پر اثر طور پر استعمال کیا ہے۔

عملی تنقید نثر کے لئے ناموزوں عمل کہا جائے گا جبتک کہ محض اقتباس ہی پر توجہ مرکوز ہوگی۔

امیر حیدر ملک ادبی ایوارڈ

ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ امیر حیدر ملک ادبی ایوارڈ کے لئے موصولہ کتابوں میں سے تین کتابوں کو انعام کے لئے ادبی کلچرل اکیڈمی انعامی بورڈ نے اپنی سفارشات چیرمین کے یہاں داخل کر دی ہیں۔ چیرمین نے بورڈ کے فیصلے کو حتمی طور پر قبول کرتے ہوئے انعام حاصل کرنے والوں کے نام کا اعلان کر دیا ہے۔

---

(۱) نام کتاب : کھل جا سم سم — پانچ سو روپے
مصنف : مظفر حنفی
صنف : شاعری

(۲) نام کتاب : دکنی مثنویوں میں منظر نگاری، پانچ سو روپے
مصنف : ملنسار اطہر احمد
صنف : تنقید

(۳) نام کتاب : رات کا منظر — پانچ سو روپے
مصنف : احمد عثمانی
صنف : افسانے

ان مصنفین کو انعام کی رقم بذریعہ چیک روانہ کی جا رہی ہے۔

دستخط : نثار احمد صدیقی
سکریٹری

دستخط : کلام حیدری
چیرمین

جوگندر پال

فکر تونسوی کی عمومیت

زندگی کے مانند ادب میں بھی مستقل قیام کی صورت
ا امر کے بغیر ممکن نہیں کہ ادیب کو معمول کے غیر معمولی پن کا
راک ہو۔ ہمارے بیشتر لکھنے والے اس لئے قدم قدم پہ ٹھوکر
اتے ہوئے لگتے ہیں۔ کہ دور کی نظر کی عینک چڑھا کر گردوپیش
غافل ہو کے چلتے ہیں۔ اس کے برعکس فکر تونسوی کی تحریر میں
ں کے پکے قدموں کا احساس ہوتا ہے۔ فکر کی قریب کی نظر بڑی
ہے۔ اور اسے پوری طرح کام میں لاتے ہوئے وہ اپنے آس
ں کو کچھ یوں باندھ لینے کا اہتمام کر لیتا ہے کہ روزمرہ کی ساری
مائیت نگاہ میں آجائے۔ اسی ضمن میں "میری مطالعہ گاہ"
انسانی بے بسی کی یہ تیکھی اور شگفتہ روداد ملاحظہ کیجئے اگر
مسکرا مسکرا کر المیوں کو جذب کرنے پر عادی رہیں۔ تو جینا دوبھر
نے سے بچا رہتا ہے:

> مطالعہ گاہ سب سے اوپر کی منزل پر تعمیر کی گئی ہے۔ سنا ہے پرماتما عرش پر رہتا ہے اس لئے عرش سے ادھر اپنا ایک مکان بنا لیا۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح پرماتما سے براہ راست تو تو میں میں ہو سکے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ تو تو بھی میں ہی کروں گا۔ اور میں میں بھی میں۔
>
> پھر اسی طرز پے میں پالیو لیشن، ایکسپلوژن کی بھگدڑ میں خدا لے بسی کا یہ ڈیفنس:
>
> چار مرتبہ میں نے پرماتما کو آواز دی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ پرماتما شاید بہرہ ہو چکا ہے۔ شور و غوغا سے بھرپور ڈھیروں ڈھیر مخلوق پیدا کرے گا تو کان کہاں تک سلامت رہ سکتے ہیں۔

ایسے معلوم ہوتا ہے گویا فکر نے خنداں خنداں قیامت کو اپنی پانچویں انگلی پر اٹھا لیا ہے۔

ہنرمندی مصنف کی شرکتوں کا اشاریہ نہ بنا پائے تو ہنر کی پہلی پانچ سات سیڑھیوں پر ہی اس کی سانس پھول جاتی ہے۔ فکر تونسوی کی خوش قسمتی ہے کہ اسے زندگی کے ہر اونچ نیچ میں برابر شرکت کے مواقع میسر آتے رہے ہیں۔ کوئی روداد بیان کرتے ہوئے اسے اس روداد کو اکادمیانہ طریق سے فرض کر کے ثابت نہیں کرنا ہوتا۔ بلکہ وہ اس صورت حال میں سے گزر رہا ہوتا ہے نتیجتاً اظہار کے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی تسکین کا سامان ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ یہ وسائل اس کی سانس پھولنے کا اسباب کریں۔ سانس تو اس وقت پھولتی ہے۔ جب سننے والوں کو متوجہ کرنے کے باوجود کہنے کو کچھ نہ ہو۔ یا ہو تو بولنے والے پہ چپ کے پہرے لگا دیئے جائیں۔ جس کے ساتھ بیت رہی ہو اسے تو بول بول کر ہی چین آئے گا۔ اور اس کا بولا ہوا اپنی سچائی کے باعث سننے والوں کے دلوں میں گھر بھی کرے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اسکے ہزاروں پڑھنے والوں کو اخبار پڑھنے کا
خیال اس لئے آتا ہے کہ "پیاز کے چھلکے" دیکھنے سے نہ رہ جائے
جن نقادوں کو فکر تونسوی کی بسیار نویسی کھلتی ہے
انہیں معلوم نہیں کہ اس کے ذہن میں کتنا خام مواد بھرا ہوا ہے
اچھا لکھنے والا کوئی بند کا بند پہاڑ نہیں ہوتا کہ اسے پکنک
اسپاٹ سمجھ کر کبھی کبھار سستا لیا جائے۔ وہ تو گویا ڈائنا
مائیٹ سے کھل کھل کر اپنا بیش بہا سرمایہ وا کرتا رہتا ہے۔ کہ
لینے والے حسب استعداد جتنا چاہیں لیتے رہیں۔ لینے والے اگر
اس کے "پیاز کے چھلکے" ایک بار کی بجائے دن میں دو یا دس بار بھی
لینا چاہتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ اسے جوں کا توں آمادہ پائیں
ہر پل اگر پیاز کے چھلکے کی مانند لپٹا ہوا محسوس ہو تو اسے روتے
چھوڑنے کی پیہم کرید عین فطری ہوتی ہے۔ "پیاز کے چھلکے" سنگترے
کے چھلکوں کی مانند خوش رنگ اور خوشبودار نہ سہی۔ لیکن تیکھے
پن کی فراوانی کی بدولت نہایت کارگر ہیں۔

فکر تونسوی اپنے ایک مضمون "مولوی ازکار و حوادث"
میں جہاں زمیں دار کے عبدالمجید سالک کو اس کے کالم "افکار
و حوادث" کی رعایت سے مولوی ازکار و حوادث کا نام دیتا ہے
وہاں بجا طور پر اپنی اصطلاح بھونڈے پن کے باوجود اپنے
آپ کو جناب پیاز کے چھلکے کا نام دینے کی ترغیب سے باز
نہیں رکھ سکا۔ اس روزانہ کالم کی خوگری نے ہوتے ہوتے
اسے اپنے اسی دور کا خوگر بنا دیا۔ اس طرح کا لکھنے والا ہنر کی
چند سیڑھیوں پر ڈھیر ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ اپنی دھن میں
اوپر ہی اوپر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور یوں جہاں ذرا دم لینے
کے لئے ٹھہر گئے۔ وہیں ایک منزل قرار پا گئی۔ اس اعتبار سے
فکر کی طنز و مزاح کی عمارت کی منزلوں کی گنتی کرنا مقصود ہو تو یہ
سلسلہ شاید امریکہ کی بلڈنگ سے بھی اونچا نکل جائے حالانکہ
اس نے مولانا سالک سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے یہ انکسار
رقم کیا ہے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا، میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

واقعہ یہ ہے کہ سالک اور فکر کی مماثلت کی اس کے سوا
اور کوئی سطح ہی نہیں۔ کہ دونوں کے صحافتی کالم طنز و مزاح
کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ امر تسلیم کر لینے کے بعد ہر دو میں باقی
جو کچھ بھی ہے اس کا الگ پن ہی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ سالک
کا اعتبار اپنے بے دھڑک لہجے کی گھن گرج سے بنتا ہے۔ اور
فکر آواز کو دبا دبا کر عام گفت و شنید کے لہجے میں مسکراتے
ہوئے اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مخاطب کو جیب میں ڈال کر
چلتا بنتا ہے۔ مولانا کو تو ان کی گھن گرج کے باعث فوراً دھر لیا
جاتا رہا۔ مگر کیا مجال۔ کوئی سرکار فکر پر ہاتھ ڈال سکے۔ وہ
سب کچھ اتنی صفائی سے کہہ جاتا ہے کہ آپ اسے گرفتار کرنے
کے لئے بڑھئے مگر وہ اپنی خاموش مسکراہٹ سے جواب دیگا
میں نے کیا ہی کیا ہے ——— ؟ اور آپ واقعی اس
کے بھولے چہرے کو گھور گھور کر دیکھتے ہوئے لاجواب ہو جائینگے

بعض لکھنے والے بے سیاق و سباق لطیفے گھڑ کر ہی
طنز و مزاح کی تاجداری کے دعوے دار بن جاتے ہیں۔ فکر تونسوی
کی خوبی یہ ہے کہ اس کی باتیں کسی مخصوص تناظر سے پھوٹتی ہوئی
محسوس ہوتی ہیں۔ اور بظاہر لغو بھی لگیں۔ ان کی زیریں لہریں
عین اپنے نشانے کی طرف لپک رہی ہوتی ہیں۔ دہلی کے حدود
اربعہ کے بیان میں مندرجہ ذیل سطور پڑھئے:

عرض۔ دہلی کی حدیں لوٹتی بنتی اور بنتی
لوٹتی رہتی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دہلی
میں شیطان آگھسا ہے۔ جو اپنی آنتوں کو
چاروں طرف پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔ اور کچھ
عجب نہیں کہ ایک دن ہم یہ خبر سنیں کہ دہلی کی
ایک حد کلکتہ ہے۔ اور دوسری حد سری نگر
——— ہندوستان سمٹ رہا ہے

اور دہلی بڑھ رہی ہے "

یا پھر دہلی کے عاشقوں کے تعلق سے یہ بیان پڑھیئے ۔

"مجھے ایک عاشق کے بارے میں معلوم ہے
کہ وہ حسن کا تعاقب کرنے کے لئے ہر روز
بائیسکل پر پندرہ پندرہ میل کا سفر کرتا رہا
اور آخر ایک دن جب اس کی محبوبہ نے
وفورِ محبت میں اس سے پوچھا پیارے
میرا جی چاہتا ہے کہ تجھ پر کچھ نچھاور کر دوں
بول کیا مانگتا ہے ؟
جواب میں عاشق کے منہ سے بے ساختہ
نکلا ۔ پیاری مجھے ایک سکوٹر لے دو ، مجھ
سے اب زیادہ دیر بائیسکل نہیں چلائی
جاتی "

بعض اوقات فکر کی پوری بات ہولی ہوتی ہے ۔ مگر وہ گویا اپنی اس بات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے ہی کئے چلا جاتا ہے ۔ اس کا جواز شاید یہ بھی ہو کہ "پیاز کے چھلکے" کا روزانہ اخباری کالم لکھتے لکھتے یہ خوف اس کی عادت میں شامل ہو گیا کہ اس کی بات عام پڑھنے والے کے سر کے اوپر سے نہ گزر جائے ، اس کے علاوہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عوامی ادیبوں کو ایسا ماحول فطری معلوم ہوتا ہے جس میں جو بات عین اپنے نشانے پر جا لگی ہو ۔ اس کی تہہ بٹھانے کے لئے اسے اور لمبا کر لیا جائے ، مصنف گویا اپنی بات اس لئے دہرا رہا ہوتا ہے کہ ایک بار تو اس نے خود آپ سے سنایا ہے اور اس کے بعد پڑھنے والا اسے بول بول کر سر دھن رہا ہے ۔ اس ضمن میں اس کے "پیاز کے چھلکے" میں سے یہ اقتباس دیکھئے :

کچھ عقلمند لوگ کہہ رہے ہیں کہ کرنسی کا
پھیلاؤ بڑھ رہا ہے ۔ مگر میرا خیال ہے
بچوں کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے ۔ یا شاید یوں
ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی
بڑھ رہے ہیں ۔ یا بچے اور کرنسی دونوں
ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے بڑھ
رہے ہیں ۔ مثلاً ادھر گورنمنٹ اپنی ٹکسال
میں سے ایک نوٹ چھاپ کر بھیجتی ہے ۔
ادھر والدین ایک اور بچہ مارکیٹ میں
ارسال کر دیتے ہیں ۔ گورنمنٹ کو اس
بات پر بڑا غصہ ہے کہ یہ بچہ سالا کھائے گا
کہاں سے ؟ چنانچہ وہ غصے میں آ کر ایک
نوٹ اور چھاپ دیتی ہے ۔ جب یہ دوسرا
نوٹ چھپنے کی خبر پہنچتی ہے ۔ تو ایک اور
بچہ جھانک کر کہتا ہے "آداب عرض ہے"

تکرار کے احساس کے باوجود پڑھنے والے کو شاید یہ محسوس کر کے خوشی ہوتی ہے کہ وہ فکر کو اپنے ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھ کر نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ چوپال پر کئی لوگوں کی رفاقت میں اسے اس کی زبان سے سن رہا ہے ۔ تکرار ہو یا نہ ہو کسی تحریر سے ایسی رفاقتیں مہیا ہو جائیں تو اور کیا چاہیئے ؟

میرا خیال ہے کہ فکر کو اپنی یہ عمومیت بہت عزیز ہے ۔ اور ایک اعتبار سے اس کی یہی خصوصیت اسے انفرادیت عطا کرتی ہے ۔ ●●

بقیہ : اور وہ نہ ہوتی رہی

کی طرف تھکن بھری خمار آلود نظروں سے دیکھا ——— اس نے جیلر صاحب سے کہا ۔

مجھے کمپلین لکھوانی ہے ۔ کل رات میرے ساتھ بالاتکار ہوا ہے ۔ ●●

شہزاد منظر (پاکستان)

ابراہیم جلیس

اردو میں جب بھی طنز نگاری کے بارے میں لکھا جائے گا۔ ابراہیم جلیس کو ضرور یاد رکھا جائے گا۔ وہ صرف افسانہ نویس یا صحافی نہیں تھے۔ وہ بہت اچھے طنز نگار بھی تھے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کو رتبہ یا درجہ کے بارے میں سوال کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ آج ہم میں نہیں۔ اور ان کے تمام افسانے ہمارے سامنے ہیں ہم ان کے افسانوں کو وقت کے تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی ادبی اور فنی قدر و قیمت جانچ سکتے ہیں۔ اور ان کی تخلیقات کے پس منظر میں بحیثیت افسانہ نگار ان کی حیثیت متعین کر سکتے ہیں۔ ابراہیم جلیس نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا۔ وہ بہت ہی انقلابی اور ہیجانی دور تھا اس دور میں سب سے بڑا مسئلہ ملک کو غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ اس لئے اس دور کی بیشتر تحریروں میں جذباتیت غالب تھی۔ اور فنی لوازمات اور جمالیاتی اظہار کا بہت کم خیال رکھا جاتا تھا۔ ادب کی مقصدیت نے پروپیگنڈے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور پڑھنے والے اس پر واہ واہ کر رہے تھے۔ ان باتوں نے اس دور کے بیشتر ادیبوں اور شاعروں کو فنی ریاضت اور خلاقانہ چابکدستی سے کام لینے کی مہلت نہیں دی۔ اور "کاتا اور لے بھاگا" کی روش عام ہو گئی تھی۔ کرشن چندر اور ابراہیم جلیس وغیرہ چونکہ خوب صورت اسلوب کے مالک تھے۔ اس لئے ان کی اچھی بری کمزور اور توانا ہر قسم کی تحریر فوراً مقبول ہو گئی تھی۔ اور نا قدین اور قارئین کو انہیں فنی کسوٹی پر پرکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آج اس دور کو گذرے ایک زمانہ ہو چکا ہے۔ آج ہم ابراہیم جلیس کے افسانوں کا تنقیدی نقطہ نظر سے جائزہ لے کر بے شمار کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ لیکن بحیثیت طنز نگار ہم ان کی حیثیت کم نہیں کر سکتے۔

ابراہیم جلیس نے اپنا ادبی کیریر طنز نگار کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جسے ہم اردو ادب کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں۔ اسی دور میں اردو کے بڑے بڑے ادیب و شاعر پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو ادب کو مالا مال کیا۔ اور ایک سے ایک شاہکار نظمیں، غزلیں اور افسانے تخلیق کئے۔ ابراہیم جلیس نے جب لکھنا شروع کیا اس وقت اردو دنیا میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، محمد حسن عسکری جیسے بڑے بڑے ادیب لکھ رہے تھے۔ ایسے دور میں ابراہیم جلیس افق ادب پر نمودار ہوئے۔ اور اپنی ابتدائی تحریروں سے ہی ادبی حلقوں کو اپنی جانب متوجہ کر لی۔ وہ جب علی گڑھ یونیورسٹی میں بی۔ اے کے طالب علم تھے اس وقت وہ سارے ملک میں بحیثیت طنز نگار مشہور ہو چکے تھے۔ اور کرشن چندر جیسے ادیب نے

انہیں داد دی تھی۔

اس کی وجہ ان کی طنز نگاری تھی۔ اس دور میں کنہیا لال کپور سب سے بڑے اور مقبول طنز نگار تھے۔ اس کے بعد کرشن چندر کا نام آتا تھا۔ ان کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ "ہوائی قلعہ" شائع ہو کر سارے ملک میں مقبول ہو چکا تھا ایسے دور میں ابراہیم جلیس کا اچانک ورود اور ان کا پرجوش استقبال معمولی بات نہ تھی۔ کرشن چندر نے "ہوائی قلعہ" کی اشاعت کے بعد اپنی تمام توجہ افسانہ نگاری کی طرف مبذول کر دی۔ اس طرح میدان میں صرف کنہیا لال کپور اور ابراہیم جلیس رہ گئے۔

ابراہیم جلیس نے طنز نگاری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری بھی جاری رکھی۔ اس طرح ان کی مقبولیت کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ اردو میں افسانہ نگاری کا سنہرا دور تھا۔ اور قارئین میں افسانہ بہت مقبول تھا۔ ابراہیم جلیس نے مختصر سی مدت میں بہت سارے افسانے لکھ ڈالے، ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ تیار ہو گیا جو "زرد چہرے" کے نام سے شائع ہوا۔ اور قارئین میں بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بعد ان کا مشہور ناول "چالیس کروڑ بھکاری" شائع ہوا جو بنیادی طور پر ایک طنزیہ ناول تھا۔ اس ناول میں انہوں نے برصغیر کے چالیس کروڑ عوام کو بھکاری سے تعبیر کیا تھا۔ یہ غلامی کا دور تھا۔ اور سارے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے خلاف جد و جہد جاری تھی۔ اس دور میں صرف وہی تحریریں مقبول ہوتی تھیں۔ جن میں کسی حد تک سیاست کی چاشنی موجود ہو۔ چنانچہ ان کا یہ ناول بھی کافی مقبول ہوا اس کے بعد بھی وہ مسلسل لکھتے رہے۔

ابراہیم جلیس کی ادبی زندگی ۱۹۴۲ء سے شروع ہوئی اور ۱۹۷۷ء تک مسلسل ۳۵ سال تک جاری رہی۔ انہوں نے اسکول [illegible]

میں لکھنا شروع کیا تھا۔ علی گڑھ میں زمانہ طالب علمی میں ان کا پہلا افسانہ "نگار" لکھنؤ (مدیر نیاز فتح پوری) میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ دوسرے رسالوں میں شائع ہوتے رہے ابراہیم جلیس میں ابتدا سے ہی افسانہ نگاری سے زیادہ طنز نگاری کی صلاحیت پوشیدہ تھی۔ چنانچہ وہ جب ۱۹۴۳ء علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر حیدرآباد آئے تو "حیدرآباد ریڈیو" سے وابستہ ہو گئے۔ اور طنزیہ اور مزاحیہ فیچر لکھتے رہے۔ اس ادارے سے وہ ۱۹۴۸ء تک وابستہ رہے۔ اور چونکہ وہ طنز نگار تھے اور ان کی نظریں معاشرے کی دکھتی رگوں پر رہتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اپنی تحریروں میں عصر حاضر کی سیاست اور معاشرے پر شدید چوٹیں کیں۔ وہ زبردست انقلابی دور تھا برطانوی ہند میں آزادی کی جد و جہد نے شدت اختیار کر لی تھی۔ جس کا دیسی ریاستوں پر بھی براہ راست اثر پڑ رہا تھا خصوصاً حیدرآباد کو متوسط اور دانشور طبقہ ان تحریکوں سے گہرے طور پر متاثر ہو رہا تھا۔ حیدرآباد میں اس طبقہ کے ذہنی رہنما مخدوم محی الدین تھے۔ چنانچہ ابراہیم جلیس بھی اس گروہ میں شامل ہو گئے۔ اور انہوں نے ریاست میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں سرگرم حصہ لیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ترقی پسند مصنفین کی کھیپ پیدا ہو گئی۔ اسی دور میں حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔

حیدرآباد جیسے دیسی اور رجعت پسند ریاست میں سیاسی شعور اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف بیداری مخدوم محی الدین اور ان کی نسل کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے پیدا کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیسی ریاستوں میں برطانوی ہند کی مختلف سیاسی جماعتوں کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ اور آزادی کی جد و جہد کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا۔

ابراہیم جلیس [illegible]

کے ساتھ تھیں۔ اور یہ ہمدردیاں اس وقت تک رہیں۔ جب تک ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو دو حصوں میں تقسیم نہ کر دیا۔ قیام پاکستان کے بعد جب برصغیر کے مختلف حصوں میں بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہوئے اور ریاست حیدرآباد کی حیثیت کے بارے میں سوال پیدا ہوا تو ایک طبقہ نے حیدرآباد کی "آزاد حیثیت" کا مطالبہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ صرف اس طرح "حیدرآباد کے اسلامی تشخص" کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ ابراہیم جلیس بھی اس گروہ کے حامی تھے۔ چنانچہ انہوں نے حیدرآباد ریڈیو سے اس کی حمایت میں دھواں دھار تقریریں نشر کیں۔ بھارت کی جانب سے فوجی کارروائی کے بعد جب حیدرآباد کا سقوط عمل میں آیا۔ اور ابراہیم جلیس نہایت بے سروسامانی کے عالم میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنا وہ معرکۃ الآرا رپوتاژ لکھا۔ جو "دو ملک ایک کہانی" کے نام سے شائع ہوا۔ کرشن چندر کے رپوتاژ "پودے" کے بعد یہ اردو کا دوسرا اہم رپوتاژ ہے۔

ابراہیم جلیس لاہور آنے کے بعد عرصہ تک بے روزگار رہے۔ اور روزنامہ "امروز" لاہور میں مضامین لکھ کر تھوڑے بہت پیسے کماتے رہے۔ "امروز" پاکستان کا واحد اخبار تھا جو اپنے لکھنے والوں کو معاوضہ ادا کرتا تھا۔ ابراہیم جلیس عرصہ تک اس میں لکھتے رہے۔ اس دور میں فیض احمد فیض پاکستان ٹائمز اور امروز کے چیف ایڈیٹر اور احمد ندیم قاسمی "امروز" کے ایڈیٹر تھے۔ بڑی کوششوں کے بعد "امروز" میں ابراہیم جلیس کے لئے سب ایڈیٹر کی جگہ نکالی گئی۔ اور وہ امروز کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ لاہور کا قیام انہیں کئی اعتبار سے راس آیا۔ ان کے سارے دوست احباب پہلے سے ہی وہاں موجود تھے۔ دوئم یہ کہ لاہور کے قیام کے دوران ان کا فلمی دنیا سے رابطہ قائم ہوا۔ اور انہوں نے ڈبلیو، زیڈ، احمد اور دوسرے فلمسازوں کے ایما پر کئی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھے

اس طرح انہیں قدم جمانے کا موقع ملا۔

جیسا کہ میں اس سے قبل لکھ چکا ہوں۔ ابراہیم جلیس کی ہمدردیاں ابتدا سے ترقی پسند قوتوں کے ساتھ تھیں چنانچہ یہاں آنے کے بعد وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ اس دور میں بھی ملک کا حکمراں طبقہ ان سرگرمیوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہ مارشل پلان کا دور تھا۔ اور دوسری جنگ عظیم ختم ہوتے ہی بڑی طاقتوں کے درمیان سرد جنگ چھڑ چکی تھی۔ اور چین اور روس امریکہ کے دشمن تصور کئے جاتے تھے۔ اس دور میں پاکستان امریکہ کا حلیف تھا۔ اس لئے اس کے لئے بائیں بازو کے عناصر کو برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ اسی دور میں "راولپنڈی سازش کیس" کا معاملہ پیش آیا۔ اور فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، سبط حسن بہت سے لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ ابراہیم جلیس بھی اس عرصے میں اپنے بائیں بازو کے رجحانات کے باعث کئی بار گرفتار اور رہا کئے گئے۔ ان کی آخری گرفتاری شہنشاہ ایران کے دورۂ پاکستان کے وقت پیش آئی، جس کے بعد انہوں نے "پبلک سیفٹی ریزر ایکٹ" اور "جیل کے دن جیل کی راتیں" جیسی کتابیں لکھیں۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں جب "امروز" کراچی سے شائع ہونے لگا تو وہ اس سے وابستہ ہو گئے۔ [illegible] میں وہ روزنامہ "انجام" کراچی کے سنڈے ایڈیشن کے انچارج مقرر ہوئے، اور انہوں نے اسی اخبار سے اپنی کالم نگاری کا آغاز کیا۔ یہ وہ دور تھا جب چراغ حسن حسرت، مجید لاہوری، اور شوکت تھانوی، جیسے مشہور مصنف مختلف روزناموں میں کالم لکھ رہے تھے۔ اور ان کا اخباری دنیا میں بڑا شہرہ تھا۔ اس دور میں ابراہیم جلیس کے کالم کی مقبولیت اور پذیرائی اس امر کا ثبوت ہے کہ ان میں ایک منفرد طنز نگار کی صلاحیت موجود تھی۔

ادبی طنز نگاری اور اخباری فکاہیہ نگاری میں

بنیادی فرق یہ ہے کہ ادبی طنز نگار اپنے خاص موڈ اور رو کے تحت لکھتا ہے۔ جبکہ اخباری کالم نویس ایسا نہیں کر سکتا اسے اس بات کی آزادی نہیں کہ اسکا جب جی چاہے لکھے اور جب جی چاہے نہ لکھے۔ اسے ہر روز کالم کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے لہٰذا وہ موڈ کا پابند نہیں ہو سکتا۔ ابراہیم جلیس کی کالم نگاری کی کامیابی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ شوکت تھانوی کے رحلت کے بعد روزنامہ جنگ کے مدیر اور مالک میر خلیل الرحمٰن انہیں شوکت تھانوی مرحوم کی جگہ لے گئے۔ اور انہیں ان کے مشہور کالم "وغیرہ وغیرہ" لکھنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں کئی اہم واقعات رونما ہوگئے ابراہیم جلیس بے حد جذباتی انسان تھے۔ اور وہ زیادہ تر جذباتی فیصلے کیا کرتے تھے جس سے بعض اوقات انہیں نقصان بھی پہونچتا تھا لیکن وہ اس پر پچھتاتے نہیں تھے۔ ۱۹۷۶ء جب وہ جنگ کے ایڈیٹر تھے۔ تو اخباری صنعت میں ویج بورڈ کے قیام کے لئے کل پاکستان ہڑتال ہوئی۔ تو اس میں انہوں نے شرکت کی جس کے نتیجہ میں انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

بھٹو حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد جب ہڑتالی صحافیوں کو سابقہ ملازمت کو بحالی کیا گیا تو سب کو واپس لے لیا گیا۔ سوائے ابراہیم جلیس کے۔ "جنگ" سے علیحدگی کے بعد وہ عرصہ تک "حریت" اور دوسرے اخبار میں کالم لکھتے رہے پھر انہیں مساوات کی ایڈیٹرشپ آفر کی گئی۔ مساوات پر فوجی حکومت کی جانب سے پابندی عائد کرنے کا ان پر گہرا اثر پڑا۔ وہ مساوات کو کھلوانے کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ اور بالآخر ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو دل کا دورہ پڑنے کے باعث انتقال کر گئے۔

وہ بہت ہی باغ و بہار انسان تھے۔ وہ ہمیشہ ہنستے اور ہنساتے رہتے تھے۔ ایک بار ان کے دوست اور مشہور صحافی طفیل احمد جمالی نے ان سے پوچھا تھا کہ "یار میں نے تم کو ہمیشہ ہنستے، لطیفہ سناتے اور قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔ آخر تم روتے کیسے ہو۔؟"

ابراہیم جلیس نے جواب دیا۔ میں دن کو ہنستا ہوں اور رات کو روتا ہوں۔

●●

گیا

چودھری مجیب رضا

صاعقۂ طور ——— ایک جائزہ

ابھی ابھی "صاعقۂ طور" مصنف تاج پیامی لکچرار شعبۂ جغرافیہ ایچ ڈی جین، کالج آراہ اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد سے چھپ کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ کتابت اور طباعت بہت دیدہ زیب ہے۔ فاضل مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ اس تنقید میں انہوں نے پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کے اردو شاعری پر جتنے اعتراضات ہیں۔ (اردو شاعری پر ایک نظر، میری تنقید، ایک باز دید، پاگل نغمہ کے دیباچہ میں) فاضل مصنف نے ان کا جواب پوائنٹ بائی پوائنٹ دیا ہے۔

بزرگ محترم پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب آج سے قریب ۵۰ برس پہلے پٹنہ کالج میں میرے استاذ تھے اور تاج پیامی صاحب میرے نوجوان دوست ہیں۔ انہوں نے کتاب کا کچھ حصہ جب وہ اسے لکھ رہے تھے۔ دوستوں کی ایک نشست میں سنایا تھا۔ اور ہم لوگوں نے کہا تھا کہ وہ استاذ محترم کی ذاتِ گرامی پر حملہ نہ کریں۔ مگر وہ نہ مانے، مشکل تو یہ ہے کہ یہاں کوئی قابلِ ذکر اردو لائبریری ہی نہیں جہاں کتابوں سے استفادہ کیا جا سکے اس لئے جو کچھ QUOTATIONS فاضل مصنف نے دیئے ہیں۔ اور جو کچھ یادداشت کی مدد سے یاد آ جاتے گیا انہیں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قلم اٹھانے کی جرأت کرتا ہوں۔ ویسے تو استاذ محترم کی ذاتِ گرامی کسی مدد کی محتاج نہیں۔

فاضل مصنف نے جس انداز سے تنقید لکھی ہے وہ خلط مبحث ہے۔ اور جو عنوان قائم کیا ہے۔ اس سے بہت کم منطقی واسطہ رکھا ہے۔ وہ کلیم الدین احمد صاحب سے اس لئے بگڑے ہوئے ہیں کہ وہ انگلش کے پروفیسر تھے۔ اور انہوں نے اپنی تنقید میں انگلش تنقید نگاروں کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اور انہیں کے نظریۂ شعر و شاعری کو اپنایا ہے۔ اور انگلش ادب کے سامنے اردو ادب کو بے مایہ ٹھہرایا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ تاج پیامی صاحب نے بھی انگریزی ناقدوں کے PAGES AFTER PAGES اقتباس دیئے ہیں۔ اور انگریز لکھنے والوں کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ چاہے وہ سائیکلوجی پر ہو یا سوشیولوجی پر، چاہے جغرافیہ پر۔ میں تو یہ کہوں گا کہ انہوں نے اس بات کا سکہ بٹھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ انگریزی علم و ادب کے ماہر ہیں اور کلیم الدین احمد صاحب نے صرف انگریزی یا فرانسیسی پڑھی ہے۔ یا انگریزی پڑھائی ہے۔ اور انہوں نے اس کے علاوہ عمرانیات یا سائیکلوجی یا کسی ... برانچ آف نالج کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اور انگریزی بھی جو انہوں نے پڑھی ہے اسے سمجھی نہیں ہے۔

ورنہ ان میں غور وفکر کی عادت ہے ۔ اور نہ صلاحیت
وز تنقید تو وہ جانتے ہی نہیں ۔ صرف انہوں نے کیچڑ
اچھالا ہے ۔ اور اردو ادب کو ذلیل وکمتر دکھایا ہے ۔
وراردو معاشرہ پر نکتہ چینی کی ہے ۔ تاج پیامی صاحب
ہتے ہیں ۔ کلیم الدین احمد صاحب کا دماغ عمیق نہیں ۔
ن کی نظر دقیقی نہیں ہے ۔ اوران کی ذہنیت بالکل
غلامانہ ہے ۔ اور وہ انگریزی علم وادب سے انگریز سے مرعوب ہیں
غیرہ وغیرہ ۔

اب سنئے تاج پیامی صاحب کا طریقہ استدلال
بس گفتار میں وہ کہتے ہیں کہ کلیم الدین احمد صاحب کو وہ
نہیں جانتے ۔ اور کلیم صاحب ان کو نہیں جانتے ۔ جب کلیم
صاحب کو تاج پیامی صاحب جانتے ہی نہیں تو انہوں
نے کیسے یہ کہدیا کہ کلیم صاحب نے انگریزی اور فرانسیسی
ادب کے سوا کچھ پڑھا ہی نہیں ہے ۔ شاید تاج پیامی صاحب
کو نہیں معلوم کہ کلیم صاحب اپنی VAST STUDY
کے لئے مشہور تھے ۔ J. A RICHARDS کی کتاب
PRACTICAL CRITICS جب ہم لوگوں کو پڑھاتے
تھے تو وہ ہم لوگوں کی سمجھ سے باہر تھی ۔ وہ J.A.RICHARDS
صاحب کے کیمبرج میں شاگرد تھے تقریباً پندرہ برس کے بعد بھی
جب میں نے J.A.RICHARDS کی کتاب PRINCIPLES OF LITERARY
پڑھنی چاہی تو وہ اتنی دقیق نکلی کہ
سمجھنا مشکل تھا ۔ کلیم الدین احمد صاحب نے عملی تنقید اور ــــــ
تنقید اور PSYCHO ANALYSIS AND
LITERARY CRITICISM لکھی ہے جو تصنیف J.A.RICHARDS
صاحب کی کتابوں سے ماخوذ ہے ۔ J.A.RICHARDS
کا شمار SCIENTIFIC CRITICS میں ہے ۔
جس کو سائکالوجی سے گہرا لگاؤ ہے ۔ مرفی صاحب کی ایک
کتاب سائیکالوجی پر INTRODUCTORY پڑھکر
یہ کہنا کہ کلیم صاحب سائیکالوجی نہیں جانتے ہیں ۔ کہاں کی

عقل مندی ہے ۔ حد تو یہ ہے کہ تاج پیامی صاحب نے کلیم الدین
احمد صاحب کو انگریزی پڑھانے کی بھی کوشش کی ہے ۔
ایک چھوٹی سی کتاب جو HISTORY OF ENGLISH
LANGUAGE C.L. WRENN پر لکھی ہے اسی کو پڑھکر
تاج پیامی صاحب اپنی انگریزی دانی کا سکہ بٹھانا چاہتے
ہیں ۔ اور وہ بھی کس پر ، کلیم الدین احمد صاحب پر ۔ تاج
پیامی صاحب نے پورا ایک CHAPTER انگریزی
زبان کی ارتقا اور اس کے نشوونما پر لکھ ڈالا ۔ اور وہ یہ بھول
گئے کہ کس سبجیکٹ کے تحت لکھ رہے ہیں ۔ اور کیا ثابت
ہوتا ہے ۔

ذرا میں پہلے کچھ شروع کی باتیں کر لوں کلیم الدین احمد
صاحب نے حالی کے متعلق لکھا ہے :

"خیالات ماخوذ ، واقفیت محدود ، نظر سطحی
فہم وادراک معمولی ، غور وفکر ادنیٰ ، دماغ
وشخصیت اوسط ، یہ تھی حالی کی کائنات "

اس جملہ نے تاج پیامی صاحب کو آپے سے باہر کر دیا ۔ مگر بجائے
پوائنٹ وائز جواب دینے کے آپ نے اسی جملے کے ساتھ
کلیم الدین احمد صاحب کی تعریف کر دی ۔ یہ کوئی جواب نہیں
یہ تو تاج پیامی صاحب کے لئے بھی کہا جا سکتا ہے ۔ اور
وہ مجھ پر شوق سے اسکو عائد کر سکتے ہیں ۔

کہنا تو یہ تھا کہ باوجود ان سب خامیوں
کے حالی ایک دردمند دل رکھتا تھا ۔ اور اس نے شاید
اردو ادب میں سب سے پہلی طویل نظم لکھی ، جس نے قوم کو
جھنجھوڑا ۔

حقیقت روایات میں کھو گئی
یہ امت خرافات میں کھو گئی

وغیرہ وغیرہ ۔ جس نے ہر خاص و عام پر اثر ڈالا یہ مسدس
روایات سے ہٹ کر لکھی گئی تھی ۔ اور اس نے حالی کو

اپنے وقت کا سب سے زیادہ POPULAR شاعر
بنا دیا۔ اسی مسدس کے ٹکڑے ہے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

زبان زد خاص و عام ہے۔ اور اگر اس کو کوئی بلند آواز سے رک رک کر ایک ایک لفظ پر زور دیکر وقار اسی کے انداز میں پڑھے تو آج بھی ساری محفل کو گرما دے۔ زبان سادہ ہے مگر پُرکار ہے۔

تاج پیامی صاحب بگڑ گئے کہ ابھی تو کلیم الدین صاحب لکھ چکے ہیں کہ حالی تو بہت اچھا PROSE WRITER تھا تو پھر اس کی شاعری کی زبان PROSAIC کیسے ہو گئی۔ چونکہ انگریزی زبان ہی سے تاج صاحب حوالہ دیتے ہیں تو میں کہوں گا یہ ویسے ہی ممکن ہے جیسے کہ WORDS-WORTH نے اپنی نظموں پر جو PREFACE لکھا ہے وہ بہت اچھی PROSE WRITING کا نمونہ ہے۔ مگر اپنی نظموں میں بہت جگہ اس نے بدترین PROSE لکھا ہے۔ جیسے PETERBELL میں اور WORDSWORTH میں EXCURISION میں SEVSE OF HUMOUR بالکل نہیں تھا۔ برخلاف اس کے BERNERD SHOW جس نے اپنے ڈرامے PROSE میں لکھے ہیں اتنا WITTY تھا اور اس میں اتنا زیادہ SEVSE OF HUMOUR تھا اور الفاظ کے اتار چڑھاؤ پر اس کو اتنا کنٹرول تھا کہ اس کے بہت سے کریکٹر گھنٹوں بولتے چلے جاتے ہیں۔ مگر طبیعت بالکل نہیں اکتاتی۔ ملاحظہ ہو ہیرو کی SPEECH عالم وجود میں یا عالم خواب میں MAN AND SUPERMAN ڈرامے میں یا مذہبی لیڈروں کا DISCUSSION جون آف آرک کی روح کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لئے اس کے ڈرامہ JOAN OF ARC میں۔

مشکل تو یہ ہے کہ تاج پیامی صاحب اردو کی میں کہہ گئے کہ کلیم الدین احمد صاحب کا مطالعہ عمیق نہیں۔ مگر استاد محترم کو انہوں نے شاید سمجھا ہی نہیں ہے۔ وہ ان کے سامنے زانوئے ادب برسوں تہہ کریں گے تو شاید انگریزی ادب کچھ کچھ سمجھنے لگیں گے۔

تاج پیامی صاحب نے عنوان تو رکھا تھا "کلیم الدین صاحب کی تنقید تخریبی ہے"۔ مگر انہوں نے بے سر پیر کی CHARAETER ASSASINA-TION شروع کر دی کلیم صاحب انگریزی زبان میں شاعری نہیں کرتے کلیم صاحب نے انگریزی میں ناول نہیں لکھے ایک کتاب لکھی ہے۔ PSYCHO ANALYSIS AND LITERARY CRITICISIM جسے شاید تاج پیامی صاحب نے نہ پڑھی ہے اور نہ سمجھی ہے۔ اور نہ وہ سمجھ سکیں گے (جیسا کہ میں نے اوپر لکھا یہ کتاب یقیناً I.A. RECHRDS کی کتاب PRINCIPLES OF LITERARY CRITICSIM سے ماخوذ ہے۔ تاج پیامی صاحب کہتے ہیں کہ کلیم الدین صاحب کی دوسری کتاب LUCRETUIS پر ہے۔ جس پر GRESSLY DULL چسپاں ہے۔ اور ان کی SNOB ANGLICAN LITERATUX

میں اہمیں نام نہیں۔ یہ سب لکھنے سے کیا فائدہ ؟ شاعری اور
ناول نگاری ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اور ان سب باتوں
سے کلیم صاحب کی ادب و تنقید سے کیا واسطہ ؟

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے۔
تم ہی بتاؤ کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

تنقید تعمیری ہے کہ تخریبی اس کی بحث ہی فضول ہے
تنقید بہرحال تنقید ہے۔ الٹی پڑے یا سیدھی پڑے، تاج
پیامی صاحب کو جاننا چاہیئے کہ تخریب میں بھی تعمیری پہلو پوشیدہ
رہتا ہے کہ تنقید صحیح ہے کہ غلط، موضوع تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ
نہ کہ کسی مقصد کا پہلو لئے ہوئے، ہاں یہ ٹھیک ہے کہ تصویر کا دو رُخ
رُخ سامنے آنا چاہیئے۔ BALANCED CRITICISM
کا معیار سامنے رہے۔ شاعری کیا ہے؟ ادب کیا ہے؟ تنقید
کیا ہے؟ آرٹ کیا ہے؟ یہ سوالات وہ ہیں جن کا خاطر خواہ
جواب معلوم نہیں۔ اردو ادب میں ان پر قلم اٹھانا مشکل ہے
یہاں تو نہ کوئی ادیب ہے اور نہ کوئی فلسفی ہے، نہ کوئی آرٹسٹ
ہے اور نہ CRITIC ہے اور نہ CRITICISM کی
زبان ہے۔ ابھی تو مغرب سے استفادہ کرنا ہی ہوگا۔ پدرم سلطان
بود کہنے سے کام نہیں چلے گا۔

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تاج پیامی صاحب کے لکھنے کا انداز منطقی نہیں۔
وہ لکھتے ہیں کہ کلیم الدین صاحب نے GALSWORTHY
کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ناقد صرف ایک لالٹین ہے۔ جس کی
روشنی میں اچھی بری چیزیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ جس سے
تکلیف ہوتی ہے مگر اس میں لالٹین کی روشنی کا یا لالٹین بردار
کا کیا قصور۔ اب سنئے تاج پیامی صاحب کو تو پہلا عندیہ آملے
کہ یہ GALOSWRTHY کو تھا اور حجت انہوں نے
لکھ دیا۔ کہ چونکہ F.R. LEAVIS صاحب نے
THE GREAT کو اپنی کتاب GALSWORTHY
TRADITION میں کوئی مقام نہیں دیا ہے۔
اس لئے وہ کوئی بڑا ناول نگار نہیں ہے۔ اس لئے اس کی
بات کا کوئی وزن نہیں۔ اگر وہ GALSWORTHY
کا ناول FOR.SYTE SAGA پڑھے ہوئے
ہوتے تو وہ شاید ایسا نہیں کہتے۔ مگر پڑھنا شاید مشکل امر تھا
چونکہ یہ ناول چھ ناولوں کا ایک مجموعہ ہے۔ جس میں تسلسل
ہے۔ یہ پورے معاشرے کی تصویر ہے۔ VICTORIAN
AGE کی تہذیب کو EDWARDIAN AGE
دھکا دیتا ہے۔ اور پھر EDWARDIAN AGE
کو GEORGIAN AGE کا دھکا لگتا ہے۔ جس
سے پرانی تہذیب کا شیرازہ بالکل بکھر جاتا ہے۔ خیالات،
محسوسات، جذبات، MORALITY, IDEAS
مذہب سبھی پر موجودہ زمانہ کی افراتفری پھیل جاتی ہے۔ یہاں
تک کہ ناول نگار نے جس تہذیب کی ہنسی اڑائی تھی۔ اسی کو
یاد کر کے وہ کف افسوس ملتا ہے۔ یہ بہت جارح ناول
SEQUENCE ہے۔ J.U.SOARTHY
کے ڈرامے جیسے JUSTICE SILVER BOX،
LOYALTIES، STRIFE بہت جاندار ہیں
میں تاج پیامی سے کہوں گا کہ وہ GALSWORTHY
کا کارنامہ پہلے پڑھیں یا کم سے کم A.C. WARD
کا TWENTIETH CENTURY LITERA
TURE پڑھیں تب وہ کہیں کہ GALSWORTHY
کا تذکرہ کافی نہیں ہے۔

تاج پیامی صاحب دعویٰ کی دلیل میں یہ کہتے ہیں
کہ F.R. LEAVIS یا THOMAS LOVE
PEACOCK نے رومانی شاعری کو غلط ٹھہرایا ہے
اس لئے وہ غلط ہے یہ بھی کوئی تک ہوئی۔ پہلے وہ خود

سمجھنے کی کوشش کریں۔ ورنہ آفتاب کو چراغ دکھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ غور و فکر تو وہ خود نہیں کرتے۔ انگریز سے اور انگریزی ناقدوں سے وہ خود بدرجہ اتم [illegible] ہیں صرف انگریزی لکھنے والوں کا وہ بڑا بڑا اقتباس دیتے ہیں اتنا کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی کی کتاب لکھ رہے ہیں۔ نہ کہ اردو کی۔ مگر جوان کا زاویہ نگاہ ہے۔ وہ بالکل غلط ہے اور جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ بھی غلط۔ یہاں تک کہ وہ کلیم صاحب سے تو کم بگڑے ہوئے ہیں۔ مگر انگریزی ادب سے بالکل نالاں ہیں۔ خاص کر انگریزی شاعری سے۔ اسی سے پتہ لگا لیں غلط یا صحیح جو باتیں انہوں نے لکھی ہیں۔ ان کو وہ انگریزی رائٹرز کے حوالے سے لکھا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے کہ کیا لکھ رہے ہیں۔ انگریزی علم و ادب اثر عالم گیر ہے۔ چونکہ انگریزی زبان ہیں اس دور میں علم و ادب کا خزانہ ہے۔ اور یہ زبان خود عالم گیر ہے۔ فلسفہ ہو کہ تنقید ہو ادب ہو کہ عمرانیات ہو۔ سائیکالوجی کہ تاریخ ہو۔ سائنس ہو کہ جغرافیہ ہو۔ سیاسیات ہو کہ معاشیات ہو۔ ہم ہوں کہ تاج پیامی ہوں کہ کلیم الدین احمد ہوں۔ انگریزی سے استفادہ تو کرنا ہی ہوگا۔ یہ غلامانہ ذہنیت نہیں انگریز تو یہاں سے ۱۹۴۷ء میں چلے گئے۔ مگر کیا کیجئے گا اپنے پاس سرمایہ ہی کیا ہے۔ انگریزی زبان تو علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ہر ذی علم چاہتا ہے کہ اس کا بچہ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھے۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

انگریزی زبان و ادب کی تاریخ چھ سو برس پرانی ہے جس میں قصہ گو بھی ہیں۔ ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ ناول نگار ہیں۔ افسانہ نویس بھی ہیں۔ شاعر بھی رزمیہ بزمیہ LYRICAL WRITERS ODE WRITER SONNET WRITER CRITIC وغیرہ وغیرہ۔ جن کا پایہ بہت بلند ہے۔ آفتاب پر گرد اڑانے سے کیا فائدہ؟ تاج صاحب نے اتنا توڑا مروڑا ہے کہ شک پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی ادب و تنقید کو انہوں نے سمجھا ہے کہ نہیں میں زیادہ DETAILS میں لکھنا نہیں چاہتا۔ مختصر تو یہ ہے کہ دماغ تو تاج پیامی صاحب کا تخریبی ہے۔ مگر وہ الزام کلیم الدین صاحب پر دھرتے ہیں۔ دو چار باتیں میں لکھ کر ختم کرتا ہوں۔

ایک عنوان ہے "اردو شاعری پر فارسی شاعری کی کورانہ تقلید کا الزام" اور تاج صاحب لکھتے ہیں کہ انگریزی شاعری خود تقلید پر مبنی ہے۔ اور اس میں کوئی مستقل روایت نہیں ہے۔ اور پھر لکھتے ہیں کہ فارسی شاعری پر عربی ادب کا اثر پڑا۔ اور خاص کر غزل کا مصرعہ سب سے پہلے عربی میں پیدا ہوا۔ ثابت کیا ہوا؟ خدا معلوم یہ کون نہیں جانتا کہ انگریزی ادب پر LATIN GRCEK SHAMSH STALAN FRCVEH GIRNAN بہت سی زبانوں کا اثر پڑا ہے۔ اس میں خرابی کیا ہوئی OBJECTION تو صرف لفظ کورانہ پر کرنا تھا۔ نہ کہ تقلید پر۔ انگریزی زبان نے بہت کچھ لیا تو بہت کچھ دنیا کو دیا بھی۔ انگریزی زبان میں کیا ہوا اس کی بات کرنا ہی بیکار ہے۔ آپ کو انگریزی زبان سے اتنی ہی نفرت ہے۔ پھر کوئی وزنی بات کرنے کے لئے انگریزی ہی سے رجوع کیوں کرتے ہیں؟

ایک عنوان ہے سنار، اس کے تحت بھی بے سر پیر کی باتیں لکھ ڈالیں ہیں۔ MILTON کی زبان خراب تھی۔ یا فردوسی کی زبان اچھی ہے۔ کیا ایک میں بھی کسی نے سند مانگ دی تھی۔ انگریزی زبان میں کوئی روایت نہیں۔ انگریزی زبان چوپٹ ہے۔ بے ہودہ

بکواس ہے۔ جس کو نفس مضمون سے کوئی واسطہ نہیں۔
سند نے زبان کی نشوونما میں مدد کی یہ اور بات ہے۔
مگر سند کا حاصل ہے۔ دیوان الف سے ی تک۔ جس
میں رطب و یابس بھرا ہوا ہے۔ اور اگر اقبال اس سند
کے چکر میں رہتا تو اقبال اقبال نہ ہوتا۔ اور اردو ادب
اس کی غزلوں اور نظموں سے محروم رہتی۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ طریقہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوئے سامری تو قتیل شیوہ آذری

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے!
ہائے کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کا امام

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

یہ صحیح ہے کہ غالب اردو زبان کا مایہ ناز شاعر
ہے مگر سند والوں کے زمانہ میں غالب کا کوئی مقام نہ تھا
وہ نالاں تھے کہ

زبان میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھے یا خدا سمجھے

غالب کی شاعری MEDITATIVE ہے
REFLECTIVE ہے اور انٹلکچول ہے۔ اور وہ
CONTROLLED EMOTION سے کام لیتے تھے
سند والے ان کی کیا قدر کرتے۔ ان کی شاعری کا عروج
تو ماڈرن زمانے میں ہوا۔ جب انگریزی داں طبقہ نے علم
و ادب کی امامت اختیار کی۔ سند کے اعتراض پر خفگی کی
کیا ضرورت ہے۔

ایک عنوان ہے۔ انسان اور ماحول۔ اور فاضل
مصنف اپنی جغرافیہ دانی کا پورا ثبوت دیا ہے۔ ہوا، پانی
پہاڑ، ندی، صحرا، شادابی، تعلیم و تربیت کا اثر ہوتا ہی
ہے۔ کلیم صاحب کا مطلب وہ نہیں جو تاج پیامی صاحب
سمجھے ہوئے ہیں۔ ایک ہی ماحول میں ہزاروں پلتے ہیں۔ مگر
سب کی طبیعت یکساں نہیں ہوتی۔ اور ماحول سے کوئی شاعر
ادیب، فلاسفر، ڈراما اسٹیٹ نہیں ہوتا۔ فن کار کی ذات
بھی اہمیت رکھتی ہے۔ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں THE
MAN AND MOVEMENT MUST COM
BINE

ایک عنوان ہے ادب اور معاشرہ کلیم صاحب نے
کہا غزل فارسی سے اردو ادب میں آئی۔ جیسے قصیدہ اور دوسری
صنفیں، یہ محض اردو شعرا کی تن آسانی تھی۔ جس نے آسان
ترین صنف کو اپنایا۔ اور تاج صاحب جواب دیتے ہیں کہ
غزل اور قصیدہ قطعی ایرانی نژاد نہیں۔ ایرانیوں نے عربی ادب
سے غزل اور قصیدہ اخذ کیا ہے۔ یعنی سوال کچھ اور جواب کچھ۔
یہ کون نہیں جانتا کہ پٹھانوں اور مغلوں نے قریب چھ سو
برس تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اور ان کے دربار
کی اور رؤسا کی زبان فارسی تھی۔ اردو شاعری فارسی
شاعری کی تقلید میں ہے۔ اور یہ ہندوستان کی برج بھاشا
اور فارسی کے سنگم سے پیدا ہوئی۔ اس کی گرامر دیسی ہے
مگر اس کے اسما عربی و فارسی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے
کہ فارسی زبان پر عربی کا اثر تھا۔ مسلم تہذیب پر عربی زبان
کا اثر تو ہے۔ مگر عربی کبھی ہندوستانی مسلمان کی یا ایرانی
مسلمان کی زبان نہ تھی۔ سوال تو یہ ہے کہ اردو شعرا نے
غزل اپنایا۔ مگر قصیدہ نہیں۔ لہٰذا قصیدہ زیادہ مشکل

ART تھا۔ اس سے کوئی مطلب نہیں کہ غزل گوئی کے لئے ہی کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ غزل لکھنا قصیدہ لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ بشرطیکہ غزل غزل ہو۔ قافیہ بیجا نہیں۔ غزل میں سادگی ہے مگر پرکاری ہے۔ قصیدہ میں تصنع ہے۔ غزل PURE POITRY ہے۔ قصیدہ ORNATE POETRY ہے۔ غالب نے سچ کہا ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی۔

تاج پیامی صاحب نے مفہوم کو سمجھا نہیں۔ یہ کون کہتا ہے کہ معاشرہ کا اثر نہیں پڑتا۔ بڑے بڑے انگریزی ناقدوں کے قول کے حوالہ سے کیا فائدہ۔ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی مشہور زمانہ کتابوں کو کلیم صاحب نہیں جانتے میں تاج پیامی صاحب کے INFORMATION کے لئے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ BASIL WILLEY نے کوئی کتاب NINETENTH CENTURY BACK GROUND نہیں لکھی ہے۔ NINETEENTH CENTURY STUDIES اور MORE NINE TEENTH CENTRY STUDIES اور مزید یہ کہ BORIS FORD نے PELICAN سیریز میں جائزہ نہیں لیا ہے وہ اس سیریز کا مصنف نہیں تھا۔ بلکہ مولف تھا۔ اور مختلف دور کا مختلف ناقدوں کا جائزہ لیا ہے BORIS FORD نے صرف GENRAL INTRODUCTION لکھا ہے۔

تاج پیامی نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی بحث بھی بیکار چھیڑی ہے۔ نفس مضمون سے اس دور کا کا بھی واسطہ نہیں۔ ایک عنوان ہے "شاعری یا قافیہ پیمائی"

گیا

کلیم صاحب لکھتے ہیں جہاں اردو شاعری قافیہ پیمائی کا مترادف ٹھہری۔ اسی طرح اردو تنقید الفاظ کے دام میں پھنسی ہے۔ اور تاج پیامی صاحب اول الذکر کے جواب میں کہتے ہیں کہ اردو کا بچہ بچہ شاعری کی حقیقت سے واقف ہے۔ اور استعاروں میں بات کرتا ہے۔ اور استعارہ شاعری کی روح ہے۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ مغرب والے خاص کر انگلستان والے شاعری کی اصلیت اور ماہیت سے واقف نہیں۔ اور ان کا مزاج قطعی شاعرانہ نہیں۔ اور ایشیا والوں کی فطرت میں شاعری رچی بسی ہے۔ SWEEPING ریمارک کے بعد کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ تاج صاحب نے شاعری کو CLIMATIC CONDITION کا پیداوار بنا دیا ہے۔ کہتے ہیں یورپ میں DARK AGE جب ایشیا ادب و تہذیب کا گہوارہ تھا تو اس سے کیا ہوا۔ آج تو یورپ ہی آگے ہے۔ یورپ چاند تک پہونچ چکا ہے۔ اور اب مریخ پر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ پدرم سلطان بود کہنے سے کیا حاصل۔ اور طرہ یہ کہ اپنی مدد میں کس کا حوالہ دیتے ہیں۔ THOMSASLOVE PEACOCK اور ANTI LOMANTIC تھے۔ F. R. LEARIS ایف آر لیوس۔ اور ٹی ایس ایلیٹ کو شاعر مانا ہے۔ مگر آپ تو شکسپیر کو چھوڑ کر کسی کو بھی شاعر نہیں مانتے۔ اور آپ کو پڑھکر تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ سوائے غزل کے آپ شاعری کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ مغرب نے ہومر اور ورجل دانتے، شکسپیر، ملٹن، گیٹے، کو پیدا کیا جن کا مقام بہت اونچا ہے۔ اور وہ غزل گو شاعر نہیں تھے۔ مشرق نے بھی والمیکی، ویاس، تلسی داس، فردوسی وغیرہ کو پیدا کیا۔ والمیکی اور تلسی داس نے رامائن دی۔ تلسی داس نے

شکنتلا بھی دی۔ ویاس نے مہابھارت لکھی۔ جس نے بھگوت
گیتا بھی شامل ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ دیا۔ مولانا روم
نے مثنوی دی۔ اور میر انیس اور دبیر نے مرثیہ گوئی کو فروغ
دیا۔ ان کا کلام غزلوں کا دیوان نہ تھا۔ اقبال بھی اپنی نظموں
کی وجہ سے مشہور ہوا۔ نہ کہ غزلوں کی وجہ سے۔ شکوہ، جواب
شکوہ، شمع اور شاعر، رموز بے خودی اور رموز خودی، خضر
راہ، مسجد قرطبہ، ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ تاج صاحب ثابت
کیا کرنا چاہتے ہیں۔

OHOMAS LOVE PEACOCK کو رومانک
شاعری سے نفرت تھی وہ HELLERNIST تھا۔ اور
صرف اس کے کہہ دینے سے رومانٹک شاعری مردہ
نہیں سمجھی جائے گی۔ اردو کی غزلوں کو آپ کیا کہئے گا۔
یہاں تو طرز نگارش رومانٹک ہے۔ مگر بہت حسین اور شیریں
احتشام حسین کو میں نے گیا کالج میں ایک سالانہ جلسے میں
قریب پچیس سال پہلے بولتے سنا تھا۔ بولتے تھے تو پھول
برستے تھے۔ زبان شیریں تھی اور بیان میں جامعیت تھی
اردو زبان کے ارتقا اور نشو و نما کے بارے میں بول رہے تھے
بڑے بڑے HEAD OF DEPARTMENT
بیٹھے تھے۔ اور انگشت بدنداں تھے اور انہوں نے اقرار کیا
کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ اردو زبان کا مقام اتنا بلند ہے۔
احتشام حسین صاحب کلام حیدری صاحب کے مہمان
تھے۔ اور ڈاکٹر حسین صاحب روتوں کا مشاعرہ بھی پردہ
CENDUCT کیا تھا۔ سبھی لوگوں نے یہ اقرار کیا
کہ اردو زبان کی آبرو احتشام صاحب نے رکھ لی ___
کلیم الدین صاحب کہتے ہیں کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری
ہے۔ تو انہیں کہنے دیجئے۔ جب تک فلمی گانے زندہ ہیں۔
قوالیاں زندہ ہیں۔ اور بڑے بڑے شاعر ہے کے منکر
زندہ ہیں۔ اردو غزل زندہ رہے گی۔ تاج پیامی صاحب کے

اس عنوان سے مجھے اتفاق ہے۔ مگر غزل کی بے اعتدالیوں کا
بھی مجھے اقرار ہے۔ غزل میں رمز و کنایہ ہے۔ داخلیت ہے۔
معنویت ہے۔ اور INTELLCTUALISM
ہے۔ MELODY ہے۔ شیرینیت ہے۔ نغمگی ہے۔
مگر بہت کچھ گندگی بھی اس میں گھس آئی ہے۔ اقبال نے کہا ہے

نمی شود پردۂ چشم پرکاہے گاہے۔
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے
وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے!
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

اچھی غزل کے شعر کی یہ اچھی تعریف ہے۔ مگر خارجی غزل کی تعریف
کرنا بیکار کی بکواس ہے۔ وہ زلف اور خد و خال میں الجھ کر رہ
گئی ہے۔ اور اس کا معیار بہت نیچا ہے۔ ردیف قافیہ پیمائی نہیں
تو اور کیا ہے؟ ایسی غزلوں سے زبان کی صحت قائم رکھنے
میں مدد ضرور ملی۔ مگر اس سے شاعری کی روح غائب ہو گئی
یہ صرف DORM ہی DORM ہے۔ غزل اور نظم دو
مختلف اصناف شاعری ہیں۔ نظم میں داخلیت بھی ہے
اور خارجیت بھی۔ اچھی غزل میں داخلیت ہی داخلیت ہے۔
یہ بھی ماننا پڑے گا کہ غالب کی جو غزلیں زیادہ مشہور ہوئیں
ان میں ربط و تسلسل ہے۔ جیسے یہ غزلیں جن کا مصرعہ اول
درج ذیل ہیں ؎

(۱) مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
(۲) آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
(۳) نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
(۴) دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
(۵) منظور ہے گزارش احوال واقعی!

یہ غزلیں زیادہ کامیاب ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں
ایک ہی خیال کا DEVELO MENT نہیں پھر
بھی ایک ہی طرح کے خیالات کا تسلسل ہے۔ اور ایک

ہم نغمگی ہے ۔ اور ہم آہنگی ہے یعنی اشعار ایک PLAN میں ہیں ۔ کلیم الدین احمد صاحب نے شاید چونکا دینے والا جملہ لکھ دیا کہ شاعری جو غلط راستے پر جا رہی تھی ۔ وہ صحیح راستے پر آجائے اور غالب کا جو شکوہ ہے (COMPLAINT) ہے سو

پر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

وہ دور ہو جائے ۔

بہت سی جگہوں پر تاج پیامی صاحب بالکل بہک گئے ہیں ۔ ان کا یہ نظریہ کہ ہر شعر تعریف کے قابل ہے چونکہ وہ ایک علامتی ہے ۔ اور ایک خیال کو پیش کرتا ہے وہ غلط ہے ۔ ان کا یہ کہنا کہ مغرب والے غزل نہیں کہتے ۔ اس لئے وہ شاعر نہیں یہ بھی غلط ہے ۔ اور یہ کہنا کہ غزل کا ایک مصرعہ کسی کے پورے شعری کارنامے پر بھاری پڑتا ہے ۔ بکواس ہی بکواس ہے ۔ یہ تنقید نہیں ہے بلکہ وہ شاعری کر رہے ہیں جس میں تعلّی جائز نہیں سو

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

گیٹے نے مغرب کا سلام لکھا ۔ اور ڈاکٹر اقبال نے اس کے جواب میں پیام مشرق لکھا دونوں ہی عظیم شاعر تھے کشادہ دل تھے اور کشادہ نظر تھے ۔

تاج پیامی صاحب کی ایک انوکھی تنقید ہے لکھتے ہیں کہ استاد محترم تخیل دانا پوری صاحب نے بائبل کا بغور مطالعہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے بارے میں بائبل میں پیش گوئی ہے ۔ جسے عیسائی نہیں مانتے ۔ یہاں تک تو خیر ۔ تاج پیامی صاحب کہتے ہیں کہ چونکہ عیسائی اس پیشن گوئی کو نہیں مانتے ۔ اور دانتے ایک متعصب عیسائی تھا جس نے رسول اللہ اور حضرت علی کی شان میں گستاخی کی ہے ۔ اس لئے وہ شاعر نہیں تھا ۔ یہ نیا معیار شاعری ہے یہ کون نہیں جانتا کہ MEDI-EVAL AGE میں عیسائی CROSS AND CRESCENT کے CRUSADES کو نہیں بھولے تھے اور وہ اسلام سے متعصب تھے ۔ دانتے بھی اپنے عہد کا اور ماحول کا پروردہ تھا ۔ اور اس لئے وہ متعصب تھا اس نے اپنے سارے دشمنوں کو جہنم میں دکھلایا تھا ۔ کارلائل نے HERO AS A PROPHET میں رسول اللہؐ کو بھی دکھلایا ہے ۔ انیسویں صدی میں بھی ان کی تعریف کرنے کے باوجود وہ تعصب سے خالی نہیں تھا ۔ وہ مسلمان نہ تھے ۔ اور تاج پیامی صاحب شاعری کو پرکھ رہے ہیں ۔ نہ کہ مذہب کو ۔ اور کسی شاعر کے کلام پر مذہب کے نقطۂ نگاہ سے تبصرہ کرنا بے سود ہے ۔

ایک جگہ تو تاج پیامی صاحب نے اور کمال کر دیا اور لکھ دیا کہ چونکہ قرآن کے ایک ہی سورہ میں مختلف مضامین آجاتے ہیں اور مسلمانوں کو قرآن سے '' DIRECT واسطہ رہا ہے ۔ اس لئے اس کی غزل کی اسٹائل پر یہ پڑا ۔ ہم صرف یہ کہیں گے کہ واللہ اعلم بالصواب

تاج صاحب انگریزی شاعری پر انگریزی تنقید میں COMMENT کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ MAC-BETH نے اپنی بیوی کی موت پر اظہار افسوس نہیں کیا ۔ یہ انسانی فطرت کے خلاف تھا ۔ وہ نہیں سمجھتے کہ خون کے دریا میں نہانے کے بعد MACBETH اس STAGE پر پہونچ گیا تھا کہ زندگی اور موت دونوں اس کے نزدیک برابر تھے ۔ اور اس میں انسانیت باقی نہ نہیں رہی تھی ۔ وہ DESPARATE ہو گیا تھا ۔ اور جو سطور تاج صاحب نے نوٹ کئے ہیں ۔ وہ غم و غصہ کی تصویر ہے ۔ اور دنیا سے بیزاری کی وہ بہت اعلیٰ درجہ کی شاعری اور کردار نگاری ہے ۔

تاج پیامی صاحب کو غصہ ہے کہ KING LEAR میں شاہزادیوں کو شکسپیر نے آوارہ اور بد تماش دکھایا ہے۔ شکسپیر ڈرامہ لکھ رہا تھا کوئی BOOK OF SAINTS نہیں اور تاج پیامی صاحب اپنا وقت کیوں برباد کرتے ہیں اور وہ انگریزی شاعری اور ڈرامہ نگاری پر کیوں لکھتے ہیں۔ نہ وہ ان کا موضوع ہے۔ نہ اس کی روح سے ان کو واقفیت ہے۔ ہم تو یہی کہیں گے کہ

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔
فیضان محبت عام تو ملے عرفان محبت عام نہیں

تاج پیامی صاحب نے ENGLISH LANGUAGE کی مختصر تاریخ اور دہلی اسکول، اور لکھنو اسکول، اور عظیم آباد کی شاعری کے بارے میں اور مختلف ممالک کی تہذیبوں کے بارے میں لکھا ہے۔ جو بہت خوب ہے مگر موضوع سے ہٹ کر۔ وہ انگریزی نظم نگاری، ڈرامہ نگاری یا انگریزی تہذیب و تمدن سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر لطف تو یہ ہے کہ جب بھی وہ کوئی بات وزن دار کہتے ہیں۔ تو وہ انگریزی ناقدوں یا انگریزی لکھنے والوں کی مدد لیتے ہیں۔

تاج پیامی صاحب نے کتاب لکھنے میں دو تین سال بہت محنت کی ہے۔ اور جانفشانی سے کام لیا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ انہوں نے بہت سی کام کی باتیں لکھی ہیں۔ اور ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ اور غزل سے ان کو والہانہ محبت ہے۔ مگر افسوس اس کا ہے کہ اس کتاب سے غم و غصہ ٹپکتا ہے۔ اور یہ کتاب ایک انتقامی جذبے کے تحت لکھی گئی ہے۔ میری مراد استاد محترم کی ذات سے نہیں ہے۔ بلکہ ان کی اردو شاعری اور اردو ادب پر تنقید نگاری سے ہے۔ استاد محترم سے مودبانہ سوال

کیا جا سکتا ہے کہ جب آپ کو اردو ادب اور اردو شاعری میں کچھ جان نظر ہی نہ آئی تھی۔ پھر آپ نے اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کیا۔ یہ تو معلوم ہے کہ اردو ادب کا سرمایہ عالمی نقطۂ نگاہ سے بہت کم تر و حقیر ہے۔ اور ابھی اس کی عمر ہی کیا ہوئی ہے۔ اس نے ہومر اور برنارڈ شا نہیں پیدا کیا۔ ہومر اور ورجل نہیں پیدا کیا۔ دانتے اور گیٹے نہیں پیدا کیا۔ کیٹس اور شیلی نہیں پیدا کیا۔ اور نہ فردوسی و حافظ اور نہ کوئی ٹرانا ولٹ ڈکنس ہارڈی، ٹالسٹائے۔ CONRAD جارج ایلیٹ گالزوردی نہیں پیدا کیا میتھو آرنلڈ اور ٹی ایس ایلیٹ کے پائے کا کوئی نقاد نہیں پیدا کیا۔ اور نہ موپاساں اور چیخوف کی طرح کوئی افسانہ نویس۔ مگر پھر بھی اردو ادب نے شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی کو تو پیدا کیا۔ اس نے میر مومن، غالب اور اقبال پیدا کیا۔ اس نے مجاز، فیض احمد فیض، اور شاد عظیم آبادی کو پیدا کیا۔ اس نے میر انیس اور میر دبیر پیدا کیا۔ اس نے جوش ملیح آبادی اور جگر مراد آبادی پیدا کیا۔ اس نے عبدالرزاق ملیح آبادی، اور عبدالماجد دریا آبادی اور حیات اللہ انصاری پیدا کیا اس نے مرزا فرحت اللہ بیگ اور نیاز فتح پوری پیدا کیا اس نے آل احمد سرور، اور سید احتشام حسین اور پروفیسر کلیم الدین احمد پیدا کیا۔

اردو کبھی کسی حکومت کی زبان نہ رہی مگر یہ پھر ہر دلعزیزی کی وجہ سے زندہ ہے۔ اور اس میں پھلنے و پھولنے کی بہت گنجائش ہے۔ عالمی علم و ادب کا پایہ بہت بلند ہے۔ اور اس کے نقطہ نظر انگریزی یا انگریزی کے ناقدوں سے پہونچا ہے۔ اردو تنقید نگاری میں صاف صاف بیان کرنا اور سمجھانا مشکل ہے کیونکہ اردو علم و ادب نہ اس پایہ تک پہونچا ہے۔ نہ تنقید کی زبان اتنی پختہ

احمد یوسف

قتل گاہ

ان دنوں یہ بکائین کا درخت جو سامنے نظر آ رہا ہے۔ سرسبز و شاداب تھا۔ چڑے چڑیوں کا مسکن۔ اور بندروں کی پناہ گاہ۔

صبح اٹھتے تو کوئے گھنے درخت پر بیٹھے کائیں کائیں کرتے دکھائی دیتے۔ مینائیں ادھر سے ادھر پھدکتی رہتیں۔ اور پھر کام سے نکل جاتیں۔ ٹیں ٹیں کرتے ہوئے طوطے اپنی شوخ رنگت کے سبب گرے سبز پتوں میں بھی نمایاں رہتے پھر دن دوپہر میں بھاری بھرکم پر۔ وں کے ساتھ چیلیں بھی آتیں اور وہ اس طرح اپنے پر سمیٹ کر کسی اونچی شاخ پر بیٹھ رہتیں کہ لگتا پورے درخت پر چھا گئی ہیں۔ اور اب وہ درخت ان کی مملکت ہے۔

بندر قافلوں میں آتے اور ان کے آنے کا مخصوص موسم ہوتا۔ کسی نے کہا موسم کوئی خاص نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جب وہ پورب سے ہنکائے جاتے ہیں۔ تو پچھم کی طرف بھاگتے ہیں۔ اور جب وہ پچھم سے ہنکائے جاتے ہیں تو پورب کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ پورب اور پچھم کی بات میں نے یوں کی کہ اتر جانب ایک چوڑی سڑک تھی۔ اور اس سے پرے ایک دریا بہتا تھا۔ اور دکھن جانب غریبوں کی بستیاں تھیں۔ جہاں انہیں دیکھتے ہی لاٹھی ڈنڈے نکلنے لگتے۔

یہ درخت ایک ایسے زمین کے ٹکڑے پر تھا۔ جہاں مشکل سے تین چار پائیاں بچھ سکتی تھیں۔ واقف کار حلقوں کا کہنا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ زمین ایک خدا ترس لوہے کے بیوپاری کی تھی۔ جس نے یہاں کنواں کھدوا دیا تھا۔ اس کنویں سے محلے ٹولے کے غریب لوگ جن کے اپنے گھروں میں کنویں نہیں تھے۔ پانی لیتے اور لوہے کے بیوپاری کو دعائیں دیتے تھے کنویں سے متصل ایک بنئے کا گھر اور اس کی دکان تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بنئے اپنی دوکان میں ایک ڈول رکھا کرتا تھا اور اگر کوئی دور سے تھکا ہارا مسافر کنویں پر اپنی پیاس بجھانے آتا تو بنیا اسے ڈول دیتا اور ساتھ میں ایک مٹھی چنا بھی یہ کہہ کر دیتا کہ دور سے آئے ہو پہلے کچھ کھا لو تب پانی پینا

ایک زمانے بعد شہر کے ہر گلی کوچے میں سرکاری نل لگ گئے۔ اور کنویں کا استعمال دفتہ رفتہ ختم ہو گیا

اب لوہے کی بیوپاری اور بنئے کی چوتھی پشتیں چل رہی تھیں۔ اور زمانہ یکسر بدل چکا تھا۔

ہم لوگوں کے ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے ہی وہ کنواں پاٹا جا چکا تھا۔ اسے بنئے کے بیٹوں نے پٹوایا یا پوتوں نے پٹوایا یہ ایک اعلیٰ تحقیق کا مسئلہ تھا کہ ہم لوگوں نے جو دیکھا تو یہ دیکھا کہ جہاں کنواں ہونے کی روایت تھی وہاں ایک ہرا بھرا بلند قامت بکائین کا درخت کھڑا تھا۔

پھر بنئے کے پڑپوتوں نے دیوار کھڑی کر کے زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے پر سڑک کی راہ بند کر دی ۔ اب تنہا ایک بکائین کا درخت تھا جو اس کنوئیں کی نشانی بن کر رہ گیا تھا ۔!

لوہے کے بیوپاری کی ہر پشت نے اس کی دولت میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کیا تھا ۔ بہتیرے مکانات، زمینیں، دوکانیں، آڑھتیں، مارکیٹ اور سینما گھر اس کے پوتوں اور پڑپوتوں کی ملکیت تھی ۔ ایسے میں ان تین چارپائیوں کے برابر زمین کے ٹکڑے کی کسے فکر تھی ۔ اور اگر کسی کو فکر بھی ہو تو یہ مسئلہ تھا کہ بے شمار پوتوں اور پڑپوتوں میں یہ زمین بانٹی کس طرح جائے ۔ اور بالفرض محال اس حقیر سی شئے کے بٹوارے کا کوئی فارمولا بھی وہ لوگ دریافت کر لیتے ۔ تو سوال یہ تھا کہ بنئے کے پوتوں اور پڑپوتوں کو جو ایک عرصے سے اسے اپنے قبضے میں رکھے ہوئے تھے ۔ بے دخل کیسے کیا جا سکتا تھا ۔

یہ سلسلہ ایک عرصے سے چل رہا تھا ۔ کہ ایک دن میونسپل کارپوریشن کا ایک انسپکٹر آیا ۔ اور اس نے بنئے کے ایک پڑپوتے سے زمین کے کاغذات مانگے ۔ اسے تو دراصل کچھ گرم گرم کاغذوں کی ضرورت تھی ۔ لیکن ہوا یہ کہ بنئے کے ایک نوجوان پڑپوتے نے جس کا خون نوٹوں سے بھی زیادہ گرم تھا ۔ اسے کچھ الٹی سیدھی سنا دیا ۔

نتیجہ یہ نکلا کہ کارپوریشن نے ان پر ایک کیس کر دیا ۔ کیس یہ تھا کہ یہ زمین کارپوریشن کی ہے ۔ اور بنئے کے خاندان والے اس پر زبردستی قابض ہیں ۔

ادھر بنئے کے پڑپوتوں نے زمین کے پرانے کاغذات دفتر سے نکلوائے جن پر لوہے کے بیوپاری کا نام چڑھا تھا اس سے ان کا کیس مضبوط ہو گیا ۔

ہر سال پت جھڑ کا موسم آتا تو بکائین کے سوکھے پتے میرے گھر کی چھت اور آنگن میں بھر جاتے ۔ پھر جب آندھیاں چلتیں تو اس کی پتلی پتلی شاخیں گھر میں آ گرتیں ۔ لیکن عورتیں انہیں ایندھن کے طور پر استعمال کرنے سے پرہیز کرتیں کہ ان سے سارے میں بڑی ناگوار سی بو پھیل جاتی تھی ۔

ایک سال جب پت جھڑ کے بعد بکائین میں نئے پتے نہیں آئے ۔ اور درخت ننگا ہی رہا ۔ تو ہمیں سخت حیرت ہوئی ۔ تب ہی ایک دن میرے بچے نے مجھ سے بڑی رازدارانہ لہجے میں کہا کہ چھوٹے بھائی راجیو نے درخت کی جڑ میں دو بوتل تیزاب ڈال دیا تھا ۔ تب یہ بات سمجھ میں آئی کہ درخت نے اس سال نیا لباس کیوں نہیں بدلا تھا ۔ اور اس طرح بے ستری کے عالم میں کھڑا تھا کہ لگتا تھا شرم سے زمین میں گڑ جائے گا ۔

زمین کو تو وہ گھیر ہی چکے تھے ۔ اب اگر یہ بکائین کا درخت بھی ختم ہو جاتا تو وہ اطمینان سے وہاں ایک کمرہ بنوا سکتے تھے ۔

جس میں کبھی بنئے کی دکان تھی ۔ اس میں اس کے ایک پڑپوتے نے لندن ڈرائی کلینرس کے نام سے ڈرائی کلینرس کی دوکان کھول لی تھی ۔ اس سے چھوٹا راجیو تھا جو اس کے برابر میونسپل کارپوریشن کے نالے پر لکڑی کا کھوکھا لگا کر چائے کی دوکان کھولے بیٹھا تھا ۔ اور لندن ڈرائی کلینرز کے جواب میں اس نے اس کا نام نیو یارک ٹی شاپ رکھا تھا ۔

ان کے دو بھائی اور تھے ۔ ایک دور کسی شہر کے کالج میں لکچرر تھا ۔ اور اپنے ایک بھائی کو دھوبی، دوسرے کو چائے والا، اور تیسرے کو تانگے والا کہا کرتا تھا ۔ اور ان کے یہاں بس کبھی کبھار مرنے جینے میں آ جاتا ۔ اور وہ بھی اس طرح گو اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے ۔

ہاں تانگے والے کا ذکر کر چکا ہوں ۔ لیکن اس کے

متعلق یہ بتانا بھول گیا۔ کہ وہ بھی اتفاقاً کسی تقریب میں ہی دکھائی دے جاتا تھا۔ دراصل وہ رات گئے عقبی دروازے سے گھر میں وہ داخل ہوتا تھا۔ دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ وہ روز چڑھا کر آتا اور چپکے سے کھانا کر سو جاتا۔ محلے والوں کو اس کی یہ عادت پسند تھی۔ پھر علی الصباح سواریوں کے چکر میں وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا۔ تانگے کہیں اور رکھتا تھا۔

گھر میں دو بھاوجیں اور ایک کنواری بہن پدما تھی۔

اور شور شرابہ آہ و بکا اور گالی گلوچ نیو پارک ٹی شاپ کے راجیو کے دم سے تھا۔ جب وہ چیخ پکار شروع کرتا تو لگتا کہ گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔ بس ایک جگہ کھڑی گھوں گھوں کر رہی ہے۔

یہ پدما کی بچی..... سب لوگ اسی کا ساتھ دیتے ہیں

پدما بھی جواب دینے میں نہیں چوکتی۔ لیکن اگر راجیو کی آواز سے گھوں گھوں کا شور اٹھتا، تو پدما کا جواب ریں ریں بن جاتا۔

سب ہم ہی کو دیکھتے ہیں۔ ہم ہی سے دشمنی ہے۔

اس کے بعد یہ محسوس ہوتا کہ راجیو ایک لمبے ڈگ بھرنے کی بجائے ایک ساتھ کئی ایک لمبے ڈگ بھر رہا ہے۔ تب ہی اس کی گالیوں میں ماں بہن، بیٹی سبھوں کی شرکت ہو جاتی۔

گھر میں ایک کمرہ نیچے تھا۔ اور ایک اوپر۔ ایک بڑا سا کچا آنگن تھا۔ کنارے ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا۔ اور آم اور امرود کے درخت تھے۔

گرمی کے دنوں میں رات کے وقت چار پائیاں آنگن میں نکل آتیں۔ لیکن سردی اور برسات کے دنوں میں صرف دو کمروں میں اتنے لوگ جن میں دو شادی شدہ جوڑے بھی تھے۔ کس طرح رات بسر کرتے تھے یہ بات کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

سے گھر کی عورتوں اور بچوں کو اس دیوار کی توسط سے جو مسئلہ اور ان کے درمیان کھڑی تھی۔ وقتاً فوقتاً کچھ باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ جیسے یہ کہ راجیو اس زمین کے چھوٹے ٹکڑے پر کمرہ بنانا چاہتا تھا لیکن ابھی درخت باقی ہے

گھر میں صرف دو ہی کنوارے تھے۔ راجیو اور پدما۔ دونوں اس کمرے کے حقدار تھے۔ جو ابھی صرف ان کے خیالوں میں بسا تھا۔

ماں باپ مر چکے تھے۔ راجیو کہتا ـــــ پدما کا یہاں کیا حق ہے۔ وہ اپنے گھر جائے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ پدما کا ابھی کوئی گھر نہیں تھا۔

پدما کی شادی کیونکر ہو گی۔ اور کون کرائے گا۔ اس کی کسی کو فکر نہیں تھی۔

لکھی بھائی اکثر لندن ڈرائی کلینرس کو خط لکھتا ـــــ تم لوگ سخت ناکارے ہو۔ پدما کا رشتہ کیوں نہیں ڈھونڈتے میں کچھ مدد کر دوں گا۔

لیکن کچھ مدد سے کام کب چلتا ہے۔ یوں کچھ مدد تو تانگے ماسٹر بھی کر دیتا جو کہتا تھا کہ میں ایک مہینہ آدھے پر گزارا کر لوں گا۔ اور اس طرح بچی ہوئی رقم پدما کی شادی کے لئے دے دوں گا۔ لندن ڈرائی کلینرس بھی تھوڑی مدد کرنے کو کہتا تھا۔ بس ایک اکیلا راجیو تھا۔ جس نے کبھی کسی وعدے کا روگ نہیں پالا ـــــ بلکہ وہ تو ـــــ

یہ پدما کی بچی کیا ساری زندگی یہیں رہے گی ـــــ گھوں گھوں۔ اور پھر اس کے کل پرسان حال کو ماں بہن کی گالیاں۔

ادھر اس کے جواب میں پدما کہتی ـــــ دیکھو راجیو بھیا سمجھا دیتی ہوں۔ ریں ریں۔

اب سویرے درخت پر اکا دکا طوطے آ کر بیٹھ جاتے تو لگتا کہ درخت کے مردہ جسم پر دو چار پتے نکل آئے ہیں۔

لیکن جلد ہی طوطے اڑ جاتے۔ کیونکہ یہ درخت کہاں تھا۔ یہ تو اس کا کھنڈر تھا۔ اور کھنڈر سے تو الوؤں کو ہی دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ویسے الوؤں کا ایک جوڑا اکثر سر شام اس اجاڑ درخت پر دیکھا گیا تھا۔

کوے آتے دو چار ثانیے۔ کائیں کائیں کر کے کسی اور طرف نکل جاتے۔ مینائیں آتیں اور آپس میں کچھ سہمی سی چوں چوں کے بعد اڑ جاتیں۔ اکثر گلہریاں بھی اس کے پہاڑ جیسے ننگے جسم پر گھومتی پھرتی دکھائی دیتیں۔ چیلیں بھی کبھی کبھی آ کر خاموشی سے بیٹھ رہتیں۔

کچھ دنوں سے اکثر دو چار گدھ بھی درخت کی بلندیوں پر دیکھے گئے تھے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا کہ ہو نہ ہو درخت کا خون انہوں نے ہی چوسا ہو گا۔

رات کے اندھیرے میں یہ گمان ہوتا کہ کوئی سیاہ فام عفریت ننگ دھڑنگ ہمارے سروں پر کھڑا ہے۔

ایک دن درخت پر ایک شاہین نظر آیا۔ اسی اثنا دو ایک کوے بھی کہیں کہیں سے کائیں کائیں کرتے درخت پر آ بیٹھے۔ لیکن شاہین پرغرور انداز میں بیٹھا رہا۔ ان کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ میرے ذہن میں اچانک ایک شعر آ گیا۔ تب ہی کہیں سے کبوتر کا ایک جوڑا ادھر آ نکلا۔ انہیں دیکھتے ہی شاہین کے تن میں شرارے دوڑ گئے۔ اور چشم زدن میں اس نے ان کے تعاقب میں اڑان بھری۔ کبوتر بھی اس خطرے سے آگاہ ہو گئے۔ اور انہوں نے بڑی تیزی سے اپنی اڑان کی سمت بدل دی۔ میں نے سوچا جسے شب و روز جھپٹنے ہی کی فکر دامن گیر رہتی ہو۔ وہ آشیانہ کیا خاک بنائے گا۔

پہلے جب درخت پر پتنگیں پھنستی تھیں۔ تو وہ کئی کئی دنوں تک پتوں کے درمیان محفوظ رہتیں۔ لیکن اب دو تین دنوں میں ہی پھٹ پھٹا جاتیں۔ اور طرف ان کی کانپ شاخوں پر جھولتی دکھائی دیتیں۔

ایک دن میرے یہاں ایک صاحب نے بکائن کے اس ننگے درخت کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔ زمانے کو بھی ثبات نہیں۔ کیا ہرا بھرا درخت تھا۔ اب تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔

اتنے ہی میں راجو کی گھوں گھوں گونجی۔

سن لو گھر والو جب یہ کرہ ——

اس طور پر جیسے وہ اعلان کر رہا ہو۔

سن لو دنیا والو میں اس سوکھے درخت کی جڑ میں پھر ایک بار دو بوتل تیزاب ڈال رہا ہوں۔ اب کبھی بھی اس کے جسم پر بہار نہیں آئے گی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ...

●●

بقیہ: کون ہے؟

اس نے آبادی سے کچھ دوری پر رک کر کہا —— میں تمہارے چہرے پر ایک نشان بار بار دیکھ رہا ہوں —— میں ریگستان کی روح ہوں۔ اور اپنے پرندے کی تلاش میں مصروف ہوں —— لیکن تم نے میرے غم کا مداوا نہیں کیا۔ اسی لئے شناخت و تعارف کی دیوار جوں کی توں قائم ہے۔

اور پھر وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا صحرا کی وسعتوں میں ڈوب گیا۔

میں خود کو سمیٹتا ہوا قدموں کے نشان کے سہارے واپس آیا۔ لیکن اس کی آواز میرے کانوں میں اب بھی گونج رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے صحرا چیخ رہا ہے۔ ریگزار کے ایک ایک ذرے میں انتظار کی چنگاری روشن ہے۔ ●●

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

درد کا رشتہ

وہ دونوں جس جگہ چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے وہاں بہت گہرا اندھیرا تھا۔ یوں تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا لیکن باہر کے مقابلے میں اندر زیادہ تاریکی تھی۔ وہ دونوں نہ جانے کتنی دیر سے وہاں چھپے بیٹھے تھے۔ مگر ان دونوں میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ اس لئے ان دونوں میں کون وہاں پہلے آیا تھا۔ اور کون بعد میں۔ یہ بھی بتانا مشکل تھا۔

ایک غیر آباد و خستہ مکان کے ایک کمرے میں جس کے دروازہ پر قفل لگا ہوا تھا۔ اور ایک کھڑکی ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ دونوں کھڑکی کے راستے سے اندر داخل ہوئے تھے

۔ اور دیوار سے لگے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے۔ جس جگہ یہ مکان واقع تھا۔ اس کے آس پاس کوئی دوسرا مکان نہیں تھا۔ سامنے ایک بڑا سا میدان تھا۔ دائیں اور بائیں طرف دور تک دھان کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ مکان کے پیچھے ایک بڑا سا تالاب تھا۔ اور اس مکان کا پچھلا دروازہ تالاب کے کنارے پر کھلتا تھا۔ کھڑکی کے سامنے ایک بڑا سا آم کا پیڑ تھا جس کی شاخیں مکان کی چھت پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اور اسی وجہ سے کمرے میں پھیلی ہوئی تاریکی اور بھی گہری ہو گئی تھی۔

اندر باہر ہر طرف تاریکیوں کی ایک وسیع چادر پھیلی ہوئی تھی۔ اور گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی جب ہوا کے جھونکے چلتے اور آم کی شاخیں جھومنے لگتیں۔ اور پتوں سے ٹکراتی ہوئی ہوائیں سسکیاں بھرنے لگتیں تو وہ دونوں بے چین ہو جاتے۔ کسی انجانے خوف سے سہم جاتے اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کرتے اور کان کھڑے کرکے ان سسکیوں کو غور سے سننے کی کوشش کرتے۔ پھر جب پتے ساکت ہو جاتے اور سسکیاں بھرتی ہوئی ہوائیں رک جاتیں۔ اور رات کا سکوت خوفناک ہو جاتا تو وہ دونوں تاریکی اور سناٹے کے احساس کو کم کرنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیتے۔ لیکن جب آنکھیں بند کئے کئے ان کے پپوٹے دکھنے لگتے یا دھان کے کھیت میں کوئی گیدڑ چیخنے لگتا تو خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، حلق میں کانٹے چبھنے لگتے۔ اور جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا اور وہ جلدی سے اپنی آنکھیں کھول کر اندھیرے کی سرا تلاس کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن اندھیرا اتنا گھنا تھا کہ انہیں کچھ بھی نظر نہ آتا۔ چونکہ اس اندھیرے میں ان کے لئے وقت کا تعین کرنا مشکل تھا۔ اس لئے صبح کے انتظار میں وہ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیتے۔ مگر ان کا دل دیر تک دھڑکتا رہتا۔ اور ہر لمحہ کسی ناگہانی خطرہ کا دھڑکا لگا رہتا۔

وہ دونوں دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ پھر جو شخص کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ زخموں میں اٹھتی ہوئی درد کی ٹیسوں کی تاب نہ لا کر غیر ارادی طور پر دھیرے دھیرے کراہنے لگا۔ اور اس کی آواز نحیف و کمزور ہونے کے باوجود ایک گونج

بن کر کمرے میں پھیل گئی

دوسرا شخص جو دوسرے کونے میں بیٹھا ہوا تھا اس کے کراہنے کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ اور کسی انجانے خوف سے بری طرح سہم اٹھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اسے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اس کمرے میں اس کے سوا کوئی دوسرا بھی موجود ہے۔ اس احساس سے وہ بری طرح گھبرا گیا۔ دوسرا کون تھا۔ اس تاریکی میں اس کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل تھا۔ لیکن اس کے کراہنے کی آواز سے اس نے اندازہ لگایا۔ کہ وہ بھی شاید اسی طرح زخمی ہے۔ جو اب تک خوف کی وجہ سے خاموش تھا۔ اور اب تکلیف کی شدت سے بے تاب ہو کر کراہنے لگا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اسے اپنے زخمی ہاتھوں میں بھی درد کی ٹیسیں نیزے کی انی کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ پھر بھی وہ ضبط کئے بیٹھا رہا۔

چند لمحوں تک وہ اپنی سانسیں روکے ہوئے اس کے کراہنے کی آوازوں کو سنتا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ اس کا واہمہ نہیں۔ بلکہ حقیقت ہے اور یہ کہ اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی موجود ہے۔ جو اسی کی طرح زخمی بھی ہے۔ تو اس نے خوف سے سہمی ہوئی آواز میں دھیرے سے پوچھا ـــــ کون ہے؟ ـــــ کون ہے وہاں؟

پہلے نے خطرے کا احساس کر کے کراہنا بند کر دیا اب اسے بھی احساس ہوا کہ اس کمرے میں وہ تنہا نہیں تھا۔

چند لمحوں تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ اور دونوں اپنی اپنی سانسیں روکے رہے۔ سہمے سہمے ہوئے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ اور اپنی مدافعت کے بارے میں سوچتے رہے۔

پھر دوسرے کو اچانک خیال آیا کہ جو شخص کراہ رہا ہے وہ بھی تو اسی کی طرح زخمی ہے۔ اس سے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ ممکن ہے وہ بھی اپنی جان بچانے کے لئے یہاں چھپا بیٹھا ہو۔ پھر تو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اس خیال سے اسے قدرے اطمینان ہوا۔ اور ساتھ اس کے دل میں اس شخص کے لئے ہمدردی کا جذبہ ابھر آیا۔

کیا تم زخمی ہو؟ اب کے دوسرے نے بڑی نرمی سے پوچھا!

لیکن پہلے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بولتے کیوں نہیں۔ دوسرے نے قدرے رک کر پوچھا ڈرو نہیں میں تمہارا دوست ہوں۔ دشمن نہیں۔ دوسرے کے لہجے میں ہمدردی بھی تھی اور یگانگت بھی۔

پہلا بے حد خوف زدہ تھا۔ اور اس کا تھکا ہوا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ پھر بھی دوسرے کے لہجے میں کوئی بات ایسی ضرور تھی کہ اس نے دوسرے پر بھروسہ کر لیا ـ!

ہاں! پہلے نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔ میرے دونوں پاؤں زخمی ہیں۔ لیکن .... لیکن تم کون ہو؟

میں ..... میں تمہاری ہی طرح زخمی ہوں دوسرے نے جواب دیا ـــــ میرے دونوں ہاتھ زخمی ہیں۔

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

پھر دوسرے نے پوچھا۔ تم کس جگہ سے بول رہے ہو؟

پہلا پھر خاموش ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کے اس سوال کا جواب دے یا نہ دے۔ اور اس کے دل میں بے بنیاد شکوک پیدا ہونے لگے۔

کمرے میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر دوسرے نے قدرے توقف کے بعد پوچھا ـــــ تم بولتے کیوں نہیں۔ بولو نا! کمرے میں کہاں پر بیٹھے ہو؟

کھڑکی کے قریب پہلے نے جواب دیا

دوسرے نے غور سے کھڑکی کے قریب دیکھا۔ لیکن

اسے اندھیرے کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اور خوش ہوتے ہوئے بولا ——— اندھیرے میں تو آدمی آنکھ رکھ کر بھی اندھا بن جاتا ہے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ تم نہ جانے کب سے میرے اتنے قریب بیٹھے ہو۔ اور مجھے خبر ہی نہ تھی۔

آہستہ بولو۔ پہلے نے اسے ٹوکتے ہوئے سرگوشی کی۔ اگر دشمنوں کو خبر ہو گئی کہ ہم یہاں چھپ کر بیٹھے ہیں تو پھر ہمارا یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔

تم ٹھیک کہتے ہو دوسرے نے جواب دیا۔ وہ لوگ تو بھیڑیے کی طرح بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔

گرچہ یہ جگہ آبادی سے بہت دور ہے پہلے نے پھر سرگوشی کی ——— مگر ان لوگوں کا کوئی ٹھیک تو نہیں۔

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ پھر دوسرے نے کہا ——— سچ تو یہ ہے کہ تمہیں پا کر مجھے بڑی ڈھارس ہو رہی ہے۔ ورنہ تنہائی اور اندھیرے کے احساس سے میری تو جان بھی نکلی جا رہی تھی۔

یہاں اندھیرا ہی تو ہمارا محافظ ہے۔ پھر تم اندھیرے سے کیوں ڈرتے ہو! پہلے نے پوچھا۔

دوسرا اس کے سوال پر الجھ گیا۔ اور جب وہ کوئی جواب نہ دے سکا تو پہلے نے کہا ——— مجھے تو ڈر نہیں لگتا۔

دوسرے نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا تو پہلے نے کہا ——— اندھیرے میں چھپ کر ہم ان خطروں اور تباہیوں سے محفوظ ہو گئے ہیں جو آبادیوں کے اجالے میں مچی ہوئی ہے میں سوچتا ہوں اجالے نے ہمیں کیا دیا۔؟ اجالا ہمارے کس کام کا جو انسان کو انسان سے دشمنی کرنا سکھاتا ہے اور ایک دوسرے کو گولیوں سے زخمی کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ تم ہی بتاؤ ایسی روشنی ہمارے کس کام کی ہے؟

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ دوسرا پھر بھی خاموش رہا۔

فرض کرو اگر ابھی اندھیرا چھٹ جائے اور روشنی ہو جائے تو جانتے ہو کیا ہو گا؟

دوسرے نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ تو پہلا بولا ——— ہم دشمنوں کی نگاہوں میں آ جائیں گے اور گولیوں کا نشانہ بنا دیئے جائیں گے۔

وہ تو ٹھیک ہے۔ اب کے دوسرے نے جواب دیا ——— لیکن یہ اندھیرا کب تک ہمیں اپنی پناہ میں رکھ سکتا ہے۔؟ رات تو بہرحال ختم ہو جائے گی۔ صبح ہو گی تو روشنی بھی پھیلے گی پھر کیا کرو گے۔؟

پہلا سوچ میں پڑ گیا۔ اور جب وہ کوئی جواب نہ دے سکا تو دوسرے نے کہا ——— اس اندھیرے میں ہم اسی لئے تو چھپ کر بیٹھے ہیں۔ کہ تاریکی میں چلتے ہوئے کہیں بھٹک نہ جائیں۔ دشمنوں کے علاقے میں کہیں چلے نہ جائیں۔ اور دھر لئے جائیں یا ہلاک کر دیئے جائیں۔ ورنہ مجھے یا تمہیں یہاں پناہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا ہمیں صبح کا انتظار نہیں؟ صبح سے پہلے ہم یہاں سے نکل کر اپنے علاقوں اور اپنے لوگوں میں کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔؟ روشنی دوست اور دشمن کو پہچاننے کا موقع بھی تو فراہم کرتی ہے۔ منزل کا پتہ بھی تو دیتی ہے۔

شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ پہلا لاجواب ہو کر بولا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے کراہنے لگا۔

کیا تمہیں بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔؟ دوسرے نے پوچھا۔

ہاں میرے دونوں پاؤں گولیوں سے چھلنی ہیں ان میں مسلسل درد کی ٹیس ابھر رہی ہے۔ پہلے نے جواب

دیا ـــــ حالانکہ میں نے زخموں پر پٹیاں بھی باندھ رکھی ہیں۔
پھر قدرے رک کر اس نے پوچھا ـــــ تمہارا کیا حال
ہے۔؟

میرے بھی دونوں ہاتھ گولیوں سے زخمی ہیں۔ دوسرے
نے جواب دیا۔ ان میں درد کی شدت سے چبھن ہو رہی ہے

پہلے نے اندھیرے میں ٹٹول کر دوسرے کا ہاتھ
اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور درد کی شدت سے اس کی ہلکی
سی چیخ نکل گئی۔

تمہارے ہاتھ تو خون سے تر ہیں۔ پہلے نے حیرت
سے کہا ـــــ تم تھوڑا سا اور میرے قریب کھسک آؤ۔
اور میں خون صاف کر کے تمہارے ہاتھوں پر پٹیاں باندھ
دوں۔ شاید اس سے درد میں کچھ کمی ہو جائے۔

پٹیوں کے لئے کپڑا کہاں سے لاؤ گے؟ دوسرے
نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

میں نے اپنی قمیص پھاڑ کر اپنے زخموں پر پٹیاں باندھی
تھیں۔ اس کی کچھ دھجیاں بچ رہی ہیں۔ پہلے نے جواب دیا
جب پہلا ہمدردی اور پیار کے جذبے سے دوسرے
کے ہاتھوں پر پٹیاں باندھنے لگا۔ تو دوسرے نے پوچھا!
جب تمہارے دونوں پاؤں گولیوں سے چھلنی ہیں۔
تو تم اتنی اونچی کھڑکی پھلانگ کر اس کمرے میں کیسے آئے؟

اس کے اس سوال پر پہلا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
پتہ نہیں کیسے آ گیا۔ مجھے تو کچھ یاد ہی نہیں۔ مگر.....مگر
تمہارے بھی تو دونوں ہاتھ زخمی ہیں۔ تم کیسے آئے؟

میں.......میں .... دوسرا بھی سوچ میں
پڑ گیا ـــــ واقعی میں کیسے آ گیا؟ مجھے تو کچھ یاد نہیں۔

پہلے کے ہاتھ پٹیاں باندھتے باندھتے رک گئے۔
وہ قدرے متفکر ہو کر بولا ـــــ یہ تو بہت برا ہوا۔ اب
ہم دونوں اس اونچی کھڑکی کو پھلانگ کر کمرے سے باہر
کس طرح نکلیں گے

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ کمرے میں دیر تک
خاموشی چھائی رہی۔

پھر دوسرے نے قدرے خوش ہو کر کہا ـــــ
ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔

وہ کیا؟ پہلے نے پراشتیاق لہجے میں پوچھا۔
میں تمہیں اپنی پیٹھ پر لاد کر کھڑکی پر بٹھا دوں گا
دوسرے نے جواب دیا ـــــ پھر تم مجھے شانوں سے
پکڑ کر کھڑکی پر چڑھنے میں میری مدد کرو گے۔ اور جب میں
کھڑکی کی دوسری جانب چلا جاؤں گا۔ تم میری پیٹھ پر
سوار ہو کر نیچے اتر جاؤ گے۔ یوں ہم دونوں اس کمرے سے
باہر نکل جائیں گے۔

وہ دونوں پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے
تمہاری ترکیب بڑی اچھی ہے۔ پہلے نے بڑے
دکھ کے ساتھ کہا ـــــ لیکن اس کے بعد۔؟

اس کے بعد کیا؟ دوسرے نے پیار سے پہلے کو
ڈانٹا ـــــ میں تمہیں اپنی پیٹھ پر لاد کر ہسپتال پہنچا
دوں گا۔ وہاں سے علاج کے بعد تم اپنے گھر چلے جاؤ گے۔

گھر چلا جاؤں گا۔؟ پہلے نے بے یقینی کے لہجے میں
پوچھا۔ اور اس کی آواز یوں سنائی دی۔ جیسے وہ کسی
غار کے اندر سے بول رہا ہو۔

ہاں! ہاں! گھر چلے جاؤ گے۔ دوسرے نے جواب دیا
لیکن میرا تو کوئی گھر نہیں۔ پہلے نے کہا۔
کیا مطلب؟ دوسرے نے تعجب سے پوچھا۔

جب میں اپنے گاؤں سے فرار ہوا تھا۔ تو میرے
خاندان کے تمام افراد قتل کر دیئے گئے تھے۔ اور میرے
گھر میں آگ لگی ہوئی تھی۔ پہلے نے کھوئے ہوئے لہجے میں
جواب دیا۔ بھاگتے ہوئے میں دور تک اپنے مکان، جو

اٹھتے ہوئے شعلوں کو مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ اب تک تو وہ آگ ٹھنڈی بھی ہو چکی ہوگی۔

دوسرا خاموش رہا اس نے مزید کچھ نہ کہا۔

پھر ہوا کے جھونکے چلتے رہے۔ آم کی شاخیں ڈولتی رہیں۔ اور پتوں سے ٹکراتی ہوئی سسکیاں بھرتی رہیں۔

تو پہلے نے کہا ـــــ دیکھ رہے ہو ہوائیں بھی ہمارے حال پر ماتم کناں ہیں۔

دوسرے نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

کیا بات ہے؟ پہلے نے پوچھا۔ تم خاموش کیوں ہو گئے بولتے کیوں نہیں۔؟

میں سوچ رہا ہوں کہ ہم دونوں کے حالات یکساں ہیں۔ دوسرے نے بڑی افسردگی سے جواب دیا۔ گھر تو میرا بھی نہیں۔

کیوں؟ تمہارے گھر کو کیا ہوا۔؟ پہلے نے پوچھا

وہی جو تمہارے گھر کے ساتھ ہوا۔ دوسرے نے جواب دیا ـــــ فرق صرف اتنا ہے کہ دشمنوں نے تمہارے خاندان کے افراد کو قتل کر کے گھر میں آگ لگا دی۔ اور میری بوڑھی ماں، بھائیوں کو ایک قطار میں کھڑے کر کے گولی مار دی۔ اور میرے گھر کو مسمار کر کے زمین تک کھود ڈالی۔ میں کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن تعاقب کرتی ہوئی گولیوں نے دونوں ہاتھ چھلنی کر دیئے۔

ہماری یہ کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ ماں، بھائیوں اور بہنوں کی لاشوں کو کاندھا بھی نہ دے سکے۔ دوسرے کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

اس کے بعد ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ دیر تک ان دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی بات نہ کی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے ہوئے اپنے افراد خاندان کی ناگہانی موت کا ماتم کر رہے ہوں۔ یا شاید گزرے ہوئے واقعات کو یاد کر کے شدت غم سے ان کا دل بھر آیا ہو۔ ان کا گلا رندھ گیا ہو۔ یا اب ان کے پاس کہنے کو کچھ بھی باقی نہ رہ گیا ہو۔

پھر رات کے سناٹے میں دور سے بم پھٹنے کی آوازیں آئیں اور گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں ـــــ تڑتڑتڑ تڑتڑتڑ تڑتڑتڑ۔ مسلسل گولیاں چلتی رہیں۔ اور وہ دونوں کسی انجانے خوف سے سہمے ہوئے ایک دوسرے کے جسم سے لگے ہوئے بیٹھے رہے۔

سن رہے ہو۔؟ دیر تک خاموش رہنے کے بعد پہلے نے سرگوشی کی ـــــ موت کا کھیل اب بھی جاری ہے جانے ان کی خون کی پیاس کب بجھے گی۔ دوسرے نے جواب دیا ـــــ نہ جانے انسانوں کا یہ خون ناحق کب تک ہوتا رہے گا۔

آج تو یہ رات بھی ہزاروں سال کی مدت تک پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے کی آواز میں گھبراہٹ تھی ـــــ ختم ہوتی ہی نہیں۔

صبح کے انتظار میں اب میری قوت برداشت بھی جواب دے رہی ہے۔ دوسرے کی آواز میں بیزاری تھی ـــــ آخر صبح کیوں نہیں ہوتی۔؟

اس سوال کا جواب دونوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔ اس لئے وہ پھر خاموش ہو گئے۔

پھر ان دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ رات کا سکوت بدستور قائم رہا۔ چاروں طرف خوفناک اندھیرے کا سایہ منڈلاتا رہا۔ دور سے گولیوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ہوائیں سسکیاں بھرتی رہیں۔ اور وہ دونوں بے حس و حرکت ایک دوسرے کے جسم سے لگے بیٹھے رہے۔ میلوں تک بھاگنے کی وجہ سے اب انہیں بری طرح تھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔ اور جسم سے بہت زیادہ خون

نکل جانے کی باعث نقاہت محسوس ہونے لگی تھی ـــــ اسی عالم میں دونوں پر غنودگی چھاگئی۔

جب پہلے کی آنکھ کھلی تو شبنم کے قطروں سے دھلا ہوا صبح کا چہرہ سورج کی کرنوں سے چمک رہا تھا اور آم کے پیڑ پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کی چہکنے کی آوازیں فضا میں موسیقی کی رس گھول رہی تھیں۔ اب کمرے میں پھیلی ہوئی تاریکی کی جگہ اجالے نے لے لی تھی۔

پہلے نے دیکھا دوسرا اب بھی اس کے بازو میں دیوار سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ اور اس کا سر شانوں کی طرف جھکا ہوا تھا ـــــ کمرے میں پختہ فرش پر ایک جوڑا موزہ پھیلا ہوا تھا۔ اور دھول سے اٹی ہوئی مٹی کی صراحی ایک کونے میں رکھی ہوئی تھی۔ جس کے اوپر ایک شیشے کا گلاس الٹا رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں اور کچھ بھی نہ تھا۔ چھت کے نیچے مکڑیوں نے جال بن رکھا تھا۔ اور دیواروں پر کی ہوئی سفیدی جگہ بہ جگہ سے دھل جانے کے سبب پلستر دکھائی دینے لگا تھا۔

صبح کا روشن چہرہ دیکھ کر پہلے کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے ٹھوکا دے کر دوسرے کو جگاتے ہوئے کہا ـــــ اٹھو صبح ہوگئی۔

دوسرے نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اور حیرت و خوشی کے ملے جلے جذبے سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر چند لمحوں تک چڑیوں کی چہکار سننے کے بعد خوش ہوتے ہوئے بولا ـــــ ارے ہاں واقعی صبح ہوگئی۔

پھر اچانک دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں ـــــ وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ ●●

شمس ندیم

ساتویں سمت کا مسافر

پورا ایک دن
اور پوری ایک رات
وہ سفر میں تھا تب یہاں پہونچا تھا
بھوک کے مارے اس کا جسم بے قابو ہو رہا تھا۔

اس کی دونوں آنکھیں چار آنکھیں بن کر کسی ہوٹل کی تلاش میں تھیں۔ سب سے پہلے پیٹ کی بھٹی میں کچھ جھونکنا ضروری تھا

فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس نے پلیٹ، چمچے کی پیالیوں اور طشتریوں کی آواز کا تعاقب کرتے ہوئے آخر ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ اور ایک میز کے پاس ایک خالی کرسی دیکھ کر بیٹھ گیا۔ کندھے سے اپنا لٹکا ہوا بیگ اتار کر پیروں کے پاس رکھ لیا۔

اس نے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ تمام لوگ ایک مشینی انداز سے خاموشی سے گویا کہ سر جھکائے کچھ کھانے پینے میں مصروف تھے۔ ان کے چہرے سپاٹ اور جھریوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور جذبات کے تاثرات سے بالکل عاری تھے۔ بچے، نوجوان، ادھیڑ، اور بوڑھے اپنی [illegible]مانی ساخت سے پہچانے جا رہے تھے۔ اسے لگا ان کے چہرے پر کوئی انفرادیت نہیں تھی۔ اسے یہ لوگ پسند نہیں آئے۔ ان کے چہروں کی یکسانیت پر اسے حیرت مزید ہوئی لیکن اس نے اپنی حیرت کو ذہن سے اپنے چہرے پر منتقل ہونے کی مہلت نہیں دی۔

وہ اٹھ کر ٹوٹے پھوٹے واش بیسن کے قریب آیا۔ اور اور پاس ہی رکھے ہوئے جگ سے ڈرم سے پانی لے کر اپنے چہرے پر دو چار چھینٹے دیئے۔ پانی نہ ٹھنڈا تھا نہ گرم، چہرے پر پانی کا لمس بھی نہیں محسوس ہوا۔ اور پانی سے بدبو کا ایک بھبھکا اٹھا، اس نے سوچا، یہ کیا؟ یہ کیسا پانی ہے؟ ہو سکتا ہے ادھر کا پانی ہی ایسا ہوتا ہو۔ جب وہ اپنے میز پر واپس آیا۔ تو سامنے پلیٹ میں کھانا رکھا ہوا پایا۔ نیلی نیلی روٹیاں اور سیاہ سالن۔

یہ روٹیاں نیلی کیوں ہیں بھائی، ؟ زہر بھرا ہے کیا؟
اور یہ سیاہ سالن، ؟

تو جناب روٹیاں اور کیسی ہوتی ہیں۔ ہوٹل کے لڑکے نے جواب دیا۔ سالن اور کیسا ہوتا ہے۔ ہوٹل کا لڑکا کھڑا ہو کر اسے گھورنے لگا۔

بھئی واہ! اب میں یہاں آکر روٹی اور سالن کی رنگت بھی بھول گیا ہوں۔؟ کیوں؟ وہ آہستہ سے ہنس پڑا۔ اسے ہنستے دیکھ کر ہوٹل کے لڑکے کے چہرے پر خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور وہ بہت ہی گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

آپ چپ چاپ کھانا کھایئے جناب! ورنہ آپ تو مجھے

سبھی لے ڈوبیں گے۔
اتنا کہہ کر لڑکا اس کے میز کے پاس سے کھسک گیا جیسے وہاں کھڑا رہنا اس کے لئے خطرے سے خالی نہ ہو۔
اسکی ہنسی کی آواز سن کر اس کے مقابل بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کی بے نور سی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور ان کے چہرے پر دھواں سا چھا گیا۔ جو کسی دہشت کی آگ سے اٹھا تھا۔ دونوں چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ جیسے دوسرے ہی لمحے ظہور پذیر ہونے والے کسی المناک حادثے کا سامنا کرنے کی ذہنی تیاری کر رہے ہوں۔
لڑکے! بھئی ایک گلاس پانی تو لاؤ۔
لڑکے نے پانی کا گلاس اٹھایا۔ اور ڈرتے ڈرتے اس کے میز تک گیا۔ گلاس میز پر رکھا۔ تو اس نے مزید کہا میٹھی چیز کھلانے کے لئے کیا ہے۔؟
میٹھی چیز؟ یہ کیا چیز ہوتی ہے؟ لڑکے نے حیرت سے کہا۔ پتہ نہیں آپ کیا مانگتے ہیں۔؟
اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا کہ ہوٹل کی پلیٹیں طشتریاں، پیالیاں، حتیٰ کہ دیواریں تک جھنجھنا اٹھیں۔ اور وہاں بیٹھے تمام لوگوں کی نگاہیں تیر کی طرح اس کے جسم میں چبھنے لگیں۔ مگر اس نے پرواہ نہیں کی۔
میٹھی چیز نہیں جانتے؟ بھئی واہ! ارے کوئی شاہی ٹکڑا، بالوشاہی، شکر پارے، حلوہ، رس گلے وغیرہ ــ ہا ہا ہا۔!!!
لڑکا کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے کھسک گیا۔
وہ آدمی دھیرے دھیرے اپنی جگہ سے اس کے میز کے گرد خالی کرسی پر آکر بیٹھ گئے۔ ایک اور ادھیڑ عمر کا آدمی اپنی کرسی کھینچ کر اس کے میز کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اب اس کے میز کے ارد گرد پانچ آدمی تھے۔ ان کے چہروں کی جھریاں مزید گہری ہو گئی تھیں۔ اور خوف و دہشت سے مارے ان کے چہروں کی زردی سفید ہو رہی تھی۔ وہ پانچوں اسے گھور رہے تھے۔ پانچواں آدمی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔
کیوں بھائی! آپ لوگ مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہیں۔؟ کیا بات ہے۔؟
ہم لوگ یہ دیکھ رہے ہیں کہ تم ہنس رہے ہو۔ ادھیڑ عمر کے شخص نے کہا۔
ہاں! ہنسنے کی بات پہ ہنس رہا ہوں۔
نہیں مت ہنسو۔ بڑی مصیبت نازل ہو گی آفت آجائے گی۔ طوفان اٹھ کھڑا ہو گا۔
پھر اس نے دیکھا ہوٹل کا مالک اس کے میز کے پاس کھڑا گڑگڑا رہا تھا۔
جناب اگر آپ کو ہنسنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کہیں اور جا کر ہنسیئے، ہمیں مصیبت میں نہ ڈالئے۔
ہوٹل کا مالک سہما، گھبرایا، بڑبڑاتا ہوا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔
وہ ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کیسے لوگ ہیں جو ہنسنے سے منع کر رہے ہیں؟ یہ کیسی جگہ ہے جہاں ہنسنا منع ہے؟ اس نے چھ سمتوں کا سفر کیا تھا۔ کہیں بھی ہنسنا منع نہیں۔ تو پھر وہ کونسی سمت میں آگیا تھا۔ کیا وہ ساتویں سمت تھی؟ ساتویں، چھ سمتوں سے بالکل الگ تھلگ!
پھر ہوٹل کے تمام لوگوں نے دیکھا۔
انسپکٹر صاحب! سلام، ہوٹل کے منیجر نے ہڑبڑا کر پیسوں کا دراز بند کیا۔ اور جلدی سے کھڑا ہو کر ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے پولس انسپکٹر کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ جس کے پیچھے کندھے پر رائفل لٹکائے دو کانسٹبل تھے۔
کہاں ہے وہ! انسپکٹر نے اس کے سلام کا جواب دیئے بغیر ہوٹل کے اندر کی طرف دیکھتے ہوئے قدم روکے

دیتے کہا اور اپنے بھاری بوٹوں میں چلتا ہوا ٹھیک اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

پکڑو اٹھا لے کو! انسپکٹر نے کانسٹبلوں سے کہا۔
اور دونوں نے جھپٹ کر اسے دونوں بازوؤں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

انسپکٹر صاحب میں نے کون سا جرم کیا ہے؟

جرم؟ تم یہاں ہنس رہے تھے۔ انسپکٹر نے اتنے زوروں سے کہا کہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں پر جیسے لرزہ طاری ہو گیا

ہنسنا تو ایک قدرتی فعل ہے انسپکٹر صاحب؟

ہو گی۔ تمہیں معلوم نہیں؟ یہاں ہنسنا خلاف قانون ہے جرم ہے۔ اس کے لئے سخت سزا ملتی ہے۔

کمال بات کرتے ہیں انسپکٹر صاحب۔ ہنسنے کی بھی سزا ہوتی ہے۔؟ اور وہ پھر ہنس پڑا۔

شٹ اپ، انسپکٹر پوری قوت سے چیخا، اور پلک جھپکتے ہی کانسٹبل کا رائفل اٹھا کر اس کا کندہ اس کے منہ پر دے مارا۔

دوسرے لمحے

اس نے خون تھوکا۔ تو اس کے ساتھ اس کے چار ٹوٹے ہوئے دانت گر پڑے۔

اٹھاؤ لے چلو اسے۔

دونوں کانسٹبلوں نے بڑی بے رحمی سے اسے اٹھایا اور ہوٹل سے باہر لے جانے لگے۔

پانچویں آدمی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے نہ جانے کہاں سے ایک ہلکی سی چنگاری چمکی۔

انسپکٹر صاحب۔ یہ کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے کہیں سے آنکلا ہے۔ جانے دیجئے۔ چھوڑ دیجئے، اسے ـــ آئندہ ـ

خاموش لڑکے۔ زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ ہنسنے والے کی تائید کرنا بھی خلاف قانون ہے۔؟ تم بھی جانا چاہتے ہو اس کے ساتھ۔؟

پانچواں آدمی نہ صرف سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ بلکہ اس کی آنکھوں کی چنگاری بجھ گئی۔ اور اس کا چہرہ کسی مردے کی طرح بے جان نظر آنے لگا۔ اور پھر ـــــ جیسے اس کا وجود گھٹ کر آدھے سے بھی کم رہ گیا ـــــ یہ ہنسنے والے کی تائید کی سزا تھی

انسپکٹر صاحب! سامنے کے چار دانت ٹوٹ جانے کی وجہ سے اس کی آواز ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی۔ آپ منہ کی ہنسی بند کر سکتے ہیں۔ لیکن دل میں جو ہنسی پھوٹتی ہے اسے کیسے روک سکیں گے؟

میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔ تم سات جنم تک نہیں ہنس سکو گے سمجھے؟

دونوں کانسٹبل اسے گھسیٹتے ہوئے تھانے کی طرف لے جا رہے تھے۔ اور اس کے ہونٹوں کی بچی کھچی مسکراہٹ خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔

●●

بقیہ: صاعقۂ طور

اور رشتہ ہے۔ اردو تنقید کی زبان چاہے تو رومانی ہو جاتی ہے۔ چاہے تو خشک۔ مگر پھر بھی جو کچھ ہے غنیمت ہے۔ اور ماننا پڑے گا کہ اردو ایک مہذب زبان ہے اور اردو زبان اور خاص کر اس کی غزل تعلیم و تربیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ استاذ محترم نے تازیانہ پر تازیانہ لگا کر استاذ محترم نے خواہ مخواہ دشمنی مول لے لی ہے استاذ محترم نے کہا ہے کہ اردو غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے۔ اور صاعقۂ طور اس قول کا دشمنانہ جواب ہے۔ مگر ظاہری تزک و احتشام کے ساتھ سہ

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

رحمٰن حمیدی

کون ہے؟

سیال سونے کی مقناطیسی کشش بھی عجیب ہے۔ سرخ خون سفید ہو جاتا ہے۔ تاکاوہ انسان کی ذات ما فوق الفطرت ہو جاتی ہے۔ انسان حیوان بن جاتا ہے۔ شیطان اور انسان کی کہانی زندہ ہو جاتی ہے۔ انسان کا قلب پتھر کی طرح سخت اور اندھی کی طرح بے رحم ہو جاتا ہے۔ میں بھی سیال سونے کی لالچ میں بے وطنی کی دھرتی پر کود پڑا۔ لیکن میرا قلب پتھر نہ بن سکا۔ وہ ہر آن خویش اقارب کی یاد میں سورج کی طرح لہلہانے لگا۔ رہ رہ کر میں اداس و افسردہ ہو جاتا۔ میرے جیسے پر اضطراب و الم کی کیفیت طاری ہو جاتی مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں انگاروں پر چل رہا ہوں میرے جسم و جان میں آگ ہی آگ ہے میرے دل و دماغ میں آتش فشاں دہک رہا۔ میری حیات کا ایک ایک لمحہ صدی سے زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے میں آب حیات سے اس دھرتی پہ آتا ہوں میں اذیت ناک احساسات سے بچنے کے لئے ہوسٹل سے باہر آیا۔ ریگستان پر چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ ٹھنڈی چاندنی میں نرم نرم ریت پہ چلنے لگا۔ تو یوں محسوس ہوا جیسے میں مخملیں فرش پر چل رہا ہوں اس عمل سے میرے اعصاب پر خوشگوار اثر ہوا۔ میرا دیہی کی ناہموار سطح پر قدموں کے نشانات ثبت کرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ ماہتاب کا پورا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ نیلا آسمان صاف و شفاف تھا۔ صحرا کا حسن بے نقاب تھا۔ اس تنہائی میں صرف میرا سایہ میرے ساتھ ساتھ تھا۔ جو کبھی دراز قد ہو جاتا۔ کبھی میرے ساتھ سمٹ کر محدود ہو جاتا۔ میں اپنے سائے کی رفاقت کی بنیاد پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا میری اضطرابی کیفیت لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہی تھی۔ میرا احساس جمال بیدار ہو رہا تھا لیلیٰ اور مجنوں کی چاہت کے داستان ذہن میں آ رہے تھے لیکن خواب و خیال میں ڈوب رہا تھا ——

معاً حد نگاہ کی دوری پر سیاہ نقطہ متحرک ہوا۔ اور چشم زدن میں دیو قامت ہو گیا۔ وہ بالکل سیاہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک جلی ہوئی لاش زندہ ہو گئی ہے۔ خوف و دہشت کی لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ میں واپسی کے لئے مڑا تو وہ میرے سامنے آ گیا۔ اس کی درد بھری آواز گونجی،

یوں منہ نہ پھیرو، میں بھی تمہاری طرح آگ پر کروٹیں لے رہا ہوں —— !

تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں انگاروں کا شکاری ہوں۔

—— ؟؟

تمہاری رفتار تمہارے سوزش و جلن کی غماز ہے۔

—— اور —— ہم دونوں ایک ہی آتش فشاں کے دو دہانے ہیں —— ؟

کہیں تم صحرا کے رہزن تو نہیں —— ؟!

تشویش کا سانپ لہرایا۔

ہاہاہا ـــــ اب عاد، ثمود، جدلیس، جرہم اور عملیق کی روحیں بھی فنا ہو چکی ہیں۔ اب رہزن کہاں؟ ان افراد کے ساتھ رہزن بھی فنا ہو چکے ہیں۔ تمہارے ذہن میں جو دھرتی ہے یہ وہ دھرتی نہیں ـــــ!

کیا کہا ـــــ؟؟؟ میں چونک پڑا۔

ہاں یہ عرب عاربہ اور عرب مستعربہ کی دھرتی نہیں یہ ابوزید سروجی اور عیسیٰ ابن ہشام کی سرزمین ہے جو نخلستان تو صدیوں پہلے فنا ہو چکا ہے۔ میں اسی کی چاہت میں بھٹک رہا ہوں ـــــ اس کی مسخ شدہ شکل و ہیئت میں نے تیار کی ہے۔ اگر دیکھنا چاہو تو چلو۔

میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ چاند مغرب کی سمت چلا گیا۔ اس نے ببول کی جھاڑیوں کے قریب مجھے روکا اور انگلی کے اشارے سے بتلانے لگا۔

پتھر کا یہ مجسمہ آپ اپنی کہانی بیان کر رہا ہے۔ یہ ایک پیغمبر کی شبیہ ہے۔ ان کے ہاتھ میں استخارہ کے تیر ہیں۔ یہ اس وقت کا ازلام ہے اس کے پہلو میں بھیڑ کا بچہ ایستادہ ہے ـــــ اور ـــــ یہ عرب کے بہادر افراد ہیں جنہیں فنکار نے پتھروں کے جسم میں مقید کر رکھا ہے۔ وقت کے رخسار پر ود، یغوث، یعوق اور نسر اصنام کا نام آج بھی کندہ ہے۔ لیکن دیکھنے والی آنکھیں بصیرت سے محروم ہیں۔ یہ عجب ہے جس پر اونٹ کی قربانی کی جاتی تھی۔ اور ـــــ

اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ اس کے چہرے کی سیاہی اور گہری ہو گئی۔ وہ چند ثانیے خاموش رہا۔ اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی آنکھ سے گرتے آنسو کو دیکھ کر ببول کی ہر شاخ جھک گئی۔ صحرا سوگوار ہو گیا۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو دونوں ہاتھ کے چلو میں جمع کیا۔ اور پی لیا۔ نصف گھنٹے میں اس کی حالت قدرے سدھری تو پھر وہ مخاطب ہوا۔

تو نے عربستان کا پرندہ کہیں دیکھا ـــــ؟

کون سا پرندہ ـــــ؟

سات سو سوراخ والا پرندہ ـــــ؟

میری نگاہ اس پرندے پر ابھی تک نہیں پڑی۔ حالانکہ میں یہاں کئی برسوں سے ہوں۔

ریگستان کا موجود وہی پرندہ ہے۔ اس کی چونچ میں ہیں۔ ہر سوراخ سے الگ الگ مترنم آواز نکلتی ہے۔ وہ اپنے جنس کے اعتبار سے مکمل ہے۔ وہ نر اور مادہ دونوں ایک ہی ہے۔ صحرا اس کی مترنم آواز سے گل گلزار ہوتا ہے۔ جب وہ کیف و سرور میں آتا ہے۔ اس پر وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کا خون جگر مترنم آواز میں جذب ہو جاتا ہے۔ جب یہ مدھر آواز بلند ہوتی ہے۔ تو آگ لگ جاتی ہے۔ گلستاں لہلہا اٹھتے ہیں۔ ہر شئے جل کر خاک ہو جاتی ہے۔ وہ پرندہ بھی اسی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے ـــــ اور ـــــ پھر موسم کی بارش ہوتی ہے۔ تو گلستاں پر ہریالی چھا جاتی ہے۔ سبھی جاندار زندہ ہو جاتے ہیں۔ وہ پرندہ بھی از سر نو زندہ ہو جاتا ہے۔ مجھے موت و زیست کا ہر عمل دل و جان سے زیادہ عزیز تھا ـــــ لیکن ـــــ لیکن ـــــ اب وہ پرندہ کسی دوسرے براعظم کی طرف ہجرت کر چکا ہے۔ اسی لئے موت و زیست کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ صحرا میں وہ آگ صدیوں سے روشن نہیں ہوئی ہے۔ میں اسی آگ کی جستجو میں بھٹک رہا ہوں ـــــ لیکن ـــــ لیکن ـــــ اس نے رک رک کر کہا ـــــ چلو میں تمہیں چھوڑ دوں۔ ورنہ یہ صحرا تمہاری ہڈیاں بھی چاٹ جائے گا مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہو گئی ہے۔

میں خاموشی سے اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا

خورشید حیات

چلتی رکتی گاڑی کے بیچ

چلتی گاڑی کے تجربے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے چلتی ہے۔ اور مسافر اس کے اندر بیٹھا رہتا ہے۔ رفتار سے بے نیاز اپنے معمول میں کھویا ہوا۔ اس وقت اسے باہر کی ہر چیز چلتی دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ خود کو رکا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے جب ترقی کی رفتار بڑھی ہے تو انسان کی رفتار رک گئی ہے۔ مگر انسان اس کے بعد بھی ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ بہر حال ٹرین چل رہی ہے ناول میرے ہاتھ میں ہے۔ اور میں "دائروں کی شکست" میں کھویا ہوا ہوں۔ اچانک گاڑی رکتی ہے اور ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ لوگ تیزی سے اندر داخل ہوتے ہیں۔ افراتفری سی مچ جاتی ہے اور میرا ناول بھی اس بھیڑ میں میرے ہاتھوں سے گر جاتا ہے۔ دائروں کی شکست کا منظر میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور میری خواہش حالیہ حالات نبرد آزما ہو جاتی ہے۔

کشمکش ——— معنی کی تلاش ———

افسردگی ——— جھنجھلاہٹ ——— اور میں ناول ہاتھ میں آجاتا ہے۔ کوئی ایک جملہ سا کس دیتا ہے اتنی بھیڑ میں ناول خوانی چہ خوب بھانت بھانت کی آوازیں ...... سرگوشیاں ——— قہقہے ——— لیکن میرا ذہن ایک نقطہ پر مرکوز۔ کیا نقطہ ہے یہ؟ احساس کی تلاش؟ ...... تجسس کا اضطراب؟ گاڑی کی سیٹی! اور پھر گاڑی چلنے لگتی ہے۔ ماحول پرسکون ہو جاتا ہے۔ شاید کہ رفتار کا مسئلہ حل ہو رہا ہے۔ دنیا گھوم رہی ہے اور انسان ساکت منجمد ہیبت ناک سکوت۔ مگر پیچھے کی طرف مڑ کر کون دیکھتا ہے۔ اتنی فرصت کسے ہے کہ افراد کو دیکھے۔ اور ان کی کشمکش پر غور کرے۔ ابھی میں نے سگریٹ جلائی ہے۔ دھوئیں کا مرغولا چھوڑتا جا رہا ہوں۔ اور میرا ذہن ان سے بنے دائروں پر غور کر رہا ہے۔ دائرے بنتے ہیں پھر ان کی شکل مسخ ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ دھواں فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

خیالات کا لا متناہی سلسلہ جاری ہے۔ کہ اچانک بریک لگ جاتا ہے۔ ایک بیبیہ دید و ا کی آواز مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہٹا کٹا انسان بھیک مانگ رہا ہے تندرست بھی ہے اور توانا بھی۔ پتہ نہیں کونسی شکست سے آشنا ہے۔ پڑھا لکھا دکھائی دیتا ہے شکستگی کا احساس چہرے پر نمایاں ہے۔ شکست و ریخت تو مقدر ہے۔ لیکن یہ فرار؟ ...... نہیں حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے ...... سعی پیہم ...... وہ آگے کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس فرصت نہیں

نہیں ہے کہ میری تعریر سنے۔ میرے ذہن میں اٹھنے والے خیالات کے نئے مرغولے بننے لگتے ہیں۔ ایک مرغولہ دوسرے میں مدغم ہو جاتا ہے۔ دائرے بنتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔

دھواں دھواں دائرے بن رہے ہیں۔ فضائے بسیط میں چہرے کیوں مسخ ہو رہے ہیں؟ پڑھا لکھا تندرست اور توانا آدمی بھیک مانگ رہا ہے؟..:

تہذیب ارتقا پذیر ہے اور ہم......؟

قدریں شکست کھا چکی ہیں۔ نئی قدروں کی تشکیل ہو رہی ہے۔ اب کوئی اپاہج بھیک نہیں مانگے گا اب کوئی نادار بھیک نہیں مانگے گا۔ اب تو ہٹے کٹے بھیک مانگیں گے نئی قدروں کا یہ بڑا تحفہ ہے۔ ہم مہذب ہیں انسانیت عروج پر ہے۔ تہذیب کی گاڑی چل رہی ہے۔ اور ہم...... شاید ہم بھی ترقی کر رہے ہیں...... ہاں یہ ترقی ہی تو ہے......

میرا چہرہ مسخ ہو رہا ہے۔ کس کو فرصت ہے۔ میرے چہرے کو پہچانے، کس کو حاجت ہے کہ ان کھوئی ہوئی قدروں کا ماتم کرے،

کوئی بھیک منگا آتا ہے۔ دستک دیتا ہے اور ناول پڑھنے والوں کی تنقید بھیک منگے کو آگے بڑھا دیتی ہے۔ یہ سلسلہ ہر چلتی ہوئی ٹرین میں جاری رہتا ہے۔ ٹرین چلتی ہی جاتی ہے۔ اسے کیا پتہ اس کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اس کے اندر بیٹھے مسافر کیا کر رہے ہیں گاڑی رکتی ہے۔ مسافروں کا سیلاب آتا ہے اور سکون سے بیٹھے ہوئے لوگوں کو جھٹکے بھی محسوس ہوتے ہیں۔ مگر احساس نہ جانے کہاں کھو گیا ہے۔ ان جھٹکوں کی کوئی مستقل شکل نہیں بن پاتی۔ یہ جھٹکے بھی مرغولے کے مانند مسخ ہو رہے ہیں۔

میں چل رہا ہوں، میں تہذیب یافتہ ہوں۔

میں انسان ہوں۔ میری ادا میری ارتقا کا اعلان ہے اور میرا ہی انداز نئی تہذیب اور نئے اقدار کو جنم دے رہا ہے۔ ان اقدار کے دامن میں کوئی ہٹا کٹا آدمی پڑھ لکھ کر بھیک مانگ رہا ہے۔ ہم عروج پر ہیں۔ قدریں ٹوٹی ہیں۔ نئی قدروں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ قدروں کے شکست و ریخت کا مسئلہ کتنا لامتناہی ہے۔

کرب کی آواز چہار طرف سنائی دے رہی ہے کون ہے جو اس کا مداوا کرے ــــ؟ بیمار کون ہے۔ معالج کون ہے۔ ان داتا کہاں گیا......؟ خداؤں کی خدائی کتنی حسرت ناک ہو گئی ہے۔ مرغولے بنتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔ ناول میرے ہاتھ میں ہے۔ مگر نہ جانے دائروں کی شکست کب ختم ہو گی......؟ ●●

فارم ۴ بابت ملکیت وغیرہ

رول ۸ دیکھیں

۱	مقام اشاعت	بیراگی گیا (بہار)
۲	میعاد اشاعت	ماہانہ
۳	پرنٹر پبلشر و مالک	کلام حیدری
۴	قومیت	ہندوستانی
۵	پتہ	بیراگی گیا (بہار)
۶	ایڈیٹر	لزث ابہ حق
۷	قومیت	ہندوستانی
۸	پتہ	بیراگی گیا (بہار)

میں کلام حیدری مالک ماہنامہ آہنگ اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست ہیں
دستخط:- کلام حیدری

اعجاز عادل

اور وہ دوڑتی رہی

وہ جب ہوش میں آئی تو وہ جیل کی کالی اندھیری کوٹھری، وہی بے رنگ دیواریں، وہی عجیب سی بو ......

آج اسے جیل کی بوڑھی جلاد وارڈن نے بہت پیٹا تھا۔ اس کے کومل جسم پر ڈنڈوں اور لاتوں کے رنگین نشان ابھر آئے تھے۔ مگر درد اسے ان چوٹوں میں نہیں ہو رہا تھا۔ درد تو ایسی جگہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی کو دکھا بھی نہیں سکتی تھی وجہ بس اتنی سی تھی کہ وہ آج جیلر صاحب کے پاس گئی تھی۔ کمپلین کرنے ...... اس لئے نہیں کہ اسے اپنی عزت و عصمت بچانی تھی۔ عزت و عصمت یہ الفاظ اسے بے معنی لگتے تھے۔ ہفتہ میں دو تین بار اس جیل کے جیلر وارڈن کی مدد سے اس کو اپنے کوارٹر میں بلوا لیتا۔ مگر آج وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ کل رات جیلر کے پاس سے واپس لوٹنے کے بعد جیل کے سب سے پرانے اور خطرناک قیدی کلو دادا نے اسے ہڈی کی طرح بھنبھوڑا اور عزت بھی لوٹی۔ یہ عزت پہلی بار لٹی تھی جو کہ عزت نہ تھی۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اسے یاد ہے جب اس کے شرابی گونگا شوہر نے اس کو کنواری لڑکی سے عورت بنایا تھا۔ اس کے خیالوں کی سطح پر اس جاگیر دار کے نوجوان شادی شدہ لڑکے کا چہرہ بھی ابھرا جس نے اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اسے کئی دنوں تک اپنی رکھیل بنا کر رکھا۔ اور ایک بچے کی ماں بھی بنا دیا۔ گونگے شوہر کی واپسی پر اس نے اس پر چوری کا الزام ڈال کے پول کھل جانے کے ڈر سے بے دردی سے پیٹا۔ اور اپنی جاگیر سے نکال باہر کیا۔ اور وہ بے کاری میں بھوکوں مرنے لگا۔ تو وہ اپنے شوہر اور بچے کو چھوڑ کے کام کی تلاش میں جب پہلی بار شہر جا رہی تھی تو ٹرین میں اس سادھو بابا نے بھی اس کی بے بسی اور اکیلے پن کا فائدہ اٹھایا تھا۔ اور شہر میں بے کاری اور بھوک سے بے حال ہوٹل میں چائے پینے گئی تھی۔ جہاں اسے وہ لڑکا ملا تھا جس نے اسے اپنے گھر میں چند دن پناہ دی پھر اس کے عوض اس لڑکے اور لڑکے کے دوستوں کو باری باری خوش کرنا پڑا تھا۔ اور وہ للیتا دیوی جو کہ بڑی اثر و رسوخ والی، شرافت کی پتلی دکھائی دیتی تھی۔ اسے اپنے کوٹھے لے گئی تھی۔ جہاں دوسری کئی لڑکیوں کی طرح اسے بھی ہر روز رات کو جاگ کر مہمانوں کا دل بہلانا پڑتا ــــ اور بے سہارا عورتوں کے لئے جو آشرم سرکاری عورتوں کے لئے چلایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ دن میں مزدوری، سینا پرونا اور رات میں ......؟

جب وہ آشرم چھوڑ کر ایک گھر میں نوکری کرنے لگی۔ تو اس سیٹھ نے بھی تو کئی بار منہ جھٹلایا تھا۔ اور سیٹھانی کو جب پتہ چلا تو جھوٹی چوری کے الزام پر وہ پولس CUSTODY میں دیدی گئی۔ اور پھر وہاں کے حوالات نے بھی اسے رات میں اکیلے نہیں سونے دیا تھا۔ مقدمہ عدالت میں گیا۔ سیٹھ بھیگی بلی بنا خاموش رہا۔ اسے سنٹرل جیل میں جب سے لایا گیا۔ جیلر صاحب تھے۔ پھر کلو دادا۔ اس کے ساتھ اب تک جو بھی ہوا۔ اس نے مجبوری اور غربت کی قیمت سمجھا۔ پر کل رات جو ہوا......

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

دروازہ جیلر صاحب نے ہی کھولا، اور اس کی

غزل

جو نگاہوں سے لب اظہار تک آیا نہیں
آج بھی دل کو وہ پیمان وفا بھولا نہیں
کونسا وہ لمحۂ محشر ہے جو گزرا نہیں
اب مرے امروز کو اندیشۂ فردا نہیں
دل کے ٹکڑوں کو سپرد خاک کر آئے مگر
کاروبار زندگی چلتا رہا ٹھہرا نہیں
میں بھی سرگرم سفر ہوں تو بھی سرگرم سفر
موت سے منزل بدلتی ہے سفر کٹتا نہیں
رات بھر کل رفتگاں سے گفتگو ہوتی رہی
جانے والوں سے دلوں کا معاملہ جاتا نہیں

محمود ایاز

سلطان اختر

غزل

دوری سے نہ تو نزدیک سے پیہم دیکھا
زندگی تیری طرف ہم نے بہت کم دیکھا

گوشے گوشے میں اداسی کی شفق روشن تھی
شہر در شہر عجب قہر کا عالم دیکھا

زندگی ہنس کے بہر طور گزاری ہم نے
آنکھ بھیگی نہ کبھی دامن دل نم دیکھا

یاد آئے ہیں بہت ٹوٹ کے نشتر ان کے
جب کسی زخم کو شرمندۂ مرہم دیکھا

یہ الگ بات کہ غافل نہ رہا ہوں لیکن
میں نے دنیا کو توجہ سے بہت کم دیکھا

خاک اڑتی تھی شب و روز نواح جاں میں
عمر بھر ہم نے یہاں ایک ہی موسم دیکھا!

ایک ویران جزیرہ ہے مرا دل اختر
میں نے اس گھر میں خوشی دیکھی نہ ماتم دیکھا

وفاؔ ملک پوری

غزل

مقتل بنا کے شہر کو کیوں خوش ہیں چند لوگ — کیوں ہو گئے ہیں اتنے اذیت پسند لوگ
زاغ و زغن ہیں اپنے نشیمن میں چین سے — بہرِ عنادل آئے ہیں لے کر کمند لوگ
بندوں کے درمیان ہے دیر و حرم کی جنگ — کتنے خدا پرست ہیں یہ خود پسند لوگ
یہ بھی بدلتی قدروں کا انداز [illegible] ہے — اب زہر کو بھی کہنے لگے ہیں گلقند لوگ
گلشن کا حسن راکھ میں تبدیل ہو گیا — مشعل بدست آئے جو کچھ شر پسند لوگ
اخبار میں ہیں اپنا بیان دے کے مطمئن — کیا فرض آشنا ہیں سیاست پسند لوگ
ہیں راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں کبھی کچھ — باقی ابھی ہیں شہر میں کچھ دردمند لوگ

سمجھائیں ان کو آپ نہ کچھ نیک و بد وفاؔ
ہیں آپ سے زیادہ ہی کچھ ہوشمند لوگ

ظہیر غازیپوری

غزلیں

آئینہ کوئی تتلی اگر دیکھتی
عمر بھر اپنے ہی بال و پر دیکھتی

باز آتی لہو چاٹنے سے اگر
زندگی کوئی شیشے کا گھر دیکھتی

جن حدوں میں بس احساس کا ہے گزر
عقل کیا وہ مقامِ سفر دیکھتی

کاٹ خنجر کی لے کر جو چلتی ہوا
پہلے میرا ہی ویران گھر دیکھتی

تیری آنکھ اگر کھولتی آگہی
پھول کی پتیوں پر شرر دیکھتی

کھلتے ایسے بھی اوراقِ شب ایک دن
ہر نظر اک شگفتہ سحر دیکھتی

دفعتاً مہ نہ جاتی اگر روشنی
تجھکو بے پردہ میری نظر دیکھتی

ایک لڑکی جو میری کہانی میں تھی
جلتی پھرتی کوئی آگ پانی میں تھی

تیری آنکھوں میں کچھ بھی نہ میں پڑھ سکا
نیلی تحریر خود نیلے پانی میں تھی

کیسے مجھکو ہوا منتشر کر گئی
زندگی تو مری پاسبانی میں تھی

پھول بنکر بکھرنے میں جو لطف تھا
ایسی لذت کہاں سخت جانی میں تھی

وہ نظر بھی کہاں معتبر ہو سکی
عمر بھر جو تری میزبانی میں تھی

میرا ہر لفظ آوازِ دل بن گیا
ایسی تاثیر سادہ بیانی میں تھی

صرف عنوان کتابِ محبت میں تھا
ساری تفصیل لفظِ جوانی میں تھی

روشن پٹیالوی

غزل

زیست کے خوابِ پریشاں پہ ہنسی آتی ہے
عارضی ہستیٔ انساں پہ ہنسی آتی ہے

آرزو زادِ سفر اور ہے عزمِ منزل [illegible]
رہروِ عشق کے ساماں پہ ہنسی آتی ہے

جادۂ زیست پہ ظلمت ہے بدستور [illegible]
دل کے ہر داغِ فروزاں پہ ہنسی آتی ہے

ہر کے مختار نظر آتا ہے کتنا مجبور
دورِ جمہور کے انساں پہ ہنسی آتی ہے

دینے والے نے مجھے اتنا دیا ہے ہمدم
اپنی کوتاہیٔ داماں پہ ہنسی آتی ہے

جو فرزانے انہیں عقل سے محروم کیا
عشق کے کارِ نمایاں پہ ہنسی آتی ہے

بے وفائی کی ہے خو، دور دغا کی عادت
خصلتِ حضرتِ انساں پہ ہنسی آتی ہے

خار ہے پہلوئے گل میں تو خزاں [illegible]
ہم کو تنظیمِ گلستاں پہ ہنسی آتی ہے

[illegible] صرصر کے فقط ایک ہی جھونکے سے [illegible]
دل کے اجڑے ہوئے ریتاں پہ ہنسی آتی ہے

غم مقدر میں ہے اور خواہشِ دیدار [illegible]
دلِ ناکام کے ارماں پہ ہنسی آتی ہے

[illegible] اہلِ نظر تھا جو خزاں سے پہلے
اب اسی رنگِ بہاراں پہ ہنسی آتی ہے

دھجیاں کچھ نہ رہیں جوڑ کے [illegible]
دامن و جیب و گریباں پہ ہنسی آتی ہے

[illegible] ہے طبیعت کو سکوں
[illegible] ارماں پہ ہنسی آتی ہے

غزلیں

حنیف کیفی

ایک کرن آئی تھی اب داغ نظر کیوں آئے
میری راتوں کو یہ ضد ہے کہ سحر کیوں آئے
ایک سایہ بھی سر راہ گزر کیوں آئے
دھوپ ہی شرط سفر ہے تو شجر کیوں آئے
کچھ نہیں غم ہمیں خوابوں کے بکھر جانے کا
غم تو یہ ہے کہ ہمیں خواب نظر کیوں آئے
آپ تو ڈھونڈ چلے راستہ اپنے گھر کا
آپ کی [illegible]
سخت [illegible] دیوار گرائیں کمزور
اپنے دیوار [illegible] خبر کیوں آئے
[illegible] راہ [illegible] نظر [illegible] ہے
بے دری پاؤں پڑی ہے کہ کوئی در کیوں آئے
راہ چلتا ہوں بھٹکتے ہوئے دامن اپنے
[illegible] ہمراہ [illegible] گرد [illegible] کیوں آئے
[illegible] نہ آ جائے نظر کیفی
[illegible] ہی میں [illegible] ہے لفظوں میں گہر کیوں آئے

حق اعظمی

تھا یہاں دن کی طرح اب رات ہو جانے کو ہے
بچ کے اپنا جسم، میری ذات ہو جانے کو ہے
فہم سے بالا سہی، محفوظ کر لے ذہن میں
حرف اول کوئی لمبی بات ہو جانے کو ہے
حبس ہوتی جا رہی ہے جانے موسم کی ہوا
کچھ ہوا جبر [illegible] حالات [illegible] جانے کو ہے!
طے نہ ہو پائے کبھی، بے سمت، دھندلے راستے!
ہر قدم پر کیوں ہماری مات ہو جانے کو ہے
شور خاموشی کا آسیبی سماں، تیرہ فضا
شہر گویا جنگلوں کے ساتھ ہو جانے کو ہے
[illegible] سے بچا تو [illegible] میں چھپ گیا
عہد کا اپنے [illegible] ہو جانے کو ہے

یاور امان (بنگلہ دیش)

غزلیں

آنکھوں نے جب سے خواب کے منظر چرا لئے
دل نے تمام عمر کے صدمے اٹھا لئے
نکلے پہن کے ہم جو وفاؤں کا پیرہن
اک بھیڑ ساتھ لگ گئی سنگ جفا لئے
خود کو تلاش کرتے رہے اپنے شہر میں
ٹوٹا سا اپنے ہاتھ میں اک آئینہ لئے
لکھ لکھ کے اپنی اپنی پیشانی پہ سلوٹیں
لوگوں نے اپنی ذات کے کتبے بنا لئے
دل پر ہمارے جب بھی لگی چوٹ کچھ امان
ہونٹوں پہ چند پھول ہنسی کے سجا لئے

موسموں کے دوش پر تشنہ لبی
زہر خوشبوؤں کو پینا ہے ابھی
دے رہا ہے دیکھئے دستک کوئی
کہہ رہی ہے مجھ سے گھر کی خامشی
چھین کر شب کے بدن کا پیرہن
کر گئی دن کو برہنہ روشنی
لمس کے گونگے سفر میں نیم شب
نفس و روح جسم کی وارفتگی
جادۂ ہجرت کا خمیازہ امان
سہمی سہمی سی شکستہ زندگی

خون وفا کے قطرے جو ٹپکے جبین سے
اک شور احتجاج اٹھے گا زمین سے
کچھ وسوسے ہیں ایسے تا گھیرے ہوئے مجھے
میں کوئی بات کہہ نہ سکوں گا یقین سے
رسوائیوں کی دھوپ جو پھیلی ہے شہر میں
سائے پناہ مانگ رہے ہیں مکین سے
قد ناپتے ہیں آج مرے ذہن کا وہی
جتنے رخ و لباس سے فروتر ہیں ذہن سے
دھبے ملیں نہ کیسے مرے قتل کے امان
رشتہ لہو کا اب بھی ہے آستین سے

غزلیں

اکرام الحق اورنگ (بنگلہ دیش)

دور گل آیا، ملا روح کو وجدان وہی!
پھر وہی دست جنوں اور گریبان وہی
راحت جان وہی، درد کا سامان وہی
مجھ سے وابستہ ہے افسانے کا عنوان وہی
مجھ سے نام و پتہ پوچھ رہا تھا میرا
اک زمانے سے تھی جس سے مری پہچان وہی
میں تو دانستہ گریزاں ہوں تری محفل سے
اب بھی پہنچی سی تری تو، مرا ارمان وہی
پہلے صرصر ہی پہ ذمہ تھا زیاں کاری کا
ہے مگر اب کے بہاروں میں ابھی امکان وہی
کر رہا تھا جو مرے خون بہا کا دعویٰ
دینے والا تھا مرے قتل کا فرمان وہی
میں نے جس شخص کو سمجھا تھا مسیحا اپنا
کر گیا ہے مجھے زخموں سے لب جان وہی
جس کے پیکر میں ہر اک وصف تھا پتھر جیسا
دیوتا سب کی نگاہوں میں تھا انسان وہی
ہے ترے باب میں اورنگ جو لوگوں کا خیال
در حقیقت ہے تری ذات کا عرفان وہی

غلام حسین ساجد (پاکستان)

ہواؤں کی لگن آنچل میں اتری
میں کل بستی سے جب جنگل میں اتری
لگا کوئی دلہن شرما رہی ہے
جب اک ننھی کرن بادل میں اتری
جو اپنی روح کو اک شہر کھو چکی تھی
وہ لڑکی [illegible] کی دلدل میں اتری
یہ کیا جانے سزا ہائیں کے ملن کا
یہ کیسی بے خودی پائل میں اتری
[illegible] پرا [illegible] کو پہنا کیوں نہ آیا
[illegible] ن مہکا جل میں اتری
[illegible] پا پھولی پھول جب سے
[illegible] ذات لے جنگل میں اتری

غزلیں

نجم نشاطی

...ان جب آگ برسائیگی تنہا چھوڑ جائیں گے
...ندسے پیڑ کو اک روز جلتا چھوڑ جائینگے
نکل جائے گی کالی رات سورج کیطرح ہملو
...ھند لکا شام کا چہرہ بہ چہرہ چھوڑ جائیں گے
سبق لے گی ہماری داستاں سے نسل آئندہ
ہم اشک خوں سے لکھا اک صحیفہ چھوڑ جائینگے
ملا ہے ایک ہی کردار ہم کو ہر زمانے میں
پئیں گے زہر اور امرت کا دریا چھوڑ جائینگے
ہمیشہ میری تنہائی کا کمرہ نجم مہکے گا!
وہ اپنی یاد کی خوشبو کا جھونکا چھوڑ جائیں گے

شجاع خاور

ادب و شعر کے الفاظ نصابی نکلے!
سب جنھیں رند سمجھتے تھے شرابی نکلے!
پوسٹ کر دیئے بنا مسئلے حل ہو نہ سکے
سوچنے کے سبھی انداز کتابی نکلے
آپ سب ہی تو اسی شہر میں رہ لیتے ہیں
عین ممکن ہے کہ مجھ میں ہی خرابی نکلے
[illegible]
[illegible]
[illegible] پہنچے ہی [illegible]
[illegible] لوگ تو صد درجہ شرابی نکلے

محفوظ کیفی

گردشوں کے ہمراہ تنکے لئے
سب لٹکے ہیں [illegible] کیلئے
لا کوئی تاسیف غم کی بوندیاں
لے بھری برسات تو ان کے لئے
تلخ لمحے گھر و مکاں، زہراب شب
ایسے ہوں گے حادثے دن کیلئے
پتھروں سے آئینہ شعلوں سے گل
سب بنا لیتا ہوں میں ان کیلئے
ہے انہی کو ہم سے شکوہ آج بھی
ہو گئے برباد ہم جن [illegible]
[illegible] ہوگا لمحہ لمحہ کا حساب
کیفی کر سامان اس دن کیلئے

حیدر علی حیدر (بنگلہ دیش)

صبح سے پہلے اجالوں کو صدا دی جائے گی
ظلمت شب آج سولی پہ چڑھا دی جائیگی
جب طلوع مہر سے مشرق میں پھوٹے گی کرن!
راستے کی ہر فصیل شب گرا دی جائے گی
دوستو یہ عہد کر لو سچ نہ بولو گے کبھی
ورنہ تم کو زہر کی پیالی پلا دی جائے گی
وقت کے فرمان ہیں جب وطن بھی جرم ہے
اب وطن کے پاسبانوں کو سزا دی جائے گی
بچ سکیں شعلوں کی زد سے بستیاں ممکن نہیں
لو چراغ جبر کی اتنی بڑھا دی جائے گی
ناپسندیدہ ہوئے جب پیار کے رشتے سبھی
طے ہوا کہ نفرتوں کو اب ہوا دی جائے گی
زخم کے داغوں کو حیدر اب چھپاؤ گے کہاں
جب تمہارے جسم سے چادر ہٹا دی جائے گی

عبداللہ کمال

بانی : ایک جستِ ناتمام

زماں مکاں تھے مرے سامنے گزرتے ہوئے
میں ڈھیر ہو گیا طولِ سفر سے ڈرتے ہوئے
(بانی)

وہ ایک جستِ ناتمام
کسی کسی کمان میں
زمیں کے بوجھ سے لدی پھندی اڑان میں
لہو لہان
طرف طرف مکان میں اتر گیا ....
نفس نفس اذان میں بکھر گیا ....
.... صدا شناس تھا
ندائے موت سے نبرد آزما رہا
کہ عرصۂ دراز تک
خود اپنے آپ سے خفا رہا
وہ اپنی ذات سے جدا رہا

زمیں کے بوجھ سے لدی پھندی اڑان میں
(شکستہ پر)
تمام وسعتیں سمیٹتا
..... سورگ باش ہو گیا
کہ وقت کے مدار سے نکل گیا

کہ اب
کوئی طرف
نہ کوئی سمت
بس ایک لامقام دھند
تمام ساعتیں شکستہ پر
سورگ : کوئی وقت یا مقام تو نہیں
سورگ : صرف اڑان ہے
سورگ : صرف اڑان میں کمال ہے
وہ : اپنا گھر میں کہاں تھا
سفیرِ بیکراں
اسیرِ بیکراں ہوا
.. کہ بیکراں تو ناتمام ہے

وہ ایک جستِ ناتمام تھا
سماعتوں کے شہر میں صدا بنا
نئی غزل کا ایک نیا خدا بنا

—— -۱۰- ——

سلطان سبحانی

شکریہ

جس نے مجھ پر سحر کیا
اس کا یہ دعویٰ تھا شاید
میرے ذہن کے سارے خیمے راکھ کی صورت اڑ جائیں گے
حکمت کے پر جھڑ جائیں گے
سارے خواب بکھر جائیں گے
اور میں اک پتھر کی بت میں ڈھل جاؤں گا۔
لیکن میرا ذہن خدا ہے اس نے کتنے شہ پارے تخلیق کئے
کوئی بھی قوت اس کو مسخر کر نہ سکے گی

اس افسوں کے تہہ خانے میں رہ کر بھی میں ہوش میں تھا
"قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" کا نور
مرے اطراف ہویدا تھا
ایک مہیب آواز، اندھیرا، چم چم کرتا آئینہ
مبہم شکلیں، سانپ، کھنڈر، ویرانہ، کفن، لاشوں کے ڈھیر
میں کیسے کیسے منظر دیکھ کر کھوتا ہوں۔
جو دنیا اس دنیا کے زیریں ہے
(جس کو سب نے جھوٹ کہا تھا)
اس سے پہلی بار تعارف کا اعزاز ملا

اب سوچ میں ہوں میں کیوں نہ اس کا شکر کروں
جس نے مجھ پر سحر کیا
اس نے مجھکو طلسمی دنیا کی
رنگ برنگی لذت اور حقیقت سے آگاہ کیا
میری پامالی کی دھن میں
اس نے میرے ذہن کو اور بھی وسعت بخشی
فکر کو مالا مال کیا

———— ٠ ————

تبصرے

نام کتاب : امعان
مصنف : ڈاکٹر منصور عالم
قیمت : ۳۰ روپئے
سن اشاعت : ۱۹۸۲ء
ناشر : دانش اکیڈمی محلہ ملکی آرہ بہار

یہ کتاب دس مقالات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ اس نے اپنے بہت سارے مقالات میں سے ان دس مقالوں کو منتخب کرکے کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔

"یہ عرض کردوں" عنوان کے تحت مصنف نے لکھا ہے

"تنقیدوں میں اختلاف رائے کی بڑی گنجائش
ہوتی ہے۔ یہ امر فطری ہے۔ کیوں کہ
تنقیدی نظر اور روش ہر ناقد کی یکساں
نہیں ہوتی۔ میں اسے ادب کے لئے رحمت
سمجھتا ہوں۔ اختلاف کی بنیاد سنجیدہ
علمی دلائل ہوں تو ذہن کو روشنی ملتی ہے
اس لئے اختلاف رائے سے خوف ہے
نہ شکوہ"

اختلاف رائے کی بڑی گنجائش "تنقیدوں تک ہی محدود نہیں۔ اصول نقد، معیار نقد، اور اسالیب نقد ——— ہر جگہ اختلاف کی گنجائش ہے۔ اور یہ گنجائش اس لئے ہی نہیں کہ ہر ناقد کی تنقیدی نظر اور روش یکساں نہیں ہوتی بلکہ اس لئے بھی کہ نظر اور علم کی سطح ہر ناقد کی بھی یکساں نہیں ہو سکتی۔ اگر مصنف کا یہ لکھنا:

"حقیقتاً میں خود کو تحقیقی اور تنقیدی کاموں
کا ابھی اہل نہیں پاتا"

کسر نفسی نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ تو یہ احساس مصنف کی خود تنقیدی میں شمار کیا جائے گا۔ جو اس خود اشتہاری کے زمانے میں کمیاب ہے۔

"اس نکتے کو میں اہم سمجھتا ہوں کہ تنقید
سارے زمانے کو اپنا مخالف بنانے کا
فن نہیں"

یہ نکتہ اگر ناقد کی نظر میں واقعی اہم ہے تو تنقید کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نقاد دوست اور دشمن بنانے کے لئے تنقید نہیں کرتا۔ اس کی دوستی محض تخلیق اور فن سے ہوتی ہے۔ کسی کی خوشی اور ناخوشی کا خیال تک اس کے تنقیدی کام کے مرتبے کو گرا دیتی ہے۔ تنقید ادب میں دوسرے درجے کی چیز ہے لیکن بہرحال اس کا وجود ہے اور رہے گا۔ نقاد خالق کی خوشی اور ناخوشی پر توجہ کرے گا تو کسی بھی فن کی خوبیوں اور کوتاہیوں تک اس کی پہونچ نہیں ہو سکے گی۔

منصور عالم کی اس کتاب کے ہر مقالے پر اظہار خیال کے لئے تبصرے میں شاید گنجائش نہیں۔ اس لئے چند مقالات کا جائزہ شاید تبصرے کا حق ادا کر دے۔

"اختر اورینوی کا ادبی مقام" ——— تمہید میں منصور عالم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اختر اورینوی نے کئی اصناف ادب سے شغل کیا۔ یہ شغل ان کے لئے دلچسپ رہا ہوگا مگر حاصل؟ منصور عالم کے الفاظ میں حاصل یہ ہے:

"ان کی محنت کا معتدبہ حصہ معمولی اور ادنیٰ درجے کا ہے"

دراصل اختر اورینوی بنیادی طور پر ادب کے آدمی ہی نہیں تھے۔ وہ تو ڈاکٹری پڑھنا چاہ رہے تھے۔ مگر صحت نے اجازت نہیں دی کہ اتنی کڑی پڑھائی کو انجام تک بخوبی پہونچا سکیں۔ اس لئے وہ ادھر ادھر سے ہوتے ہوئے اردو میں ایم اے کرکے لکچرر ہوگئے۔

اچھے مقرر تھے اس لئے تحریر میں بھی "خطابت" کے دباؤ سے مشتمل الفاظ اور لہجے کا دبدبہ موجود ہے۔ تمہید کے بعد صفحہ ۱۸ سے اصل مضمون ان جملوں سے شروع ہوتا ہے۔

"اختر اورینوی نقاد نہیں انشا پرداز تھے" اور اس دعوے کی دلیل میں انہوں نے چند برمحل اقتباسات اختر اورینوی کی تنقید سے دیئے ہیں۔ صرف ایک مضمون "سراج و منہاج" سے انہوں نے چار اقتباسات دیئے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اختر اورینوی کے پاس نقد کا کوئی اصول تھا نہ وہ اس محنت کے لئے تیار تھے۔ جو کسی شاعر یا ادیب کے فن کا تجزیہ اور تنقید کے لئے ضروری ہے۔ انہوں نے فکر و نظر کے کھوکھلے پن کو خوب صورت الفاظ اور ان کے حسن کے پردے میں چھپانا چاہا۔ مگر تعقل نہ ہو وہاں الفاظ بھی ساتھ نہیں دیتے۔ اس کا شعور اختر صاحب کو نہیں تھا۔

منصور عالم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کے یہاں "ہاں، نہیں" دونوں ہیں۔ اس لئے وہ جامعیت سے اکثر جگہوں پر فرار کرنے کو ہی بہتر تصور کرتے ہیں۔

اس کے بعد اختر اورینوی کی تحقیق کی باری آتی ہے۔ یہ پروفیسر کی "مجبوری" تھی جس کا اعتراف اختر صاحب نے خود ہی کیا ہے۔ اور قاضی عبدالودود نے ان کی تحقیق کا درجہ متعین کر دیا ہے۔ اختر صاحب کی تحقیق غیر مستند، سرسری اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے ——— منصور عالم نے کثرت سے اس کی مثالیں دی ہیں۔ اور صحیح دی ہیں۔

شاعری میں منصور عالم نے اختر اورینوی کو بحیثیت نظم گو کامیاب بتایا ہے۔ اور آخری نتیجے کے طور پر کہا ہے

"اختر اورینوی اپنے عہد کے بزرگ شعرا میں شامل کئے جانے کے مستحق ہیں"

ڈرامہ نگار کی حیثیت سے منصور عالم اختر اورینوی کو ناکامیاب بتاتے ہیں۔ "شہنشاہ حبشہ" واقعہ ہے کہ ڈرامے کی حیثیت سے نہایت پست ہے۔

ناول نگار کی حیثیت سے حسرت، تمیر اور کرشن چندر کے شکست کا موازنہ کیا ہے۔ حالانکہ بنیادی طور پر دونوں کا موازنہ نکالنے کی بے جا سی کوشش معلوم ہوتی ہے۔

منصور عالم کا یہ کہنا حقیقت سے دور ہے کہ اختر اورینوی نے اپنے نظریے کی اشاعت کا ذریعہ ناول یا افسانے کو نہیں بنایا۔ اختر اورینوی نے اپنے مذہب کی اشاعت افسانوں کے ذریعہ خوب خوب کی ہے۔ نقوش میں ان کا طویل افسانہ ان کے زوال آمادہ خیالات کا پرزور اور پرشور پروپیگنڈہ ہے۔ اور ایسے کئی افسانے ہیں جن میں اختر اورینوی نے اپنے مذہبی اعتقادات کا کھلا پروپیگنڈہ کیا ہے۔

اختر اورینوی کے آخری دور کے افسانے رجعت پسند، متعصب اور غیر ادبی ہیں۔ شاید منصور عالم نے ان افسانوں تک پہونچنے کی کوشش نہیں کی۔

اختر اورینوی "ازم" اور تحریک دونوں کے کٹر مبلغ رہے ہیں۔ قلم کے ذریعے بھی اور تقریروں کے ذریعے بھی۔ ترقی پسندی اختر اورینوی کو راس نہیں آسکتی تھی کیونکہ وہ جس محدود مذہبیت کے حصار میں تھے۔ وہ ان کو وسیع و عریض دنیائے ترقی پسندی میں جانے ہی نہیں دیتی تھی۔

اخیر میں منصور عالم نے ڈاکٹر سید محمد حسنین کا ایک جملہ لکھا ہے۔ اور یہ ڈاکٹر مذکور کی رسوائی کا سبب بن سکتا ہے۔ جملہ یہ ہے:

"اختر صاحب اگر اختر ادیب نہ
بھی ہوتے تو اختریت پر بال نہ پڑتا"

"بال آنا" اور "بال پڑنا" دونوں صحیح ہے مگر "پر" بال پڑنا غلط ہے۔ داغ کا شعر ہے ؎

ساقی ہمارے جام میں کیوں بال پڑ گیا
ایسا نہ ہو کہ غیر کی جھوٹی شراب ہو

بال آنا بھی صحیح ہے مگر یوں ؎

باریک کمر ہے کیا ہی اس کی
تلوار میں بال آگیا ہے

غرض 'بال آنا' اور 'بال پڑنا' دونوں کے استعمال کے لئے "پر" غلط ہے۔ اور ڈاکٹر حسنین کے جملے میں اختریت پر بال پڑتا ہے۔ کسی پروفیسر کے ایسے جملے کو احتراماً بھی QUOTE نہیں کرنا چاہئے جس سے اس پروفیسر کی ہتک ہنسائی ہو۔

اختر اورینوی پر منصور عالم کا یہ مقالہ اچھا ہے۔ اور قابل توجہ ہے۔

پرویز شاہدی پر منصور عالم کا مقالہ قابل غور ہے۔ اس میں مجھے ایک تعصب یہ کام کرتا نظر آیا جو منصور عالم کے اور مضامین میں بھی ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تمام کی تمام تخلیقات کو پروپگنڈا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک نے فیض احمد فیض سا شاعر ——— عزیز احمد سا ناول نگار ——— بیدی سا افسانہ نگار ——— اور احتشام حسین سا نقاد دیا ہے۔

پرویز شاہدی اگر فیض نہ بن سکے تو یہ قصور ترقی پسند ادبی تحریک کا نہیں، خود فن کار کا ہے۔ جیسے نیاز حیدر دیل کا ہیتیہ جام ہی کرتے رہے۔ اور مجروح ارض ماسکو کو سلام کرنے کے علاوہ بہت کچھ اردو ادب کو دے گیا۔

حیات کلیم بھی معلوماتی اور اچھا مضمون ہے۔

مجموعی اعتبار سے ڈاکٹر منصور عالم دنیائے تنقید میں ہونہاری کے آثار لے کر آئے ہیں۔ ●●

بقیہ: مواد و صورت

نہیں، بلکہ ان سے آگے دیکھا گیا، تاکہ راون کے آدمی انہیں نقصان نہ پہونچا سکیں۔ ہرن کے روپ میں راون نہیں اس کا اپنی مریچ آیا تھا۔ جو لنکا شری رام چندر جی کے تیر کا نشانہ ہو کر وہاں بحق ہوا۔ اندراسی نے رام چندر جی کو بتایا تھا کہ یہ سارا جال راون کا بچھایا ہوا تھا۔ راون برہمن کے بھیس میں سیتا سے بھکشا لینے گیا تھا۔ اور لکشمن کی کھینچی ہوئی ریکھا (دھیان نہ دینے) کے خیال سے سیتا دھوکے میں آکر گھی ریکھا سے باہر آگئی۔ اور اس طرح راون اسے اغوا کرنے میں کامیاب ہوا۔ لنکا پہنچنے کے لئے سمندر کو شری رام چندر جی نے ہنومان کے سر پر نہیں۔ بلکہ تیرنے والے پتھروں پہ پار کیا تھا۔

ذکر کورکشیتر کا ہو کہ لنکا کا، وجہ کا یا کربلا کا، بات نیکی کی بدی پر، سچ کی جھوٹ پہ، اور انسان کی شیطان پہ فتح کی ہی ہوتی ہے۔ لیکن حوالے درست ہونے چاہئیں۔

——— شروَن کمار ورما
(امرتسر)

قارئین

سواد و صوت

مکرمی ! اسلام علیکم

آہنگ کا شمارہ مارچ ۸۳ء موصول ہوا۔ میرے علم کے مطابق ہندوستان میں آہنگ پہلا رسالہ ہے جس میں تازہ شمارہ میں انشائیہ کی بحث چھیڑی گئی ہے آپ کا اداریہ انشائیہ سے متعلق چند اہم باتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ نیز انشائیے سے متعلق دونوں مضامین غور و فکر کے دروازے کھولتے ہیں۔ پاکستان میں اوراق، فنون اردو زبان، تخلیق، وغیرہ رسائل میں انشائیہ کی بحث زور و شور سے جاری ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں PIN DROP SILENCE ہے۔ آپ کا یہ قدم واقعی لائق ستائش ہے کہ آپ نے اس جمود کو توڑا۔

انشائیہ ہمارے یہاں شناخت کے مرحلہ میں ہے۔ حالانکہ اس قدر بحث و مباحثہ کے باوجود یہ مسئلہ پاکستان میں اب بھی گونج رہا ہے۔ ہمارے یہاں انشائیہ کے سلسلہ میں پائے جانے والے کنفیوژن کو دور کرنے کی کس قدر ضرورت ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں ہر طنز و مزاح نگار بلاتکلف انشائیہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ اس کنفیوژن کی مثال آہنگ کے تازہ شمارہ سے بھی دی جا سکتی ہے۔ نشتر جعفری نے اپنے مضمون میں "سفر اور صرف سفر" میں موجود زبان و بیان کی غلطیوں کا احاطہ کیا ہے۔ خطاوار کی "سماجی بزرگی" و برتری کے پیش نظر ان غلطیوں پر ٹوکنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے یہ مضمون اہم ہے مگر کیا ہم اسے انشائیہ کی بحث میں شمار کر سکتے ہیں۔ ؟ نشتر جعفری لکھتے ہیں۔

"انشائیہ نگار نے اس موضوع کے تحت جو کچھ پیش کیا ہے۔ وہ گیا سے پٹنہ تک کے سفر میں رونما ہونے والے واقعات ہیں"

گویا انہوں نے بجائے انشائیہ کے سفرنامہ کا جائزہ لیا ہے انشائیہ کے ان چیزوں سے چھان پھٹک کر الگ دکھانا ضروری ہے۔

صفدر صاحب نے اپنے مضمون "دوسرا کنارہ" ایک مطالعہ میں چاند کے روشن حصہ کے کوائف کو ترک کر کے پیچھے لیا اور عقب میں پہونچ کر مٹھی میں بند بصیرت کے جگنوؤں کا چمک اٹھنا اور روشنی کے ننھے ننھے حلقوں میں تاریک دنیا کی سچائیوں کا چمکنا" اس مثال کے ذریعہ انشائیہ نگار کی کارکردگی کو بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں اٹھائے گئے مسائل پر اچھی خاصی بحث ممکن ہے۔ اور ہمارے

یہاں انشائیہ پر بحث ہونی چاہئے۔ پاکستان میں ان مباحث
کا ایک خوشگوار ردعمل یہ آیا ہے کہ وہاں انشائیہ نگاری ایک
تحریک کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اور نئے نئے لوگ اس
نووارد صنف کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

اس مضمون میں صفدر صاحب لکھتے ہیں۔

"بے ہیئتی ہی انشائیہ کی ہیئت ہے۔
اس کا یہ مطلب نہیں کہ انشائیہ کسی بھی
ہیئت میں لکھا جا سکتا ہے۔"

آگے رقم طراز ہیں:

"انشائیہ کی ہیئت کسی کارخانہ سے بن کر
نہیں آتی۔ اس اسلوب نگارش نے
انشائیہ کی ہیئت کو دریافت کیا ہے۔
اس لئے یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ انشائیہ
کی ہیئت میں لکھا گیا طنزیہ انشائیہ کیوں
نہیں؟"

میری نظر میں یہ ایک اہم سوال ہے۔ اگر ہم اس سوال
کا جواب تلاش کریں۔ تو انشائیہ کی اصل تک ہماری رسائی
ہو سکتی ہے۔ وزیر آغا صاحب نے دوسرا کنارہ میں لکھا ہے

"انشائیہ خارجی ہیئت کی بہ نسبت اپنی
داخلی ہیئت کا زیادہ پابند ہے۔ انشائیہ
کی پرکھ کے سلسلے میں اس داخلی ہیئت
کا ادراک بہت ضروری ہے"

غرض اگر ہم انشائیہ کی داخلی ہیئت کی نسبت خارجی ہیئت کو
ہی اصل سمجھیں جو بقول صفدر صاحب:

"بے ہیئتی ہی انشائیہ کی ہیئت ہے"

تب ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی اس کے مستحق
ہو جاتے ہیں کہ انہیں بھی انشائیہ کہا جائے۔ جبکہ مضمون
[illegible] میں صفدر صاحب نے لکھا ہے:

"یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ ہندوستان
میں انشائیے کے نام سے جو طنز و مزاح
تخلیق ہو رہا ہے۔ دوسرا کنارہ کے انشائیوں
کا مزاج ان سے قطعی مختلف ہے"

اور میرے خیال میں یہی بات پاکستان میں تخلیق ہونے
والے دیگر انشائیوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔
لہٰذا ان دونوں کا فرق واضح ہونا چاہئے۔ میرے خیال میں
آہنگ میں انشائیہ سے متعلق مباحث کو جگہ دی جانی چاہئے
ہو سکے تو آہنگ میں اس خط کو شائع کر کے ممنون فرمائیں۔

محمد اسد اللہ
(امراوتی)

برادرم! آداب

شمارہ مارچ میں بہت کچھ پڑھنے کو ملا۔
زین العابدین بنگلہ دیشی کی کہانی "اجنبی اور بچہ"
اچھی کہانی کہی جا سکتی ہے لیکن کہیں کہیں جذباتیت اور
اور مضمون نگاری کا شکار ہو جاتی ہے۔ کچھ غلطیاں بھی ان
سے سرزد ہو گئی ہیں۔ جن کی طرف اشارہ کرنے پر مجبور ہوا
ہوں۔

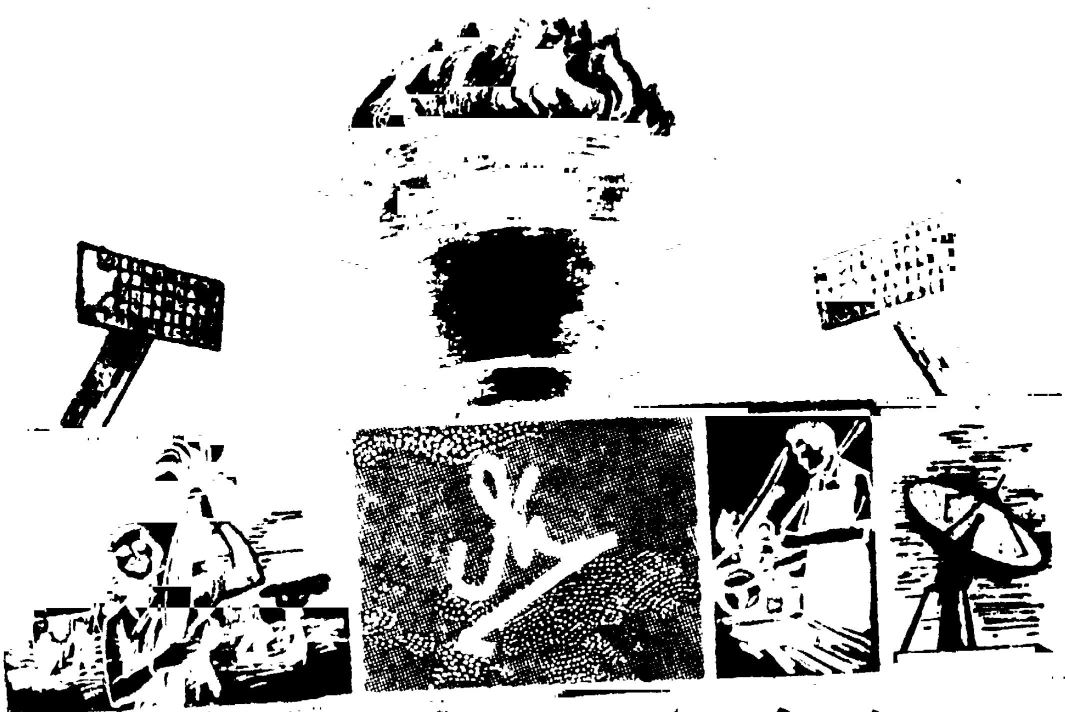
رامائن اور مہابھارت اس برصغیر کے مشہور و مقبول
مہاکاویہ ہیں۔ ہندوؤں کے لئے تو یہ مقدس بھی ہیں۔ ان
کے مذہبی یا اخلاقی پس منظر میں بات نہیں کروں گا کچھ حوالوں
کا ذکر کرنا ہے۔

مصنف نے کئی جگہ ان مہاکاویوں کے واقعات
و کرداروں سے اپنی کہانی میں نئی معنویت پیدا کرنے کی
کوشش کی ہے۔ یہ ذہانت کا ثبوت ہے لیکن ادیب
کو ان کا صحیح علم ہونا چاہئے۔

سیتا رامائن سے اور ارجن مہابھارت سے
تعلق رکھتے ہیں۔ ارجن کے تعلق سے دروپدی کی بات کی
جا سکتی تھی۔ سیتا کی بہن۔ سیتا کی جھونپڑی کے گرد رام نے

بقیہ صفحہ پر

THE AAHNG URDU MONTHLY APR 83



MA'

Aahang Urdu Monthly

تقریظات

The Cultural Academy Gaya



MAY—1983

PRICE RS. 2-00

دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگ جیون روڈ گیا

قائم شدہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

ایک سال کیلئے ۲۴ روپے

ایک کاپی دو روپے

فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹر
نوشابہ حق

رفقاء ایڈیٹرز
شفق، عبدالصمد

کتابت: کلیم الدین گوڑی

محتویات

کشکول

"آواز کب معتبر نہیں رہتی ؟"

"جب آدمی بولتا کچھ ہے، سوچتا کچھ ہے، کرتا کچھ ہے"

الیاس احمد گدی کی کہانی کی یہ دو سطریں کئی سطحیں رکھتی ہیں۔ اظہار ہے، ترسیل ہے ـــــ مگر پروپیگنڈا نہیں ہے۔ تجریدیت بھی نہیں ہے۔ وار ہے مگر ہتھیار نظر نہیں آتے۔ فنکاری کی اونچی سطح یہی کہلاتی ہے جو الیاس احمد گدی کی "اپنی" ہے۔ مگر فکشن کا ناقد غیاث احمد گدی کا پرندہ پکڑنے کی کوشش میں "کوا بنا" ہوا جارہا ہے۔ ہم غیاث احمد گدی کی فنکاری کے قائل ہیں۔ پرستار ہیں ـــــ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ صرف اس جرم میں کہ الیاس احمد گدی اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ الیاس کو قتل کر دیں۔

"دن کا زوال" مثالی جدید کہانی ہے۔

"میاں تم سنو گے تو حیرت کرو گے مثلاً ایک دن وہ کہنے لگا ـــــ اتو! آپ نے محسوس کیا ہے آوازوں کا اپنا ایک اظہار ہوتا ہے۔ آوازوں کی اپنی ایک بشارت ہوتی ہے"

یہ جملے اردو فکشن میں اچھوتے ہیں۔ اور یہ جملے ہی نہیں ہیں۔ وہ ہیرے ہیں جن کی تراش و خراش فن کار کا وجدان ہی کر سکتا ہے۔

"آپ جانتے ہیں اتو! کہ ہاتھ کہاں قید ہیں ؟"

"کہاں قید ہیں ؟"

"آپ کے پیٹ میں ـــــ"

الیاس احمد گدی فنکار ترقی پسند ہے۔ وہ افسانے COMPOSE نہیں کرتا۔ افسانوں میں حقیقتوں کو EXPLORE کرتا ہے

"بات دراصل یہ ہے اتو کہ اس نے اپنے ہاتھ دوسروں کے پیٹ میں ڈال دیئے ہیں اور یہ بڑا جرم ہے"

استحصال کو ایسے فنکارانہ طور پر بیان کر دینا الیاس احمد گدی کی پہچان اور ایسی انفرادیت ہے جو کمیاب ضرور ہے۔

اب قارئین اس کہانی کو ـــــ اس کے ہر جملے کو پڑھیں ہم زیادہ دخل انداز ہونا نہیں چاہتے

---

۶ سے ۸ جون تک دہلی میں فنکاروں، ادیبوں، دانشوروں کی بہت نمائندہ اور بڑی کانفرنس ہونے جارہی ہے جو قومی یک جہتی کے لئے ہوگی۔ اور یہ کانفرنس بتائے گی کہ زبان اور ادب اور دانش کا مثبت استعمال ادب کی طہارت کو مجروح کئے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔ بہار نے اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا ہے۔ بہار نے بنگال کے بعد یہاں بنگال اکیڈمی بنائی ہے، بہار نے پنجابی اکیڈمی بھی قائم کی ہے۔ بہار میں زبانوں کے جگناتھ ـــ بہار کے چیف منسٹر نے وہ کیا ہے جو ایک دانشور سیاست داں ہی کر سکتا ہے ہم پوری تندہی کے ساتھ اس کانفرنس کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں ـــ یہ کانفرنس نوعیت، اہمیت ا

کلام حیدری

کے مختصر افسانوں کا

چوتھا مجموعہ

لہو رو کے لکھا

زیر طبع

دی
کلچرل اکیڈمی گیا

نثر کی عملی تنقید

برادرم کلام حیدری صاحب! تسلیم

آہنگ ملا۔ اس مرتبہ کشکول میں آپ نے بہت دلچسپ بحث اٹھائی ہے۔ کہ "نثر کی تنقید کیوں عام نہیں ہے" جس طرح شعری تنقید اور یہ کہ نثر کی تنقید اردو میں تقریباً نہیں ہے اسٹائیل وغیرہ پر باتیں کرکے لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے نثر کا حق ادا کر دیا۔ اس میں بہت کچھ حقیقت ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ نثر پر تنقید نہیں لکھی گئی۔ جنھوں نے باغ و بہار، فسانۂ عجائب شبلی کی نثر، حالی یا محمد حسین آزاد کے طرز تحریر پر باتیں کی ہیں انہوں نے ان مصنفین کی پوری تخلیقات کو نظر میں رکھ کر باتیں کی ہیں۔ آخر افسانوں اور افسانہ نگاروں پر بھی بحثیں ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ ہاں نثر کے STRUCTURE پر بحث کم ہوئی ہے۔ اور یہ کام اس لئے آسان نہیں ہے کہ اسے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے طویل اقتباسات لینے پڑیں گے۔ پھر بہت سی ایسی بحثیں ہوں گی۔ جہاں صرف ایک اقتباس سے کام نہیں چل سکتا۔ شاعری کی تنقید میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ چند اشعار کے حوالے مدد کر سکتے ہیں اور زیادہ جگہ بھی نہیں گھرتے۔ ہاں! عملی تنقید نثر کی جب بھی ہوگی۔ تو صرف اسٹائل، بناوٹ اور اسلوبیات وغیرہ ہی کی بحث اس میں اٹھائی جا سکتی ہے۔ اس میں خیالات کی گرفت مشکل اس لئے ہوگی۔ کہ خیال مجموعی طور پر دور سے چلتا ہوا ایک مخصوص نثر پارے تک پہونچا ہے وہ خود مکتفی نہیں ہے۔ اور سب کو ایک اقتباس کے ذریعہ پیش کرنا ممکن نہیں۔ ہم صرف اشارے میں یہ بات کہہ سکتے ہیں۔ کہ افسانہ نگار یا نثر نگار پہلے سے یہ باتیں کہتا ہوا آ رہا ہے اور اس لئے اس نے یہاں یہ بات لکھی ہے۔ مگر عملی تنقید کی مشکل یہ ہے کہ اس میں جو کچھ سامنے ہے اس پر سارا عمل مرکوز ہوتا ہے۔ اب اس اقتباس میں نثر نگار کے ذہن کی نہ تو پوری تصویر پیش کی جا سکتی ہے۔ اور نہ وہ مختصر سا اقتباس سب کچھ قاری کو دکھا سکتا ہے۔ جو کچھ تخلیق کار کے ذہن میں گزرتا ہے۔ یا جس کے زیر اثر وہ ایک مخصوص اقتباس کی عبارت وجود میں آئی ہے۔ پھر اور رہ کیا جاتا ہے۔؟ سوا اسٹائیل وغیرہ پر باتیں کرنے کے۔ طلسم ہوش رُبا میں اگر ایک حجرۂ بلا کا اقتباس پیش کیا جائے گا۔ تو پھر پیچھے کیا ہوتا رہا ہے۔ اسے بتانا تنقید نگار کے لئے اور قاری اور سامع کے لئے بھی اس وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک کہ یہ ناقد اور قاری یا سامع طلسم ہوش رُبا کے تمام علائم، کردار طلسمات، اور جادوگروں کی خصوصیات سے پہلے ہی واقف نہ ہو۔ انہیں افراسیاب کی شخصیت، باغ سیب کے حالات اوراق جمشیدی، ماہیان زمرد پوش، آفات چہار دست، مشعل جادو، تاریک شکل کش، اور شہنا لواز وغیرہ کے خصائص اور حادثات سے جب تک واقفیت نہ ہو۔ وہ ملک اخضر گوہر پوش، اور ملکۂ یاقوت سخن داں، اور عفریت طلسمی کو بالکل الگ کرکے ISOLATION میں سمجھ نہیں سکتے۔

ایسی صورت میں اقتباس کا صرف وہی حصہ جو سامنے ہے۔ اس میں صرف اسٹائیل، بیان واقعہ، اور داستان گو کے فن پر ہی کچھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے نثر کی عملی کی تنقید بہت مشکل چیز ہے۔ جس میں صرف الفاظ کی دار و بست کا فکری تخلیق سے سلسلے ملانا تقریباً ناممکن ہے جب تک بار بار اقتباسات متعدد جگہوں سے نہ پیش کئے

جائیں۔ یا قصے کا اعادہ قارئین کے لئے کیا جائے۔ جس سے عملی تنقید کا عمل غیر دلچسپ ہو جائے گا۔ اور اس کا صحیح مقصد ہی فوت ہو سکتا ہے۔ ہاں! تنقید کے اقتباسات یا انسانے کے ٹکڑوں کی اگر عملی تنقید پیش کی جائے تو کچھ کام ہو سکتا ہے مگر ان میں بھی خیالات کے سلسلے پیچھے سے ملے ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی خود مکتفی مشکل ہی سے ہوا کرتے ہیں۔ اور اس طرح نثر نگار کیا کہہ رہا ہے؟ کیوں کہہ رہا ہے؟ اور اس کا کیا مقصد ہے؟ یہ سمجھنا اور پیش کرنا آسان کام نہیں۔ برخلاف اس کے شعر میں یہ بات بہت آسان ہوتی ہے۔ جس کا راز اس کے اختصار میں مضمر ہے۔ غزل میں یہ کام بہت آسان ہے مگر نظم میں وہاں بھی قدرے مشکل ہو گی۔ کیونکہ نظم میں خیالات پھیل کر آتے ہیں۔ اور اپنا سلسلہ پیچھے سے جوڑے رہتے ہیں۔ اس طرح بیانیہ شاعری کی عملی تنقید بھی خاصی مشکل ہے۔ پھر ایک مشکل اور ہے۔ کہ مضمون نگار کو کوئی مضمون کسی رسالے کے لئے بھی لکھنا ہوتا ہے۔ اب اگر جوش کی نظم "کسان" کی عملی تنقید پیش کرنی ہے۔ تو پہلے پوری نظم پیش کرے، اور پھر عملی تنقید۔ تو اس کے لئے آہنگ کے آدھے صفحات وقف ہو جائیں گے مگر یہ ایک عملی دشواری ہے جس کا اثر تنقید نگاری پر زیادہ نہیں پڑتا۔

بہرحال آپ کی یہ جستجو، تنقید نگاروں کے لئے ایک چیلنج بھی ہو سکتی ہے۔ اور سر جوڑ کر سوچنے کی بات بھی۔ یہ صحیح ہے کہ اردو تنقید میں نثر کی تنقید کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں دی گئی۔ مگر یہ بات صرف اردو ادب ہی تک محدود نہیں ہے دنیا کے تمام ادب میں تقریباً یہی صورت نظر آئے گی۔

سنا ہے کہ محمد محسنؒ صاحب رانچی یونیورسٹی چھوڑ کر مگدھ یونیورسٹی واپس آگئے؟ مگدھ یونیورسٹی ایک صحرائے بے آب و گیاہ یعنی او سر زمین میں بنی ہے۔ اسے سر سبز بنانے کی کوشش کیجئے۔ میرا مطلب ہے ادبی طور پر سر سبز۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خیر طلب
سید محمد عقیل۔

ڈاکٹر منظور احمد (پاکستان)

میری غزل ——— کرار نوری

میرا شعر یا شاعر پر کچھ لکھنا توجہ طلب ہے ایک وجہ تو لوگوں کا دیا کم از کم کچھ لوگوں کا حسن ظن ہے۔ جو ممکن ہے میری ذات یا میرے علم سے کم ہو لیکن میرے مضمون فلسفہ سے زیادہ ہے۔ فلسفہ کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اگر اس کو کسی شاعری کے ساتھ اس طرح جوت دیا جائے۔ جس طرح گاڑی میں گھوڑا (اگرچہ گھوڑا گاڑی کے پیچھے ہی کیوں نہ ہو) تو شاعری میں وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ (زیادہ وزن پیدا ہونے سے شاعری ڈوب بھی سکتی ہے) یا کم از کم فلسفہ پڑھ کر کوئی شخص ایسی اصطلاحات میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو کم لوگوں کی سمجھ میں آتی ہیں۔ (یا لوگوں کی کم سمجھ میں آتی ہیں آپ جس طرح سمجھیں) اور اس طرح وہ جس شئے کے متعلق رائے کا اظہار کرتا ہے اس سے ایک عام رعب کی کیفیت طاری ہو سکتی ہے فلسفے کے متعلق ممکن ہے۔ بعض مرتبہ یہ ظن حسن ثابت ہو لیکن میری پریشانی یہ ہے کہ میں نے جس فلسفیانہ مدرسۂ فکر میں تربیت پائی ہے۔ وہ تجزیہ کا مکتبۂ فکر ہے۔ جہاں الہام، ذو معنویت یا منطقی الٹ پھیر سب سے بڑے جرم مانے جاتے ہیں۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر آپ اپنا مطلب سادہ اور مختصر الفاظ میں نہیں سمجھا سکتے۔ تو آپ کے مضمون کے بارے میں آپ کا بیان مشتبہ ہے۔

میرے لکھنے کی دوسری وجہ خود میری مروّت اور دوست داری ہے۔ اور بعض اوقات یہ جانتے ہوئے کہ میں کسی کام کا اہل نہیں۔ وہ کام کرنے کی حامی بھر لیتا ہوں۔ اور پھر وعدہ خلافی کی شرمندگی سے بچنے کے لئے کر بیٹھتا ہوں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اردو میں شرمندگی اس شخص کو لاحق ہوتی ہے جس نے رسماً مجھ سے کچھ کرنے کی فرمائش کی۔ اور میں نے قبول کر لی۔ یا پھر غلط فہمی کی بنا پر مجھے اس امر کا اہل سمجھا۔ اور میری نااہلی اس پر بعد میں منکشف ہوئی۔ اب اگر کرار نوری صاحب اس بات سے شرمندگی ہو کہ میں نے ایسا مضمون کیوں لکھا تو ان کو اب بھی اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ اس اشاعت کے حوالے نہ کریں۔ میں کسی سے نہ کہوں گا۔

میرے لکھنے کی تیسری وجہ بڑی پکی اور سچی۔ اور وہ یہ ہے کہ ادب کا اصل مخاطب ایک تہذیب یافتہ قاری ہوتا ہے۔ اور تہذیب یافتہ سے میری مراد کلیہ تعلیم [illegible] بلکہ اس سے معاشرہ اور انسان کی ایک کیفیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ جو تعلیم و تربیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک فکری صلاحیت ہے جو حسن قبیح میں تمیز کرتی اور تمام لذتوں سے مرتفع ہو کر ایک جمالیاتی رویّہ کی شکل ظاہر ہوتی ہے۔

میں شعر و ادب کا ایک قاری اور ناظر ہی ہوں۔ مجھے تنقید نگاری کے اصول آتے ہیں اور نہ ہی دیباچہ نگار ہوں لیکن اس کے باوجود شاعر اور شعر دونوں کی مراد مجھ جیسے سامع اور قاری ہی ہوتے ہیں۔ ژرف نگاری، خوردہ بیں، لغت داں اور عروض داں نہیں۔ جو بحر و وزن اور شتر گربگی کے چکر میں شعر اور شاعر دونوں کو گم کر بیٹھتے ہیں آپ چاہے کچھ سمجھیں غالب نے اپنا دیوان حالی یا عبدالرحمن بجنوری کے لئے نہیں لکھا تھا۔ ناقد اور شارح کی مثال تو سمعی اور بصری آلوں کی طرح ہے۔ جو حروف و صوت کو بڑا کر کے دکھاتے ہیں کہ کم نظر بھی ان کی خوبیوں اور خامیوں کو دیکھ سکیں۔ لیکن دیکھئے تو دراصل ایک عام ناظر ہی کا کام ہے کہ وہی شعر و ادب کا اصل RECI-ان PIENT-ہے۔

شاعری کی تعریف اہل فن جس طرح چاہیں کریں لیکن بہر طور کاریگری اور معنی آفرینی اس کے لازمی جزو ہیں۔ لیکن کاریگری اور معنی آفرینی کا یہ عمل میکانکی نہیں ہے۔ یہ عمل تکوینی ہے جس کے ذریعہ ہئیت اور مادہ دونوں تشکیل پاتے ہیں۔ شاعر جو لفظ استعمال کرتا ہے اگرچہ اس کی ایک متعین صورت ہوتی ہے لیکن اچھے شعر میں اس کا عمل ایک تو آفریدہ کی طرح ہوتا ہے۔ جو اپنے انفرادی وصف کی وجہ سے شعر کا اس طرح ایک لازمی جز بن جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی لفظ بھی اس کی جگہ نہیں لے سکتا شعر کا ترجمہ اسی لئے ایک مشکل ترین عمل ہے کہ کسی اچھے شعر میں استعمال ہونے والا لفظ ایک عام لفظ نہیں ہوتا جس کے لغت میں معنی اور مترادفات تلاش کئے جا سکیں۔ وہ اپنی جگہ اکلوتا ہوتا ہے۔ جس کے معنی اس سیاق سے متعین ہوتے ہیں جس میں وہ اترا ہے۔

یہ تمہید اگرچہ خاص طور پر کرار نوری کی میری غزل سے متعلق نہیں ہے۔ لیکن کسی کلام کے معنی متعین کرنے کے چند لازمی خواص کی طرف ضرور اشارہ کرتی ہے۔ اس کی تفصیلات میں ہم کو فلسفہ معنی کی راہ میں دور تک لے جا سکتی ہے۔ جن کا موقع یہ نہیں ہے لیکن معنی میں سیاق کی اہمیت ایک ایسا اصول ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ اس کے اطلاق کی وسعت کے بارے میں بڑے اختلافات موجود ہیں۔

بیسویں صدی کی اردو شاعری جس طرح اس اصول کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔ شاید کسی اور عہد کی شاعری نہ کرتی ہو۔ برصغیر میں خاص طور پر کیا خاص اور کیا عام کوئی بھی زمانے کے اس محسوس بوجھ سے نہ بچ سکا۔ بہت کم طبقات یا اشخاص ایسے ہوں گے۔ جو اپنے چاروں طرف ہونے والے حوادث سے صرف نظر کر سکے ہوں۔ ٹھہرے ہوئے زمانوں میں جب معاشروں کی معاشی اور سیاسی فارغ البالی نصیب ہوتی ہے۔ لوگ خود ساختہ گنبدوں میں محصور ہو کر زمانہ سے بے خبر اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔ لیکن ایسے زمانوں میں جہاں تہذیب و تمدن کی تمام محفوظ عمارتیں مسمار ہو چکی ہوں۔ جہاں معاشرے میں شکست و ریخت کے طبعاتی اور مابعد الطبعیاتی عوامل کارفرما ہوں۔ کسی کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ حوادث کی دستبرد سے بچ کر زندگی گزار سکے۔

شاعر یوں بھی معاشروں میں ان حساس آلوں کی مانند ہوتے ہیں۔ جن پر آنے والی تبدیلیوں کے اثرات پہلے ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ذات شاعر اس کیفیت لذت و الم کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جس سے معاشرے گزرتے ہیں۔ اس لئے شاعری اگر ایک طرف سیاق سے عبارت ہوتی ہے تو دوسری طرف وہ ایسا سراغ ہوتی ہے جس سے معاشروں کے چلن کا پتہ چلتا ہے۔

بیسویں صدی کا نصف آخر خاص طور پر ایک ہیجان کا دور ہے۔ یہ ہیجان ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ دونوں ممالک میں پایا جاتا ہے۔ غیر ترقی یافتہ ممالک میں یہ اس حد کی عمل سے

بھی پیدا ہوا ہے۔ جو ترقی اور پس ماندگی کے تصادم کا نتیجہ ہے
پھر تصورات کا معاشرے میں سُرعت سے پھیلاؤ اور نت نئے
تصورات کی ایک دوسرے سے نبرد آزمائی ایک مستقل عمل کے
کی صورت میں زندگی کے اسٹیج پر نمودار ہو رہی ہے۔ اور ہر
شخص کی زندگی حالات کے بھنور میں اس طرح گرفتار ہوئی ہے
کہ اس سے نجات ممکن نہیں۔ برصغیر کے اردو شاعر ظاہر ہے کہ
اس صورت حال سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ اب وہ چاہے
کرار نوری ہوں جو ایک پختہ مشق اور پختہ شعور اور پختہ عمر شاعر
ہیں۔ یا شاعروں کی وہ نئی نسل جو درونی ہلچل کے اظہار میں
زیادہ بے باک اور زیادہ جلد باز معلوم ہوتی ہے۔ (جلد بازی
میں ذم کا پہلو نہیں ہے)

کرار نوری کی ذہنی اور شعری تربیت نے ان درون خانہ
ہنگاموں کو ایک مدھم مگر پُر اثر لہجہ دیا ہے۔ ان کے شعروں میں
چونکا دینے والے یا دھماکہ کرنے والے اسالیب نہیں ہیں۔ وہی
کسی حد تک روایتی انداز ہیں۔ لیکن ان کی ترتیب اور سلیقہ
نے ایک نیا پن پیدا کیا ہے۔ اس طرح کہ الفاظ نے مضمون کی نئی
وسعت پائی ہے ؎

اس کو تو صرف اپنی اکائی کی فکر ہے
ہم وہ کہ ہم کو ساری خدائی کی فکر ہے
گل کی تو کیف ذات سے رنگت بدل گئی
بلبل کو اپنی نغمہ سرائی کی فکر ہے

بیسویں صدی کے نصف آخر کے جس ہیجان کا تذکرہ میں نے
کیا ہے۔ اس کے شعور میں سب سے بڑی آواز شکست و ریخت
ہے۔ توڑ پھوڑ کا یہ عمل اول قدم انسان کی زندگی میں ایک حیرانی
پریشانی اور پراگندگی پیدا کرتا ہے ؎

یہ میرا سایہ بھی میرا نظر نہیں آتا
وہ کون شخص ہے کس شخص کے لباس میں ہوں
مری سنو، مجھے دیکھو، مرے قریب آؤ
میں روح عصر ہوں اور اپنے التماس میں ہوں
مجھے جو دیکھا تو لوگوں کی بھی ہنسی پڑا مجھ پر
کسے بتاؤں کہ اس عہد کے لباس میں ہوں

ایک شاعر اور ایک آدمی میں فرق یہ ہوتا ہے کہ شاعر
اپنے ذاتی تجربات کو جو زمان و مکان میں مقید ہوتے ہیں ایک
تنزیہی جہت عطا کر سکتا ہے اور اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدات
کے ذریعہ وہ معاشرے کے عمومی تجربات کا اظہار کرتا ہے۔ اب اس
میں چاہے شہروں کی پر ہجوم زندگی کی طبعی تنہائی ہو یا بے گھر
ہونا یا دوستوں اور ساتھیوں کی تلاش ہو۔ جو اس دور میں
مشکل سے ملتے ہیں۔ ایک عام آدمی کی زندگی میں یہ تجربات
اس کی ذاتی زندگی کی ایک غیر دلچسپ کہانی ہوتے ہیں۔ ایک
شاعر ان کو آفاقی بنا کر ایسی قدروں کی تشخیص میں نکلتا ہے۔
جو مثالی ہوتی ہیں۔ لیکن وہ ان کو امر واقعہ میں دیکھنا چاہتا ہے
اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ ہر شاعر لازماً افلاطونی ہوتا ہے
اور عالم برزخ کی ایک مثالی دنیا کے خواب یاد کرتا رہتا ہے
آج کے دور کا شاید ہی کوئی شاعر افلاطونی نقطۂ نظر رکھتا ہو۔
وہ تو پکا حقیقت پسند ہوتا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت کا تصور
اس کی زندگی کا انفرادی سانحہ نہیں ہوتا اس سانحے کے ذریعے
وہ ایک عموم کی طرف بڑھتا ہے۔ جو ایک لامتناہی بڑے اور کلی
مشاہدے اور تجربے پر منتج ہوتا ہے۔ اگر کرار نوری کے شعروں
کو ان کی زندگی کا ذاتی سانحہ ہی سمجھ کر پڑھا جائے تو ان کی
معنویت محدود ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس تحدید سے آگے بڑھ کر
اس کو ایک تجربہ سمجھا جائے تو ان کی معنویت ایک تنزیہی
جہت سامنے آئے گی۔ اب آپ کو حق ہے کہ مندرجہ ذیل
شعروں کو آپ زندگی کے سانحات کے حوالے سے سمجھیں یا ایک
آفاقی تجربے کے ؎

ہر شخص نے نقش کف پا ہم کو بنایا

ہر شخص کی ہم راہ میں حائل تو نہیں تھے
ہر شخص پر پڑتی ہوئی دھوپ، مرے سائے گئی
زیر سایہ کسی دیوار نہ سونے نہ دیا
نام لے کے کبھی ہم کو بھی پکارے کوئی
گھر کا دروازہ کسی روز تو کھولیں ہم بھی
نغمۂ دستی میں ابھرنے لگے سناٹے سے
در و دیوار جو بولتے ہیں تو بولیں ہم بھی
ہم بھی دن بھر کی کشاکش سے تھکے ہارے ہیں
کوئی گوشہ کہیں مل جائے تو سولیں ہم بھی

ایک بات جو کرار نوری میں موجود ہے اور جو شاید ان کے عزم اور حوصلے کی پیدا وار ہے۔ وہ یہ ہے کہ شکست و ریخت اور کھو جانے کے احساس میں انہوں نے اپنے آپ کو بالکل گم نہیں کیا۔ ان کا شعور ایک بندھی ہوئی شخصیت میں موجود ہے۔ جو بھی ان میں فرق نہیں ہوئی ہے۔ فرق ہونا ممکن ہے فنا کا کوئی درجہ ہو لیکن یہ پاگل پن کی ایک کیفیت ہے جس کے بعد کلام تک ممکن نہیں رہتا۔ اور اس کیفیت سے قبل کا تمام کلام بے معنی ہو جاتا ہے۔ لوگ چاہے شاعرانہ تجربے میں یا تصرف کے میدان میں اس کا شکار ہوئے ہوں ان کا مقام لاؤتزو کی ایک چپ ہے جس کے پہلے یا بعد میں کچھ نہیں ہے۔

ہجوم میں گم ہونے کے بجائے اس سے واپسی کی خواہش اور اپنی شخصیت کی پہچان دونوں عمل کرار نوری کی شاعری میں موجود ہیں۔

گھر کا سناٹا یہ مانا کہ ڈراتا ہے مجھے
پھر بھی گھر میں کوئی اپنا نظر آتا ہے مجھے
لگن یہ ہے کہ جو کچھ ہے مجھے معلوم ہو جائے
کہ میری ذات میں پیدا نیا مفہوم ہو جائے

اب اس ڈر سے کہیں کہ بات زیادہ فلسفیانہ نہ ہو جائے کرار نوری کی غزل کے تین شعر اور سن لیں جو ان کے استاد ہونے کی دلیل ہیں ۔

باتوں باتوں میں وہ خود اپنا پتہ سمجھا تا
اور پوچھو تو پتہ اپنا بتاتے بھی نہیں
ان کو دیکھو تو خفا، ان کو نہ دیکھو تو خفا
ان سے پوچھو تو سبب اس کا بتاتے بھی نہیں
راستہ پوچھتے ہیں وہ سر راہے ہم سے
ہم بتاتے ہیں تو اس راہ پہ جاتے بھی نہیں

o

بدر اورنگ آبادی

آتی جاتی لہریں —— ایک مطالعہ

"آتی جاتی لہریں" مظہر امام کے ان سترہ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۸ء کے درمیان "دانشوروں" یا ریڈیو کے لئے لکھے گئے لیکن وہ "تنقیدی مضامین" نہیں ہیں۔ وہ "نقاد یا ناقد" ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو نقاد یا ناقد تو جبراً "تختہ دار پر چڑھنے کے بعد ہی" کہیں گے۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ نہ صرف اچھے ناقد کے بنیادی وصف کی باتیں کرتے ہیں بلکہ انہیں اچھے "تنقیدی نمونوں کی کمی" اب بھی کھٹکتی ہے۔ اس تضاد کی وجہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ مشمولات میں دس مضامین تو کچھ اس قسم کے سرسری جائزے ہیں کہ ان کی مضمون کے عنوان سے کوئی مطابقت ہی نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ "ریختہ گو نگے سفر کا" کے بعد ہر عنوان کے ساتھ کوئی اضافت ضروری سمجھتے ہیں۔ ٹائیٹل کے مضمون کے تحت مصنف نے اپنے متنوع اور منتشر خیالات یکجا کر دیئے ہیں جن کے مرکزی خیال تین ہیں۔

(۱) نئی نسل کے مسائل سے گفتگو کرنے والے شعراء اور نقاد بھی کٹرپن کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے یہاں رواداری اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کا فقدان نظر آتا ہے۔

(۲) بعض نئے لکھنے والے صوبائی اور علاقائی عصبیت سے بھی اپنے آپ کو بند نہیں کر سکے اور (۳) آج مغربی ادب سے براہ راست اور بالواسطہ دونوں ہی طرح سے استفادہ کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ یہ باتیں ارفع ادب کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اور ان پر کھل کر بحث کی ضرورت تھی لیکن اختصار کے باعث تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ سب سے پرانا مضمون (۴۸ء) "مخمور جالندھری کی شاعری کا دور اولیں" ہے جس کی حیثیت "ایک سرسری" یا "پیشہ ورانہ تبصرے" سے کسی طرح زیادہ نہیں۔ اور اسی لئے یہ مضمون قابل توجہ بھی نہیں ہے۔

اس کے بعد کا مضمون (۵۸ء) کرشن چندر کی فلم "سرائے کے باہر" کا ایک تجزیہ ہے۔ لیکن "تنقیدی نوعیت کے مضامین" کے مجموعہ میں اس مضمون کی شمولیت کا جواز نہیں۔ اس لئے کہ فلم کے معیار سے کرشن چندر کے فن کا موازنہ ہی فعل عبث ہے۔ "ادب اور بہاریت" (۵۹ء) دراصل ماہنامہ صنم (پٹنہ) کے بہار نمبر کا ریویو ہے۔ جس میں اس شمارہ کی تمام برائیوں اور کمزوریوں کو اچھالا گیا ہے۔ شاد عارفی کو تنقید نویسوں کے یہاں وہ درجہ نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انہوں نے کمزور لیکن مقبول شعرا کی طرح اپنی شاعری کے زرد چہرے پر ترقی پسندیت و استعارات کا غازہ نہیں ملا۔ وہ نہ کسی تحریک سے براہ راست اور نہ بالواسطہ وابستہ

ہوئے اور نہ انہوں نے مشاعروں میں نغمہ گری یا اداکاری کے جوہر دکھائے"۔ اس پس منظر میں قاری جب شاد عارفی کی شاعری کا انفرادی پہلو ڈھونڈھنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ مظہر امام نے اس مضمون (۶۶ء) میں کسی ایسی خوبی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ جو شاد عارفی کی شاعری کو دوسرے شعرا کے کلام سے ممیز کر سکے۔ اس لئے اس مضمون کا عنوان" شاد عارفی کی شاعری" زیادہ موزوں اور مناسب ہوتا۔ شاد عظیم آبادی پر جو مضمون (۶۹ء) شامل ہے اس میں بھی بہ لحاظ عنوان اگر قاری ان محاسن کی تلاش کرے جن کی بنیاد پر شاد کو "نئی غزل کا پیش رو" کہا جا سکے تو اس کی تمام کوششیں بے سود ہوں گی۔ سرسری جائزے کے بعد مظہر امام صرف یہ کہہ سکے کہ شاد نے اپنے لئے جو رنگ منتخب کیا وہ دراصل بہار اسکول کا سب سے نمائندہ اور سب سے عمدہ رنگ ہے۔ (لفظ نمائندہ کے ساتھ "سب سے" کا استعمال محل نظر ہے) "سلام مچھلی شہری طوفان بہاراں کا شاعر" (۴۷ء) میں شاعر سے متعلق تقریباً سبھی باتیں ملتی ہیں۔ ان کی حیات کے چند گوشے "ساقی" میں چھپی ہوئی ان کی نظموں کی ایک فہرست سلام کے کلام پر تبصروں سے طویل اقتباسات اور ان کی نظموں سے حوالے۔ لیکن سلام کی شاعری کا مظہر امام نے بہت ہی سرسری جائزہ لیا ہے اور طوفان بہاراں کا شاعر کہیں نظر نہیں آتا۔

"آزاد غزل پر ایک نوٹ" (۸۰ء) ایک وضاحتی مضمون ہے۔ جس میں اس تجربہ سے متعلق شکوک شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے۔ اس کی مختلف فنی تراکیب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس نئی صنف غزل کے امکانات پر مدلل بحث کی گئی ہے جن لوگوں نے آزاد غزل میں (مثبت یا منفی) دلچسپی لی ہے۔ ان کے حوالے ہیں۔ یہ مضمون جاندار اور مکمل ہے۔ اور تخلیق کار کے لئے لمحہ فکر مہیا کرتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ آزاد غزل مظہر امام کا "جزو ایمان" ہے۔ افسانہ نگاری چونکہ مظہر امام کا میدان

نہیں۔ اور نہ وہ خود نقاد یا ناقد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لئے اس ضمن میں جو چار مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ وہ کسی خصوصیت کے حامل نہیں۔ نیا اردو افسانہ میں بہت کچھ کہنے اور پھیلاؤ کی گنجائش تھی۔ لیکن یہ مضمون نئے افسانہ نگاروں کی ایک نامکمل فہرست بن کر رہ گیا۔

"داغ کا ایک غیر معروف شاگرد" سعادت نظیر پوری (۶۱ء) ایک اچھا تحقیقی مقالہ ہے۔ جس میں قاضی عبدالودود کے ایک مضمون کے حوالہ سے ان پر سخت چوٹ بھی کی گئی ہے۔ کہ قاضی صاحب کی تحقیق کا سب سے بڑا وصف دوسروں کی اہمیت کو گھٹانا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ محققین اس الزام (یا حقیقت ؟) کی طرف سنجیدگی سے دھیان دیں۔ "اردو شاعری میں صورت کی جلوہ گری" (۶۸ء) بڑی کاوش سے لکھا ہوا ایک اہم مضمون ہے۔ جو مظہر امام کے وسیع اور عمیق مطالعہ دور رس نگاہوں اور فنی بصیرت کا مظہر ہے "۱۸۵۷ء کے عہد آخریں سال" میں اور اس کے بعد اکثر شاعروں نے اردو شاعری کو نئے سانچے دیئے۔ اور ان سے جو نئے اسالیب بیان ملے، اور جس طرح نت نئی ہیئتوں سے اردو شاعری روشناس ہوئی۔ جن سے نئے شاعروں کو بیش از بیش تجربہ کرنے کا حوصلہ ملا۔ ان تمام پہلوؤں پر مظہر امام نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ کس طرح نئے نئے تجربات نے اسلوب و اظہار کے دائرے کو وسیع کیا ہے۔ اور اعلیٰ شاعری کی تخلیق کے لئے فضا سازگار ہوئی ہے۔" اس کا تفصیلی جواب اس مضمون میں ملتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ غزل کی ہیئت میں واقعی انقلابی تجربہ آزاد غزل کی صورت میں ہوا" شاعرانہ تعلّی کے مترادف ہے۔ کہ اگر آزاد غزل کی اس خصوصیت کو ذہن میں رکھا جائے کہ "حشو و زوائد سے بچانے کے لئے دونوں مصرعوں کے ارکان گھٹائے بڑھائے جا سکتے ہیں۔" تو آزاد غزل کو واقعی "انقلابی" تجربہ ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ جوش نے بھی حسب ضرورت

مصرعوں کی ترتیب میں ارکان کی کمی بیشی کو روا رکھا"۔ (ص ۴۴)
اور بعض شعرا نے اپنی جدت طبع کو راہ دے کر مروج بحروں میں
ارکان کی کمی بیشی کی ہے یا نئی بحریں نکالی ہیں۔ (ص ۵۲)

"کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر" (۲۶۱) دراصل اسی نام سے پاکستان میں شائع شدہ ڈاکٹر ممتاز احمد کی کتاب پر تبصرہ ہے۔ اور اس تبصرہ سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ مظہر امام کو طنز نویسی پر کافی عبور حاصل ہے۔ بلکہ میں تو بلا تامل یہ بھی کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ مضمون ایک اچھوتا انشائیہ ہے جس میں زیر لب مسکراہٹیں بھی ہیں اور طنز کی سنگ باری بھی۔ بے چارے ممتاز احمد نے کلیم صاحب کی شاعری کی عظمت اور بڑائی ثابت کرنے کے لئے یہ تکنیک اپنائی کہ ہر نظم کو کسی نہ کسی انگریزی، فرانسیسی یا فارسی شاعر کے کلام سے جوڑ دیا۔ اس عجیب پیوندکاری پر مظہر امام نے بڑا دلچسپ مصرع چسپاں کیا ہے ؎

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

اپنے انداز بیان سے "ممتاز احمد نے جو مضحکہ خیز سچویشن پیدا کر دی ہے۔ اس تناظر میں مظہر امام کے یہ جملے قاری کو گدگدا دیتے ہیں۔ اگر آپ مجھے تھوڑا سا وقت اور عنایت کریں۔ تو میں حوالے دے کر یہ بتاؤں گا کہ مصحفی اور سودا نے کن کن مغربی شاعروں سے الفاظ اور محاورے مستعار لئے تھے۔ اتنا تو خیر آپ بھی جانتے ہوں گے کہ نہ ہے۔ "شیکسپیر کے" "S ر" اور نہ "ملٹن کے" "S A R ..." سے لیا گیا ہے۔

تیس صفحات پر پھیلا ہوا سب سے طویل مضمون "ناقدروں کے مقتول: پرویز شاہدی" (۲۸۶) ہے۔ پرویز شاہدی خود اتنے لاابالی اور بے نیاز فطرت کے مالک تھے۔ کہ اپنے کلام کی اشاعت سے ایک طویل عرصہ تک بے پرواہ رہے۔ اور جب انہیں اشاعت کلام کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ہوا یا دلایا گیا۔ تو حالات بہت بدل چکے تھے۔ اور کھوٹے سکے ہائے رائج الوقت میں اتنی چمک دمک پیدا ہو چکی تھی کہ ایک نئے لیکن کھرے سکے کو بازار ادب میں وہ درجہ اعتبار نہیں مل پایا۔ جس کا وہ صحیح معنوں میں مستحق تھا۔ اسی تناظر میں مظہر امام نے پرویز شاہدی کے مختلف ادوار کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اور ان کی شاعری کے رنگ و آہنگ، اسلوب، ہیئت اور تہہ داری کو اجاگر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

"پرویز شاہدی کے یہاں شاداب خیالی کے ساتھ ایک والہانہ پن، سرمستی، نشاط افروز آلودگی، کھو جانے کی کیفیت، موسیقیت اور غنائیت ہے جو انہیں ان کی قبیل کے دوسرے شہرت یافتہ شاعروں مثلاً سردار جعفری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی وغیرہ سے ممتاز و ممیز کرتی ہے۔ اور انہیں ایک انفرادی شان عطا کرتی ہے"

لیکن تمام زور قلم کے باوجود مضمون میں اتنی متضاد باتیں در آئی ہیں کہ وہی پرویز کی شاعری کو بے وقعت بنانے کے لئے کافی ہیں۔ جب خود مظہر امام کو پرویز کی شاعری کے کسی ایک رنگ یا ایک اسلوب میں استقلال نظر نہیں آیا۔ تو ان کی یہ شکایت بے جا ہے کہ:

"پرویز شاہدی کی شاعری پر کسی نے باقاعدہ مقالہ لکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی"

مظہر امام کے تجزیہ کی روشنی میں پرویز شاہدی کی شاعری میں کئی متضاد دھارے نظر آتے ہیں۔

(۱) ۱۹۳۰ء کے پہلے کی بعض غزلوں کے اشعار پر رنگ جگر کا ہے "انداز بیان ہی نہیں زمینیں بھی جگر سے لی ہوئی ہیں لیکن (اور یہ "لیکن" اہم ہے) یہ رنگ انہیں راس نہیں آیا۔ (ص ۱۲۴)

(۲) انہیں نظم [illegible] والہانہ پن اور کیف و سرمستی کی دولت عطا ہوئی تھی [illegible] یہ "اگر [illegible] توجہ ہے) وہ جذبے کی آنچ.

اور روح کی آگ میں تپ سکتی تو اردو شاعری کو بھی ایک
ایک حافظ مل سکتا تھا (ص ۱۲۷)

(۳) پرویز شاہدی اپنے بعض نظموں میں ناہمواری
کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ (ص ۱۳۱)

(۴) پرویز اپنی قادر الکلامی سے یہ ثابت کرنا چاہتے
ہیں (گو یہ بات بھی نہیں ہے ـــ) کہ وہ ہنگامی موضوعات
کو پائندگی بخش سکتے ہیں۔ مگر ایسی کوشش تو ظفر علی خاں
بھی کرتے رہے۔ اور ان کا حشر ظاہر ہے (ص ۱۳۲)

(۵) شاعرانہ صناعیوں سے پرویز شاہدی کا کلام بھرا
پڑا ہے۔ "لیکن" کبھی کبھی ان کی ترکیبیں اضافت کی زیادتی یا
لفظ کی ثقالت سے بوجھل ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی کبھی فنی تساہل
کا بھی شبہ ہوتا ہے (ص ۶-۱۳۵)

"آنکھ کا شاعر" محمد علوی (۷۸-۲) اس لحاظ سے یقیناً یہ
ایک اچھا مضمون ہے کہ اس میں مظہر امام نے عنوان کے
لحاظ سے علوی کے شاعرانہ رنگ و روپ ان کی شاعری کی
تازہ کاری اور تازہ دمی اور ان کے کلام کے غمناک لہجہ پر سیر
حاصل بحث کی ہے۔ علوی کے تیسرے مجموعہ کلام کے دیباچہ
کی بدنمائی بڑے پیارے ڈھنگ سے پیش کی گئی ہے۔ اور یہ
حقیقت ہے کہ دیباچہ نویس کسی فن کار کی تخلیق پر روشنی
ڈالنے سے زیادہ اپنی ہی قابلیت کی نمائش کرنا چاہتا ہو
تو یہی ہوتا ہے کہ روشنی نہیں پہونچ پاتی۔

مظہر امام نے شروع میں باقاعدہ پابند نظمیں لکھیں۔
اور فن عروض کے نکات سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کی۔
(ص ۹۰) اور کئی مضامین میں انہوں نے بحر و ارکان سے متعلق
تفصیلی بحث کی ہے۔ ص ۵۴ پر یہ نکتے بھی ملتے ہیں:

"اجتبیٰ رضوی نے اپنی نظم ایسے جلوے میں
ایک نئی بحر استعمال کی ہے جو علم العروض کی
مروجہ کتابوں میں نہیں ملتی۔
بحر متدارک کی اس مخصوص جدید ترکیب
زحافی سے کی جا سکتی ہے"

شہاب الدین ثاقب

توصیف تبسم کی شاعری

موجودہ عہد میں پاکستان میں غزل گوئی کی روایت جن شعرا سے عبارت ہے ان میں توصیف تبسم کا نام بھی اپنی تخلیقی انفرادیت کے سبب اہمیت کا حامل ہے۔ اچھا فن ہمیشہ اجتماعی اور آفاقی ہوتا ہے لیکن اس کی قدر و قیمت کے تعین کے لئے جمہوری پیمانوں کو کافی حد تک غیر وقیع سمجھا جاتا ہے۔ غزل کا معیار بھی شعرا کی کثرت تعداد پر منحصر نہیں۔ بلکہ فنی نزاکتوں کی پاسداری پر ہے۔ اسی لئے جب اردو کے نمائندہ غزل گو شعرا کی فہرست تیار کی جاتی ہے۔ تو قلی قطب شاہ سے لے کر فراق تک شعرا کی بے شمار تعداد میں سے صرف چند نام ہی ہماری توجہ کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ جن میں میر اور غالب کو نمائندہ حیثیت حاصل ہے۔ غالب کا تعقل و تفکر اور تخلیقی پیچیدگی اس دور کے نظام زندگی سے پوری ہم آہنگ ہے۔ لیکن اس اشتراک کے باوجود اردو شاعری پر میر کا اثر ہی کچھ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کا غالب سبب یہ ہے کہ فکر و نظر کی وسعت، علوم و فنون کی ترقی، اور عقل و شعور کے اس دور میں بھی میر جیسی زندگی کی بہت سی محرومیاں، خواب و ارماں اور نامرادیاں ہمارے عہد کی زندگی کا حصہ ہیں۔ چنانچہ جدید غزل کا اچھا خاصا سرمایہ میر کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ناصر کاظمی، ابن انشا، اور خلیل الرحمن اعظمی کا نام مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور توصیف کی شاعری بھی اسی شعری روایت کی توسیع معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں ایسے شعرا کی بھی کمی نہیں جو میر یا غالب کے تتبع میں اس حد تک آگے بڑھے کہ ان کی آواز ان کے اسی مقررہ دائرے میں گھٹ کر رہ گئیں۔ پھر بھی وہ میر یا غالب نہ ہو سکے۔ توصیف تبسم کی شاعری میں ایک واضح ارتقا موجود ہے۔ میر اور غالب دونوں سے انہوں نے کافی اثرات قبول کئے لیکن اس پیروی کے دائرے سے بھی وہ آغاز سفر میں ہی بہتوں سے آگے نکل گئے۔ ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جو میر کے رنگ میں کہے گئے ہیں۔ لیکن محسوسات اور پیرایہ بیان کی تازگی نے انہیں ایک علاحدہ رنگ دیا ہے۔ جو توصیف کا انفرادی رنگ ہے:

فقط جبیں کا لہو یا نخوں کا مقدر تھا
ہر ایک رنگ مری دسترس سے باہر تھا
بہا کے ساتھ کناروں کو لے گیا سیلاب
جہاں پہ بہتا ہے دریا کبھی یہاں گھر تھا

لوٹا نہ کوئی قافلۂ رنگ و بو کے ساتھ
کس کس کو سوئے دشت بلانے گئی ہوا
ہم سے مایوس نہ ہو بجھتی ہوئی شام شفق
خون ہے دل میں بہت رنگ اگر کم ہو جائیں
کل نہ روئے گی کوئی شاخ عزادار انہیں
ان شگوفوں سے کہو شامل ماتم ہو جائیں

دل بیاضِ عمر کی اوراق گردانی میں ہے
کیا خبر ہے کون سا صفحہ کھلا رہ جائے گا۔

آخر کو ہم بھی گرد میں تحلیل ہو گئے
جن راستوں میں کوئی نہ تھا لے گئی ہوا
ہر شاخِ سر کو پیٹ کے یک بار رہ گئی
کس کو خبر درخت سے کیا لے گئی ہوا

اب نہ ابھرے گا کبھی شام کا ڈوبا سورج
شب کو محراب پہ ہر لفظ نمایاں لکھو

کہہ دو ہوائے شام سے آہستہ تر چلے
آباد روشنی کا نگر پانیوں میں ہے

توصیف کے یہاں شعری تجربے کا اظہار پیکر تراشی کے وسیلے سے ہوا ہے۔ توصیف کی شاعری اپنے انفرادی نشانات رکھتی ہے۔ پیکر تراشی کے ذریعہ انہوں نے محاکات نگاری، محسوسات کی شدت، قوت متخیلہ اور قدرت کلام کا مظاہرہ کیا ہے۔ زندگی کے ٹھوس اور سچے تجربات اور محسوسات کی مجسم شکلیں بھی انہیں پیکروں کے سہارے ان کے یہاں ابھری ہیں۔ اور جابجا تغزل کا حسن بھی ان پیکروں کی مدد سے واضح ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ خوبصورت سا شعر دیکھیے ؎

وہ جو دن میں رنگ ہے رات کو خوشبو ہے
اس چہرے کو منظر منظر یاد رکھو

اس شعر میں استعارے کی مدد سے لونی اور شامی پیکر تراشے گئے ہیں۔ لونی پیکر کا تعلق بھی دیکھنے کے عمل سے ہے۔ اس لئے اسے بھی بصری پیکر ہی کہیں گے۔ اردو شاعری میں پیکر تراشی کی ایسی عمدہ مثال اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ دن کی سفیدی اور اس کی روشنی قوت باصرہ کو دعوت دیتی ہے جس کے ذریعہ انسان اپنی بینائی کی گرفت میں آنے والی تمام اشیاء کو دیکھ سکتا ہے۔ اور دن کا ایک رنگ مظاہر کائنات کے بہت سے رنگوں کے دیدار میں ہماری مدد کرتا ہے۔ لیکن رات کی تاریکی مظاہر کائنات کے تمام رنگ اور اشیا پر اپنا سیاہ پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس لئے دیکھنے کا عمل رات میں سست پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ رات کے ساتھ شاعر نے شامی پیکر ابھارا ہے۔ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ یہ دونوں پیکر دو مختلف اوقات میں ابھارے گئے ہیں۔ اس لئے ہمارے دونوں حواس (باصرہ اور شامہ) بھی بیک وقت متوجہ اور متحرک نہ ہو کر الگ الگ وقتوں میں متحرک ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان پیکروں کا اثر دونوں حواس پر زیادہ گہرا اور چھا جانے والا ہوگا۔ دونوں حواس کو الگ الگ وقتوں میں متحرک کرنے کا سبب یہ بھی ہے کہ آخری مصرعہ میں اس چہرے کو منظر منظر یاد رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ رات کی سیاہی محبوب کے زلفوں سے عبارت ہے جس میں شامہ کو متاثر کرنے کے اوصاف بھی پائے جاتے ہیں۔ اور دن کا اجالا اس کا صاف و شفاف چہرے کی مانند ہے۔ اگر کوئی چیز یکساں صورت میں ہمارے سامنے آتی رہے تو اس کی اصل ماہیت بھی خود بخود حافظہ کی گرفت میں آجاتی ہے۔ لیکن جس چیز کے کئی پہلو ہو اور ہر آن وہ زاویے بدل کر ہمارے سامنے آئے تو اسے حافظہ کی گرفت میں لانے کے لئے تھوڑی سی کوشش کرنا پڑتی ہے۔ یہاں محبوب کی بھی اتنی ادائیں اور ایسے زاویے ہیں وہ دن میں رنگ ہے تو رات کو خوشبو۔ مذکورہ شعر کے پیرایہ بیان پر اگر غور کیا جائے تو اس کے دونوں مصرعوں میں کہیں بھی اضافت نہیں ہے۔ اور ایسے سادہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن میں ایک طرح کا صوتی ٹھہراؤ موجود ہے۔ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ کسی چیز کو یاد رکھنے کیلئے ٹھہر ٹھہر کے ہی پڑھنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ اور رنگ اور خوشبو سے حافظہ کو

تقویت ملتی ہے۔

توصیف نے کائنات کا اچھی طرح مشاہدہ کیا ہے اپنی شاعری کو انہوں نے قوت متخیلہ کا اس حد تک پابند نہیں کیا کہ جس کے سبب زمین سے اس کا رشتہ ہی باقی نہ رہے۔ ان کے یہاں ہر طرح کی پیکر تراشی ملتی ہے۔ لیکن بصری اور لمسی پیکر کی مثالیں کچھ زیادہ ہیں۔ جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے نیرنگئی زمانہ کو بغور دیکھا ہے۔ اور اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ ذیل میں بصری پیکر کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؎

ہم سے مایوس نہ ہو بجھتی ہوئی شام شفق
خون ہے دل میں بہت رنگ اگر کم ہو جائیں

اچھے لگے تھے آنکھ کو جلتی خزاں کے رنگ
اے دل وہ کیا مقام غم رنگ و بو کے تھے

جہاں کو دیکھنا چاہا تھا یہ نہ چاہا تھا
مری نظر ہی یہاں منظروں میں بٹ جائے

پت جھڑ میں شاخ شاخ تھی تلوار کی طرح
حیرت ہے کیسے خود کو بچا لے گئی ہوا

آنکھوں میں یوں بسی ہیں سفر کی رفاقتیں
پوچھے کوئی تو کہہ دوں سر منزل کہاں نہ جائے

اسی طرح لمسی پیکر کی مثالیں بھی ملاحظہ ہوں ؎

زلیست تپتے ہوئے صحرا کا سفر تھی شاید
سایہ ہوتا تو مسافر کہیں ٹھہرا ہوتا!

اک پگڈنڈی بدن کسی کا جس پر اپنا مورکھ من
دیکھ کے رستہ بھولے ہے اور جاں کے ٹھوکر کھائے ہے

جاں میں اتر گئی ہے درختوں کی سائیں سائیں
تنہا ہوں میں کہ بزم میں شامل کہا نہ جائے

دن کا سورج کب کے گہرے اندھیاروں میں ڈوب چکا
تن کی آنچ ابھرے جس میں سب کچھ پگھلا جائے ہے

توصیف کے یہاں مخلوط پیکر کی بھی اچھی مثالیں موجود ہیں۔

مٹی سے رنگ، شاخ سے پتے، گلوں سے بو
جو بھی ہوا کے ساتھ گیا، لے گئی ہوا

جو بھی گزرنی ہے آنکھوں پر کاش اک بار گزر جائے
سرد ہوا میں ظلم تو یہ ہے پتا پتا گرتا ہے

یہاں پہلے شعر میں بصری، شامّی، سمعی اور لمسی چاروں پیکر ابھرے ہیں۔ تو دوسرے شعر میں بصری اور لمسی اور سمعی پیکر موجود ہیں۔ ان کے یہاں بعض اشعار ایسے بھی ہیں جسکے پہلے مصرعہ میں کوئی ایک پیکر اور دوسرے مصرعہ میں کوئی دوسرا پیکر ابھارا گیا ہے مثلاً ؎

رکوں تو دور سے آوارگی صدائیں دے
قدم بڑھاؤں تو زنجیر پا لپٹ جائے

دن کا سورج کب کے گہرے اندھیاروں میں ڈوب چکا
تن کی آنچ ابھرے جس میں سب کچھ پگھلا جائے ہے

ہوں ایک عمر سے اوڑھے ہوئے بدن اپنا
جو بن پڑے تو بدل لوں نہ پیرہن اپنا

محولہ بالا پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں بصری اور دوسرے مصرعہ میں لمسی پیکر موجود ہے۔ اور تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ لمسی اور دوسرا مصرعہ بصری پیکر کی مثالیں پیش کرتا ہے۔

سمعی پیکر بھی توصیف کے یہاں بڑی خوبی سے ابھرے ہیں

جو نیند آئے تو یہ پاگل ہوا سونے نہیں دیتی
عجب اک شور دروازوں پہ پیہم دستکوں کا ہے

پتے ہلے تو آئینہ خانے شکست تھے
کیا گنیا طلسم ہوش ربا لے گئی ہوا

دل میرا ایک ہی موسم ہے اب کیا نشہ کیا بے کیفی
تیری اک پیماں شکنی سے ٹوٹے کتنے پیمانے

بس ایک گونج ہے جو ساتھ ساتھ چلتی ہے
کہاں پہ چھوڑ گئے فاصلے صدا کے مجھے

نوا گران تمنا بھی سو گئے تھک کر
حریم جاں میں مگر شور غم برابر تھا

توصیف نے پیکر تراشی کو اپنے شعری تجربے اور تخلیقی اظہار کا ایک موثر اور مستقل ذریعہ بنا کر اردو شاعری میں ایک دلچسپ اور دلکش طرز ادا کے نقوش روشن کئے ہیں۔ یہ دھندلے نقوش اردو شاعری میں بہت قدیم سے موجود تھے لیکن انہیں واضح اور روشن کر کے توصیف نے غزل کی تخلیقی روایت میں ایک طرح کا اضافہ کیا ہے۔ اور یہ اضافہ محض پیرایۂ بیان کی شعبدہ بازی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے اپنے تمام حواس سے کام لے کر اپنے گرد و پیش اور اندرون و خارج کا جائزہ لیا ہے۔ زندگی کی واضح اور تلخ حقیقتوں کی ترجمانی اور نئے زمانہ کے حالات و محسوسات کی شدت ان کے یہاں ظاہر ہوئی ہے۔ چنانچہ توصیف کی شاعری کا مجموعی تاثر نشاطیہ اور رجائیہ نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں سنجیدگی غالب ہے۔ اس سلسلے میں ان کے درج ذیل اشعار بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

چلتے چلتے شام ہوئی ہے تنہائی کے جنگل میں
پھیل کے ہر سو چھا جائینگے دکھی دلوں کے ویرانے

شوق تعمیر بسائے گا خرابے کیا کیا
آدمی ہے تو ہر اک شہر میں صحرا ہوگا

سفینے ہو بھی چکے تہ نشیں مگر دریا
سمیٹتا نہیں دامان پر شکن اپنا

جو مجھکو چھوڑ گیا اتنا بے خبر تو نہ تھا
جو ہم سفر ہے مرا درد جانتا ہی نہیں

نظر کے ساتھ افق کیا کھلے کہ ہم سفرو!
شکستہ ہو بھی چکے حوصلے پروں کی طرح

یاد آئیں گی بہت نیند سے بوجھل پلکیں
شام کے ساتھ یہ دکھ اور گھنیرا ہوگا

اب دیکھ لو کہ دیدۂ تر پانیوں میں ہے
کے دن یونہی رہے گا جو گھر پانیوں میں ہے

جشن مہتاب رات بھر ہے یہاں
صبح کیا ہو کسے خبر ہے یہاں

حقیقتوں کے اعتراف کے نتیجہ میں توصیف کے یہاں اس انداز کی شاعری وجود میں آئی ہے۔ ورنہ ان کے یہاں

ایسے اشعار بھی کم و بیش موجود ہیں جن سے زندگی کو سلیقے سے برتنے اور اس کے لئے نئے امکانات کی جستجو کا پتہ چلتا ہے مثلاً ؎

کیا عجب کوئی کرن ہم سفر خواب ملے
تا سحر لے کے چلیں نیند کے ماتے خود کو

اب نہ ابھرے گا کبھی شام کا ڈوبا سورج
شب کی محراب پہ ہر لفظ نمایاں لکھو

تجھ بھی اے غم جاں کم ملیں گے ہم ایسے
متاع درد سمیٹی ضرورتوں کے بغیر

خاک ہو کر ہوا کے ساتھ چلو
اور کیا صورت سفر ہے یہاں

ہمت نہیں تو اپنے سفینے میں ڈوب مر
توفیق ہو تو چھین لے ساحل بھنور سے تو

سارے دریا کا لہو دیدۂ گرداب میں ہے
قصۂ موج بہ اندازۂ طوفاں لکھو

فکر اور سنجیدگی کے غلبہ سے توصیف کی شاعری بوجھل پن کا شکار بھی نہیں ہوئی ہے۔ وہ عقل کو جذبات پر ترجیح دیتے ہیں لیکن جذبات کی اہمیت کو بھی سمجھتے ہیں۔ موقع محل کے لحاظ سے جذباتی ہونا ان کے نزدیک برا نہیں ؎

نکلو کبھی تو توڑ کے زنجیر ہوش بھی
اسباب وحشتوں کے بہم ہو چکے بہت

وقت کی نبض کو وہ اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ ان کی ہوشمندی انہیں حالات سے سمجھوتہ کر لینے پر آمادہ تو کر لیتی ہے۔ لیکن حالات کی اسیری کو وہ تسلیم نہیں کرتے۔ اور ایسے سازگار ماحول اور آزاد فضا کے منتظر رہتے ہیں جس میں ان کی انانیت اور خودداری بال و پر پھیلا سکے ؎

بارش سنگ میں اپنے لہو سے تر آنکھو!
کس نے مارا پہلا پتھر یاد رکھو

حالات کے جبر سے گرد و پیش کے ماحول کی شکست کے عالم میں بھی وہ استحکام اور اعتماد کے ساتھ اپنے اندرون کی تعمیر میں لگے رہے ہیں ؎

میں اپنی موج میں ڈوبا ہوا جزیرہ ہوں
اتر گئے ہیں سمندر بلند پا کے مجھے

خود اعتمادی اور استحکام ذات کی یہ روش توصیف کو خواجہ میر درد سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ تعلّی اور خودستائی ان کے یہاں مفقود ہے۔ اس کار و بار گیتی میں وہ انفرادی اور اجتماعی سود و زیاں کے احساس اور احتساب کی منزلوں سے بھی گزرے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر نظریاتی تبلیغ کی بوجھل پن سے اپنے فن کو محفوظ رکھتے ہوئے کچھ ایسے نشانات بھی چھوڑ جاتا ہے جو ہمیں بصیرت کی منزلوں تک پہنچاتے ہیں ؎

اب سوچ منزلوں سے بھی حاصل ہوا ہے کیا
خود آپ اپنی گرد ہے بار سفر سے تو

آشنا لوگ جو انجام سفر سے ہوتے
صورت نقش قدم آپ مٹاتے خود کو

دکھاتے آئینہ اوروں کو کس طرح توصیف
مثال آپ تھے ہم اپنے زشت میں اپنا
مرتے مرتے زندگی کا خواب تو پورا ہوا
بہہ گیا سارا لہو تن کا [illegible]

خزاں میں بکھرا ہے جو زرد پتیاں ہو کر
کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤ گی اے ہوا اُسے

موضوع کے لحاظ سے توصیف کی شاعری ایک وسیع فضا رکھتی ہے۔ عصری زندگی کی پرچھائیوں کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جنھیں غزل کے اچھے شعروں میں شمار نہ کیا جائے مثلاً ؎

میرا ہنر بھی کوئی شکل دے سکا نہ تجھے
نظر میں گرچہ تری ہر ادا کا پیکر تھا

لگتی نہیں پلک سے پلک جیسے آج تک
آنکھوں میں سارے خواب اسی خوبرو کے تھے

اک حد خاص سے بڑھتے نہیں کاکل تیرے
حادثہ یہ بھی مری جان پہ گزرا ہوتا

گرفت میں نہیں آتا وہ خواب سا پیکر
بڑھاؤں ہاتھ تو کچھ اور دور ہٹ جائے

صرف تو ہوتا تو تیرا وصل کچھ مشکل نہ تھا
کیا کریں تیرے سوا کچھ ہم نے چاہا اور بھی

لوگو! باہر کچھ بھی نہیں ہے مت بھولو!
سب منظر ہیں آنکھ کے اندر یاد رکھو

توصیف کی شاعری ان کے پختہ تجربات کی آئینہ دار ہے۔ اور خلا میں پرواز کرنے کی بجائے زمین سے اپنا رشتہ استوار کئے ہوئے ہے۔ انہیں زبان و بیان پر استادانہ قدرت حاصل ہے۔ روایت سے انہوں نے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ لیکن روایت کے اسیر نہیں ہوئے ان کی شاعری روایت اور جدت کا حسین فکری وفنی امتزاج ہے۔

آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ توصیف کی شاعری کا دامن فکر اور اسلوب ہر دو لحاظ سے وسیع اور متنوع ہے۔ وہ اپنے تخلیقی سفر میں ترقی کے نئے امکانات کی طرف رواں دواں ہیں۔ ان کی غزلوں سے چند اور اشعار ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں جن میں فکر و فن کی ایک نئی فضا کا احساس ملے گا ؎

آندھیوں نے کر دیئے سارے شجر بے برگ و بار
ورنہ جب پتے کھڑکتے، دل لرزتا اور بھی

ہم تو وابستہ رہے تجھ سے کہ ہے بوئے وفا
تو نے کیا سوچ کے اے غم ہمیں چاہا ہوگا

اَن دیکھے ساحلوں کی لگن بھی عجیب تھی
سب کو خبر تھی جاں کا خطر پانیوں میں ہے

دل کو فرقت میں اگر ضبط کا یارا ہوتا
دردِ ہوتا بھی تو ٹھہرا ہوا دریا ہوتا

کیا سوچ کر جنونِ وفا پر ہنسے تھے ہم
دیکھا تو خود بھی صید اسی آرزو کے تھے

کہنے کو خد و خال نظر آشنا سے ہیں
ہے کون آئینے میں مقابل کہا نہ جائے

رہگزر سیلاب بنے کیا دونوں روزن آنکھوں کے
آہ بھری تو سینے میں کچھ اور دھواں گھٹ جاتا ہے

الیاس احمد گدی

دن کا زوال

زوال کا وقت .....

سورج آہستہ آہستہ نشیب میں گر رہا ہے۔

دونوں آسمان کے اس ٹکڑے پر کھڑے ہیں جسے زمین کھا چکی ہے۔

بوڑھا جس کے بال بے حد سفید اور مصنوعی لگ رہے ہیں جیب سے دستی نکالتا ہے۔ اور ایک پختہ قبر کے پائتانے کو جھاڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔

تم عزیز کو خط لکھتے ہوئے میرے دل پر کیا گزری اس کو تو کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ میاں! سات دفعہ تو چٹھی لکھی اور پھاڑی ہے۔ کوئی مضمون ہی نہیں سوجھتا تھا۔ لکھنا کچھ چاہتا تھا۔ لکھا کچھ جاتا تھا۔ نہ دماغ کام کر رہا تھا نہ قلم، تمہاری بڑی اماں میری پریشانی دیکھ کر رونے لگیں۔ بولیں چھوڑیئے! ابھی نہ لکھا جائے گا آپ سے بعد میں کچھ لکھ دیجئے گا ابھی کون سا گئے جاتے ہیں۔ سات گھنڈا ادھر تو جا کر بسے ہیں۔

آپ کی چٹھی تو ...... نوجوان متانت سے بولا۔

آپ کی چٹھی تو بڑے ابا کوئی پندرہ دن میں مل گئی تھی۔ مگر پاسپورٹ اور ویزا میں آپ جانیئے ......

میاں یہ بات تو میں جانتا تھا کہ چار پانچ مہینہ سے پہلے تو تم آ نہیں سکوگے۔ مگر چٹھی لکھنا اس لئے ضروری تھا کہ تمہارے علاوہ ہمارا کوئی عزیز بھی تو نہیں۔ پھر جب تم سے ناراض ہونے کے باوجود تمہیں چاہتا بھی بہت تھا۔ اکثر کہتا بچپن میں نہ اتنا دلیر تھا کہ اگر حق بات کہنی ہوتی تو سولی پر چڑھ کر کہہ دے کا حوصلہ اس میں تھا۔

نوجوان کے جسم کا جیسے سارا لہو تلملا کر اس کے چہرہ پر چڑھ آیا۔ پھر اچانک دھیرے دھیرے اس لالی میں پیلا گھلنے لگا۔ کشادہ پیشانی پر بوند بوند پانی بکھر گیا

ہاں میاں! تم کے ساتھ ساتھ بہت کچھ سوچتا تھا تم نے اس چیز کو سمجھا تو ماشاءاللہ آج ترقی پر ہو۔ لاکھوں کا روبار پھیلا رکھا ہے۔ بہنوں کی شادی کی، مکان خریدا، سمجھ نہ سکا وہ پاگل ......

بڑے ابا یہ بے حد عجیب بات ہے۔ بھلا رجب بھیا پاگل کیسے ہو سکتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی موضوع پر بے تکان گفتگو کرنے والا آدمی اچانک، پاگل ہو جائے تو حیرت نہ ہوگی۔

مگر ادھر بہت کم بولتا تھا۔ مجھ سے بات کئے تو کبھی ہفتوں ہو جائے۔ ماں سے بس ایک دو جملے ہی بولتا تھا۔ اور جب گھر پر موجود ہو۔ ورنہ دو دو تین تین دن لاپتہ رہتا۔ جب آتا تو بے حد تھکا ہوا۔ ٹوٹا ہوا۔ آنکھیں انگارہ سی دہکتی ہوئی گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ پھر جب بولتا تو ایسی بات بولتا جو بالکل سمجھ میں نہ آتی۔

مگر میں نے انہیں کبھی اول فول بکتے نہیں سنا تھا۔

میاں وہ اول فول بالکل نہیں بکتا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی کہ وہ جو کچھ کہتا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایسا ضرور لگتا جیسے کوئی چیز ذہن کو چھو رہی ہے۔ کوئی شکل لے رہی ہے۔ کوئی ایسی چیز بنتی معلوم ہوتی جو دیکھی ہوئی یا سمجھی ہوئی ہو۔ مگر پھر اچانک سب کچھ اندھیرے میں تیر جاتا۔ اور صرف جھلاہٹ باقی رہ جاتی۔ اس سے وضاحت طلب کی جاتی تو وہ چپ ہو جاتا۔ غصہ سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو اٹھتا۔ آنکھیں سی دہکنے لگتیں خدا کی قسم میاں اس کی آنکھوں سے ڈر لگنے لگتا تھا۔

آخر وہ ایسا کیا کہتے تھے جو......

میاں تم سنو گے تو حیرت کرو گے مثلاً ایک دن وہ کہنے لگا ابّو! آپ نے محسوس کیا ہے۔ آوازوں کا اپنا ایک اظہار ہوتا ہے۔ آوازوں کی اپنی ایک بشارت ہوتی ہے جیسے کوئی چڑھی ہوئی ندی رات کے سناٹے میں گرجتی ہے۔ گرجتی ہے نا؟ تو وہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کی پختہ اور اونچائی پر بنی ہوئی عمارت کو یہ ندی کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتی۔ مگر پھر بھی وہ ڈر جاتے ہیں۔ خوف ان کی رگوں میں سرد سیال کی طرح دوڑ جاتا ہے یہ کیا ہے آپ جانتے ہیں؟ یہ دراصل ندی کے پانی سے نہیں ڈرتے۔ بلکہ اس بشارت سے ڈرتے ہیں جو......

یا پھر جب کبھی بستی میں آگ لگتی ہے۔ اور شعلوں کے عفریت چنگھاڑتے ہیں اور ہوا ان شعلوں کو دور دور تک لپکاتی ہے۔ تب بھی وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ بستی سے ان کا فاصلہ بہت ہے۔ اور وہ جانتے ہیں کہ آگ ان تک نہیں پہونچ سکے گی۔ اس کے باوجود وہ دھڑا دھڑ کھڑکیاں بند کر لیتے ہیں اور بے حد وحشت زدہ ہو کر بند کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر جھانکتے رہتے ہیں۔

وہ ایسی ہی باتیں کرتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس کے بے ربط جملوں میں معنی و آہنگ نہ ہوتا۔ مگر ایسا ضرور لگتا جیسے کچھ ہے۔ کوئی سچ جو چھونا چاہتا ہے دل کے یا دماغ کے اندر اتر جانا چاہتا ہے۔ مگر اتر نہیں پاتا۔ تب پہلے اپنے آپ پر غصہ آتا۔ پھر اس بار جھلاہٹ ہوتی لیکن میں ڈانٹ کر کچھ کہہ دیتا تو وہ ایک دم سے چپ ہو جاتا۔ اور اس کی آنکھوں میں اس گفتگو کے دوران جو ایک چراغ سا جلنے لگتا تھا۔ ایک جوت سی جگمگانے لگتی تھی۔ وہ دھندلا جاتی اور برہمی کا ایک کٹیلا کھنچاؤ تمام چہرے پر پھیل جاتا۔

مگر بڑے ابا کیا شروع شروع میں......

میاں بہت زمانے تک تو میں حیران رہا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ بلکہ شروع شروع میں تو میں نے اسے سختی سے ڈانٹ بھی دیا تھا۔ مجھے یاد ہے سب سے پہلے اس نے ایک دن ہنس کر پوچھا تھا۔

ابّو — آپ کے ہاتھ میں —؟

میں نے غصہ سے اپنے ہاتھ اس کے آگے کر کے کہا تھا

یہ کیا ہیں —؟

مگر ابّو۔ یہ آزاد نہیں۔ یہ ہاتھ آپ کے یا سبھوں کے، یا بیشتر لوگوں کے ہاتھ جو ہیں نا ابّو وہ قید ہیں ———

پھر اس نے رازداری سے پوچھا تھا۔

آپ جانتے ہیں ابّو کہ یہ ہاتھ کہاں قید ہیں۔؟

میرا جی چاہا کہ اس کو ایک تھپڑ لگاؤں۔ مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔

کہاں قید ہیں۔؟

آپ کے پیٹ میں۔ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ آپ اپنے ہاتھ باہر نہیں نکال سکتے۔ کیونکہ اس طرح پیٹ خالی ہو جائے گا۔ اور آپ کے لئے خالی پیٹ رہنا ممکن نہیں کیونکہ پیٹ کو آپ نے اپنی انا کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے حالانکہ اگر ہاتھ آزاد ہوں تو بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں۔ دریاؤں کا رُخ......

میں چپ چاپ اس کا بھاشن سنتا رہا اور جی میں
بولتا رہا کہ خداوندا یہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ یہاں ایک ہی لڑکا رہ
بھی......
اسی لئے کہتا تھا بڑے ابا کہ چلئے چلئے یہاں کیا رکھا ہے
میاں تم کہتے ہو یہاں کیا رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے وہاں
کیا رکھا ہے۔ ادھر داس گپتا کہتا ہے کہ اکل ساری دنیا سڑ گئی
ہے۔ اس کے لئے ایک بڑا آپریشن ضروری ہے ایک میجر آپریشن
تاکہ سارا سڑا ہوا مواد باہر نکالا جا سکے۔
یہ داس گپتا! ؟ اس نے استفسارانہ اس کی طرف
دیکھا۔
میاں بنگالی لڑکا تھا چھوٹا سا معصوم سا۔ اس
کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایسا سحر تھا مانو ساری بنگال کی
ساحری انہیں آنکھوں میں آ بسی ہے۔ مگر تلخ گو اتنا کہ مار
کاٹ کے علاوہ بات ہی نہ کرتا تھا پستول اور بم کے نیچے تو
یہ سوچتا بھی نہ تھا۔ رجب کا دوست تھا۔ ماں باپ،
بھائی بہن ناتے رشتے دار کوئی نہیں۔ مگر کہتا ساری دنیا
میری رشتہ دار ہے۔ ساری دنیا میری ماں ہے۔ اور جو
لوگ اس کی بے حرمتی کر رہے ہیں انہیں میں بھون کر رکھ
دوں گا اڑا دوں گا ___ دراصل وہ بھی کم پاگل نہیں تھا
فرق صرف اتنا تھا کہ داس گپتا ہر وقت ابلتا رہتا تھا کھولتا
رہتا تھا۔ جیسے اس نے کوئی حتمی فیصلہ کر رکھا ہو۔ اس
کے برخلاف رجب ہمیشہ فکرمند رہتا۔ چپ چپ سوچتا رہتا
کبھی کبھی تو اس کو مسکراتے ہوئے بھی مہینوں بیت جاتے
آخری بار جب میں نے اس کو ہنستے ہوئے دیکھا تو یہ کوئی
سال بھر پہلے کی بات ہے۔ اس دن ہم لوگ یعنی میں، رجب
اور تمہاری بڑی اماں تینوں باہر والے آم کے پیڑ کے نیچے
کھڑے تھے۔ درخت کی سب سے اونچی شاخ پر ایک پرندہ
بیٹھا تھا۔ اچانک پرندے نے سر موڑ کر ہمیں دیکھا۔ دونوں
پنکھ پھیلائے اور ہوا میں تیر گئے۔ رجب کی آنکھیں یکایک
جگمگا اٹھیں۔ وہ زور سے ہنس پڑا۔
آپ نے دیکھا ابو...... ؟ آپ نے دیکھا ___ ؟
اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔
میں نے پلٹ کر پوچھا ___ کیا دیکھا ؟
اس پرندے کو ___ دراصل ہم میں اسی چیز کی کمی
ہے۔ اسی ایک چیز کی۔ بس اسی ایک چیز کی۔
میں نے حیرانی سے پوچھا! کس چیز کی۔؟
اسی بھرپور اعتماد کی، مکمل بھروسے کی۔ آپ نے
دیکھا پرندے نے پر پھیلائے اور اپنے سارے وجود کو خلا
میں چھوڑ دیا۔ اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی خیال نہ آیا کہ وہ گر
بھی سکتا ہے۔ ہم تو بس ہر لمحہ ڈرتے رہتے ہیں گرنے کا خوف
ہمیں اڑنے نہیں دیتا۔ ہم وہ اعتماد......
میاں مجھے بڑا غصہ آیا۔ ہر وقت بے تکی سنتے سنتے
عاجز آ گیا تھا۔ آدمی کو اور بھی ہزاروں کام ہیں۔ ہر وقت آدمی
کا دماغ یکساں تو نہیں رہتا۔ جھلا کر ڈانٹ دیا۔
یہ کیا ہر دم خرافات بکتے رہتے ہو۔
خوشی جو اس کے چہرے پر صندل کے سنہرے چمکیلے
ذروں کی طرح بکھر گئی تھی۔ اچانک معدوم ہو گئی۔ اس نے بڑی
نفرت سے مجھے دیکھا۔ اپنی ماں کو دیکھا۔ پھر چپ چاپ اپنے
کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس کی ماں مجھے لڑنے لگی۔
تم ہر وقت لڑکے کو کیوں ڈانٹتے پھٹکارتے رہتے
ہو۔ آج تک کیا کیا ہے تم نے اس کے لئے۔ دو وقت کی
روٹی تو ......
روٹی ___ دو وقت کی روٹی ......؟ روٹی
تو میاں سچ پوچھو ہمارے لئے......
لڑکے کا چہرہ دھواں ہو گیا ___ یہی بات تو ہے
بڑے ابا ہمیں یہاں روٹیوں کے لالے پڑے ہیں۔ اور ہمارے

یہاں کتوں کو پھینکی جاتی ہے۔

ہاں میاں ! تمہاری خوشحالی کی کہانیاں سنی ہیں کئی بار تمہارا حوالہ دیا تو چپ ، بار بار ذکر کیا تو ایک دن چڑ کر بولا ۔ ابو کیا وہاں غریب نہیں ہوتے ۔ کیا وہاں بھوک اور بیکاری نہیں ہے ۔ کیا وہ جبر اور استحصال نہیں ۔ کیا وہاں سب لوگ منظور جیسے ہیں ـــــ بات دراصل یہ ہے ابو کہ اس نے .... کہ اس نے اپنے ہاتھ دوسروں کے پیٹ میں ڈال دیئے ہیں ۔ اور یہ بڑا جرم ہے ۔ بہت بڑا جرم ہے ۔ اور ہم لوگ اسی کے خلاف .... نوجوان تلملا گیا ـــــ جن لوگوں کو کچھ کرنا نہیں ہوتا وہ ایسے ہی باتیں بناتے ہیں۔

یہی بات تو میں اسکو سمجھاتا رہتا تھا ۔ کہ میاں مہندی کے پتے کو سال بھر بھی مٹھیوں میں دبائے رہو تو ہاتھ لال نہ ہوں گے ۔ ان کو تو کوٹنا پڑتا ہے ۔ پیسنا پڑتا ہے۔ مگر وہ سنتا جب نا ۔ بہت تنگ آجاتا تو کہتا آپ صرف مجھے کیوں دیکھتے ہیں تین چوتھائی آبادی بھوکی ننگی ....

نوجوان جس کو دولت نے بہت چوکنا بنا دیا تھا بھوکے اور ننگوں کی بات پر چونکا ۔ اور ڈرتے ہوئے لہجے میں بولا ۔

یہ سیاست ہے بڑے ابا .... اور آپ جانئے سیاست !

میاں سیاست ویاست میں کیا جانوں ۔ میں تو اس کی بات کر رہا تھا ۔ جو تمہارا بھائی رجب بکتا رہتا تھا آخر آخر میں تو وہ بالکل اول فول بکنے لگا تھا ۔ ایک دن بہت غصہ میں پیر پٹکتا آیا بولا ۔ ابو ہماری گھڑی گم ہو گئی ہے گھڑی کے بغیر کوئی کام کیسے ہو سکتا ہے ۔ وقت کے تعین کے سلسلے میں بہت سی غلطیاں ہو رہی ہیں ۔ بہت سی غلطیاں ....

داس گپتا بھی کیا اسی طرح .... نوجوان نے سوال کرتے کرتے ادھورا چھوڑ دیا ۔

اس کی بھی بتاتا ہوں ۔ وہ کیا اس سے کم پاگل تھا چھ مہینہ پہلے وہ کلکتہ چلا گیا بولا بلاوا آگیا ہے ۔ لڑائی بہت جلد شروع ہو گی ۔ مجھے جانا ہی ہو گا ۔ سو دوسرے دن وہ وہ چلا گیا ۔ اس کے بعد سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی ۔ کئی بار رجب سے پوچھا مگر وہ چپ ہو جاتا ۔ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ایک بار بہت تنگ آگیا تو بولا آپ کو پتہ ہے ابو

آپ کو پتہ ہے ابو ، آواز کا زوال بشارت کا زوال ہے ـــــ

آواز کا زوال کب ہوتا ہے ۔ ؟

جب آواز معتبر نہیں رہتی ۔

آواز کب معتبر نہیں رہتی ؟

جب آدمی بولتا کچھ ہے ۔ سوچتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے ـــــ

میں نے وضاحت کے لئے اس کی طرف دیکھا تو وہ غصہ ہو گیا ۔

کالی بھیڑوں پر سفید اون آگئے ہوں تو بڑی مشکل ہو جاتی ہے ۔ پہچان کھو جائے تو سب کچھ خطرے میں پڑ جاتا ہے ۔

مگر میں نے یہ سب کہاں پوچھا تھا میاں ۔ میں تو داس گپتا .....

اسی کی بات تو بتا رہا ہوں ۔ وہ حرام زادہ ، ری ایکشنری ولی میں ہے جیسے ....

میری تو سمجھ میں یہی آتا ہے بڑے ابا کہ یہ کوئی خطرناک ....

بوڑھے نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا ۔ نیچے ..... بالکل نیچے اتر آنے والے سورج کو دیکھا ۔ پھر آنکھیں نوجوان کے چہرے پر گاڑ دیں ۔ جہاں خوف بکھر پڑا تھا ۔ اور

بالوں کی ایک لٹ پسینے سے کنپٹی پر چپک گئی تھی۔

خطرناک بات تو تھی ہی اسی لئے تو ...... آخر آخر میں تو وہ بہت پریشان بھی رہنے لگا تھا۔ بار بار کہتا ابو کالی بھیڑوں نے ہمارا قطب نما بھی چھپوا دیا ہے۔ ہم دشائیں کھو بیٹھے ہیں۔ ہمیں سمت کا کوئی پتہ نہیں چلتا یوں لگتا ہے جیسے ہم بھٹک گئے ہیں۔

رجب پر یہ بڑا کڑا وقت تھا۔ وہ ہفتوں غائب رہتا۔ کبھی آتا بھی تو رات کے اندھیرے میں۔ بس گھنٹہ دو گھنٹہ ٹکتا اور اسی طرح اندھیرے میں معدوم ہو جاتا۔ ماں سارا دن لڑتی رہتی۔ کچھ کرو تمہاری تو بہت جان پہچان ہے۔ کسی سے سفارش کرا دو، نیک بخت کو کیا معلوم کہ یہاں تو چوہے بلی کا کھیل چل رہا تھا۔ سادہ لباس دن رات گھر کے آس پاس منڈلاتے رہتے۔

تو کیا وہ لوگ اس کو پکڑ لے گئے تھے۔؟

نہیں گولی مار دی تھی۔

گولی؟ نوجوان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مگر آپ نے تو بڑے ابا خط میں ......

خط میں کیا لکھتا میاں۔ کہاں تک ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ کوئی مضمون ہی نہ بنتا تھا۔

مگر یہ سب ہوا کیسے؟

ہوا کیسے یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، بہت رات گئے گرتا پڑتا خون میں لت پت وہ گھر آیا تھا۔ ماں چیخنے چلانے اور سر کے بال نوچنے لگی تو اس نے منع کر دیا۔ پھر مجھے اپنے قریب بلایا۔ ابو میں اس بڑی عمارت تک جا پہونچا تھا جو نہایت محفوظ و مامون ہے۔ ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ اندر لوگ بے حد مطمئن تھے۔ تبھی میں نے فرش سے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر کھڑکی پر دے مارا۔ کھڑکی کے شیشے چور چور ہو گئے۔ پاگل ہوا اندر گھسی تو تمام افراتفری مچ گئی۔ تبھی اچانک چاروں طرف سیٹیاں گونجیں۔ تڑا تڑا گولیاں چلیں۔ گھنڈا سا سیسہ جا بجا سے میرے بدن میں گھس گیا۔ مجھے لگا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب کچھ نہ ہوگا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ ..... اچانک دور نہیں ایک اور چھناکہ سنائی دیا۔ کسی اور نے بھی کسی بند کھڑکی پر پتھر پھینکا تھا۔ کوئی اور شیشہ ٹوٹا تھا۔ پھر دور کہیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ پھر مجھ میں پتہ نہیں کہاں سے ہمت عود کر آئی شاید یہ سوچ کر کہ اور بھی لوگ ...... ابھی اور بھی کچھ لوگ ......

آپ نے گولیوں کی آواز سنی تھی ابو۔؟ نہیں سنی نا!؟

میں نے سنی تھی۔ بالکل صاف سنی تھی ...... تو ابو ان گولیوں کی آوازوں کی بھی ایک بشارت ہوتی ہے۔

ہوتی ہے نا ابو ـــــ؟

ہوتی ہے نا ـــــ؟؟

بقیہ: توصیف تبسم کی شاعری

یہ سارے داغ ہیں دراصل تیرگی کے شجر
ستارے آسماں بوتا ہے کشت میں اپنی

اشک قیدی ہیں جو رو لیں تو رہائی پائیں
ورنہ تا عمر یوں ہی درد کو زنداں لکھو

تیشے کی صدا میری ہی فریاد تھی گویا
میری ہی طرح تھا کوئی پتھر کی سلوں میں

ناصر بغدادی (نائجیریا)

تتلی کے رنگ

نہ جانے اتنا حبس کہاں سے آگیا تھا۔

شکور کی حساس سیمابی فطرت کے لئے یہ موسمی غضب بن بلائے مہمان کی طرح کم آفت خیز نہ تھا۔ دن تو خیر مصروفیات اور ہنگاموں کی نذر ہو گیا تھا۔ مگر رات شیطان کی آنت ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسی حالت میں نیند کی توقع عبث تھی۔ وہ تو روٹھی ہوئی محبوبہ کے انداز کو اپنائے مشق ستم پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔ بھلا ایسے موقعہ پر وہ کیسے مان سکتا تھا کہ سولی پہ بھی نیند آجاتی ہے۔ یہاں تو وہ بستر پہ تھا اور کب سے جاگ رہا تھا۔

رات موت کے احساس کی طرح فضاؤں پر چھائی ہوئی تھی۔ فضائیں خاموش تھیں جیسے کان لگا کر کچھ سن رہی ہوں۔ ہوا کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ جیسے پروردگار کے لبوں نے سانس لینے کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ پسینے میں شرابور، حال سے بے حال، کھلے آسمان کے نیچے ایک بوسیدہ سی چرچراتی ہوئی کھاٹ پہ شکور نے اتنی کروٹیں بدلیں تھیں کہ پچاس سالہ دور محبت میں بھی کسی نے محبوب کے انتظار میں اتنی کروٹیں نہ بدلی ہوں گی۔ یوں بھی اندرونی احساس کیا کم تھا کہ آج موسم نے شعلوں کا لباس پہن لیا تھا۔ ——

اچانک وہ بری طرح چونکا اسے احساس ہوا کہ وہ پیاس کے بے آب و گیاہ صحراؤں میں بھٹک رہا ہے۔ جیسے اس کے انگ انگ کی پیاس وجود کی گہرائیوں سے نکل کر کائنات کے طول و عرض پر پھیل جائے گی۔ اچھل کر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے بونقوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کے اردگرد رات کی تاریکیوں میں یوں اضافہ ہو رہا تھا۔ جیسے برے وقت میں انسان کی پریشانیاں بڑھتی ہیں ——— اس نے محسوس کیا جیسے اس کی روح جسم کے اندھے کنویں سے نکل کر خلا کے تاریک سمندر کی لامتناہی پہنائیوں میں کسی مبتدی تیراک کی طرح ڈوبتی جا رہی ہو۔ اس کی حالت اس مسافر سے سر مو جدا نہ تھی جو تپتے ہوئے ریگستان میں پانی کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہو۔ اور پانی کا چشمہ اس سے ذرا پرے ریت کے ٹیلوں کے پیچھے نرم خرامی سے بہتا جا رہا ہو۔

حلق کی خشکی دور کرنے کے لئے پوری اکیس سیڑھیوں کو عبور کرنے کی ضرورت تھی۔ نچلی منزل تک پہونچنا جوئے شیر لانے کے مترادف نہ تھا اور نہ وہ اتنا نڈھال و بے حال ہوا تھا کہ اس قدر مشقت برداشت نہ کر سکتا۔ مگر ایک حد فاصل تھی جسکو بے حجابانہ انداز میں پار کرنے میں ہچکچاہٹ سی مانع ہو رہی تھی۔ اور وہ اتنا بے باک نہ تھا۔ کہ اس جھجک اس ہچکچاہٹ کا گلا گھونٹ سکتا ———

شدید مایوسی کے احساس سے بغل گیر ہوتے ہوئے وہ پھر کھاٹ پہ ڈھیر ہو گیا۔ پیاس بجھانے کی خواہش نگوڑا [illegible]

کے سینے میں ناچ رہی تھی ۔ انسان کو اس وقت تو صبر آجاتا ہے جب اسے یقین ہو جائے کہ اس کی خواہش کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں ۔ مگر اس لمحے بے کلی کو مہمیز لگ جاتی ہے جب مطلوبہ شئے سامنے ہو اور اچانک درمیان میں رکاوٹ کی فصیل سر اٹھائے کھڑی ہو جائے

اب اس نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں ۔ اس کا چہرہ اس شخص کے چہرہ سے مختلف نہ تھا جو پیاسی زندگی کے بھنور میں پھنس کر ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں ۔ مختلف النوع خیالات گرنے سنبھلتے ہوئے اس کے ذہن میں جڑ پکڑتے جا رہے تھے ۔ اور کان ایک ایسی انجانی آہٹ کے چھپاکے سے گونج رہے تھے ۔ جو تصور کو پر لگا دیتی ہے ۔ مگر تصور کی اڑان زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی ۔ ذہن انجانی فضاؤں کی رنگینیوں سے کتنی دیر تک لطف اندوز ہو سکتا ہے ؟ اپنے ماحول میں واپس آکر زمین کے گول ہونے کا ثبوت فراہم کرنا ہی پڑتا ہے ۔ اپنی حقیر زندگی کے تاریک گوشوں پر نظر پڑی تو اس کی طبیعت مکدر ہو گئی ۔ یہ وہ زندگی تو نہیں تھی جس کو ماضی میں اس نے اپنے تصور سے وابستہ کیا تھا ۔ بھینی بھینی خوشبوؤں اور پرفریب تصوراتی رعنائیوں کے پس منظر میں جو زندگی جلوہ گر تھی وہ نہ جانے کہاں ڈوب گئی تھی ــــــــــــ شکور نے محسوس کیا اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا ہے ۔ ذہن میں جو کچھ ہوتا ہے زندگی اس سے کتنی مختلف ہوتی ہے ۔ اسے زندگی کے کھوکھلے پن اس خلا کی پرواہ نہ تھی اسے تو بس یہی غم کھائے جا رہا تھا کہ اس کھوکھلے پن اس خلا کا اسے احساس کیوں ہے ؟ جب ناسازگار حالات کی عصریت نے اسے گھیرا تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے خواب رند بلانوش کے ہاتھوں سے گرا ہوا پیالہ بن گئے ہیں ۔ اور تب اس نے سوچا تھا کہ زندہ رہنے کے لئے اسے بے حس بن جانا چاہیئے ۔ مگر اب اس کا کیا علاج کہ اس کی تو حس ہزار چند ہو گئی تھی ۔

مرنے سے پہلے اس کی ماں نے اس کی سعادت مندی و فرمانبرداری کا اعتراف کرتے ہوئے اتنی دعائیں دی تھیں کہ اس کو کوتاہی داماں کی شکایت ہو گئی تھی ۔

" بیٹے ! میری دعائیں ہمیشہ تیرے ساتھ رہیں گی تو زندگی میں کبھی پریشان نہ ہوگا "

یہ ماں کی آخری دعا تھی اور اس کی پریشانیوں کا نقطہ آغاز ! سنا ، مرتی ہوئی ماں کی دعاؤں میں اثر ہوتا ہے مگر یہاں تاثیر الٹی تھی چند ہی دنوں کے اندر اسے احساس ہو گیا کہ وہ کائناتی رہگزاروں میں بالکل اکیلا ہے ۔ اس کے چاروں طرف اجنبی غموں کے سائے جیسے سانس لیتے ہوئے پھیلتے جا رہے تھے ۔ ماں نے شاید اپنے راج دلارے کو اپنے خوابوں میں شہزادے کے روپ میں دیکھا تھا حقائق نے اسے غموں کی رداؤں میں لپیٹ کر ایک گھریلو ملازم بنا دیا تھا ۔ اب زندگی کے اس چھٹپٹے میں پہونچ چکا تھا ۔ جو بجھی ہوئی اداس شاموں سے ملتے جلتے ہوئے احساسات اور ڈوبتی ہوئی روشنیوں سے ملتے جلتے جذبات سے بھرا ہوا تھا ۔ ایک ایسا جھٹپٹا جب امیدوں نے رخت سفر باندھ لیا ہو اور خوشی کے آنے کی آخری امید بھی ستارہ سحری کی طرح چپکے سے ڈوب گئی ہو ۔

اگرچہ ان دنوں جہاں وہ ملازم تھا کوئی پریشانی نہ تھی ۔ مگر اب اسے کیا کہئے کہ وہ کاتب تقدیر سے ایک پریشان اور دکھی وجود لکھوا کر دنیا میں آیا تھا ۔ اس کا مالک اور مالکن دونوں ہی اس کے لئے بہترین صفات کے حامل تھے ۔ گھر والا ایک میانہ قد آدمی تھا ۔ عمر یہی کوئی پینتیس سال ہو گی ۔ اس کے سیاہ اور چمکدار بالوں میں چند سفید بال چاندی کے تاروں کی طرح جگمگاتے تھے ۔ خدوخال بڑے جاذب نظر اور متناسب تھے ۔ آنکھیں یوں چمکتی تھیں جیسے بجلیاں سی ناچ رہی ہوں مگر کبھی کبھی شکور نے اس کے چہرے پر دبیز سوچ اور گہرے

تفکر کے آثار ابھرتا دیکھے تھے۔ ایک ایسی کیفیت جو محض متفکر اور کسی گمبھیر مسئلہ پر غور کرنے والے آدمی کی کیفیت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی مالکن ایک نوجوان عورت تھی جس کا بدن گداز گداز سا تھا۔ چہرے پر کبھی کبھی مسکراہٹ کا نور برسنے لگتا تو لگتا یوں جیسے موسم بہار کا سورج فیاضی سے اپنی شعاعیں لٹا رہا ہوں یوں تو اس کی آنکھیں بڑی پرکشش تھیں مگر ان کے دیکھنے کا انداز زیادہ ہوش ربا اور پُرتمکنت تھا۔ جیسے اس چیز کو مسخر کر لیا ہو جس کو سب نے متفقہ طور پر ناقابل تسخیر قرار دیدیا تھا۔ جب وہ شان استغنا سے جھومتی ہوئی چلتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کائنات کی رعنائیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہو۔ اس کا بھرپور انداز زمین سے اٹھ کر آسمانوں کو چھو لینے کی آرزو کا غماز تھا

کہا تو یہی جاتا ہے کہ مثالی مرد اور مثالی عورت ایک جگہ جمع ہو جائیں تو زندگی مثالی بن جاتی ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ الٹا ہی تھا۔ شکورے نے تو یہی محسوس کیا تھا کہ دونوں [illegible] کچھ خوشگوار ہیں۔ اگرچہ اس نے دونوں کو [illegible] دوسرے دست وگریباں تو نہ دیکھا تھا مگر ان کا [illegible] ازدواجی زندگی کا آئینہ تھا۔ جس نے اس [illegible] مخفی پہلوؤں کو اجاگر کر دیا تھا۔ [illegible] دونوں کو بہت [illegible] ایک دوسرے کے قریب بیٹھے دیکھا تھا۔ جیسے دونوں ایک دوسرے کے لئے الرجک بن گئے ہوں۔ بسا اوقات وہ ایک دوسرے سے بالکل ہی لاتعلق معلوم ہوتے اور کبھی ایک دوسرے سے یوں کھنچے کھنچے رہتے جیسے قریب آنے ہی پگھل کر بھاپ بن جائیں گے۔ چند مرتبہ شکورے نے دیکھا تھا کہ مالکن کو دیکھتے ہی اس کے مالک کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ تھرتھرا اٹھی تھی۔ ایک ایسی زبردستی کی مسکراہٹ جس میں پشیمانی کا ہلکا سا عنصر بھی شامل تھا ——— مگر شکورے کے باب میں دونوں کا برتاؤ بڑا دوستانہ، بڑا مخلصانہ تھا۔ کبھی کبھی تو ان کی باتیں سن کر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس کو اپنا قریبی دوست اور دست راست سمجھتے ہیں۔ ان کا نرم اور خوشگوار لب ولہجہ مالکانہ شان اور شان تفوق سے بالکل عاری ہوتا۔ شکورے کے لئے یہ ایک نیا اور مثبت تجربہ تھا۔ ورنہ اس کی زندگی تو جڑ تک دنیا والوں کی صلواتوں اور نازیبا سلوک کے پاتال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور شاید یہ ان کا رویہ ان کا برتاؤ تھا ـ جس نے اس کے دل میں ان کے لئے گہرا جذبہ، گہرا انس پیدا کر دیا تھا۔

کئی بار اس کے مالک نے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہا تھا
"کیوں دوست! یہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں"
وہ فراخدلی سے مسکرا دیتا "تکلّف سے کام نہ لینا"۔
اور کبھی اس کی مالکن گنگنانے کے انداز میں اس سے مخاطب ہوتی۔

"شکورا اس گھر میں خود کو اجنبی نہ سمجھو! جس چیز کی ضرورت ہو بے تکلف ہو کر مجھ سے کہنا"

اظہار تشکر کے طور پر اس کا سر زمین بوس ہو جاتا وہ سوچتا جس شخص کو بلا ضرورت ہی دکھ درد مل گئے ہوں اسے بھلا کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ ایسے موقعوں پر اس کے اپنے پرانے غم آگیں احساسات کہیں دور کسی بے نام سے پاتال میں تھک کر سو جاتے۔ اور دونوں کی ازدواجی زندگی کی الجھنوں کا خیال اس کا اپنا غم بن کر یوں دل میں ابھرتا جیسے صبح کے آخری ستارہ کے ڈوبتے ہی مشرقی افق پر سورج طلوع ہونے لگتا ہے۔ وہ یہ سوچ کر وحشت زدہ سا ہو جاتا کہ اس کی تقدیر کی ازلی نحوست بُرا شگون بنکر اس گھر کی فضاؤں پر تو مسلط نہیں ہو گئی؟

مالک عموماً تجارتی سلسلے میں مہینے میں دو ایک بار دو ایک روز کے لئے گھر سے باہر رہتا تھا۔ اس دوران

مالکن کے چہرے پر طمانیت مجنونانہ سرخوشی بن کر یوں رقصاں رہتی جیسے کوئی مریض کسی موذی مرض سے صحت یابی کے بعد خود کو حقیقی مسرتوں کے قریب پاتا ہے۔ بہترین بھڑکیلے لباس میں اس کا صندلیں جسم پھولوں سے لدی ہوئی ایک لچکتی شاخ بن جاتا سولہ سنگھار سے مرصع ہو کر وہ یوں اتراتے ہوئے شاہانہ انداز میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی جیسے مدتوں کی قید کے بعد اسے آزادی نصیب ہوئی ہو۔

شکور، اس کی آواز ولی مسرت کی مظہر ہوتی۔ اور شکور کے لئے وہ ندائی صدا بن جاتی۔ وہ نامکمل کام چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا۔ مگر اس کے پہونچنے سے پہلے اس کے نام کی صدا دو چار بار در و دیوار سے ٹکرا کر معدوم ہو جاتی۔

او ہو شکور! تم کہاں تھے؟ شکور کو نظارہ کی تاب نہ ہوتی کیونکہ اس کا چہرہ دوپہر کا سورج بن جاتا۔

بی بی جی ——— بس ——— شکور کی آواز میں لکنت آجاتی۔

میں کب سے تمہیں آواز دے رہی ہوں مگر

جی میں کام کر رہا تھا ———

اب چھوڑو بھی کام کو! اس کا چہرہ معصوم خوشیوں کے نور سے غسل کر کے شعلہ طور بن جاتا۔ کام تو روز ہوتا ہے۔ بیٹھو نا! یوں کیا مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے ہو۔ اس کے سریلے قہقہے کا جلترنگ بج اٹھتا۔ تو شکور کے سارے سہمے ہوش و حواس بھی پرواز کے لئے پنکھ کھول دیتے۔ وہ بادل نخواستہ ایک کرسی پر بیٹھ جاتا۔

جی ——— جی ——— کچھ کام ہے؟

"کام" وہ ایک لمحہ کے لئے سوچتی۔ کیا کام کے بغیر دو آدمی ایک جگہ جمع ہی نہیں ہو سکتے؟ شکور جیسے سادہ لوح آدمی کے لئے یہ فلسفہ بڑا ادق ثابت ہوتا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

جی بی بی جی ———

آج میں بہت خوش ہوں نا؟ وہ پوچھتی اور شکور اثبات میں سر ہلا دیتا۔

تمہیں وجہ معلوم ہے؟

اس بار وہ نفی میں سر ہلا دیتا۔

چلو چھوڑو تم ان باتوں کو کیا سمجھو گے۔ ... منور پیشانی پر سوچ کی متوازی لکیریں نمودار ہو جاتیں ... کیا معلوم زندگی میں کیا ہونا ہے؟

اور اس لمحے شکور کا جی چاہتا کہ کہہ دے۔

بی بی جی یہ محض آپ کا خیال ہے۔ شاید آپ ... غم میرے دکھ درد سے زیادہ وزنی ہوں مگر میرے احساس نے میرے چھوٹے چھوٹے غم کو بھی پہاڑ بنا دیا ہے۔ بے چارے بڑے غم اور پھر دکھ کسی بھی ذات سے وابستہ نہوں بستہ نہ ہونے کے باوجود روح کا رستا ہوا ناسور ہوتے ہیں

مگر رعب و دبدبہ کا احساس اس کی زبان پر قفل سا لگا دیتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے کوئی مرئی طاقت اس کی ... پر دباؤ ڈال رہی ہو ——— اور تب چند لمحوں کی خاموشی میں ڈوب کر اس کی مالکن بڑی خوش آہنگ روانی میں سوالات کا ایسا طومار باندھ دیتی کہ جیسے موسلا دھار بارش ہو گئی ہو لیکن تو اتنے عام فہم ہوتے کہ وہ سب کچھ تو سمجھ جاتا مگر جواب دینے کی کوشش کرتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی نے اس کی زبان کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہو۔ کچھ سوال اس کی فہم سے بالا ہوتے جن کا جواب اس کے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اسے شاید صرف پوچھنے کا شوق تھا جوابات کی مطلقاً پرواہ نہ تھی۔ کافی دیر بعد جب اسے احساس ہوتا کہ وہ ایک خوبصورت اور جوان عورت کے ساتھ تنہا کھڑا ہے۔ تو وہ ہانڈی پاکے چولہے کا بہانہ بنا کر اس کی مرضی کے خلاف وہاں سے کھسک جاتا۔

——— رسوئی میں وہ گھنٹوں یہی سوچتا کہ آخر یہ سب

گئی گیا ہے؟ اس کا تو اسے اندازہ ہوتا کہ کوئی غم گھن بن کر اسکن کو کھائے جا رہا ہے۔ مگر وہ غم کس خمیر سے اٹھا؟ اس کا وجود کن محرکات کا مرہون منت ہے؟ اس کے متعلق وہ گھنٹوں کی مسلسل عرق ریزی اور دماغ سوزی کے باوجود کچھ نہ جان سکا

اچانک پیاس بجھانے کی منہ زور خواہش نے پھر ایک بار جوش مارا تو سوچ کا تسلسل کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گیا ——— یوں اپنی دنیا میں واپس آگیا۔ جیسے مچھلی چند لمحوں کی اڑان کے بعد پھر پانی میں گر گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے پانی نہ ملا تو اس کا جسم پھوٹ کر چیتھڑوں کی شکل میں فضا میں بکھر جائے گا۔ پیاس اب اس کے لئے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ نہ جانے یہ خواہش یہ طلب کس طرح کی تھی؟ زندگی میں کسی بھی طلب نے اتنے شدید اور جارحانہ انداز میں اس کے سامنے سر اٹھانے کی جرات نہ کی تھی۔ شاید سب کو اس حقیقت کا علم تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ اس در سے کچھ ملنے کا امکان نہیں۔ مگر آج تو جیسے ایک ضدی اور سرکش پیاس بجھانے کی پیاسی طلب نے بار بار ابھر کر اس کی انا پر کاری ضرب لگا دی تھی۔ اس کی کم مائیگی کا مذاق اڑایا تھا۔ اور پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور مردہ انداز میں کھاٹ سے اٹھ کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے کسی کے تن مردہ میں آدمی روح کی سرسراہٹیں گونج اٹھی ہوں۔

سیاہ رات کے سیاہ آسمان نے چاند ستاروں کو جیسے ہمیشہ کے لئے نگل لیا تھا۔ ہر گلرنگ منظر نے جیسے اس سناٹے سے خوفزدہ ہو کر اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ کاش اس پیاسی آرزو کو بھی کہیں جائے پناہ مل جاتی۔ وہ یوں قدم قدم گن گن کر سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی روح اپنی کھوئی ہوئی مسرتوں کو تلاش کر رہی ہو ——— نچلی منزل کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے وہ چند لمحوں کے لئے سیڑھیوں کے پاس رک گیا۔ اس کی ذہنی کیفیت اس آدمی سے مختلف نہ

جس نے روح فرسا مراحل طے کرنے کے بعد کوئی فیصلہ تو کر لیا ہو۔ مگر اس کے باوجود مطمئن نہ ہو سکا ہو۔ ایک بے نام سا احساس اس کے رگ و پے میں رچ بس کر خاموش ہلچل سے طوفان بیدار کر رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر الفاظ نطق پر دستک دینے کے بعد کسی گوشے میں دبک کر بیٹھ گئے ہوں۔ حوصلوں اور جرات کو جمع کر کے اس نے پہلی سیڑھی پر یوں قدم رکھا۔ جیسے کسی کم ہمت تیشہ بردار کو کوہ کنی پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ پھر اس کے بعد اسے کچھ پتہ نہ چلا کہ اس نے باقی سیڑھیاں کس طرح طے کیں۔ اس کے خوابیدہ حواس اس وقت بیدار ہوئے جب اس نے آخری سیڑھی عبور کر لی تھی اس کے بائیں جانب ڈائننگ روم تھا۔ جہاں پیاس بجھانے کا وافر سامان موجود تھا۔ ایک کونے میں قد آدم سفید ریفریجریٹر یوں کھڑا تھا جیسے کوئی سفید پوش آسمانی فرشتہ برکت کا خزانہ لٹانے آگیا ہو۔ اس میں اتنی یخ بوتلیں تھیں۔ کہ وہ زندگی بھر کی پیاس بآسانی بجھا سکتا تھا ——— اچانک اس نے سامنے دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کی نظریں چوکھٹ عبور کر کے دراناندر داخل ہو گئیں۔ ہلکے نیلے رنگ کی روشنی میں کمرہ رنگ بھرے خوابوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ایک حیات آگیں منظر سامنے تھا۔ جن آنکھوں کی جلن کی قیمت دنیا بھر کی دولت سے بنا ہوا سونے کا پہاڑ بھی ادا نہ کر سکتا تھا۔ آج وہ شربتی ٹھنڈک کے روح افزا احساس سے ہم آغوش ہو کر ہر پل فرحاں و شاداں ہو گئی تھیں۔ اور یہ سب کچھ ایک دلنشیں نظارے کی مہربانی کا نتیجہ تھا۔ کل تک زندگی کے راستے پر جو مسافر قدم قدم پر لٹتا چلا آیا تھا۔ آج اس کی نظروں میں حقیقت ایک رنگ بھرے خواب کی لطافتوں کا ہیولیٰ بن کر رچ بس گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ الف لیلوی الو کی طرح ہکا بکا بھونچکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بار بار دیکھنے کے باوجود سیڑھی کا

آثار کا کوسوں دور تک پتہ نہ تھا۔ یہ حقیقی جذبات اور سچے احساسات کی بات تھی۔ اس کی نظروں کا مرکز ایک کشادہ اور بے حد سجی سجائی مسہری تھی۔ جس پر اس کا مالک اپنی شریک حیات کے ساتھ محو استراحت تھا۔ دونوں چولی دامن کی طرح ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ مگر جسموں کا اتصال کے باوجود روحوں کا ملاپ نہ ہو تو یقیناً یہ ایک المیہ ہے۔ ایک دوسرے کے قریب رہ کر دور ہونے سے بہتر یہی ہے کہ دور رہ کر ایک دوسرے کے قریب آجائیں جیسے ان کا غم شکور کا اپنا غم تھا۔ محرومیوں کی گود میں وہ پل رہے تھے۔ مگر محرومیوں کا احساس شکور کو زیادہ تھا ــــــ

وہ اپنے غموں سے بے نیاز معصوم فرشتوں کی طرح نیند کی مہربان آغوش میں کھوئے ہوئے تھے۔ بیداری کی تلخیاں خوابوں کی دھند میں چھٹ چکی تھیں۔ مالکن کا چہرہ آسمانی کتاب کے تقدس اور پاکیزگی کے نور میں نہایا ہوا معلوم ہو رہا تھا ــــــ ــــــ اچانک شکور کے احساسات ساز سے نکلی ہوئی آواز کی طرح کپکپا کر رہ گئے۔ اس کی نگاہیں نگوں سار ہو گئیں۔ اس نے سوچا اسے یوں نہیں دیکھنا چاہئے۔ نظروں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ نہ معلوم کب تقدس کے پاکیزہ دامن کو آلودہ کر دیں وہ دل میں خود کو ملعون کرنے لگا۔ یہ ایک گری ہوئی حرکت تھی۔ جس کی توقع اسے خود سے ہرگز نہیں تھی۔ کسی شادی شدہ جوڑے کی خواب گاہ کی طرف نگاہ غلط انداز سے دیکھ لینا بھی قتل عمد سے زیادہ سنگین ہوتا ہے۔ یہ تو وہ تقدس گاہ ہے جس طرف خدا کی نظریں بھی نہیں اٹھتیں۔ اور اس کی نگاہیں تھیں کہ کب سے ایک روح پرور نظارے کی معصوم چوری میں مصروف و منہمک تھیں ــــــ وہ سرشام احساسات کا خوابناک لئے ڈائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی کچھ دیر پہلے تک وہ پیاس کی شدت سے باؤلا ہو رہا تھا اور اب جبکہ پانی سامنے تھا۔ تو اس کی پیاس غائب ہو گئی تھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اگلی کئی جنموں کی پیاس سیراب ہو چکی ہو۔ مگر اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ سمندر کے قریب سے حلق بھگوئے بغیر لوٹ جائے۔ اس نے کمال آہستگی سے میز پر سے ایک گلاس اٹھا لیا۔ اور ریفریجریٹر کی طرف دبے پاؤں بڑھا۔ اس کا بدن ابھی تک انجانے جذبوں کے زیر اثر یوں تھر تھر کانپ رہا تھا جیسے وہ کوہ طور سے کلیم اللہ بن کر واپس آیا تھا۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی؟ کمرہ کا اندھیرا یا بے نام اندیشوں کا احساس کہ راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود اس نے ایک ایسی ٹھوکر کھائی کہ سنبھلنے کی کوشش میں وہ آگے پیچھے کو دو مرتبہ جھول گیا۔ اس قلیل عرصے میں اس کے ہاتھ کا گلاس فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ اور آواز سے در و دیوار کی خاموشیوں نے سہم کر اپنی خوابیدہ آنکھیں کھول دیں تھیں۔ اب اس کی حالت ناقابل بیان تھی۔ جیسے وہ قتل کے جرم میں رنگے ہاتھوں دھر لیا گیا تھا۔ جاتے ہوئے حواس کو اس نے بہ ہزار دقت روکا۔ چھٹی حس نے آنے والی طوفان کی خبر دے دی تھی۔ وہاں کھڑا ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ بلی کی طرح بغیر آواز پیدا کئے تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ اور اسی لمحے اس نے اپنے مالک کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنی

کون ہے ــــــ ؟ ــــــ کون ــــــ ؟

شکور کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اس پہ شبہ کیا گیا تو وہ اپنی صفائی پیش نہ کر سکے گا۔ اس کا بے داغ ضمیر کوئی کپڑا تو تھا نہیں۔ کہ ناپ کر اس کی پیمائش ہو جاتی خوف اور پشیمانی کے احساس سے اس کا دل ایک سو میل کی رفتار سے دوڑنے لگا۔ جوں ہی اس نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا۔ اس کے مالک کی آواز دوبارہ ابھری۔

"اف وہ ــــــ گلاس کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے ــــــ اس بلی نے تو پریشان کر دیا ہے"

اس بار طمانیت کا رنگ اس کے چہرے پر اجاگر ہو گیا
مگر خوف ہنوز میں برقرار تھا۔ وہ اندیشوں کی دیوار سے سر ٹکراتا
ہوا کھاٹ پہ دراز تو ہو گیا۔ مگر نیند کا پتہ نہ تھا۔ یوں محسوس ہو رہا
تھا جیسے کوئی ڈراؤنا حادثہ باہیں پسارے اس کی سمت بڑھتا
چلا آ رہا ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی چاہتا ہے۔ انسانی خوف کے نقطۂ
عروج پر پہونچ کر وہ بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے تک پیاس سے وہ
ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ چند
لمحوں پہلے ایک جانفزا نظارہ کو دیکھ کر اس کے دل میں نشاط و
نور کے بے گنتی آبشار گرے تھے۔ مگر اس کی روح کی مسرت کا
وہ تابندہ لمحہ تو مر چکا تھا۔ اسے تو بس یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے
کوئی تلوار اس کے سر پر لٹک رہی ہو۔ اور کسی بھی وقت اس
کی گردن اس کی زد میں آ سکتی ہے۔ اسے علم تھا کہ اس نے
سقراط کی زبان بھی مستعار لے لی تو کسی کو یقین نہیں دلا سکتا
کہ وہ نیچے کس نیت سے آیا تھا۔ بھلا ان حالات میں کس کو اس
کی بات کی صداقت پہ یقین آ سکتا تھا۔

رات اس کی حالت زار پر یوں ہنستے ہوئے گزر رہی
تھی جیسے کوئی اپنے دشمن کی ناکامیوں پر جشن مناتا ہے۔ اب
موسم نے اپنے کڑے تیور درست کر لئے تھے۔ حبس کا زور ٹوٹ
چکا تھا۔ مگر اسے اتنا ہوش کہاں تھا کہ ان خطوط پہ سوچ سکتا۔
اسے تو یقین تھا کہ آنے والی صبح اسکو رسوائیوں کے اندھیروں
کی سوغات پیش کرے گی۔ اور اپنی ناکردہ گناہوں کے ساتھ اسے
اپنا بوریا بستر گول کرنا پڑے گا۔ اس ذلت سے تو بہتر یہی تھا کہ
وہ پیاس کی شدت سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔ مگر اسے کیا پتہ
تھا کہ حالات کا اونٹ اس کروٹ بیٹھے گا۔ اگرچہ ابھی تک کوئی
غیر متوقع بات ظہور میں نہیں آئی تھی۔ مگر اسے یقین تھا کہ نیچے اس
کی تباہی کے منصوبوں کو آخری شکل دی جا رہی ہوگی۔ اس کا
دل رہ رہ کر کورس کا گھنٹہ بن گیا۔ اس کی موہوم امیدوں کی تجہیز و
تکفین کا وقت قریب آ گیا تھا۔

اس کے چاروں طرف سناٹے یوں پھیلتے جا رہے
تھے جیسے طوفانی دریا شاداب وادیوں کا سہاگ لوٹتے ہوئے
ٹھاٹھیں مارتا چلا جائے۔ اور اس میں ہر شئے کا نقش حرف
غلط کی طرح مٹ کر رہ جائے۔ اب رات دم توڑنے کے مراحل
میں داخل ہو چکی تھی۔ صبح کے بھرپور آثار پیدا ہونے سے پہلے کی
لطیف مدھم نیم تاریک روشنی کی چادر کسی شرمیلی دوشیزہ کے
بلوریں سینے پر پھیلتے ہوئے دوپٹہ کی طرح فضاؤں پر آہستہ
آہستہ پھیل رہی تھی۔ اس خوابناک ماحول میں دھندلے مکانات
کی پرچھائیاں یوں ابھر رہی تھیں۔ جیسے خوابوں کے کردار آہستہ
آہستہ حقیقی دنیا میں قدم رکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اور
پھر کچھ دیر بعد نئی صبح کے آغاز پر نئے دن کی عملی زندگی کی شروعات
کے لئے بڑے بڑے انسانی ہیولے یوں گلی سے گذرنے لگے
جیسے دریا کے تیز بہاؤ میں چلے آ رہے ہوں۔

شکور کھاٹ سے اچھل یوں جیسے کوئی دنیا سے اٹھتا ہو
خوف اب تک اس کے اعصاب پر اس کے شعور اور تحت شعور پر
بری طرح مسلط تھا۔ ایک بار تو اس نے سوچا کہ اپنا سارا سامان
یہیں چھوڑ کر چپکے سے نو دو گیارہ ہو جائے۔ نیچے جانے کا تصور
قبر میں جانے کے تصور سے کم ہیبت ناک نہ تھا۔ وہ خود میں اس
جرأت کا فقدان پا رہا تھا۔ جس کی مدد سے اپنے مالک اور
مالکن کا سامنا کر سکتا۔ جیسے اس کی حیثیت ایک معمول کی سی
تھی۔ اور اس کے سامنے عامل کی سحر پاش آنکھوں کا جال بچھا
ہوا تھا۔ اور اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ آنکھوں میں ایک
بار جھانکتے ہی اس کی ناکردہ گناہیں اپنے سر پر گناہ کا سارا الزام
رکھ لے گی۔ پھر بھی وہ جرأت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو یکجا
کر کے نیچے اتر ہی گیا۔ اور یوں دولوں سے بچتے بچاتے رسوئی
میں داخل ہو گیا۔ جیسے کوئی مفرور مجرم پولیس کی آنکھوں میں دھول
جھونک کر جائے پناہ کی طرف بڑھتا ہے۔

زندگی کی معمولات کا نیا دن طلوع ہو چکا تھا۔ وہ

روزمرہ کے کاموں میں مشغول تو ہو گیا۔ مگر اس کی ساری توجہ ایک ایسے حادثہ کی طرف مرکوز تھی۔ جو ہنوز معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ بظاہر سکون ہی سکون تھا۔ دونوں سے میاں بیوی جاگ چکے تھے ایک دو بار کسی کام سے مالکن اسٹوڈیو میں چند ثانیوں کے لئے آئی تھی مگر اس کا طرز عمل اس امر کا غماز نہ تھا کہ وہ اندرونی طور پر شدید غصہ کا شکار ہے مگر نہ جانے کیوں شکور کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس خاموشی کے خول میں ایک ایسا طوفان سو رہا ہو جس کی بیداری آنکھ جھپکتے ہی ساری دنیا کو تہس نہس کر سکتی ہے۔ وہ اس طوفان کا متوقع تو تھا۔ مگر جانتا تھا کہ اس کا مقابلہ کرنے کی سکت اس میں بالکل نہیں۔

دن کافی چڑھ گیا تھا۔ دیواروں پر دھوپ کی ابلتی ہوئی کرنیں آنکھ مچولی کا کھیل رچا رہی تھیں۔ اس کا مالک حسب معمول وقت مقررہ پر آفس جا چکا تھا۔ مگر ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ مگر اس کے باوجود شکور یہ ماننے کو بالکل تیار نہ تھا کہ کچھ ہونے کی امید آخری سانسیں لے چکی ہے۔

شکور! اچانک مالکن کی خوابناک آواز نے فضاؤں کو جھومنے پر مجبور کر دیا۔ مگر وہ بید مجنوں کی طرح لرزہ براندام ہو کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا؟

شکور کہاں ہو؟ آواز نے دوبارہ اس کا تعاقب کیا۔ اس بار اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور مجرموں کی طرح سر جھکائے مالکن کے سامنے آ گیا۔

کل رات تم نیچے آئے تھے۔ ایک سوال خنجر بن کر اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تھم سی گئی

بولو ——— کل رات ———

جی...... میں ——— اس کی زبان نے اس کے خیالات کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ صفائی پیش کرنے کے سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔

جی ——— اس نے حیرانی سے اٹھایا۔ اس کا چہرہ سحر کن نقرئی مسکراہٹوں کی روشنی سے دور کے چاند کی طرح جگمگا رہا تھا۔

میں نے کہا "تم پاگل ہو" اس نے اپنے الفاظ بھرپور بے ساختگی اور تاثر انگیز طور پر ادا کئے۔ تمہیں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہارے مالک کو شک ہو جاتا تو ———؟

شکور کو محسوس ہوا جیسے اجنبی احساسات کی رستہ کشی اعصاب کی زنجیر کو توڑ کر اس کی ذہنی صلاحیتوں کو پرخچے اڑا دے گی۔ اور وہ کہے جا رہی تھی۔

بدھو! جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ جب تمہارے مالک دورہ پر ہوں تب ———

اور وہ اس کے قریب آ گئی۔ سب کچھ اس کے قریب آ گیا۔ گداز صندلیں باہیں، پیاس سے کھیلتی ہوئی ہونٹوں کی کلیاں، دہکتے عارض، پیاسی سانسوں کی سنسناتی آنچیں ——— سارا مرمریں جسم جو جواہر کی دوکان تھا ———

مگر شکور کا دم گھٹ رہا تھا۔ حبس اور حرارت کا احساس جاگ اٹھا تھا۔ جیسے اس کے سامنے دوزخ کی آگ دہک رہی تھی۔ اور اس آگ میں اس کی روح سوکھی لکڑی کی طرح جلتی جا رہی تھی۔

حمید سہروردی

آگے پیچھے

اور ہاں اچھی طرح یاد رکھو
بغیر سمت کا تعین کئے آگے بڑھنا مناسب نہیں یوں بھی راستے سیدھے نہیں ہیں۔ آڑے ترچھے نیچے اوپر اور کو اور کہیں کہیں راستہ نہ ہونے کا گمان ہوتا ہے دیکھو گھبراؤ نہیں ہمت و جرات سے میدان مار لوگے۔ اور جب تمہیں راستہ نظر نہ آئے تو خود ہی راستہ پیدا کرلو اور اس کی افتتاحی ربن کاٹ دو تمہیں پورا پورا حق ہے۔

کئی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک ایسی جگہ نظر آئے گی کہ تم پھر گھبراؤ گے نشیب ہی نشیب نظر آئے گا وہاں تمہیں ہمت و استقلال سے ایک آواز بلند کرنا ہوگی۔

"راستے میری مٹھی میں ہیں"

راستے خود بخود تمہارے قدموں میں چلے آئیں گے اور وہاں آسمان نیچے آتا ہوا نظر آئے گا۔ کوئی بات نہیں۔ بے نیازی سے آگے بڑھو۔ اب تمہاری مٹھی میں راستے تلملاتے رہیں گے
اب تک تم کونسی سمت میں تھے۔

جنوب میں۔

اور اب شمال کی طرف بڑھو۔ یہاں راستے فراز ہی فراز میں نظر آئیں گے۔ ممکن ہے کہ تم تھوڑی دیر ہی میں تھک جاؤ گے تھکن فطری عمل ہے۔ یہاں تم ایک اور آواز بلند کرو۔

"آسمان میری مٹھی میں ہے"

تمہاری ایک مٹھی میں زمین (راستے) اور ایک مٹھی میں آسمان ہوگا۔

پھر آگے بڑھو۔ ایک بہت بڑا غار نظر آئے گا۔ وہاں سانپ اور بچھو نظر آئیں گے۔ سانپ بے حس پڑے ہوئے رہیں گے جن کی آنکھوں میں غنودگی اور منھ میں پھپھوندی ہوگا۔ اور بچھو ڈنک اٹھائے ادھر ادھر گھومتے نظر آئیں گے۔ تمہارے پیروں میں لوہے کے جوتے ہیں نا؟ تو پھر ٹھیک ہے۔ بچھو تمہارے پیروں کے نیچے کلبلاتے کلبلاتے ختم ہو جائیں گے۔ تم ذرہ برابر ڈرو نہیں —— غار کے اندر چلے جاؤ ——
یہاں ایک اور آواز بلند کرو ——

"میں آگیا ہوں"

وہاں تمہیں ایک آواز سنائی دے گی

"ہاں تمہارا ہی انتظار تھا"

اس جملہ کے بعد تمہیں نزدیک آنے کے لئے کہا جائیگا خبردار! تم فوراً اس آواز کی طرف نہیں بڑھوگے۔ جہاں کھڑے ہو وہیں زمین پر جھک جاؤ۔ ایک کنکرا اٹھاؤ —— جس طرف سے آواز آرہی ہے۔ اسی طرف وہ کنکرا اٹھا کر پوری قوت سے پھینک دو۔ ایک بھیانک قہقہہ تمہارے کانوں میں گھس پڑے گا۔ تم پوری تیزی سے پھر ایک کنکرا اٹھاؤ جس طرف سے

قہقہہ کی آواز آ رہی ہے۔ اسی طرف دوسرا کنکر پھینک دو۔
اب قہقہہ دوسری طرف سے نہیں سنائی دے گا۔ پھر تم پوری شتابی سے جھکو، تیسرا کنکر اٹھاؤ، اور جہاں سے قہقہہ بلند ہوا ہے۔ تیسرا کنکر پھینک دو، اب تمہیں دلفریب ہنسی سنائی دے گی۔ اسی طرح تم چوتھا، پانچواں، چھٹا اور جب تم ساتواں کنکر پھینکو گے تو ایک نسوانی آواز سنائی دے گی۔

میرے صدیوں کے محبوب تم اب تک کہاں رہے؟ تم ایک قدم آگے بڑھو، تمہیں وہی نسوانی آواز والا سایہ نظر آئے گا۔ ترشا ہوا۔ چل ایک قدم آگے بڑھو تمہیں لگے گا کہ اس سایہ کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں ہے۔ اس کے بعد تم ایک قدم آگے بڑھو گے اب تمہیں سر کے بال گھٹنوں تک نظر آئیں گے۔ تمہارے ذہن میں ایک بوسیدہ اور فرسودہ تشبیہ چلی آئے گی۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ تم ابھی ابھی سانپوں کے جنگل پار کر کے آگے بڑھو ہو۔ تمہارے منہ سے سانپ نکلے گا ——

ہوشیار! دراز زلفوں کو ہاتھ نہ لگاؤ، ہنسی کی آواز آئے گا۔ پھر تم پر تشبیہ کی حماقتی گرفت مضبوط ہوگی مدھ جھرنے کے پانی کی آواز آئے گی۔ اس کے بعد شاعرانہ کم نظر کی تمہاری آنکھوں میں فطری چمک پیدا ہوگی۔ اور یہی چمک بے پیئے نشے کا اثر کر جائے گی۔ کولہے نظر آئیں گے، شہوت انگیز رانیں —— اس کے بعد تمہاری نظر اس کے پیروں کو نہیں چھو سکے گی۔ شہوت انگیز رانیں، ہیجان خیز کولہے، اور شاعرانہ کمر اپنے حصار میں لے لے گی۔ —— ایک جھٹکے کے ساتھ تمہاری نظریں اوپر اٹھیں گی۔ اب وہ سایہ تمہاری طرف پشت کئے نہیں کھڑا رہے گا۔ بلکہ تمہارے سامنے ہوگا۔ تیز اور قیامت خیز جوبن —— جلتے اور دہکتے ہوئے ہونٹ —— بڑی بڑی اور نشیلی ہوئی آنکھیں —— اور جذبات آمیز ناف ——
تمہاری حالت ماہی بے آب کی طرح ہوگی۔

یاد رکھو —— !

تمہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ تم ایسا ویسا قدم نہیں اٹھاؤ گے
آواز .... آواز .... آواز ....

آواز .... چھم آ رہا .... چھم .... چھم ....
چھن چھن چھن .... آ گیا ہے کوئی جس کی محبت میں منتظر ایک آہٹ پر نکل جاتا تھا دم، اس کی ہیں مٹھیوں میں زمیں آسماں آ گیا ہے وہی، ہاں ہاں وہی۔ ہاں ہاں وہی۔

تم یہاں سے نہیں جاؤ گے، تم نہیں جاؤ گے۔ بس دیکھتے رہ جاؤ گے۔ تم ایک قدم آگے بڑھو گے، یہاں سے تمہاری آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ دیوار ہوگی۔ اور اس میں ایک سوراخ ہوگا۔ اور تم اس سوراخ سے باہر دیکھو گے یوں لگے گا کہ تمہاری وہ پرچھائیں باہر نکل گئی ہے لیکن تم باہر سانپوں کی بجائے آگ کا دریا اور بچھوؤں کی جگہ پانی کا سمندر۔ گھبراؤ نہیں۔

منظر بدلے گا —— !

تم جس راستے سے اندر غار میں داخل ہوئے ہو۔
اب اس راستہ کی طرف پشت کر کے غار کے دائیں طرف چلو وہاں پر ایک بڑا سا پتھر ہوگا۔ اس پتھر کو ہٹا دو اور زمین کے اندر دیکھو وہاں ایک سیڑھی نظر آئے گی۔ تم اس سیڑھی سے نیچے اترو آخری سیڑھی پر پانی ہوگا۔ تم تیرنا جانتے ہو۔ تیرتے ہوئے سیدھے آؤ، وہاں ایک روشن کھڑکی دکھائی دے گی۔ اس کھڑکی کے بائیں طرف کم از کم پندرہ منٹ تیرتے ہوئے آگے بڑھو۔
ایک آدمی کے برابر دروازہ نظر آئیگا اس پر قفل لگا ہوگا وہ زنگ آلود ہوگا تم وہاں پانی میں ٹھہر سکو گے۔ قفل جلد نہیں کھلے گا۔ دروازے کے بازو ایک محراب ہوگی۔ وہاں چراغ جل رہا ہوگا۔ اسی محراب میں چابی رکھی ہوگی۔ تم چراغ کو ہاتھ نہ لگاؤ، ورنہ چراغ گرگٹ کی شکل میں تمہارے ہاتھ میں آئے گا۔ اور اگر چراغ بجھا ہو تو جب بھی تم چراغ کو ہاتھ نہیں لگاؤ۔ آہستہ سے اندھیرے میں ہاتھ بڑھاؤ۔ وہیں قریب تمہیں چابی ملے گی۔ گھبراؤ نہیں۔

چابی قفل میں گھماؤ۔ دھندلے دھندلے اجالے میں زنگ آلود قفل نہیں کھلے گا۔ چابی کو زور زور سے تین مرتبہ گھماؤ قفل کھلے گا۔ قفل اور چابی وہیں رکھو۔ دروازے سے باہر آؤ، پلٹنے سے پہلے ہی دروازہ بند کردو۔ بغیر مڑے دو فرلانگ سیدھے ہی سیدھے چلتے رہو۔ اور کچھ دیر رکو۔ پھر سانس سیدھی کرلو۔ یہیں ایک چبوترہ نظر آئے گا۔ اور اس چبوترے پر ایک بزرگ جن کی گھٹنوں تک بڑھی ہوئی داڑھی، آنکھوں کے بھوئیں، اور سر کے بال سفید ہی سفید ہوں گے۔ وہ آنکھیں موندے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح کے منکے پھیرتے رہیں گے۔ تم وہاں جاکر خاموش کھڑے رہو گے۔ سفید ریش بزرگ کی آنکھ کھلے گی۔ اور چاروں اور اجالا پھیل جائے گا۔

اور کیا ہوگا ——— ؟

اور کیا ہوگا ——— ؟ ؟

اور کیا ہوگا ——— ؟ ؟ ؟

اور ———

بچہ کہہ رہا تھا کہ میری دونوں مٹھیاں خالی ہیں۔ ○

بقیہ: نام کا عذاب

اس انجان اور اندیکھے آدمی کے نام کا عذاب جھیل رہا تھا۔ گاڑی کے رکتے ہی میں پلیٹ فارم پر آگیا۔ سرد رات کی وجہ سے آدمیوں کی بھیڑ کم تھی۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ میرے گاڑی سے اترتے ہی جیسے چاروں طرف سے اجنبی نگاہیں میرے تعاقب میں لگ گئی ہیں۔ میں جلد از جلد اسٹیشن سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ EXIT کے چوڑے چکلے آہنی گیٹ کی طرف میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا چلنے لگا۔ لوگوں کی آنکھیں میرے چہرے اور میری پشت پر چبھ رہی تھیں ہوا کے تیز جھونکے کی طرح میں گیٹ سے باہر نکلا جارہا تھا۔ کہ ایک وزنی آواز کا زناٹے دار طمانچہ لگا ——— ٹکٹ ——— ؟

میں بوکھلا کر تیزی سے پلٹا۔ اور کالے کوٹ والے بابو کی ہتھیلی پر جلدی سے ٹکٹ رکھدیا۔ بابو کی ہتھیلی پر ٹکٹ رکھتے اور میرے باہر نکلتے ہی میرا وجود خود کو روئی کے گالے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا ——— اس لئے کہ اب میری روح اور میرا جسم قید عذاب سے آزاد ہوچکا تھا۔ ○

ارشد حلیم

نام کا عذاب

میں سفر میں تھا۔ لیکن نہیں، شاید وہ میں نہیں، بلکہ کوئی اور تھا جو ان دیکھا اور انجانا تھا۔ کبھی مجھے ایسا لگتا کہ کہیں میں بلا ٹکٹ سفر تو نہیں کر رہا ہوں۔ اور اگر دھر لیا گیا تو ــــــــ؟

حالانکہ ٹکٹ میرے پاس تھا۔ اور تھری ٹائر سلیپر کا تھا۔ لیکن مجھے مجبور کیا گیا کہ تم سفر کرو گے مگر اپنا اصل اس شہر میں چھوڑ کر کہ تمہیں سفر کرنا ہے۔ اور اپنی منزل پر جلد پہنچنا ہے ــــــ!

تب میں نے ریزرویشن کاؤنٹر پر بے انتہا بھیڑ دیکھی۔ تب میں کاؤنٹر کے باہر آس پاس منڈلاتے ہوئے دلالوں میں سے ایک دلال کو کنارے لے گیا۔ اور اس سے رجوع کیا۔ اس نے بلیک میں زیادہ روپے لے کر کسی دوسرے کے نام کا ٹکٹ مجھے تھما دیا۔ جو اس کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ حالانکہ میں نے احتجاج بھی کیا کہ مجھے میرے نام کا ریزرویشن چاہیے۔ تم اندر جا کر بابو سے ٹکٹ لے آؤ۔ مگر اس نے جھڑک دیا۔ لہٰذا یہ ٹکٹ جو میں آپ کو دے رہا ہوں یہ ایک بھلے آدمی کے لئے ہی ریزرو کرایا تھا۔ جو کسی وجہ سے نہیں جا سکے گا۔ حرج نہیں۔ تم ٹکٹ والے بابو کو یہی نام بتا دینا۔ کیا کرتا مجبوراً وہی ٹکٹ لے لینا پڑا۔ کیونکہ مجھے بمبئی میں سفر کرنا تھا۔ ٹکٹ لے کر اپنے ٹھکانے پر آیا تب کسی نے چپکے چپکے سے سرگوشی کی

تم نے یہ کیا غضب کیا ــــــ؟ اب تو تمہیں اپنی اس قطع اور اپنے لب و لہجہ کو ترک کرنا ہوگا۔ کہ تم دوسرے کے نام کی تختی اپنے سینے میں چھپائے سفر کرو گے۔ اور اگر کسی مصیبت میں گھر گئے تو ــــــ؟

میں شعوری طور پر اسی وقت سے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا کہ مجھے وہ بن جانا ہے جو میں نہیں ہوں۔ لہٰذا مجھے ان دیکھے آدمی کے نام کی مناسبت سے اپنا لباس بدلنا پڑا۔ حالانکہ اس کے نام اور مذہب کی مطابقت سے میرا یہ لباس بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ خیال کرکے کہ آج کے فیشن کے ہائی فیور کے باوجود کچھ روایتی اور عام لباس ایسے ہیں جو سب مذہب اور قوم کے لوگ زیب تن کرتے ہیں۔ اور جس سے ان کی قومیت، نسل، تہذیب، مذہب اور زبان کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ کہ یہ کس قوم، کس تہذیب، کس نسل، کس مذہب اور کس زبان و لہجے کا آدمی ہو سکتا ہے ــــــ؟؟

لباس کا مسئلہ حل ہوا تو میں نے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ سامان میں ایک چرمی سوٹ کیس، ایک ایئر بیگ، ایک پلاسٹک کی باسکٹ اور ایک پھولدار کپڑے کا تھیلا تھا ــــــ تھیلے سے کچھ میگزین اور کتابیں اور پرچے جھانک رہی تھیں۔ جس پر کسی کی نظر پڑ سکتی تھی۔ اور وہ آسانی سے ایک اچٹتی ہوئی نظر سے ہی پہچان سکتا تھا کہ یہ میگزین اور

یہ کتابیں کس زبان کی ہیں۔ لہٰذا میں نے اسے ٹھونس ٹھونس کر تھیلے کے اندر کیا۔ کہ سب حرف اور الفاظ اچھی طرح چھپ جائیں ورنہ اس کی وجہ سے بھی آفت میں گھر جانے کا قوی امکان تھا۔ اس کی طرف سے جب مطمئن ہو گیا تو ایک بہت بڑے مسئلے کا قطب مینار میرے سامنے حائل ہو گیا۔ وہ مسئلہ تھا زبان کا ـــــــــ!

جو زبان میری تھی وہ اس اَن دیکھے آدمی کی زبان قطعی نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ٹکٹ پر لکھا ہوا اس کا نام اور نام کی مناسبت سے اس کا مذہب صاف ظاہر تھا۔ اور جو مجھ سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا شعوری طور پر میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ جو زبان میری ہے اس کی نہیں ہو سکتی۔ ـــــــــ

بہت ہی کم لوگ اپنی زبان کے علاوہ دوسروں کی زبان اچھی طرح بول سکتے ہیں۔ لہٰذا مجھے اس سنگین مسئلے کا حل فوری سوچنا تھا کہ گاڑی کے کھلنے کا وقت سوا ۹ بجے رات میں تھا۔ اور ساڑھے سات بج چکے تھے ـــــــــ!

میری حالت اس مہاجر کی تھی جسکو ہجرت سے قبل اپنا وطن ہی نہیں اپنا سارا اثاثہ چھوڑ دینے پر مجبور کیا جا رہا تھا ـــــــــ!

رات کے اب ساڑھے آٹھ بج گئے۔ ہلکی ہلکی خنکی سے بدن میں کپکپی ہو رہی تھی۔ مجھے نو بجے گاڑی میں بیٹھ جانا تھا۔ لامحالہ زبان کے مسئلے کو یوں ہی تقدیر کی تابوت میں ٹھونک کر اٹھ جانا پڑا۔ ٹیکسی کو آواز دی اور زن سے اسٹیشن پہونچ گیا۔ قلی کو دو روپے دیئے۔ اس نے تھری ٹائر میں بروقت سامان مجھے ٹھونس دیا۔ میں نے برتھ کے نیچے اپنا سامان عجلت میں گھسایا۔ اور بیٹھ گیا۔ گاڑی کھلنے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے کمپارٹمنٹ کے دروازوں پر چسپاں ناموں کی فہرست سے اپنے ٹکٹ پر لکھے ہوئے اس اَن دیکھے آدمی کے نام کو ملایا۔ برتھ نمبر اور کمپارٹمنٹ نمبر بھی ٹھیک تھا۔ جب پوری تشفی ہو گئی تو واپس آکر اپنے برتھ پر بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحے بعد دو صاحب اور آگئے۔ اپنے سامانوں کو برتھ کے نیچے داخل کیا اور ہانپتے ہوئے جس پر میں بیٹھا تھا۔ بیٹھ گئے۔ گاڑی کھلنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھا۔ وہ آپس میں اپنی زبان میں گفتگو کرنے لگے۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک سکنڈ کی بھی دیر نہیں لگی کہ یہ دونوں جو ہیں وہ میرے ہی ہم مذہب ہیں ہم مذہب نہیں تو کم از کم ہم زبان ضرور ہیں۔ لیکن میں مجبور تھا کہ میں خود کو ان میں کھول نہیں سکتا تھا۔ بلکہ مجھے تو جبراً بغیرتی برتنی تھی۔ اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ جو آپ ہیں وہ میں نہیں۔ بلکہ میں وہ ہوں جو آپ نہیں۔ کیونکہ میں دوسرے کے نام کی تختی اپنے سینے میں چھپائے سفر کر رہا تھا

اب گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے سفر میں زیادہ بات کرنے سے گریز کرنا ہوگا۔ کہ مبادا میری اپنی زبان کا بھرم کھل گیا تو کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس سکتا ہوں ـــــــــ زبان کی شناخت سے انسان پہچانا جاتا ہے ـــــــــ

میرا المیہ یہ تھا کہ مجھے اپنے وجود پر اَن دیکھے آدمی کا نام اور نام کی مناسبت سے اس کی تہذیب اس کا مذہب اس کی زبان حتیٰ کہ اس کے متوقع احساسات اور جذبات کی بھی ترجمانی کرتے ہوئے سفر کرنا تھا۔ ـــــــــ یہ کام کتنا کٹھن تھا۔ مجھ پر جیسے ایک بدہئیت اور بدبخت آسیب سایہ فگن تھا اور جو مجھ سے زیادہ محتاط تھا ـــــــــ زیادہ طاقت ور تھا ـــــــــ

اب گاڑی خاصی تیز رفتاری سے بھاگتی جا رہی تھی رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ـــــــــ

میرا برتھ بیچ کا تھا اور وہ دونوں شخص جو میرے اصل سے مطابقت رکھتے تھے ان میں سے ایک کا برتھ میرے اوپر تھا اور دوسرے کا نیچے؛ اس لئے برتھ کھلنے کا بعد مجھے شدید

بننا ہی تھا۔ مگر ابھی ہم سب نیچے کے برتھ پر ہی بیٹھے تھے۔ میں نے ان لمبے اس اَن دیکھے آدمی کے متوقع لب و لہجہ میں کہا کہ آپ کو اگر تکلیف نہ ہو تو میں ابھی آپ کے برتھ پر ہی کچھ دیر اور بیٹھوں کہ ابھی رات کا آنچل کچھ زیادہ نہیں بھیگا ہے۔ اور پھر دو رات اور ڈیڑھ دن کی مسافت کا کرب تو بہرحال جھیلنا ہی ہے۔ اس نے میری اپنی زبان میں کہا کوئی بات نہیں سفر میں گفتگو ہی لوریت اور گھٹن کا واحد علاج ہے کہ راستے اور فاصلے سمٹتے جاتے ہیں۔ اور منزل کسی توبہ شکن محبوبہ کی طرح کسمساتی ہوئی قربت کی پیاس لئے باہوں سے لپٹتی جاتی ہے۔ ———!

ترا شاعرانہ لہجہ تھا اس شخص کا۔ مگر میں تو بے نام کرب کے حصار میں گھرا ہوا تھا۔ ڈرتا تھا کہ میں اپنی زبان میں گفتگو کرنے لگوں تو ممکن ہے وہ لیا جاؤں۔ اس لئے دل کے جوش مارتے ہوئے جذبات کو مجبوراً سرد خانے میں داخل کرنا پڑا۔ کہ جس زبان میں اس نے اتنی پیاری بات کہی تھی وہی زبان میری بھی تھی۔ اور اس سے بھی پیارے الفاظ اور جملے میں تراش سکتا تھا۔ مگر میں انہیں آواز کا سحر نہیں دے سکتا تھا۔ لہٰذا اسے صرف پھیکی مسکراہٹ دے کر میں خود ریزہ ریزہ ہو گیا ———!

کمپارٹمنٹ کے دوسرے مسافر آرام اور آسودگی کے ہچکولے چاٹ رہے تھے۔ میرے سامنے والے تینوں برتھ پر میرے اَن دیکھے وجود کے ہی ہمزاد براجمان تھے۔ جن کی نگاہیں بار بار میری طرف اٹھتی رہتی تھیں۔ اور مجھے ہر لمحہ یہ ہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ نگاہیں مجھکو پہچان تو نہیں رہی ہیں میرے دل میں ہر لمحہ شک ابھرتا کہ کہیں یہ میری اصلیت نہ جان لیں۔ ہر لمحہ یہی خدشہ لگا رہتا کہ اگر ان لوگوں نے پہچان لیا اور اس کی شکایت کالے کوٹ والے بابو تک پہنچا دی تو ——— ؟ میں جیسے کہ کوئی غیر قانونی چیز اپنے ہمراہ چھپا کر لے جا رہا تھا ——— ہاں شاید کہ میں نے ایک اَن دیکھے آدمی کے نام کو اپنے اوپر غیر قانونی اور غیر اخلاقی طور پر مسلط کر لیا تھا ——— ؟ شاید کہ یہ سرکار سے ایک فراڈ تھا۔ جو نادانستہ طور پر مجھ سے سرزد ہو گیا تھا۔ لیکن کوئی بتلائے کہ اس میں میرا قصور کیا تھا۔ ملکہ،، یہ میرا ہی جی جانتا ہے کہ میں کس اذیت ناک کیفیت سے گزرتے ہوئے سفر کر رہا تھا۔

میرے خیالات تفکرات اور جذبات اتھل پتھل ہو رہے تھے ——— طوفانی ہواؤں میں میری انا ایک تنہا پتے کی طرح میری زخمی روح کی ناتواں شاخ پر لرز رہی تھی۔ ——— مجھے لگ رہا تھا کہ میں ضرور کسی سنگین جرم اور گناہ کا مرتکب ہوا ہوں ——— میرے شعور کے ہر حساس خانے میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی ——— اس سرد اور پراسرار رات میں میرے اپنے وجود کا چاند گناہ اور جرم کے سیاہ بادلوں میں آہستہ آہستہ معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے عقیدے اور مذہب کے سمندر کو چاروں طرف سے کھنگال ڈالا کہ شاید اس میں میرے اس گناہ اور جرم سے بچنے کی کوئی صورت، کوئی سبیل نکل آئے۔ کوئی ایسا جواز مل جائے، جس کی وجہ سے میں گناہ اور سزا سے بری قرار دے دیا جاؤں لیکن ——— لیکن ہر بار میری ہتھیلیوں کے صدف میں مایوسیوں کی ریت بیٹھی ہوئی ملی ———

رات اور گہری ہو گئی اب کمپارٹمنٹ میں غنودگی کے بوجھل سائے رینگنے لگے تھے کہ کالے کوٹ والے بابو نظر آئے ...... ٹکٹ ...... ٹکٹ ..... لوگ لساہی سے ٹکٹ بڑھا دیتے اور بابو اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے، اس کا نام پوچھتے، اپنی چارٹ سے ملاتے، سرخ پنسل سے کچھ لکیریں کھینچتے، پھر دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھا

دیتے کہ جب میری طرف نگاہ اٹھی تو میری روح فنا ہو گئی دل دھڑکنے لگا۔ ایک لمحہ کے لئے ایسا لگا کہ میں کھڑکی سے چھلانگ لگا دوں۔ مگر میرے پیروں کو تو میرا آن دیکھا حریف جکڑے ہوئے تھا۔ اس کے نام کی تختی میرے ننگے سینے میں دہکتے ہوئے سکے کی طرح چپکی ہوئی تھی۔ ایک سکنڈ کے ساٹھویں حصے میں میں نے دعا کی کہ میں گونگا ہو جاؤں، اندھا ہو جاؤں، بہرا ہو جاؤں۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا —— بلکہ یکایک جیسے لمحے مجھ پر مہربان ہو گئے۔ کچھ لمحے پہلے جو بھونچال آیا تھا وہ اب ساکت ہو چکا تھا۔ صرف یہ ہوا کہ کالے کوٹ والے بابو اور میرے درمیان خاموشی کی طنابیں کھنچی رہیں۔ نہ میں کچھ بولا، نہ وہ کچھ بولے۔ میں نے جلدی سے بچھو کی طرح ڈنک مارتے ہوئے ٹکٹ کو ان کی طرف بڑھا دیا۔ اور انہوں نے ضروری کارروائی کے بعد ٹکٹ واپس کر دیا —— جانے کب سے میں اپنی یاد داشت پر مہر شک و شبہ ثبت کر چکا ہوں۔ مجھے یاد نہیں۔ شاید اسی وجہ سے گاڑی پر سوار ہونے کے بعد ٹکٹ پر لکھے ہوئے اس ان دیکھے وجود کے نام کو جس کا عذاب میں جھیل رہا تھا ایک چھوٹی سی پرچی پر لکھ کر اوپر کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اور ذہن میں بار بار دہراتا رہا تھا۔ جب بھول جاتا تو چپکے سے سب کی نظر بچا کر پرچی دیکھ لیتا اور دل ہی دل میں یاد کرنے لگتا۔ کیونکہ یہ خوف برابر دامن گیر رہا تھا کہ اگر کسی نے اور سب سے بڑھ کر اس کالے کوٹ والے بابو نے نام پوچھ لیا تو بجائے ٹکٹ پہ لکھے ہوئے نام کے میں نے لاشعوری طور پر اپنا اصلی نام بتا دیا تو فراڈ کے جرم میں گرفتار نہ کر لیا جاؤں —— !

ٹرین تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی تیز رفتاری سے بھاگتی جا رہی تھی۔ سردی شباب پہ تھی۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا کمپارٹمنٹ میں ہلکی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے علاوہ کمپارٹمنٹ کے سب مسافر نیند کی گود میں منہ چھپائے سو رہے تھے۔ کہ یکایک نیند سے چونکی ہوئی ایک جوان عورت کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ...... اوہنہ .... کیا کرتے ہو جی .... کوئی ہے .... ارے .... رے .... کوئی پیچھے دیکھ رہا ہے .... اوہنہ ہٹو بھی .... بڑے وہ ہو .... یہ گھر ہے کیا؟ .... میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش کھینچا۔ اور دھوئیں کو پھیپھڑے تک اتار کر خلا میں چھوڑ دیا۔ کمپارٹمنٹ میں ایک کہرے کی چادر سی پھیل گئی۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے خود کو قدرے پیچھے کھینچ لیا۔ کہ پھر وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ اور میں شرمندہ نہ ہو سکوں۔ وہ کوئی مرد تھا۔ جو اس شاداب عورت پر بادلوں کی طرح چھا جانا چاہتا تھا —— شاید وہ اس کا شوہر ہوگا۔ جو شدت جذبات میں بے نیام ہوا جا رہا تھا۔

صبح ہوئی تو سورج کی ابتدائی کرنیں کھڑکیوں سے آکر گدگدانے لگیں۔ سرد موسم میں دھوپ کا احساس بھی بڑا لطف دیتا ہے۔ صبح سے شام تک مجھ پر جاں کنی کا عالم رہا۔ کالے کوٹ والے بابو کا اور بھی کئی اسٹیشنوں پر سامنا ہوا۔ ہر بار وہ میرے احساسات کے دریچے سے مجھ پہ شک و شبہ کی نگاہ ڈالتے ہوئے نظر آئے —— !

گذرتے ہوئے وقت کے کسی ایک پل میں کسی نے اندر سے رک رک کر کہا کہ ایسا کیوں ہوا —— ؟ ایسا کیوں ہوتا ہے —— ؟ کسی نے اندر سے جواب دیا کہ جب تک ماحول اور زمانے کی چھاتی پر تخریب، غلام نفس و زر اور بندے خود غرضی مسلط رہیں گے۔ تب تک ہر شخص کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہوتا رہے گا —— !

رات کے ساڑھے تین بج گئے —— گاڑی اس اسٹیشن پر رک گئی۔ جہاں مجھے اترنا تھا۔ میں اب بھی

محمود شاہد

ہوا پر بیٹھا ہوا مہارشی

نصف شب کے قریب اس چھوٹے سے گاؤں میں خوفناک آگ بھڑک اٹھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کی ساری جھونپڑیاں جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئیں۔ جھونپڑیوں میں بے خبر سوتے ہوئے لوگ بھی اپنی جھونپڑیوں کے ساتھ جل کر راکھ کا حصہ بن گئے۔ اور وہ لوگ جنھیں کسی وجہ سے نیند نہیں آئی تھی۔ اور جو بیدار تھے کسی طرح جلتی ہوئی جھونپڑیوں میں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن ان میں سے کسی کا چہرہ جھلس گیا کسی کا سر زخمی ہوگیا۔ کسی کے ہاتھ پاؤں جل گئے کسی کی آنکھیں جل گئیں۔ کسی کا بازو کٹ گیا۔ وہ پریشان ہو اٹھے اور جلتی ہوئی جھونپڑیوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کو بچانے کی تگ و دو کرنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جھونپڑیوں میں کیسے آگ لگی۔ جب سے ہوا پر بیٹھے ہوئے مہارشی نے پیشین گوئی کی تھی کہ اس علاقے کا ایک گاؤں آگ لگنے کی وجہ سے جل کر تباہ ہوجائے گا۔ وہ آگ کے استعمال میں انتہائی محتاط ہوگئے۔ ضرورت پر آگ جلاتے اور پھر بجھا دیتے۔ گلی کوچوں اور کھلے مقامات پر آگ جلانے کی سخت ممانعت تھی۔ اور یہاں تک کہ گھروں میں بلا ضرورت آگ محفوظ نہ رکھنے کی گاؤں والوں کو تاکید کر دی گئی تھی۔ اگر کسی جھونپڑی کے روشن دان سے ہلکی سی چنگاری بھی اڑتی دکھائی دیتی۔ تو سارے گاؤں میں واویلا مچ جاتا۔ اور اس جھونپڑی کے لوگوں کو خوب ڈانٹ پلائی جاتی۔ ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود گاؤں میں آگ کیسے لگی؟ ایک اور حیران کن بات یہ تھی کہ ایک ہی وقت میں ساری جھونپڑیوں میں آگ لگی۔ اور ایک ہی وقت میں ساری جھونپڑیاں جل کر زمین بوس ہوگئیں۔ لوگوں کو سنبھلنے اور آگ بجھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ بھیانک آگ جھونپڑیوں کو آدمیوں سمیت چٹ کر گئی۔

صبح ہوتے ہوتے آتش زدگی کے اس واقعہ کی خبر قرب و جوار کے سارے علاقے میں پھیل گئی۔ لوگ یہ تصور کر کے خوف اور دہشت سے لرز اٹھے کہ اگر یہ آگ ان کے گھروں میں لگ جاتی تو ان کا کیا حشر ہوتا۔ علاقے کے گھبرائے ہوئے لوگ ہوا پر بیٹھے ہوئے مہارشی کے پاس دوڑے پہنچے مہارشی ہوا پر بیٹھا تپسیا میں مستغرق تھا۔ کافی دیر بعد اس نے اپنی سحر انگیز آنکھیں کھولیں۔ اور اپنے سامنے خوف سے کانپتے ہوئے لوگوں کے مجمع کو دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ قلیل وقفے کے بعد پھر وہ اپنی آنکھیں کھول کر لوگوں سے مخاطب ہوا۔

میں جانتا ہوں کہ تم لوگ کیوں آئے ہو؟ تم سب اس گاؤں کے حادثہ سے خوفزدہ ہوگئے ہونا۔ کہ کہیں تمہاری بستیوں کا انجام بھی اس گاؤں جیسا نہ ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ اب اس علاقے میں آتش زدگی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آئے گا۔ لیکن

مہارشی اپنی آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گیا۔ اس
کی خاموشی جونک بن کر لوگوں کی شہ رگ سے چمٹ گئی
اور ان کا خون چوسنے لگی۔

کچھ دیر بعد پھر اس نے اپنی گہری آنکھیں کھول کر بات

[illegible]

[illegible] ایک چرواہا ایک ناگہانی بلا کا شکار ہو

[illegible]

مہارشی نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور سر کی جنبش
سے لوگوں کو چلے جانے کا اشارہ کر کے تپسیا میں منہمک ہو گیا۔

لوگ ایک اور خوف کا اژدھا اپنی گردنوں میں لٹکائے
اپنی بستیوں کو لوٹ آئے۔ علاقے کے چرواہوں میں شدید سراسیمگی
پھیل گئی۔ معلوم نہیں یہ بلا کب کس کے سر آئے۔ چرواہے
اپنے مویشیوں کے ساتھ جنگل کی طرف نکلتے تو ایک انجانا خوف
ان کے پیچھے لگا رہتا۔ انہیں درختوں، جھاڑیوں، پتوں، بیلوں
سے وحشت سی ہونے لگتی۔ وہ ڈرے سہمے ہوئے رہتے
کہ کہیں سے کوئی سایہ نکل کر انہیں دبوچ نہ لے۔ اپنی ہی مویشیوں
میں سے انہیں کسی پر شک ہونے لگتا۔ یا کوئی جانور ان کی
طرف کبھی گھور کر دیکھتا تو وہ اس جانور کو گاؤں میں کسی درخت
سے باندھ دیتے۔ اور اس پر کڑی نظر رکھی جاتی کہ کہیں وہ بلا کی
صورت میں ان پر نازل نہ ہو جائے۔ وہ سورج غروب ہونے سے
بہت پہلے اپنے مویشیوں کو لے کر جنگل سے گھروں کو لوٹ
آتے۔ جنگل جہاں انہیں اپنے گھروں سے زیادہ آزادی اور خوشی
حاصل تھی۔ اب وہاں انہیں اپنی جان کا خطرہ محسوس ہونے لگا
تھا۔

ایک شام اس دور افتادہ دیہات میں ایک بوڑھیا
جھونپڑی کے سامنے بیٹھی چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے
لگی۔ بوڑھیا کو روتے دیکھ کر تمام دیہاتی گھبرائے ہوئے اس کے
پاس جمع ہو گئے۔ بوڑھیا کا جوان لڑکا اپنی بکریوں کے ساتھ
جنگل سے ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ دوسرے چرواہے دن ڈھلنے
سے پہلے اپنے ہی گھروں کو لوٹ آئے تھے۔ اس پر دیہات میں
سخت اضطراب پھیل گیا اور ہوا پہ بیٹھے ہوئے مہارشی کی بات
یاد کر کے دیہاتی تھرا اٹھے۔ بوڑھیا روتے روتے بے ہوش
ہو گئی۔ دیہاتیوں نے اپنی مشعلیں اور لالٹینیں تیار کیں۔ اور
بوڑھیا کے لڑکے کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے جنگل کی طرف نکل
پڑے۔ رات بھر جنگل میں تلاش کرتے رہے۔ لیکن نہ تو بوڑھیا
کے لڑکے کا کہیں پتہ ملا اور نہ ہی بکریاں نظر آئیں۔ نوجوان
چرواہے کا اپنی بکریاں سمیت جنگل میں غائب ہو جانے کی خبر
اطراف و اکناف کے علاقوں میں پہونچ گئی۔ ان واقعات نے
سارے علاقے میں خوف اور دہشت کے آسیب پھیلا دیئے
اور لوگوں نے ان ناگہانی بلاؤں اور آفتوں سے نجات حاصل
کرنے کے لئے ہوا پہ بیٹھے ہوئے مہارشی کی پرستش شروع
کر دی۔

آہستہ آہستہ اس پورے علاقے میں سکون و اطمینان
کی فضا پیدا ہونے لگی۔ اور لوگوں کے وجود کو زخمی کرتے ہوئے
خوف کا اثر زائل ہونے لگا اور ایک طویل عرصے میں اس علاقے
میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اور اس دوران مہا
رشی نے بھی کسی حادثہ کی پیشین گوئی نہیں کی تھی۔

ایک صبح اس قصبہ کے ۱۲ بارہ خاندانوں کے افراد
اپنے محلے کے کنوئیں کا پانی پینے کے فوراً بعد موت کے منہ
میں چلے گئے۔ کنوئیں کا پاک و شفاف میٹھا پانی سم میں تبدیل
ہو گیا تھا۔ قصبے کے لوگوں نے اس کنوئیں کو گھیر لیا۔ کنوئیں سے
تلخ و ترش ابخرات اٹھ رہے تھے۔ جس کی تیز بو سے دماغ میں
سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ اور لوگوں کو اپنی آنکھوں اور
اور نتھنوں اور سانسوں میں تیزاب سا اترتا محسوس

ہو رہا تھا۔ جلدی سے لوگ کنوئیں کے منہ کو ایک مضبوط چٹان سے بند کر کے ہوا پر بیٹھے ہوئے مہارشی کے پاس دوڑے۔ مہارشی تپسیا میں محو تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی جھکتی ہوئی آنکھیں کھول کر اپنے سامنے کھڑے ہوئے پریشان و مغموم لوگوں کو دیکھا۔ اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مختصر سے وقفے کے بعد پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول کر لوگوں سے کہا۔

اس کنوئیں کی طرح تمہارے قصبے کے سارے کنوؤں کا پانی سم میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور تم پانچ دہائیوں تک ان کنوؤں کو تم استعمال نہیں کر سکو گے۔ پانچ دہائیوں کے بعد سم کا اثر زائل ہونے لگے گا اور کنوؤں کا پانی استعمال کے قابل بنے گا۔

مہارشی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور ہاتھ کی انگلی سے لوگوں کو چلے جانے کا اشارہ کر کے پھر تپسیا میں غرق ہو گیا دوسرے دن قصبے کے سارے کنوؤں کا پانی سم میں تبدیل ہو گیا۔ قصبے کے لوگوں کو محسوس ہوا جیسے وہ ایک لق و دق صحرا میں آ گئے ہیں۔ جہاں چشمے تو موجود ہیں۔ لیکن ان میں پانی کے بجائے گرم گرم ریت بھری ہوئی ہے۔ اب وہ پانی کہاں سے حاصل کر سکیں گے۔ اس قصبے سے کوئی ندی یا جھیل بھی نہیں گزرتی تھی۔ اور اس سے ملحق کوئی دوسرا گاؤں بھی نہیں تھا یہاں سے سارے علاقے کافی دوری پر واقع تھے پیاس کے شدید احساس سے لوگوں کے حلقوم میں سوکھے نوکدار کانٹے اگ آئے تھے۔ قصبے کے لوگ پانی کے حصول کے لئے اپنی بگھیوں، اور جانوروں کو لے کر دور دراز کے علاقوں کی طرف چل پڑے، اور سخت دشواریوں اور تکلیفوں سے اپنے قصبے کو پانی لاتے رہے۔

اسی دوران پہاڑی کے دامن میں واقع بستی میں پڑوس کے جانور گھس آئے اور مقامی جانوروں پر ٹوٹ پڑے، مقامی اور بیرونی جانوروں میں شدید خون ریز لڑائی چھڑ گئی۔ اور بستی میں سخت افراتفری اور انتشار پھیل گیا بستی کے لوگوں کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ لڑائی دن بدن زور پکڑنے لگی۔ اور اس لڑائی میں کئی لوگوں کی جانیں بھی تلف ہو گئیں۔ جانور گھروں میں گھس آئے تھے۔ لوگ حواس باختہ ہو کر اپنے مکانات چھوڑ کر قریب کی پہاڑی پر چڑھ گئے تھے۔ پہاڑ کے باسیوں نے بستی کے لوگوں کو اپنے گھروں میں پناہ دی۔ اور کئی عارضی جھونپڑیاں بنا کر ان کے رہنے کا انتظام کیا۔ کئی لوگوں نے غاروں کے اندر، درختوں کے نیچے اور چٹانوں کے سائے میں رہنے کا بندوبست کر لیا۔ پہاڑ کے باسیوں نے اپنے پاس جو کچھ بھی کھانے پینے کی چیزیں میسر تھیں۔ بستی کے لوگوں کو فراہم کیں۔ پہاڑ کے باسی خود بھی اناج کے لئے اسی بستی پر انحصار کرتے تھے۔ جس کے لوگ اب ان کے یہاں پناہ گزیں تھے۔ جانوروں نے بستی کی ساری فصلوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اور خوراک کی زبردست قلت پیدا ہو گئی تھی۔ بستی کے لوگ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں پہاڑی پر رہنے لگے۔ بستی میں، جانوروں کی خوفناک لڑائی مسلسل جاری تھی۔

اس سارے علاقے کی فضا ایک بار پھر مکدر ہو گئی اور چاروں طرف خوف و ہراس کے بھیانک بگولے اٹھنے لگے۔ وہ نہایت ہی سنجیدگی سے ان سارے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس پورے علاقے میں پھیلی ہوئی غیر یقینی صورت حال سے اسے بے حد تشویش لاحق تھی۔ متواتر رونما ہونے والے واقعات نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا وہ جب بھی ہوا پر بیٹھے ہوئے مہارشی کے متعلق سوچتا اس کے دل و دماغ میں عجیب سے خیالات سر اٹھاتے آج بھی، وہ مہارشی کے بارے میں سوچتا ہوا پہاڑی سے نیچے اتر آیا۔ اور مہارشی کی سمت چلنے لگا۔ ایک عجیب احساس اور جذبہ سے اس کے سارے بدن کا خون جوش

کھا رہا تھا۔ وہ نہارشی کے پاس پہونچا۔ نہارشی حسب معمول ہوا پر بیٹھا تپسیا میں مستغرق تھا۔ وہ نہارشی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور نہارشی کے آنکھیں کھولنے کا انتظار کئے بغیر اس پر چیخ اٹھا۔

جب تم ہمارے علاقے میں رونما ہونے والے واقعات کی پہلے سے خبر رکھتے ہو تو پھر تم اپنی شکتی اور قوت سے ان حادثات اور بلاؤں کو کیوں نہیں روکتے؟ ہم تمہاری پرستش کرتے ہیں۔ تمہارا احترام کرتے ہیں۔ لیکن تم ——— تم بے رحم ہو ——— سنگ دل ہو ——— ظالم ہو ———

نہارشی آنکھیں بند کئے اس کی باتیں سنتا رہا۔

یہ پہلی دفعہ تھا کہ کسی نے اس کے روبرو کھڑے ہو کر اس سے بات کرنے کی جرأت کی تھی۔ نہارشی کا چہرہ غضب ناک ہو گیا۔ اس کے سارے وجود میں لرزہ سا پیدا ہو گیا۔ اور اس کی قہر آلود آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ وہ نہارشی کی اس حالت کو دیکھ کر دہشت کے مارے وہاں سے بھاگ کر پہاڑی پر چلا آیا۔ اور اپنی جھونپڑی میں بند ہو گیا۔

اسی روز نہارشی نے پیشین گوئی کر دی کہ پہاڑی پر رہنے والے ایک نوجوان کی سانپ کے کاٹنے سے موت واقع ہو جائے گی۔

اندھیرا چھانے لگا تھا۔ نہارشی کی اس پیشین گوئی سے پہاڑی پر بسے ہوئے لوگوں کے دل لرز اٹھے۔ وہ پہلے ہی مصیبتوں اور بلاؤں کے شکار رہے تھے۔ انہوں نے مشعلیں جلا کر ساری پہاڑی پر اجالا کر دیا کہ کہیں کوئی سانپ ان کی نظروں سے بچ کر ان پر حملہ نہ کر دے۔ وہ ہاتھوں میں مشعلیں اور لاٹھیاں لئے جاگتے رہے۔ اتنے میں پہاڑی کی بلندی سے ایک دہشتناک انسانی چیخ ابھری اس چیخ کو سن کر لوگوں کی سانسیں اسی دم رک گئیں۔ اور ہر شخص یہ محسوس کرنے لگا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگے۔ کچھ لوگ لاٹھیاں لے کر آواز کی سمت بھاگے بلندی پر واقع ایک جھونپڑی میں ایک شخص بری طرح کراہ رہا تھا۔ لوگ احتیاط سے جھونپڑی کے اندر داخل ہوئے جھونپڑی میں ایک نوجوان بے بسی کے عالم میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اس کا سارا بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور آنکھیں پھر گئی تھیں۔ لوگوں نے سمجھا کہ اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ جھونپڑی کے اندر اور باہر تلاشی لی گئی لیکن کہیں بھی سانپ کے موجودگی کے آثار نہیں ملے۔ وہیں ایک مارگیر بھی موجود تھا۔ اس نے اپنی بین بجانی شروع کی تاکہ چھپا ہوا سانپ باہر نکل آئے۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں کہہ رہا تھا۔

تم فضول کیوں سانپ کو ڈھونڈ رہے ہو۔ مجھے سانپ نے نہیں کاٹا ہے۔ مجھے زہر پلایا گیا ہے۔

بین کی آواز میں لوگ اس کی بات سن نہ سکے اور اس نے انتہائی تکلیف کے عالم میں دم توڑ دیا۔ مارگیر بین بجاتا رہا اور لوگ سانپ کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے رہے۔

قطعات

(۱)

آ گئی تیرے ساتھ ساتھ گھٹا
مل گئے جام تیری آنکھوں کے
شیشہ و مئے کہاں سے لاتے ہم
بن گیا کام تیری آنکھوں سے

(۲)

دن گزرتا ہے ان کی یادوں میں
روشن اشکوں سے رات کرتا ہوں
میں کہتا نہیں ہوں شعر کبھی
دل کے زخموں سے بات کرتا ہوں

(۳)

ہم جو کافر ہیں سب کی نظروں میں
سیڑھیاں مسجدوں کی چڑھتے ہیں
کون جانے تو مل ہی جائے ہمیں
آج ہم بھی نماز پڑھتے ہیں

صابردت

کوہ ندا .....

نصر قریشی

مرا نام گمنامیوں کی چٹانوں سے باہر نکلنے کو سر پھوڑتا ہے
مرا کارواں ایک مدت سے صحراؤں کی وسعتوں میں کہیں کھو گیا ہے
کوئی جیسے تاریک غاروں میں سورج کو ترسے
شب و روز کا یہ تماشا ہے جاری
مرا میں نجانے کہاں کھو گیا ہے۔
ہوئی صبح تو زندگی کے تعاقب میں اندھوں کی مانند میں چل پڑا ہوں
ڈھلی شام تو لوٹتا، پھوٹتا، تھکا، ہارا واپس ہوا ہوں
فائلوں میں قلم پھنس گیا ہے
مرا ذہن افکار کے شور میں گم
صداؤں کے پتھر مرے سر کو پھوڑیں
غم جاں کا کوئی مداوا کہاں ہے
ہر اک سمت بے مہریوں کے تلاطم میں اخلاص کا نام ڈوبا
جسے دیکھو اپنے تصور میں گم ہے۔
میں جن کے لئے محفلوں کو سجاتا رہا ہوں
تبسم کی کلیاں بچھاتا رہا ہوں
مرے راستوں میں وہی پتھروں کی طرح بچھ گئے ہیں
مرے نام کو بغض کے تیز نیزوں سے وہ چھیدتے ہیں
مرے پیار کا آئینہ توڑتے ہیں
کوئی موڑ آیا تو منہ موڑتے ہیں
میں چاہت، مروت، محبت کا پیکر
زمانے میں حرف وفا بن گیا ہوں
خدا کی خدائی میں زندہ رہوں گا
بکھر کر [illegible] سب کی کہانی [illegible]
مرا نام کوہ ندا کا پتا ہے

صحراؤں کی پیاس

سید احمد شمیم

پھر سنا ہے
کہ مرے شہر میں وہ آیا ہے
جس نے
لکھا تھا کبھی مجھکو
بہت پیار کے ساتھ....

میں کہ اک حرف تھا
بے معنی و مفہوم
اکیلا تنہا
اس نے پہنایا مجھے
معنی و مفہوم کا
زرتار لباس

اور پھر
توڑ کے یوں پھینک دیا
کہ ہے آج مرے ہونٹوں پہ
کتنے جلتے ہوئے
صحراؤں کی پیاس۔!!

پرندہ زندگی کا

نہ جانے کتنی صدیوں سے
پرندہ زندگی کا اپنے شہپر
پھڑپھڑاتا ہے۔
کبھی کہسار پر بیٹھا
انا کی وسعتیں ناپے
کبھی یہ خودنمائی کے
بھنور میں ڈوب جاتا ہے
پرندہ زندگی کا اپنے شہپر
پھڑپھڑاتا ہے
کبھی گیتی کی حد ماورا سے
بقا کی رحمتیں مانگے
کبھی لمحوں کے دشت بے کراں میں
ابد کی قربتیں مانگے
کبھی محرومی تقدیر پہ
آنسو بہاتا ہے
پرندہ زندگی کا اپنے شہپر
پھڑپھڑاتا ہے
تعصب کے اندھیروں میں
کبھی یہ راحتیں چاہے
کبھی دل کے حصاروں سے
خلا کی وسعتیں چاہے
کبھی نفرت کے پودوں سے
مہکتی الفتیں چاہے
کبھی یہ بغض و کینہ کی
نئی فصلیں اگاتا ہے
پرندہ زندگی کا اپنے شہپر
پھڑپھڑاتا ہے۔

موہن راہی لندن

پیاس

میں اندھیرا ہوں مجھے ہر روشنی کی پیاس ہے
ہر کرن قاتل ہے میری پھر بھی مجھکو راس ہے
مجھکو اپنی بے بسی کا رات دن احساس ہے
میری نبضیں ٹوٹتی ہیں نور کی برسات میں
میری رگ رگ میں اتر جاتی ہے کرنوں کی انی
میں ازل سے تا ابد لا انتہا اک پیاس ہوں
پیاس جو سیراب ہوتی ہے زمیں تا آسماں
پیاس جو ساحل سے لے کر دوسرے ساحل تلک
ایک اک ذرے کا حاصل ایک اک قطرے میں ہے
پیاس جو ہے زندگی سے موت تک پھیلا ہوا
لامکاں سا فاصلہ اک لامکاں سا سلسلہ
پیاس جو ہے دشت دل سے آنکھ تک بہتی ہوئی
کرب کے لا انتہا دریا کی اک بے رنگ بوند
پیاس جو روتے ہوئے تشنہ لبوں کا رقص ہے
پیاس جو ہے ———
روز اول سے
صدائے دل
نوائے بے صدا
پیاس جو ہے پھول پتوں، خانہ زادوں کی ہوس
پیاس جو ہے شام سے تا بہ سحر
بے نور پھیلی ہوئی شاخ شجر شاخ ثمر
پیاس شبنم کی ہر اک گل کو ہے جیسے ہر گھڑی
ان گنت سالوں سے تاریکی محیط زندگی
ان گنت برسوں سے تاریکی صدائے زندگی
ان گنت صدیوں سے تاریکی شریک زندگی
میں اندھیرا ہوں مجھے ہر روشنی کی پیاس ہے
ہر کرن قاتل ہے میری۔ پھر بھی مجھکو راس ہے

زخم کے بھرنے تک ....

نوشاد نوری
(بنگلہ دیش)

یہ عالم سکوت و تکلم، خدا کی خیر
دلدوز ہے گریز و تعاقب کی چاشنی
رنگ شفق میں اور بھی کچھ دن اٹی رہے
کچی کلی کو راس نہیں تیز روشنی
دیتے ہیں آبگینہ صفت کو مساس نرم
گل کو نسیم قطرۂ شبنم کو چاندنی

اک بت تراش تیشہ آہن کے باوجود
پر بت تراش دیتا ہے اوزار کے بغیر
پوشیدہ خد و خال کی بے رنگ سلوٹیں
ماتھے پہ رینگ جاتی ہیں اظہار کے بغیر
موج صبا پہ اور بھی کچھ دن رکی رہے
منتی نہیں ہے یار طرح دار کے بغیر

"اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی"
اس عاشقی نے سانس کو آزاد کر دیا
آداب کی، سکوت کی، ڈر کی، لحاظ کی
اس اک پناہ گاہ کو مسمار کر دیا
جاگے تو اس کی یاد تھپک کر سلا گئی
سوئے تو اس کے خواب نے بیدار کر دیا

یہ خواب اور خیال کے خود کار سلسلے
یہ درد خود شناس کے خاموش مرحلے
[illegible] ہے ہیں زخم سے ناخن کے فاصلے

ایک نظم

دیپک قمر

چندا نکلا تاروں بیچ
آئینے میں کیا دیکھا
آبشار اک جذبہ ہے

گوری پھرتی سکھیوں بیچ
انگلی دابی دانتوں بیچ
راہ کھڑے پاشالوں بیچ

سبھی سہانی پونم رات
اس مالن کی ڈلیا میں
اپنوں کی بیٹھک تج کر

دلہن لگتی گہنوں بیچ
ناگ چھپا ہے پھولوں بیچ
بیٹھے کیوں بیگانوں بیچ

جنگل کی پگڈنڈی سی
ایک بھیڑیا آن گھسا
کون کلی کا مکھ چومے

مانگ نکالی بالوں بیچ
بھولی بھالی بھیڑوں بیچ
چھڑی لڑائی بھنوروں بیچ

تم میرے ہو جاؤگے تو
مڑ مڑ دیکھے جاتے ہیں
[illegible] بے دن تیرے جیسے

رکھا نہیں وہ ہاتھوں بیچ
کون ملا تھا راہوں بیچ
جانے کتنے گزرے سالوں بیچ

فضا ابن فیضی

کمند لفظوں پہ معنی کی ڈال رکھی تھی!
نہ پوچھ! کیسے بنا سے خیال رکھی تھی

جواں ہوا مرا لہجہ، تو سر وسا نکلا
کہ ابتدا سے بڑی دیکھ بھال رکھی تھی

سبھوں کی مٹی میں ساحل کی خشک ریت آئی
کہ موج موج تو ہم نے کھنگال رکھی تھی

وہ کٹ کے رہ گیا، کرتا بھی کیا کہ ہم نے بھی
اسی پتنگ کی ڈوری سنبھال رکھی تھی

ہر ایک شخص ہے گندم، زیاں کے خرمن کا
کہاں چھپا کے متاعِ زوال رکھی تھی!

اب اور قریۂ بے چہرگاں میں کرتے کیا
نقاب ہم نے بھی چہرے پہ ڈال رکھی تھی

ہم آسماں سے مل کر ہوئے بہت مایوس
زمیں نے اپنی ہی مٹی اچھال رکھی تھی!

عجیب تھا منظر بستی، کہ ہر دریچے پہ!
بس ایک شمع، ہوا کی مثال رکھی تھی

رہا قدح بہ قدح، سخت دھوپ کا موسم
سبو میں اس نے مری پیاس ڈھال رکھی تھی

کوئی بھی شہر میں اس کے، نہ تنگ دست ملا
مصیبت ایک نئی، سب نے پال رکھی تھی

طلسم کھل نہ سکا اس کے پورے چہرے کا
سبھوں نے اپنی نظر، خال خال رکھی تھی

ہمارا کام تھا جادو کی داستاں لکھنا
ورق ورق، وہی چشمِ غزال رکھی تھی

رہا نہ خوش ہنروں کو بھی پاس وضعِ فضا
وہ راہ بے ہنروں نے نکال رکھی تھی

پرکاش فکری

جاں ہتھیلی پہ لے کے نکلے کون
سیلِ دہشت کو بڑھ کے روکے کون

زخمِ رسوائی بھی نہیں ملتے
کوچہ گردی کا شوق رکھے کون

غم کی گہرائیاں جو حاصل ہیں
پھر سمندر کی تہہ میں ڈوبے کون

میری آنکھوں میں کیسے آنسو ہیں
سب کو اپنی پڑی ہے پوچھے کون

اپنے یاروں میں جب نہیں ملتا
صف میں غیروں کی تجھ کو ڈھونڈے کون

سبز پیڑوں کے نرم سائے میں
گزرے موسم کا سوگ پائے کون

وہ جو راہوں میں کھو گئے فکری
راہِ منزل پہ ان کی دیکھے کون

زہر کا جادو جب بھی مرے سر پر چڑھ کر بولے
کتنی ہی گرہیں ڈالے مجھ میں کتنی ہی گرہیں کھولے

اپنا بکھرا جسم لئے میں چوکھٹ چوکھٹ گھوموں
ایسے میں جو اپنا سمجھے روح میں امرت گھولے

مٹی ہوں یا سونا ہوں میں اب تک جان نہ پایا
کوئی مجھے تو جانچے پرکھے کوئی تو مجھ کو تولے

جس رستے پہ چل کر میں نے اپنا مان گنوایا!
اس رستے پہ کوئی نہیں ہے ساتھ مرے جو ہو لے

رات تری بے چینی والی، دن نکلے تو پاگل پن!
تھک کر لیٹ کبھی تو فکری تھوڑی دیر تو سو لے

شاہد کلیم

دشواریٔ سفر سے میں انجان بھی نہ تھا
زنبیل میں مگر کوئی سامان بھی نہ تھا

ہوتا کہاں نصیب مجھے لمحۂ سکوں
میرے لئے تو کوئی بیابان بھی نہ تھا

منزل پہ سارے لوگ سلامت پہنچ گئے
اب کے سفر میں خوف کا امکان بھی نہ تھا

طوفان کا ظلم سہہ گیا یہ اور بات تھی
دیوار و در کی طرح میں بے جان بھی نہ تھا

ہم بن سکے نہ دشت و جبل کے مکین بھی
لوٹ آنا اپنے شہر میں آسان بھی نہ تھا

لوٹا گیا تھا وقتِ سفر شہر میں کلیمؔ
شمعیں جلی تھیں، راستہ سنسان بھی نہ تھا

سراج العارفی قادری
(بنگلہ دیش)

نظروں کو دھوپ، چھاؤں کا منظر دیا گیا
دل کو انعام درد کا لشکر دیا گیا

زخموں سے چور چور ہو، تو پیکر لہولہان
ہر ہاتھ میں اسی لئے پتھر دیا گیا

چھوئے نہ ذرا پیار سے کوئی یہ سوچ کر
غنچوں کے منہ میں برہنہ خنجر دیا گیا

جب زندگی کی بات چلی ہو گئے خموش
پیغام میری موت کا گھر گھر دیا گیا

کس خوبصورتی سے یہ رندوں کے ہاتھ میں
انسانیت کے خون کا ساغر دیا گیا

یہ تلخ تلخ جملے، یہ الفاظ سرد سرد
مجھ کو تو خشک زہر برابر دیا گیا

معراجؔ کو ڈبونے کی سازش نہ ہو کہیں
اشکوں میں اس کو بند سمندر دیا گیا

جمیل عظیم آبادی

لے اڑی باد صبا محفل سے پروانوں کی خاک
جانے کس کس دیش تک بکھر گئی دیوانوں کی خاک

میکشی جب سے ہوئی متروک اپنے شہر میں
چاٹتے پھرتے ہیں سارے رند پیمانوں کی خاک

رہبران قوم و ملت قائدان کارواں
سر جھکا کر چومتے ہیں شاہی ایوانوں کی خاک

راکھ جل کر جو ہوئے فہم و ذکا کی آگ میں!
درس گاہوں میں پڑی ہے ایسے فرزانوں کی خاک!

وہ گھڑی سنگین تھی جب جل رہے تھے بام و در
آسماں تک اڑ رہی تھی اپنے ارمانوں کی خاک

منحصر جن کی تھی رونق ثروت امداد پر!
نالۂ غم بن گئی ان کے ایوانوں کی خاک

آگ کے ہر کھیل کو اب بند ہونا ہے جمیل
راکھ بن کر تا بہ کے بکھرے گی انسانوں کی خاک

حنیف کیفی

لمس اس کا لہو گرم کرتا گیا
میری رگ رگ میں انگارے بھرتا گیا

اک نگینہ تھا میں نقش باطل نہ تھا
مجھ کو جتنا بگاڑا سنورتا گیا

ہم اسے ایک انساں سمجھتے رہے
اور ہی کچھ نکلا، جو برتا گیا

موت سے کم نہ تھا خوف تنہا روی
اپنی پرچھائیں سے بھی میں ڈرتا گیا

رہ گیا داغ اک زندگی کے لئے
زخم تو وقت کے ساتھ بھرتا گیا

ریزہ ریزہ بکھرتی گئی زندگی
لمحہ لمحہ ہر اک دن گذرتا گیا

تلخئ زیست کیفی ابھرتی رہی
زندہ رہنے کا احساس مرتا گیا

ارتضیٰ نشاط

کہتا رہوں گا شعر چھپے گی کتاب بھی
کھیلا ہے یہ جوا تو پیوں گا شراب بھی

جگنو کی روشنی سے ڈرا اس بری طرح
خیمے کی بھاگ دوڑ میں ٹوٹی طناب بھی

اپنی خوشی سے موت کے منہ میں نہ جاؤں گا
جینے کا مجھکو شوق نہیں بے حساب بھی

تو ہی نہیں یگانہ و یکتا ہے اے خدا
بے وقت بے مثال ہے موسم خراب بھی

بس ایک بار اور ہنسوں گا کسی طرح
ممکن ہے پھر نہ دیکھنے پاؤں میں خواب بھی

بس بھی ملے گی، گھر بھی چلیں گے میاں نشاط
کچھ ہم اگر رکے تو رکے گا سحاب بھی

خالد قمر

گھر میں لکھ کر کہانیاں رکھ جا
میں ہوں تنہا سہیلیاں رکھ جا

چاند سے اب سکوں نہیں ملتا
اپنے کانوں کی بالیاں رکھ جا

مدتوں سے ہے گھر میں سناٹا
بند کمروں میں آندھیاں رکھ جا

لوگ کہتے ہیں تو مسیحا ہے
میرے زخموں پہ انگلیاں رکھ جا

بھیگا بھیگا ہوا سا موسم ہے
یار! خالی پیالیاں رکھ جا

اے قمر آج میری آنکھوں میں
اپنی ساری اداسیاں رکھ جا

قاضی انصار

مسکراتے ہوں لب، آنکھیں نم ہوں الگ
ساری خوشیاں الگ، سارے غم ہوں الگ
آج انساں، انساں کی مجبوریاں!
چاہتا ہے یہی کم سے کم ہوں الگ
سوچتے سوچتے رات ہو جائے گی
راستہ صاف ہو، پیچ و خم ہوں الگ
پاپیادہ جو ہے بھیڑ اس بھیڑ سے
شہسواروں کے نقش قدم ہوں الگ
فکر و فن میں سیاست کا کیا کام ہے
اس سے انصار اہل قلم ہوں الگ

نجم عثمانی

اندھیری رات کی پر درد داستاں لکھئے
یہی ہے وقت کہ تاریخ خونچکاں لکھئے
نہیں ہے ایک کرن بھی کہیں اجالے کی
تمام منظر ہستی دھواں دھواں لکھئے
ہر ایک شہر پہ قابض ہے موت کا لشکر
بھٹکتی پھرتی ہے اب زیست بے اماں لکھئے
ہوئے ہیں آپ تقاضائے مصلحت کے اسیر
زمیں کو شوق سے سو بار آسماں لکھئے
ہمارے پیروں کے نیچے زمیں ہے جلتی ہوئی
سروں پہ دھوپ کا پھیلا ہے سائباں لکھئے
ہمارے ذہنوں میں نفرت کا زہر پھیل گیا
جناب نجم محبت کی داستاں لکھئے

صابر فخرالدین

گھر سے نکلے تھے جب کے تڑکے
سرد موسم میں گاؤں کے لڑکے
ایک ہی جان اور اس کے لئے
ہر قدم پر نئے نئے دھڑکے
عمر کے آخری سرے پر ہیں
اور دن آگئے ہیں پت جھڑ کے
لوٹ، دنگا، فساد، جھگڑا، قتل
نفرتوں کے الاؤ سے بھڑکے
آہ! غصہ جناب صابر کا
گھن گرج جیسے بجلیاں کڑکے

حفیظ آتش

سرگوشی کی جہان ہوتے ہیں
اخباروں کے کان ہوتے ہیں
غیر کہیں تو جھٹلا بھی دوں
اپنے تو ایمان ہوتے ہیں
کب تک آخر یاد نہ آئیں
بیتے دن گزران ہوتے ہیں
اُن رستوں پر بھیڑ ہوتی ہے
جو رستے آسان ہوتے ہیں،
سوچ کے شاید چپ رہنا بھی
جینے کے میزان ہوتے ہیں
کچھ آداب مے خانہ بھی
مے نوشی کی شان ہوتے ہیں

قارئین

سواد و صوت

محترم جناب کلام حیدری صاحب ، ایڈیٹر آہنگ گیا

آداب و نیاز !

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ کی طرف سے رنگا رنگ آہنگ باقاعدگی سے مجھ تک پہونچ جاتا ہے ۔ اس ادبی احسان کا میں بہت ہی شکر گزار ہوں ۔ جولائی ۸۲ء کے شمارہ میں فراق سے متعلق میرا مضمون شائع فرما کر مجھ پر اور بھی احسان کر دیا ۔ اس لئے آپ کا از حد ممنون ہوں ۔ آہنگ کا نظمیہ اور نثری دونوں حصے اپنی اپنی جگہ پر خوب ہوتے ہیں ۔ آپ کی جواں مردی اور جسارت کی داد دیئے بنا نہیں رہ سکتا ۔ کہ آپ ان حقائق کو منظر عام پر لائے کہ جن کی توفیق بڑے بڑے اور موٹے موٹے جرائد کے ایڈیٹروں کو بھی نہیں ہوئی ۔ اردو صحافت اور جرنلزم کے جنازے پر کوئی کتنی بار آنسو بہائے یہ لوگ ادبی بدنیتی سے ادبی ماحول ہی گندا اور ناپاک نہیں کرتے بلکہ اردو ادب کے دھارے کو آزادی اور قدرتی سطح پر بہنے سے بھی روکنا چاہتے ہیں ۔ اور یہی لوگ اردو اور اردو ادب کے خیر خواہ گنے جاتے ہیں ۔ لیکن ان سبھی ناخوشگوار حالات کے باوجود کچھ تنقید نگار ایسے بھی رہ جاتے ہیں جو کسی بھی قیمت پر تنقید نگاری کے اصولوں کو طلاق نہیں دے سکتے ۔ آپ نے گزشتہ چند شماروں میں جن حالات کی نشاندہی کی ہے وہ قابل ستائش ہے ۔ لہٰذا آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں ۔

—— سوہن راہی (لندن)

محترم جناب کلام حیدری صاحب ! عقیدتیں

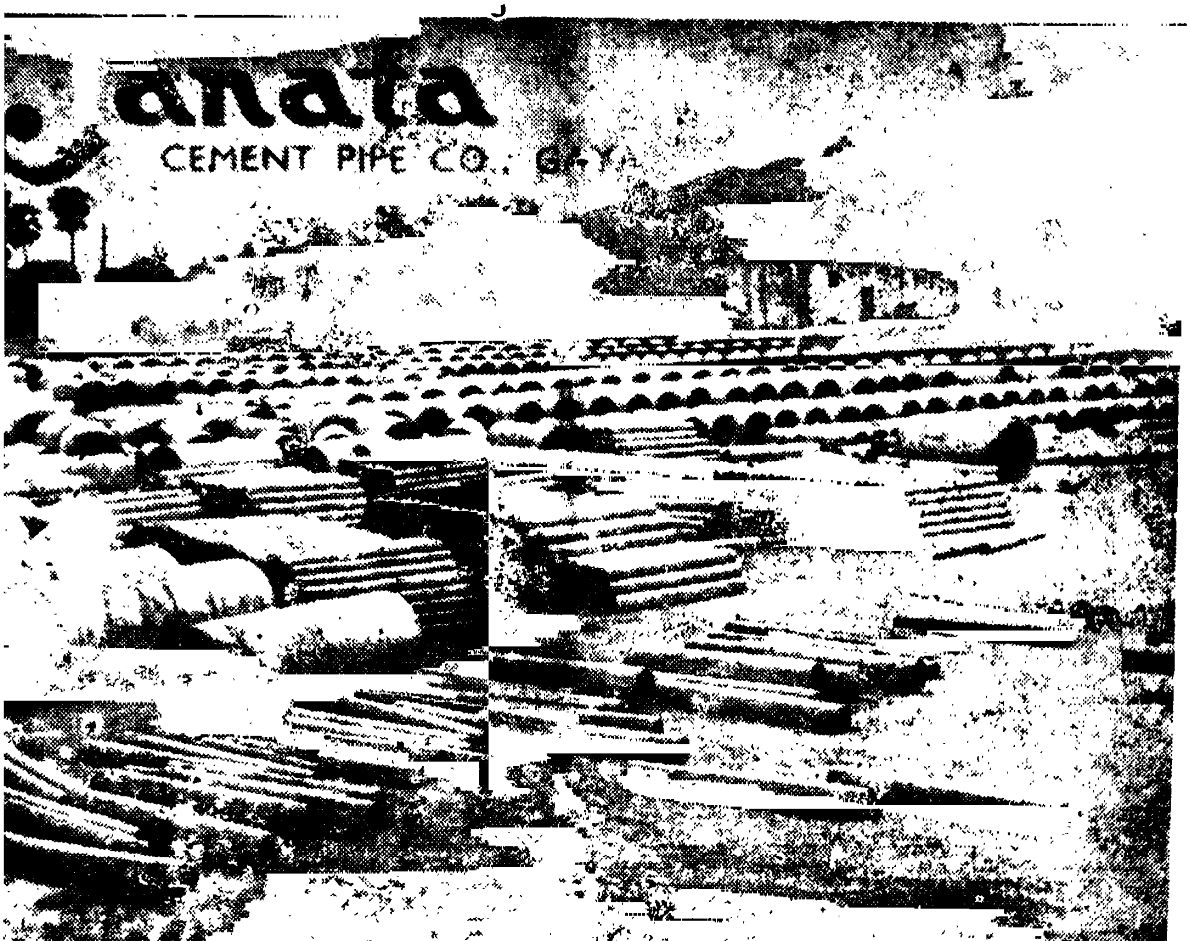
آہنگ کا مارچ کا شمارہ آسنسول کے بک اسٹال سے دستیاب ہوا ۔ کیوں کہ دھنباد میں کسی بک اسٹال پر نہیں ملتا ہے ۔ ہمارے حلقہ میں کسی کے پاس اعزازی کاپی بھی نہیں آتی ۔ آہنگ کا کوئی شمارہ اگر میرے مطالعہ میں نہیں آتا ہے تو مجھے تشنگی کا احساس ہوتا ہے ۔ تازہ شمارہ معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے بے حد معیاری ہے ۔ شعری اور نثری دونوں حصے اول درجے کی معیاری تخلیقات سے مزین ہیں ۔ شاہد کلیم کا مضمون " شاعری میں مصوری " اچھوتے موضوع پر لکھا گیا ایک معیاری مضمون ہے ۔ موصوف نے اردو شاعری کے ہر دور کو مناسب انداز میں TOUCH کیا ہے مجھے ترقی پسندوں کے سلسلے میں ان کی رائے سے مکمل اتفاق نہیں ۔ جدید شاعری میں مصوری کی مثالیں پیش کرنے میں شاہد کلیم نے بخل سے کام لیا ہے ۔

بہرحال ! مضمون مجھے پسند آیا ۔ یہ خبر سن کر مسرت ہوئی کہ بہار اردو اکیڈمی نے آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انعام سے نوازا ہے ۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے ۔

—— نجم عثمانی (دھنباد)

Regd 4253/64
Regd No. Gy. 7
—432

THE Aahang Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA





بہار اُردو اکیڈمی کے صدر جناب جگن ناتھ [illegible]

JUNE-1983

PRICE-Rs. 2

دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس گیا

قائم شدہ: سنہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری چوبیس روپے

ایک شمارہ دو، روپے

فون نمبر۔ 432

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشابہ حق، عبدالصمد

محتویات

اداریہ

کشکول

مئی کے دوسرے ہفتے میں بہار اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام اکبر الہ آبادی پر دو روزہ سمینار منعقد کیا گیا۔ جس میں کئی قیمتی مقالے اکبر کے فن پر پڑھے گئے اور ان مقالوں سے متعلق مباحثہ بھی ہوا۔ غرض اکبر کے شایان شان سمینار ہوا۔ کلیم الدین احمد کی نگرانی اور دیکھ ریکھ میں ہونے والے اس سمینار کی ہندوستان میں خاطر خواہ توقیر بھی ہوگی۔

رام لعل کا ایک خط چیف ایڈیٹر آہنگ کے نام اس سمینار سے قبل آیا کہ جمیل جالبی اور انتظار حسین پاکستان سے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اور پٹنہ جانے والے ہیں۔ وہاں ان سے ملو اور بہار کے ادبا شعرا اور ادبی ذوق رکھنے والوں سے ملواؤ ۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

چنانچہ سمینار سے قبل ایک دن پٹنہ پہونچ کر چیف ایڈیٹر آہنگ نے دونوں حضرات کا پتہ چلایا کہ آئے ہیں یا نہیں۔ اور اگر آئے ہیں تو کہاں ٹھہرے ہیں۔ معلوم ہوا جمیل جالبی علی گڑھ رہ گئے مگر انتظار حسین صاحب پٹنہ آ گئے ہیں۔

سوال اٹھا کہ انتظار حسین کا مصرف کیا ہو۔؟ وہ ظرافت نگار اور محقق ہیں نہیں۔ طے پایا کہ ان سے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرادی جائے کہ جس میں موضوع پر عمومی قسم کی ہی باتیں ہوں گی سوان کی مزاح اور اکبر سے لاعلمی یا کم علمی پر پردہ پڑا رہے گا۔ اور سمینار میں بہار اور بہار سے باہر کے ادبا، شعرا سے ان کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔ اور اس کے عوض اکیڈمی ان کے اخراجات برداشت کرلے گی۔

افتتاح ریاست بہار کے چیف منسٹر نے کیا ہند و پاک میں تمام لوگوں کو علم ہے کہ بہار میں قانونی طور پر اردو دوسری سرکاری زبان ہے۔ چیف منسٹر نے اردو کے لئے سرکاری طور پر جو کچھ اب تک کیا ہے۔ اس کا جائزہ نہایت انکسار کے ساتھ لیا۔ پھر مستقبل قریب میں ان کی سرکار اردو کے لئے جو کرنے جا رہی ہے اس کا ذکر کیا۔ انتظار حسین نے حیدرآباد کے ایک جلسے کے صدارتی خطبے میں مزاح نگار بننے کی کوشش میں خود کو مسخرا بنا دیا۔ انہوں نے لکھا کہ پٹنہ میں جو بھی ملا وہ یا تو افسانہ نگار یا شاعر یا ایڈیٹر تھا۔ اور یوں اپنے جانتے بہار پر پھبتی کسی۔ حالانکہ اگر وہ سنجیدہ یا بیکرنہ ہوتے تو بآسانی سے سمجھ سکتے تھے کہ انتظار حسین سے ملنے کے لئے پٹنہ کے قصائی، نائی، اور نان بائیوں کے آنے کے امکانات تو تھے نہیں۔

وہ پاکستان کے کسی اخبار کے کالم نویس ہیں۔ اس کے کسی شمارے میں انہوں نے تحریر

فرمایا کہ چیف منسٹر کو معلوم تھا کہ افتتاحی جلسے میں پاکستان کا ایک اردو کا ادیب بھی ہے۔ اس لئے چیف منسٹر نے اردو کے سلسلے میں بڑھ چڑھ کر بڑے اعلانات کر دیئے ــــــ اتنی بھی اپنے بارے میں خوش فہمی آدمی کو نہیں ہونی چاہئے۔ ہماری جمہوریت میں ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اپنے درمیان کسی کو پاکر غلط سلط اعلانات کریں۔ انتظار حسین تو خیر انتظار حسین ہی ہیں۔ جنرل ضیاء کی موجودگی میں بھی ان کو خوش کرنے کے لئے کوئی وزیر اعلیٰ ایسا نہیں کرے گا۔ اس لئے آپ ہمارے عزیز مہمان تو ہو سکتے ہیں۔ مگر ہم پر سیاسی طور پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

جس صدارتی خطبے کا ذکر اوپر آیا ہے اس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ اکبر الہ آبادی سیمینار میں ایک بہار کے مقرر نے مُزاح، مِزاح، مُزاح کہا۔ تلفظ کا یوں زیر و زبر ہو جانا ان کو پسند نہیں آیا ــــــ آغا بڑا جھوٹ انتظار حسین بولیں گے اس کا یقین ان کی تحریر پڑھنے سے پہلے کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔

اب ایک واقعہ جسے بیان نہ کرنا اچھا تھا بیان کر دیتا ہوں کہ انتظار حسین سے جب کسی ادیب، شاعر، یا کسی اور کا تعارف کرایا گیا تو انہوں نے یوں پوچھا:

آپ کا مِزاج کیسا ہے؟

کسی سے پوچھا:

آپ کا مَزاج کیسا ہے؟

اور حد ہو گئی جب انہوں نے ایک صاحب سے یوں کہا:

آپ کا مُزاج کیسا ہے؟

انتظار حسین نے دہلی میں مقیم میرے ایک دوست سے شکایت کی کہ انہیں نالندہ نہیں دکھایا گیا۔ ان کی یہ شکایت میرے دوست نے خط کے ذریعہ مجھ تک پہونچا دی ــــــ اب یہ کون سمجھائے کہ ان کے پاس نالندہ کا ویزا نہیں تھا۔

کالم نویسی کے چکر نے انہیں گھن چکر میں ڈال دیا۔ اور اس بات پر خفگی کا اظہار پٹنہ میں تو انہوں نے نہیں کیا۔ مگر لکھا کہ اکبر الہ آبادی کو لوگوں نے بہاری بنا دیا۔ اور یو پی سے چھین لیا۔ محققین کو تو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ اس پر روشنی ڈالیں۔ بحث کریں کہ اکبر پیدا کہاں ہوئے اور عہد طفولیت کہاں گزاری۔ مگر انتظار حسین کس کھیت کی مولی ہیں کہ اس بحث میں ٹانگ اڑائیں؟

انتظار حسین سے اتنے اوچھے پن کی توقع کس کو ہو سکتی تھی؟ انہوں نے پاکستان کے بہترین اخلاق رکھنے والے ادیبوں، شاعروں پر جو کیچڑ گورنمنٹ اردو لائبریری کے جلسے میں اچھالی۔ اس کا ذکر کر کے منہ کا مزہ کیوں خراب جائے؟

شاہد کلیم

نئی شاعری اور عناصر حیات

زمین جب سورج سے ٹوٹ کر الگ ہوئی تو وہ اس وقت جلتی ہوئی آگ کا ایک ٹکڑا تھی۔ دھیرے دھیرے وہ بیرونی ہوا کی یلغار سے ٹھنڈی ہو کر سکڑتی گئی۔ اس طرح زمین کی اوپری سطح پر دھیرے دھیرے برف جم گئی۔ مگر اس کے اندر کھولتا ہوا لاوا مچلتا رہا۔ زمین کے اس سکڑنے اور لاوے کے ابل دینے کا عمل آج تک قائم ہے۔ واضح ہے کہ انسان سب سے پہلے دو طرح کے موسم (۱) موسم گرما (۲) اور موسم سرما سے دوچار ہوا۔ پھر اس نے برسات کا مزہ لیا۔ خود انسانی وجود کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانی خمیر کی نشوونما سمندر میں ہوئی۔

مندرجہ بالا باتوں سے چار عناصر معرض وجود میں آتے ہیں (۱) آگ (۲) مٹی، (۳) پانی (۴) ہوا

انسانی وجود انہیں چار عناصر سے ترتیب پاتا ہے۔ چکبست نے اس نکتہ کی طرف خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

مندرجہ بالا شعر پیش کرنے کا مقصد صرف اس امر پر دال ہے کہ انسانی وجود کے بنیادی عناصر کی نشاندہی کلام سلف میں بھی ملتی ہے۔ چکبست کے یہاں عناصر حیات جب بے ترتیب اور غیر منظم شکل اختیار کر لیتے ہیں تو موت واقع ہوتی ہے ظاہر ہے چکبست نے حیات انسانی کے بنیادی عناصر کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اور موت کی وجہ دریافت کی۔ میر نے بھی فلسفۂ حیات و ممات کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

مطلب یہ ہے کہ میر کے یہاں موت صرف تھکن کا نام ہے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد تھکن کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ لہٰذا تھکن کے بعد انسان آرام و سکون کا جویا ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ آرام کے بعد تھکن دور ہو جاتی ہے۔ اور مسافر پھر ایک نئی توانائی اور نئے عزم کے ساتھ اپنے سفر پر گامزن ہوتا ہے۔ اس طرح میر کے محولہ بالا شعر سے مترشح ہے کہ زندگی کی موت دائمی نہیں۔ یہ سورج کی طرح ہے جو رات میں مر جاتا ہے۔ اور صبح میں پھر جنم لیتا ہے۔ یہ نظریہ صرف میر کا ہی نہیں بلکہ تمام آسمانی مذاہب بھی اس نکتہ کا انکشاف کرتے ہیں۔ کہ موت مکمل خاتمے کا سبب نہیں۔ یہ محض جسم اور روح کے باہمی رشتے کو ختم کر دینے کا ایک مضبوط ذریعہ ہے۔ موت سے کسی کو فرار حاصل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کائنات کی چمک دمک میں کھو کر اور اس سے

گیسوؤں میں الجھ کر حیات ابدی کا خواہش مند ہو جاتا ہے۔ وہ موت کو ایک آسیب کے روپ میں دیکھتا ہے۔ اور اس سے خوف کھانے لگتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ رنج و غم سے کسی کو دائمی مفر نہیں۔ وہ دوسرے ہی لمحہ جب رنج و غم کی مسلسل ضرب سے ٹوٹنے لگتا ہے تو موت کو آواز دیتا ہے۔ لہٰذا موت ایک ایسے آلہ کار کی حیثیت رکھتی ہے جو کشاکش حیات سے اسے نجات بخشتی ہے۔ اس طرح موت انسان کے لئے آرام و سکون کا ذریعہ بن جاتی ہے سے

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
(غالب)

اوپر کی باتوں سے یہ ظاہر ہے کہ ہمارے اساتذہ نے حیات و ممات کا بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے۔ مگر زندگی کو پُر لطف اور پُر بہار بنانے کے لئے لب معشوق اور گیسوئے جاناں سے کیف و نشاط کے طالب رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری زندگی اور موت کے باریک فلسفہ سے الگ ہو کر معشوق کی موہوم کمر میں سمٹ گئی۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمین کی ایک مخلوق یعنی عورت ان کی شاعری کا موضوع بن کر رہ گئی۔ ان کی شاعری فطرت کے تمام جلوؤں سے یکسر الگ تو نہیں ہوئی مگر ان کا انعکاس مدھم ضرور پڑ گیا۔ مطلب یہ ہے کہ مظاہر فطرت یعنی آگ، مٹی، ہوا اور پانی کا استعمال ان کی شاعری میں خال خال ملنے لگا۔ اسی طرح فطرت کے دوسرے مظاہر مثلاً دھواں، ریت، ندی، پہاڑ، شجر، پرندہ، سمندر، چاندنی، دھوپ، خوشبو، پتھر، جنگل، سایہ، اندھیرا، اجالا، کبوتر، مچھلی وغیرہ کے نقوش کم کم ابھرنے لگے یہاں تک وہ اپنے وجود اور وجود کے بنیادی عناصر سے بھی غافل ہو گئے۔ اور ان کی شاعری شمس الوجود فرد کی مثال بن گئی

غزل اگرچہ بہت ہی لطیف اور نازک صنف ہے مگر غزل کے بدن پر موجودہ دور میں نئے نئے وجودی خیالات کے پیراہن اس طرح سجائے گئے کہ غزل کے حسن و معنی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ غزل اب جام و سبو، شمع و پروانہ، گل و بلبل، لب معشوق اور گیسوئے جاناں کے حصار کو توڑ کر کھلے میدان میں آگئی۔ جہاں وہ سورج سے حرکت و حرارت کا خراج لے کر خراماں خراماں ہرے بھرے کھیتوں، رنگ برنگے پھولوں سے بھری وادیوں نیلی پیلی تتلیوں والے شہر میں سیر کرنے لگی۔ تھکن اور پیاس کے بعد میٹھے چشمے کا پانی پینے لگی۔ ہوا میں جھومتے ہوئے سبز و شاداب درختوں کے سائے میں زمین کے نرم و گداز فرش پر سونے لگی۔ اور صحرائی سفر سے تھک ہار کر، پیاس کی شدت سے چور ہو کر سخت چٹانوں سے پھسلنے لگی۔ مطلب یہ ہے کہ غزل کے دامن کو کچھ اور وسعت ملی۔ اور اب وہ بندھے ٹکے مضامین کے علاوہ حیات و کائنات کے تعلق سے دیگر مضامین کی احاطہ بندی کرنے لگی۔

اگرچہ غزل اپنی مخصوص ہئیت میں ایک مخصوص صنف ہے تاہم اس نے حیات و کائنات سے اپنا رشتہ بخوبی جوڑ لینے کی صلاحیت پیدا کر لی ہے۔ غزل پر اب یہ الزام قابل قبول نہیں کہ اس ربط کامل کی کمی اور یک جہتی کا فقدان ہوتا ہے۔ یہ کسی وقت واحد میں ایک ہی خیال کا اظہار نہیں کرتی بلکہ مختلف خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ اپنا جسم طرح طرح کے خیالات کے لباس سے آراستہ کرتی ہے۔ جو الگ الگ وقت اور موسم کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ یہ اپنے اندر وقت اور لباس کی پہچان اور دریافت کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ یہ تو اپنے جسم پر ایسا لباس سجاتی ہے جو عمومی ہوتا ہے۔ اور عمومی لباس سے خود کو آراستہ کرنا اس کا مقدر ہے۔ اس لئے کہ

غزل کا شاعر مجبور ہوتا ہے کہ اس کے آگے غزل کے اشعار کی تعداد مخصوص ہے۔ ردیف و قوافی کے چکر ہیں۔ گھسے پٹے مضامین کا سلسلہ ہے۔ وہ تو ردیف و قوافی کو کاغذ کے ایک سرے پر لکھ لیتا ہے۔ اور ان کے حصار میں رہ کر شعر کہتا ہے۔ اس لئے کوئی غزل نہیں وہ تو صرف پانچ شعر کی تعداد پوری کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ اصولاً پانچ شعر کے بغیر غزل کا ڈھانچہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غزل کے دامن کو وسیع و عریض بنانے میں جدید شعراء نے بہتر طریقے سے کوشش کی۔ غزل جہاں نئے نئے خیالات کو اپنے بطن میں پروان چڑھانے لگی۔ وہیں اردو نظم کے مزاج میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ ایک طرف جہاں غزل میں نئی شاعری کی چمک دکھائی دینے لگی۔ وہیں دوسری طرف نظم میں بھی اس کا روشن نکتہ ابھرنے لگا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ جدید شعراء نے انسانی وجود کی تلاش و دریافت کی طرف توجہ دی ہے وہ اس نکتہ کو پا چکے ہیں کہ انسانی وجود کا سرچشمہ مذکورہ چار بنیادی عناصر ہیں۔ اور یہی چار بنیادی ان کی شاعری کا محور بن چکے ہیں۔ لہٰذا غزل اور طویل و مختصر دونوں طرح کی نظموں میں عناصر حیات کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔

حرکت و حرارت زندگی کے لئے لازمی شئے ہے۔ آگ یا روشنی کی زندگی میں اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ انسان روز ازل سے روشنی کا خواہاں ہے۔ اور تاریکی سے نالاں۔ سورج سے روشنی اور حرارت دونوں ملتی ہیں۔ جو زندگی کو جامد و ساکت ہونے سے روکتی ہیں۔ اندھیروں میں انسانی آنکھیں قوت باصرہ سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے برعکس روشنی میں آنکھیں مظاہر فطرت کے رنگا رنگ جلوؤں سے متلذذ ہوتی ہیں۔ اس طرح سورج کا وجود انسانی وجود کے لئے جزو بدن کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے بغیر انسانی زندگی مکمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورج نئی شاعری میں اپنی متنوع کیفیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ کبھی زندگی کے لئے زہر بن جاتا ہے تو کبھی آب حیات۔ مثال کے لئے چند اشعار پیش ہیں ؂

اُبلتے دیکھی ہے سورج سے میں نے تاریکی
نہ راس آئے گی یہ صبح زر نگار مجھے
(خلیل الرحمٰن اعظمی)

کہیں سے آ گیا اک ابر درمیاں ورنہ
مرے بدن میں یہ سورج اترنے والا تھا
(بانی)

دل کا نگر تو دیر سے ویران تھا مگر
سورج کا شہر بھی مجھے اجڑا ہوا لگا!
(کمار پاشی)

یہ الگ بات کہ دن میں مجھے رکھتا ہے نڈھال
تنہا سورج یاد کروں میں اور ہو سرسبز!
(پرکاش فکری)

نہ ابھرے گا سورج نہ چٹکیں گی کلیاں!
بہت دور تک رات ہی رات ہوگی
(زاہدہ زیدی)

سورج کے تعلق سے نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں ؂

نہیں یہ سورج کے شہر کا آدمی نہیں ہے
کہ یہ تو مرنے کے بعد فٹ پاتھ پر پڑا ہے
یہ لاش ہم سب کی طرح سورج کے ساتھ
گردش میں کیوں نہیں ہے
پڑھو تو اس ڈائری میں کیا ہے۔ ؟
(نظم سورج کا شہر۔ شہاب جعفری)

قریب ہے طلوع

جانے سو ہزار چشم ولب صبا کے منتظر
نگارِ زندگی کے ہر نئی ادا کے منتظر
حصارِ وقت توڑتے ہیں کیف و نور
صدائے گل مجھے سنائی دے رہی ہے دور سے
قریب ہے طلوع
آج ساحلوں کی ریت پر
لہو میں ایک اور انقلاب کی صدا سنیں
لہو میں ایک اور آفتاب کی صدا سنیں۔
(نظم ایک اور آفتاب کی صدا ۔ بلراج کومل)

ہاں یہ سب کچھ
مرے دیکھتے ہی ہوا
پہلے سورج چھپا
اور پھر عکس
میری نظر کی حدوں سے پھسل کر گرا
ایک دو لمحے پہلے چمکتا ہوا شہر
پھر سٹپٹا کر اٹھا
بھاگنے کو جھکا اور گر ہی پڑا
لمبا لمبا سا لیٹا ہوا شہر تھا لاش سا
(ایک نظم ۔ فضل تابش)

جسم کی ساخت میں مٹی اور پانی کا بڑا اہم رول ہے مٹی زمین سے مہیا ہوتی ہے۔ اس طرح زمین کی قدر و قیمت کا تعین بھی ضروری ہے۔ زمین طرح طرح کے اشجار رنگ برنگے پھول پھل، کوہساروں، چھوٹی بڑی ندیوں اور گونجتے ہوئے چشموں سے آراستہ اور سجی ہوئی ہے جو فطرت کے خارجی حسن کے ضامن ہیں۔ فطرت کے یہ خارجی حسن شاعر کے احساس جمال کو نکھرنے اور سنورنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اور قلبی تسکین کے لئے سامان مہیا کرتے ہیں نئے شاعروں نے فطرت کے رنگا رنگ جلووں سے متاثر ہو کر صرف قلبی سکون ہی حاصل نہیں کیا ہے بلکہ ان کے وسیلے سے کائنات، زندگی اور معاشرے کے دیگر پہلوؤں کو بھی ایک نئے زاویئے سے دیکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نئی شاعری صرف احساس جمال اور احساس فطرت کے حصار تک ہی محدود نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئے شعرا نے مظاہر فطرت کو صرف ایک تحریک کے طور پر ہی قبول نہیں کیا ہے بلکہ انہیں اپنی شاعری کا وسیلہ بھی جانا ہے۔ اور ان سے براہ راست حیاتی اور روحانی رشتہ استوار کرنے کی سعی کی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

آنکھیں آنسو، دل بھی آنسو، شاید ہم سرتاپا آنسو
تھوڑی مٹی اور ملا دے ابھی بہت گیلی ہے مٹی
(بشیر بدر)

کسی کی بھیگی صدا جھانکتی تھی مری خاک سے
میں تھا اپنا کھنڈر اس میں مرے سوا کون تھا
(بانی)

مرے بدن میں کھلے جنگلوں کی مٹی ہے
مجھے سنبھال کے رکھنا بکھر نہ جاؤں میں
(ندا فاضلی)

چھپ جائیں کہیں آکہ بہت تیز ہے بارش
یہ میرے ترے جسم تو مٹی کے بنے ہیں
(صبا اکرم)

مٹی زمین کا روپ ہے۔ اور یہی مٹی انسانی جسم کا ایک حصہ۔ لہٰذا انسان اور زمین کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ کی بنیاد مٹی ہے۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ زمین طرح طرح کے اشجار، رنگ برنگے پھول پھل چھوٹی بڑی ندی، اونچے نیچے پہاڑ، اور گونجتے ہوئے چشموں سے آراستہ اور مزین ہے۔ اور اسے ہمیشہ

نئے شاعروں نے دلہن کی طرح زیوروں سے آراستہ دیکھنا
چاہا ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید شاعروں نے زمین سے
اپنی وابستگی کا مختلف ڈھنگ سے ثبوت پیش کیا
ہے ؎

یہ نرم نرم گھاس یہ پھولوں بھری زمیں
اک دن بہا تھا خون کا دریا یہیں کہیں

(ظفر اقبال)

ہرا شجر نہ سہی خشک گھاس رہنے دے
زمیں کے جسم پہ کوئی لباس رہنے دے

(سلطان اختر)

سرخ پھولوں سے زمیں کو ڈھک کے کس کی صدا
سب کی آنکھیں پوچھتی ہیں کوئی بتلاتا نہیں

(شہریار)

پہاڑوں پر کہیں بارش ہوئی ہے۔
زمیں محوِ دعا ہے اور میں ہوں

(مظہر امام)

اب کے موسم میں لٹیرے بادلوں کو بھیج کر
ساری ہریالی زمیں کی آسماں لے جائیگا

(شمیم فاروقی)

نظموں میں بھی زمیں اور اس کے لوازمہ کا عکس
دیکھا جا سکتا ہے ؎

کھرا کھرا آنکھوں کا آکاش
پیڑ، پہاڑ، سڑک، گھر، آنگن
سندر اور اسندر ایک
کھڑکی میں ہاتھ بڑھا کر
تھوڑی سی بے رنگ دھند کو
مٹھی میں بھر لیتا ہوں
باہر اور اندر کا منظر
ایک رنگ کر لیتا ہوں

(نظم باہر اور اندر کا منظر۔ (عمیق حنفی)

خوشی تھی کہ فصلیں اگیں گی
تو سرسبز منظر میں
تپتی ہوئی سرخ آنکھوں کو ٹھنڈک ملے گی
مگر کیا پتہ تھا کہ
لذت کی زرخیزیٔ ہے
کچھ ایسے کرگس ہی تخلیق ہوں گے
جو مہکتے ہوئے جسم کی
بوٹی بوٹی اڑانے کی کوشش کریں گے۔

(نظم مراجعت ۳، ظہیر صدیقی)

جسم کی ساخت میں مٹی کے ساتھ ساتھ پانی کی بھی
کچھ کم اہمیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شعرا نے اپنی شاعری
میں پانی کے علاوہ جگہ جگہ سمندر ندی اور چشمہ وغیرہ کا اس
انداز سے ذکر کیا ہے کہ حیات و کائنات کے مختلف نقش
صفحۂ قرطاس پر بکھر آئے ہیں ؎

میں ساحلوں پہ اتر کر شکیبؔ کیا لیتا
ازل سے نام مرا پانیوں پہ لکھا تھا

(شکیب جلالی)

میں وہ صحرا جسے پانی کی ہوس لے ڈوبی
تو وہ بادل جو کبھی ٹوٹ کے برسا ہی نہیں

(سلطان اختر)

ہر شے جو چمکتی ہے اسے کہتا ہے پانی
صحرا کے مسافر کو سرابوں سے نکالو!

(عالم خورشید)

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا!

(شہریار)

کئی صدیوں سے ساحل پر کھڑا ہوں
میں آنکھوں سے سمندر ناپتا ہوں
(کمار پاشی)

نکلیں سمندروں میں جزیروں کو ڈھونڈنے
لیکن قدم قدم پہ بھنور درمیان ہے۔
(سلیم شہزاد)

عجب نظارہ تھا بستی کا اس کنارہ پر
سبھی بچھڑ گئے دریا کے پار اترتے ہوئے
(بانی)

بہتی ندی میں اتنے سلگتے دیئے نہ چھوڑ
کس کس کو ڈر سے موجوں کی آخر بچائیں ہم
(بشر نواز)

وہ لوگ ایک ہی دریا کی دونوں جانب تھے
بہت قریب تھے لیکن کبھی نہ مل پائے
(فرحت قادری)

نظموں کے چند اقتباسات بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

میں تنہا کنارے کی نم ریت پر
اپنے بے روح ڈھانچے سے باہر کھڑا ہوں
اداسی کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہوں
یہاں سے وہاں تک گدلا اور منور پانی کا
سناٹا پھیلا ہوا ہے
بہت دور گہرے دھندلکوں میں لپٹا ہوا
ایک جزیرہ نظر آ رہا ہے۔
(نظم دور اس جزیرہ سے۔ کمار پاشی)

جو مہمات اس کو
پانی کی یورش نے دی تھی ابھی
وہ فضا میں اسے خود سنبھالے رکھے
ہاں ابھی، بس ابھی

غیر محسوس ہاتھوں نے
قطرہ کو پھر
عمر کی بے کراں ساعتوں کے
سمندر میں گم کر دیا۔
(نظم قطرہ کا مقدر، علیم اللہ حالی)

'چلتا ہے ہوا پہ کارخانہ میرا' مطلب یہ ہے کہ انسانی وجود کے لئے ہوا کی کچھ کم اہمیت نہیں۔ ہم سانس کے ذریعہ ہوا لیتے اور چھوڑتے ہیں۔ ظاہر ہے انسانی وجود ہوا کی مرہون منت ہے۔ خنک اور شیتل ہوا سے انسان روح افزا کیف و سرور سے دوچار ہوتا ہے۔ اور یہی ہوا جب طوفان کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ تو وہ اس سے نجات کے لئے پناہیں ڈھونڈتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ انسان اور کائنات دونوں کو نہ صرف خارجی طور پر بلکہ داخلی طور پر بھی متاثر اور متحرک کرتی ہے۔ لہٰذا کلاسیکل شاعری میں بھی اس کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ مگر صرف مظہر فطرت کے طور پر سے

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
(انشا)

اڑا کر لے گئی باد صبا اس سال اس کو بھی
رہا تھا ایک برگ زرد باقی میرے گلشن میں
(حسرت موہانی)

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔
(ثاقب لکھنوی)

چمن ہے، ابر ہے، ٹھنڈی ہوا ہے۔
ہجوم طائران خوش نوا ہے۔
(اسمٰعیل میرٹھی)

چونکہ ہوا کا وجود انسانی وجود کی بقا کا ضامن ہے
لہٰذا یہی وجہ ہے کہ جدید شاعروں نے ہوا کو مختلف رنگ
وروپ میں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور اس کے داخلی
خواص کو اپنی شاعری میں علامتی اظہار کا وسیلہ بنا کر
پیش کیا ہے ؎

مجھے دیا نہ کبھی میرے دشمنوں کا پتہ
مجھے ہوا سے لڑاتے رہے جہاں والے
(ظفر اقبال)

اک خوف سا درختوں پہ طاری تھا رات بھر
پتے لرز رہے تھے ہوا کے بغیر بھی
(فضیل جعفری)

میں سو رہا ہوں مگر جاگتے ہیں کان مرے
ہوا کے پاؤں کے گھنگرو ہیں پاسبان مرے
(رشید نثار)

رسوا نہ کر دے آنکھ کا منظر کہیں تجھے!
دامن میں یہ چراغ چھپا تیز ہے ہوا!
(لطف الرحمن)

میں شب کی پلکوں پہ آنسو کا ایک قطرہ ہوں
ملے ہوا کا بہانہ تو ٹوٹ جاؤں میں
(فاروق شفق)

نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں ؎

ہوا کہتی رہی آؤ۔
چلو اس پیڑ کے پتوں میں چھپ کر تالیاں پیٹیں
گریں، اٹھیں، لڑھک کر نہر میں اتریں نہائیں۔
مخملیں سبزے پہ ننگے پاؤں چل کر دور تک جائیں
ہوا کہتی رہی آؤ
مگر میں خشک چھاگل اپنے دانتوں میں دبائے
پیاس کی برہم سپہ سے لڑ رہا تھا۔ میں کہاں جاتا!
(نظم "ہوا کہتی رہی آؤ"۔ وزیر آغا)

نیلے لال سنہرے، پیلے
کنکوے
یہ رنگ برنگے دھرتی پر لگتے ہیں نیارے
لیکن جب اڑتے ہیں فر فر
اونچے اونچے دوش ہوا پہ
آنکھ کوئی بھی کہہ نہیں سکتی
کون سا کنکوا ہے نیلا
کون ہے پیلا
کون سنہرا۔
(نظم نیلا، پیلا، سنہرا۔ راج نرائن راز)

ان شعر کے علاوہ مندرجہ ذیل شعراء نے بھی عناصر حیات کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مخمور سعیدی، مظفر حنفی، محمد علوی، قاضی سلیم، عادل منصوری، زبیر رضوی، باقر مہدی، شاذ تمکنت، حسن نعیم، عتیق اللہ، شمس الرحمٰن فاروقی، صادق، رشید افروز، ظفر غوری، رونق شہری، نجم عثمانی، ساحل احمد، بدنام نظر، حق اعظمی، سید عارف، حامد کشمیری، مصور سبزواری، شہپر رسول، پروین کمار اشک، شاہد میر، صدیق مجیبی، آزاد گلاٹی، حمید الماس، ظہیر غازیپوری، جمال الدین ساحل اور خورشید سحر وغیرہ۔

اوپر نئی غزل کے جو اشعار اور نظموں کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں کہ ان میں مخصوص الفاظ مثلاً آگ (سورج) مٹی (زمین) پانی (سمندر) اور ہوا کا استعمال ہے۔ ان الفاظ کے علاوہ مندرجہ ذیل الفاظ کا استعمال بھی نئی شاعری میں کثرت سے دیکھا جا سکتا ہے۔

بیاباں، صحرا، بھنور، ندی، پہاڑ، ریت، پتھر،

جزیرہ، جنگل، دھوپ، آسمان، مکان، دیوار، کھنڈر، دھوپ، رات، دن، درخت، پتا، پرچھائیں، چاندنی اجالا، اندھیرا، آئینہ، چہرہ وغیرہ۔ ان الفاظ کے استعمال سے نئی شاعری کو رنگ و نور سے عاری اور حسن و لطافت سے خالی شاعری کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نئی شاعری میں مختلف نوعیت کے تجربات ملتے ہیں۔ ان میں ایک اہم تجربہ لسانی تجربہ بھی ہے۔ جدید شعرا نے اظہار و بیان کے لئے نئے نئے پیکروں، الفاظ و تراکیب کی تلاش و دریافت کی نئے نئے استعاروں اور نئی نئی تشبیہوں اور نئی نئی علامتوں کی تشکیل کی۔ پرانے الفاظ و تراکیب کے استعمال سے پرہیز کیا۔ مشکل پسندی کی بجائے سلاست و روانی کے سہارے اشعار میں حسن اور نکھار پیدا کیا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید شعرا نے صرف الفاظ کی خوب صورتی پر ہی نظر نہیں رکھی۔ بلکہ شعری معنویت پر بھی زور دیا۔ ان کا اس بات پر ایمان ہے کہ شعر کی زبان عام بول چال کی زبان ہونی چاہئے۔ لہٰذا وہ شعری زبان کو ایک ایسے آئینہ کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں جو نئے نئے تقاضوں، نئے نئے امکانات، بدلتے ہوئے حالات اور وقت کی معتبر اور روشن تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی شاعری کی زبان آسان ترین اور عام فہم ہے۔ اس نے اپنے اندر کچھ ایسے الفاظ کو سمو لیا ہے جن کا استعمال کلاسیکل شاعری میں متروک سمجھا جاتا تھا۔ دراصل شاعری کی زبان وقت اور ماحول کی زبان ہوتی ہے۔ لہٰذا وقت اور ماحول کے پس منظر میں ہی الفاظ کا استعمال بھی ضروری ہے۔ ہم غور کریں تو دیکھیں گے کہ کلاسیکل شاعری میں جہاں بلبل، چمن، گل، باغباں، لالہ، شمع، پروانہ، بہار، زلف، کاکل، گیسو کمر، چلمن جیسے الفاظ کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ وہیں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو شاعری کے لفظیات میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ نظموں اور غزلوں میں روایتی استعاروں کو سماجی پس منظر میں پیش کیا جانے لگا۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ، زلف و رخسار، صہبا و جام، اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ و تراکیب کا استعمال دھیرے دھیرے کم ہونے لگا۔ اور ان کی جگہ صلیب، دار، زندانی، مزدور، کھیت، کسان، مشن وغیرہ کا استعمال بڑھ گیا۔ ٹھیک اسی طرح ہم غور کریں تو دیکھیں گے کہ نئی شاعری میں ایسے الفاظ کا استعمال کچھ زیادہ ہوا ہے۔ جو فطرت سے وابستہ ہیں۔ دراصل ان الفاظ کا استعمال نئے شعرا کے یہاں فطری اور جبلی سطح پر ہوا ہے آگ، مٹی، ہوا اور پانی حیات انسانی کے بنیادی عناصر ہیں اور دیگر اشیاء اس کے لوازمہ، چونکہ انسانی وجود کی ساخت (FORMATION) انہیں چار عناصر سے ترتیب پاتی ہیں۔ لہٰذا شاعری میں ان کا مظاہرہ بھی فطری اور جبلی ہے میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ شعرا کے پیش نظر انسانی وجود کی تلاش و دریافت کا مسئلہ کچھ اور گہرا ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے شعرا نے مظاہر فطرت کو نہ صرف نظروں سے دیکھا ہے بلکہ ان کے داخلی کوائف کو بھی اپنے آپ میں ضم کر لیا ہے لہٰذا نئی شاعری نہ صرف حیات انسانی اور اس کے ماحول سے ہی جڑ گئی ہے۔ بلکہ مظاہر فطرت اور حیات انسانی کے کے درمیان رابطوں کا ایک سلسلہ بن گئی ہے۔ حقیقتاً نئی شاعری فطری شاعری کا منظر نامہ ہے

اس لئے کہ نئی شاعری میں عناصر حیات کا ذکر فطری طور پر کسی نہ کسی روپ میں آب و رنگ کے ساتھ موجود ہے۔

طاہر نقوی (پاکستان)

کھڑکی میں اٹکی ہوئی شام

دھوپ دن بھر کی تھکن اتارنے کے لئے گلی میں اتر آئی۔ اور پھر دھیرے دھیرے دھندلکوں میں تبدیل ہونے لگی۔ پھر یہ دھندلکے گھر گھر جا کر دلوں میں گدگداہٹ پیدا کرنے لگے۔ تیز دھوپ اور گرم ہواؤں سے بچنے کے لئے دن چڑھتے ہی جو کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں اب ایک ایک کر کے دوبارہ کھلنے لگیں۔ اوروں کی طرح جب اس نے اس گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھولے تو ہوا کے لطیف جھونکے اس کے جسم پر بھی ایسا تاثیر پیدا کرنے لگے جیسے شدید گرمی سے آکر وہ شاور کے نیچے کھڑی ہو گئی ہو۔ اور اب اس وقت اپنی بدلی ہوئی خوشگوار طبیعت کی بنا پر اس نے ماحول کی وسعتوں میں اپنی نظریں کھڑکی سے دور دور تک دوڑائیں۔ مگر پھر اگلے ہی لمحے اس کی یہ نظریں چاروں طرف سے سمٹ کر کھڑکی کی نیچے گلی میں کھڑے ہوئے ان دو لوگوں پر مرکوز ہو گئیں جو آس پاس سے لاتعلق اپنی باتوں میں منہمک تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی بلاارادہ کھڑی دیکھتی رہی۔ اس وقت وہ کھڑکی کے چوکھٹے کے بیچ یوں کھڑی تھی جیسے فریم میں تصویر لگی ہوئی ہوتی ہے۔

پھر یہ شام سمٹ کر گلی میں جھانکتی ہوئی اس کھڑکی میں اٹک کر رہ گئی۔ اور آہستہ آہستہ اسے اپنی گرفت میں لینے لگی۔ اس گرفت میں انجانے طور سے جاتے ہوئے وہ ایک کتاب اٹھا لائی جس کے موضوع میں وہ ہمیشہ دلچسپی لیتی تھی۔ اب بظاہر اس کی نظریں کتاب پر تھیں۔ مگر ذہن ادھر ہی رہا بلکہ غیر ارادی طور سے بھی اس کی نظریں بھی گھڑی گھڑی ادھر ہی اٹھ جاتیں۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے اور کسی قدر جھنجھلاتے ہوئے دو تین بار اس موٹی کتاب کو زور زور سے بند کیا اور کھولا اور پھر خواہ مخواہ گنگنانے لگی۔ اس کے باوجود ان کے اپنی طرف متوجہ نہ ہونے سے اسے بڑا عجیب اور سراسر غیر متوقع لگا۔ اسے اپنی نسوانیت کے کسی انجانے جذبے کو ٹھیس پہونچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور بے چینی سے کھڑکی کے کھلے پٹ کا سہارا لے کر تھکی تھکی کھڑی ہو گئی۔ اس لمحے اسے نہ جانے کیوں بلند آواز میں کوئی نغمہ گانے کو بھی جی چاہا۔ مگر گھر والوں کے خوف کی وجہ سے اس نے اپنی آواز کو بلند نہیں ہونے دیا۔ اس نے اس کیفیت سے شعوری طور سے بچنے کی خاطر ایک بار پھر بلا مقصد گلی کے دونوں جانب نظر دوڑائی۔

یہ گلی زیادہ نہیں چلتی تھی۔ بس کبھی کوئی ٹھیلے والا آوازیں لگاتا ہوا چلا آتا۔ یا کوئی گاڑی یہاں کے ٹھہرے ہوئے ماحول میں یوں گزر جاتی جیسے جمع شدہ پرسکون پانی میں کنکر پھینکا گیا ہو۔ ذرا فاصلے پر جا کر یہ گلی بازار کی مصروف اور چوڑی سڑک سے جا ملتی تھی۔ جس کا شور اور ہنگامہ اس گلی کے رہنے والوں کے لئے اب ایک

معمول بن چکا تھا۔ بازار کی چہل پہل، ٹریفک کی تیزی لوگوں کا چلنا پھرنا یہ سب اپنی اپنی جگہ اس وقت تک دلکش ضرور تھا اور وہ ویسے بھی زندگی کی معمولی سے معمولی خوشی کو توڑ ا ایک لیا کرتی تھی۔ زندگی کا روشن پہلو دیکھنے کی عادی تھی۔ مگر اس وقت ان چیزوں میں کوئی دلکشی، کوئی دلچسپی نہیں محسوس ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے وجود سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے صاف آسمان کو ڈھانپ لیا ہو لیکن ہلکی ہلکی امید کی طرح ہوا کے جھونکوں کا احساس ابھی باقی تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے گھبرا کر پھر ان دونوں کی جانب دیکھا وہ اسی طرح بڑے انہماک سے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جیسے معاشرے کے سارے مسائل کا حل ان ہی کی گفتگو میں پنہاں ہو۔ اور اگر انہوں نے اپنی باتوں کا تسلسل ذرا بھی توڑا تو کائنات کی ترتیب بگڑ جانے کا خدشہ لاحق ہو جائے گا۔ اسی اثنا اس کی چھوٹی بہن دور ہی سے اسے پکارتی ہوئی آئی۔ اور اس سے کورس کی کتاب میں سے کچھ معلوم کرنے لگی۔ مگر اس نے اس کی بات غور سے سنے بغیر ٹال دیا۔ چھوٹی بہن اس کی اس غیر متوقع بے رخی اور بیزاری کی وجہ سے حیرت سے اسے دیکھتی ہوئی الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد غیر شعوری طور سے وہ کھڑکی سے ہٹ کر کپڑوں کی الماری میں لگے قد آور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور اپنے سراپے کا تفصیلی جائزہ لینے لگی۔ وہ اپنی نسوانیت کے نازک قطرے میں اپنی نفسیات کا پورا دریا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ان دونوں پر غصہ آیا اور اسی عالم میں دوبارہ کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔

اس وقت وہ دونوں وہاں موجود نہ تھے۔ اس نے اپنی گردن نکال کر اپنے وجود میں پھیلی ہوئی بے چینی سے مجبور ہو کر جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھا وہ دونوں گلی کے نکڑ پر واقع کیبن کے پاس سگریٹ خرید رہے تھے۔ وہ ان دونوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوا اپنی آسودگی تلاش کرتی رہی۔ ساتھ ہی اس کے دل میں کوئی پراشتیاق جذبہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ سگریٹ پیتے ہوئے وہ اسی جگہ اکڑ گلی کے کنارے رکھے ہوئے ایک پتھر پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ ان کی نظریں اب بھی ایک دوسری پر جمی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس کی بے چینی میں اس سے مزید اضافہ ہوا۔ اور ذہن کی دھیمی دھیمی سی آنچ پر اس کے احساسات پگھل پگھل کر اس کے دل پر ٹپکنے لگے۔ اس نے ان کے دوبارہ اسی مقام پر واپس آ جانے پر جھنجھلا کر سوچا کہ آخر یہ یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ تاکہ وہ اس دھواں دھواں کیفیت سے بچ جائے۔ وہ دونوں پاس سے گذرنے والے ہر راہ گیر کی طرف لمحے بھر کو ضرور دیکھ لیتے۔ لیکن اس کی جانب سے اسی طرح بے خبر رہے جیسے کھڑکی میں اس وقت وہ نہ ہو۔ بلکہ کھڑکی خالی ہو اس لئے اس کا دھیان کالج کے ساتھیوں اور رشتہ دار ہم عمر لڑکوں کی طرف لاشعوری طور سے چلا گیا۔ ان سب کو تو اسے دیکھتے رہنے، اس سے بات کرنے اور اس کے نزدیک رہنے کی ہمیشہ ہی تمنا رہتی تھی۔ یہ سوچ کر اس نے پھر نیچے ان دونوں کی طرف دیکھا وہ اسی طرح اب بھی اس سے بے خبر اور اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ وہ اب کالج کے ان ساتھیوں اور رشتہ دار لڑکوں پر جھنجھلا اٹھی کہ وہ سب جھوٹ بولتے ہیں۔ غلط کہتے ہیں۔ بہکاتے ہیں اور غصے سے اپنے دانت پیسنے لگی۔ اس کی شخصیت رفتہ رفتہ مرد کے سامنے کرب کی چیخ بن کر ہوا میں تحلیل ہونے لگی۔

اپنی کیفیت کی اس شدت میں اس نے کہیں گھرائی سے آتی ہوئی اپنی ماں کی آواز سنی جو اسے بلا رہی تھی۔ وہ ان دونوں پھر ایک بار پھر پر امید نظر ڈالتی ہوئی اندر چلی

ماں کے بتلائے ہوئے کام کو نہ کرنے کا بہانہ بنا کر انکار کے بعد جلدی سے پھر کھڑکی کی جانب آ گئی۔ وہ دونوں اب کسی بحث میں زور و شور سے الجھے ہوئے تھے۔ کہ ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں ان کی یہ آوازیں اس کے کانوں کے پردوں سے گزر کر اس کے ذہن کی سطح پر کنکریوں کی طرح گر رہی تھیں۔ جن کی چوٹ سے اس کے لاشعور کے کسی جذبے سے ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اسے ان کی ان باتوں سے تسلی کوئی رغبت نہیں تھی۔ بلکہ بے چینی کے اوپر لپٹی ہوئی ناگواری پیدا ہو رہی تھی۔ اسی دوران اس نے دیکھا کہ سامنے ہی چلتے چلتے ایک بوڑھی عورت لڑکھڑا کر گری۔ تو وہ دونوں لپک کر اس کی طرف دوڑے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور پھر اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ جب تک بوڑھی عورت ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ وہ دونوں اسی کی جانب دیکھتے رہے۔

جب پڑوس کا کوئی جان پہچان کا شخص اس گلی سے گزرتا ہوا دکھائی دیتا۔ تو وہ خود کھڑکی سے ذرا ہٹ جاتی۔ اور وہ دوبارہ وہیں جا کھڑی ہوتی۔ اسے ساتھ ہی رہ رہ کر یہ خیال بھی آتا کہ کوئی ان دونوں کی موجودگی میں کھڑکی میں مستقل اسے کھڑا دیکھے گا تو جانے کیا خیال کرے گا۔ یہ خدشہ اس کے ضمیر سے برابر اپنا سر ٹکراتا رہا پھر کسی گاڑی کی بریک لگنے کی وجہ سے نہ صرف خود اس نے بلکہ انہوں نے بھی گھبرا کر جائے حادثہ کی طرف دیکھا۔ اور پھر اپنی باتوں میں اس طرح مصروف ہو گئے۔ جیسے انہیں اپنی باتوں میں ایک لمحے کی تاخیر بھی گراں گزر رہی ہو۔ کھڑکی میں کھڑے کھڑے اب اسے اپنے وجود پر کوئی بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جیسے یہ لمحات اس کی شخصیت کو مسخ کرنے پر تلے ہوئے ہوں۔

اداسی کے ساتھ اس کے ذہن میں اب مایوسی جاگزیں ہو گئی تھی۔ جس کے ردعمل کے طور پر لمحے بھر کے لئے اس کے ذہن میں عجیب اور غیر معمولی خیال گھس آیا کہ فوراً دوڑ کر نیچے چلی جائے اور ان دونوں کے عین سامنے جا کر کھڑی ہو جائے۔ مگر چاہنے کے باوجود وہ یہ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے سوچا کہ نیچے اتر کر ان کے سامنے سے محض گذر جائے لیکن یہ بھی اسے نسوانیت کی انتہائی بے عزتی محسوس ہوئی۔ اور اسی لئے اس نے اپنے اس خیال کو بھینچ کر دبا دیا۔ اس وقت وہ اپنے داخلی کرب میں مبتلا ہو گئی۔ اور اس کے وجود کے اندر سے۔ دل سے، دماغ سے، روح سے دھواں سا اٹھنے لگا۔ پھر یہ دھواں باہر آ کر چاروں طرف پھیلنے لگا۔ اس کیفیت میں وہ اپنے آپ کو ایک ایسا سپاہی سمجھنے لگی جو بھری دوپہر میں پہرے پر کھڑا ہو وہ اس تیز دھوپ سے بچنے کی خاطر اپنی متوقع اور فطری آسودگی کے سائے میں چلی جانا چاہتی تھی۔

وقت بہہ بہہ کر اجالے کو اندھیروں کی اترائی میں لے جا رہا تھا ان میں سے ایک نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر دوسرے سے کچھ کہا اور پھر وہ دونوں مخالف سمتوں میں جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے جانے لگے۔ اسی لئے شدت کے ساتھ اس کا جی چاہا کہ کھڑکی سے گردن نکال کر پڑوسیوں اور دوسرے راہگیروں کی پرواہ کئے بغیر زور زور سے چلائے مگر اس کوشش میں اس کا گلا اندر گیا۔ تشنج زدہ شخصیت نے اب جکڑ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے احتجاجی طور سے کھڑکی کے دونوں پٹ اپنی پوری قوت سے بند کئے۔ اور اسی شدید ترکیفیت میں ایک بار پھر الماری کے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اب اسے اپنا چہرہ انتہائی بھدا اور نقوش ٹیڑھے میڑھے نظر آئے اس لئے ہیجانی انداز میں اپنی پوری طاقت سے آئینے پر لگاتار مکے مارنے لگی۔ اور لہولہان ہاتھوں سے رسنے والے خون سے بے خبر بند کھڑکی کے پاس کھڑی بُری طرح [illegible] اندھیرا ہو جانے کے باوجود وہ شام اسی طرح کھڑکی

انور خاں

نیا دانشور

شہر کے اندر ایک خوب صورت چھوٹا سا بنگلہ ہے۔

بنگلے میں داخل ہونے کا ایک ہی دروازہ ہے جو خودکار ہے
بنگلے کی کھڑکیاں ہمیشہ بند رہتی ہیں جن کے پیچھے سبز منقش پردے جھلکتے ہیں۔

دروازے پر چم چم کرتی نام کی سنہری پیتل کی تختی لگی ہے
سامنے سڑک پر گزرتی ایس ٹی بسوں کے مسافروں کو دروازہ ہمیشہ بند نظر آتا ہے۔

کھڑکیوں کے پیچھے کبھی کوئی چہرہ جھانکتا نظر نہیں آتا
شاداب، نوجوان یا تھکا ہارا یا کوئی بچہ بھی کبھی کھیلتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔

نام کی تختی سے البتہ یہ پتہ ضرور لگتا ہے کہ یہ بنگلہ کسی نئے دانشور کا ہے جو ایک صابن کمپنی کے ایک اشتہاری پروگرام میں ہر ہفتے ٹی وی پر نظر آتا ہے۔ بنگلے کے باہر ایک چھوٹی سبز کار کھڑی رہتی ہے۔ جو بنگلے میں اس کے موجود ہونے کا اعلان کرتی ہے۔

ایک افواہ ہے کہ کسی نے دودھ والے کو کنستر سائیکل پر رکھے علی الصباح دروازے پر کھڑا دیکھا ہے۔

ایک افواہ یہ بھی ہے کہ ایک بار ایک ردی فروش ڈھیر سارا ردی جس میں دنیا جہان کے اخبارات و رسائل اور کتابیں شامل تھے لیکر بنگلے سے نکلتا ہوا دیکھا گیا ہے۔

لوگ لڑتے ہیں۔ جھگڑتے ہیں۔ کبھی لوٹ کر ملتے بھی ہیں۔ شادی بیاہ بھی ہوتے ہیں۔ فسادات ہوتے ہیں۔ ہزاروں بے گھر ہو جاتے ہیں۔ حادثات ہوتے ہیں سینکڑوں مر جاتے ہیں۔ ساسیں بہوؤں کو جہیز کی خاطر جلا ڈالتی ہیں۔ لڑکیاں گھر سے فرار ہو جاتی ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیاں دیوالیہ ہو جاتی ہیں حکومتیں بدل جاتی ہیں۔ اسمگلر توبہ کر کے مذہبی تنظیموں کے سربراہ ہو جاتے ہیں۔

دانشور کا عکس بلا ناغہ ہر ہفتے ٹی وی کے عدسے پر نمودار ہوتا ہے۔ انہیں ڈھارس دیتا ہے۔ ان کی زندگیوں میں جو انقلابی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اس کا علم انہیں دانشور کے ذریعہ ہوتا ہے وہ انہیں گراں قدر مشورے دیتا ہے اور ان کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔ اعراض نفسانی میں گرفتار، تفکرات دنیا سے بے حال، عوام اس کے تفکر انگیز چہرے کو دیکھتے ہیں۔ اور انہیں اطمینان ہوتا ہے کہ کوئی شخص تو ہے جو ان کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ جس کی حالات حاضرہ پر نظر ہے۔ جو ماضی سے بھی باخبر ہے۔ اور مستقبل پر بھی نظر رکھتا ہے۔ انہیں ڈھارس دیتا ہے۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔ سرکاری بسوں سے گزرتے ہوئے ان کی نگاہیں جب خوشنما بنگلے اور باہر کھڑی سبز گاڑی پر پڑتی

یا۔ تو ان میں عقیدت کے روشن دیئے اٹھتے ہیں۔

ایک روز خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ ٹی وی اور ریڈیو اپنا پروگرام روک کر عوام تک یہ اطلاع پہونچاتے ہیں کہ دانشور جان عزیز خدا کو سپرد کر کے اس ناپائیدار دنیا سے کوچ کر گئے ہیں۔ عوام فکر مند ہو جاتے ہیں کہ اب کون ان کے مسائل پر غور کرے گا۔؟ حیات و کائنات کے مسائل کو سلجھائے گا۔ تہذیب کا کیا ہو گا؟ سماج کا کیا بنے گا؟ جیسے تعلیم عام ہونے لگی ہے سبھی لوگ یہ سمجھنے اور ماننے لگے ہیں کہ دانشور نہ ہوں تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔ تہذیب ترقی نہیں کرتی۔ ملک پس ماندہ کہلاتا ہے۔ بس سے گزرتے ہوتے وہ اس کی سبز گاڑی اور بنگلے کی بند شیشے کی کھڑکیوں کو اداس نگاہوں سے تکتے ہیں۔ جن پر دھول کی تہہ دن بدن گاڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ کون ان کی ڈھارس بندھائے گا۔ انہیں گراں قدر مشورے دے گا ان کے زخموں پر مرہم رکھے گا۔

آپ تو جانتے ہیں کہ قدرت کا قانون ہے کہ کہیں بھی خلا باقی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ایک مبارک صبح وہی صابن کمپنی نصف صفحے اخباری اشتہار کے ذریعے انہیں یہ مژدہ سناتی ہے کہ لوگ مایوس نہ ہوں ان کے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کے لئے ایک اور دانشور کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ جو آئندہ ہفتے سے کمپنی کے مشہور اشتہاری پروگرام جلوہ افروز ہوں گے۔ اشتہار کے بیچ ادھیڑ عمر کا ایک شخص فکر و فکر میں ڈوبا منہ میں پائپ دبائے انہیں مربیانہ نگاہوں سے تکتا ہے۔ لوگ اطمینان کے سانس لیتے ہیں۔ اور اپنے دھندوں سے لگ جاتے ہیں

اگلے ہفتے بس کے مسافر دیکھتے ہیں کہ بنگلے کے باہر ایک سرخ کار چم چم چمک رہی ہے۔ رنگ بدل گیا ہے مگر نمبر سے پتہ چلتا ہے کہ گاڑی وہی ہے۔ کھڑکیاں اب بھی بند ہیں۔ مگر شیشوں کے پیچھے سے سرخ پردے جھلک رہے ہیں۔ کوئی چہرہ نظر نہیں آتا مگر سنہری حرفوں کی نئی تختی کی نیم پلیٹ نئے دانشور کے وجود کا اعلان کرتی ہے۔

لوگ سمجھدار ہیں۔ باشعور ہیں۔ جانتے ہیں۔ کہ فسادات ہوتے رہیں۔ لڑکیاں گھروں سے فرار ہوتی رہیں کمپنیاں دیوالیہ ہوتی رہیں حکومتیں بدلتی رہیں۔ اسمگلر مذہبی تنظیموں کے سربراہ بنتے رہیں۔ دانشور کا وجود غنیمت ہے ضروری ہے۔ آخر وہی تو ہے جسے ان کی فکر ہے۔ جو انہیں گراں قدر مشورے دے سکتا ہے۔ انہیں تسلی دے سکتا ہے۔ اس کا وجود ضروری ہے۔ تہذیب کی بقا کے لئے۔ سماج کی ترقی کے لئے۔ انسانیت کے تحفظ کے لئے۔ بس سے گزرتے ہوئے جب ان کی نظریں بنگلے کی بند کھڑکیوں اور سرخ کار پر پڑتی ہیں۔ تو ان کی آنکھوں میں عقیدت کے دیئے لو دینے لگتے ہیں۔

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

جب رات ڈھلی

رات تاریک تھی۔ اور چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سارا گاؤں اداس اداس ویران ویران نظر آرہا تھا یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جو چاروں طرف سے دھان، تمباکو اور آلو کے کھیتوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور جس میں پچاس ساٹھ خاندان آباد تھے۔ گاؤں میں ایک بھی پختہ مکان نہیں تھا۔ صرف بانس کی جھونپڑیاں تھیں جن کی چھتیں دھان کے پوال اور خشک گھاس سے چھائی ہوئی تھیں۔

گاؤں سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر ایک شاہراہ تھی اور اس شاہراہ سے ایک ٹیڑھی میڑھی کچی سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی گاؤں کے اندر تک چلی گئی تھی۔ شاہراہ سے کچی سڑک پر اتر کر چلتے ہوئے جہاں سے لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے تھے۔ ٹھیک اسی دہانے پر ایک بڑی اور لمبی سی جھونپڑی تھی۔ جس پر فری پرائمری اسکول کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اسکول کے عقب میں ایک بڑا سا تالاب تھا۔ اور تالاب کے کنارے بانس کا جھاڑ تھا۔ اور اس کے لب ایک بڑا سا کھیل کا میدان تھا۔ اس میدان میں بچے فٹ بال کھیلتے اور گاؤں کے لوگ عیدین کی نمازیں ادا کرتے۔ اور یہ کچی سڑک جتنی دور تک گاؤں کے اندر جاتی تھی۔ اتنی دور تک سڑک کے دونوں کنارے پر آم، جامن، کٹھل، کٹالی چمپا، میہی گنی اور ساگوان اور کرشن چوڑا کے پیڑوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ یہ پیڑ رات کی تاریکی میں لپٹے ہوئے بڑے ہی پراسرار نظر آرہے تھے۔

سارا گاؤں چند دنوں قبل ہی خالی ہو چکا تھا۔ اور گاؤں کے تمام لوگ اپنی اپنی جھونپڑیاں چھوڑ کر کسی دوسرے مقام پر چلے گئے تھے۔ اس لئے رات کی سیاہی بڑی بھیانک لگ رہی تھی۔ اور رات کا سناٹا کسی گہرے غار کی طرح نظر آرہا تھا۔

کچی سڑک پر چلتے ہوئے تین مسلح سائے یکایک ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ اور حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے ان کے چہروں پر ابھرنے والے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کی۔ اور تینوں کے ہاتھوں کی گرفت اپنے اپنے رائفلوں پر مضبوط ہو گئی ——— گاؤں کی ایک جھونپڑی سے ہلکی ہلکی روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ جو اس تاریک رات میں دور سے دکھائی دے رہی تھی۔

وہ چند لمحوں تک اپنی اپنی جگہوں ساکت و صامت کھڑے رہے۔ پھر ان کے قدم دھیرے دھیرے اس جھونپڑی کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ تینوں گاؤں کی اس جھونپڑی میں پناہ لینے والے باغیوں کی موجودگی پر خوش بھی تھے۔ اور ہراساں بھی ——— رات کی گہری خاموشی میں ان کی ذرا سی غلطی سے ان کے قدموں کی چاپ باغیوں ہوشیار ہو کر ان پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ لیکن اپنی دانشمندی اور

مستعدی سے وہ ان باغیوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔

کچی سڑک سے جھونپڑی کا فاصلہ بیس تیس گز سے زیادہ نہ تھا۔ وہ تینوں اس فاصلہ کو چند منٹوں میں طے کر سکتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ہوشیاری سے قدم بڑھاتے ہوئے ہر لحظہ کسی اچانک حملہ کا خدشہ لئے ہوئے انہوں نے یہ فاصلہ نصف گھنٹہ میں طے کیا۔

جھونپڑی کے قریب پہونچ کر ان تینوں نے اپنی اپنی رائفلوں کا رخ جھونپڑی کی طرف کر کے پوزیشن سنبھال لی۔

جھونپڑی کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ چند لمحوں تک وہ تینوں اپنی اپنی سانسیں روکے ہوئے جھونپڑی کے اندر چھپے ہوئے باغیوں کی گفتگو سننے کے منتظر کھڑے رہے۔ تاکہ ان کی تعداد کا اندازہ لگا سکیں لیکن جھونپڑی کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ صرف بانس کے درزے سے چھن کر باہر آتی ہوئی روشنی اس بات کی مظہر تھی کہ جھونپڑی کے اندر کوئی موجود ضرور تھا اس کے علاوہ جھونپڑی کے اندر زندگی کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی۔

جب انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں۔ تو ایک سایہ جو دروازہ کے سامنے تھا۔ آگے بڑھا اور اس نے زور سے دروازے پر دستک دی۔ دستک کی تاب نہ لاکر کمزور دروازہ رات کی خاموشی میں بڑے زور سے چیخ اٹھا۔ اور اس کی چیخ اس خاموشی میں دور تک پھیلتی چلی گئی۔

خلاف توقع زوردار دستک کی گونج خطرے کی گھنٹی کی طرح جھونپڑی کے اندر بج اٹھی۔ اور زندگی متحرک ہوگئی۔

کون ہے؟ جھونپڑی کے اندر سے ایک بوڑھی اور کمزور آواز میں خوفزدہ لہجہ میں پوچھا۔

دروازہ کھولو! ایک کرخت آواز گونجی۔ پھر ایک سائے نے چند قدم پیچھے ہٹ کر دروازہ کو نشانہ بنا کر اپنی رائفل سیدھی کرلی۔

دروازے کے دونوں پٹ آہستہ سے کھل گئے اور ایک بوڑھے شخص نے ہاتھ میں لالٹین لئے ہوئے باہر تاریکی میں جھانکا۔

رائفل بوڑھے کے سینے پر تن گئی ——— کون ہے تمہارے گھر کے اندر؟

بوڑھے نے لالٹین کی روشنی میں اس انسان نما سائے کو دیکھا اور بڑے پرسکون لہجہ میں جواب دیا ——— میں۔ اور میری بیوی اور میری بیٹی۔

ہم تمہارے گھر کی تلاشی لیں گے۔ سائے نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

اتنی دیر میں باہر کھڑے ہوئے دوسرے سائے بھی آگئے پھر دو سائے رائفل تانے ہوئے جھونپڑی کے اندر داخل ہوگئے اور تیسرا باہر پہرہ دیتا رہا۔

جھونپڑی کے اندر واقعی ان تین نفوس کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

جھونپڑی میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں بانس کے بنائے ہوئے دو مچان تھے۔ ایک کونے میں مٹی کا ایک چولہا تھا۔ اور اس کے قریب ہی مٹی کی ہانڈی، المونیم کے برتن، اور لکڑی کی چھوٹی سی پیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف بانس کا ایک ٹکڑا دونوں سرے سے رسی سے بندھا ہوا چھت سے لٹک رہا تھا جس پر استعمال شدہ کپڑے، سوتی، چادر اور سوزنی تہہ کر کے رکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک قطار میں تین چھینکے پر چھوٹی بڑی مٹی کی تین ہانڈیاں پٹ سن کی رسی میں بندھی ہوئی چھت سے جھول رہی تھی۔ ایک طرف فرش زمین پر ایک چھوٹی سی بانس کی ٹوکری اور ایک سوپ تھا۔

دوسرے کمرے میں ایک طرف بانس کا مچان تھا جس [illegible] ماں بیٹی ایک [illegible]

سوتی تھیں۔ اور بوڑھا ایک کمرے میں۔

بوڑھے کی عمر ساٹھ پینسٹھ سال سے کم نہ تھی۔ اس کی داڑھی اور سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے بازو اب بھی بھرے بھرے تھے۔ اور جسم صحت مند تھا۔ جو اس کے محنت کش ہونے کی غمازی کر رہا تھا۔ اس کی بیوی کی عمر پچاس پچپن سال کے لگ بھگ تھی۔ اور اس عمر میں جسمانی اعتبار سے تندرست دکھائی دے رہی تھی۔ نو واردوں کی آمد پر اس نے تھوڑا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ لیکن اس کے چہرے کا جو نصف حصہ کھلا ہوا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی اس کے چہرے پر بڑھاپے کی چھاپ نہیں پڑی تھی۔ لڑکی کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ گاؤں کی فضا میں پروان چڑھنے کے سبب اس کے عضو عضو سے بہار کی رنگینیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں۔ گورا رنگ، لمبوترا چہرہ، کشادہ آنکھیں، چوڑی پیشانی، گٹھا ہوا جسم ایک معمولی سی ساڑھی میں لپٹی ہوئی وہ اس وقت اس ہرنی کی طرح دکھائی دے رہی تھی جو چوکڑیاں بھرتے بھرتے یکایک کسی خطرے کی بو سونگھ کر چوکنا اور چوکس حملے کی سمت کا تعین کر رہی ہو۔

ہر طرح اطمینان کر لینے کے بعد جب ان دونوں نے گرین سگنل دیا تو تیسرا سایہ بھی جھونپڑی کے اندر آ گیا۔ اس جھونپڑی کے اندر اس لڑکی کے سوا اور کوئی بھی قابل قدر چیز نہیں تھی۔ اس لئے ان تینوں کی نگاہیں دیر تک اس لڑکی پر جمی رہیں۔

وہ تینوں بظاہر انسانوں جیسے دکھائی دے رہے تھے مگر ان کی ہیئت انسانوں سے مختلف تھی۔ بہ یک نظر وہ انسان تھے اور نہیں بھی تھے۔ بوڑھے نے لالٹین کی روشنی میں غور سے ان تینوں کو دیکھا۔ ایک کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ دوسرے کے دائیں گال پر ایک زخم کا نشان تھا۔ اور تیسرے کی ناک لمبی تھی۔

جب گاؤں کے تمام لوگ اپنی اپنی جھونپڑیاں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ بڑی بڑی مونچھوں والے نے سوال کیا۔

بوڑھے کے چہرے پر بڑی غمگین مسکراہٹ پھیل گئی۔

—— میں اس مٹی کی حفاظت کر رہا ہوں۔ جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ بوڑھے نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا

کون سی مٹی؟ دوسرے نے پوچھا۔

اپنے دیش کی مٹی۔ اپنے گھر کی مٹی جس پر میں کھڑا ہوں اس مٹی کی جس نے مجھے جنم دیا۔ جس کے سینے پر قدم رکھ کر میں نے چلنا سیکھا۔ جس کی گود میں پروان چڑھا۔ جس کے سینے پر میں نے فصل اگائے۔ اور ان سنہری فصلوں سے اپنے خواب سجائے۔

یہ مٹی بھی کوئی چوری کرنے کی چیز ہے۔ جو تم پہرہ دے رہے ہو؟ لمبی ناک والے نے سوال کیا۔

بوڑھے نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تلخی عود کر آئی۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

یہ دل کا معاملہ ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔ بس یوں سمجھ لو کہ اس مٹی سے مجھے اتنی والہانہ اتنی شدید محبت ہے کہ اسے چھوڑ کر کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا۔

مگر اس ویران گاؤں سرحد پر دینے والے سپاہیوں نے تمہیں باغیوں کا جاسوس سمجھ کر قتل کر دیا تو کیا ہو گا؟ بڑی بڑی مونچھوں والے نے پوچھا۔

میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بوڑھے نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا —— یہ تو میری خوش قسمتی ہو گی کہ مرنے کے بعد بھی مجھے اسی مٹی میں دفن کیا جائے گا۔

بڑی بڑی مونچھوں والے کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک رات کی خاموشی میں جھونپڑی سے باہر کچھ آہٹ ہوئی اور وہ تینوں اپنی اپنی رائفل لے کر تن کر کھڑے ہو گئے۔

کون ہے اس جھونپڑی کے باہر؟ بڑی بڑی مونچھوں والے نے مشکوک نگاہوں سے بوڑھے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے بیٹے ہیں۔ بوڑھی عورت نے جو اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلی بار اپنے لب کھولے۔

تمہارے بیٹے؟

تینوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کا شک یقین میں بدل گیا—— یہ بوڑھا ضرور باغیوں کا جاسوس ہے۔ اور جنھیں وہ اپنا بیٹا بتا رہا ہے۔ وہ ضرور باغی ہوں گے۔ جو انہیں دیکھ کر چھپ گئے ہیں۔

ان میں سے دو جست بھر کر جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔ اور لمبی ناک والا بوڑھے کا محاصرہ کئے کھڑا رہا۔

باہر جھونپڑی سے ملحق ایک اور جھونپڑی تھی۔ جو اندھیرے کی چادر اوڑھے کھڑی تھی سامنے سے اس کا نصف حصہ گرا ہوا تھا۔ لیکن غور سے دیکھے بغیر تاریکی میں اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا بڑی بڑی مونچھوں والے نے اپنی پتلون کی جیب سے ٹارچ لائٹ نکال کر اس کی روشنی جھونپڑی کے اندر پھینکی اندر دو بیل بندھے بندھے جگالی کر رہے تھے۔ اور ایک بالنس کے کھمبا سے اپنا جسم رگڑ رہا تھا۔

اپنی اپنی رائفلوں پر ان دونوں کی مضبوط گرفت قدرے ڈھیلی ہو گئی۔

وہاں تو دو بیل بندھے ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی مونچھوں والے نے جھونپڑی میں واپس آکر بوڑھے سے پوچھا—— تمہارے بیٹے کہاں ہیں؟

بوڑھا دھیرے سے مسکرایا—— وہی تو میرے دو جوان بیٹے ہیں۔ جو میرے کام میں میرا ہاتھ بٹاتے ہیں میرے ساتھ ساتھ محنت و مشقت کرتے ہیں۔ کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں۔ خوشوں سے دانوں کو الگ کرتے ہیں۔ فصلوں کو گھر تک پہونچاتے ہیں۔ اور اپنی کمائی سے مجھے سکھ پہونچاتے ہیں۔

بوڑھے کی آواز میں اعتماد تھا۔ اس کے بات کرنے کا انداز پر وقار تھا۔ اور اس کے لہجے سے اس کی صداقت ظاہر تھی۔ وہاں واقعی کوئی اور نہیں تھا۔ بوڑھے کی باتوں پر یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

پھر جب ان تینوں کے پاس مزید استفسار کے لئے کوئی سوال باقی نہ رہا تو انہوں نے لڑکی کی طرف تاکا جو اب تک بالنس کے مچان کے پاس خاموش کھڑی تھی۔

تمہاری لڑکی کی شادی ہو گئی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے نے غور سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

نہیں۔ بوڑھے نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ جیسے اسے اپنی لڑکی سے متعلق اس قسم کا سوال ناگوار گزرا ہو لیکن اس کی منسوب طے ہو چکی ہے۔ اگلے سال شادی ہو جائے گی

تمہارا ہونے والا داماد کیا کرتا ہے؟ دوسرا سوال بوڑھے کی سماعت سے ٹکرایا۔

وہ بھی ہماری طرح کسان ہے۔ بوڑھے کی آواز میں غصہ کی جھلک نمایاں تھی۔

لڑکی جو اتنی دیر سے خاموش کھڑی تھی۔ خود کو ان کی گفتگو کا موضوع بنتے دیکھ کر سمٹ سی گئی۔ اور اپنی نظریں جھکا لیں۔ ان تینوں کی نگاہیں بار بار لڑکی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اور ان کی نگاہوں میں پوشیدہ گرسنہ خواہش کو بھانپ کر پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

تمہارا ہونے والا داماد باغیوں کی جماعت میں شامل تو نہیں؟ بڑی بڑی مونچھوں والے نے مشکوک لہجہ میں پوچھا

بوڑھے کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اور پہلی بار اس کی آواز میں لرزش پیدا ہوئی —— مجھے اس کا علم نہیں۔

تمہیں علم نہیں تو تمہاری لڑکی کو ضرور اس کا علم ہو گا۔ ایک آواز ابھری۔

اس کے اس سوال پر لڑکی نے چونک کر ان تینوں کی

طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا کر پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کی زمین کریدنے لگی۔

کسان کی بیٹی دھان کوٹنا جانتی ہے۔ چاول صاف کرنا جانتی ہے۔ اور اُپلے تھوپنا جانتی ہے۔ وہ باغیوں کی خبر نہیں رکھتی۔ بوڑھے نے قدرے خفگی سے جواب دیا۔

مجھے تمہاری لڑکی پر شبہ ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے نے فیصلہ کن انداز میں کہا ـــــ اسے علم ہے یا نہیں ہم معلوم کریں گے

بوڑھے کی آنکھوں میں انجانے خوف کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ اس کے پاؤں دھیرے دھیرے تھرتھرانے لگے۔ اور وہ دھپ سے زمین پہ بیٹھ گیا۔

اے لڑکی! بڑی بڑی مونچھوں والے نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ـــــ ادھر آؤ

لڑکی چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی۔ ان تینوں کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا اندرونی کرب اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ اور شاید وہ اس کے لئے تیار ہو چکی تھی۔

میرے ساتھ دوسرے کمرے میں چلو۔ اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

اسے دوسرے کمرے میں کیوں لے جا رہے ہو۔؟ بوڑھے نے احتجاج کرتے ہوئے کہا ـــــ تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے میرے سامنے پوچھو۔

تم چپ رہو۔ لمبی ناک والے نے بوڑھے کے سینے پر رائفل تان دی۔

بوڑھے نے بڑی بے چارگی سے لڑکی کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر غم کی دبیز تہہ جم گئی۔ بوڑھی عورت نے گھونگھٹ میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پھر لڑکی بڑی مونچھوں والے کے ساتھ جب لڑکی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ تو دوسرے اپنی اپنی رائفلیں سنبھالے ہوئے جھونپڑی کے دروازے پر آ کر پہرہ دینے لگے۔

بوڑھے کے لئے وہ رات قیامت سے کم نہ تھی۔ وہ بار بار اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے میں جھانکتا۔ پھر تھک کر فرش پر بیٹھ جاتا۔ بوڑھی عورت اسی طرح گھونگھٹ کاڑھے بیٹھے روتی رہی۔ جیسے اس کے اندر گھونگھٹ سرکا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہو۔ اس کے جسم میں بار بار کپکپی سی ہوتی۔ اور اس کپکپی پر قابو پا لینے کے لئے وہ بار بار جھونپڑی کے درمیان ایستادہ بانس کے کھمبے کو مضبوطی سے تھام کر اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتی۔

رات ڈھلتی رہی۔ تاریکی گہری ہوتی گئی۔ ہر طرف پھیلا ہوا سکوت آسیب کی طرح گرد و پیش پر چھایا رہا۔ موت کی سی ویرانی اپنا پر پھیلائے ناچتی رہی۔ بوڑھے کی بے چینی بڑھتی گئی اور دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ اور دوسرے کمرے کا دروازہ اسی طرح بند رہا۔ لمبی ناک والے نے دوبارہ دستک بھی دی۔ لیکن دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔

جب سارے گاؤں میں صبح کا اجالا پھیل گیا۔ اور اس اجالے میں دھان کے کھیتوں میں کھڑی ہوئی فصلیں دور تک سبز لبادے میں لپٹی ہوئی ہوا کے نرم جھونکوں سے آہستہ آہستہ تھرکنے لگیں۔ درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر شبنم کے موتی زمین پر ٹپکنے لگے۔ اور جھونپڑی کے آنگن میں ڈربے کے اندر بند مرغ نے بانگ دے کر صبح کی آمد کا اعلان کیا تو دروازہ کھل گیا۔

دروازہ پر پہرہ دیتے ہوئے دونوں پہرے داروں نے چونک کر دروازہ کی طرف دیکھا ـــــ لڑکی کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ اس کے کپڑوں کی بے ترتیبی، اس کی الجھی ہوئی زلفیں۔ اور اس کی بے خواب آنکھیں اس کی شب بیداری کی غماز تھیں۔ چہرے سے وہ بے حد تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جیسے

بقیہ ۲۶ پر

ممتاز احمد خاں (پاکستان)

ایک سوال؟

یہ برسوں پرانی ایک صبح تھی۔

ماحول میں کافی کشیدگی تھی۔ پورا محلہ سنسان پڑا تھا یوں لگتا تھا جیسے قبرستان اپنی جگہ سے اٹھ کر یہاں پڑاؤ ڈال چکا ہو۔ گذشتہ ہفتے اسی محلہ کے دو نوجوان لڑکے مظاہرے کے دوران پولیس والوں کے اندھا دھند لاٹھی چارج کی وجہ سے شدید زخمی ہو کر اپنی ٹانگوں سے محروم ہو چکے تھے۔

جب دوپہر ہوئی تو دو بھاری بوٹوں والے لمبے دیہاتی قسم کے سپاہی وہاں سے آخری راؤنڈ لگاتے ہوئے گزرے۔ اسی وقت کسی شرارتی لڑکے نے کھڑکی میں سے ایک پتھر پھینکا جو ان میں سے ایک کی پیٹھ پر لگا۔ اس نے گھوم کر اس مکان پر نظر ڈالی اور غصہ سے اونچی آواز میں پتھر پھینکنے والے کی ماں کو گالی بکی۔ چونکہ وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس لئے وہ تھوڑی دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ اور پھر اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ بوٹوں کی پھٹ پھٹ جیسی آواز نکالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اچانک مسجد سے دردبھری آواز میں اذان نشر ہونے لگی جس سے پورے ماحول میں مذہبی تقدس چھا گیا۔ ایک گھر سے اللہ ہو کے وظیفے کی آواز بھی سنائی دی۔ ساتھ ہی ماسٹر صفدر علی کے گھر کا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ وہ دھیان میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس لئے کرفیو کی خلاف ورزی سے بے نیاز مسجد کی طرف چلے گئے۔

ماسٹر صفدر علی کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے۔ اور کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے؟ اس کا کسی کو کوئی علم نہ تھا۔ بس وہ ایک دن اچانک اس محلے میں وارد ہو گئے تھے۔ جیسے کوئی خودرو پودہ کسی جگہ اُگ آتا ہے۔ محلے کے تمام لوگ ان کا معمر اور نیک صفت ہونے کے بنا پر ہی احترام نہیں کرتے تھے بلکہ وہ انہیں اس لئے بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے کہ وہ ان کے دکھ درد میں شریک رہتے۔ ان کے مُردوں کو نہلاتے کفناتے اور قبروں میں اتارتے، مذہبی جلسوں میں فرش پر جھاڑو لگاتے لہک لہک کر حمد و نعت پڑھتے۔ اور گھریلو عورتوں کا جو شے سودا سلف لا کر دیتے۔ وہ چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر گزر بسر کرتے تھے۔ اور اس قدر خوددار تھے کہ کسی کے یہاں ایک وقت کی روٹی کھانا گوارا نہیں کرتے۔

البتہ لوگ ایک بات پر حیران ہوتے کہ وہ کنوارے تھے۔ اور اگر کوئی ان سے شادی کے مسئلے پر بات کرتا تو وہ خاموشی سادھ لیتے۔

کرفیو اٹھنے پر وہ سودا لینے مارکیٹ جا پہنچے۔ وہاں انہوں نے بھگدڑ مچی ہوئی پائی۔ انہوں نے دیکھا کہ کچھ پولیس والے ایک شخص کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ انہوں نے غور سے دیکھا کہ یہ مجرو تھا۔ انہیں بڑا تعجب ہوا جب وہاں

امن قائم ہوگیا۔ تو انہوں نے اپنے برابر کھڑے ایک شخص سے پوچھا۔ بھائی یہ کیا معاملہ ہے ؟

اس شخص نے اپنے دیدے گھماتے ہوئے ان کے کان میں کہا۔ بڑے میاں اسے پکڑنا آسان نہیں۔ اس پر بڑوں بڑوں کا ہاتھ ہے۔ ابجی پیسے ملتے ہیں اسے۔

کیا مطلب ؟ ماسٹر صفدر علی کے کچھ پلے نہ پڑا۔

وہ شخص اکتاہٹ کے ساتھ بولا۔ اجی یہ فخرو تھا ــــ چھٹا ہوا بدمعاش ــــ چرس اور بھنگ بھی فروخت کرتا ہے ــــ روپے لیکر جلسے جلوسوں میں پانی ہڑکنٹ، اور سانپ بھی چھوڑ کرافراتفری کرواتا ہے۔ کل بھی یہ سرکار کے خلاف پوسٹر دیواروں پر لگوار ہا تھا ــــ کیا تم اس کو نہیں جانتے ؟

ماسٹر صفدر علی کے سامنے پیش امام صاحب کی تصویر گھوم گئی۔ جو فخرو کی حرکتوں سے نالاں ہوکر اپنے دوسرے بچوں کے ہمراہ محلے چھوڑ کر کسی اور شہر کو ہجرت کر گئے تھے۔

انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔ اللہ تجھ پر رحم کرے فخرو اور پھر آگے بڑھ گئے۔

جب وہ گھر پہونچے تو دیکھا کہ تالہ باہر سے غائب تھا انہوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک مدھم سی آواز آئی۔

اندر آجاؤ صفدر علی صاحب ــــ لیکن دروازہ بند کر دینا۔

تم ـــ اور یہاں ! ماسٹر صفدر علی نے نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

فخرو نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ کچھ لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں اس لئے یہاں آگیا ہوں۔ جلد چلا جاؤں گا

ابھی چلے جاؤ ! یہاں سے۔

اس سے بہتر ہے مجھے پکڑوا دو۔ فخرو بولا۔ پولیس انعام بھی دے گی۔

ماسٹر صفدر علی نے غصے سے زمین تو کری زمین پر دے ماری۔ اور گوشت کی بوٹیاں سب طرف بکھر گئیں۔ وہ خو ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی پر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ فخرو انہیں مسکرا دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ مریل سی آواز میں پوچھنے لگے۔

اللہ کے بندے ــــ تو آخر کر کیا رہا ہے ؟

میں آمریت کے خلاف جدوجہد کر رہا ہوں۔ کیا تم اخ نہیں پڑھتے ؟

ماسٹر صفدر علی کا غصہ ہوا ہو گیا۔ وہ ہنس پڑے، سا ہی وہ کھانسنے لگے۔ ان کے منہ سے بلغم نکل کر فرش پر گرا۔ پ انہوں نے کھانسی پر قابو پایا اور بولے۔

تجھے پتہ ہے لوگ تیرے بارے میں کیا کہتے ہیں ؟

زندگی کے ہنگاموں میں اتنی فرصت کسے ہے ؟

ماسٹر صفدر علی کا جذبۂ ہدایت عود کر آیا۔ وہ اسے سمجھ لگے۔ فخرو۔ اس دنیا کے بعد بھی ایک اور دنیا ہے۔ جس میں اپ اعمال کا حساب دینا پڑتا ہے۔ پتہ ہے وہاں کتنا سخت عذا ہے گناہ گار کے لئے۔؟ میرا خیال ہے کہ تجھے اب سدھر جا چاہیئے۔

فخرو نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور بولا۔ جب تم کتابی باتیں کرتے ہو تو مجھے اپنے بھولا باپ یاد آجاتا ہے۔ پیش امام تاآخر، یہ کرو یہ نہ کرو۔

مجھے حیرت ہے کہ جنتی شخص کے یہاں شیطان کیسے پیدا ہو جاتا ہے۔

ماسٹر صفدر علی نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

اچانک کچھ ملی جلی آوازیں باہر سے ابھریں۔ اور دروازہ زوردار طریقے سے بجنے لگا۔ ماسٹر صفدر علی نے گھبرا کر فخرو کو دیکھا۔ جو بڑے اطمینان سے بستر پر دراز تھا۔

دروازہ کھول دو۔

فخرو نے پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

دروازہ کھلنے پر بہت سے سپاہی دھڑ دھڑ کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اور پورے گھر میں پھیل کر چیزوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔ جیسے مالِ غنیمت جمع کرنے کی مہم پر نکلے ہوں۔ البتہ ایک لمبا چوڑا انسپکٹر پولیس ماسٹر صفدر علی کے پاس کھڑا ان کی نگرانی کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد باقی سب سپاہی بھی انسپکٹر کے پاس آ کر جمع ہو گئے۔

نہیں ملا صاحب وہ بدبخت؟ انسپکٹر نے پوچھا اور ماسٹر صفدر علی کو یوں گھور کر دیکھا جیسے انہوں نے فخرو کو کہیں چھپا دیا ہو۔

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ انسپکٹر صاحب وہ کمینہ ادھر بھی نہیں ہے۔

ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ آخر ہم نے باقی سب گھروں کی تلاشی لے لی ہے۔ انسپکٹر نے کہا۔

آپ کو کس کی تلاش ہے۔؟ بڑی دیر بعد ماسٹر صفدر علی نے پوچھا۔

انسپکٹر نے الٹا ان سے پوچھا۔ آپ فخرو الحسن عرف فخرو کو جانتے ہیں؟

ماسٹر صفدر علی نے جواب دیا۔ پہلے وہ اسی محلے میں رہتا تھا۔ اب نا معلوم کہاں رہتا ہے؟

آپ نے اسے آج کہیں دیکھا؟

ہاں، ہاں —— مارکیٹ میں دیکھا تھا جب پولیس والے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

اور اس کے بعد؟

اللہ جانے!

ماسٹر صفدر علی صاف جھوٹ بول گئے۔

جب وہ لوگ جانے لگے تو ماسٹر صفدر علی نے انسپکٹر سے پوچھا آخر اس کا قصور کیا ہے؟

انسپکٹر نے جھنجھلا کر ... [illegible]

کیا

تصور ہو تو بتاؤں۔ کل شام ہمارا سامنے شراب کی ایک دکان کا تالہ توڑا۔ اور نعرہ لگایا کہ ادھر نہیں چلے گی۔ اور بہت سی بوتلیں ساتھ لے گیا۔ اب کہیں موج کر رہا ہو گا۔

اللہ رحم کرے۔ ماسٹر صفدر علی نے احمقوں کی طرح سر ہلا کر کہا۔

مگر ایس پی صاحب تو مجھ پر رحم نہیں کریں گے۔ انہوں نے بولا ہے کہ اگر وہ آج برآمد نہیں ہوا تو وہ مجھے لائن حاضر کرا دیں گے۔

انسپکٹر صاحب نے یہ کہہ کر زمین پر تھوکا۔ اور اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔

ماسٹر صفدر علی اپنے بستر پر آئے تو دیکھا کہ فخرو سیڑھیوں پر سے دھم سے کودا۔ اور پلنگ پر لیٹ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟

برابر والے گھر چلا گیا تھا۔ ہا، ہا، ہا

کئی دن بعد پورے علاقے میں لڑائی جیسی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مظاہرے، لاٹھی چارج، آنسو گیس کا استعمال اور گولی لگنے سے اموات، روزانہ کا معمول بن گئیں۔

پھر ایک دن علاقے کے تمام تر عمارت کا بڑا حصہ زمین بوس ہو گیا۔ چاروں طرف افراتفری پھیل گئی۔ فائرنگ اور آنسو گیس کی وجہ سے ... دھواں دھواں ہو گیا دور ایک نکڑ پر ماسٹر صفدر علی دہشت زدہ لوگوں کے ساتھ غریب لوگوں کے گھروں تک پہنچ رہے تھے۔ ان کو اپنی جان کا قطعاً ہوش نہیں تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر نظر کر دیکھا۔ جب کوئی جگہ ... سے وہ ما آگے۔

تو ... سے پیچھے۔ ... ما گیا بھائی؟

لیکن ان کی بات کا جواب ... [illegible]

نہیں سکتا۔ لوگ اپنی جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ وہ لوگوں سے بچتے بچاتے اپنے گھر کی طرف بھاگتے۔ اور کمرے میں آتے ہی پلنگ پر دراز ہو کر یوں سوئے گویا محاذِ جنگ سے واپس آئے تھے۔ پھر شام تک وہی سناٹا چھا گیا۔

لیکن تھانے کو کس نے نقصان پہونچایا تھا جی!؟ ایک دودھ بیچنے والے نے اہلِ محلہ سے سوال کیا۔

اجی یہ تھانے والوں کا اپنا کام ہے۔ انہوں نے سوچا اس طرح انہیں لوگوں کو گولی مارنے کا بہانہ ہاتھ آجائیگا کسی نے اپنی رائے پیش کی۔

ایک دوسرا شخص لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ اجی کیا بکواس کر رہے ہیں آپ!؟ پولیس والے خود اپنے آپ کو کیوں نقصان پہونچانے لگے؟

پہلے والے شخص نے غصے میں دوسرے شخص کے منہ پر جو زوردار تھپڑ مارا تو وہ لڑھک کر نالی میں جا گرا۔ پھر وہ جب اٹھ کر آیا تو دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ لوگوں نے بڑی مصیبت سے دونوں کو علیحدہ کیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بُری طرح گالیاں دے رہے تھے۔ اچانک کوئی لڑکا وہاں بھاگا ہوا آیا۔ اور بتانے لگا۔ پولیس کی گولی سے فخرو شہید ہو گیا ہے۔

اچانک اس محفل میں خاموشی چھا گئی۔ ان میں سے ایک شخص کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ نوجوانی میں شہید ہو گیا۔ بے چارہ!

دوسرے دن لوگوں نے اس محلے سے ملحق چوک کا نام فخرالحسن چوک رکھ دیا۔

اسی چوک کے عقب میں ایک بہت بڑا میدان تھا جہاں پابندی کے باوجود اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی جس میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم تھا ــــ میدان کے داخلی میں موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا ــــ ہم شہید فخرالحسن کو سلام کرتے ہیں ــــ فخرِ قوم ــــ فخرالحسن زندہ باد ــــ فخر........جم........ہو........رہ

اور اسی میدان کے بالکل آخر میں آہنی گیٹ کے پاس نیم کے درخت کے نیچے پیش امامی والے سفید کپڑوں میں ملبوس گھنی ڈاڑھی والا ایک بوڑھا شخص دنیا و مافیہا سے بے نیاز کھڑا زار و قطار رو رہا تھا۔

بقیہ "جب رات ڈھلی"

ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے آ رہی ہو۔

دروازے پر پہرہ دیتے ہوئے دونوں پہریدار نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور ان کے ہونٹوں پر فتح مندانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ دوسرے کمرے کے درواز کھلا دونوں نے دیکھا بڑی مونچھوں والا اب تک چادر اوڑھے ہوئے گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ اور اس کے کپڑے بجان قریب ہی بانس کے کھمبے سے جھول رہے تھے۔

صبح ہو گئی استاد! اب اٹھ بھی جاؤ۔ کب تک سوتے لمبی ناک والے نے قریب پہونچ کر آواز دی۔ اور گال کٹے چادر کا ایک سرا پکڑ کر کھینچ دیا۔

بڑی بڑی مونچھوں والے سپاہی کا پیٹ چاک اور گوشت کا ایک چپٹا سا ٹکڑا اس کے منہ سے باہر رہا تھا۔ اور بستر خون سے لت پت تھا۔

ان دونوں نے اس منظر کی تاب نہ لا کر بجلی کی سرعت سے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

دروازے کے بیچوں بیچ وہ لڑکی رائفل تانے کھڑی تھی۔

رحمٰن حمیدی

ساتویں آرزو

یہ اس کی ساتویں آرزو تھی ۔ اسی لئے میں نے صاد کر دیا ۔ اور میرے ذہن کے ویرانے میں عرفان و آگہی کی شمعیں فروزاں ہونے لگیں ، تو گھنے جنگلات میں عقل و خرد کے سفید مور رقص آلود ہو گئے ۔ میں فہم و ادراک کے لشے میں چور بہت دور نکل گیا ۔ جہاں ہارا ہوا پرندہ ٹوٹی شاخ پر بسیرا کرتا ہے ۔ شتر بے مہار پیاس کی شدت سے اپنا ہی شکم چاک کر لیتا ہے ، زمان و مکان کی سرحدیں منہدم ہو جاتی ہیں ۔ تاریخ خود کو دہراتی ہے ۔ چاندی اور سونے کے سکوں کے نشانات مٹ جاتے ہیں اور ریگستان کا زیر آب شیریں چشمہ فنا ہو جاتا ہے ۔ مٹی کی حلاوت اور شیریں پن ختم ہو چکی ہے ۔ آتش نشاں زیبق دوڑ رہا ہے ۔ جس کے لئے صرف ایک تیلی کافی ہے ۔ امن کا پیامبر بارود کے ڈھیر پر پھیلا ہے ۔ میں سکوں کا قیدی بن چکا ہوں ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت صرف میری پیاس بجھاتی ہے ۔ دن کا جلتا ہوا تنور مجھے شعلہ زار کر دیتا ہے ۔ بھٹکے ہوئے آہو کی زبان باہر نکل آئی ہے ، بھٹکے ہوئے قافلوں کے افراد کی ہڈیاں چٹخ رہی ہیں ۔ میں اس عظیم ہستی کے قدموں کے نشانات [illegible]

کائنات میں اجالا ہوا تھا ۔ بے جڑ کے پودوں نے جنم لیا تھا ۔ قمر دو ٹکڑے ہو گیا تھا ۔ میں اور تو کا امتیاز ختم ہوا تھا ۔ کبوتری انڈا دے رہی تھی ۔ عنکبوت کی باریک جالی پھیلی ہوئی تھی ـــــــــ اور ـــــــــ

اور ان کی آمد کی خوشبو پا کر بھٹکا ہوا قافلہ رک گیا ۔ باغ کے سوکھے درختوں پہ ہریالی پھیل گئی ۔ میں ہتھیلی پر شمع جلائے اور اپنی نگاہ عقیدہ سے جھکائے تربت کی جانب جا رہا تھا ۔ جو ہر جاندار کی آخری منزل ہے ۔ ہر نفس کو اس کا مزہ چکھنا ہے ۔ میں دہلیز پر قدم رکھنے والا ہی تھا کہ بیوی نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کر روک لیا ۔ اس کا کٹورا نما چہرہ آنچل میں چھپا ہوا تھا ۔ اس نے مٹی کی بجائے چاندی کا چراغ جلایا اور مجھ سے آہستہ سے کہا ۔

یہ میری ساتویں آرزو تھی ـــــ !

میری پشت پر بے شمار افراد داخل ہونے کے لئے ایستادہ تھے ۔ سبھی نے میری اقامت کو بھاری چٹان محسوس کیا ۔ یہ رکاوٹ ان کے لئے ناقابل برداشت تھی اسی لئے لوگ دھکے مارتے ہوئے آگے بڑھ گئے ۔ میں بیوی کی [illegible] میں شمع لئے ایستادہ تھا ۔ بیوی کے چراغ

سے میرے اندر ایک اور آگ لگی۔ بیوی کی ہدایتوں میں الجھ کر میرا چراغ بجھ گیا۔ تو میں نے اپنے سینے سے آگ خارج کی۔ اور ہر شخص کا بجھا ہوا چراغ روشن ہو گیا۔ وہ میرے اس عمل کو دیکھ کر چونک گئی۔ اور اس طرح غور سے دیکھنے لگی۔ جیسے وہ ابھی تک اس جسم کے مضمرات سے بے بہرہ ہے۔ میں تربت سے واپس مڑا تو میرے آرزو کی آگ اور دہک اٹھی۔ میں ڈر گیا کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اسی آگ میں جل کر راکھ ہو جاؤں۔ میں چند قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا اور اپنا انگوٹھا چوسنے لگا۔ میں خوف و دہشت سے کانپ رہا تھا۔ رہ رہ کر تربت کے عقب سے اژدہا اپنا سر نکالتا ہے۔ اور میری جانب منہ پھاڑ کر سانسیں لینے لگتا ہے۔ میرے خوف و دہشت کو دیکھ کر لوگ تسلیاں دیتے ہیں۔ کہ یہ زہریلا سانپ نہیں ہے۔ صرف اس کا منہ بڑا ہے۔ مجھے تو اس کے منہ میں دریائے نیل کی دلہن نظر آ رہی ہے۔ یہ دلہن پھر زندہ ہو گئی ہے اور ہر شہر میں عروس نو کی طرح آراستہ ہے۔ یا الٰہی یہ کیسا عذاب ہے؟ میں اپنے جسم پر بار بار ہاتھ پھیرتا ہوں۔ اس آگ کو کریدتا ہوں جو بار بار میرے وجود میں آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتا ہے

تم مجاور کا احترام کیوں نہیں کرتے —— اخبارات کی بے بنیاد باتوں پر اس قدر اداس کیوں ہو —— ؟!

عرس کی قوالی میں چار لڑکیاں فرار ہو گئیں۔ ان کی عمر کافی ہو چکی تھی اور شادی کے اخراجات کسی نے برداشت نہیں کئے —— !

میں نے بیوی کو سمجھایا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ مجاور کا سالانہ قسط ادا کرنے کے لئے بے چین ہے اگر میں اسی طرح قسطوں میں ادا ہوتا رہا تو ایک دن فنا ہو جاؤں گا۔ میرا نام و نشان بھی مٹ جائے گا۔ اسی لئے میں نے بیوی سے کہا۔

تم مجھے تربت سے دور لے چلو، ورنہ میں اپنی ہی آگ میں جل کر خاک ہو جاؤں گا۔ بیوی مجھے سمجھانے لگی۔

تم بزرگوں کی عظمت اور مُردوں کی کشف کرامات کی نعمت کی دیدار سے محروم ہو۔ ہارون رشید کی ملکہ نے دنیا ہی میں جنت خریدی تھی۔ ہارون رشید سلطنت کا مالک ہوتے ہوئے بھی تہی دست رہ گیا۔ تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم —— یہ دھرتی جب لوہے کی طرح سخت ہو جائے گی۔ سارے مُردے زمین سے برآمد ہوں گے سبھی کو حیرت ہو گی کہ یہ زلزلہ اور اخراج انتقال کیسے ہونے لگا ہے۔ اس وقت تمہاری فہم و ادراک کا دریچہ کھلے گا۔ تم سارے لوگوں کو گروپ در گروپ دیکھو گے ان کے جیسے ان کی زندگی کی کتاب کا مطالعہ کرو گے اگر تم نے مثقال برابر بھی بھلائی کی ہے تو وہ اجالے کا کرن بن کر تمہارا ساتھ دے گی۔ اگر تم نے مثقال برابر بھی برائی کی ہے تو زہریلا سانپ تمہارے سامنے پھن پھیلائے کھڑا ہو گا۔ اسی لئے میں تمہیں آرزو منت کر کے اجالے کی کرن کی جانب لے آتی ہوں۔ تم نے اخبارات میں چاند کے مسافر کا حال پڑھا —— ؟

ہاں میں نے نیل آرم اسٹرانگ کو پڑھا ہے۔ اور پوپ سنگر کو بھی سنا ہے۔ لیکن تم جو کچھ کر رہی ہو وہ مجھے کیوں نہیں دکھائی دیتا —— !!

تمہارے فلسفے نے تمہیں تاریکی کی راہ ہی دکھلائی ہے۔ تمہارے عقل و خرد میں اندھیرا ہے۔ اسی لئے تمہاری آنکھ بصارت سے محروم ہے۔ اگر تمہاری یہی حالت رہی تو تم گونگے اور بہرے بھی ہو جاؤ گے۔ تمہاری بصارت پہلے ہی سلب ہو چکی ہے۔

بیوی نے ترش روئی سے کہا۔

میں جھنجھلا کر کمرے میں آ گیا۔ سینے کی آگ سے

میں نے پیشانی کی موم بتی روشن کی۔ میری آنکھوں میں روشنی کی کرنیں پیوست ہونے لگیں۔ میں دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو گیا۔ تلسی داس کی یادیں تازہ کرنے لگا۔ بیوی میری جھنجھلاہٹ کو فوراً بھانپ گئی ہے۔ اور وہ بار بار آواز دے رہی ہے۔ لیکن اس کی ہر آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے۔ وہ اپنی بے بسی پر روہانسی ہو گئی ہے۔ اس کی آنکھیں چھلک پڑی ہیں۔ اس کے سرخ سرخ عارضوں پر آنسوؤں کے قطرے چمک رہے ہیں جیسے شمع سحر ہونے تک پگھلتی رہتی ہے۔

میں نے اس کے رونے کا سبب پوچھنا چاہا۔ تو خیال آیا کہ میری پیشانی کی شمع اور اس کے ہونٹوں کی خشکی ہی اس کے آنسوؤں کی وجہ ہے۔ اسے اپنے اصلی وجود سے جدا ہونے کا احساس تیزی سے چبھ رہا ہے۔ تکمیل آرزو میں وہ اندھی ہو رہی ہے۔ وہ مجھے مجاور کے پاس صرف اس لئے لے گئی تھی۔ کہ اسے اپنا جسم واپس مل جائے اور وہی آگ میرے دل دماغ میں پھیل جائے جو شادی کی پہلی رات بھڑکی تھی۔ لیکن مجاور نے اپنی قسط لے کر واپس کر دیا ہے۔ بیوی کو نذر و نیاز سے گہری طمانیت نصیب ہوئی ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی اسی بجھے ہوئے چراغ کے سائے میں محو خواب ہیں۔ تاریکی ہر سو پھیلی ہوتی ہے۔ تاریکی میں ہمارے جسم کا ایک ایک عضو منجمد ہو گیا ہے۔ اور میں ساتویں فلک کی جانب دیکھ رہا ہوں کہ شاید بیگم کی ساتویں آرزو پوری ہو جائے۔ اور ہم دونوں اصلی روپ کی طرف لوٹ جائیں۔

(پنجابی کہانی)

پنجابی :- ہربھجن سنگھ بٹالوی

اُردو :- شرون کمار ورما

میں مر چکا ہوں

چھوٹی بہن کا خط آیا ہے۔ پڑھا ہے۔ دل میں کچھ گھبراہٹ ہے، بیتا ہے۔ اس نے لکھا ہے ـــ ماتا جی دھاری وال جاتے ہوئے بس سے گر گئی تھیں۔ چوٹیں تو بہت لگی ہیں لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کتنی فکر کی بات ہے۔ ماں ٹھنڈی چھاؤں ہوتی ہے۔ ماں، ماں ہوتی ہے۔ تین چیزیں دوبارہ نہیں ملتیں۔ حسن، جوانی، والدین، اور بھی بہت کچھ میرے ذہن میں آرہا ہے۔ اپنے باس سے چھٹی کے لئے کہتا ہوں۔ دسمبر کے آخری دن ہیں۔ شاید وہ شک کرے، چھٹیاں ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن نہیں وہ متفق ہے۔ اب سوچتا ہوں بیوی کو فون کروں۔ وہ بھی نصف دن کی چھٹی لے آسکے۔ ابھی چلتے ہیں۔ پیسوں کا انتظام بھی کرنا ہے۔ ادھار بھی نہیں ملتا اور بینک بیلنس بھی نہیں۔ خیر دیکھا جائے گا۔ بیوی آتی ہے۔ پوچھتا ہوں، وہ بتاتی ہے بچوں کا پیپر فنڈ سو روپے کے لگ بھگ اس کے پاس ہے۔ اب اس سے چلنے کی بات کرتا ہوں۔

بچوں کو کہاں چھوڑیں گے؟ وہ کہتی ہے۔

گھر پر ہی، کچھ نہیں ہوگا۔ میں اعتماد سے کہتا ہوں تم کھانا بنا کر رکھ جانا۔

گیس ختم ہے۔ کھانا کیسے پکے گا؟ اس کے چہرے کی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں۔

انگیٹھی سے کام چلائیں گے۔ تم علی الصباح چلنے کی تیاری کرو۔

وہ آسانی سے مان گئی ہے۔

رات اطمینان سے نیند نہیں آتی۔ چلو جلدی کرو۔ میں صبح ۵ بجے اسے جھنجھوڑتا ہوں۔

وہ مشین کی سی تیزی سے تیار ہو جاتی ہے۔

دن چڑھتے ہی ماں سے جا ملتے ہیں۔ گھبرانے کی سچ مچ کوئی بات نہیں ہے۔ دل کی اداسی دور ہو جاتی ہے۔ خدا کا شکر کرتا ہوں۔

ساتھ کے گھر سے بھائی، بھابی اور ان کے بچوں میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا۔ میری بیوی ان سے ملنے جاتی ہے۔ اور دو گھنٹے تک واپس نہیں آتی۔ میں اپنے پرانے دوستوں سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ چھٹی کا دن ہے کوئی ملتا ہے کوئی نہیں ملتا۔ پرانے تھے، ہنسی مذاق، چائے اور بھی بہت کچھ۔ آدھا دن گزر جاتا ہے۔ واپسی کا خیال بھی اہم ہے۔

گھر پہنچنے پر دیکھتا ہوں کہ میری بیوی، ماں اور چھوٹی بہن، ساگ (سرسوں کا) توڑ رہی ہیں۔ مولیاں

۱۔ گردواروں میں دونوں وقت کھانا تقسیم ہوتا ہے۔ جسے سکھائی میں لنگر کہتے ہیں۔

لائی جا چکی ہیں۔ چاول بوری میں ڈالنے کے لئے الگ رکھے
ہیں۔ اور ایسی کئی چھوٹی موٹی چیزیں اکھٹی کر رہی ہیں۔

بھائی اور بھابی سے ملنے کو من چاہتا ہے۔ بھائی
نے بڑا ہونے کے ناطے گھر کے لئے بڑی مصیبتیں اٹھائی تھیں
بھابی نے بھی بھابیوں کی طرح ہمیں پالا پوسا تھا۔ کبھی ان
دونوں نے گھر کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ لیکن ایک وقت
ایسا بھی آیا کہ ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکا اور وہ علیحدہ
ہو گئے تھے۔ تب سے سکھ دکھ کا کوئی خاص ساتھ نہیں رہ
گیا تھا ـــ لیکن بچے تو ایسے ہی ہوتے ہیں نا۔ ان کے
یہاں اوپر تلے چھ لڑکیاں ہوئیں۔ کئی مرتبہ سوچا کہ ایک دو
ہم اپنے پاس رکھ لیں گے کہ ان کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا۔
لیکن ایسا کچھ ہو نہیں سکا۔ ان کی قربانیاں گھریلو جھگڑوں
اور چھوٹے موٹے من مٹاؤ تلے دب سی گئی محسوس ہوتی
ہیں۔ سوچتا ہوں وہاں جا کے کروں گا بھی کیا۔ بس سلام ہی
کرنا ہے ـــ اور بات بھی کیا ہو گی۔ گھڑی دیکھتا ہوں
ابھی تو آخری بس جانے میں تین گھنٹے باقی ہیں۔

ٹھیک۔ ادھر ہو آؤں۔ میں اشارے سے بیوی کو سمجھاتا
ہوں۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہے لیکن
خاموش ہے۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوں۔

بھائی اور بھابی دونوں الگ الگ چارپائیوں پر
بیٹھے ہیں۔ بھائی جو مجھ سے صرف تین سال بڑا ہے۔ تقریباً
دس برس بڑا لگتا ہے۔ نصف آستین کی قمیص پہنے ننگے
سر خاموش بیٹھا ہے۔ بھابی چھوٹی لڑکی کو لحاف سے ڈھکے
گود میں لئے بیٹھی ہے۔ لڑکی کی حالت بہت خراب ہے۔
سانس لینا مشکل ہو رہا ہے۔ آنکھیں الٹ رہی ہیں حلق
سے کچھ اترتا نہیں۔

اسے یرقان ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی دوائیں دیں تو نمونیہ
ہو گیا۔ بھابی روایتی سی بتاتی ہے۔

میں کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں۔ میں جذباتی ہو کر پوچھتا ہوں
اس معصوم بچی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ یہی بچی مجھے دیکھ کر
تاتا تلام کہا کرتی تھی۔ میں ان کی طرف دیکھتا ہوں۔

بھائی خاموش ہے۔ بھابی کہتی ہے۔ ابھی ڈاکٹر دوڑی
آیا تھا۔ نمونیہ بگڑ گیا ہے ـــ اب تو بہت مشکل ہے
ویسے ٹیکا لگا گیا ہے ـ دوا دے گیا ہے۔

پھر کچھ افاقہ ہوا؟ میں پوچھتا ہوں۔

نہیں ایسے ہی ہے۔ منٹوں کی مہمان ہے۔ بھابی
بھیگی سی آواز میں کہتی ہے۔

نا ایک بار کوشش کر دیکھتے ہیں۔ میں اپنی جیب
ٹٹولتا ہوا دلیری سے کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن میری آواز بیٹھی
جا رہی ہے۔

میرے من سے کئی باتیں سوچتا ہوں واپس آ جاتا ہوں
ماں اور بیوی ساگ چھیل رہی ہیں۔ صرف نرم پتے لے جاتے
ہیں۔ چھوٹی بہن چاول بوری میں ڈالتی ہے۔ دوسری بوری
مولیوں، گنوں وغیرہ سے بھری جا رہی ہیں۔ ابھی جانے میں
ڈھائی گھنٹے باقی ہیں۔

معلوم نہیں کیسے ہیں۔ بیوی کے کان میں کہتا ہوں۔
پتہ نہیں کب پران نکل جائے۔ ہم پھنس جائیں گے
نہ جا پائیں نہ رہ سکیں۔ لیکن یہ مجھے [illegible] معلوم نہیں ہوتی
وہ ویسی ہی ساگ بوری میں بھرتی رہتی ہے۔ ایک پل میں رکشہ
آ جاتا ہے۔ اور ہم سوار ہو کر بس اڈے کی طرف چل دیتے ہیں۔
بھائی بھابی شاید ہماری پیٹھ دیکھتے ہوں۔ بیوی چپ سی ہے
بس میں بیٹھے وہ معصوم چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے

چھوٹی بہن کی چھٹی ابھی ابھی ملی ہے۔ لکھا ہے وہ
تمہارے جانے کے آدھے گھنٹے بعد مر گئی تھی ـــ میں
چھوٹی بہن کو کیسے لکھوں کہ میں آنے سے دو گھنٹے پہلے ہی
مر گیا تھا۔

رؤف صادق

زخم زخم خوشبو

○

تیز ہوا کے خنجر سے
پتہ پتہ صحن چمن میں
تڑپ رہا ہے
جیسے کہ میں

○

سوکھی ندی
دھرتی کا ہے
لمبا زخم

○

خوشبو دار دھواں دیکھا
دل میں
ایک خوبصورت یاد جل رہی تھی

○

سینے پر میرے
پھول نہیں یہ
خنجر کا الٹا دستہ ہے

○

وہ خوش ہے بہت مطمئن، پرسکون
مگر اس کی تحریر پہ
چند سوکھے ہوئے آنسو بھی تھے

○

پنجرے میں ایک مینا تھی
میں نے اس کو رہا کیا
اب میں اس پنجرے میں ہوں

○

ہر ایک سانس
میری عمر کے تازہ پھول
ایک ایک کرکے توڑ رہی ہے

○

بیچ دریا ڈبو کر مجھے
میری کشتی
کنارے لگی

○

اس کے بچے نے پھول نوچ کر
پنکھڑیاں پھینکی
اس کے میرے درمیان

○

گھنا پیڑ
کٹتے ہی سب
یتیم تھے۔

صفدر

خالی ہے آکاش

اک منظر میری آنکھوں میں
اک منظر تیری آنکھوں میں
تا نظر سے جھول رہی ہے ست رنگ دھنک

جہاں ایک مکڑی کرتی ہے سعی
اس کھڑکی سے اس کھڑکی تک
گوندر ہی ہے ایک ڈور
مسلسل بھاگ رہی ہے ۔

وہ! وہ! وہ! آؤ! آؤ! دیکھو! دیکھو!
مخلوق گلی کی آنکھیں مل مل جاگ رہی ہیں
بچے، بوڑھے، جاہل، کاہل، اوباش

زہر بجھے تیر ہاں چلے
دو تار نظر کے ٹوٹے
سب رنگ دھنک کے چھوٹے
منظر ـــــ منظر کی لاش
خالی ہے آکاش ۔

محبت اب آئینہ ہے

تیری میری محبت اب آئینہ ہے
آئینے میں
سو عکس مسلسل بنتے اور بگڑتے ہیں
سب جاگ اٹھے ہیں سوتے سے ۔ اک چیڑ
مقابل آئینے کے آتی ہے ۔
اپنی پہچان ہنر کرتی ہے
یہ کام مکرر کرتی ہے ۔
اپنے آپ سے مل کر خوش ہیں سب
ہنستے باتیں کرتے ہیں
ہم! ان آتے جاتے رنگوں کا شکلوں کا
بوجھ اٹھائے چلے آتے ہیں

تیری میری محبت اب آئینہ ہے
آئینے میں
سو عکس مسلسل بنتے اور بگڑتے ہیں ۔

سوہن راہی (لندن)

گم صم گیت

مدھ دیپ کے آس پاس
دو ٹھٹھرائے ہاتھ
دو پیلوں کی ایک کلی
دو تپیوں کا پھول
رات کے سناٹے کا جادو
سانس سانس لہرائے
من میں اترا جائے

پیاس دھنک دھرتی امبر کو
اپنی گود میں لے لے
ایک سماں اگنی کا دوارا
ایک سماں جھرنے کی ٹھنڈک
رس برساتے سمے کے رسیا
ماٹی، آگ، ہوا، پانی، آکاش کے گم صم گیت
جسموں کے دو گیت
چپ چپ رنگوں کے موسم میں
مدماتے گیتوں کی رُن جھُن
خاموشی کے پہراوے میں
جھومتے گاتے بھیگے پل چھن

میٹھی متوالی ہر دھن کا
اپنا ایک بسیرا۔

وہ کون ہے؟

وہ کون ہے
جو سرمئی شاخ شجر کو / شان گل فراز کر دے
وہ کون ہے
جو خزاں رسیدہ کا نفس کا دامن
آہنگ نو کے پلوں سے بھر دے
وہ کون ہے
جو خامشی کی گھٹن میں پھر سے
زندگی کے گیت چھیڑے
وہ کون ہے
جو شبنمی جوڑا پہن کر / مری صبحوں میں مسکرائے
وہ کون ہے
جو اندھیری راتوں کے دامنوں سے
سیاہیوں کے ستم نچوڑے
وہ کون ہے
جو ویرانیوں کی حرم سرا سے
سیاہ بختی کے بت کو توڑے
وہ کون ہے
جو چاند سورج کی روشنی کو
ہر ایک آنگن میں ایک جیسی ہی بانٹتا ہے
وہ کون ہے
جو شعور عالم کی وسعتوں سے / جہل کہنہ کی ہر سلاسل کو کاٹتا ہے
وہ کون ہے
جو وجود آدم کی دفتر کون میں / صحیفۂ آگہی اتارے
وہ کون ہے
جو سماعتوں کی انجمن میں / پھر نئی آواز کا جادو جگائے
وہ کون ہے؟
وہ کون ہے؟

وحید اختر

غزل

لپٹی ہوئی پھرتی ہے نسیم ان کی قبا سے
گل کھلتے ہیں چشم متبسم کی ضیا سے

برہم نہ ہو تم شوخیٔ امواج صبا سے
زلفیں ہیں بکھرنے ہی کو جب سر پہ ہوا سے

دل ایسا دیا کیوں کہ رہا کشتۂ جاناں
تم سے نہیں، یہ شکوہ بھی کرنا ہے خدا سے

محروم ہیں ہم گرمیٔ گفتار سے ان کی
جو ہونٹ جو آنکھیں ہیں گراں بار حیا سے

کھولیں گے انہی ہاتھوں کے ناخن گرہ دل
جو بستہ ہیں رنگینی و خوشبوئے حنا سے

لب نہروں کے صحراؤں میں ہیں خواب پریشاں
دریا کو سرابوں سے صدا دیتے ہیں پیاسے

کیوں اہل فلسطین کریں شکوۂ امت
مقتول اسی کے ہیں محمدؐ کے نواسے

یہ شرط وفاداری ہے شاہ شہدا سے
جاں جائے سر و پا نہ ہٹیں راہ وفا سے

آہستہ کرو چاک گلو! اپنا گریبا سے
گونجے نہ چمن غنچوں کے ہنسنے کی صدا سے

فضا ابن فیضی

غزل

اس کو چراغ آخر شب کا سلام لکھ
یعنی ابھی ہے حرف سحر ناتمام لکھ

منزل بجز شکستہ دلی اور کچھ نہیں
ہو جائیں پاؤں شل تو سفر کو قیام لکھ

شاید صبا اسی سے بصیرت کا درس لے
اوراقِ گل پہ نکہتِ گل کا پیام لکھ

ہے جنبشِ نفس میں سفر کا معاملہ
موجِ نفس کو شوخیٔ پائے خرام لکھ

ہم سے فقیرِ راہ بھی جس کو سہہ سکیں
ایسا بھی کوئی حیلہ سرِ سقف و بام لکھ

اس کے اسیر میری طرح راستے بھی ہیں
نقشِ قدم کو حلقۂ زنجیر و دام لکھ

یہ جنسِ ناصواب تو ہے رائیگاں یہاں
دل کے حساب میں نہ وفاؤں کے دام لکھ

سنتا ہے کون خاصۂ خاصانِ فن کی بات
لکھنا ہے جو تجھے بزبانِ عوام لکھ!

ہر تجربہ ہے اپنی روایت کی بازیافت
ہے باشعور تو نہ کوئی حرفِ خام لکھ

الفاظ کے نگاہ دار بھی ہوں گے ترے بعد
تو میرے خواب بھی نئی نسلوں کے نام لکھ

غالب کے فکر و فن کا وہ اسلوبِ خسروانہ
اس کو فضاؔ جدید غزل کا امام لکھ

شرون کمار ورما

غزلیں

ڈاکٹر نریش

میتوں کا منتظر، یہ مقبروں کا شہر ہے
خوب صورت ہی سہی، اجڑے گھروں کا شہر ہے

اپنی ہی پہچان مشکل ہے یہاں ہر شخص کو
مان لیں کیسے کہ یہ دیدہ وروں کا شہر ہے

عکس کیا، آواز تک کو ترس جاوگے تم
آئینہ خانہ نہیں، یہ پتھروں کا شہر ہے

ہونٹ ساکت، دل فسردہ، جسم پتھر، ہاتھ شل
آپ کو ضد ہے کہ یہ چارہ گروں کا شہر ہے

ہر سڑک پر خون، ہر آنگن میں ہے آہ و بکا
اے خدا یہ مسجدوں اور مندروں کا شہر ہے

منزلیں تو دور نقش پا نہیں ملتے یہاں
قافلے والو چلو، یہ رہبروں کا شہر ہے

دیکھ لو ورما تمہیں اک شخص پتھر کر گیا
ہم نہ کہتے تھے کہ یہ جادوگروں کا شہر ہے

خلاف اس کے زباں کھولو، نہ کھولو
مگر یہ کیا کہ تم سچ بھی نہ بولو

بہت بوجھل ہیں یہ سکے تمہارے،
مرے شعروں کو تم پھولوں میں تولو

بہت معصوم ہیں آنکھیں تمہاری
خدارا تم مری آنکھوں سے رو لو

ابھی بارود آلودہ فضا ہے،
ابھی اڑنے کو اپنے پر نہ تولو

بہت ہی زہر پھیلا ہے ہوا میں
دریچے بند رہنے دو، نہ کھولو

نقوش اجداد کے دھندلا رہے ہیں
نریش آئینے کو اشکوں سے دھو لو

غزلیں

محبوب شیدائی

بانٹ لے آپس کا غم ایسا یہاں اب کون ہے
آشنائے لذتِ دردِ جہاں اب کون ہے

خواب ہے، تنہائی ہے یا رنگینی پرچھائیاں
میں جہاں سے آگیا دیکھو وہاں اب کون ہے

لوٹ جاؤ سرزمینِ خواب کے سوداگرو!
جاگتے خطے میں شب کا رازداں اب کون ہے

خوشنما ہو نیند، سپنوں سے زیادہ تو یہاں
تحفۂ تعبیر دے شایانِ شاں اب کون ہے

ساری بستی میں اندھیرا ہے مقفل در کرو
کون آئے گا بھلا اپنا یہاں اب کون ہے۔

میں ادھر بیٹھا ہوا ہوں سامنے ہے آئینہ
سوچیے دیوار بن کے درمیاں اب کون ہے

پہلا پتھر مجھکو وہ مارے کہ جو ہو بے گنہ
ساری دنیا دیکھ لے عیسیٰ یہاں اب کون ہے

صرف سمتوں کا تعین ہی نہیں مد نظر!
دیکھنا یہ بھی ہے میرِ کارواں اب کون ہے

سارے رشتے وقتِ ہجرت ساتھ دیتے ہیں مگر
تھام لے محبوب کا دامن یہاں اب کون ہے

نصر قریشی

وہ شخص اجنبی تھا، مگر دلبروں میں تھا
وصلِ بہار بن کے خزاں کے گھروں میں تھا

آتا ہے یاد تیز ہواؤں کے شور میں
تنکوں کا آشیانہ شکستہ پروں میں تھا

ننھے اجلی آستینوں میں وہ سب چھپے ہوئے
میرے لہو کا ذائقہ جن خنجروں میں تھا

یادوں کا ایک سونا جزیرا ہے سامنے
کیا کیا طلسمِ خواب کبھی منظروں میں تھا

بکھرا اس قدر کہ مجھے لوٹنا پڑا
میں کبھی زمانے کے طاقت وروں میں تھا

جھونکا ہوا کا اب تو اڑاتا ہے چار سو
طوفانی رت سے پہلے یہ سر پھروں میں تھا

گرد و غبار قافلوں کو چاٹنے لگے!
رہزن ہمارے بیچ کبھی رہبروں میں تھا

خاموش سازِ بزم ہے نغمے جگائے کون؟
مدت ہوئی کہ نصر وہ نغمہ گروں میں تھا

غزلیں

خلیل سیمابی

کم سے کم اتنا تو جذبِ شوق پیدا کیجیے
حسنِ بے پردہ کو مجبورِ تماشا کیجیے

حسن کی منزل میں ارکانِ تصور تو بھی ہے
ہو سکے تو آپ سے تو پردا کیجیے

مائلِ حسنِ حقیقت ہے حجابانہ نیاز
آرزوئے دید ہے تو چشمِ دل وا کیجیے

ہے اسی کا نام تکمیلِ عبادت عشق میں
حق کو سجدہ کرتے کرتے خود کو سجدا کیجیے

میں بہر صورت ابھی تک تشنۂ تکمیل ہوں
آپ بھی ترکِ محبت کا ارادہ کیجیے

سرکشوں کا ہو ہی جائے گا کسی دن سر نگوں
پہلے اپنے زورِ بازوؤں میں زور پیدا کیجیے

آنکھ کہتی ہے کہ بس کر اب نہیں تابِ دید
دل یہ کہتا ہے کہ اس جلوے کو دیکھا کیجیے

پھر جبیں کو یاد آئی لذتِ آغوشِ در
جی میں آتا ہے کہ پھر سجدے پہ سجدا کیجیے

رنگ و بو کے بھیس میں ہے اک سرابِ رنگ و بو
سوچ کر دل کو اسیرِ حبِ دنیا کیجیے

ذمہ دارِ عیش ہوتا ہے ہر اک غم اے خلیل
بے محابا ہر غمِ دنیا گوارا کیجیے

شہپر رسول

تُل جائے گا خود بھی ان کو تول کے دیکھ
صدیوں کی خاموش کتابیں کھول کے دیکھ

کھو جائے گا رنگ برنگے لمحوں میں
اشکوں میں یادوں کا نشہ گھول کے دیکھ

اس ملبے میں کچھ تو ہاتھ آ جائے گا
حال اور ماضی کے ٹکڑوں کو رول کے دیکھ

ہو سکتا ہے تو ہی زخمی ہو جائے
ہمسائے کے خط کو یوں مت کھول کے دیکھ

شہروں کی محدود فضاؤں میں کیا لطف
دیوانے بے سمت ہوا میں ڈول کے دیکھ

قیمت کون طلب کرتا ہے زخموں کی
ایک نظر بس دل کی آنکھیں کھول کے دیکھ

تیرے ہی الفاظ تجھے ڈس جائیں گے
ان لوگوں میں شہپر سچ تو بول کے دیکھ

غزلیں

شاہد لطیف

عجیب طرز کا اظہارِ غم گساری تھا
وہ سبز ساخ ہی مصروف آہ و زاری تھا
جھکی زمین کی طرف تو کھلا یہ راز عجیب
کہ بوڑھی شاخ پہ پتوں کا بوجھ بھاری تھا
ملی نگاہِ بصیرت تو ہم نے دیکھ لیا!
شرابِ جسم کا سہ کے کلس سے عاری تھا
تمام عمر رہے روشنی کی خواہش میں
سحر ہوئی تو لگا ہوں پہ خوف طاری تھا
ہوس تھی نام کا چرچا کریں گے چاروں طرف
ہمارے دور کا ہر شخص اشتہاری تھا

ایاز جھالنوی

عقل حیراں، نظر ساکت، زباں چپ ہے
آپ چپ ہیں تو میرا ہر جہاں چپ ہے
کل وہ کیا تھا جو سب سے بات کرتا تھا
آج کیا ہے کہ سب کے درمیاں چپ ہے
قہقہوں سے زمیں پر کھیلنے والو!
یہ بھی سوچا کبھی، کیوں آسماں چپ ہے
گمرہی کا یقین بھی ہو چلا لیکن!
احتیاطاً امیرِ کارواں چپ ہے
میں نے دیکھے ہیں کچھ خاموش طوفاں بھی
خیر یارب کہ ہر موجِ رواں چپ ہے،
رہزنی کا طلسم اک دن ٹوٹے گا!
راہ چپ ہے نہ گردِ کارواں چپ ہے
سننے والے ایاز اب تک پریشاں ہیں!
کہنے والا تو کہہ کر داستاں چپ ہے

قاضی حسن رضا

ہاتھوں کو سمیٹے ہوئے مصروفِ دعا ہوں
تاثیر کے ہاتھوں میں نہ آؤں گا ہوا ہوں
آندھی کے پروں سے ہی چلوں عرش بریں تک
اک عزم لئے خاک کے ذروں سے اٹھا ہوں
تلوار ہی بن جائے قلم ہاتھ میں آ کر!
دیکھو کہ لہو رنگ ہوں یا رنگِ حنا ہوں
جب پھول کی خوشبو ہوں کوئی مجھکو نہ روکے*
پستی سے بلندی کی طرف اڑ کے چلا ہوں
تپتے ہوئے سورج سے زمینوں میں پگھل کر
لاوے کی طرح چاروں طرف پھیل گیا ہوں
موسم کی عنایت سے ہرے برگ و ثمر ہیں
میں خارِ ندامت سے رضا آبلہ پا ہوں

جمیل قریشی

خنجر ہوا کا شوخ کلی کے بدن میں تھا
تازہ لہو کا رنگ نئے پیرہن میں تھا
سورج کے سائبان باہر نہ آئے لوگ
آسیب جیسے سایہ سرو و سمن میں تھا
ہر شمع، ورنہ رات گزیدہ ہوئی وہاں
بس ایک چراغ حاصلِ شب انجمن میں تھا
بے اعتنائی میرا مقدر بنی رہی
تنہائیوں کا زہر میری جان و تن میں تھا
کیا جانے مجھ پر کس طرح اوچھا پڑا تھا وار
ورنہ وہ شخص طاق بہت اپنے فن میں تھا
اس کو دیارِ غیر میں اب پوچھتے ہیں لوگ
جو اجنبی کی طرح خود اپنے وطن میں تھا

ماہنامہ آہنگ میں شائع شدہ تخلیقات کا
گوشوارہ

مرتبہ :

ڈاکٹر [illegible]

سال ۱۹۷۰ء

نمبر شمار	عنوان	مصنف	مضمون کا تعارف
۱	تنقید، حسن نعیم ۔ جمال فکر	مخمور جالندھری	حسن نعیم کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ
"	اردو شاعری پر غالب کا اثر	شمس الرحمن فاروقی	غالب کی شاعرانہ خصوصیات
"	اردو نثر کی روایت اور غالب کی انشا پردازی	ڈاکٹر وہاب اشرفی	غالب کی نثر اور انشا پردازی کی انفرادیت کا تجزیہ
۲	ظہیر صدیقی	شفیع جاوید	ظہیر صدیقی کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر
"	ظہیر صدیقی ایک جدید شاعر	ڈاکٹر وہاب اشرفی	ظہیر صدیقی کی جدیدیت کا تجزیہ
"	ٹی ایس ایلیٹ اور شخصیت	محمد حنیف	فنکار کی ادبی شخصیت کے متعلق ایلیٹ کے نقطۂ نظر کا مطالعہ
"	عملی تنقید	ڈاکٹر سید محمد عقیل	عملی تنقید کی توضیح و تشریح
"	مغربی ادب میں جدیدیت	نزہت نوری	جگدیش لوہری کے مضمون کا ترجمہ
"	تنقیدی زبان	انور سدید	تنقید میں ادبی اسلوب کی اہمیت
	[illegible] اور ایلیٹ	محمد حنیف	ایلیٹ کے ادبی تصور پر بریڈلے کے فلسفہ کا اثر

جز شمارہ	عنوان	مصنف	مضمون کا تعارف
۳	بیسویں صدی میں انگریزی تنقید کے نئے زاویے	نظام صدیقی	موجودہ صدی میں انگریزی تنقید کے مختلف نقطہائے نظر کا بیان
۴	لفظوں کا بوجھ	وزیر آغا	لفظوں کے تخلیقی استعمال کی اہمیت
"	غالب کا فن	نجم الہدیٰ	غالب کے فن میں توانائی اور فعالیت
۵	حقیقت کی تلاش میں	دیوندر اسر	ادب میں حقیقت کا نفسیاتی تصور
"	ادب میں فرائیڈ اور ژونگ کا تصفیہ	افتخار جالب	فرائڈ اور ژونگ کے نظریہ حقیقت کی تنقید
"	جدید غزل کا ڈکشن	مشتاق قمر	جدید غزل کی لفظیات کا مطالعہ
"	جدیدیت اور قومی اور آفاقی روایت	علی جواد زیدی	ادب میں روایت کی قدر و قیمت
٦	معیار تنقید	شرف عالم	علی اکبر کسمائی کے مضمون کا ترجمہ
۷	معیار تنقید	شرف عالم	علی اکبر کسمائی کے مضمون کا ترجمہ
"	مخدوم کی چار نظمیں	شمیم نغز انمر	مخدوم محی الدین کی چار نظموں کا تجزیہ
۸	طنز و مزاح کے پچیس سال	وزیر آغا	پچھلے پچیس برس کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کا
"	نئی شاعری کے مسائل	نظام صدیقی	نئی شاعری کی خصوصیات کا تجزیہ
۱۰	کنکریٹ شاعری	وہاب اشرفی	کنکریٹ شاعری کا مفہوم
۱۱	کچھ راجہ مہدی علی خاں کے بارے میں	انور سدید	فن کا تنقیدی مطالعہ خطوط کی روشنی میں
۱۲	اردو دانشوری کی تلاش	عابد رضا بیدار	اردو زبان کی فکری بنیادوں کی جستجو

سال نامہ (کہانی)

جز شمارہ	کہانی	مصنف	جز شمارہ	کہانی	مصنف
۱	چھری	غیاث احمد گدی	۱	بے نام	ستیش بترا
"	طنز	جوگندر پال	"	آنچ	نزہت نوری
"	دانت کا ...	شفیع جاوید	٦	دوسری اجڑی شام	احمد یوسف
"	خودکشی	جیلانی بانو	"	ان دیکھی آواز	رشید امجد

آہنگ نمبر	کہانی	مصنف
۲	زرد پہاڑ	الیاس احمد گدی
۳	رہ جو دنیا کو نہ چاٹ سکے	انتظار حسین
،،	وقت	بہل متہ، مترجم: اقبال عارف
،،	موت کی بیکاری	رمیش چندر دت
،،	برسات کی رات	سمیع آہوجہ
،،	نحور	حامد اکمل
	لا	کلام حیدری
۴	واپسی، ولیم جالسن روانگی	انور سجاد
،،	چاند، لاش اور ایک آواز۔	بدیع الزماں
،،	ڈرائنگ روم کی پینٹنگ	حکدرشن چترویدی۔ (اردو: شاہ نواز)
،،	پل پر بیٹھا بوڑھا آدمی	آرنسٹ ہیمنگوے (ترجمہ مناظر عاشق ہرگانوی)
،،	سیاہ ہوتا دن	رشید امجد
،،	ٹیچ اینڈ وینیش	علی امام
،،	دکھ	سید باقر حلیم
،،	گیلی مٹی کا بت	مشتاق قمر
۵	دو گھنٹے	سہیل عظیم آبادی
،،	بارش میں یوکلپٹس کا درخت۔	اے حمید
،،	جانا پہچانا شہر	رام لعل
،،	تلوار کا موسم	احمد یوسف
،،	ایک دوپہر	اکرام اللہ

آہنگ نمبر	کہانی	مصنف
۵	شیرازہ	نزہت نوری
،،	اعتماد کا جرم	علی حیدر ملک
،،	رنگ رنگ کھولتی روانی	نشاط قیصر
۶	ربط کا انعقاد	جوگندر پال
،،	ٹیلے سے ٹیلے تک	سجاد نقوی
،،	پرخوف اندھیرا	یوگ راج
،،	ہوا کا حبس	سلیم الظفر
،،	سبک	کلام حیدری
۷	کہ ہر خواہش پہ دم نکلے	ہاجرہ مسرور
،،	وادیوں کی دھوپ	انور سجاد
،،	خوشی کی کھوج میں	جمیلہ ہاشمی
،،	افسانہ نگار یا بادل	منصور قیصر
،،	باہر کا کمرہ	نشاط قیصر
،،	پرابلم	احمد شریف
،،	ہمشیا	شاہد عزیز
،،	سیاہ لکیروں کی روشنی	آصف محمود
،،	جنگل	وانگ گنگ بافوت (ترجمہ مناظر عاشق ہرگانوی)
۸	کبوتری	غیاث احمد گدی
،،	اپی ٹاف	شفیع جاوید
،،	سبز نقش	نزہت نوری
،،	زرد دوابیا	ہانس رش زول (ترجمہ زوار محمد)
۹	لارنس آف عریبیا	احمد ندیم قاسمی
،،	الف لیلہ کا ایک گمشدہ ورق	رشید امجد

شمارہ	کہانی	مصنف
۹	ملائنڈ پرم	منظر الاسلام
"	خیرو بن النثوم	شبیر احمد
"	مصلوب نسلیں	علی حیدر ملک
"	ملاقات	ہوری ادگائی
	بھوک ہی بھوک	شانتو قیصر، اردو
		امان ہرگانوی
۱۰	روپ بہروپ	نزہت نوری
۱۱	اعتراف	جوگندر پال
"	سنگین کے دو کنارے	احمد یوسف
"	میرا نام	آمنہ ابوالحسن
"	آخری سودا	ستیش بترا
۱۲	کور	ارنج
"	پاگل خانہ	شمس ندیم
"	چوراہے کا انسان	لقمان ہاشمی
"	دہشت	سلام بن رزاق
"	آخری اینٹ	شفق

سالنامہ (نظم)

شمارہ	نظم	شاعر
۱	زاویہ نظر	لطیف حزیں
۲	حصول کل اور ایک منظر	ظہیر صدیقی
"	اعراف	" "
"	قتل نور و ظلمت	" "

شمارہ	نظم	مصنف
۲	نیا مریض	ظہیر صدیقی
"	مینڈک	" "
"	غلط ہے یہ بھی	" "
"	قیمتی لمحوں کا دیوتا	" "
"	مراجعت	" "
"	چیخوں کا جہنم	" "
"	اجنبی راستے	" "
"	برف کی سل	" "
"	کہ دائروں سے مفر نہیں ہے	" "
"	قیمتی کھلونے	" "
"	بچوں کی نظمیں	شمس الرحمن فاروقی
"	نیا گیت	ندا فاضلی
۳	یہ سچ ہے اگر	منظر شہاب
"	دکھ اعتبار کے	من موہن تلخ
"	عمر کے چالیس سال	سہیل احمد زیدی
۴	ڈھلوان	وزیر آغا
"	وہ لوگ	شاہد احمد شعیب
"	ابلاغ	احمد ندیم قاسمی
"	آڈن کے نام	فہمیدہ ریاض
"	کہاں رکھیں پاؤں	عرش صدیقی
"	راستہ کدھر ہے	مظہر امام
"	پت جھڑ	سید محمد عقیل
"	دو نظمیں	لطف الرحمن

شمارہ	نظم	شاعر
۵	سچ کا زہر	احمد فراز
〃	خود آذیتی	کشور ناہید
۶	سفر کا دوسرا مرحلہ	وزیر آغا
〃	آزاد لمحوں کا دکھ	علیم اللہ حالی
〃	نئی اجتہاد	〃
〃	ایک نظم	مجید امجد
〃	یکش نگری	عزیز قیسی
〃	دو نظمیں	ندا فاضلی
〃	نظم	جیلانی کامران
〃	آرزو سے شکست آرزو تک	فاروق حسن
〃	دائرہ	حزیں صدیقی
〃	نروان	جمال الدین ساحل
۷	رباعیات	جمیل مظہری
〃	اے دیوتا	احمد ندیم قاسمی
〃	بہار آرہی ہے	جیلانی کامران
〃	جھیل میں ڈوبا سورج	شاہد احمد شعیب
〃	کتنے بہت راستے	زاہدہ زیدی
〃	نئی رتوں کا نوحہ	شریف خالد
〃	دو نظمیں	شاہد ماہلی
〃	بادِ جنوب	شاہین غازیپوری
〃	چارہ گر	مخدوم
〃	دارہ موت	〃
〃	رات کے بارہ بجے	〃

شمارہ	نظم	شاعر
۷	مارٹن لوتھر کنگ	مخدوم
۸	آخری نظم	مصطفیٰ زیدی
〃	تبدیل ہونا انسانوں کا عبادت گاہوں میں	ظہیر صدیقی
〃	تنہائی	جاں نثار اختر
〃	نظم	ماجد الباقری
〃	کہانی گم ہو گیا	سلام مچھلی شہری
〃	ڈسٹورشن	صغیر احمد صوفی
〃	لاحاصل	مشتاق علی شاہد
〃	مجھے یاد ہے	شاہد عزیز
۹	رباعیات	جوش ملیح آبادی
〃	شب و روز تماشا	وحید اختر
〃	امام	عزیز قیسی
〃	ہپی	افتخار نسیم
〃	قم	فہیم جوزی
〃	نیا شہر	〃
〃	گواہی	〃
〃	یادداشت	احمد سوز
〃	سودا	شعیب شمس
〃	یہ کون ہے	نفر حمید خلش
〃	ہم اپنی جڑ کاٹنا چاہتے ہیں	فخر رضوی
〃	کرب احساس	اکمل اجلی

نمبر شمارہ	نظم	شاعر
۹	ساتواں در	فرخ درانی
۱۰	آنکھ	وزیر آغا
"	ادھوری تلاش	شفیع مشہدی
"	سارے رشتے بچا	قمر اقبال
"	ہوائی اڈے پر	" "
"	اس جہنم میں	" "
"	شاعیں تہ گرداب بچوں کے ہونٹ [illegible]	سعادت سعید
"	یہ تیرا نام، میرا ہے	مشتاق علی شاہد
"	دو شلاک	" " "
"		
۱۱	سر برہنہ شہر کا	خلیل الرحمن
"	پنگھنا وا	
"	شمار ٹوٹ گیا	ساجدہ
"	نروان	اسلم عمادی
"	[illegible]	شاہد ماہلی
"	دہشت	چترگپت (میتھلی)
	آدرش	ہرقامہرن جھا (")
	تحریر	کرتی نرائن مشرا (")
	ایک نظم	گیان چندر (")
	ایک نظم	گیان چندر (")
۱۲	[illegible]	وحید اختر
	[illegible]	" "

نمبر شمارہ	نظم	شاعر
۱۲	ہنگامہ سکوت	نسیمہ اشرفی
"	ادھورا نگر	زاہدہ زیدی
"	مردہ خوشیوں کی تلاش	ارمان نجمی
"	رباعیات	حرمت الاکرام

سال ۸۴ء (غزل)

نمبر شمارہ	غزل	شاعر
۱	غزلیں	حسن نعیم
۲	غزل	جمیل مظہری
"	"	باقر الماجدی
"	"	خلیل الرحمن اعظمی
"	"	باقر مہدی
۳	غزل	منظر شہاب
"	غزلیں	ظہیر صدیقی
"	غزلیں	ماجد الباقری
"	غزل	شرون کمار ورما
"	غزلیں	قمر اقبال
"	غزل	بشیر سیفی
"	غزلیں	ادریس یوسفی
۴	غزلیں	شاہد احمد شعیب
	"	[illegible]

نمبر شمارہ	غزل	شاعر
۴	غزلیں	سلطان اختر
۵	غزلیں	جمیل مظہری
"	غزل	من موہن تلخ
"	"	لطف الرحمن
"	"	شکیب ایاز
"	غزلیں	صبا اکرم
"	غزل	عبداللہ کمال
"	غزل	نصر قریشی
۶	غزل	باقر مہدی
"	غزلیں	سلطان اختر
"	غزل	مراتب اختر
"	"	انور شعور
"	غزلیں	فخر رضوی
"	غزل	نذیر قیصر
"	"	شمیم ہاشمی
"	"	مختار اللہ عاصی
۷	غزلیں	بشیر بدر
"	غزل	شکیب ایاز
"	"	ماجد الباقری
"	غزلیں	ابرار اعظمی
"	غزل	قتیل شفائی
"	"	احتشام اختر
"	"	شکیل دسنوی
۸	غزل	مظہر امام

نمبر شمارہ	غزل	شاعر
۸	غزلیں	لطف الرحمن
"	"	شاہد کبیر
"	"	آفتاب شمسی
"	غزل	شہزاد احمد
"	"	عدیم ہاشمی
"	"	اقبال ساجد
"	"	ظفر حمیدی
"	"	شاہین
"	"	بدنام نظر
"	"	لئیق حسین خلش
"	"	عبدالرحیم نشتر
"	"	میر نقی علی ثاقب
"	"	احمد فراز
"	"	رؤف خیر
۱۰	غزل	مصطفیٰ زیدی
"	غزلیں	پرکاش فکری
"	"	سلطان اختر
"	"	علیم اللہ حالی
"	"	ابرار اعظمی
"	غزل	ناصر کاظمی
"	"	ماجد الباقری
"	"	من موہن تلخ
"	"	چندر پرکاش شاد
"	"	غلام مرتضیٰ راہی
"	"	ساجد اثر

۱۰	غزل	فارغ بخاری
〃	〃	جعفر طاہر
〃	〃	جمیل مظہری
〃	غزلیں	وحید اختر
〃	غزل	غلام جیلانی اصغر
〃	〃	عزیز قیسی
〃	〃	بشیر بدر
〃	〃	راج نرائن راز
۱۱	غزل	حسن نعیم
〃	غزلیں	پرکاش فکری
〃	غزل	زبیر رضوی
〃	〃	بشر نواز
۱۲	غزل	پرکاش فکری
〃	〃	من موہن تلخ
〃	غزلیں	لطف الرحمن
〃	غزل	ماجد الباقری
〃	〃	اسرار اعظمی
〃	〃	ظفر سیدی
〃	〃	آفتاب شمسی
〃	〃	احمد شمیم
〃	〃	فخر رضوی
〃	〃	[illegible]
〃	〃	[illegible]
〃	〃	جعفر عسکری

سالنامہ (تبصرے)

نمبر شمارہ	کتاب کا نام	مصنف کا نام	مبصر کا نام
۳	گنج سوختہ	صمد ابن اذانی	وہاب اشرفی
۴	نیا ادب	رشید امجد	کلام حیدری
۵	غالب کی جمالیات	کمار پاشی و	وہاب اشرفی
	(دستہ ۶۹ء کی منتخب شاعری)	گوپال متل	تاج انور
۶	زہر حیات		شاہدہ حیدری
۹	لفظوں کا پل		وہاب اشرفی
۱۲	سنگ میل		لطف الرحمن
	یاد کی خوشبو		〃
	جذبہ و آواز		افصح ظفر

متفرقات ۷۰ء

نمبر شمارہ	عنوان	مصنف	تعارف
۱	پاپیادہ تماشا گر	احمد یوسف	شخصی خاکہ (حسن نعیم)
	شاہ میں وہ دھوم تھی		
۲	نیند کیوں نہیں آتی	کرشن چندر	انشائیہ
۶	باقر مہدی	محمد مثنیٰ	شخصی خاکہ
۷	[illegible] وارہ	اسمٰعیل خوئی	غزل وارہ فارسی شعر میں ایک جدید اصطلاح
۹	خلیل الرحمن اعظمی	محمد مثنیٰ	شخصی خاکہ
۱۰	آٹے کا حجرانہ	یوسف ناظم	انشائیہ
	جنگل میں	کرشن چندر	مولیر کے ایک ڈرامہ کا ہندوستانی روپ

شمارہ	عنوان	مصنف	مضمون کا تعارف
۱۱	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	خود نوشت سوانح کا ایک حصہ
۱۲	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	خود نوشت سوانح کا ایک حصہ
"	اختر انصاری	محمد محسن	شخصی خاکہ

سال ۱۹۷۱ء (مضامین)

شمارہ	عنوان	مصنف	مضمون کا تعارف
۱۳	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	خود نوشت سوانح کا ایک حصہ
"	ن۔ م۔ راشد — اظہار کی نئی جہت	فریدہ بخاری	راشد کے یہاں طرز اظہار کی ندرت کا مطالعہ
۱۴	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	خود نوشت سوانح کا ایک حصہ
"	ادب میں پورے آدمی کی تلاش	نظام صدیقی	جدیدیت کے صالح تصور کا مفہوم
۱۵	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	خود نوشت سوانح کا ایک حصہ
۱۶	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	خود نوشت سوانح کا ایک حصہ
"	نئی شاعری کے چند عناصر	متین سید	نئی شاعری کے چند عناصر کی نشاندہی
"	نروان اور اہرمل	تیمر صفی عالم	ولیم واٹسن کی مشہور نظم کا تجزیہ
۱۷	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	خود نوشت سوانح کا ایک حصہ
"	نئی شاعری کا پس منظر	سید احتشام حسین	نئی شاعری کے پس منظر سے متعلق چند اشارے
۱۸	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	خود نوشت سوانح کا ایک حصہ
	خواجہ غلام السیدین	محمد محسن	خاکہ
	احتشام حسین	محمد محسن	خاکہ
۱۹	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	خود نوشت سوانح کا ایک حصہ
۲۰	قدروں کے زوال سے جڑا ہوا مسئلہ	نظام صدیقی	جدیدیت کے صالح تصور کا ایک تجزیہ

شمارہ	عنوانات	مصنف	مضمون کا تعارف
۳۰	سواریاں	یوسف ناظم	مزاحیہ مضمون
۲۱،۲۲	جدید اردو نظم۔ ایک جائزہ	احتشام اختر	جدید نظموں کا تنقیدی جائزہ
۲۳	شپلی، پیاس کا ایک صحرا	نظام الدین صدیقی	شپلی کے تخلیق کا مختصر تجزیہ، زندگی کی روشنی میں
و	موضوع کی تلاش	قمر اعظم ہاشمی	ادب میں موضوعات کی اہمیت کا مسئلہ
۲۴	احمد یوسف کے افسانے	علی حیدر ملک	احمد یوسف کے فن کا تجزیہ

سال ۸۲ء کہانیاں

شمارہ	کہانی	مصنف	تعارف
۱۴	میں، تم، وہ، ہم	شوکت حیات	
"	قیامت	ہرچرن چاولہ	
"	مونگے کی وادی	قمر التوحید	
۱۴	خون رسی لکیریں	علی امام	خصوصی مطالعہ
"	پنچ اینڈ ونیش	"	"
"	حادثے	"	"
"	پگھلتی زمین پر	"	"
"	گزرتی ہوائیں	"	"
	سوانح حیات	"	"
۱۵	دلدل	ثروت کمار ورما	
"	کور آنکھوں کا صحرا	اعجاز راہی	
"	پانچواں کلنڈر	جاوید نہال	
"	ایک کہانی	حسین الحق	
	کھوکھلی	شگفتہ	
"	برف سے ٹکرا ہوا	پرکاش پانڈے	ترجمہ ظفر اقبال

شمارہ	کہانی	مصنف	تعارف
۱۵	سال گزر جاتے ہیں	چیکو وسیگل (ترجمہ)	مناظر عاشق
۱۶	ہم تھے اور شہر تھا	احمد یوسف	
"	رات آنکھیں اور زرکر	نزہت لوذی	
"	دائرے		
"	سیاہ اور سفید	انور خان	
"	میراث	شمس ندیم	
"	نیا سقراط	شمیم سیفی	
۱۷	اسیر زیست	انور خان	خصوصی مطالعہ
	سورج، راکھ، اور	"	"
	ہنسی	"	"
	برف کی آنچ	"	"
	راستے اور کھڑکیاں	"	"
	ہیراؤ	"	"
	بھیڑیے	"	"
۱۸	آخری کمپوزیشن	بلراج مین را	

شمارہ	کہانی	مصنف	تعارف
۱۸	آخری نذرانہ	ڈاکٹر عبد الستار	
"	روشنی کے شہر تک	شبیر احمد	
"	طلبانہ	حسین الحق	
"	ماں	ابرٹو موراویا (ترجمہ)	سنیل کمار دہرا
"	لمپ کے کھنڈر تک	سعادت شمیم	
۱۹	نرگا مرد	شمس ندیم	خصوصی مطالعہ
"	آخری موت	"	"
"	شعلے رواں دواں	"	"
"	تبدیلی	"	"
"	سونا مکھی	"	"
"	ہمارے بھی ہیں مہرباں	"	"
۲۰	ایک چھوٹی کہانی	غیاث احمد گدی	
"	شرکاف، دراڑ، خلا ہوا	شوکت حیات	
"	ماضی کے جالے	انور خاں	
"	عمر قید	علی حیدر ملک	
"	ٹیبل کے نیچے ٹیبل کے اوپر	شاہدہ یوسف	
"	گنتی	شرون کمار ورما	
۲۱	سکون سے دبا	شوکت حیات	خصوصی مطالعہ
"	آدمی	"	"
"	میں، تم، وہ، ہیں	"	"
"	پنڈولم	"	"
"	سہ شنبہ پر سیاہ کبوتر	"	"
		"	"

شمارہ	کہانی	مصنف	تعارف
۲۱ و ۲۲	دائرے کے کنارے	شوکت حیات	خصوصی مطالعہ
	قطبین کے بیچ	"	"
	ہواؤں کی زد میں		
۲۳ و ۲۴	پہلی کمپوزیشن	ہرشن بن مالی	
	صحرا کا ساون	شفق	
	بائیسویں صدی کا ایک چوپال	تسکین انصاری	
"	تشکیل آفاق کے ہاتھ میں تھی	شبیر احمد	
	رقص زدہ لہریں	علی امام	
	گدلیوں کے چکر	مقبول شمیم	
	لیکر تی مرکس	سعادت شمیم	

سال ۱۹۷۸ء (نظمیں)

شمارہ	نظمیں	مصنف
۱۳	تاریک جنگل کا سفر	ظہیر صدیقی
"	تسلسل یا جمود	ساجدہ زیدی
	تھکن	علیم اللہ حالی
	اطلاع	سلام مچھلی شہری
	خالق	عبد اللہ کمال
	[illegible]	سامہ جاوید

نمبر شمارہ	نظمیں	مصنف	مترجم
۲۰	مادر وطن / سال نو کا تحفہ	سبھاش مکرجی	علقمہ شبلی
۲۱	اس بات یہ ہے	صادق	
۵	وسواس مجھے		
۲۲	تحفے (۲) فرحت	اکرام باگ	
"	(۳) مناکشی (۴) شاہدہ		
"	ہوا کی امانت	حمید الماس	
"	نظمیں	خلیل تنویر	
"	(۱) ضبط کائنات	صلاح الدین پرویز	
"	(۲) عورت	"	
"	پلیٹ فارم (ہندی)	دھرم دیر بھارتی	اعجاز کامل
"	ایک اور (ہندی)	اشیور شرما	" "
"	عزات سے فرار (میتھلی)	گنگیش گنجن	" "
"	بہار (میتھلی)	سوم کانت سوم	" "
"	نظریہ (")	گیان پنندر	" "
"	روایت (")	"	" "
۲۳	دھند میں تصویریں	شاہد احمد شعیب	
۵	ملبہ	اکرام باگ	
۲۴	پانچ نظمیں	نصر قریشی	
	رباعیات	بمل کرشن اشک	

سال ۸۱ء (غزل)

نمبر شمارہ	غزلیں	مصنف
۱۳	غزل	شمیم فاروقی
"	"	شکیب ایاز
"	"	احمد سوز
"	"	چندر پرکاش شاد
"	"	نصر قریشی
"	"	غلام مرتضیٰ راہی
۱۴	غزل	مظفر حنفی
"	"	پرکاش فکری
"	"	سلطان اختر
"	"	لطف الرحمن
"	"	اطہر عزیز
"	"	نصر حمید خان
"	"	صفدر
"	"	زبیر شفائی
۱۵	غزل	حسن نعیم
"	"	سلام مچھلی شہری
"	"	من موہن تلخ
"	"	ظہیر غازی پوری
"	"	شمیم سحر
	"	احمد شمیم
		شاہد ماہلی

نمبر شمارہ	غزلیں	مصنف
۱۵	غزل	عبدالرحیم نشتر
"	"	میر تقی علی ثاقب
"	"	اسلم عمادی
۱۶	غزل	عزیز قیسی
"	"	ظفر اقبال
"	"	بشیر بدر
"	"	سلطان اختر
"	"	ماجد الباقری
"	"	شاہد کبیر
"	"	عبدالرحیم نشتر
"	"	سید احمد شمیم
"	"	صفدر
۱۷	غزل	حسن نعیم
"	"	حرمت الاکرام
"	"	شمیم فاروقی
"	"	عبداللہ کمال
"	"	ماجد الباقری
"	"	ابرار اعظمی
"	"	چندر پرکاش شاد
"	"	غلام مرتضیٰ راہی
"	"	شکیل دسنوی
"	"	جمنا پرشاد راہی
"	"	جمیل کلیمی

نمبر شمارہ	غزلیں	مصنف
۱۷	غزل	سید احمد شمیم
"	"	رفیق الزماں
"	"	ساجد اثر
"	"	حباب ہاشمی
"	"	مختار احمد عاصی
۱۸	غزل	مظہر امام
"	"	شہاب عراقی
"	"	اقبال ظہیر ناگی
"	"	ابرار اعظمی
"	"	رفیق الزماں
"	"	نازش انصاری
"	"	محسن زیدی
"	"	منصور سبزواری
"	"	مضطر حیدری
"	"	رشید افروز
"	"	ظہیر غازی پوری
"	"	احتشام اختر
"	"	نسیم چمن
"	"	حبیب ہاشمی
۱۹	—	—
۲۰	غزل	من موہن تلخ
"	"	محمود عشقی
"	"	سلطان اختر

نمبر شمارہ	غزلیں	مصنف
۲۰	غزل	لطف الرحمٰن
"	"	غلام مرتضیٰ راہی
"	"	عبدالرحیم نشتر
"	"	محسن زیدی
"	"	چند۔ پرکاش شاد
"	"	حق اعظمی
"	"	ساجد اثر
۲۲/۲۱	غزل	بشیر بدر
"	"	زیب غوری
"	"	علیم اللہ حالی
"	"	غلام مرتضیٰ راہی
"	"	مدحت الاختر
"	"	عشرت ظفر
"	"	شرون کمار ورما
"	"	ڈاکٹر نریش
"	"	صفدر
"	"	منظور ہاشمی
"	"	رفیق الزماں
"	"	اصغر ساحل
"	"	قاضی حسن رضا
۲۴/۲۳	غزل	زیب غوری
	"	ظہیر صدیقی
	"	بمل کرشن اشک

نمبر شمارہ	غزلیں	مصنف
۲۴/۲۳	غزل	اقبال متین
	"	شکیب ایاز
	"	ارمان نجمی
	"	فاروق شفق
	"	شاہد ماہلی
	"	حق اعظمی
	"	نسیم مومن

سال نامہ (تبصرے)

نمبر شمارہ	کتابیں	مبصر
۱۳	کینسر وارڈ	لطف الرحمٰن
"	دنیا کہیں جسے	لطف الرحمٰن
"	لامکان	کلام حیدری
۱۴	اکائی	وہاب اشرفی
"	گلوب	لطف الرحمٰن
۱۶	دو غنڈے	کلام حیدری
"	پہلی آواز	"
۱۷	لاہور کا جو ذکر کیا	لطف الرحمٰن
۲۰	نجات سے پہلے	علی حیدر ملک
۲۲/۲۱	آئینہ در آئینہ	علی حیدر ملک
	وقت کی صدیاں	علی حیدر ملک
	ماچھی دھیرے چل	سیف زلفی

مطبوعات کلچرل اکیڈمی گیا

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	قیمت
	تنقید وتبصرہ		
۱	زاویۂ نگاہ	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	۲۰/-
۲	انتخاب کلام جمیل	" محمد مثنیٰ	۷/-
۳	معیار و مسائل	" شاہ شکیل احمد	۵/-
۴	احتشام حسین نمبر	مرتبہ، کلام حیدری	۲۵/-
۵	شاد کی نثر نگاری	ڈاکٹر وہاب اشرفی	۴۰/-
۶	مزامیر	کلام حیدری	۱۰/-
۷	برملا	کلام حیدری	۱۵/-
۸	عکس	نثار احمد صدیقی	۱۰/-
۹	نئے افسانے کا سلسلۂ عمل	مہدی جعفر	۳۰/-
۱۰	کلیات وجد	ایم ایم مصطفیٰ	۱۵/-
۱۱	تفہیمات	کلام حیدری	۲۰/-
۱۲	تذکرۂ شعرائے گجرات	ترجمہ کلام حیدری	۸/-
	افسانے		
۱۳	بے نام گلیاں	کلام حیدری	۱۰/-
۱۴	بابا لوگ	غیاث احمد گدی	۸/-
۱۵	صفر	کلام حیدری	۱۰/-
۱۶	روشنائی کی کشتیاں	احمد یوسف	۱۵/-
۱۷	الف، لام، میم	کلام حیدری	۱۵/-
۱۸	مردے	ترجمہ، شاہد احمد دہلوی	۱۰/-
۱۹	سائیکی کی تقدیر	" شیخ صلاح الدین	۱۰/-
۲۰	فکشن نمبر	مرتبہ، کلام حیدری	۳۵/-
۱۹	شاہی کنیز	رحمٰن حمیدی	۱۰/-
۲۰	ارتقا سیریز ۱	مرتبہ، کلام حیدری	۱۵/-
۲۱	یہ لوگ (خاکے)	ڈاکٹر محمد مثنیٰ	۱۸/-

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	قیمہ
۲۲	شعلے بھڑک اٹھے (ڈرامہ)	نثار احمد صدیقی	/-
	شاعری		
۲۳	درخشاں	حفیظ بنارسی	/-
۲۴	نوائے راز	مہجور شمسی	/-
۲۵	لمحوں کا سفر	ڈاکٹر نرملیشور پرشاد	/-
۲۶	والٹ ہیٹ مین	ڈاکٹر عبدالرؤف	/-
۲۷	نقش نا معتبر	قسیم الحق گیاوی	/-
	متفرقات		
۲۸	اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	/-
۲۹	فراز دار	کلام حیدری	/
	زیر طبع		
۳۰	جنت نہیں چاہیے (ناول)	کلام حیدری	
۳۱	اصول نقد	کلام حیدری	
۳۲	مطالعہ جمیل مظہری (مرتبہ)	کلام حیدری	
۳۳	ہم سفر	نثار احمد صدیقی	
۳۴	ادبی مباحث	نثار احمد صدیقی	
۳۵	نئے افسانے کا سفر	مرتبہ کلام حیدری	

ایجنٹ حضرات کیلئے ۳۳ فیصد کمیشن کی خصوصی رعایت

ملنے کا پتہ

دی کلچرل اکیڈمی

دینہ ہاؤس جگجیون روڈ، گیا۔

.. N. Regd 4253/64
. T. Regd No. Gy, 7
hone--432

THE **AAHANG** Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

تنقیدی مضامین

کلام حیدری

PRICE Rs 20/

The Cultural Academy, Gaya.

ماہنامہ آہنگ گیا

JULY–1983

PRICE–Rs 2-00

دی کلچرل اکیڈمی آئینہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ، ۱۹۶۲ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

سالانہ ۲۴ روپے

ایک شمارہ ۲ روپے

فون نمبر ۴۳۲۲

ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈمنسٹریٹر

[illegible]

دی کلچرل اکیڈمی گیا کی تمام (کتابیں، رسائل، پمفلٹ) میں شائع ہونے والی ادبی و نیم ادبی تخلیقات میں نام، مقام، واقعات، ادارے اور کردار سارے کا سارا سو فیصدی فرضی ہوتی ہے۔ حقیقی افراد، نام و مقام، واقعات، کردار اور اداروں سے اس کی مماثلت یا مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔ جس کے لئے کلچرل اکیڈمی گیا کے کسی فرد ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، اراکین، معاون یا کارکن اور مصنف پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی

ادارہ

محتویات

اداریہ

کشکول

فیڈرل کالج پاکستان نے پانچ جلدوں پر مشتمل "پاکستانی ادب" کا انتخاب شائع کیا ہے۔ پانچویں جلد ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ رشید امجد اور دیگر کئی اہم ادیبوں کی کوششوں کے نتیجے میں یہ کام ہمارے سامنے آیا ہے۔ کام لائق تحسین ہے اور اسکو یہاں تک پہونچانے والے داد کے مستحق ہیں۔ "پاکستانی ادب" کے نام سے اس "سلسلے" کے انتخاب میں صرف ادب ہی نہیں ہے بلکہ فنون لطیفہ کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کے اردو مفکرین، دانشور اور ادیب ادب کا کام ثانوی کام سمجھکر نہیں کرتے، ڈوب کر کام کرتے ہیں۔ ایک مخصوص سلیقے، انتظام، ضبط اور احتیاط کے علاوہ ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ کام شروع کرتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ اتنا بسیط و عریض کام کیسے ہو سکے گا کب تک ہو سکے گا اور کس پائے کا ہو سکے گا۔ بس یہ نیت کر لیتے ہیں کہ کام ایمانداری، صبر و استقامت کے ساتھ کریں گے۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجے تک کام کو پہونچائیں گے نتیجے میں جو کام ہوتا ہے، قابل رشک ہوتا ہے۔ لائق تقلید ہوتا ہے۔ معیاری ہوتا ہے، اپنی زبان میں بے مثال ہوتا ہے۔ مرتبین کا جانفزا اور محبت بھرا اقدام ہے۔ جو ہر جلد پڑھتے وقت دہرایا جاتا ہے کہ اس انتخاب پر تبصرہ کروں۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل، تمام فنون لطیفہ کا جائزہ، تجزیہ اور دانشورانہ مطالعے سے بھرپور یہ انتخاب مجھ جیسے کم علم آدمی کو روشنی اور آگہی دیتا ہے۔ میں ان پانچوں جلدوں کے ہر مضمون اور شریک اشاعت تخلیقات پر تبصرہ کیا کروں؟ بس رشک کرتا ہوں اور پڑھتا چلا جا رہا ہوں۔

بہت سارے سوالات کے جوابات اس انتخاب سے ملے، بہت سے نئے سوالات ذہن میں پیدا ہوئے اور ذہن کے کئی دریچے کھلے۔

ابھی میں مرتبین کو صرف مبارکباد دیتا ہوں اور خواہش کرتا ہوں کہ ہندوستان کی اردو اکیڈمیوں میں سے کوئی ایک اکیڈمی یا سب مل کر ــــ یا کوئی ادارہ ایسا ہی کوئی کام کرے۔

امیر حیدر ملکؔ ادبی ایوارڈ

کے لئے

کتابیں مطلوب ہیں

دی کلچرل اکیڈیمی گیا نے سال گذشتہ کی طرح اس سال بھی اردو کے ادیبوں اور فنکاروں کو ادبی انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

: شرائط :

(۱) ہر تصنیف مطبوعہ سنہ ۸۲ء کی پانچ جلدیں داخل کی جائیں گی

(۲) کتابوں کے ساتھ مصنف کے دستخط سے ایک خط اکیڈمی کے نام ہونا ضروری ہے۔ جس میں واضح طور پر یہ تحریر کیا ہو کہ کتابیں وہ خود داخل کر رہا ہے۔ اور اکیڈمی کا فیصلہ ہر حال میں منظور ہوگا۔

(۳) ہر تصنیف مطبوعہ سنہ ۸۲ء کی پانچ جلدیں ۳۱ اگست ۸۳ء تک دفتر اکیڈمی میں چیرمین کے نام پہونچ جائے۔

انعامات کا اعلان ہفتہ وار مورچہ گیا میں ضرور کر دیا جائے گا۔ دیگر اخبارات و رسائل میں بھی اعلان کیا جا سکتا ہے۔

: چیرمین :

دی کلچرل اکیڈمی جگجیون روڈ گیا۔

(ڈاکٹر) وحید اختر

نئے تناظر میں انسان کا مقام

ہزاروں سال کی تہذیبی، ترقی اور فکری کاوشوں نے انسان کو یہ احساس دلایا تھا کہ وہ عالم اصغر ہے خلاصۂ کائنات ہے، مرکز نظام موجودات ہے۔ وہ زمین کا باسی تھا۔ اس نے یہ زمین کو تمام کون و مکاں کا مرکز مان کر خود اپنی مرکزیت کا تصور صدق دل سے قبول کر لیا۔ دیومالاؤں نے دیوتاؤں کو انسانی صفات سے متصف کیا۔ مذاہب نے کبھی اسے خدا سے ہمکلام کیا۔ کبھی خود خدا کا بیٹا کہا۔ کبھی خلافت و نیابت الٰہی کی مسند پر بٹھایا اور وہ مظہر کمالات الٰہی ٹھہرا۔

جو کچھ کہ سنا تجھ میں، سو انسان میں دیکھا

تمام مخلوقات میں اگر کوئی ایجاد و اختراع، اختیار و تخلیق پر قادر ہے تو انسان! دوسری تمام موجودات کیا بے جان اور کیا جاندار اس کے آلۂ کار ہیں۔ اس کی تکمیل ذات اور اظہار ذات کے وسائل ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی محیر العقول ترقیوں نے اسے ستاروں کی گزرگاہوں کا مسافر بنایا۔ مذہب نے تسخیر کائنات کے جس منصب پر اسے فائز کیا تھا اس کی تکمیل سائنسی انکشافات، ایجادات نے کی۔ اسی خود اظہاریت نے نئے فلسفوں کی زبان سے کہلوایا۔ کہ انسان نہ صرف اپنے ماحول، سماج اور معاشرتی اداروں کا خالق ہے بلکہ وہ اپنا خالق بھی آپ ہی ہے۔ وہ زماں کی تخلیقی قوت ہے۔ مذہب اور فلسفے کے ساتھ ہم آہنگ ہوئے تو یہ [illegible] نعرۂ شاعر

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم

خدا پرست انسان اپنی تخلیقیت کو خالق کل، [illegible] مطلق کے مقابل پیش کر کے داد طلب ہوا۔ کائنات میں اگر کچھ ہے تو انسان ہے، معنی ہیں تو انسان ہے، موحد ہے تو انسان ہے۔ یعنی انسان خود اپنا ہی [illegible] ہے۔ کلی تمدنی اسی کا معیار ہے۔ قبل سقراط فلسفیوں سے [illegible] تاریخی مادیت، انسانیت تک کا سفر عظمت انسانی کے تصور کے تدریجی ارتقا کا سفر ہے۔ لیکن اس سفر میں کئی سخت مقام آتے ہیں۔ جہاں اس تصور عظمت کو ٹھیس لگی ہے۔

وہی انسانی عقل جو اسے الوہیت کا مظہر قرار دے رہی تھی ایک مرحلے پہ کیا دیکھتی ہے کہ زمین بے کراں [illegible] میں ایک بے مقدار ذرہ ہے اور کچھ نہیں۔ یہ [illegible] شمسی کے مرکز سورج کے اطراف مسلسل رقص کر رہی ہے۔ خود نظام شمسی کہکشانی نظام کا ایک بہت [illegible] اور کہکشانی نظام ان گنت نظام ہائے شمسی پر [illegible]

کہکشاں ایسی کائناتوں میں سے صرف ایک چھوٹی سی کائنات ہے۔ اور یہ کائناتیں مسلسل پھیلتے ہوئے مکان میں حد تخیل سے بھی ماورا، روشنی کے سفر کے برسوں حساب سے بھی، آگے تک بکھری ہوئی ہیں ـــــ نیوٹن کو یہ احساس ہوا تھا کہ اس کا سارا علم اس بچے سے زیادہ نہیں جو ساحل سمندر پر سے چند ریگ ذرے اٹھا لیا ہو۔ کائنات کے لاانتہار پھیلاؤ میں زمین ریت کے ذرے سے بھی کم وقعت ہے۔ اس پر دو پیروں سے چلنے والا جانور کس طرح مرکز کائنات ہو سکتا ہے۔ کہیں سارے کا سارا تصور انسانی محض خود فریبی تو نہیں۔ شعبدہ کار داہمے کا کھیل تو نہیں۔؟

فلسفہ و نشابت اور پھر عمرانیاتی علوم نے انسانی شخصیت کے مختلف داخلی اور خارجی پہلوؤں کی چھان بین کی تو پتہ چلا کہ انسان جس انسان کو اب تک جانتا رہا ہے وہ آدھی ادھوری نقاب ہے۔ فرائڈ نے انکشاف کیا کہ وہ شعور جس پر ہزاروں سے انسان نازاں رہا ہے۔ سمندر میں ڈوبے ہوئے ہمالیہ سے بھی کئی گنا بلند پہاڑ کی چوٹی کا صرف اوپری کونا ہے۔ نیچے بے شمار خواہشات، جبلی تحریکات، ناکردہ گناہوں کی حسرتیں دبی پڑی ہیں۔ اقبال نے ایک کمزور جذباتی لمحے میں لکھا تھا کہ "میرا ذہن سانپوں سے بھری ہوئی پٹاری ہے" فرائڈ نے ہر ذہن کو ایسی پٹاری بناد یا مگر اس کی تھاہ وہ بھی نہ پا سکا ـــــ لاشعور کائنات کی بے انتہا وسعتوں کی طرح لامتناہی ہے۔ وہ جو اب تک مرکز کائنات تھا خارج میں پھیلی ہوئی کائنات کے ایک بے مقدار ذرے سے چھٹے ہوئے اربوں افراد میں سے ایک تھا۔ اور وہ جو اپنی عقل اور وجدان سے نظام موجودات کی تسخیر کرنے چلا تھا۔ اپنے ذہن کی وسعتوں اور گہرائیوں سے جب ناآشنا نکلا۔ اب پوچھئے کہ وہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کے اندر اور باہر کائناتیں ہی کائناتیں ہیں۔

انسانی ذہن کی بے کرانی کے انکشافات نے مکان کی ناقابل پیمائش، لامتناہیت کی تھوڑی سی تلافی ضرور کرائی ـــــ ہمارے باہر کائنات بے کراں ہے تو ہو۔ ہم بھی اپنے اندر بے کراں ہیں۔

مذہب نے تو انسان کو خدا کی نامکمل شبیہ بنایا تھا مادیت نے تیور باخ سے کہلوایا کہ معاملہ الٹا ہے۔ انسان نے اپنی خامیوں کے بالمقابل ایک لامحدود ذات سے منسوب کیا۔ اس طرح اس نے خود اپنے تصور کی توسیع کی۔ اور جب یہ توسیع لامتناہیت اور مطلقیت کی حدوں تک پہنچ گئی تو اس ذات کو جو اس کی صفات کلی تکمیلی کا مثالی اظہار تھی، خدا کہا ـــــ اور اس خدا سے اپنے کو "اشرف المخلوقات" کہلوایا ـــــ دوسری انسان اس سے اتنا خوف زدہ اور مبہوت ہوا کہ اپنا رشتہ اس سے توڑ کر آزاد اور خود مکتفی بننے لگا۔ اس پورے عمل میں وہ اپنا اثبات کیا کرتا، خود بیگانہ اور کائنات بیگانہ ہی نہیں۔ خود بیگانہ بھی ہو گیا۔

انسان کی خود بیگانگی کے عمل میں اس کی عقل کے تمام ہتھیاروں نے ہاتھ بٹایا۔ حیاتیاتی، طبعیاتی، اور سماجیاتی سائنسوں نے اس کی ذات کو پارہ پارہ کر کے خوردبینوں کے نیچے رکھ دیا۔ تسخیر خلا کی دوربینوں نے ماورائے کہکشاں کائناتوں پر نظر جمائی۔ تو اسے کہیں انسان نظر ہی نہیں آیا ـــــ یہ پارہ پارہ معدوم وجود اب از سر نو اپنی تلاش کر رہا ہے۔ اپنا ریزہ ریزہ چن رہا ہے۔ اپنا پارہ پارہ وجود یکجا کر رہا ہے۔ اپنے نامعلوم لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے۔ اپنے بنائے سیاسی، معاشی، سماجی، تہذیبی، اداروں کی گرفت میں ایسا پھنسا ہے کہ ان سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اپنی تخلیق کی ہوئی اقدار کی لایعنیت میں ایسا گم ہے کہ

اپنے معنی کا سراغ نہیں پا سکتا۔ وہ جو کائنات کا مقصود و انتہا تھا۔ بظاہر ہستی کا مرکز و مدعا تھا۔ اپنا اور خدا کا مطلوب تھا۔ اب بے مرکز، بے محور، بے معنی، بے مقصد ذہن کا ڈھیلا ان کے ترجمان تخلیقی اظہارات میں خود کو کبھی اپنا قاتل کہتا ہے کبھی اپنا مقتول بتاتا ہے۔

فکری عروج کے رجائی فلسفوں سے خود ناشناسی کے قنوطی نظریوں تک اتنے نشیب و فراز ہیں کہ کسی جگہ کوئی لائبنز کہتا ہے "یہ ہماری دنیا تمام ممکنہ دنیاؤں میں بہترین دنیا ہے"، کہیں قریب ہی کھڑا والٹیئر اس کا مذاق اڑاتا ہے حادثات، امراض، انسانی قانون، کے ساختہ مظالم کے نقوش کھینچ کر بار بار زہرخند کے ساتھ پوچھتا ہے یہی دنیا، جو بہترین دنیا ہے تو بدترین دنیا کیا ہوگی۔؟ کہیں گیلیلیو دور افتادہ ستاروں کو دیکھ کر جھومتا ہے تو کہیں یہی سائنس داں کلیسا کے محکمہ احتساب کے سامنے دو زانو ہو کر اپنی تحقیق کو جھوٹ قرار دیتا ہے۔ تہذیب اور علم، عقل اور سائنس کی ترقی نے خوشی سے موت کا جام پینے والے سقراط کو اپنی دریافت کی ہوئی صداقتوں کی تکذیب پر یوں مجبور کیا۔ اسی نشیب و فراز کے پر پیچ راستے میں شہر اروسو، انسان کو زنجیروں سے آزاد ہونے کا درس دیتا ہے۔ تو قریب ہی اس کے درس پر عامل انقلاب آفریں افراد اپنے لئے نئی زنجیریں ڈال لیتے ہیں۔ ایک طبقے کی آزادی دوسرے کی غلامی ہے۔ ایک موڑ پر کارل مارکس غیر طبقاتی نظام کا خواب دکھاتا ہے۔ مگر اس کے لئے جو راہ تجویز کرتا ہے وہ طبقاتی منافرت و کشاکش کی راہ ہے۔ اصلاحات کی تحریکیں، انقلابوں کے سیلاب، اس پیچ و خم میں حباب کی طرح ابھرتے اور اپنے آپ میں ڈوب جاتے ہیں۔ مشرق کی روحانیت مغرب کی مادیت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ اور کہیں اپنے تشخص کی خاطر آزادی کی جنگیں لڑتی ہے کبھی مغرب کی مادیت و سائنسیت کے حملے سے اور کبھی اپنی بازیافتہ روحانی قوت سے حملہ آور رہتی ہے۔ مشرق و مغرب کی کشمکش کا عنوان بدلتا ہے۔ تو شمال و جنوب کے معاشی امتیاز کا چہرہ سامنے آتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام آزادی کا نام لیوا ہے، اشتراکیت، آمریت محنت کشوں کی نقیب ——— کون آمر ہے۔ کون آزاد کرنے والا؟ کون مختار ہے۔ کون محکوم؟ کون غلام ہے کون آزاد؟ زمین کے سینے سے پھوٹ بہنے والا سیاہ سیال زر آزادی کا سیل ہے۔ یا خود گرفتاری کی پیچ در پیچ زنجیر؟ معاشی امدادی ترقی پذیر ممالک کے ساتھ تعاون ہے یا انہیں رہن رکھنے کا نیا طریقہ؟ اتنے سوالات ہیں اور ان کے اتنے جوابات کہ سوالات جوابات کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ اور جوابات اپنے آپ سے دست گریباں ہیں ——— سوالوں کی اس اٹوٹ زنجیر میں بستہ انسان اپنے ہی جوابوں کے حصار میں گرفتار خود اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔

بیسویں صدی دو عظیم جنگوں کے جنون سے جل کر تپ کر اپنے دوش پر کروڑوں لاشیں اٹھائے جب سرد جنگ کی اعصاب آزما منزل پر پہنچی تو ایک آواز آئی زندگی لایعنی ہے۔ پھر اسی آواز نے کہا آزادی انسان کا مقدر ہے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے ——— آزادی تمام موجودات میں صرف انسانی وجود کا جوہر ہے۔ اس لئے وہ اپنی زندگی ہی کے معنی متعین نہیں کرتا۔ کائنات کو بھی معنویت بخشتا ہے ——— اس مژدۂ جانفزا نے ساتھ ہی یہ بھی سنا دیا کہ انسان اپنے ساختہ اداروں میں گم ہے۔ اس کا وجود کائنات کی لامتناہی بے معنویت میں اپنے معنی سے تہی ہو چکا ہے اس کی آزادی جو خلاقیت ہے، عدم سے پھوٹی ہے عدم کے مترادف ہے۔ اور ہر نظام سیاست میں آج معدوم ہے تمام فنون لطیفہ اس آزادی کی تلاش میں چل پڑے

[illegible] موسیقی، شاعری، رقص، ناول، افسانہ، ہر فن لطیف لبلن عدم میں آزادی کو تلاش کر رہا ہے۔ لفظوں [illegible] میں گم معانی کھوج رہا ہے۔ بے مقصدیت کے سراب میں مقصد کا سفینہ تراش رہا ہے۔ کہ کشتی پار لگے۔

اس نئے تناظر میں انسان آج خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہے۔ اس کے اندر جو کشاکش ہے اسی کا دوسرا نام آفاق میں خیر و شر، صدق و کذب، حق و باطل، کا مسلسل معرکہ بھی ہے۔ جس نے اپنا اثبات اتنے دھوم دھام سے کیا تھا اسی نے اپنی نفی بھی اتنی ہی خشوع و خضوع سے کی۔ لیکن یہ نیا تناظر اتنا مایوس کن بھی نہیں۔ جیسا کہ بظاہر دکھائی دے رہا ہے۔ جو اپنی نفی کر سکتا ہے وہی اپنے کو پا بھی سکتا ہے۔ اپنا اثبات بھی کر سکتا ہے۔ سیکڑوں سال سے لا کے سراب میں بھٹکنے والا انسان جلد یا بدیر اِلّا کہہ کر پھر اپنا بھی اقرار کرے گا۔ کائنات کا بھی، اور تمام موجودات کی خالق و مختار طاقت کا بھی، اور اس طاقت کا سرچشمہ انسان کی یہ نئی خود آگہی ہوگی۔ معنی کی گمشدگی کا احساس ہی نئے معنی کی تلاش کا دیباچہ ہے اور آزادی سے محرومی کا عرفان ہی حصول آزادی کا زینہ ہے۔

ہم اور ہمارے عہد کے مفکر، قلم کار، سائنس داں فن کار اسی زینے پر کھڑے وہ دیباچہ لکھ رہے ہیں۔ جس کے بعد نئے انسان کی فتوحات کا صحیفہ شروع ہوتا ہے

بقیہ: افسانہ گھر

[illegible]اری پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میرے بچوں کے ساتھ [illegible] کھیل کھیلا گیا۔ جو اس گھر کے حصول کے وقت [illegible] تھا۔ لیکن ان کے خون سے ایک بار پھر ہاتھ میں [illegible] پائی تھی۔ انہیں دوبارہ گھر سے بے گھر اور تباہ

گیا

وہ برباد کر کے فٹ پاتھ پر چھوڑ دیا گیا۔

ٹھیک اس رفیق کی طرح۔ لیکن رفیق شاید اپنی مرضی سے فٹ پاتھ پر آیا تھا جبکہ مجھے زبردستی فٹ پاتھ پر دھکیل دیا گیا تھا۔ اور ظلم کی انتہا یہ کی گئی کہ فٹ پاتھ سے نہ صرف زمین و آسمان چھین لئے گئے۔ بلکہ اس پر تہمتیں بھی دھر دی گئی ہیں۔ جبکہ رفیق اس معاملہ میں خوش نصیب واقع ہوا ہے۔ لیکن مجھے رفیق سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ کیونکہ اب ہم دونوں ایک ہی راستے کے دو مسافر ہیں اور شاید اس مسافت کی یکجائی نے ہمیں ایک دوسرے سے بہت ہی قریب کر ڈالا ہے۔ اتنا قریب کہ وہ جب بھی دکھائی دیا تو میں اس کی طرف یوں کھنچی جیسے پھول خوشبو کی طرف یا خوشبو پھول کی طرف۔

اس روز بھی میں اسے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جب ایک ننھی سی بچی اس کی میلی کچیلی قمیض کا دامن پکڑے بڑی اپنائیت کے ساتھ اس سے پوچھ رہی تھی

اے رفیق تے رہے ہے کہاں رے، تیرا گھر کہاں ہے؟۔

رفیق ہیں ہیں ہیں ہیں کر رہا تھا۔ لیکن میں ایک ٹک اس ننھی بچی کو گھور رہی تھی۔ اور پھر کئی صدیاں بیت گئیں۔ وہ معصوم چہرہ کب کا میری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ لیکن میں اب بھی اپنی میلی کچیلی ساڑی کا دامن پھیلائے یہی سوچ رہی ہوں کہ وہ بچی ایک دن میرے پاس بھی آئے گی اور ٹھیک رفیق کی طرح مجھ سے بھی پوچھے گی۔

اے بوڑھی تے رہے ہے کہاں رے، تیرا گھر کہاں ہے۔؟

محمد اسد اللہ (اردو)

انشائیہ ۔ چند باتیں

ابتدا میں ہمارے یہاں انشائیہ کی حیثیت اس ہاتھی کی سی تھی ۔ جس کے متعلق چار اندھے مختلف قیاس آرائیوں میں مبتلا تھے ۔ گذشتہ ربع صدی میں یہ پورا ہاتھی پاکستان میں دریافت کر لیا گیا ہے ۔ اردو میں انشائیوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ اور جتنے اعلیٰ قسم کے انشائیوں کی تخلیق پچھلے چند سالوں میں ہوئی ہے ۔ اس سے اس نو وارد صنف کو استحکام حاصل ہوا ہے ۔ انشائیہ کے گرد بکھری دھند بہت حد تک چھٹ چکی ہے ۔ اس کے باوجود انشائیہ کی بحث ہنوز جاری ہے ۔ اب بھی انشائیہ کے متعلق بہت سوں کے ذہن اور بقول ڈاکٹر وزیر آغا شاید دل بھی صاف نہیں ہے ۔ ہندوستان میں آ کر انشائیہ کی کھیر اور بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے ۔ اس لئے کہ عموماً یہاں صحیح معنوں میں انشائیے نہیں لکھا جا رہا ہے ۔ نیز اس کی شناخت اور اس کے فروغ کی کوششیں مباحث کی حد تک کیوں نہ ہو مفقود ہے ۔ حالانکہ بیشتر رسائل میں انشائیہ کے عنوان سے مہینہ دو مہینے میں ایک آدھ مضمون ضرور نظر آتا ہے اسی طرح ہندوستان کے واحد مزاحیہ رسالہ "شگوفہ" حیدرآباد میں کمال مہارت (انشائیے) اس عنوان تلے ہر ماہ پانچ سات مزاحیے چھپتے ہی ہیں ۔ مگر ایسے چراغ تلے اندھیرا سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ کیونکہ عموماً یہ تمام طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہی ہوتے ہیں ۔ کبھی کبھی یکتا انشائیے چھپتے بھی ہیں ۔ تو یہ امپورٹیڈ مال (مال مسروقہ) (ڈائجسٹ) کے خانہ میں الگ باندھ کر رکھا جاتا ہے ۔

بہتر ہوگا اگر انشائیہ سے متعلق غلط فہمیوں کا تذکرہ فضیل جعفری کے اس اقتباس سے شروع کیا جائے :

> "جس طرح ۲۵ برس پہلے تک ادبی گالم گلوچ کے لئے رجعت پسند اور زوال آمادہ جیسے کلیشز بنا لئے گئے تھے ۔ بالکل ویسے ہی ان دنوں انشائیہ کی اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے ۔ یعنی جس سے ناراض ہوئے اسے رجعت پسند وغیرہ نہ کہہ کر انشائیہ نگار کہہ دیا ۔ حساب بے باق ہو گیا ۔ چنانچہ ترقی پسند کیمپ کے نئے کورٹ کیپر مشکور حسین یاد عسکری کے مضامین کو اگر انشائیہ کہتے ہیں ۔ تو ادھر ممتاز جدید نقاد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے مضامین کو انشائیہ کہنا پسند کرتے ہیں اسی طرح ایک طرف سرکش ادیب باقر مہدی کرشن چندر کے افسانوں کو انشائیہ سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ تو لسانی تنقید کے ایک سرگرم و کھیل ڈاکٹر مغنی تبسم وارث علوی کے مضامین کو انشائیہ گردانتے ہیں" [1]

کسی کو اس کے اصل مرتبہ سے نیچے پٹخ دینا گالی ہے

[1] ۔ جدید تنقید مسائل اور تجزیہ ۔ فضیل جعفری
مطبوعہ جواز ۔ مالی گاؤں ۷۹ء

بجائے یہ کہیے کہ فلاں بہت ہی گھٹیا یا بکواس لکھتا ہے۔ لیکن انشائیہ نگار کہہ دینا ادائے مطلب کے لئے کافی سمجھا گیا۔ انشائیہ کو اس کے اس مروج مفہوم سے اوپر اٹھا کر اس کا صحیح مقام متعین کرنے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ چونکہ سرسید اور کرشن چندر ملک پطرس سے رشید احمد صدیقی تک تمام مزاح نگاروں کو انشائیہ نگار مانا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا انشائیہ کی علیحدہ شناخت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب جو مزاح نگار ہے وہ انشائیہ نگار بھی ہے۔ لیکن اس ایک آدمی (مزاح) کو دو ناموں کی ضرورت کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کا میدان الگ الگ ہے۔ یہ غلطی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ انشائیہ کو ایک طرز نگارش کے طور پر قبول کیا گیا۔ اس لحاظ سے انشائیہ کے خدوخال ہیں افسانہ ڈرامہ، خاکہ، تنقید، خطوط، ناول، سوانح، وغیرہ دیگر اصناف میں بھی نظر آتے ہیں۔ اور ان ہی خدوخال کو سرسید اور کرشن چندر کی تحریروں میں دیکھ کر ان پر انشائیہ نگار کا لیبل لگا دیا گیا۔ یہ لوگ انشائیہ نگار نہیں ہیں۔ سرسید نے انگریزی ESSEY کو اردو قالب میں ضمن و خوبی پیش کیا۔ ان کا مضمون "امید کی خوشی" انشائیہ سے قریب تھا۔ انشائیہ کے متعلق غلط فہمیاں بھی انشائیہ ہی کی طرح IMPORTED ہیں۔ چنانچہ انور سدید لکھتے ہیں:

مغرب میں ایسے (ESSEY) کی کوئی بے لوچ RIGID تعریف ابھی تک وضع نہیں ہو سکی۔ اور ایسے کے جو مجموعے بازار میں دستیاب ہیں ان میں انکشاف ذات سے لے کر افسانہ خاکہ، سوانح، تنقید، سیاست اور فلسفہ غرض کہ ہر موضوع پر مضامین شامل ملتے ہیں۔ اردو انشائیہ کی بحث بھی کچھ اسی انداز میں گڈمڈ ہوتی ہے۔ انشائیہ کے اہم ترین نقاد ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کو انگریزی ایسے کی اس نوع سے عبارت کرتے ہیں۔ جسے (PERSONAL ESSEY) کا عنوان دیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ انشائیہ کو انکشاف ذات کا ذریعہ اور دیکھنے کا ایک تیکھا زاویہ تصور کرتے ہیں۔ اور شگفتہ بیانی کو اس کا قیمتی جز قرار دیتے ہیں"[1]

پاکستان میں انشائیہ ایک علیحدہ صنف کی حیثیت سے لکھا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے مضامین میں اسی انشائیہ کے خدوخال اور اس کی حدود کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے انشائیہ کی یہ تعریف پیش کی ہے:

"انشائیہ اس مضمون کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے"[2]

ڈاکٹر وزیر آغا صحیح معنوں میں اردو کے اولین

---

[1] ۔ اردو انشائیہ، انور سدید، مطبوعہ ذکر اس پری وش کا
[2] ۔ دوسرا کنارا۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔

انشائیہ نگار ہیں جن کی رہنمائی میں انشائیہ نگاری پاکستان میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ وزیر آغا اور سجاد نقوی کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ اوراق لاہور نے انشائیہ کو سب سے زیادہ فروغ دیا۔ نیز نئے انشائیہ نگاروں کو متعارف کرایا۔ اردو انشائیہ کا یہ فروغ انشائیہ کے پودے کے مرجھائے ہوئے آبیاری کی داستان نہیں ہے۔ بلکہ یہ پودا تو ہمارے یہاں تھا ہی نہیں۔ بلکہ اس کی اصل (بیج) مختلف اصناف میں بکھری پڑی تھی۔ کہیں اس میں انکھوے لگ رہے تھے۔ (مثلاً فلک پیما ملا موزی کے یہاں) ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے رفقا کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے مغربی ادبیات کے باغات سے انشائیہ کی قلم کاٹ کر اردو کی زمین میں لگائی۔ اور اس کی مناسب نگہداشت کی۔ انشائیہ آج ایک تناور پیڑ کی شکل اختیار کر چکا ہے بقول انور سدید:

> انشائیہ اردو ادب کی نوخیز صنف
> اظہار ہے اور اردو ادب کی ایک
> الگ صنف کی حیثیت میں اس کی عمر
> بیس پچیس سال سے زیادہ نہیں [1]

آج کل پاکستان میں شب افسانہ اور شب غزل ہی کی طرح شب انشائیہ منانے کی بھی باتیں ہو رہی ہیں۔

سرحد کی بنیاد پر ہندوستانی یا پاکستانی کہہ کر انشائیہ کو تقسیم کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں مجبوری یہ ہے کہ پاکستان میں انشائیہ کے خد و خال کے تعین کے بعد اسے ایک صنف کی حیثیت سے قبول کیا جا چکا ہے۔ انشائیہ اور مزاحیہ الگ الگ پہچانا جاتا ہے اور انشائیہ نگاری ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی ہے۔

[1] ۔ اردو انشائیہ ۔ انور سدید

لیکن ہندوستان میں ستم ظریفی ہے کہ یہاں صحیح معنوں میں انشائیہ نہیں لکھا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود انشائیہ کے عنوان سے متعدد تحریریں ہمارے رسائل میں ہر ماہ شائع ہوتی ہے۔ میرے علم کے مطابق پاکستان میں لکھے جانے والے انشائیوں کے خطوط اور مزاج و معیار پر ہندوستان میں تین ادیب انشائیہ لکھ رہے ہیں۔ احمد جمال پاشا، ولیم لعل ناصوی، اور محمد اسد اللہ۔ ادر لوگوں کے انشائیے اوراق اور تخلیق وغیرہ رسائل میں شائع بھی ہو رہے ہیں البتہ ان کی مزاحیہ تحریریں بھی ہندوستان میں انشائیہ ہی کے عنوان سے شائع ہو رہی ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بھارت میں انشائیہ کی پہچان نہیں ہو سکی۔

اب آگے ہم اپنے یہاں شائع ہونے والے ان انشائیوں پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔ ESSEY کو ڈاکٹر جانسن نے بے قاعدہ کمپوزیشن اور غیر منظم ٹکڑا کہا ہے [2]

> "A LOOSE SALLY OF THE MIND AN IRRE-
> -GULAR INDIGESITED PIECE, NOT A REG-
> ULAR AND ORDERLY COMPOSITION"

انشائیہ کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہوتی۔ انشائیہ افسانہ کی شکل میں لکھا جا سکتا ہے۔ بقول وزیر آغا:

> بعض اوقات افسانوی پیرائے کو بھی انشائیہ نے اختیار کیا ہے۔ (مثلاً

[2] ۔ دوسرا کنارہ ۔ وزیر آغا۔

ایک

(ورجینا وولف کا ڈیتھ آف دی موتھ)
مگر اس طور کہ وہ افسانہ نہیں بنا بلکہ
بنیادی طور پر انشائیہ کے مزاج ہی کا
حامل رہا[1]

یہ انشائیے جسے ہم اوراق برانڈ انشائیہ بھی کہہ سکتے ہیں بجائے اپنی ظاہری ہئیت کے اپنی داخلی ہئیت اور مزاج سے پہچانا جاتا ہے۔ اور یہی چیز اس کی شناخت میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

انشائیہ کی پرکھ کے سلسلے میں اس داخلی
ہئیت کا ادراک بہت ضروری ہے۔
افسوس کی بات ہے کہ لوگ باگ زیادہ
تر انشائیہ کی خارجی ہئیت کے سلسلے
میں ایک دوسرے سے متصادم دیکھے گئے
ہیں۔ انشائیہ کو پہچاننے کی کوشش
انہوں نے بہت کم کی ہے۔ حالانکہ جس
طرح ہم ہزاروں اشعار میں غزل کے شعر
کو فی الفور پہچان لیتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں
اس قابل بھی ہونا چاہیے کہ ہم طنزیہ، مزاحیہ
مضامین اخباری کالموں اور اب جو
مضمونوں کے ڈھیر میں سے انشائیہ کو
پہچان کر الگ کر سکیں۔ اور پھر دوسروں
کو دکھا سکیں[2]

ہم اپنے انشائیہ سے نام نہاد اسپیل پر نظر ڈالیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ذہن میں انشائیہ کے کچھ مخصوص امیجز (IMAGES) ہیں۔ جو اوراق برانڈ انشائیہ سے قطعی مختلف ہیں۔ اس قدر کہ ہم اسے انشائیہ ہی تسلیم نہ کریں

---

[1] دوسرا کنارا۔ وزیر آغا۔ [2] ایضاً

گیا

میرے ایک دوست نے سرحد پار کا ایک انشائیہ پڑھا تو کہنے لگا یہ کوئی انشائیہ ہے اس میں تو طنز و مزاح کچھ بھی نہیں۔ انشائیہ سے متعلق ہمارے تصورات و توقعات کی وضاحت سے پہلے میں چند مضامین کی نشاندہی کر دوں جو پچھلے دنوں انشائیہ کی حیثیت سے شائع ہوئے۔ اور انہیں کے پس منظر میں ہم بات کو آگے بڑھائیں گے۔

مسئلہ۔ (آج کل) رام لال نابھوی) خط، ہوا خوری (تحریک، آہنگ) شرون کمار ورما۔ داد دینے کے طریقے، (شگوفہ) مسیح انجم، کرسی نامہ، دشمنی (شگوفہ) صفدر نثار میں تیری گلوں پر۔ پان (شاعر، تیر) شیخ رحمن اکولوی ٹیچر، (شاعر) خالد اکا سکر۔ کھٹملے (شگوفہ) عاشق شاہ جونکے، طوطے۔ (الفاظ، تحریک) محمد اسد اللہ وغیرہ وغیرہ

اس قسم کے بہت سے مضامین ہیں جو انشائیہ کی حیثیت سے شائع ہوئے۔ جن کے مطالعہ سے سرسری طور پہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے یہاں انشائیہ سے مراد وہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ہے۔ جو غیر رسمی انداز میں کہیں سے بھی شروع ہو سکتا ہے۔ اس میں کہانی پن سے عموماً گریز پایا جاتا ہے۔ عام طور پر اس کا ایک موضوع ہوتا ہے۔ لیکن فن کار تخیل اور سوچ کی آوارہ گردی موضوع کی قید کو خاطر میں لائے بغیر راستے میں ملنے والی ہر چیز سے اٹکھیلیاں کرتی جاتی ہے۔ یہ عمل انتہائی بے معنی، معمولی اور بے فائدہ ہے۔ لیکن انشائیہ نگار بے معنی اور معمولی اشیاء سے ہی گہری معنویت برآمد کرتا ہے۔ ایک دو شخصی واقعات ہوتے ہیں جو مضمون میں بتاشے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ شگفتہ انداز بیان اور آپ بیتی و جگ بیتی کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ اس دوران انشائیہ نگار کو مضحکہ خیزیوں اور طنز کے مواقع کی تلاش رہتی ہے جیسے وہ کسی ایک موضوع پر پرکار رکھ کر اس کے گرد دائرہ کھینچتا،

جس میں اس کے تخیل کی آزادانہ اڑان ملک، سماج، سیاست قوم، ادب غرض قلم کی زد میں جو بھی آجائے اسے اس دائرہ میں سمیٹ لیتی ہے۔ موضوع کا چھوتا پن اور TREATMENT کا انوکھا پن ان مضامین کی خصوصیت ہے۔ موضوع کے گرد چکر لگاتے ہوئے مصنف نے اپنے اطراف کے ماحول، سیاست، سماج، انسانیت کی تجربات پر مشاہدہ کی سرچ لائٹ کچھ اس طرح چمکاتا ہے اور مضمون میں ماحول کی منظر کشی کے لیے آئینوں کو کچھ اس طرح SET کرتا ہے کہ ہم ان آئینوں میں نظر آنے والے مضحکہ خیز مناظر کو دیکھ کر بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں۔

ہمارے یہاں انشائیے کے نام پر جو مضامین سامنے آرہے ہیں ان میں ایک بات یہ بھی مشترک ہے کہ یہ کار کے دائرے میں موضوع کے ایسے گوشے سمیٹنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ جو مضحکہ خیز اور قہقہوں کو جنم دینے والے ہوں نہ ہوں لیکن انوکھے اور ذہن کو جھٹکے دینے والے ضرور ہوں دوسری طرف اس کے نتیجے میں یہ شکایت سنائی دے رہی ہے۔ کہ ہمارے مزاح پاروں اور انشائیوں سے ہنسی غائب ہوتی جا رہی ہے۔

میرے خیال میں یہی وہ اسٹیج ہے جہاں ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کو "انشائیہ" کا نام دیا جا رہا کہ یعنی انشائیہ سے مراد ہم وہ مضمون لیتے ہیں جس میں شگفتگی سوچ و فکر کے عناصر ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہوں کہ بجائے نان اسٹاپ قہقہے لگا کر بات اڑا لینے کے ذہن کو کچھ ایسے لطیف جھٹکے دیئے جائیں کہ قاری لطیف حیرانی کی خوشگوار سوچے بھی، اور مسکرائے بھی۔ ان مضامین میں کہیں کہیں تو طنز کی نشتریت تو ملتی ہے۔ مگر لگتا ہے مزاح کا دم نکلا ہوا ہے جیسا کچھ اس وقت ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ان طنزیہ و مزاحیہ انشائیوں میں

بڑھتی ہوئی سوچ اور محسوسات کی فراوانی جس کے اظہار کا بہترین میدان "اوراق" برانڈ انشائیہ ہو سکتا ہے کہیں طنز و مزاح کے مشہور ہوا کر مکر تو نہیں رہا ہے؟ اور اسی سے خود ان کے نظام میں گڑبڑی پیدا ہو رہی ہے؟

مزاح میں عموماً خیال کی ایک سمت ہوتی ہے۔ جو دو غیر مطابق اور غیر مماثل اشیا کے درمیان کا فاصلہ اس زاویہ سے قطع کرتی ہے۔ کہ سمت کے آخر میں قہقہہ کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ انشائیہ میں سوچ میں رگوں میں خون کی طرح رواں دواں رہتی ہے۔

ہندوستان میں لکھے جانے والے ان انشائیوں کی وضاحت کے بعد ہم انشائیہ کی ان خصوصیات پر بھی نظر ڈالیں۔ جس کی وجہ سے "اوراق" انشائیہ۔ اوراق برانڈ انشائیہ سے جدا ہوتا ہے۔ اوراق سے انشائیہ و طنزیہ مضامین کو "لکم دینکم ولی الدین" کہہ کر اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی شکل میں پائے جانے والے ہمارے انشائیے صرف ان معنوں میں انشائیہ ہیں کہ ان میں طرز تحریر STYLE یعنی بدن تو انشائیوں کا ہے لیکن روح انشائیوں کی نہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے دوسرا کنارہ کے اقتباس میں یہ بات گزر چکی ہے کہ انشائیہ خارجی ہیئت کی بہ نسبت داخلی ہیئت کا زیادہ پابند ہے

ایک مرتبہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ابن انشا سے پوچھا کہ آپ انشائیہ کیوں نہیں لکھتے۔ جبکہ وہ آپ کے نام سے منسوب ہے۔ ابن انشا نے جواب دیا کہ میں اشیا و مظاہر کے مضحکہ خیز پہلو دیکھتا ہوں تو مزاح لکھتا ہوں۔ جب مخفی پہلو دیکھوں گا تو انشائیہ بھی لکھوں گا۔

انشائیہ کی تعریف پہلے بھی یہ بات گزر چکی ہے

گیا

[illegible] کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور گرفت [illegible] کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر [illegible] ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا [illegible]

(ب) اسی کے ساتھ اسلوب کی تازہ کاری بھی شرط ہے جیسے ہم زبان کو تخلیقی سطح پر برتنے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں مردہ سوچ، احساس، اور زبان کو ایک نئی زندگی دینے کا تصور خود لفظ "انشائیہ" سے آشکار ہے

تیسری اہم چیز انکشاف ذات کا عمل ہے۔ جس سے مخفی مفاہیم کا گرفت میں لینا، انسانی شعور کے نئے مدار کا وجود میں آنا، اور اسلوب کی تازہ کاری کچھ اس طرح منسلک ہیں۔ گویا انکشاف ذات کا عمل ایک توانائی کا سرچشمہ ہے جس سے پورا انشائیہ، پھیلنے پھولنے اور لہرانے لگتا ہے۔ موضوع کے گرد انشائیہ نگار پرکار تو یہاں بھی گھماتا ہے۔ لیکن یہاں مزاح کی طرح جو ہنسی کھنچنے بھی کا ذریعہ رہنا ضروری نہیں۔ یہاں انشائیہ نگار موضوع کے اندر ایک پراسرار دروازہ تلاش کر لیتا ہے۔ اور جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ہم یہ دیکھ کر حیرت اور مسرت میں ڈوبتے جاتے ہیں۔ کہ یہ دروازہ تو خود اس کی ذات کے محل میں کھلتا ہے۔ اور اسی عمل میں یہ بھی کہ اس پر انکشاف کے نت نئے دریچے وا ہونے لگتے ہیں جہاں سے وہ کائنات کے مظاہر پر تجسس بھری نظر دوڑاتا ہے اور اس عمل کے دوران دنیا اور خود اس کی ذات پہلے سے الگ اور دلکش ہو چکی ہوتی ہے۔ انشائیہ ہمیں اس خوشگوار الہامی تجربہ میں شریک کرتا ہے۔ جو انشائیہ نگار کی ذات پر گذرا۔ طنز و مزاح ہماری طبیعتوں کو گدگدا کر ہمارے احساس کی سطح پر ہنسی اور تبسم کے دائرے بکھیر دیتا ہے جبکہ ایک اچھا انشائیہ ہمیں بہت اندر تک گدگدا

دیتا ہے۔

انشائیہ کے یہ خواص جو دراصل انشائیہ کی روح سے عبارت ہیں۔ اور اصل چیز وہی ہے کہ انشائیہ کی کوئی ظاہری ہیئت سے متعین نہیں۔ لہٰذا اس بنیاد پر انشائیہ ایک ایسا نازک آبگینہ ثابت ہوتا ہے۔ جو ذرا سی ٹھیس سے چور چور ہو جاتا ہے۔ یا کچھ اور ہو جاتا ہے سوچ، مزاح، شگفتگی، فلسفیانہ یا حکیمانہ انداز نظر یہ سب اور دیگر چیزیں انشائیہ میں CHEMICALS کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان کی موجودگی کے باوجود ان میں عدم توازن کی وجہ سے انشائیہ کا پورا ڈھانچہ بگڑ جاتا ہے۔

ہم مذکورہ بالا ہندوستانی انشائیوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ان میں انشائیے کے چند خواص ہیں مگر عجیب و غریب شکل میں۔ انکشاف ذات کی جگہ آپ بیتی ایک دو مزاحیہ، واقعات، اسلوب کی تازہ کاری کی جگہ شوخی زبان، انسانی شعور کی توسیع کی جگہ طنز و مزاح کے لئے صورت حال کی بوالعجبیاں دریافت کرنا، ان بنیادوں پر طنزیہ مزاحیہ وجود میں آ سکتا ہے۔ کہ ان کا میدان خارجی مظاہر ہیں۔ داخلیت میں تو یہ دونوں بجھ کے مر جائیں گے۔ یا فلسفی، یا قنوطی، یا شاعر ہو جائیں گے۔ مگر انشائیہ کا یہ کمال ہے کہ وہ داخلیت اور خارجیت دونوں بحر و بر میں آمد و رفت کرتا ہے۔ اس کے باوجود شگفتگی اس کے ہاتھ سے نہیں جاتی۔ وہ فلسفی کی طرح سوچتا ہے۔ مگر قنوطی نہیں ہوتا۔ مذکورہ بالا انشائیوں کو ہم ڈھیر ڈھیر اوراق برانڈ انشائیہ کی طرح پیش قدمی کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔

یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ کیا انشائیہ اور طنز و مزاح متضاد چیزیں ہیں۔ ؟ ایسا نہیں ہے۔

انشائیہ میں مزاح شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ پاکستانی انشائیہ نگاروں میں ایک بڑے انشائیہ نگار غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں میں وافر مقدار میں مزاح موجود ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ وزیر آغا، انور سدید، سلیم آغا قزلباش، جمیل آذر احمد جمال پاشا، رام لعل نابھوی، طارق بشیر، سلیمان بٹ وغیرہ کے انشائیوں میں مزاح کی چاشنی موجود ہوتی ہے۔

پہلے پہل جبکہ مزاح کو دوسرے درجے کا ادب سمجھا جاتا تھا۔ انشائیہ کو تھرڈ کلاس خیال کیا گیا۔ لیکن اب جب انشائیہ ایک توانا صنف کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے لگتا ہے کچھ لوگ مزاح کو انشائیہ سے گھٹیا سمجھنے لگے ہیں۔ یہ دونوں رجحانات غلط ہیں۔ طنز و مزاح اپنے میدان میں ایک معزز صنف ہے، پطرس، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، فکر تونسوی، اور مجتبیٰ حسین اور دیگر مزاح نگاروں کی ادبی اہمیت سے کوئی سر پھرا ہی انکار کر سکتا ہے۔ ہمارے طنز و مزاحیہ انشائیے اگر طنزیہ و مزاحیہ کے نام سے جانے جاتے ہیں تو کیا برائی ہے۔ وہ مزاجاً بنیادی طور پر ان خواص کے حامل ہیں۔ اور انشائیہ کے نام سے ایک نوخیز صنف اردو ادب میں ابھر رہی ہے جس کی عمر بقول انور سدید بمشکل پچیس سال سے زیادہ نہیں۔ اگر ایک صنف کی حیثیت سے اپنے خد و خال کے تعین کے بعد اگر یہ اپنی منزل کی طرف قدم بڑھا رہی ہے تو پھر ہم انشائیہ کو طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مترادف معنی میں استعمال کر کے الجھن کو کیوں راہ دیں؟

محض انشائیہ کا لیبل لگا دینے سے ہمارے طنزیہ و مزاحیہ ادب کا معیار بلند ہونے سے رہا۔ اس کے برعکس انشائیہ کو ہم نوخیز صنف کی حیثیت سے قبول کر کے پاکستان ہی کی طرح ہندوستان میں بھی ترقی دیں۔ تو یہ کوشش اردو ادب کا سرمایہ اور نکھار بن کر رہے گی کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کے متعلق لکھا ہے:

> اردو زبان صدیوں کے سفر کے بعد اب اس قابل ہوئی ہے کہ اس نازک پیمانہ کو استعمال کر سکے۔ اور پھر کیا عجب ہے کہ کل یہی نازک پیمانہ اس کی آبرو بھی قرار پائے۔[1] ●

بقیہ:۔ جوش ملیح آبادی

وجود میں آجائے گی۔ اور نظم کسان کی اثر انگیزی میں کوئی کمی بھی پیدا نہ ہوگی۔ چونکہ نظم کے فن کی اہم ترین خصوصیت "وحدت تاثر" ہے اور "بیل" کی تعریف پر مشتمل بند کو حذف کر دینے سے نظم کسان کی وحدت تاثر میں کمی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لئے اس نظم میں جوش کا فن کمزور ہے

بہرحال جوش کی شاعری جو مختلف عناصر اور متضاد رجحانات کی نشاندہی کرتی ہے اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اہمیت اور وقعت کی حامل ہے ●

[1] اداریہ اوراق بہار نمبر

نسترین ممتاز نصیر

جوش ملیح آبادی کی شاعری کے چند اہم پہلو

جدید اردو شاعری کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ دو شاعروں یعنی جوش اور فراق کا نام سر فہرست ہے۔ اردو کے جدید شاعروں میں جوش کو ایک خاص مقام اور اہمیت اس لئے حاصل ہے کہ انہوں نے اس فن میں بعض اہم اضافے کئے۔ اور موضوعات اور مضامین کے تنوع اور رنگا رنگی سے اس کے میدان کو وسعت دے کر نئے امکانات کی نشاندہی کی۔ ان کی شاعری کے موضوعات کا دائرہ اتنا ہی وسیع اور رنگا رنگ ہے جتنی کہ خود کائنات ان کے یہاں عشقیہ، منظریہ، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور طربیہ ہر قسم کی شاعری موجود ہے۔ موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے ان کا اسلوب بھی مختلف النوع ہے۔ کہیں شکوہ و جلال ہے تو کہیں سادگی اور سلاست، کہیں تلخی اور درشتی ہے تو کہیں نرمی اور شیرینی کہیں سرشاری اور مستی ہے۔ تو کہیں سنجیدگی و متانت، جوش کی قوت مشاہدہ اتنی توانا اور ان کے حواس خمسہ اتنے ذکی ہیں کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی اور باریک سے باریک شے کو بھی دیکھنے اور محسوس کر لینے پر قادر ہیں۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

> جوش کی شاعری میں ایک عجیب و غریب آنکھ ملتی ہے۔ جو ہر چیز کو دیکھتی رہتی ہے دور ہو یا نزدیک، اہم ہو یا غیر اہم، خوب صورت ہو یا بد صورت، یہ آنکھ کبھی بند نہیں ہوتی۔

جوش کی یہی وہ عجیب و غریب آنکھ ہے۔ جو ان کی دو ظاہری آنکھوں سے زیادہ دور بین اور باریک بین ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ ہر چیز کی تہہ میں اتر کر اس کی تمام جزئیات و تفصیلات کو معلوم کر لیتے ہیں۔ جوش کی شاعری میں حیات انسانی کے تمام مسائل، جذبات و احساسات اور افکار و خیالات یکجا ہو گئے ہیں۔ اور ان سب کے برتاؤ اور اظہار پر انہوں نے یکساں قدرت

ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان کے یہاں جذباتی اور رومانی شاعری بھی ہے۔ اور حقیقت و واقعیت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی شاعری سیاسی بھی ہے۔ اخلاقی بھی ہے۔ اور سماجی بھی۔ وہ ہر چیز کی منظر کشی اتنی تفصیل سے اور اتنے دلآویز اور موثر پیرائے میں کرتے ہیں کہ ان کی شاعری کو بلاشبہ غیر منقسم ہندوستان کا تہذیبی مرقع کہا جا سکتا ہے۔ بقول مجتبیٰ حسین :

"ادب اگر تہذیب و معاشرت کا آئینہ دار اور نافذ ہوتا ہے تو جوش صاحب کی شاعری اس کی ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے۔"

موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں :

"پورے ہندوستان کو اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے جوش کی شاعری ہمارے ادب میں اہرام مصر کی طرح کھڑی ہوئی ہے۔"

جوش کے لئے یہ دشواری تھی کہ وہ ایک ایسے زمانے میں اپنے لئے راستہ ہموار کریں جب اقبال کو ہندوستان کے طول و عرض میں شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ اور وہ بھی کوئی معمولی شہرت نہ تھی۔ ان کی حیثیت شاعر کے بجائے مسلمانوں کے قومی و ملی لیڈر کے ہوتی جا رہی تھی یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ "روح ادب" کی اشاعت کے فوراً بعد ہی اردو شاعری میں جوش کا منفرد لہجہ جگہ پا چکا تھا...... اگر اقبال روایت پرست یا کلاسیکی شعرا کے مقلد ہوتے تو جوش کے لئے کوئی دشواری نہ تھی۔ لیکن اقبال جدید ترین رجحانات کے امام شاعر تھے۔ ایسی صورت میں جوش نے اقبال سے الگ راہ نہ نکالی ہوتی تو ان کے لئے شاعری میں مستقل جگہ ہرگز پیدا ہوتی۔"

جوش نے اپنی تخلیقی قوتوں کے اظہار کے لئے نظم گوئی کا انتخاب کیا۔ اور اس میں نئی جہتوں کے موجد بھی ہوئے۔ مگر غزل کے روایتی موضوعات اور مضامین سے خود کو علاحدہ نہ کر سکے۔ البتہ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ انہوں نے موضوعات غزل کو محض زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے نہیں برتا بلکہ ان میں اپنی شدت جذبات طبعی تخیل، اور وسعت مشاہدہ سے وہ جان ڈال دی جو عصر حاضر کے بہت کم شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

جوش کی شاعری کے محبوب موضوعات حسن و عشق ہیں۔ وہ حسن کے شیدائی ہیں۔ اور حسن خواہ عورت کا ہو یا فطرت کا۔ اس سے ہر حال میں متاثر ہوتے ہیں وہ فطرتاً رنگین مزاج اور رعنائی پسند بھی ہیں۔ اور یہ رنگینیاں اور رعنائیاں کہیں بھی ہوں، کیسی بھی ہوں۔ ان کو زندگی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ حسن فطرت کی بہ نسبت حسن عورت کی اثر پذیری کے معاملے میں زیادہ ذکی الحس واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ جمال خوباں کی جزئیات کو وہ اتنی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ کہ نہ صرف عورت کا سراپا نگاہوں میں پھر جاتا ہے۔ بلکہ بھرپور نسوانی شباب کا ذائقہ تیز تنفس کی حدت رگوں میں سرایت کرتے ہوئے محسوس ہونے لگتی ہے ———— چنانچہ جوش کی مشہور نظم "جنگل کی شہزادی" کا شمار بھی اسی قسم کی نظموں میں ہونا چاہئے۔ اس میں انہوں نے ایک پیکر حسن و لطافت کے بھرپور شباب کی تصویر

مجھے ملانے والے انداز میں کھینچی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی ایک اور مشہور نظم "کیا گل بدنی ہے" کے چند بند مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ؎

سینے پہ یہ پلو ہے کہ اک موج حبابی،
ماتھا ہے کہ اک صبح کا پرتو ہے شہابی
آنکھیں ہیں کہ بہکے ہوئے دو مست شرابی
پیکر ہے کہ انساں کے سانچے میں گلابی
گیسو ہیں کہ گل بار ہوئی مشک ختنی ہے
کیا گل بدنی، کیا گل بدنی، کیا گل بدنی ہے

عشوے ہیں کہ اک فوج کھڑی لوٹ رہی ہے
چل بل ہے کہ چھاتی کو زمیں کوٹ رہی ہے
انگڑائی کا خم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے
مکھڑا ہے کہ پربت پہ کرن پھوٹ رہی ہے
قامت ہے کہ برنائی سرو چمنی ہے۔
کیا گل بدنی، کیا گل بدنی، کیا گل بدنی ہے

جوش کی شاعری میں لذتیت، لطف اندوزی اور جنسی ترغیب بھی ہے۔ یہ تمام چیزیں شباب کا تقاضا ہیں حسن کی دلکشی اپنی جگہ مسلم ہے لیکن جب حسن پر شباب چھا جاتا ہے تو دیکھنے والا بے اختیار جنسی کشش محسوس کرتا ہے۔ حسن و شباب کے امتزاج کی یہی وہ اہمیت ہے کہ جوش کی شاعری میں حسن کا بیان شباب کے بغیر نہیں ملتا جوش کی شاعری دراصل حسن کے پردے میں شباب اور عشق کی آڑ میں کشش کی ترجمان ہے۔ جس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے ؎

اس سن میں بھی پڑتی ہیں حسینوں پہ نگاہیں
کم سن کے لئے اب بھی جوانی کی ہیں راہیں
اب بھی یہ تمنا ہے ملیں پھول سی بانہیں
اصنام کو ضد ہے کہ ہم جوش رہا ہیں۔

گھنٹی میں پڑی عاشقی و برہمنی ہے۔
کیا گل بدنی، کیا گل بدنی، کیا گل بدنی ہے

جوش کی عشقیہ شاعری رسمی اور روایتی نہیں۔ بلکہ حقائق پر مبنی ہے۔ ان کی بہترین مثال ان نظموں میں ملتی ہے — گنگا گھاٹ پر، تیسرے لے، شام رخصت جنگل کی شاہزادی۔ عشق کا امکان وغیرہ۔

حسن فطرت کے مختلف پہلوؤں کو جوش مختلف انداز میں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ وہ ان تمام پہلوؤں کو دیکھنے اور چھونے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ اور ہر حسین مناظر سے پیدا ہونے والی کیفیات کو پوری تفصیل سے محاکات کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی منظریہ شاعری پر انگریزی کے جن رومان پرست شعرا کا اثر پڑا ہے، ان میں ورڈس ورتھ کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے۔ جوش نے مناظر فطرت کے مختلف دلکش پہلوؤں پر جو نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں۔ برسات کا شفق، برسات کی پہلی گھٹا، شام اور اس کی بزم آرائیاں، بھری برسات کی روح، بدلی کا چاند، چاندنی، البیلی صبح، جلوہ صبح جامن والیاں، مالن، دہقانی، رنگین رات کا پچھلا پہر، ربودگی اور گم شدگی کی کیفیت کو ظاہر کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی ہیں — نمونہ کے طور پر مختلف نظموں سے یہاں چند بند درج کیے جاتے ہیں۔

؎

مجھے سنگھاتی ہے روح پرور ہوا میں اس وقت بوئے قدرت
شمیم گلشن ہنوز ہوتی ہے بند غنچوں کے پیرہن میں
سفید ہلکی سی چاندنی میں بلند ہوتے ہیں میرے نغمے
چٹکنے والی تمام کلیاں خموش ہوتی ہیں جب چمن میں

جھٹپٹا ہونے لگا، تاریکیاں چھانے لگیں
بدلیاں جنگل میں اک وحشت سی برسانے لگیں
وہ کلی جھلکی، وہ برسا رنگ، وہ پھوٹی کرن
ہنس کے وہ انگڑائی لی دریا نے بہکنے کیلئے

آہ! اے فطرت تیری برنائیوں کے سامنے
بہترین الفاظ ہو جاتے ہیں شرمسار
حسن تیرا ذوقِ گویائی کے سی دیتا ہے لب
سر جھکاتا ہے مرے ذوقِ بیاں کا افتخار
تیرا دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتا نہیں
آدمی محسوس کر سکتا ہے، کہہ سکتا نہیں

جوش کی منظریہ شاعری کا تعلق خالص ہندوستانی فضا سے ہے۔ ان کے یہاں مشاہدے کی جو باریکی اور تشبیہات واستعارات میں جو ندرت ہے۔ اسی نے انہیں ایک بڑا منظر نگار بنا دیا ہے۔ جب وہ کسی چیز کا منظر کھینچتے ہیں۔ تو نہ صرف اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے حسن کی تمام جاذبیت کو اپنی آنکھوں میں جذب کر لیتے ہیں۔ اس غیر معمولی جذباتی وابستگی کی وجہ سے ان کی منظریہ شاعری اور بھی حسین اور دلکش ہو جاتی ہے البتہ جہاں کہیں بھی انہوں نے مناظرِ فطرت میں سیاسی رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں وہ بقول ڈاکٹر مسعود حسین "پیغمبر فطرت نہ بن سکے"

جوش کی قوت مشاہدہ اور دقیق النظری نے ان کو جذبات انسانی کے تمام چھوٹے بڑے پہلوؤں کو سمجھنے میں بھرپور مدد دی ہے۔ انہوں نے انسانی نفسیات کے ایسے پہلو بھی بڑی مہارت اور کامیابی کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ جن پر عام نظر نہیں جاتی۔ ان کی اس قبیل کی نظمیں، پرانی تصویر، بہن کی یاد، ماں جائے کی یاد، کو نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ نظمیں ہیں جن میں "عقل و جذبہ" کی مسلسل آویزش ہے۔ اور بالآخر مفکر جوش شاعر جوش سے شکست دے دیتا ہے۔ جوش اپنی ان نظموں میں طبعًا جذباتی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں منطقی استدلال اور غور و فکر کے عنصر کی کمی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جذباتی آہنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

جوش کی شاعری کی جس سبب سے اہم خصوصیت پر اب تک زور دیا جاتا رہا ہے۔ وہ یہ کہ ان کے یہاں الفاظ کی جادوگری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جوش کو اپنے ہم عصروں میں "الفاظ کے بادشاہ" کی حیثیت حاصل ہے اور الفاظ ان کے سامنے صف بہ صف ہاتھ باندھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ الفاظ ان کے حکم کے نہیں بلکہ چشم و ابرو کی جنبش کے منتظر رہتے ہیں۔ اور اشارہ پاتے ہی اس جگہ جاکر فٹ ہو جاتے ہیں۔ جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ الفاظ کی اسی کثرت اور مترادفات کی فراوانی کی وجہ سے ان کی شاعری میں بڑی تیزی اور سلاست ہے۔ ان کو انتخاب الفاظ پر ملکہ حاصل ہے۔ وہ لفظوں کو نظموں میں نگینے کی طرح جڑ دیتے ہیں ——— لیکن جوش کی یہی نمایاں خصوصیت ان کے فن کو کمزور بھی کر دیتی ہے۔ وہ انتخاب الفاظ میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان کے افکار و خیالات کی رو بہک جاتی ہے۔ وہ نفس مضمون پر کم اور الفاظ کے بناؤ سنگھار پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ مثلاً نظم کسان میں کسان کی عظمت و بلندی کے ضمن میں جہاں جوش نے ان کی بدحالی اور مفلوک الحالی، اور جفاکشی کا منظر کھینچا ہے۔ وہاں "بیل" کی تعریف میں ایک طویل بند بھی لکھ دیا ہے۔ اگر اس بند کو نظم کسان سے علاحدہ کر دیا جائے تو "بیل" کے عنوان سے ایک مستقل علاحدہ نظم

ممتاز احمد خان (پاکستان)

خدا کی لاٹھی

ایک چھوٹے سے جنگل جسے پانچوں بھائی نے نے مل کر سنوارا تھا۔ اچانک لغزشوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اور اپنی لغزشوں میں وہ اس قدر آگے بڑھ گئے کہ پاگل بن گئے۔ اور اپنی متحدہ شناخت کھو بیٹھے۔ اور ہر وقت دست و گریباں رہنے لگے۔

جب ایک طویل عرصے بعد بوڑھے پاگل نمبر ایک نے کہ جو ہمیشہ اپنی لاٹھی مضبوط کے دم پر باقی چاروں کو دبائے رکھتا تھا۔ اپنی لال لال لٹو جیسی آنکھوں سے ان سب کو دیکھا تو وہ سہم گئے۔ شکل و صورت، حسب و نسب، اور سماجی لحاظ سے پہلے چار پاگل ایک دوسرے سے بڑی مناسبت رکھتے تھے۔ تاہم پانچوں پاگل رنگ و روپ قد و قامت اور رہن سہن میں ان سے کمتر تھا۔ چونکہ جنگل کے حصول اور اس کے سنوارنے میں ان کا ان سب سے زیادہ حصہ تھا۔ اس لئے وہ اسے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور تھے۔ لیکن بوڑھے پاگل کی کالی گفتار اور لاٹھی کی وجہ سے وہ سخت مصیبت میں مبتلا تھا۔ پھر اس کی مصیبت دوچند اس وجہ سے بھی ہو گئی تھی کہ اس کے بقیہ تین ساتھی بھی بوڑھے پاگل سے خوفزدہ خوفزدہ سے رہتے تھے۔ اور اس کے خلاف بغاوت کرنے سے عاجز تھے۔

انہوں نے جنگل میں پانچ حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر ایک کے حصے میں پیمائش کے اعتبار سے مختلف رقبے آئے تھے۔ اتفاق سے پانچویں پاگل نے اپنے وسیع و عریض جثے کی وجہ سے زیادہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ جنگل کی سرداری اسے دی جائے۔ جب کہ گھوم پھر کر سرداری پہلے پاگل ہی کے پاس رہتی تھی ــــــ اس لئے کہ لاٹھی اس کے پاس تھی۔ اور بقیہ چاروں کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ اس کی لاٹھی کو توڑ سکے۔

کافی دیر سہمے رہنے کے بعد آخر کار پانچویں پاگل نے جرأت کا دامن تھاما اور حسب معمول اپنی نا آسودگیوں کا گلہ کرنے لگا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ اگر اسے سرداری دے دی جائے تو اس کے تمام تردد اور مصائب دور ہو جائیں گے۔

بوڑھے پاگل نمبر ایک نے دانت پیسے اور بولا۔ "کوتاہ قد کمینے پھر تو نے اپنا پرانا راگ گانا شروع کر دیا۔ کاش کہ میں جنگل بستے وقت تجھے قتل کر دیتا۔"

دوسرے پاگل نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم جمہوری اسپرٹ سے کام لیں۔"

تیسرے نے بھی ہمت کی۔ "بہتر ہے کہ ہم سرداری کے مسئلے کو حل کر لیں۔"

چوتھا ذرا اونچی آواز میں کہنے لگا۔ " وقت آگیا ہے
ہم قیادت کے مسئلے کو حل کر کے آپس میں پیار و محبت
سے رہیں۔ جس طرح کہ ہم اپنے باپ کی زندگی میں رہتے تھے
اچانک سب نے باپ کی تصویر کی طرف دیکھا۔
ان سب کے سامنے لٹکی ہوئی تھی۔ پانچویں پاگل نے اپنی
جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ اس پر جو عبارت تھی وہ سونے
کے پانی سے لکھی گئی تھی۔

کیا ہے یہ؟ پانچویں نے پوچھا۔

ہمارے باپ کے آدرش ـــــ اگر ہم ان پر عمل
کریں تو ہماری غائب شدہ محبتیں واپس آسکتی ہیں۔

بوڑھے پاگل نے کچھ لمحوں کے واسطے آنکھیں موندلیں
تھوڑی دیر بعد وہ گویا ہوا۔

چلو ٹھیک ہے آج سرداری کا مسئلہ حل کر لیا جائے
حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے اپنی
سرداری سے تم سب کو کافی فائدے پہونچائے ہیں۔

پانچواں پاگل ذرا سختی سے بولا۔ برادر ـــــ تو نے
ہمیں ہمیشہ راتب کھلایا مگر بھونکنے نہیں دیا۔ اور کبھی اگر ہم
نے بھونکے تو تو نے پابند سلاسل کر دیا۔

تین دوسرے پاگلوں نے بھی سر ہلایا۔ جیسے کہ اس
کی تائید کر رہے ہوں۔

بوڑھے پاگل نے ان سب کو کھا جانے والے انداز
سے دیکھا اور اپنے فیصلے کا اعلان کیا۔

ٹھیک ہے آج یہ فیصلہ ہو جانا چاہیئے کہ قیادت
کا حق کسے حاصل ہے تاکہ یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو۔

بقیہ چاروں پاگل اس قدر جذباتی ہوئے کہ بوڑھے
پاگل سے پہلے تو کئی کئی بار معانقہ کیا اور پھر مستقل اس
کے ہاتھ چومنے لگے۔ ادھر بوڑھے پاگل کے چہرے پر ایک
عجیب مسکراہٹ رقصاں تھی۔

اچانک دوسرا پاگل بولا۔ پہلے یہ طے کیا جائے کہ ہم
کس طریقہ کار کے تحت اپنا سردار منتخب کریں۔

تیسرا کہنے لگا یہ کون سی مشکل بات ہے؟ پچھم
والوں کا طریقہ کار اگر ہم اختیار کریں۔ تو ہم اپنا سردار منتخب
کر سکتے ہیں۔

دوسرے پاگل نے تجویز پیش کی، ہمیں پورب کا طریقہ کار
اختیار کرنا چاہیئے۔

چوتھا پاگل جو اب تک خاموش بیٹھا تھا کہنے لگا
پورب میں اکثر ملکوں پر جبر، دھونس اور زبردستی کی سرداریاں
قائم ہیں۔ کیا تم کو اس کا احساس ہے؟

اب وہ طریقۂ انتخاب پر گرما گرم بحث میں ملوث
ہو گئے۔ اس طرح کہ جنگل میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی
تھی۔ یوں ان کی کج بحثی کے نتیجے میں کئی سال بیت گئے۔ انہوں
نے ایک دوسرے کے جسموں پر اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے کھرونچے
ڈال دیئے۔ پھر وہ جب اس صورت حال سے تنگ آگئے
تو انہوں نے بیک وقت اپنی اپنی زبانوں کو لگام دی۔
اور یہ طے کیا کہ پچھم والوں کا طریقہ پورب والوں کے طریقے
سے افضل ہے۔ بوڑھا پاگل جو اب تک مزے سے سرداری
کے مزے لوٹ رہا تھا کہنے لگا۔

تم سب ایک ایک پرچے پر اپنے پسندیدہ شخص کا نام
لکھ لاؤ۔ پھر میں سب پرچیاں پڑھ کر فیصلے کا اعلان کروں گا
ـــــ مگر ایک بات سوچ لو۔

وہ کیا؟

یہ وہ یہ کہ قدرت نے یہ لاٹھی مجھے عطا کی ہے اور
اس کی طاقت کا تمہیں گزشتہ کئی برسوں میں اندازہ ہو چکا ہے

باقی چار پاگل تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے

پھر پانچواں پاگل بولا۔ بڑے بھائی ـــــ یہ پرچی بھی تو
ایک لاٹھی ہے۔

بوڑھے پاگل کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ اس نے ذرا بھر کر اسے ڈانٹ پلائی۔ اور اپنی پرچی کو گھور گھور کر دیکھنے لگا پھر وہ زوردار لہجے میں بولا۔ میں تم سب کے سامنے اپنی پرچی میں اپنا نام درج کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر اس نے پرچی پر اپنا نام درج کر دیا۔ اور پرچی سب کے درمیان رکھ دی۔ اچانک ہوا کا تیز جھونکا آیا اور پرچی کو اڑا کر لے گیا۔ بوڑھے پاگل کا چہرہ ایک لمحے کو فق ہوا۔ پھر وہ اپنی خفت مٹانے کے لئے مسکرایا اور بولا۔ کوئی بات نہیں ہم اول سردار، آخر سردار۔

اس کے بھائیوں نے اس کی بات سنی اور اپنی اپنی پرچی پر اپنے اپنے کونوں میں جا کر اپنی پسند کے شخص کا نام درج کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے پرچیاں لا کر بوڑھے پاگل کو دیدیں۔ جس نے سب کو پڑھا اور اپنے فیصلے کا اعلان کیا۔

اکثریت کی رائے کے مطابق اب سرداری کا حق پانچویں بھائی کو حاصل ہے۔

یہ کہہ کر بوڑھا پاگل خاموش ہو گیا۔ باقی چاروں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اور ہاتھ کانپنے لگے ہیں۔

اسی اثنا میں باقی چاروں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دینا اور معانقہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے بیچوں بیچ موتیوں اور ہیروں سے جھلملاتا ہوا تاج رکھا ہوا ہے۔

پانچویں منتخب پاگل نے تاج کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ ابھی وہ آگے بڑھ کر تاج پہننے کو ہی تھا کہ بوڑھے پاگل کی گرجدار آواز سنائی دی۔

ٹھہرو! پہلے وعدہ کرو کہ اپنی سرداری سے مجھے بھی کچھ حصہ دو گے۔

یہ ناممکن ہے میرے بھائی! میں اپنی سرداری کو تقسیم نہیں کر سکتا۔

پھر تو تو اس تاج کو نہیں پہن سکے گا۔

بوڑھے پاگل نے یہ کہا اور لاٹھی اتنی زور سے زمین پر ماری کہ پورا ماحول لرز گیا۔

پانچواں پاگل تھوڑی دیر خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔

برادر! اگر تم نے ہوش کے ناخن نہیں لئے تو ہم سب جدا ہو جائیں گے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پیار و محبت، خلوص، رواداری اور مفاہمت نے قوموں کو مستحکم کیا۔ اور جب یہ ستون گر گئے۔ تو قوموں کے جغرافیے تبدیل ہو گئے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرے اقتدار کے دوران بھی ہم متحد رہیں گے اور اور اپنے جنگل کے ہرے بھرے اور گھنے درختوں کے میٹھے پھل آپس میں بانٹ کر کھاتے۔۔۔۔۔۔

بکواس بند کرو۔

بوڑھے کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

پانچویں پاگل نے بوڑھے کے غصے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے لمبے لمبے نوکیلے ناخن اس کے جسم میں گاڑ دیئے جواب میں بوڑھے نے اپنی لاٹھی اس پر چھوڑ دی۔ باقی تین خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہے۔ اچانک جنگل کا موسم بدل گیا۔ تیز ہوا آندھی میں اور آندھی طوفان میں تبدیل ہو گئی۔ پورا منظر دھندلا گیا اور جب یہ طوفان رخصت ہوا تو ایک چیخ سنائی دی۔

ارے طوفان نے لاٹھی کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

دوسری چیخ بھی ابھری! جنگل شق ہو گیا۔

پھر متواتر کئی آوازیں ابھریں۔ جنگل شق ہو گیا۔

جنگل شق ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب انہوں نے جنگل کے پورے حصے کو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے ——— خون میں نہایا پانچواں پاگل ان سب سے سینکڑوں میل دور کھڑا وہ بھی تاج پہنے مسکرا رہا تھا۔

ایوب جوہر (بنگلہ دیش)

گھر

میں جب بھی اپنے جھروکے پر آئی اور وہ جب بھی ایک نظر دکھائی دیا۔ تو میں اس کی طرف یوں کھینچی جیسے پھول خوشبو کی طرف یا خوشبو پھول کی طرف۔

لیکن آپ اسے میرا پاگل پن کہیں گے یا مجھے بھی اس زمرے میں شامل کریں گے۔ جس سے اس کا تعلق ہے بہرحال آپ خواہ کچھ ہی سمجھیں مگر قصہ دراصل اس دیوانے کا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

"بہتر ہے نہ مارو میرے دیوانے کو"

وہ سچ مچ کا دیوانہ ہی ہے۔ لیکن اس کا نام دیوانہ نہیں۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک اسے رفیق کے نام سے یاد کرتے تھے۔ آپ کا اگر ایک آدھ بار لیوز گرام روڈ، شیخ بازار، پارٹ کھولا سے گذر ہوا ہے۔ تو آپ نے اسے یقیناً کبھی نہ کبھی دیکھا ہے۔ اور بالفرض اگر آپ ان محلوں کے ہی باسی ہیں۔ تو آپ اسے سے بخوبی شناسا بھی ہیں۔ یہ حالی وہ چھریرے لانبے قد کا کالا کلوٹا شخص ہے۔ لیکن اتنا بھی کالا نہیں کہ اس پر کسی حبشی کا گمان ہو۔ ناک ونقشہ موزوں، عمر تیس سے اوپر نہیں جسم پر عام پاگلوں کا لباس یعنی کبھی مسا س اسکن کا سوٹ زیب تن کئے ہوئے ہے۔ تو کبھی لنگی، بنیائن، اور کبھی ان تمام لغویات سے بالکل پاک لیکن ایسا میں نے کم ہی دیکھا ہے۔ کوئی نہ کوئی دیا تو اس کا ننگا جسم ڈھانک ہی دیتا ہے۔ اس لئے کم کم بچوں سے لیکر بوڑھوں تک کے رفیق تھے۔

ابھی کل ہی اسے بچے گھیرے ہوئے کھڑے تھے بوڑھے بھی پیچھے لگ گئے تھے۔ کوئی اس کی پھٹی ہوئی قمیض کھینچ رہا تھا۔ تو کوئی اس کی لنگی چھین لینا چاہ رہا تھا۔ لیکن تمام کا تقاضا یہ تھا کہ "رفیق گانا سناؤ" اور وہ ہنس رہا تھا۔ اس کی ہنسی بڑی جان لیوا ہے۔ خصوصاً میرے لئے، میں ایک لمحہ دم بخود رہ گئی۔

پھر اس نے ہنستے ہنستے گانا شروع کر دیا۔ وہ ٹھیک سے گاتا ہے۔ لیکن چونکہ مجھے اس کی ہر ادا پیاری لگتی ہے لہٰذا میں اس کے گانے میں کھوتی چلی گئی۔

وہ گا رہا تھا۔

"ہے اپنا دل آوارہ تو نہ جانے ...."

ہائے ظالم تو نے کتنی حقیقت آمیز بات کہی ہے۔ یہ آوارہ دل کی ہی تو بات ہے کہ دل آئے تو ایک پاگل پر۔ ہاں اس وقت میں پاگل ہی تھی۔ جب اسے میں نے پہلی اور آخری بار دل میں بسایا تھا وہ بھی ٹھیک اس رفیق کی طرح ہی دبلا پتلا اور لمبا تڑنگا شخص تھا۔ لیکن وہ کالا نہیں تھا۔ گورا تھا۔ اور رفیق کی طرح جاہل اور دیوانہ بھی نہیں تھا۔ بلکہ وہ انتہائی ہوش مند، باشعور اور انتہائی پڑھا لکھا شخص تھا۔ لوگ اس کے ایک اشارے پر اٹھتے بیٹھتے تھے۔ اور میں ان ہی لوگوں میں سے ایک تھی۔ لہٰذا نہ صرف اس سے متاثر ہوئی بلکہ ایک زمانہ وہ آیا کہ میں نے اسے اپنا سب کچھ بنا لیا اور جس کے صلے میں میری ماں کو زبردست زک اٹھانی پڑی۔ لاکھوں کی تعداد میں وہ بچے ماں کی تمنا پر نچھاور ہو گئے۔ در سے بے در ہوئے، لیکن ماں کی آرزو پر انہوں نے ایک آنچ نہ آنے دی۔ اور پھر وہ زمانہ بھی آیا جس گلشن کے ویرانے میں کلیوں نے

مسکان دیکھا پھولوں کے چہرے دمک اٹھے، اور سارا باغ خوشبوؤں سے لہلہا اٹھا۔

ہاں یہ وہی زمانہ تھا جب میں اپنے محبوب کے ساتھ بیاہی گئی۔ اور میکہ چھوڑ سسرال لائی گئی۔ اور یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ میں کسی عروسی لباس میں اپنے سسرال داخل نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ پھٹے پرانے کپڑوں میں سمٹی سمائی آئی تھی۔ اس لئے بھی کہ میرے میکے والے اس رشتے سے قطعی خوش نہ تھے جس کی سزا انہوں نے یہ دی کہ میں خالی ہاتھوں پھٹے پرانے کپڑوں میں اپنے سسرال جاؤں تاکہ اپنے سسرال والوں کی نظر میں عمر بھر ذلیل و خوار رہوں لیکن ان کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ میں خلاف توقع اپنے سسرال میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اس لئے بھی کہ میں خالی ہاتھوں سسرال میں ضرور داخل ہوئی تھی۔ لیکن علم و حکمت اور خلوص و محبت کی دولت سے مالا مال تھی جس کے صلے میں میرے سسرال والوں نے میرے سارے غم پونچھ دئے اور مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔

میں بہت مگن تھی۔ کیونکہ مجھے وہ سب کچھ مل چکا تھا۔ جس کی مجھے تمنا تھی۔ یعنی ایک عورت کی سب سے بڑی خواہش ایک گھر اور گھر والے کی محبت، ٹھیک اسی طرح جیسے رفیق کو محلہ مل چکا ہے۔ اور محلے والوں کی محبت۔

یہ بھی کل کی ہی بات ہے میں حسب معمول اپنے جھروکے پر کھڑی خلا میں گھور رہی تھی کہ رفیق کی ہیں ہیں کی آواز ابھری۔ اور میری نگاہ اس پر جم گئی۔

ایک ننھی سی بچی رفیق کا میلا کچیلا کرتا کا دامن پکڑے بڑی اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔

اے رفیق تے رہے ہے کہاں رے، تیرا گھر کہاں ہے؟

لیکن رفیق بدستور ہیں ہیں ہیں کر رہا تھا۔ مجھے اس پر غصہ آیا۔ اور رشک بھی۔ غصہ اس لئے کہ وہ بد اخلاقی کی ثبوت دے رہا تھا۔ جبکہ بچی بڑی اپنائیت سے اس سے پوچھ رہی تھی۔ اور رشک اس لئے......

لیکن یہ میرا پاگل پن ہی تھا کہ میں ایک پاگل سے خلیق ہونے کی توقع کر رہی تھی۔ کبھی کبھی جب میرے خیالات ذہن کی بھٹی میں سلگتے ہیں تو مجھے اپنے پاگل پن پر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔

اس روز بھی میں اپنے آپ پر ہنس رہی تھی۔ جب پہلی دفعہ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں اس گھر میں اکیلی نہیں ہوں بلکہ میرا نباہ پانچ سوکنوں کے ساتھ ہے۔ جو پہلے سے ہی اس گھر پر قابض ہیں۔ اور یہ بھید کبھی نہ کھلتا اگر میرے گھر والے نے ٹ‍کری بیگم کو دل نہ دیا ہوتا۔ دراصل میرے گھر والے سے یہ ہی پہلی اور آخری چوک ہوئی تھی جو بعد میں ایک بڑے ہنگامے کا سبب بن گئی۔ اور ہمارا سکھ چین جاتا رہا۔

بڑی بہو گھر والے کے اس چونچلے پر ایکدم جل سی گئی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گھر والے پر اس طرح جھپٹی کہ وہ ایک لمحہ ڈگمگا سا گیا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا۔ کہ اسے اس نازک لمحے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ غصے میں آگ بگولا ہوگیا۔ اور بڑی بہو کی چٹیا پکڑ کر کچھ اس طرح جھٹکا دیا کہ وہ بلبلا اٹھی۔ ظاہر ہے کہ بڑی بہو اپنی اس ہتک کو کب برداشت کرنے والی تھی وہ شیرنی کی طرح غضبناک ہوگئی۔ لیکن ازراہ مصلحت اس نے اس وقت کوئی جوابی حملہ نہیں کیا۔ بلکہ بڑی خاموشی سے زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اور اندر ہی اندر جوالا مکھی کا روپ دھارنے لگی۔

ادھر گھر والا بھی کم ہوشیار نہ تھا۔ اس نے بڑی بہو کے بدلتے ہوئے تیور کو بھانپ لیا۔ کہ وہ مرتے مرتے

لیکن لشکری بیگم کا وجود ہرگز برداشت نہیں کرے گی۔ لہذا اس نے فیصلہ کیا کہ لشکری بیگم کو بڑی بہو کے گھر سے نکال کر اسے ان چار سوکنوں کے حوالے کیا جائے۔ جو بڑی بہو کے گھر سے کافی دور پر ایک بڑی حویلی میں ایک ساتھ رہ بس رہی تھیں۔ اور جو لشکری بیگم کی رشتہ دار بھی تھیں۔ لہذا لشکری بیگم جب بڑی حویلی میں منتقل ہو گئیں تو ان چار سوکنوں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ادھر بڑی بہو قدرے مطمئن ہو گئی کہ چلو خس کم جہاں پاک.....

لیکن کہتے ہیں کہ کسی کے خلاف دل میں ایک بار میل بیٹھ جائے۔ تو وہ مشکل ہی سے صاف ہوتا ہے۔ لہذا بڑی بہو کے سلسلہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ گھر والے کے خلاف اس کے دل میں جو میل بیٹھا تو وہ صاف نہ ہو سکا۔ اسے اپنے گھر والے کے ہر کام میں عیب دکھائی دینے لگا۔ اور وہ گھر والے پر کم سے کم اعتبار کرنے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تلخی بڑھتی گئی۔ اور مفاہمت و خلوص کی دیواریں ڈھلتی گئیں۔

اور ان دو پاٹوں کے درمیان میرا کچومر نکل گیا اس لئے کہ مجھے جتنا بڑی حویلی کا خلوص حاصل تھا۔ اسی قدر چھوٹی حویلی میں بھی میری قدر و منزلت کم نہ تھی۔ لیکن اسے میری بدبختی جانیے کہ میں بڑی بہو کی نظروں میں صرف اس لئے گر گئی کہ لشکری بیگم میری سگی بہن تھی۔ اس کے باوجود کہ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ میں بڑی بہو کے ساتھ رہوں گی۔ مجھے اس کے ساتھ جینا و مرنا ہے۔ بڑی بہو نے پھر بھی مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔ اور دن بدن میں اپنی نظروں سے گرتی چلی گئی۔ مجھے اس کا احساس ہونا فطری عمل تھا۔ لہذا میں بڑی بہو سے کھنچتی گئی۔ اس لئے بھی کہ مجھے اس کا اچھی طرح احساس تھا کہ میں اس گھر میں بھگا کر نہیں لائی گئی تھی۔ بلکہ میری بہت ساری قربانیوں کے عوض مجھے ڈولی میں بٹھا کر یہاں لایا گیا تھا۔ لہذا اس گھر پر جتنا حق بڑی بہو یا دوسری سوکنوں کی ہے اتنا ہی حق میرا بھی ہے۔ پھر میں دوسری سوکنوں سے دب کر کیوں رہوں۔ اور پھر صرف دبیل ہونے کی ہی بات ہوتی تو میں کسی قدر بڑی بہو سے سمجھوتہ بھی کر لیتی۔ لیکن بڑی بہو تو ایک ایسی گھناؤنی سازش میں لگی ہوئی تھی جس کے تصور سے کانپ اٹھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ گھر والے کو اس گھر سے نکال باہر کیا جائے۔ اور کسی اور کے ساتھ دو بول پڑھوا لیا جائے۔ اس سازش میں وہ مجھے بھی شامل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن میں نے صبر سے انکار کر دیا۔ لہذا ہمارے درمیان سمجھوتے کے تمام راستے بند ہو گئے اور نفرت کی اونچی نیچی دیواریں بلند ہونے لگیں۔

اور پھر وہ زمانہ بھی آیا جب بڑی بہو گھر والے کے خلاف کھل کر سامنے آ گئی۔ کیونکہ اسے ایک طاقتور پڑوسی کی شہہ مل چکی تھی۔ اور یہ وہ پڑوسی تھا۔ جو میرے گھر والے کا پرانا حریف تھا۔ اور جس کی بڑی بہو کے ساتھ ایک عرصہ سے شناسائی بھی چل رہی تھی۔ لہذا اس نے بڑی بہو کو اپنے گھر والے کے خلاف صف آرا دیکھا۔ تو فوراً اس کی مدد کے لئے کود پڑا۔ پھر کیا چاہئے تھا اندھے کو ملیں آنکھیں بڑی بہو نے اپنی اولاد کے ذریعہ گھر میں وہ اودھم مچایا کہ توبہ ہی بھلی۔ چند ہی دنوں میں گھر والے کا جینا دوبھر ہو گیا اور بالآخر وہ ہی ہوا جو بڑی بہو کی تمنا تھی۔ یعنی گھر والے کو سب کچھ چھوڑ کر گھر سے بھاگ جانا پڑا۔ پھر تو سارے گھر میں بڑی بہو تھی۔ یا اس کا شناسا۔ یعنی ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات ہو گئی

[illegible] مجھ دکھیاری کے ساتھ جو ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ گھر والا تو بھاگ کر اپنی جان بچا [illegible]

خو

گیا

ڈاکٹر منزی

جناب علی کی عمر چالیس بیتالیس سال سے تجاوز کر چکی۔ تو امی نے بازاری لڑکیوں کا دھندہ ترک کر دیا۔ اور سینما کے احاطے میں ایک سگریٹ پان کی دوکان کھول کر بیٹھ گیا۔

جناب علی چاہتا یہ تھا کہ باقی زندگی وہ عزت و آبرو کے ساتھ گزار دے۔ کیونکہ اب اس کے اپنے بچے اور بچیاں سن بلوغ کو پہونچ چکے تھے۔ روز بروز ان کا شعور بھی بیدار ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں اگر امی کے پیشے کی حقیقت کا پتہ چل گیا تو پتہ نہیں وہ لوگ اپنے دل میں کیا سوچیں گے۔

پھر جناب علی کا خیال یہ بھی تھا کہ ان بازاری لڑکیوں کا دھندہ پہلے کے مقابلے میں کافی پراگندہ ہو گیا تھا۔ اور یہ دھندہ بھیوڑے پن کی حد تک پہونچ چکا تھا۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ شوقین صاحبوں کو کسی لڑکی کے حاصل کرنے میں کافی پاپڑ بیلنا پڑتا تھا۔ کیونکہ سب سے پہلے دلالوں سے رابطہ قائم کرتا پھر لڑکیوں کی رونمائی کا مسئلہ، پھر سودے بازی کرنا، پھر مقررہ مقام تک پہونچا کر پولس والوں کو ٹھیک ٹھاک کرنا، تب جا کر وہ شوقین عیش و نشاط کی منزل تک پہونچتا تھا مگر اب وہ بات کہاں۔ اب تو اچھی بھلی نوخیز لڑکیاں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی سڑکوں پر گزرتی ہیں۔ کہ جیسے وہ کٹی ہوئی پتنگ ہوں۔ آپ نے ہاتھ بڑھایا اور وہ دوڑتی ہوئی آپ کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اور ایسی لڑکیوں سے اسے خود بھی گھن آنے لگی تھی۔

اب نہ دلالوں سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ نہ رونمائی کا مسئلہ نہ سودا بازی کا جھمیلہ، اور نہ پولس والوں کا خوف۔ پھر ایسے میں جناب علی کا کیا کام۔ کیونکہ اس دھندے میں اس کی حیثیت تو ایک کچے دھاگے کی سی تھی۔ جس کے اور سے بندھے ہوئے اچھے بھلے شوقین چلے آتے تھے۔ اور اپنے شوق کی تکمیل کرتے تھے مگر اب پہلے جیسی بات کہاں کہ ایک روز میں وہ کئی کئی لڑکیوں کا دھندہ کرتا تھا۔ اور وہ عیش کے دن گزارتا تھا۔ لیکن ملک کے آزاد ہونے کے بعد جیسے یہ لڑکیاں خود رو پودے کی طرح روئے زمین پر اگ آئی ہوں۔ گلیوں میں، سڑکوں پر، سنیما ہال ارد گرد، ریلوے پلیٹ فارموں پر اور ہوٹلوں کے آس پاس گورئیے کی طرح پھدکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

ایسے عالم میں جناب علی کبھی کبھی اداس ہو جاتا۔ ایک طرف اس کے گھر کے اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ اس کے بچے اور بچیوں کا قد اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ ان کی ضروریات زندگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف روز بروز اس کا دھندہ مندہ ہوتا جا رہا تھا۔ کیونکہ وہ لڑکیاں جن کی بدولت جناب علی کا دھندہ چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ اور سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ اب وہ لڑکیاں دھیرے دھیرے روپوش ہوتی جا رہی تھیں۔ کسی کی عمر ڈھل چکی تھی یا کسی نے دوسرے شہر کی بود و باش اختیار کر لی تھی یا کسی نے چکلے میں جا کر پناہ لی تھی۔

ایسی صورت میں جناب علی کا ایسے دھندے سے پاؤں کا اکھڑ جانا ایک لازمی بات تھی۔ اور ایک روز وہ خود ہی ان بازاری لڑکیوں سے دست بردار ہو گیا۔

انہیں دنوں اس نے سوچا کہ چھوٹا موٹا کوئی کاروبار کرلیا جائے۔ انشاء اللہ اسی میں برکت دے گا۔ اور بڑی جدوجہد کے بعد جب اس نے بجلی سینما کے احاطے میں ایک چھوٹی سی دوکان حاصل کرلی۔ تو اس نے سوچا کہ یہ دوکان اور کچھ تو نہیں مگر سگریٹ پان کے لئے قطعی مناسب ہوسکتی ہے۔ اس میں پونجی کے مناسبت سے منافع بھی خاصہ ہوگا۔ پھر اس کے خیال میں یہ جگہ اور جگہوں کے مقابلے میں کافی پر رونق بھی تھی۔ اور لوگوں کے چہل پہل کی وجہ سے اس کا دل بھی بہلتا رہے گا۔ اور یہاں ایسے کاروبار کے چمکنے کے سارے امکانات روشن تھے۔ اس لئے وہ سگریٹ پان کی دوکان لگاکر اطمینان سے دوکان پر بیٹھ گیا۔

دکان پر بیٹھنے سے قبل اس نے سب سے پہلے دوکان کی صفائی کی۔ اور تمام ریک اور چھت کو گلابی رنگ سے پینٹ کروایا۔ پھر تمام الماری کے ریک پر اس نے صابن تیل، اسنو، پوڈر، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش، سگریٹ ماچس، اگربتی، اور زردہ وغیرہ کی ڈبیوں کو سجایا۔ اور جہاں جہاں جگہیں خالی رہ گئی تھیں۔ وہاں اس نے چند فلمی ایکٹر اور ایکٹرسوں کی شیشے میں فریم کی ہوئی تصویریں آویزاں کردیں۔ اور اپنی نشست کے سامنے چاندی کی طرح چمکتا ہوا ایک ڈالہ رکھ دیا۔ جس پر اس نے پان کی گلوریاں سجا رکھی تھیں۔ پیتل کے چمکتے ہوئے کٹورے میں ڈلی اور پیتل کے دو چمکیلے لوٹے میں کتھا اور چونا رکھے ہوئے تھا۔ اور خود چارخانے کی لنگی اور ادھی کا سفید کرتا زیب تن کرکے یوں دکان پر بیٹھا دکھائی پڑتا جیسے کسی نے اسے بھی بکنے کے لئے دکان پر سجا رکھا ہو۔

پھر چند ہی دنوں میں جناب علی کی دکان چل نکلی۔ اور دکان ایسی چلنے لگی جیسے بجلی سینما میں فلم چل رہی تھی۔

بجلی سینما والے کی دکان داری اور جناب علی کی دکانداری میں کافی مماثلت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ فلمیں دکھا کر پیسے کما رہے تھے۔ اور یہ پان کی گلوریاں بیچ کر۔ جب فلمیں اچھی ہوتیں تو ٹکٹیں کافی فروخت ہوتیں۔ اور ہال میں کافی رش ہوتا۔ اور جب ہال میں کافی رش ہوتا تو سگریٹ پان اور دوسری اشیا کی خریداری بھی وقفے کے دوران اس کی دکان پر ٹوٹ پڑتے۔ اور ایسے ہی موقع پر وہ بالکل باؤلا ہوجاتا۔ اور کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ پان کی تمام گلوریاں ایک ساتھ ہوا میں اچھال دے۔ اور گاہکوں کے دیئے پیسوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لے۔

مگر وہ دکانداری کے اس باؤلاپن میں بھی ایک لطیف سی لذت محسوس کرتا تھا۔ اور دل ہی دل میں کبھی کبھی سوچتا کہ اتنے دنوں تک وہ خواہ مخواہ ان بازاری لڑکیوں کے چکر میں پھنس کر اپنا وقت اور عاقبت دونوں تباہ کر رہا تھا۔ اگر وہ شروع ہی سے کسی کاروبار میں لگا رہتا تو آج وہ اس قدر پس ماندہ بھی نہ ہوتا۔ وہ ایک قطعہ مکان اور ایک عدد دکان کا مالک ضرور ہوتا۔ اس کے بچے اور بچیاں کسی اسکول میں پڑھ رہے ہوتے۔ ایسے گنوار اور جاہل تو نہ ہوتے کہ دکانداری میں کبھی کسی وقت اگر اس کا جی چاہا تو آکر ہاتھ بٹا دیا۔ ورنہ آوارہ کتوں کی طرح ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔

پھر اس نے ان گذری ہوئی باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اور اپنے ذہن کو کاروبار کی طرف مرکوز کر دیا۔ اور وہ اپنے کاروبار میں ایسے منہمک ہوگیا کہ دنیا کے دوسرے جھمیلوں سے بے نیاز سا ہوگیا۔

وہ صبح سویرے دکان پر آجاتا اور کبھی کبھی بھیڑ بھاڑ کے وقت اس کا بڑا لڑکا آجاتا۔ تو کچھ دیر بیٹھا رہتا۔ ورنہ رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے تک وہ خود ہی

سکتا۔ ایک رات گئے جب وہ گھر پہنچا تو تھکن سے اپنے آپ کو چور چور پاتا۔ اور دوسری صبح کافی دیر تک وہ سویا رہتا۔ اور جب نیند سے بیدار ہوتا تو اپنے آپ کو بڑا ہلکا ہی پھلکا محسوس کرتا۔ لیکن جب کبھی بھی اس کی نظر اپنی بیٹی رضیہ پر پڑتی۔ تو ایک لمحہ کے لئے فکرمند ہو جاتا۔ اور اپنے ذہن پر وہ ایک بھاری سا بوجھ محسوس کرتا۔ بیٹوں کا ذکر کیا وہ تو اس کے بڑھاپے کے سہارا تھے۔

کئی ماہ بعد ایک روز ایسا واقعہ ہوا کہ وہ دکان پر تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ کہ اس نے حسینہ کو دیکھا۔ جو ایک مرد کے ساتھ بجلی سینما کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی بالکونی میں داخل ہو گئی۔ تو اسے ایک نامعلوم مرد کے ساتھ دیکھ کر جناب علی کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ اسے خوب پہچانتا تھا ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی ابھی کچھ ہی دن پہلے اس کی ماں اسے محلے کی گلیوں میں اچھلتی کودتی ہوئی چھوڑ کر جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اور آج وہی حسینہ ایسی لہراتی بل کھاتی ہوئی اس کی نظروں کے سامنے سے گذر گئی۔ کہ اس کی آنکھیں ویکا چوند ہو گئیں۔ اور سو سو کے کئی نوٹ اس کے ذہن میں لہرا گئے۔

اس روز جناب علی ایک بار پھر گڑبڑا گیا۔ اور وہ جلدی جلدی پان پر کتھا چونا لگا کر انہیں پر ڈلی رکھ کر اور گلوریاں بنا بنا کر ڈالے پر سجاتا جا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ یہ بھی کوئی کاروبار ہے دس پیسے میں پان کی گلوریاں۔ بیس پچیس پیسے کا سگریٹ، پانچ دس پیسے کی بیڑیاں، اور ماسنو پوڈر، اگر ہتی کے خریدار گاہے گاہے آگئے تو آگئے ورنہ ان پر دھول جم رہی ہے۔ یا پھر دیمک چاٹ رہی ہے۔ اور رات کے بارہ بجے دکان بڑھا کر حساب کیجئے

تو سو پچاس روپئے سے زیادہ کی دکانداری ہوتی ہی نہیں تھی۔ بھلا ایسے میں کیا ننگی نہائے کیا نچوڑے تن تو کھلا کا کھلا ہی رہ جاتا ہے۔ اور یہ سوچتے ہوئے وہ اپنی چٹکی میں چھالی لیتا اور کتھے چونے کے لوٹے پر زور زور سے ملنے لگتا۔ جیسے وہ لوٹے کے میل کو نہیں۔ اپنی قسمت کے میل کو صاف کر رہا ہو۔

اس روز آخری فلم شو ختم ہونے کے بعد جناب علی ٹکٹکی لگائے بالکونی کی سیڑھیوں کو تکتا رہا۔ فلم بین ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ سب سے آخر وہ شخص نظر آیا۔ مگر حسینہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اور اسے یہ سمجھ میں قطعی دشواری پیش نہیں آئی کہ حسینہ آج منیجر صاحب کے بستر کی زینت بن گئی۔ اور یہ سوچتے ہوئے جناب علی کی کنپٹیاں شائیں شائیں کرنے لگیں۔

یہ منیجر نیا نیا یہاں آیا تھا۔ یہی تقریباً دو تین ماہ ہوئے تھے۔ اس سے قبل وہ ڈھاکے میں رہتا تھا۔ اس نے اس سے متعلق بہت ساری باتیں سن رکھی تھیں۔ اس نے سنا تھا کہ منیجر بڑا عیاش ہے۔ لڑکیوں کا دلدادہ تھا۔ پھر اس نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ دلالوں کو اچھی رقم چکاتا ہے۔ مگر شرط تھی کہ چیز اچھی ہو۔ ورنہ ایسی ویسی کے آگے وہ گھاس نہیں ڈالتا۔ اس نے یہ بھی سنا تھا کہ وہ شراب نہیں پیتا ہے۔ جوا نہیں کھیلتا ہے۔ بس وہ نئی نئی لڑکیوں سے اپنا جی بہلاتا ہے۔ اور اس کے لئے وہ موٹی سے موٹی رقم خرچ کرتا ہے۔

یہ ساری باتیں منیجر کا چپراسی ننھی میاں نے اسے قسطوں میں بتایا تھا۔ اور جوں جوں اس سے متعلق سنتا جاتا تھا۔ اس کی پیشانی کی شکنیں گہری ہوتی جاتی تھیں۔

اور اب کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ دکان پر

فرصت کے لمحات میں بیٹھے بیٹھے خیالوں میں گم ہو جاتا۔ اور کبھی پان کی گلوریاں بناتے ہوئے سوچتا کہ آخر وہ کب تک ان دس بیس پیسوں کے جھمیلوں میں الجھا رہے گا۔ وہ تو چاہتا یہ تھا کہ ایک ہی جست میں وہ اتنی بلندی پر پہونچ جائے کہ اگر اسے کوئی چھونا بھی چاہے تو نہیں چھو سکے۔ مگر یہ کیونکر ممکن تھا۔ اس چھوٹی سی دکان کی آمدنی سے تو وہ ترقی کے زینے پر کبھی بھی قدم نہیں رکھے گا۔ جبکہ اس کے کاندھے پر ذمہ داریوں کے بوجھ کا جوا بڑا ہی بھاری ہے۔

اور ایسے ہی خیالوں کے دوران کبھی کبھی وہ غنی میاں کی کمی شدت سے محسوس کرتا۔ گرچہ وہ جانتا تھا کہ غنی میاں بڑے بے شرم ہے۔ انہیں اپنے منیجر صاحب کے راز کی بات کسی سے نہیں کہنی چاہیے تھی۔ اور اسے بھی غنی میاں کے باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے تھا مگر وہ واقعات کو کچھ اس انداز میں نمک مرچ لگا کر بیان کرتے تھے کہ جناب علی منٹوں میں متاثر ہو جاتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ ابھی وہ دکان سے اٹھ کر باہر جائے اور کہیں سے حسینہ کو پکڑ کر منیجر صاحب کے حضور میں پیش کر دے اور ایک سو کا نوٹ مٹھیوں میں دبا کر سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے اور پھر اپنی دکان پر بیٹھ کر دکانداری میں وہ یوں مصروف ہو جائے۔ جیسے خریدار کافی دیر سے دکان پہ کھڑے ہوں۔ اور وہ بازار سے پان خرید کر ابھی لوٹا ہو۔ مگر فوراً اس نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اور اپنے دل میں سوچا۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ تجارت پھر تجارت ہے۔ دلالی پھر دلالی ہے۔ اور اس عمر میں اب وہ پیشہ اختیار کرنا بھی چاہے۔ تو اسے زیب نہیں دے گا۔ اور اگر اس بات کی خبر اس کے بچوں کو ہو جائے گی۔ یا اڑوس پڑوس کے لوگ جان جائیں گے۔ تو وہ پھر کسی کے آگے آنکھ ملا کر کھڑا بھی نہ ہو سکے گا۔ اور کسی کے سامنے سینہ تان کر مرد کی طرح بات بھی نہ کر سکے گا۔

اور ایک بار پھر وہ اپنے دھیان کو کاروبار کی طرف مائل کر دیا۔ دکان کو جھاڑ پونچھ کر ریک میں سامان کو سجاتا اور دلچسپی کے ساتھ دکان پر بیٹھنے لگا۔ دکانداری کے دوران اگر کبھی غنی میاں آ بھی جاتے تو وہ ان کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ اور غنی میاں لوٹ کر واپس چلے جاتے جیسے جناب علی کی دکان پہ پان لینے کے لئے آئے ہی نہیں ہوئے تھے۔

لیکن جب کبھی وہ رات کو دکان بڑھا کر حساب کرتے تو اسے بڑی مایوسی ہوتی۔ بھلا اتنے پیسوں میں وہ کیونکر گذر بسر کر سکتا تھا۔ جبکہ اس کے کاندھے پر ذمہ داریوں کے بوجھ کا جوا بڑا ہی بھاری تھا۔ اور ایسے ہی موقع پہ اس کے دل کا چھپا ہوا چور سامنے آ جاتا۔ اور وہ غنی میاں کی باتوں میں بڑی کشش محسوس کرنے لگتا۔ جیسے غنی میاں ہی اس کی ترقی کے راستے کا زینہ ہوں۔

اور اب جو غنی میاں اس کی دکان پر وارد ہوتے۔ تو وہ ان کے ساتھ بڑی نرمی اور ملائمت سے پیش آتا۔ انہیں پان کی گلوری اور سگریٹ پیش کرتا۔ کاروباری مسائل پر گفتگو کرتا۔ کاروبار کے نہ چلنے کا رونا روتا۔ اپنے گھر کے اخراجات کی فہرست دکھاتا۔ اور کہتا غنی بھائی اس مہنگائی کے دور میں اب عزت و آبرو کا محفوظ رکھنا بڑی مشکل ہے۔ اب اس چھوٹی سی دکان کی قلیل آمدنی کا رونا کیا روؤں۔ غنی بھائی! عالم یہ ہے کہ سر چھپاؤں تو پاؤں کھل جاتا ہے اور پاؤں چھپاؤں تو سر۔

ایسے موقع پر غنی میاں کو جناب علی پر ترس آ جاتا۔ اور وہ بڑے ہی مخلصانہ اور عالمانہ انداز میں کہتے۔ جناب علی! گرچہ تمہاری عمر کافی ہو چکی ہے۔ مگر تجربات اور مشاہدات کے دور سے ابھی نہیں گزرے ہو۔ یہ دنیا بڑی

گیا

[illegible] اور اس دنیا کے لوگ بڑے بے مروت ہیں۔ [illegible] لوگ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے [illegible] پاس پیسے ہوں۔ دولت ہو۔ اور دولت [illegible] طرح حاصل کرو۔ پھر بیوی بچے بھی خوش۔ [illegible] کے لوگ بھی ہنس کر ملیں گے۔ دوست احباب بھی آگے پیچھے رہیں گے۔ مسکین و نادار بھی فیض یاب ہونگے اور اس طرح دین بھی مستحکم، اور دنیا بھی مٹھی میں۔

غنی میاں کی ان باتوں سے جناب علی کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ غنی میاں ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ پیسے کمانے کے ہزاروں طریقے ہیں۔ لوگ پیسے دیکھتے ہیں طریقہ کار کو نہیں۔

دوسری صبح جب وہ دکان پر پہونچا۔ تو دکانداری میں اس کا جی نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار وہ غنی میاں کی باتوں پر غور کرتا۔ اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سوچتا۔ منیجر صاحب سے متعلق سنی ہوئی باتوں میں وہ ایک لطیف سی کشش محسوس کرتا۔ وہ غنی میاں سے مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ منیجر صاحب کے عادات و اطوار سے پوری طرح واقف ہو جائے۔ اور اس روز وہ سارا دن غنی میاں کے انتظار میں بے دلی سے دکانداری کرتا رہا۔

اور غنی میاں جب اس کی دکان پر آئے تو شام کا وقت تھا۔ فلم کا شو شروع ہو چکا تھا۔ دکان پر خریدار نہیں تھے۔ تو باتوں ہی باتوں میں غنی میاں نے بتایا کہ جانتے ہو کل ایک ایسی عورت آئی تھی۔ جسے میں جانتا ہوں۔ کہ وہ کئی صاحبوں کی منظور نظر رہ چکی ہے۔ مگر اس کے جسم کی مٹی ایسی ہے کہ کندن دکھائی پڑتی ہے۔ ایک شخص کے ساتھ آئی اور منیجر صاحب سے پچاس روپے وصول کر کے چلی گئی۔

جناب علی نے غنی میاں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر دلچسپی کے ساتھ اس کی باتوں کو سنتا رہا۔

پھر غنی میاں نے بتایا کہ دو چار روز پہلے ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ شاید تم نہیں جانتے ہو کہ منیجر صاحب لڑکیوں کے معاملے میں بڑے صاف ستھرے اور اعلیٰ ذوق کے مالک ہیں۔ مگر ایک روز ایک دلال ایک نہایت معمولی لڑکی کو اٹھا کر لے آیا۔ جی نہ چاہنے کے باوجود بھی منیجر صاحب اس لڑکی کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کے جسم کے مختلف عضو کو چھوا۔ اور اس دلال سے کہا کہ میاں اسے لے جاؤ۔ کوئی ایسی چیز لاؤ کہ جسے دیکھ کر روح تازہ ہو جائے۔ اور اسے انگلی کے پور سے چھوتے ہی دل کی گہرائی تک ایک برقی لہر دوڑ جائے۔ پھر بھی انہوں نے دلال کی دلجوئی کی خاطر اس کی ہتھیلی پر پچیس روپیہ تھمایا اور رخصت کر دیا۔

اس وقت بہ ظاہر جناب علی نے غنی میاں کی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں دی۔ لیکن جناب علی نے دکان پر بیٹھے بیٹھے یوں محسوس کیا۔ جیسے وہ خلاؤں میں معلق جھول رہا ہو۔ اوپر منیجر صاحب کا کمرہ اور نیچے پان کی دکان۔

پھر آہستہ آہستہ دکانداری سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ گاہکوں کے ساتھ اس کا رویہ بگڑ گیا۔ کیونکہ شروع شروع میں تیز زردے کا نشہ اور پان کی کساوٹ کا احساس ہوتا۔ وہ چاندی جیسا چمکنے والا ڈالہ جس پر وہ قرینے سے پان کی گلوریاں سجاتا تھا اب سیاہی مائل ہوتا جا رہا تھا وہ کتھے اور چونے کے کٹورے جو سونے کی طرح چمکتے تھے اور جنہیں وہ دن میں دو تین بار راکھ سے چمکاتا تھا۔ اب چونے اور کتھے سے اٹے ہوئے دکھائی پڑتے تھے۔ اور وہ جناب علی جو کبھی سفید ادھی کا کرتہ اور چارخانے کی لنگی زیب تن کر کے دکانداری کرتا تھا۔ اب وہ خالص تنبولی کا روپ دھار چکا تھا۔

ایک روز جناب علی نے بڑے سلیقے سے پان

کی چند گلوریاں بنائیں۔ ان میں خوشبو دار بھیگی پتی، شہزادہ پی قوام، اور چینی ہوئی ڈلی ڈال کر چاندی کے طبق میں لپیٹا۔ اور غنی میاں سے کہا۔

غنی بھائی میرا یہ حقیر نذرانہ اگر آپ منیجر صاحب کے حضور میں پیش کر دیں۔ تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔

جناب علی کے اندر اچانک یہ تبدیلی دیکھ کر غنی میاں دل ہی دل میں چونک پڑے۔ پان کی ان گلوریوں میں کیا راز ہو سکتا ہے۔؟ پھر اس نے سوچا کہ چلئے جناب علی کے ان پان کی گلوریوں میں کسی قسم کا راز ہی کیوں نہ ہو۔ مگر منیجر صاحب کے حضور میں پیش کر دینے میں بھلا اسے کیا عذر ہو سکتا ہے۔

دوسرے دن جب غنی میاں نے یہ خبر دی کہ منیجر صاحب نے یاد کیا ہے تو اس روز اچانک جناب علی کے اندر کا شیطان جاگ اٹھا۔ اور اسے پان کی دکان میں ایک لمحہ کے لئے بھی جی نہ لگا۔ اور نائٹ شو ختم ہونے سے پہلے ہی دکان بند کر کے وہ گھر چلا گیا۔ اور ساری رات وہ کروٹیں بدلتا رہا۔

پھر مسلسل کئی دنوں تک جناب علی اس ٹوہ میں لگا رہا کہ کہیں سے بھی اسے کوئی لڑکی ہاتھ لگ جائے۔ جو بھرپور جوان ہونے کے ساتھ ساتھ حسین و جمیل بھی ہو۔ اور تیز و طرار بھی۔ تو وہ اسے منیجر صاحب کے حضور میں نذر کر کے ایک موٹی سی رقم حاصل کر لے۔ جو وہ اپنی دکان سے مہینوں میں بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شہر کی کئی لڑکیوں کو دیکھا۔ مگر کوئی بھی نظر میں نہیں جچی۔ اس نے حسینہ کو بھی تلاش کیا۔ مگر وہ بھی کہیں نہیں ملی جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ تلاش بسیار کے باوجود بھی جب کوئی معقول لڑکی اسے نظر نہیں آئی۔ تو وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ وہ چاہتا یہ تھا کہ اگر کسی طرح ایک بار بھی منیجر صاحب سے رابطہ قائم ہو جائے تو پھر آگے کا راستہ خود ہی ہموار ہو جائے گا۔ اور پھر اس کا پرانا دھندہ اسی آب و تاب کے ساتھ چلنے لگے گا۔ پھر اس کے بیوی بچے بھی خوش، اڑوس پڑوس کے لوگ بھی ہنسی خوشی رہنے لگیں گے دوست احباب بھی آگے پیچھے رہیں گے۔ بیکس و نادار بھی فیض یاب ہوں گے اور اس طرح دین بھی مستحکم، اور دنیا بھی اس کی مٹھی میں ہوگی۔

اس خیال کے آتے ہی جناب علی کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ اور اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کرنے لگا۔ بھلا منیجر صاحب بھی کیا سمجھیں گے۔ پھر اتنی موٹی رقم اتنی آسانی سے اور کہاں سے حاصل ہو سکے گی۔ تو کاروبار بھی کر کے دیکھ چکا تھا۔ دن رات مستعدی کے ساتھ دکان پر بیٹھے رہنے کے باوجود رات کو حساب کیجئے تو سو پچاس روپے کی سے آگے کی دکانداری ہوتی ہی نہیں ہے۔ پھر یہ پرانا دھندہ۔ رات کی تاریکی کا دھندہ کسی نے دیکھا۔ کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ آخر کیا برا تھا۔

اور اس نے اپنے طور پر لڑکی کی تلاش جاری رکھی۔

پھر ایک روز وہ نائٹ شو ختم ہونے کے بعد ایک نوخیز لڑکی کو اپنے ہمراہ لئے منیجر صاحب کے چیمبر میں داخل ہوا۔ منیجر صاحب نے جناب علی کو دیکھا۔ پھر اس لڑکی کا بغور جائزہ لیا۔ اور بہت خوش ہوئے۔

اس وقت جناب علی کا دل دھڑک رہا تھا۔ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اور ذہن پر جیسے کوئی کچوکے لگا رہا تھا۔ پھر وہ دروازے سے باہر نکلا، اور کچھ دوری پر جا کر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لڑکی کے واپس لوٹ آنے تک انتظار کرنے لگا۔

صبح پو پھٹنے سے پہلے جب دروازہ کھلا۔ منیجر صاحب جناب علی کی ہتھیلی پر سو سو کے دو نوٹ رکھ کر اندر چلے گئے اور جناب علی اپنی مٹھی میں سو سو کے دو نوٹ دبائے ہوئے

بدر اورنگ آبادی

رگ سنگ

سمندر کے کنارے کا منظر بھی کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ جیسے شہر کے تمام پیاسے لوگ اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہوں۔ اور سمندر کی موجیں کناروں سے سر ٹکرا کر واپس ہو جاتی ہیں۔ کھارے پانی سے کہیں پیاس دور ہوتی ہے۔ لیکن پیاسوں کو کھارے پانی اور شیریں پانی کے فرق کا ہوش کہاں؟ حد نگاہ تک ایسا لگتا ہے جیسے زمین نے چاروں طرف سے آسمان کو جکڑ رکھا ہو۔ اور آفتاب اپنی سرخی سمندر کے کھارے پانی میں گھول کر غائب ہو جاتا ہے۔ اور ہر طرف پھیلی ہوئی ریت ٹھنڈی ہو کر پیاسوں کا بہترین فرش بن جاتی ہے۔ نرم نرم ٹھنڈی ٹھنڈی، جس سے جلن دور ہو جاتی ہے۔ احساسات دور ہو جاتی ہیں۔ اور دھواں دھواں جیسے پانی کے قطرے سے لت پت ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد جدھر بھی نگاہ اٹھتی ہے تو ناریل بکھرے پڑے ملتے ہیں۔ پانی پی لینے کے بعد پیاسوں کی بے پروائی کبھی کبھی کھٹکنے لگتی ہے۔ یہی ناریل جب اندر پانی بند کئے رہتے تو ان کے حصول کے لئے کتنے ہاتھ بڑھتے۔ اور ناریل کی نظر نہ آنے والی نگاہیں پیاسوں کو گھور گھور کر دیکھتیں ـــــ تمہیں واقعی میری ضرورت ہے؟ ـــــ نہیں نہیں تم الگ ہٹ جاؤ۔ اسے دیکھو وہ جو تمہارے مانند میں کھڑا ہے، اس کے چہرے کا کرب ذرا ان دیکھو تمہیں

گیا

ضرورت نہیں۔ صرف حرص میں پانی ہو گئے۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ آواز اسے سنائی نہیں دیتی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی وہ ہاتھ بڑھا کر ناریل لے لیتا۔ اس کا سر کتوا کر پانی پی جاتا پھر ناریل ریت پر پھینک دیتا ہے۔ جو دوسرے پیاسوں کے پیروں کے ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔ میں بھی ہر شام سمندر کے کنارے سیر کے لئے نکل جاتا۔ دن بھر گھر میں بیٹھے بیٹھے کیا کرتا۔؟ سبھی کتابوں کے اوراق تو چاٹ چکا ہوں۔ اب کوئی کتاب ہاتھ میں لیتا ہوں تو اس کے اوراق زوردار قہقہہ مار کر کہتے ہیں ـــــ اب کیا باقی رہ گیا ہے؟ ـــــ اب تو حروف بھی ماند پڑ چکے ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن کوئی بھی تو نہیں ہے گھر میں ـــــ سناٹا پر ہول سناٹا ـــــ نہ یہ سناٹا ہوتا نہ سمندر کے کنارے سیر کی ضرورت ہوتی۔ اور نہ ناریل منہ چڑھاتے۔۔۔۔۔۔ کنارے کنارے جو درخت ہیں ان کے پرے شاہراہ شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن درختوں کی چھاؤں میں ناریل ہی ناریل دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ جوڑوں کی شکل میں۔۔۔۔۔۔ یہ آپس میں ٹکراتے تو کھٹ کی آواز ہوتی بس!

لیکن میری نظریں پتھروں پر جم جاتیں۔ ایک طرف کچھ بڑے بڑے پتھروں کو دیکھتا کہ سینہ پھلائے موجوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ پتھروں کے اوپر کائی کی ہریالی ہے۔ یا زندگی کی، یہ میں نہ جان سکا۔ کون جانے ان موجوں اور ان پتھروں کے درمیان! اور دوسری طرف پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک دوسرے میں گتھے ہوئے پڑے رہتے۔ ان کی بساط ہی کیا تھی۔ پانی کے ایک ہی ریلے میں یہ سب کے سب خس و خاشاک کی مانند بہہ کر سمندر کی گود میں نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے۔۔۔۔۔۔ اور میں سوچتا کہ کچھ ازل سے تو یہ ایسے نہ ہوں گے۔ یہ بھی کبھی چٹان ہی رہے ہوں گے توانا اور زندگی سے بھرپور۔۔۔۔۔۔ لیکن سمندری طوفانوں

اور موجوں نے مل جل کر ان پتھروں کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہوگا۔ اور مسلسل رگڑتے رگڑتے ان کی زندگی بکھر رہی ہوگی اور اب وہی چٹانیں ٹوٹ پھوٹ کر یہاں وہاں پڑی ہوئی تھیں۔ سوکھے ہوئے جیسے کہ لئے، بے مقصدیت کا شکار ہو کر۔ یہ ٹکڑے وقت کاٹ رہے تھے۔ وہ تو اب اس قابل بھی نہ تھے کہ انہیں کسی پر پھینکا جائے تو کسی کو چوٹ لگے۔

لیکن میں ان پتھروں کی کہانی ان کی زبانی سننا چاہتا تھا۔ ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے سے ٹکرا دیتا اور کئی طرح کی کوششیں کیں۔ لیکن سب بے سود۔.......

میں نے آخر بہتے پانی میں ایک ٹکڑے کے منہ میں رکھ دی۔ اور اچانک ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کنوئیں کے اندر سے بول رہا ہو ـــ یہ کیا ہوا؟ کس نے منجمد پانی میں پتھر پھینک کے ہلچل مچا دی۔؟ ...... سمجھا! تم میری کہانی سننا چاہتے ہو لیکن کیا کرو گے میری کہانی سن کر...... تم جو آج کے ہو اور ہم جو پتہ نہیں کتنے پرانے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کروڑوں سال پرانے ہوں ...... ہم پر سفیدی ہی سفیدی تھی۔ اور ہم اپنے سر اٹھاتے تو آسمان ہماری طرف جھکتا نظر آتا۔ اور روئی کے گالوں جیسا غلاف ہمارے چاروں طرف پھیل جاتا ...... نرم نرم ...... اور صبح گام ہوگا۔ ہمارے سینے اتنے چوڑے تھے کہ ان کی پیمائش کے لئے ہزاروں جشن کئے جاتے۔ اور لوگ اپنی جان پر کھیل کر بھی یہ کام کرنے کو بے قرار رہتے۔ لیکن اچانک ......
تم سو رہے ہو ـــ ٹھیک ہی ہے کیا کرو گے سن کر ...... لیکن تمہیں سننا ہی تھا تو کیوں تم نے ہمیں نیند سے جگا دیا کیا کہا۔؟ کہانی ضرور سنو گے تو سنو۔

ایک دن بڑے زوروں کا طوفان آیا۔ اور جب طوفان تھما تو ایک بھیانک شکل سامنے کھڑی بڑی ہی کریہہ انداز میں قہقہے لگا رہی تھی۔ سرخ آنکھوں والی وہ شکل اتنی بھیانک، اتنی مہیب تھی کہ ہمارا کلیجہ شق ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی قہقہوں کی گونج اور تیز ہو گئی۔ ساتھ ہی کچھ عجیب سی آواز بھی شامل تھی ...... ٹک ٹک، ٹک ٹک ...... پتہ نہیں تم لوگوں نے ایسی آواز سنی ہے کہ نہیں۔؟ اور پھر ہم ٹکڑوں کی شکل میں اس کے پیچھے چلنے لگے۔ جیسے کوئی مقناطیسی طاقت ہمیں کھینچ رہی ہو۔... اور پھر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اور دوسرے ہاتھ میں ایک آئینہ .... وہ روشنی دکھا کر آگے بڑھتا اور آگے بڑھ کر ہمیں آئینہ بھی دکھاتا۔ اور ہم اپنی صورت دیکھ کر گریہ و زاری کرنے لگتے ...... دن بدن سوکھتے ہی جا رہے تھے۔ ٹوٹتے جا رہے تھے۔ اور ایک دن پھسل کر نیچے چلے گئے۔ ٹھنڈک تو محسوس ہوئی لیکن کچھ ہی دنوں بعد ہم نے دیکھا کہ ہر طرف سے ہم تھپیڑے کھا رہے تھے۔ موجیں سر ٹکرا ٹکرا کر پرا کتیں۔ اور ہم کو اور زخمی کر جاتیں۔ یہ سلسلہ بھی صدیوں چلتا رہا۔ ہم سوکھے گئے اور آج ...... تم سو گئے کیا؟ سونا ہی تھا تو تم نے ہمیں گویائی کیوں عطا کی۔؟ ـــ دفن ہو گئی تھی کہانی ہمارے پتھریلے سینوں میں۔ اور تم نے اسے کرید کر باہر نکال لیا۔ کیوں؟ بولو، کیوں؟

میں نے زبان کھینچ لی ـــ کم بخت بولے جا رہا ہے ـــ میں گھر لوٹ آیا۔ لیکن رات کے وقت بڑی بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ جب بھی نیند کے غلبے سے آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ تو کئی سائے اچھل کود کرنے لگتے ـــ بالکل سفید ـــ جیسے کسی نے سر سے پیر تک خون کھینچ لیا ہو .... ان کی سوکھی ہوئی رگیں کانٹوں کی طرح چبھنے لگیں۔ ان کی بلبلاہٹ بھی قریب معدوم ہو چکی تھی۔ ...... گھبراؤ نہیں ساتھیو! تمہاری زندگی کی شادابی پھر واپس آ جائے گی ...... اور اچھل کود ختم ہو جاتی۔

اور اس کے بعد جب میں سمندر کے کنارے پہونچا، تو وہ [illegible] منتظر تھے۔ میں دوڑتا ہوا ان کے پاس پہونچ گیا۔ اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کرنے لگا۔ میرے اندر دو بچے جمع ہونے لگے...... آؤ، آؤ ...... وقت کے ستائے ہوئے ان بے زبان ٹکڑوں کو ہماری ضرورت ہے ہم جو چاند پر سفر کر سکتے ہیں۔ سورج کی گرمی ہی مٹھیوں کو بند کر سکتے ہیں۔ پھر دنیا کو تباہ کر سکتے ہیں۔ کیا ان سوکھی ہوئی رگوں میں خون انجکٹ نہیں کر سکتے۔ یہ پاگل ہے، پاگل ہے۔ بھاگو، مارو، بہت بچے تو بھاگ کھڑے ہوئے اور بہت سے بچے میرے ہی جمع کئے ہوئے پتھر مجھ پر پھینکنے لگے۔ مجھے مت مارو بچو، میں پاگل نہیں ہوں۔ میں انہیں جمع کرکے کوئی ایٹم بم نہیں بناؤں گا۔ بلکہ ان کی مسکراہٹ واپس لانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن کئی پتھر بیک وقت میرے سر سے ٹکرائے، اور میں بھاگتا ہوا پھر گھر واپس ہو گیا

لیکن مجھے کوئی پکار رہا تھا۔ دروازہ پر دستک بھی ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور سر اور چہرہ سے بہتے ہوئے لہو کو میں نے ایک بوتل میں جمع کیا۔ اور پھر سمندر کے کنارے کو [illegible] کرنے گیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر ناریل بکھرے پڑے تھے۔ اور بے جان پتھر ہماری راہ تک رہے تھے۔ سمندر سے اٹھتی ہوئی ایک لہر میرے قدم چوم کر واپس چلی گئی۔ اور کچھ ٹکڑے میرے قدموں میں پڑے تھے۔ میں نے ان میں سے چار کو اٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اور بوتل سے [illegible] نکال کر ان کے اوپر چھڑک دیا۔ پتھر کے ٹکڑے اچھل کر بھاگ نکلے۔ اور میں دوڑتا ہوا جتنے ٹکڑے جمع کر سکتا تھا کیا۔ اور مٹھیاں [illegible] ان پہ چھڑک کر بوتل سمندر میں پھینک دی۔ جو شاید کسی چٹان ہی سے ٹکرا کر چھناک کی آواز کے ساتھ ٹوٹ کر بکھر گئی ...... اور کرچیاں! ہے کوئی ان کرچیوں کو [illegible]؟ میں مٹھیاں سمیٹتا رہا اور پھر!

کچھ دنوں کے بعد عجیب منظر تھا۔ سمندر کے کنارے کنارے چٹان نظر آئی۔ جن کے درمیان ہواؤں کی گنگناہٹ سنائی دیتی۔ سینکڑوں جگنوؤں کی چمک سے روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور وہ شکستہ چہروں والے ٹکڑے غائب تھے ...... میں نے سمجھا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں خواب ہی تو دیکھتا ہوں میں یہ خواب میری زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکے تھے۔ میں بے تحاشہ ہنسنے لگا اور میری ہنسی کی گونج ان چٹانوں میں پھیل گئی۔ میں ٹھنڈی ریت پر لیٹ گیا۔ موجیں آ آ کر میرے قدموں کو چومتیں اور میرے چہرہ پر ہلکی ہلکی پھواریں برسا کر واپس چلی جاتیں ...... خنک ہوائیں مجھے لوریاں سناتی رہیں ...... نہ جانے کب تک ...... آفتاب کی کرنیں میری بوجھل پلکوں کو گدگدانے لگیں۔ لیکن میں ریت کی ٹھنڈک سے مدہوش ان چٹانوں سے پھوٹنے والے نغموں میں گم تھا ......●

شاآم بارک پوری (بنگلہ دیش)

توپ

میں ڈھاکا شہر میں گلستان کے سامنے رکھی ہوئی وہ توپ ہوں جسے پہلے "بی بی مریم" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اب "گلستان کی توپ" کے نام سے مشہور ہوں۔ آہنی پیکر میں ڈھلا ہوا میرا سراپا جس کے دہانے سے کبھی شعلوں اور گولوں کی بارش ہوتی تھی۔ اب خاموشی کی چادر اوڑھے میں تحیر کی آنکھوں سے دور جدید کی بے ثباتی اور ہنگامہ آرائی دیکھ رہی ہوں۔ مجھے عظمت رفتہ کی یادگار سمجھ کر میوزیم میں رکھنے کی بجائے ——— شان و شوکت کے مظاہرے کے لئے اس چوراہے پر نصب کر دیا گیا ہے۔ میں اپنے وجود کی لاش اٹھائے ہوئے بے زبان نہیں ہوں۔ میری بھی ایک داستان ہے۔ میں تاریخ کے نشیب و فراز دیکھ چکی ہوں۔ ساڑھے تین سو برس کی زندگی میں ——— میں نے جو تغیر و تبدل دیکھا ہے وہ تلاش بسیار کے باوجود تاریخ کے اوراق پارینہ میں نہیں ملے گا۔ میں بے شمار معرکوں میں شامل رہی ہوں۔ فتح مندی کے پرچم کے ساتھ جنگجو بن کر ابھری ہوں۔ اس سرزمین کے آزادی میں میری بھی قربانی شامل ہے۔ میری داستان ایک تاریخ بن گئی ہے۔

میرے وجود کو آہنی پیکر میں ڈھالنے کا سہرا بنگال کے صوبہ دار شائستہ خاں کے سر ہے۔ اس نے فتح و نصرت کا ڈنکا بجانے کے لئے مجھے جنگی حرب کی شکل دی جن کاریگروں نے فولاد کو ڈھال کر میرا ڈھانچہ تیار کیا رات دن کی محنت شاقہ کے بعد مجھے آتشیں اسلحہ کے پیکر میں ڈھالا تھا۔ اگر فولاد کے خام مال کو کسی مثبت اور اصلاحی کام میں صرف کرتے تو دنیا میں صلح و آشتی اور اخوت اور امن کا پیغامبر بن کر ابھرتی۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں آتشیں ہتھیار بن کر حملہ آوروں کی سرکوبی کے اور فتح مندی کا جھنڈا گاڑنے کے لئے استعمال کی جاتی رہی امن کے لئے جنگ بھی امن کا پیش خیمہ تھا۔ بے شمار انسانی جانوں کا خون ناحق میری گردن پر ہے۔ خون اپنوں کا ہو یا پرائے کا۔ بہر حال خون ہے۔

میدان جنگ میں دو فریقوں کے درمیان جنگ ہوتی تھی۔ دونوں فوجیں بے جگری سے لڑتی تھیں۔ معرکے میں کشتوں کے پشتے بن جاتے تھے۔ زخمیوں کے چیخ و پکار سے میدان جنگ ماتم کدہ بن جاتا تھا۔ میرے توپچی تاک تاک کر دشمنوں کے مورچے پر گولے برسانے شروع کر دیتے۔ دشمن کے گولہ انداز بھی ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کر دیتے۔ اژدہا پیکر توپیں ہولناک گرج کے ساتھ گونج اٹھتیں اور آگ برسانے لگتیں۔ گولے آگ کے شعلوں کی طرح ادھر ادھر برسنے لگتے۔ ایک بار میرے دہانے سے ایک نکلا ہوا ایک گولہ دشمن کی توپ میں جا گھسا جس سے اس کی توپ کی نال پھٹ گئی۔ دشمن کی فوج نہایت بدحواسی اور سراسیمگی کی حالت میں بھاگنے لگی۔ کامرانی نے ہمارے قدم چومے اور دشمن کو شکست ہوئی۔

جنگ کے خاتمے پر مجھے کھینچ کر جہانگیر نگر لے آیا جاتا۔ وہاں فتح و نصرت کی جشن منایا جاتا۔ سپاہی اور سردار لباس فاخرانہ زیب تن کئے رقص و سرود میں کی محفلوں میں شرکت کرتے۔ دہلی اور لکھنؤ سے حسین اور جمیل رقاصائیں

[illegible] ورنگ کی محفل کو جنت نظیر بنا دیتیں۔ بائل کی [illegible] سے سارا جہانگیر نگر کیف و مستی میں ڈوب جاتا اور شراب ارغوانی کی نہر میں بہتی ہوئی بوڑھی گنگا میں جا گرتیں۔ رنگ و نور کا یہ سیل اب خواب بن چکا ہے جہاں عیش و طرب کی بزم جمی تھی۔ وہاں بے شمار زخم پڑے ہیں۔

اس دور کے واقعات اب بھی مجھے روز اول کی طرح یاد ہیں۔ یہ میری کتنی بدنصیبی تھی کہ میں خاموش تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ مگر جشن طرب میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ میرا فولادی جسم اس کا متحمل نہ تھا۔ زمانے نے میرے احساس کو ڈس لیا تھا۔ تاکہ میں حرف مدعا زبان پر نہ لا سکوں۔

آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ مجھے جہانگیر نگر (ڈھاکا) میں سب سے پہلے نواب معظم خاں میر جملہ خان خاناں سپہ سالار بہادر آسام سے لائے تھے۔ مجھے ڈھاکا کے بڑے کٹرے کے سامنے نصب کر دیا جو مغلانی چبر کہا جاتا تھا۔ میری لمبائی گیارہ فیٹ ہے۔

پھر مسٹر واٹر کلکٹر نے سواری گھاٹ سے اٹھا کر چوک بازار میں لا رکھا۔ ۱۹۱۷ء میں چوک بازار سے سندر گھاٹ منتقل کر دی گئی۔ ڈی۔ آئی۔ ٹی۔ کے چیرمین مرنی نے ۱۹۵۷ء میں گلستان کے سامنے رکھا۔ اسی لیے خاص و عام میں "گلستان کی توپ" کے نام سے مشہور ہو گئی ہوں جب مخلوق کی نظریں مجھ پر پڑتی ہیں۔ تو مجھے داستان پارینہ کا غبار اٹھتا ہے۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے کاروبار کے سلسلے میں بنگال کی سرزمین پر قدم رکھا تو نہ صرف یہاں کی معیشت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر انگریز تاجروں کے کاروبار کو چمکانے لگی۔ بلکہ رفتہ رفتہ اقتدار کی جڑ بھی مضبوط

گیا

کرنے لگی۔ ڈھاکے کی ململ کی شہرت سارے عالم میں تھی۔ انگلستان کی مصنوعات کی کھپت کے لئے ململ پارچہ بافوں کے ہاتھ کٹوا دیے۔ فرنگیوں نے سازش کا ایسا جال بچھایا کہ اپنوں کی آنکھیں بھی لالچ اور ہوس سے چندھیا گئی ہیں۔ سراج الدولہ نے ان کی چالبازی اور توسیع پسندی کو بھانپ لیا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں ان سے نبرد آزما ہوا۔ بدقسمتی کی پرچھائیاں اسے حصار میں لے چکی تھیں۔ میر جعفر کی غداری نے سارے ہندوستان کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈال دیں۔ انگریز ایک آندھی کی طرح اٹھے اور سارے ہندوستان پر بگولے بن کر چھا گئے۔ کبھی کبھی تیتو میر، فقیر مجنوں شاہ، شریعت اللہ اور دودو میاں جیسے سرفروش انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے رہے۔ ان کے کارواں کے عوام آزادی کی خوشبو سے سرشار ہو کر ان جانبازوں کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور انگریز آقاؤں کے خلاف جہاد میں ڈٹ گئے۔ آپ انگریزوں کے سازشی ذہن سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ ان کی سیاست اس بنیاد پر تھی کہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو"۔ چنانچہ انہوں نے خود غرض لوگوں کو لالچ دے کر اپنا حلیف بنایا۔ اور آزادی کے پروانوں کو جور و ظلم کے بوٹوں تلے روند دیا۔

بنگال کے مسلمانوں کے اندر آزادی کی چنگاری سلگتی رہی۔ پھر ۱۹۰۵ء میں بنگال تقسیم کے بعد ڈھاکا دارالحکومت قرار پایا۔ شومئی قسمت خود مختاری کا یہ خواب عارضی ثابت ہوا۔ آج بنگلادیش دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک بن کر وجود میں آچکا ہے۔ عوام کو سوچنا چاہیے کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ۱۹۱۱ء میں بنگال کی تقسیم منسوخ کرا دی تھی۔؟ اس زمانے میں ہی مشرقی بنگال صوبائی خود مختاری مل چکی تھی۔ مسلمانوں کے مستقبل

ما ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ایسا لگا یہ قوم ذلت اور مایوسی کے
دلدل سے نہیں نکل سکے گی۔ لیکن ۱۹۰۶ء ڈھاکا میں آل انڈیا
مسلم لیگ کے قیام سے مسلمانوں کی رگوں میں ایک نئی
حرارت دوڑنے لگی۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف
محاذ آرائی شروع کر دی۔ آزادی کی یہ لہر سارے ہندوستان
میں پھیل گئی تھی۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس
کی قرارداد لاہور میں بنگالی ممتاز رہنما فضل الحق نے دوقومی
نظریہ کی بنیاد پر الگ وطن کی قرارداد پیش کی۔ ۱۴ اگست
۱۹۴۷ء کی صبح کو قائد اعظم محمد علی جناح کی سرپرستی میں آزادی
کا سورج طلوع ہوا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان سوچتا کچھ ہے اور
ہوتا کچھ ہے۔ جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو میں نہال
ہو گئی کہ عرصہ دراز کے بعد پھر مسلمانوں کو آزاد فضا میں سانس
لینے کا موقع ملا۔ مگر آہستہ آہستہ آزادی کے سورج پہ
گرہن لگنے لگا۔ میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ کہ مسلمان
آپس میں مل جل کر بھائیوں کی طرح کیوں نہیں رہ سکتے؟
میری چشم عبرت نے دیکھا کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں
کے لالچی خود غرض اور مفاد پرست سیاست داں اپنی
باہمی چپقلش سے انصاف، مساوات، دیانت داری
کا گلا گھونٹنے کے درپے تھے۔ عوام میں بے چینی پھیلنے لگی۔
وزارتیں بننے اور ٹوٹنے لگیں۔ جذباتی عصبیت اور رقابت
نے سیاست میں زہر بھر دیا۔ متحدہ محاذ نے الیکشن جیتنے
کے بعد ۳ اپریل ۱۹۵۴ء کو مولوی فضل الحق کی قیادت
میں اپنی حکومت تشکیل دی۔ متحدہ محاذ کا اتحاد عارضی
ثابت ہوا۔ متحدہ محاذ نے طبقاتی شعور اور منافرت کا
زہر پھیلا دیا تھا۔ جس کے باعث فساد، خون خرابہ،
اور مظاہرے کی آگ چاروں طرف پھیل گئی۔ ایسا ہنگامہ
اور فساد برپا ہوا کہ حکومت کا نظم و نسق چلانا مشکل ہو گیا
گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔ عوام جو اقتصادی غلامی میں جکڑے
چلے آرہے تھے۔ ان کی ترقی اور خوشحالی کی کوئی سبیل
نہیں نکالی گئی۔ سنہ ۱۹۵۸ء تک بار بار حکومتیں تبدیل ہوتی
رہیں۔ قائدین کے سیاسی دیوالیہ پن نے عوام کو دل برداشتہ
کر دیا تھا۔ سیاست کا میدان ریشہ دوانیوں اور سازشوں
کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ اس طرح ملک میں مارشل لا نافذ کر کے ایوب
خاں برسر اقتدار آئے۔ صوبائی عصبیت کی جو آگ بھڑک
اٹھی تھی۔ اس نے ایوب خاں کے عنان حکومت سنبھالنے
کے بعد چند سال بعد آگ پر تیل کا کام کیا۔ اس طرح فوجی
جنرل یحییٰ خاں کو دولخت کرنے کا جو سہرا باندھا گیا اس
کے مختلف اسباب تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ مجروح جذبات اور احساس
محرومی عوام کا مقدر بن گیا۔ مایوسی ان کی قسمت بن گئی۔
معصوم عوام یہ نہیں سمجھ سکے کہ چند اقتدار کے بھوکے انسانوں
نے انہیں گمراہی کا آئینہ دکھایا ہے۔ آزادی کے خوش الحان
نعرے نے عوام کو مدہوش کر دیا ہے۔ اس طرح شیخ مجیب
الرحمٰن قوم کا لیڈر بن کر ابھرا۔ اس نے ایک نئی آزادی کا
نعرہ بلند کیا۔ اس کی آواز بڑی سحر انگیز تھی۔ عوام کی نظر
میں شیخ مجیب الرحمٰن ان کا نجات دہندہ تھا۔ جلسوں میں
میں لاکھوں آدمیوں کا جم غفیر تھا۔ عوام نے اس کی آواز پر
لبیک کہا۔ اس طرح مجیب الرحمٰن کو سنہ ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں
کثیر ووٹوں سے کامیابی حاصل ہوئی۔

ابتدا میں میری آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی۔ کہ
یہ عوامی لیڈر اپنے ہاتھ میں صداقت کی مشعل لئے فلاح
و بہبود کی راہ پر گامزن ہے۔ آزادی کے سورج سے بنگالی
عوام کی رگوں میں کرنوں کی برقی لہریں دوڑیں گی۔ مگر
صد افسوس! لیڈر جو کہتا ہے ـــــ اس پر عمل
نہیں کرتا۔

میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ عوام کو آگ اور خون کے دریاؤں سے ہو کر گزرنے پڑے گا۔ ہر طرف گولیوں کی آواز سے فضا کانپ گئی۔ انسانی خون ارزاں ہو گیا۔ سڑکیں فوجی بوٹوں کی آواز سے گونجنے لگیں۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگا۔ زمین سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ لہو کے قطروں سے ایک نئے گلشن کی آبیاری ہوئی۔ نئے پودے نے جھومنا شروع کیا۔ گھنیرے بادلوں کی اوٹ سے آزادی کا سورج نمودار ہوا۔ جب قسمت کا ستارا اگر گردش میں ہو تو سورج کی تپش سے شاخ پر پھول بھی کمہلا جاتا ہے۔ کبھی بھی میرا ذہن یہ سوچنے کو تیار نہ تھا۔ کہ ملک کا بٹوارہ ہوگا اور خاندان بکھر جائے گا۔ کسے معلوم تھا کہ بین الاقوامی سازش اور پڑوسی ملک کے جوڑ توڑ سے یہ تقسیم عمل میں آئے گا۔ جغرافیائی حدود کی لکیریں کھینچ دی جائیں گی اور قومی پرچم بدل جائے گا۔ لیکن ملک کی معاشی اور سیاسی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

دیدۂ عبرت نے دیکھا کہ سیاسی کارکنوں اور اعلیٰ عہدیداروں نے اپنے عیش کے محل تعمیر کر لئے۔ لیکن عوام غریب کے غریب ہی رہے۔ جب انسان غیر کی غلامی میں زندگی کاٹتا ہے تو وہ اپنے حاکموں کو جلاد قرار دیتا ہے۔ لیکن جب اسے آزادی نصیب ہو جاتی ہے تو وہ خود جلاد بن جاتا ہے۔

میں اب بھی گلستان کے سامنے لوگوں کی نگاہوں کا مرکز ہوں۔ عوام سے گزارش ہے کہ وہ کان کھول کر میری سرگزشت سنیں۔ اور اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لئے غور و خوض کریں۔ ورنہ ہسپانیہ کی طرح ان کی عبرت ناک داستان بھی تاریخ کی کتابوں کی زینت بن جائے گی۔ سچ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ یہ سچ فلک نیلگوں پر نمودار ہونے والے آفتاب کی طرح ہے۔ جس کی

حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

وقت اپنے ساتھ حالات کا کیا طوفان لے کر آئے گا ابھی سے کچھ کہنا مشکل ہے معلوم نہیں اس وقت تک بقیہ داستان سنانے کے لئے میرا وجود باقی بھی رہے گا یا نہیں۔ میں اپنی حدت سے پگھل جاؤں گی۔ کیونکہ دکھ درد کا شعلہ میرے سراپے کو جلا رہا ہے۔ ●

بقیہ سائمن باسکی

ہوا آگے بڑھا۔ وہ چلّا رہا تھا لیکن اس کی آواز سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر خود بخود لوگ آگے بڑھنے کے لئے اسے راستہ دینے لگے۔ اس نے سائمن باسکی کے ہاتھ سے مشعل لی اور تیزی سے اس لکیر کے آگے بڑھ گیا۔ ●

ادبی تبصرے

بریلا

کلام حیدری

قیمت ۱۵ روپے۔

قاسم خورشید

سائمن باسکی

جلوس ختم گیا۔
چاروں طرف عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ ہوا میں لہراتے ہوئے ہاتھ بے جان ہو گئے۔ سب کی نگاہیں مشکوک چہروں کی لکیروں میں سوالات ابھرتے اور پھر وہیں ڈوب جاتے۔ خوف کی پرچھائیوں نے اپنا دائرہ وسیع کیا۔ رات کی تاریکی میں مشعل کی روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ آگے بارود کا ڈھیر، کوئی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ ایک شخص بھی اگر اس لکیر کو پار کر جاتا تو دیکھتے ہی دیکھتے کتنی زندگیاں تباہ ہو جاتیں۔ اس جلوس میں عورتیں، معصوم بچے، بوڑھے اور جوان سبھی تھے۔ انہیں اپنا حق چاہیے تھا۔ ان سبھوں نے اس لڑائی میں اپنا سبھی کچھ کھویا تھا۔ اب آگے کچھ بھی کھونے کو تیار نہیں تھے۔

یہ سلسلہ تو صدیوں سے قائم رہے۔ ان کے لبوں پر کچھ دیر کے لئے مسکراہٹ بکھرتیں۔ اور اس کے بعد پھر سے بوجھل پلکوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ سبھی ایک بڑی ندی پر پل بنانے کے لئے رکھے گئے تھے۔ ان کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی۔ پل کی تعمیر کا کام پچھلے آٹھ برسوں سے تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس عرصے میں کتنی بار موسم بدلا۔ حالات کے نقشے میں معمولی تبدیلی ہوئی۔ مزدوروں کے کتنی بے نام چہرے دھوپ کی تپش سے

جھلسا گئے۔ ان میں سے اکثر حادثے کے شکار بھی ہوئے۔ لیکن کام یوں ہی چلتا رہا۔ ایک مزدور آواز اٹھاتا تو دوسرا اسے دبانے کی کوشش کرتا۔ کوئی ایک دوسرے کا دشمن نہیں تھا۔ لیکن بھوک کا مسئلہ بہرحال اہم تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موت پر کوئی سوگ منائے۔ اصل میں ایسا تھا کہ تقریباً سبھی حادثے کی ذمہ داری خود پر ہی لینے کو تیار رہے۔ کئی آوازیں ابھریں۔ تقریریں کی گئیں۔ لیکن ان سب کا حاصل کیا تھا۔ پھر سفر اسی جگہ سے شروع کرنا پڑتا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ حالات کو بدل دینے کا جذبہ اپنے اندر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب ظلم اپنی حدود سے بہت آگے بڑھ گیا۔ تو ان میں سے ہی ایک لیڈر ابھر کر سامنے آیا۔ سائمن باسکی، وہ پڑھا لکھا تھا، لیکن بہت زیادہ جذباتی۔ غلط جگہ پر سمجھوتہ کرنے سے گریز کرتا۔ لیکن اکثر حالات کے آگے مجبور بھی ہوا۔ مزدوروں کی اکثریت نے اس کا ساتھ دینا شروع کیا۔ لیکن کچھ لوگ ہمیشہ اس کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ کبھی کبھی ان میں اختلاف رائے بھی پیدا ہو جاتا۔ سائمن باسکی کو جو لوگ صحیح معنوں میں اپنا سچا لیڈر مانتے تھے، انہیں زیادہ پریشان کیا جاتا تھا۔

سائمن اپنی بیوی، دو جوان بیٹیوں، اور ایک دس سالہ بچے کے ساتھ پل کی تعمیر میں جٹا رہتا۔ جب کبھی کسی کے چیخنے کی آواز ابھرتی تو دوڑتا ہوا اس جگہ پر جاتا۔ ٹھیکہ دار حسب معمول ان پر وار کر رہا ہوتا۔ سائمن کے آتے ہی وہ سر مزدور لوٹنے لگتے۔ ٹھیکہ دار کچھ سہم جاتا۔ اور اپنے آپ کو چھپانے کے لئے سائمن سے مخاطب ہوتا۔

ہونہہ تم مزدوروں کے لیڈر بنتے ہو۔ کیسے ہو کہ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ ہمیں اتنی مزدوری نہیں ملتی، جتنا ہم کام کرتے ہیں۔ کیا اسی کو محنت کہتے ہیں کہ دو گھنٹے سے چھالے بھی پڑ گئے تھا۔ ہم کہاں تک برداشت کریں گے۔ تمہیں بھی تو سزا ملنی چاہیے

ایک ... گیا

ٹھیکہ دار ٹوکتا رہا۔ اور سائمن مزدوروں کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش میں رہتا۔ پھر کچھ دیر بعد سبھی اپنے اپنے کام میں لگ جاتے۔ وہ بھی اپنی جگہ پر لوٹ آتا۔ پھر دیر تک اسے ذہنی پریشانی میں مبتلا رہنا پڑتا تھا۔ آخر ہم ان لوگوں کو کس طرح سمجھائیں جو بالکل محنت کرنا نہیں چاہتے۔ ہم اس جگہ پر کمزور ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسے مزدور تو ہیں ہی جو ہم سب کو بدنام کر رہے ہیں۔ انہیں آخر کس طرح سدھارا جا سکتا ہے۔ ٹھیک ہے اگر ان میں محنت کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ تو مالک انہیں نکال کیوں نہیں دیتا۔ ہم تو نہیں کہہ سکتے کہ انہیں ہٹا دیا جائے اس لئے کہ ان پر جو ذمہ داریاں ہیں۔ انہیں کون پورا کرے گا۔ مالک سب کچھ جانتا ہے اسے کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کیوں بدنام ہوں گے۔ جو ان کی یہ سازش کبھی رنگ نہیں لائے گی۔ کچھ ایسے بھی مزدور ہیں یہاں جو صرف غنڈہ گردی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ سب مالک کے خاص آدمی ہیں۔ یہ کسی وقت کو خطرہ پیدا کر سکتے ہیں۔

سائمن چھٹی کا سائرن بجتے ہی بیوی بچوں کے ساتھ اپنے بیرک میں لوٹ آتا۔ یہاں بھی دھوپ کی تپش ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ چھت گرم ہو جانے کی وجہ کر رات گئے تک انہیں نیند نہیں آتی۔ رات کے کسی حصے میں پاس والے بیرکوں میں ہنگامہ شروع ہو جاتا کبھی اسے جانا پڑتا۔ اور کبھی جان بوجھ کر نہیں جاتا۔ جب کبھی نہیں جا پاتا تو اکثر ایسا بھی ہوا کہ صبح اٹھتے ہی کسی مزدور کی لاش پائی گئی جس کا الزام بھی کسی مزدور پر ہی ہوتا۔ کچھ دنوں تک سائمن کے خلاف بھی آوازیں بلند کی جاتیں۔ اور جب دھیرے دھیرے حالات لوگوں کے سمجھ میں آ جاتے، تو سائمن اور عظیم بن جاتا۔ اکثر ٹھیکہ دار رات گئے اس کے بیرک میں آتا، اور سائمن کو مالک کے پاس لے جاتا۔ مالک مزدوروں کے اتحاد سے نفرت کرتا۔ اسے چائے پلائی جاتی۔ اور جب وہ لوٹتا تو کچھ لوگ اس کے منتظر ہوتے۔ پھر بہت دیر تک سائمن کو ان سے الجھنا پڑتا۔ بیٹیاں دروازے پر اپنے باپ کی باتوں کو دھیان سے سنا کرتیں۔ ان دونوں کو اکثر اس ماحول سے خوف سا لگتا۔ چاروں طرف سے اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کرتیں۔ تھکن کے باوجود گرمی میں کبھی گہری نیند میں نہیں ڈوب پاتی تھیں۔ ٹھیکہ دار کی آواز پر صرف وہ چونکتی ہی نہیں۔ بلکہ بابا کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیتیں۔ ماں سے اکثر گالیاں بھی سننے کو ملتیں۔ جب بابا جاگ جاتا تو کسی حد تک دونوں خود کو محفوظ سمجھتیں۔ ٹھیکہ دار انہیں گھورتا رہتا اور سائمن نیند میں ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہتا ——— ایک دن سائمن کی بڑی لڑکی کو کام کرنے کے بہانے ندی میں بھیج دیا گیا ——— وہ حادثے کا شکار ہو گئی ——— اس کی نعش ندی میں کہیں کھو گئی ——— پھر کچھ دنوں بعد موت سے بھاگتی ہوئی رات کے پچھلے پہر وہ اپنے بیرک میں پہونچی، جیسے ہی دروازہ کھولا گیا۔ وہ سائمن پر جھول گئی۔ اس کا سارا جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ سائمن چیختا رہا۔ بستر چیخ ہوتی رہی۔ اور اسی بیچ اس کی بیٹی نے سہم کر موت کو گلے لگا لیا ——— کچھ دنوں بعد سائمن نے چندہ کرکے اخبار نکالنا شروع کیا۔ مزدوروں کے حلقے میں اس اخبار کو پڑھنے والے کی تعداد کم تھی۔ لیکن جب باہر کی دنیا میں اس کے اخبار کو پڑھا جاتا۔ تو کچھ لوگ اس سے ملنے آتے، انہیں مکمل طور پر حالات سے آگاہ کیا جاتا۔ ان کے وعدے مزدوروں میں کئی خوبصورت خواب بن کر ابھرتے۔ یہ سلسلہ کچھ دنوں تک چلتا رہا ——— بیداری بڑھتی رہی۔ لیکن ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ ان کے دکھ درد کو سمجھنے والے اپنی شہرت کے پیچھے بھاگتے رہے۔ ان کی ہمدردی حاصل کرنے والوں کا

مستقبل تابناک ہوا۔ لیکن انہیں اندھیرے سے کوئی لگاؤ تھا
کسی میں حوصلہ نہیں تھا۔ سب کچھ دکھاوا ——— بے بنیاد
باتیں۔ آخر کب تک ان کے سہارے زندہ رہا جا سکتا
تھا۔ کچھ دنوں بعد سائمن باسکی کی آخری بیٹی بھی حادثے
کا شکار ہو گئی۔ اسے بھی ندی نے اپنے بانہوں میں جکڑ
لیا۔ موجیں اس کے جسم سے کھیلتی رہیں۔ پھر خون کے
دھبے ساحل پر دور دور تک پھیل گئے۔ سائمن باسکی
نے تحریک اور تیز کر دی۔ اب اسے ان سے لڑنا تھا۔
ان کے خلاف ثبوت حاصل کرنا تھا۔ لیکن یہ کس طرح
ممکن تھا۔ ان کی تعداد محدود تھی، لیکن فلانخ بہت دور
تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اسے بھی تھک کر
بیٹھ جانا ہوگا۔ جب کبھی وہ اپنے بیچ کے لوگوں سے
بھی مایوس ہو جاتا۔ تو اچانک اس کا لڑکا جھنجھوڑ دیتا۔
لڑائی تیز ہوتی گئی۔ مزدوروں کی ایک بڑی تعداد ابھر کر
سامنے آئی ——— دن بھر مختلف راستوں سے گزرتا ہوا
یہ جلوس رات کے کسی حصے میں اس مقام پر پہنچا جہاں
انہیں انصاف ملنے کی امید تھی ——— سائمن باسکی ہی ان
کا لیڈر تھا۔ اس کے ایک اشارے پر سارے لوگ
خاموش ہو گئے۔ سبھی اپنے لیڈر کو شک کی نگاہوں
سے دیکھ رہے تھے۔ اجتماعی طور پر یہ سوال سامنے آیا۔ کہ
اس جگہ پر ہم بھی خاموش کیوں ہو گئے۔ جہاں سبھی
احتراماً خاموش رہتے ہیں۔ آگے بارود کی ڈھیر تھی۔
اس ڈھیر سے انہیں گزرنا ہی تھا۔ سائمن کا سر جھک
چکا تھا۔ پھر اس نے مشعل کی روشنی کو خون آلود نگاہوں
سے دیکھنا شروع کیا۔ چہرہ بالکل سرخ ہو چلا تھا
وہ بہت کچھ بولنا چاہ رہا تھا۔ لیکن بولنے سے کیا فائدہ۔
خاموش احتجاج کی ضرورت ہے۔ اب وہ یہ سوچ رہا
تھا کہ اب تک بول کر ہم بہت بڑی غلطی کی ہے۔ انہیں جلدی

کمزوریوں کا علم ہو چکا ہے۔ اب جو آواز ابھری تو پھر کوئی
ایسا راستہ ضرور سامنے آ جائے گا۔ جہاں سے ہم آگے
نہیں بڑھ سکتے ہیں۔ اس لکیر سے آگے بڑھنا ہوگا جسے
چھو کر اکثر لوٹنا پڑا ہے۔ سائمن بارود کی ڈھیر کی طرف
بڑھنا ہی چاہ رہا تھا۔ کہ اس کی بیوی سامنے آ گئی۔ بلکہ
اس کے پاؤں پر گر گئی۔ چند لمحے بعد اس نے سائمن کے
چہرے کی طرف دیکھا۔ اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی
ہم اس لڑائی میں کئی بار ہار چکے ہیں۔ بہت کچھ
مٹ چکا ہے۔ اب جو آگے قدم بڑھایا تو چاروں طرف
آگ پھیل جائے گی۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ یہیں دم
توڑ دیں گے۔ یہ سلسلہ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو سکتا
جو کچھ بھی ہمارے پاس بچا ہے کیا اس کی ہی حفاظت
نہیں کر سکتے ——؟ ایسا لگتا ہے کہ ہم کمزور ہیں بہت
کمزور ہیں ہم۔ ہمارے پاس صرف ایک بیٹا ہے۔ [illegible]
بھی مزدور ہے سائمن باسکی کی طرح۔ سائمن اسے
بڑھاتے وقت بھی ظلم کے خلاف احتجاج پر زیادہ زور
دیتا تھا۔ ایسے کئی بچے ہیں ہمارے بیچ جو آگے چل کر
اس بھیڑ کی شکل میں ابھر سکتے۔ اور پھر ہم سب کی طرح
انہیں بھی پیش آنا پڑے گا۔ لیکن اس کا حاصل کیا ہے
ہماری جوان بیٹیوں اور بیٹوں کی بلی۔ نہیں اب ہم
آگے نہیں بڑھ سکتے۔ سمجھ لو کہ تھک گئے ہیں ہم لوگ۔
حالات جیسے ہیں ویسے ہی رہنے دو۔ سب کچھ اسی
طرح چلتا رہے گا۔ ہم اب کوئی تبدیلی نہیں چاہتے ہیں
ہمیں اب کوئی تبدیلی نہیں چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک ہے
ہم بھی سکھی ہیں ...... اب کوئی تبدیلی نہیں۔
اور پھر بھیڑ میں سرگوشیاں ہونے لگیں
تمام ہاتھ دھیرے دھیرے جھکنے لگے۔ لوگ تھک کر بیٹھ
بھی چاہ رہے کہ سائمن باسکی کا اکلوتا لڑکا بھیڑ کو چیرتا

بقیہ ... ۳۰

گیا

کرشن موہن

کھردرے پن کا جواز

مزا منہ کا بدلنے کے لئے ہم نے
کہی ہیں کھردری غزلیں
کہ اکتایا ہوا تھا ایک مدت سے ہمارا جی
نمائش کی لطافت سے
حقیقت کھردری ہے، تا بکے اس کو چھپائیں ہم
فسوں آمیز پردوں میں
ہمیں ہر گوشۂ شعر و ادب کی سیر کرنی ہے
کہ ہم شامل ہیں اقلیم سخن کے منچلے آوارہ گردوں میں

کھردری غزل

یہ بگاڑے گی آخرت پیارے — عشق بازی ہے ایسی دھت پیارے
ایسے لوگوں سے پوچھی بے سود — جنکی الٹی ہوئی ہو مت پیارے
ہم تو پہلے ہی دل جلے ہیں بہت — ہم سے اغماض مت برت پیارے
روز پیتے ہو اپنے پیسوں سے — پڑ گئی ہے یہ کیسی لت پیارے
سخت ہے گرچہ دھرم کا سنگرام — رام رکھے گا تیری پت پیارے
اب کہاں حسن میں ہیں وہ تیور — اب کہاں عشق میں سکت پیارے
سارے سنسار میں اجاگر ہے — ابن آدم کی شیطنت پیارے
ترجمان شباب طاغی ہے — دار و گیر جدیدیت پیارے
اسکو "اپیار" نے کیا بیزار — تھا امانش کا پیار رت پیارے
جذبۂ عشق ہے کھرا سونا! — حسن تو ہے فقط رجت پیارے
کہہ کے آدھا گلاس خالی ہے — ہو نہ جا وقف یاسیت پیارے
جھاڑ بھی گرد من کے درپن کی — تا کجے یہ قنوطیت پیارے

کرشن موہن یہ تیرا پاگل پن
تو ہے فرزانگی کا ست پیارے

جب بھی عقب میں دیکھوں

بنگلہ : شمس الرحمن
اردو : احمد سعدی

اچانک [illegible] نے حیرت سے مڑکر عقب میں جو دیکھا
تو روپہلی کرنوں کے سیلاب میں کھو گئیں میری آنکھیں
بہت دور ہی کوئی چھوٹا سا بچہ
[illegible] کوئی نوجواں اور نغموں کی پروردہ کوئی حسین ایک لڑکی
مری سمت رومال لہرا رہے تھے
پیام محبت مجھے دے رہے تھے
مرا دل پریشان تھا، مضطرب تھا۔
مجھے شام کے گہرے سائے
شناسا شناسا نظر آ رہے تھے
وہی ساری باتیں جو گرویدہ شاعر کو کر لے
تو کیا واقعی میں وہی تھا ۔ ؟
بہت دور سنولا یا سنولا یا پتھریلا رستہ
کئی رہگذر اور بھی تھی
وہی موج دریا، وہی پیچ و خم تھے ۔
وہی پل، وہی بے شجر اجڑا اجڑا سا میداں
وہی میں جو آباد شہروں کی جھیلوں میں غوطے لگا کر
یہاں آ گیا تھا ؟
شناسا تھے جتنے بھی چہرے
سبھی رفتہ رفتہ جدا ہو گئے تھے
نہ جانے کہاں کھو گئے تھے
وہ [illegible] شخص تنہا ۔
شکاری کی گولی سے زخمی پرندوں کی صورت
سیہ رات کی میز پر سر جھکائے
بے حس خود اپنے کمرے میں بیٹھا ۔
وہ تخلیق شعر و ادب کر رہا ہے
مگر اس کا مجروح دل رو رہا ہے
ظفر[*] کی طرح وہ بھی مجبور و محتاج ہے
بے وطن ہے ۔

دل مضطر کی خواہش ہے
کہ مڑ مڑ کر عقب میں دیکھتا جاؤں
کبھی فرصت ملے تو گذرے لمحوں کو
گرانمایہ انگوٹھی کی طرح
ہر زاویہ سے دیکھ کر پرکھوں
کبھی آہیں بھروں ایسے
کہ خود احساس بھی اس کا نہ ہو مجھکو
کبھی میں بے سبب ان گذرے لمحوں کی محبت میں
وفور شوق سے افسردہ ہو جاؤں ؟
کبھی گذرے دنوں کو اپنی آنکھوں میں سمو کر
اس طرح دیکھوں
کہ درماندہ کوئی پردیسی جیسے لوٹ کر
اپنے وطن آئے
دوبارہ اپنے پیارے خوبصورت شہر کو دیکھے
مکانوں کی قطاریں، زندگی کا شور و ہنگامہ
چمکتی روشنی، حجلۂ عروسی کی
اٹھائے اپنے کاندھوں پر جنازے کو
جلوس سوگوار انساں
سپاہی کی قواعد گاہ سے، میداں میں پریڈ سے پرے
دلہن و دلہا کی رضا لے کر
بڑے ہی شاعرانہ احترام و عاجزی
حسن عقیدت سے
مری یہ آج خواہش ہے
اجل کے بدشکل چہرے کو [illegible] سے سجا دیتا
دو [illegible] [illegible]

[*] بہادر شاہ ظفر

خواب افلاکی

مشورہ

مجھکو معلوم ہے
میں سب جانتا ہوں
کس کے منہ میں ہے کس کی زباں
کس کے سر میں ہے کس کا دماغ
کس کے بازو میں ہے کس کی قوت
یہاں تو زمیں پوس کیڑے
عقابوں کی رفعت پہ تنقید کرنے کے
مستقل غیر فطری عمل کے خرابوں میں
مشغول ہیں
یہاں لوگ تخم تخریب بو کر
فکر تعمیر میں مبتلا ہیں۔
جھوٹے بے ہودہ خوابوں میں مصروف ہیں۔
نیم بالغ سماعت میں گھولی ہوئی
مدبرنما بے بصارت سیاست کی
شر گوشیوں میں ڈھلی
نرم لہجوں کی ساری فسوں کاریاں
کو میں پہچانتا ہوں۔
گفتگو میں ہر اک لفظ کی مصلحت کوشیوں کے
پس پشت جذبے کے فقدان کو

خوب محسوس کرتا ہوں میں
اس طرح
نفرتوں اور محبت کے مابین
یاں کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں
مسکراہٹ کے لیبل شدہ
خوبصورت لبادوں میں ملبوس
تبسموں کے ہر کرب کو کون سمجھے
یہ میں جانتا ہوں
اداکاریٔ فہم و ادراک
ایک ذہنی دیوالیہ پن ہے لوگو
اگر ہو سکے
تو میرا مشورہ ہے
کہ اب سب سے پہلے
یہ ذہنوں کی پس ماندگی،
دور کرنے کی کوشش کرو!

آفاق فاخری

کشمکش

آج پھر میں نے اٹھایا ہے قلم
سوچتا ہوں دل مضطر کی داستاں لکھوں
داستان لب ورخسار غزالاں لکھوں
یا جو نکلا تھا ابھی
شہر میں خون کے قطروں کا جلوس
وہ سبھی قصہ سوزاں لکھوں
یا تو میں سینۂ صفحۂ قرطاس پہ پھر
بھوک و افلاس کے مارے ہوئے ....
چہروں کی چیختی ہوئی زباں رکھ دوں
یا، میں دولت کے پجاری کی کتھائیں لکھوں
یا، کہ چھیڑوں رگِ سازِ ماضی
یا، میں حالات کی موجودہ کہانی لکھوں
یا، خود اپنی ہی حکایات پریشاں لکھوں
آج پھر میں نے اٹھایا ہے قلم
تم ہی بتلاؤ، میں کیا کیا لکھوں

فرحت قمر

ضمیرِ خفتہ

کچھ دن پہلے
وہ جو ضمیرِ زندہ
میرے سینے میں کچھ بول رہا تھا
سود و زیاں کو تول رہا تھا
ہٹ دھرمی سے ایسا بے کر زرد ہوا ہے
جیسے رشوت لینے والا کوئی حاکم!

مایوسی

سرِ بازارِ تمنا کے خریدارِ محبت
نقدِ ہمت ہے گداگر کے بچھونے کی طرح
آرزوئیں کسی کمہار سے اونچی ہیں مگر
قد آوے کا کسی دوٹے ہونے کی طرح

صفدر

روشن ہیں کنول

جھیل کے پانی پہ کرنوں کا نزول
جھیل کے پانی میں چاندی کی چمک
جھیل کے پانی پہ روشن ہیں کنول

ایک روشن صبح جیسی تیری آنکھیں
عکس میرے: جھیل پر ہنستے کنول

تیری پلکیں ہیں مرے دستِ دعا
عالموں کے رب سے مانگیں وائے خدا

جھیل کی تہہ کو سنبھال!
صبح تیری بے مثال
روک دے وقتِ زوال!

غزل

فضا ابن فیضی

کچھ اپنی فکر، کچھ اس کا خیال بھی کم تھا
وہ عمر کیا تھی کہ سر پہ وبال بھی کم تھا

بلندیوں نے بہت خاک خاک ہم کو کیا
زمیں پہ تھے تو خوفِ زوال بھی کم تھا

گلہ کریں کہ شمارِ نخلِ جاں میں کم آئے
شمارِ زخمِ بدن، پچھلے سال بھی کم تھا

ملا تھا تو کے جب عمر دوسروں کے حصے کا
اسے خود اپنے زیاں کا ملال بھی کم تھا

میں دو نفس میں ہوا امتحان سے فارغ
کہ مختصر تھی یہ فرصت، سوال بھی کم تھا

بڑا سکوں تھا نہ آیا تھا شہر وہ جب تک
جبیں جبیں عرقِ انفعال بھی کم تھا

ہمارے دور میں آکر یہ جنس عام ہوئی
کہ اگلے وقتوں میں قحط الرجال بھی کم تھا

غرورِ فکر نے کچھ اور مشتعل رکھا
مرے مزاج میں کچھ اعتدال بھی کم تھا

کہاں کی دانشِ آئندہ، اے فضا ہم کو
شعورِ ماضی و عرفانِ حال بھی کم تھا

رفیعہ شبنم عابدی

غزلیں

دل میں، احساس میں، خوابوں میں مری خوشبو ہے
ترے شعروں میں، کتابوں میں مری خوشبو ہے

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں گھروندے تیرے
تیری آنکھوں کے سرابوں میں مری خوشبو ہے

کچی مٹی کے گھڑوں تک ہی نہیں ہے محدود
ساری دنیا کے چنابوں میں مری خوشبو ہے

جانے کیوں میں نے یہ محسوس کیا ہے اکثر
اس کے آنگن کے گلابوں میں مری خوشبو ہے

مجھ سے بچ کر تو شرابوں کا سہارا مت ڈھونڈھ
سب گلاسوں میں، شرابوں میں مری خوشبو ہے

کون شبنم در دل پر یہ لگاتا ہے صدا
"ڈوبتی رات کے خوابوں میں مری خوشبو ہے"

دل کے صحرا سے تری یاد کے آہو نکلے
یا اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے جگنو نکلے

مفتیٔ شہر! بنا اپنی زباں کو یا سنگ
لوگ کانوں پہ دھرے آج ترازو نکلے

وقت کی تند ہوا خود ہی بکھر جائے گی
پھول احساس کے مرجھائیں تو خوشبو نکلے

بے اثر ہونے لگی اب تو نظر بندی بھی
اب مرے سر سے ترا بولتا جادو نکلے

"پی" کہاں کون سے پردیس گئے کیا معلوم
اب پپیہے کی زباں سے تو فقط "ہو" نکلے

کوئی شبنم کی طرح جلنے والا ہی نہیں،
لوگ سورج سے بچاتے ہوئے پہلو نکلے

غزلیں

ناصر بغدادی (نائیجریا)

میں تغیر ہوں زمانے کو یہ دکھلاؤں گا
موت جینے کی سزا ہے تو میں مرجاؤں گا

میرا ایمان تغیر کے سوا کچھ بھی نہیں
وقت بدلے گا تو میں خود بھی بدل جاؤں گا

کس لئے میں ہوں تصور میں کسی اور کے ساتھ
پاس آجا تری باہوں میں سمٹ جاؤں گا

میں خداوند ہوں بگڑی ہوئی اس دنیا کا
وقت تھمے گا تو میں وقت کو دکھلاؤں گا

رات کی آنکھ پہ ٹھہرا ہوا اک آنسو ہوں
جب سحر ہوگی تو چپ چاپ پگھل جاؤں گا

میں کہ سرگرم سفر ہوں، نہیں منزل کی تلاش
اک دریا ہوں کہ بہتا ہی چلا جاؤں گا

وقت کی قید سے نکلا ہوا اک قیدی ہوں
وقت چلے گا تو پھر قیدی ہو جاؤں گا

کسی آواز پہ رک جاؤں یہ ممکن ہی نہیں
ایک نغمہ ہوں فضاؤں میں بکھر جاؤں گا

ایم، اے، ضیا

آنکھ کے تالابوں کو نیند کیوں نہیں آتی؟
بن پڑھے کتابوں کو، نیند کیوں نہیں آتی؟

رات کے اندھیرے میں آکے کیوں ڈراتے ہیں
ان حسین خوابوں کو، نیند کیوں نہیں آتی؟

خار تو ہیں دامن میں آنکھ میں ہے آنسو کیوں
مخملی گلابوں کو، نیند کیوں نہیں آتی؟

جوڑنے گھٹانے کا سلسلہ ہے روز و شب
کوئی پل حسابوں کو، نیند کیوں نہیں آتی؟

بارشوں کے موسم میں اور تیز جلتے ہیں
جلتے آفتابوں کو، نیند کیوں نہیں آتی؟

پیاس ہے تو صحرا میں موت روز ہوتی ہے
پھر ان سرابوں کو، نیند کیوں نہیں آتی؟

اے ضیا نہ جانے کب ہم تو سو گئے لیکن
فکر کے عتابوں کو نیند کیوں نہیں آتی؟

گیا

غزلیں

شمس تبریزی

جس نے بڑوں کے قول کو یکسر بھلا دیا
اس نے یہاں پہ اپنا سبھی کچھ دھلا دیا

میں نے جلایا ملبہ جو گھر کا اپنے آج
اس نے بھی ملبہ گھر کا اپنے جلا دیا

دیکھا وجود مسخ کسی کا تو یوں لگا!
دل پہ کسی نے جیسے کہ خنجر چلا دیا

نا جانے کیوں ہیں مجھ سے اسے خاص رنجشیں
کھانا بھی آج گھر پہ ہی اپنے کھلا دیا

تھا محو جو خیز بچے کے آج پھر
شانے کو تھپتھپا کہ ماں نے سلا دیا

سب کی طرح سے میں نے بھی اپنی کتاب پہ
علمائے شاعری سے مقدمہ لکھا دیا

کرتا ہے شمس شکر ادا تیرا بار بار
مانگا جو اس نے تجھ سے وہ سب کچھ دلا دیا

شہپر رسول

سوچیں گم سم، آنکھیں حیراں، مجھکو ہمت دے
چاروں اور غضب کا طوفاں مجھکو ہمت دے

وقت سے تنہا جنگ نہیں لڑ پاؤنگا میں
بھڑک دے سارا غصہ جاناں مجھکو ہمت دے

سب ہی زخمی لیکن میں ہوں سر تا پا زخمی
میں بھی ناچوں جشن نگاراں مجھکو ہمت دے

حالانکہ سب لوگ جہاں میں خوش تو نہیں لیکن
کیسے کاٹوں کرب کا زنداں، مجھکو ہمت دے

سب جا پہونچے میں بھی اپنی منزل پر پہنچوں
میرے رفیق اے عزم یاراں مجھکو ہمت دے

روز تو اپنے ہاتھوں سے ہی آگ نہیں لگتی
میں بھی مناؤں جشن چراغاں مجھکو ہمت دے

کام بہت مشکل ہے شہیر لیکن اے شہپر
بدلوں سب کی فکر کے عنواں مجھکو ہمت دے

غزل

منظر لہو لہان ہوا، پر بکھر گئے
سرکاٹ کر حیات کے لمحے گذر گئے

نخلوں کو کر کے برہنہ موسم گذر گئے
شاخوں کے ساتھ ساتھ پرندے بکھر گئے

زنجیر کرب میں ہمیں الجھا گئے مگر
لیلائے کائنات کے گیسو سنور گئے

یاد آ گیا کسی کا سلگتا ہوا شباب
سورج کی آگ میں جو گھڑی بھر ٹھہر گئے

نکلے تھے وہ بھی اپنے گھروں کی تلاش میں
ہر سو بھٹک کے مسافر جدھر گئے

وہ آگ میں سفر کی دہکتے رہے مدام
جو چھاؤں دیکھ کے راہ گزر میں ٹھہر گئے

ہم دیکھتے ہی رہ گئے سو حسرتیں لئے
برسے بغیر کتنے ہی بادل گذر گئے

محروم یاں خرابۂ ارماں کی کیا بتاؤں
تاریکیوں میں گھٹ کے اجالے بھی مر گئے

گہرے سمندروں نے پکارا عجب طرح
پایاب ہجر میں شناور اتر گئے

پرکاش جب لہو میں قلم کو ڈبو لیا
ہم زندگی کے خاکے میں سو رنگ بھر گئے

پرکاش تیواری

خاور اعجاز (پاکستان)

گلاب چہروں پہ شبنمیں کہکشاں سلامت
مرے خدا اس زمیں پہ رکھ آسماں سلامت

خیال کی وادیوں میں جگنوؤں میں ہمیشہ
حروف پھولوں پہ صوت کی تتلیاں سلامت

دعا کی منزل سے اک صدا آ رہی ہے
مرے سفر میں رواں سبھی کارواں سلامت

ابھی ہے دشمن سمندروں میں بھنور دہکتے
ابھی تو کشتی میں ہے کٹا بادباں سلامت

لکھیں گے تیری نوازشوں کی حکایتیں بھی
رہیں اگر تیرے عہد میں انگلیاں سلامت

معیار بارہ بنکوی

مجھے کیا آگ پانی میں لگی معلوم ہوتی ہے
ہمیں تو یہ شرارت آپ کی معلوم ہوتی ہے

بظاہر ہیں مخالف راستوں پر رہبر و رہزن
مگر دونوں کی منزل ایک ہی معلوم ہوتی ہے

مرے حصے میں تھے آنسو مگر سینے میں آیا ہے
کہ اب ان کی بھی آنکھوں میں نمی معلوم ہوتی ہے

اب اس گلچیں کا ذوق باغبانی پوچھئے کیا ہو
جسے سوکھی ہوئی ڈالی ہری معلوم ہوتی ہے

تم اپنی زندگی سے مطمئن ہو زندگی والو!
مگر یہ زندگی کیا زندگی معلوم ہوتی ہے

لبوں کو سی لیا پھر بھی نشانہ بن گیا ہوں کر
ہماری خامشی بھی بولتی معلوم ہوتی ہے

یہاں تک سلسلہ معیار پہنچا بدگمانی کا
کہ اچھی بات بھی ان کو بری معلوم ہوتی ہے

تبصرہ

نام کتاب : عزیز احمد بحیثیت ناول نگار
مصنف : ڈاکٹر اسلم آزاد
پبلیشر : آہنگ بک سینٹر پٹنہ
قیمت : پندرہ روپے۔
سنہ اشاعت : دسمبر ۱۹۸ء
مبصر : کلام حیدری

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔
(۱) موضوع اور مسائل
(۲) معاشرہ نگاری
(۳) واقعہ نگاری،
(۴) کردار نگاری،
(۵) پلاٹ۔

مصنف نے بتایا کہ ادب میں فطرت نگاری کی مقام امام زولا کو "تسلیم کیا" گیا ہے۔ اور پھر یہ کہ اس اقدام کو ملک میں نے پسند نہیں کیا۔ نتیجتاً یہ رجحان کچھ دنوں کے لیے ختم ہو گیا۔ اس رجحان کی تعریف کے لئے DICTIO-NARY OF THE LITERATURE کا اقتباس دیا گیا ہے۔ مصنف نے ایک ڈکشنری پر بھروسہ کر کے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ اور یہ بات غلط لگتی

گیا

ہے کہ زولا کو فطرت نگاری (NATURALSM) کا امام تسلیم کیا گیا ہے۔ زولا تو فطرت نگاری کی تائید کرنے والا ہے۔ وہ امام نہیں ہے امام دراصل CON-COURT BROTHERS) ہیں۔ جنہوں نے GERMINIE LACERTEUX ناول میں تخلیق کیا۔ اس ناول میں ایک ملازمہ کی زندگی کو تفصیلات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کو زولا نے بہت پسند کیا جو NATURALISM کا بڑا THEORIST ہوا۔ زولا نے اپنے مشہور مقالے LE ROMAN EXPRIMENTAL (THE EXPRIMENTAL NOVEL) میں لکھا ہے کہ ناول نگار کو سائنس داں کی طرح تجربہ کرنا چاہئے جو رسوم کی قید اور پہلے سے طے کئے ہوئے اصولوں سے آزاد ہو۔ اس تھیوری کو زولا نے برتنے کی کوشش کی۔ اپنے ناول THERESE RAQUIN (1868) اور L ASSOMMOIR (1877) میں زولا تھیوری کو برتنے کی کوشش بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس نے اپنے ناولوں کو بالزک اور فلابیر کے ناولوں حقیقت پسندی سے ممیز کرنے کے لئے ان کو NAT-URALISTIC کہا۔ اگرچہ اس کی خواہش تھی کہ وہ اس اصطلاح کے ذریعہ اپنی تھیوری اور طریقہ کار کو مشخص کرائے۔ مگر بیشتر اس کے عملی نفس مضمون ویسے ہی ہیں۔ اور یہی اس کی تقلید کرنے والوں کے ساتھ ہوا۔ بات چونکہ ناول کے ضمن میں ہو رہی اس لئے میں اس NATURALISM کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ جو شاعری خصوصاً روسی ادب سے متعلق ہے۔

اسلم آزاد نے فطرت نگاری NATURALISM

کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ عزیز احمد کو زولا کے بغل میں کھڑا کرنے کے لئے کافی تھا ہے۔ مگر ان کا فطرت نگاری کے سلسلے میں علم کا حال اوپر کی سطروں میں ہو چکا ہوگا۔ اس باب کا نام اور نفس مضمون دونوں میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مگر اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نفس مضمون پر ہی غور کر لیا جائے۔

عزیز احمد کے سلسلے میں موصوف کا پہلا جملہ یہ ہے

"اردو ادب میں فطرت نگاری کا رجحان
باضابطہ طور پر عزیز احمد کے یہاں ملتا
ہے"

فطرت نگاری ہے کیا۔ اس پر سرے سے کوئی بحث ہی نہیں کی گئی کہ کتاب پڑھنے والا یہ جان سکے کہ یہ ہے کیا۔ اور عزیز احمد کے یہاں یہ "باضابطہ طور پر" اسلم آزاد کو کیسے ملا جبکہ خود زولا جیسے بلند قامت کے یہاں یہ عمومی نفس مضامین سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ علاوہ باضابطہ طور پر اس کے یہاں بھی ظہور اس کا نہ ہو سکا۔ زولا کے مقلد حضرات عزیز احمد سے زیادہ بلند قامت ہوئے ہیں۔ پھر عزیز احمد شعوری طور پر بھی زولا کی تقلید کریں تو اس سے کیا بنتا ہے؟

ہوس اور مرمر اور خون کو اپنا ناول کہتے ہوئے عزیز احمد کو شرم آتی ہے ـــــــ یہ لکھنے کے فوراً بعد اسلم آزاد نے رابرٹ لیڈل کا قول نقل کیا ہے:

"بہترین زبان میں انسانی فطرت کی گہری
واقفیت کا ثبوت دینا، اس کی سچی
عکاسی کرنا ناول نگار کا کام ہے"

اس قول کو اچانک نقل کر دینے سے احساس ہوتا ہے کہ جیسے مصنف کو ڈر ہو کہ آگے کہیں پر اسے نقل کرنے کی گنجائش نہ نکلے، اس لئے یہاں پر بھی بغیر گنجائش نکالے ہی نقل کر دیا۔ ناول پر ایسی آرا کی کوئی قیمت نہیں ہے جب تک کہ وہ نقاد کی کہی ہوئی کسی بات کی تصدیق یا تردید نہ کرے،

پہلا باب خیالات، اقتباسات، بیانات ـــــ کچے، ادھ پکے، غلط اور صحیح مماثل اور متضاد ـــــ کا ایک ایسا مجموعہ ہے کہ جیسے بچے کے آگے سینکڑوں اچھے، ٹوٹے، ادھورے کھلونوں کا انبار لگا دیا گیا ہو۔ پہلے باب کا حاصل کیا ہے۔؟ اجنبی، بڑے چھوٹے غیر ملکی فنکاروں کے نام ایک ایسے عقبی دیوار پر ٹانک دیئے گئے ہیں کہ نہ دیوار نظر آتی ہے نہ ان سب کی موجودگی سے کوئی نتیجہ نکلتا ہے۔ اور نہ سمت کا اشارہ ملتا ہے۔ بس یہ بات متفرقات کا مجموعہ ہے۔ اور نامکمل اور اچانک ختم کر دیا جاتا ہے ۲۳ صفحات کا باب کچھ نہ دے سکے تو مایوسی ہوتی ہے

معاشرہ نگاری کے عنوان سے جو باب شروع ہوتا ہے۔ اس کا احوال اسی باب کے ابتدائی جملے سے ہوتا ہے:

"واقعات اور کرداروں میں توازن اور
ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے عزیز احمد
اپنے ناولوں میں فضا آفرینی پر خصوصی
توجہ دیتے ہیں"

اس ابتدائی جملے کی تائید میں انہوں نے ممتاز شیریں کا اقتباس دیا ہے۔

معاشرہ نگاری کے عنوان کے تحت فضا آفرینی سے ہی باب شروع ہوا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ دونوں ہم معنی ترکیبیں ہیں۔ یا نقاد عنوان مقرر کر کے ممتاز شیریں کی طرف متوجہ ہو گیا؟

آگے پڑھنے پر پتہ چلتا ہے کہ ایسی بلندی اور پستی یعنی جس زوال آمادہ جاگیردارانہ ماحول اور معاشرہ کی نشی

گیا

کیا گیا ہے۔ اس کا ذکر خلیل الرحمٰن اعظمی کے توسط سے کیا گیا ہے۔ غلط مباحث اس کتاب کے اس باب کا بھی عیب ہے۔ اور ٹکڑے ٹکڑے نوٹس (NOTES) کو منضبط کرنے سے نقاد یا تو واقف نہیں ہے۔ یا کتاب جلدی تیار ہو جانے کی دُھن میں اس نے عزیز احمد کے فن اور مواد کو ہضم کرنے کی جانب توجہ نہیں کی ہے۔ اب دیکھئے اسی باب کا ایک اقتباس:

عزیز احمد کی منظر کشی، فطرت نگاری، معاشرہ
طرازی (؟) ماحول نگاری اور بیانیہ
قوت (یا قوت بیان) کا اعتراف احسن
فاروقی، سہیل بخاری، اور انتظار حسین
نے بھی کیا ہے صفحہ ۲۵ (بریکٹ میرے ہیں)

پورے باب کا نقاد نے آخری نتیجہ یہ نکالا ہے۔

عزیز احمد کے ناول اپنے عہد کی زرّیں
تاریخ بن گئے ہیں۔ صفحہ ۴۱

لفظ زرّیں تاریخ کی تعریف بن گیا ہے۔ عزیز احمد کے ناول کا نہیں۔

عزیز احمد کے ناول ایسی بلندی، ایسی پستی اچھا ناول ہے۔ اہم ناول ہے۔ (اردو کی کم مائیگی!) مگر محض وہ حیدرآباد کی اونچی شہری سوسائٹی کی عکاسی تک ہی محدود ہے پورا حیدرآباد تک نہیں ہے۔ پورا عہد تو خیر کہاں سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا باب واقعہ نگاری کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ پہلا جملہ ہے:

اپنے ناولوں کے پلاٹ کی تشکیل کے دوران
عزیز احمد واقعہ نگاری میں حقیقت پسندی
کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ صفحہ ۴۲

اس باب میں یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ واقعہ نگاری کس کو کہتے ہیں۔ اور نہ یہ کہ عزیز احمد کے یہاں کیسے ہے اور واقعہ نگاری میں حقیقت پسندی کو زیادہ اہمیت دینے کا کیا مفہوم ہوا؟ یعنی واقعہ نگاری میں حقیقت پسندی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہ باب بھی ژولیدہ بیانی، پراگندگی، اور غیر مرتب خیالات کی نذر ہو گیا ہے۔

کردار نگاری کے تحت باب یوں شروع ہوتا ہے

عزیز احمد کے ناولوں کی سب سے اہم
صفت ان کی ترقی یافتہ تکنیک ہے۔
ناول کے اسلوب کو بھی انہوں نے ممکنہ
جدت کے ساتھ پیش کیا ہے

کردار نگاری سے باب کی ابتدا ہی نہیں کی گئی ہے۔ پراگندگی خیال اور ضابطے کے فقدان کا جہاں یہ عالم ہو وہاں عزیز احمد جیسے پیچ دار ناول نگار کا حشر معلوم!

آگے چل کر کرداری نگاری کا اسی حد تک ذکر ہے جس کا تعلق عزیز احمد سے ہے وہ بھی منتشر اور ایک ہی باب میں تکرار کے ساتھ۔ پھر بھی یہ باب پہلے والے ابواب سے نسبتاً بہتر ہے۔

آخری باب پلاٹ کے عنوان سے پیش کیا گیا۔ اور یہ باب اپنے ابتدائی جملے سے ہی لگتا ہے کہ یہ واقعی پلاٹ سے متعلق ہے۔

"عزیز احمد کو پلاٹ کی تشکیل کا ملکہ حاصل ہے"

مگر نقاد یہ فرق نہیں کر سکا کہ تکنیک اور پلاٹ دونوں ایک نہیں۔ اس لئے احسن فاروقی کا ایک اقتباس عزیز احمد کو مکمل معیاری (یہ الفاظ نقاد کے ہیں) پلاٹ ساز نہیں ثابت کرتا۔ نقاد نے خود پلاٹ کی کوئی مختصر سی تعریف بھی نہیں پیش کی ہے۔ صرف مشاعروں کی داد کی طرح عزیز احمد کے پلاٹ پر واہ واہ کی آواز بلندی کی ہے

بلاٹ کی مختصر تعریف یہ ہے۔
"کہانی یا ڈرامے میں واقعات کی تنظیم"
اور تکنیک کی تعریف یہ ہے:
کہانی کہنے کا طریقہ۔ (پڑھئے تکنیک کا تنوع)
از ممتاز شیریں۔

ظاہر ہوا کہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں۔

اسلم آزاد نوجوان لکچرر ہیں۔ حوصلہ بھی ان میں ہے توانائی بھی ــــــ توجہ، احتیاط، اور محنت کے علاوہ ریاضت اور کتاب لکھنے کے سلسلے ان میں ضبط بھی پیدا ہو جائے تو ان کا ایک موضوعی تنقیدی کتاب لکھنے کا رجحان بہت کام آسکتا ہے۔ اور اردو کو ان سے بہت کچھ مل سکتا ہے۔ فکشن پر وہ شاعر ہو کر توجہ کرتے ہیں یہ اہم بات ہے کیونکہ PURE CRITIC سے اردو کا ناطقہ بند ہے۔ تخلیقی ذہن رکھنے والے اسلم آزاد کو تنقید کی دنیا میں دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ کہ تخلیقی ذہن خالص نقاد کی ضرب اور تقسیم سے تخلیق کو بچائے گا اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ یہ ایک اہم ناول نگار پر لکھی گئی ہے۔

نام کتاب : اصول تعلیم اور عمل تعلیم
مصنف : ڈی ایس گورڈن
مترجم : ڈاکٹر جلیل الرحمٰن سیفی پریمی
ناشر : ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
قیمت : ۱۶ روپے ۷۵ پیسے
سنہ اشاعت : ۱۹۸۰ء
مبصر : کلام حیدری

ترقی اردو بیورو کی ۲۰۷ ویں کتاب ہے۔ آفسٹ پر ڈیمائی سائز میں شائع ہوئی ہے قیمت کم رکھی گئی ہے۔ کہ درس و تدریس کے پیشے سے متعلق حضرات خرید سکیں۔ اور پڑھ سکیں۔ اور اصول تعلیم کے علاوہ عمل تعلیم کی جانب بھی متوجہ ہو سکیں۔

ہر چند کہ "عمل تعلیم" کے جو نمونے ہندوستان بھر کے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دیکھے جارہے ہیں۔ اور جس طرح عام سماجی اور سیاسی ماحول مجرمانہ فضا بنا رہا ہے۔ اس کے پیش نظر اس کتاب کے لکھے جانے، ترجمہ کئے جانے اور شائع کئے جانے پر یوں افسوس ہوتا ہے۔ کہ کس درس دینے والے کو "ترقی" کی دوڑ اور دھن میں عمل تعلیم اور اصول تعلیم سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔

لیکن اس کتاب کی افادیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اب معاشرت خدا ہی فائدہ نہ اٹھائے اور سیاست اور اقتدار کے خدا بناتا رہے تو اس میں خدا کیا کرے!

کتاب پر مفصل گفتگو کے معنی ہوں گے ۲۰، ۲۵ صفحات لکھے جائیں۔ جو تبصرے میں ممکن نہیں۔ اور تبصرہ اس کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا۔ ایک بات جو مجھے کھٹکتی ہے۔ کہ مصنف کا دو سطروں میں بھی تعارف نہیں ہے۔ اس کی ضرورت اس لئے زیادہ تھی کہ ڈی۔ ایس۔ جی جیسے باصلاحیت ماہر تعلیم کے بارے میں ہمیں بتانا ضروری تھا۔

کتاب میں اصول تعلیم اور عمل تعلیم کا ابتدائے آفرینش سے لے کر جدید زمانے تک کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ اور بے حد خوبصورتی اور مناسبت کے ساتھ ہر عہد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر معاشرے اور تہذیب میں حصول علم کا حال بتایا گیا ہے۔

پانچ ابواب اصول تعلیم پر ہیں جو بلا شبہ اصول تعلیم بھی ہے۔

دیگر باب عمل تعلیم کے ہر پہلو اور ہر حصہ پر ہیں۔ تعلیم عمل کیا ہے؟ بچہ کیا ہے؟ بچے کے مطالعے کی ضروریات کیا ہیں۔ بچوں کی نشوونما کی منزلیں کتنی ہیں۔ اور ہر منزل پر استاذ کو کیا کرنا چاہئے۔ استاد اور شاگرد کا کیا رشتہ ہونا چاہئے۔ یہ بحث ہر جگہ چل رہی ہے مگر مسئلہ حل ہو نہیں پاتا۔ اس کتاب میں اس مسئلے پر مدلل بحث نظریاتی بحث کے علاوہ عملی طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ اور بڑی مہارت اور بڑی محنت کے ساتھ اس باب کو قیمتی باب بنایا گیا ہے۔

تعلیم کے مختلف شعبوں پر الگ باب میں بحث کی گئی ہے لیکن کئی پہلو شاید ہی کہیں نمایاں ہوا اس پر کم محنت کی گئی ہے۔

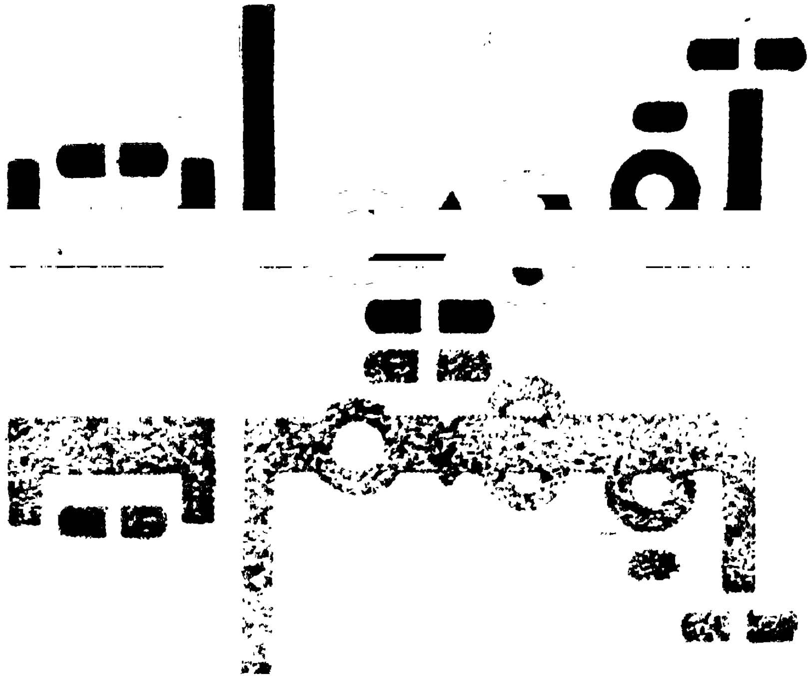
آخری باب پوری بحث کو بڑی مہارت کے ساتھ اختتام تک پہونچاتا ہے۔ اس میں طریقۂ تدریس کے عملی پہلوؤں پر بحث کر کے بڑی سلاست کے ساتھ موضوع کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے۔

ترجمہ رواں، شگفتہ اور بے ساختہ ہے۔

ہر تعلیمی ادارے میں اس کتاب کا ہونا ادارے کا بہتری کا سامان ثابت ہوگا۔

N. Regd 4253/64
T. Regd No. Gy. 7
one—432

THE AAHANG Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

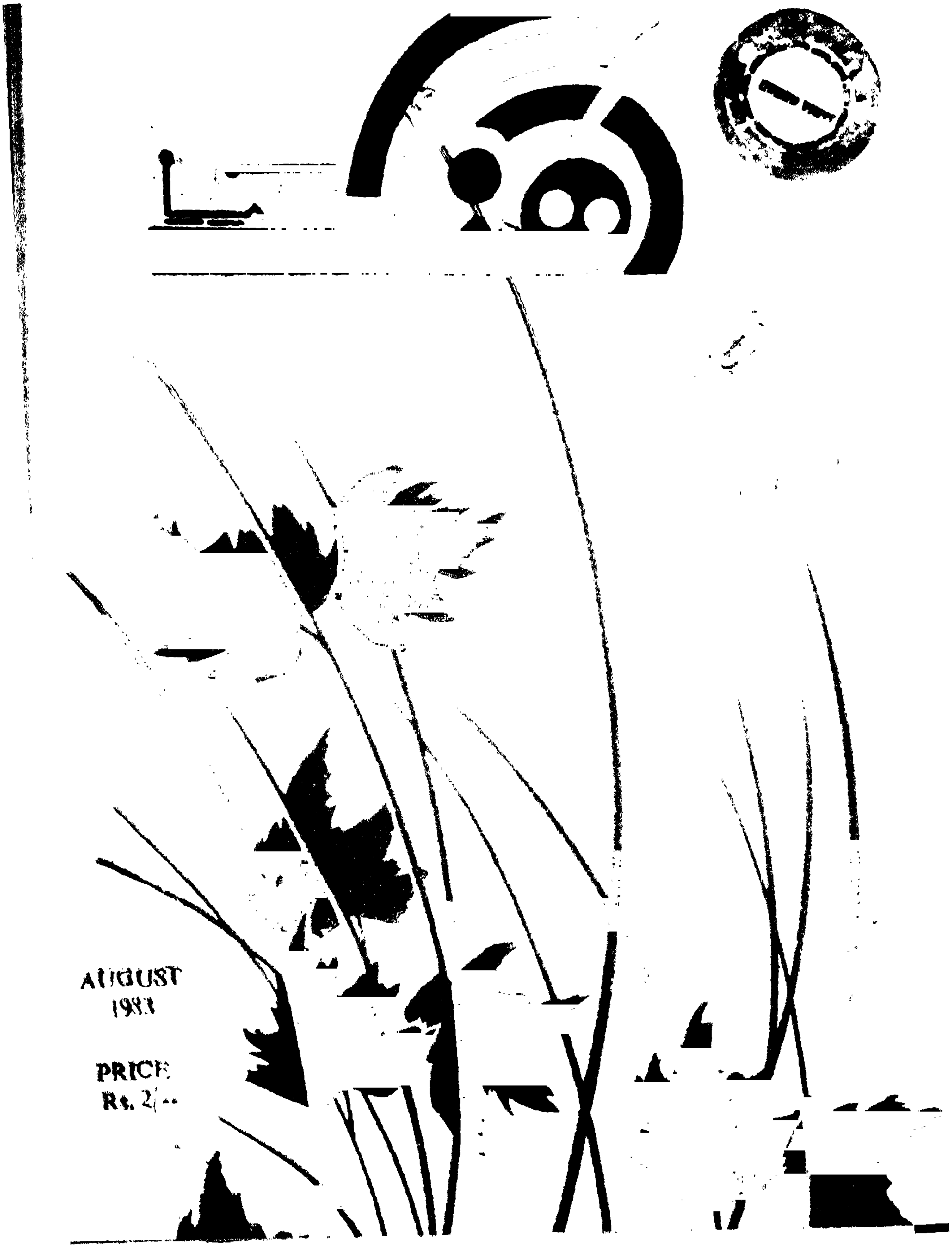


تنقیدی مضامین

کلام حیدری

PRICE Rs. 20

The Cultural Academy, Gaya.



AUGUST
1983

PRICE
Rs. 2/-

دی کلچرل اکیڈمی ریسنہ ہاؤس گیا

قائم شدہ ۔ سنہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

سالانہ خریداری ۲۰۔ بیس روپے

ایک شمارہ ۲٫۵۰ دو روپے

فون نمبر ۲۳۳

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشابہ حق ، عبد الصمد

دی کلچرل اکیڈمی گیا کی تمام مطبوعات (کتابیں ، رسائل ، پمفلٹ) نیز شائع ہونے والی ادبی و نیم ادبی تخلیقات میں نام ، مقام ، واقعات ، ادارے اور کردار ساری چیزیں سو فیصدی فرضی ہوتی ہیں حقیقی نام ، واقعات ، ادارہ ، کردار اور افراد سے اس کی مماثلت یا مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے کلچرل اکیڈمی گیا کسی فرد ، ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلشر ، اراکین ، معاون ، کارکن یا مصنف پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ۔ ادارہ

کتابت : کلیم الناسی ڈنگروی ——— طباعت : ہند لیتھو پریس گیا

محتویات

کشکول

آہنگ کے صفحات پر سیاست سے متعلق باتیں کر کے مسرت تو نہیں ہو سکتی. مگر میں اگست کے اس شمارے میں آزادی کی سالگرہ کا ذکر کیسے نہ کروں کیوں کہ آزادی تو لکھنے پڑھنے اور بولنے کا حق دیتی ہے اور ادیب و شاعر کو ان بنیادی آزادیوں کی ضرورت شاید سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

سب سے پہلے ہم آزادی کے لیے شہید ہونے والے بھگت سنگھ جیسے سپوتوں کو عقیدت اور احسان کے پھول نذر کریں، جنھیں اُس وقت کی سیاسی بیداری پیدا کر [illegible] نے انتہا پسند اور مہم پسند کہہ کر اُن کی شہادت کی توہین بھی کی اور عوام [illegible] سمجھوتے کے راستے پر [illegible] گئی نتیجے میں ہندوستان میں آزادی رات کے اندھیرے [illegible] طرح آئی کہ جیسے وائسرے ہاؤس میں مجرمین کوئی سازش کر رہے ہوں، صبح ہوئی تو [illegible] ہندوستان کی سرحدیں تنگ ہو گئی ہیں اور ٹیبل پر رکھے نقشے پر کچھ لکیریں اسکیل سے ناپ ناپ کر کھینچ دی گئی ہیں اور سفید فام آقاؤں نے ہمیں خاک و خون میں تڑپنے کی آزادی بخش دی ہے۔

گاندھی سوگوار تھے۔

خان عبدالغفار خاں نے کہا: ہمیں بھیڑیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام کی تمکنت نے سارے آنسو اپنے اندر جذب کر لیے۔

سبھاس چندر بوس کی روح تڑپی۔

حسرت موہانی جھلّائے۔

آزادی کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے مگر ہم نے نظر اُٹھائی تو آزادی تین رنگوں میں سہمی سہمی سی کھڑی ہندوستانی عوام سے معذرت طلب کر رہی تھی۔

اور فیض کو اسے اُجالا ماننے میں دقّت ہوئی۔

...انسانیت کو برتنے والا اور اس کی تبلیغ کرنے والا کرشن چندر کچھ دیر
کے لیے انسانیت پر اپنا یقین کھو بیٹھا ــــــــــ ہم وحشی ہیں ــــ
بھگت سنگھ کو پہلی اور آخری بار پھانسی پندرہ اگست کی رات کے سناٹے
اور اندھیرے میں دیش بھگتوں نے دے دی۔

یہ چھتیس ۳۶ سال پہلے کی بات ہے، بات پرانی ہو جائے تو کیا زخم مندمل ہو جاتے ہیں؟
شکر ہے ہم نے اپنی بدحواسی اور شدبدلت پر قابو پایا اور دستور بنانے لگے اور ملک کو
"سکولر" اور "جمہوریہ" بنایا ــــــــــ یہ پنڈت جواہر لعل نہرو کی قد آور شخصیت کے طفیل ہوا
ورنہ سکولر اور جمہوریہ ہونے کی بجائے ہمارا آزاد ہندوستان بھی مذہبی اور آمری ہو سکتا تھا!
آیئے اُس عظیم دانشور، عالم اور انسانیت دوست سوشلزم پر یقین رکھنے والے
جواہر لعل نہرو کے آگے عقیدت کے گلدستے نذر کریں۔
اور آیئے اِس چھتیس ۳۶ سال میں غریبوں کے غریب تر ہو جانے پر اور امیروں کے
امیر تر ہو جانے پر رسماً بھی دو بوند آنسو گرا لیں۔
اور بے شمار سیاسی پارٹیوں کی اقتدار کی ہوس کے شکار ہم سب تہیہ کریں کہ
آزادیٔ گفتار اور آزادیٔ تحریر پر ہونے والے ہر حملے کے لیے ہم بھگت سنگھ ثابت ہوں گے۔

اے قلم!
لکھ دے کہ دستور کی موٹی کتاب کے ہر لفظ کو اُس تابوت سے نکال کر اُس میں
روح پھونکیں گے، اُسے زندہ کریں گے، کہ ہر لفظ انقلاب کی مشعل بن کر ہندوستان کو
سچا اُجالا بخشے گا۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ

تاج بھوپالی کی غزل ۔ ایک مختصر مطالعہ

محمد علی تاج بھوپالی کی شعری تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں اکثر یہ خیال آیا ہے کہ ان کے یہاں نظموں کا سرمایہ غزلوں کے مقابلہ میں اتنا کم کیوں ہے جسے برائے نام کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں اور پوچھنے میں حق بجانب بھی ہوں گے کہ آخر یہ خیال تاج ہی کے متعلق غور کرتے ہوئے کیوں میرے ذہن میں آیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تاج کے کلام میں نہ صرف یہ کہ باہر کی دنیا اور اس سے متعلق مختلف مسائل سے گہری دلچسپی کا اظہار ملتا ہے بلکہ ایک مخصوص نظریہ حیات سے شدید وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ میری مراد ترقی پسند نظریہ حیات سے ہے ان کے ادبی شعور کے ارتقاء کا زمانہ بھی کم و بیش یہی ہے۔ جسے ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عظمت اللہ خاں اور کلیم الدین احمد کی غزل دشمنی سے قطع نظر جس کے اسباب بالکل مختلف تھے۔ ترقی پسند تحریک کے بعض اہم علم برداروں کی جانب سے غزل کی سخت مخالفت کی جا رہی تھی۔ کیونکہ ان کی نظر میں غزل ارتقائی عمل اور تسلسل کے وصف سے فطری اور بنیادی طور پر محروم ہونے کے باعث انقلابی اور سماجی تصورات کے منضبط اظہار سے قاصر ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خیال میں اس کی تخلیقات کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہے کہ جدید ترین، سماجی، سیاسی اور تہذیبی خیالات اور تصورات کے اظہار میں یہ اپنی اندرونی قوت لطافت اور رعنائی برقرار رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اپنے عہد کے اس غالب ادبی اور تنقیدی رجحان کے باوجود تاج نے اپنی شخصیت کے اظہار یا اس سے گریز کے لئے خاص طور پر غزل ہی کا انتخاب کیوں کیا۔

ظاہر ہے اس سوال پر غور کرتے وقت سب پہلے یہ غزل کے تاریخی اور روایتی ماحول کے اثرات کے علاوہ جو وجہ میرے ذہن میں سب سے پہلے آئی۔ وہ غزل سے ان کی طبعی مناسبت کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے مجھے تشفی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان کے یہاں محض ایسے اشعار بھی جن کو انتہائی شخصی اظہار کے باعث اور کسی دوسرے حوالے کی عدم موجودگی کی وجہ سے داخلی محسوسات کے ضمن میں شمار کیا جائے گا۔

بہت کیا بات تھی بن شب ماہ بھی
تم تیرے گرد تھے چاندنی کی طرح
ترے خیال کی ہمسائیت ارے توبہ
قریب دل تری سانسیں سنائی دیتی ہیں

فراق یار کا عالم نہ پوچھو
کوئی جیسے کلیجہ چاٹتا ہے

اگر ان کے کلام کا بیشتر حصہ ایسے ہی خوب صورت اور پُر تاثیر مگر انتہائی داخلی اور شخصی احساسات پر مبنی اشعار تک محدود ہوتا تو تاثرات کو آگے نہ بڑھایا جاتا۔ مگر میری دقت یہ ہے کہ تاج کے کلام میں ایسے اشعار خاصی تعداد میں موجود ہیں جہاں شاعری کی گئی ہے حواس اور اعصاب کے وسیلے سے مگر خارجی زندگی اور کائنات کے حوالے پوری طرح محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

پیچھے بندھے ہیں ہاتھ مگر شرط ہے سفر
کس سے کہیں کہ پاؤں کے کانٹے نکال دے
جسے ہو زعم یکتائی وہ تنہا جی کے دکھلا دے
زمانہ کو بدلنے میں زمانہ کام آیا ہے
بتاؤ کوئی زندگی کے علاوہ
کوئی شے اگر جاوداں بن گئی ہے

یہ وہ شاعری ہے جو اور بڑھ جاتی ہے۔ جب خارجی حقائق نسبتاً کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اور شخصی تجربہ کی آنچ میں کبھی تپ کر کندن بن جاتے ہیں۔ اور کبھی ایک آنچ کی کسر کے باعث اپنی قدر کھو بیٹھتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ عمل ہر جگہ کامیابی سے ہمکنار ہو بھی نہیں سکتا۔ کچھ کاریگری کا معاملہ تو ہے نہیں۔ حسن کاری (Art) کا معاملہ ہے۔ اور وہ بھی شاعرانہ حسن کاری کا معاملہ۔ بہر حال اس سے پتہ چلتا ہے کہ بات صرف مخصوص روایتی ماحول اور طبعی مناسبت کی نہیں تھی۔ غزل سے ان کے عشق کے اسباب کچھ اور بھی رہے ہوں گے۔

یہ تو ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان کی غزل گوئی ان کے شخصی [illegible] داخلی تقاضوں کی تخلیق کردہ ہے اور ان کے ضمیر کی [illegible] تاج نے اس صنف سخن کو اپنانے میں محض اپنی مزاجی موانست اور طبعی مناسبت کا خیال نہیں رکھا ہے۔ بلکہ غزل کے اندر صنف سخن کی حیثیت سے جو مخصوص خوبیاں اور توانائیاں موجود ہیں اور جو امکانات پائے جاتے ہیں ان سب کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ان کے شعری مزاج کے اصل جوہر کا اظہار اپنے محاسن کے ساتھ بھرپور انداز میں غزل ہی میں ممکن ہے۔ لیکن اپنے حدود اور نارسائیوں سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے طور پر دوسروں کی رایوں سے مرعوب ہوئے بغیر غزل کی امکانی قوتوں کا احساس رکھتے تھے۔ گہری نظر سے غزل کے امکانات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ ہماری جذباتی اور جمالیاتی تربیت کے لئے غزل کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ داخلی شخصیت کی تہذیب کی ضرورت اس دنیا میں ہر انسانی معاشرہ میں محسوس ہو گی۔ اور اس ضرورت کو پورا کرنے میں فنون لطیفہ کا جو اہم کردار (Role) ہو گا۔ صنف غزل کی تخلیقی کاوشیں بھی اس کا ایک موثر اور نمایاں جزو ہوں گی۔ اتنا ہی نہیں۔ انھوں نے اپنے شعری تجربات کی بنیاد پر یہ راز بھی دریافت کر لیا تھا کہ غزل کے دائرہ کو وسیع تر بنایا جا سکتا ہے۔ اور اس میں ایسے موضوعات اور تصورات کی سمائی ہو سکتی ہے۔ جنہیں غزل کو ہاتھ لگاتے ڈرتے تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو تاج اپنے بہت سے ہم عصر ترقی پسند شاعروں کی طرح غزل سے توبہ کر کے بیانیہ انداز کی سپاٹ نظم گوئی کی طرف مائل ہو جاتے۔ یا اس نوع کی غزلوں تک اپنے کو محدود کر لیتے جن میں ذاتی شکست کی آواز، انفرادی محرومیوں کا اظہار، محبوب کے سراپا کی جھلک اور غم عشق کی کربناکی ہی جلوہ فگن رہتے ہیں۔ لیکن تاج غزل کے گہرے رمز شناس تھے۔ اس لئے انھوں نے اس کی امکانی قوتوں کو بروئے کار لانے میں اس کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے

ی کوشش کی۔ لیکن ان کی اصل خوبی اس امر میں ہے۔ کہ اس تخلیقی عمل میں انہوں نے غزل کو غزل ہی رہنے دیا۔ نظم نہیں بننے دیا۔ وہ کتنی دوررس نگاہ کے مالک تھے اور ان کا تجزیہ کتنا حقیقت پسندانہ تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ آگے چل کر سردار جعفری، مخدوم اور کیفی اعظمی نے بھی غزلوں کی طرف توجہ کی۔ اور مجروح نے تو اسے اپنا فن ہی ٹھہرایا۔

ان کی انفرادیت کو متعین کرنے میں اس تنقیدی شعور کو خاصا دخل ہے۔

تاج جن کے انداز و اسلوب ہیں،
وہ غزل کیوں کہیں گے کسی کی طرح

یہ نہ شاعرانہ تعلی ہے نہ دعویٰ بے دلیل، حقیقت یہ ہے کہ تاج کی غزلوں کا ایک انفرادی مزاج ہے۔ جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی منفرد اور مخصوص آواز پر کسی دوسری آواز کا دھوکا نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ ان کی انفرادیت کا واضح، مکمل اور تشفی بخش تجزیہ ہم نہ کر سکیں۔ لیکن کوئی بھی سخن فہم ان کے کلام کو پڑھ کر یا سن کر فوراً کہہ اٹھے گا کہ یہ رنگ سخن تاج کا ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ فنکار کی انفرادیت کی تعمیر میں کئی عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ طرز احساس، اور انداز فکر، لہجہ کی کیفیت الفاظ کا ترجیحی انتخاب، زبان و بیان کے معاملہ میں مخصوص میلان طبع، دائرہ ادراک، غرض کہ اس کی پوری شخصیت اپنی قوتوں اور کمزوریوں سمیت کارفرما ہوتی ہے۔ اور ان سارے عناصر کے مطالعہ اور تجزیہ کے بغیر انفرادیت کا گرفت میں آنا ممکن نہیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں یہ انفرادیت ذرا کیمیا سب قسم کی چیز ہے۔ فراق صاحب کے لفظوں میں اسے مر مر کے پالنا پڑتا ہے۔ اور جب معاملہ غزل کا ہو تو یہ کام اور دکھوں کا ہو جاتا ہے۔ بات یہ

ہے کہ اردو غزل کی اپنی ایک روایت ہے۔ قدیم بھی اور عظیم بھی۔ ولی، میر اور غالب سے یگانہ، فراق، اور فیض تک خوب صورت، تہہ دار اور پُروقار آوازوں کا ایک سلسلہ ہے۔ جس کی موجودگی میں کسی نئے غزل گو کے لئے اپنی آواز کی انفرادیت کو پانا اور اسے نمایاں کرنا آسان نہیں۔ یوں بھی غزل مزاجی اعتبار سے ذرا نازک مزاج، حساس اور کٹر قسم کی صنف سخن ہے۔ بہرحال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جن شاعروں کے یہاں تجربات میں سچائی، خلوص اور انفرادیت کا فقدان پایا گیا ہے۔ ان کے لئے یہ عظیم روایت بیڑیوں کی بیڑی بن گئی ہے۔ مگر یہی روایت ان فنکاروں کے لئے ایک زبردست تخلیقی تحریک ثابت ہوئی۔ جن کے فن کی اساس شخصی تجربہ اور طرز احساس کی شدت اور ندرت پر ہے۔ محمد علی تاج کا تعلق شاعروں کے اس قبیلہ سے ہے جن کی غزلوں میں ان کے سینہ کی آگ اور دل کا گداز نئی آگہی کے ساتھ منتقل ہوئے ہیں۔ غزل میں لفظوں اور علامتوں کا میکانکی استعمال شروع ہی سے نہایت کثرت سے ملتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ نہایت سطحی کھوکھلا اور بے روح ہو کر رہ گیا ہے۔ مخصوص اور گھسے پٹے الفاظ اور علائم نہایت غیر تخلیقی انداز میں بار بار ملتے ہیں۔ جن میں کسی نئے اور زندہ احساس یا کسی نئی معنویت کا دور دور تک پتہ نہیں تاج نے اپنی غزلوں کو اس فرسودگی اور باسی پن سے بڑی حد تک بچائے رکھا۔ فیشن زدگی کے اس سیلاب میں اپنے قدم کو مضبوطی کے ساتھ جمائے رکھنا اور اپنے فن کی تازگی اور طرفگی کو پارہ پارہ نہ ہونے دینا کوئی آسان بات نہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

فرہاد سے سیادرگی سنگین ہو نہ جائے
تیشہ بدست اٹھو یہ شب کا چٹان ہے

اے ساقی بہار یہ کیسی بہار ہے جو
گزری نہ اپنے سر سے گھٹا تک بھری ہو

آبلہ پائی کا رُخ ہے آج بازاروں کی سمت
اب وہ دیوانہ کہاں جو سوئے صحرا جائے ہے

حاصلِ راہ بھی حاصلِ منزل ہے یہی
اپنے دامن میں نئے گردِ سفر بیٹھے ہیں

شوقِ درماں ہو تو آرزوئے شفا اُن سے کرو
زخمِ دل شمع جلا کر نہیں دیکھے جاتے
تشنگی لاکھ ہو اتنی تو قاتل نہیں

اے مرے دوستو بے حسی جرم ہے
چپ رہا مرد نہ ہنگامہ ہر ذرّہ چپ ہے
آپ چپ ہیں تو سمجھتے ہیں کہ دنیا چپ ہے

خارجی حقائق سے پیدا شدہ موضوعیت اور داخلیت کتنی معنی خیز اور موثر ہو سکتی ہے۔ اس کا کسی قدر اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے۔ یہاں عرفانِ ذات کشمکشِ حیات کا مرہونِ منت ہے۔ ان میں اردو غزل کی روایت کے صحت مند عناصر اور تہذیبِ جدید کے بطن سے جنم لیتے ہوئے مسائل کے شعور و آگہی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ خارجی زندگی کی حقیقتوں کا شعور ان کی شخصیت میں جذب ہو کر اور اس کا جزو لازمی بن کر ان کے فن میں جھلک اٹھا ہے۔ اور شخصی اظہار کے پرتو نے ان کی غزلوں میں وہ تابناکی اور رعنائی پیدا کی ہے جس کی بدولت آج بھی ان کی غزلیں نئی کیفیت کی حامل نظر آتی ہیں۔

تاج نے اپنی زندگی کے ذہنی، جذباتی، اور حسیاتی پہلوؤں کو غزل کے فارم میں اس کے تناسب و محاسن کو برقرار رکھتے ہوئے بلکہ اس میں ایک نیا بانکپن اور ایک نئی کیفیت پیدا کر کے فنی حسن کو وسعت

کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ ان کے خوابوں اور تمناؤں کی دنیا۔ اس دنیا کے لئے ان کے جسم، ذہن اور جذبہ کی قربانیاں، تاریکی کے احساس کے ساتھ نورِ سحر کے لئے بے قرار خواہشیں، غرض کہ ان کی زندگی کی پوری کہانی ان کی غزلوں میں پڑھی جا سکتی ہے۔ زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیتوں اور رنگوں کو پرکھنے میں اور انہیں اپنی غزل کی میں سمو لینے پر انہیں نہ صرف دسترس حاصل ہے۔ بلکہ اس توسط سے انہوں نے اپنی شخصیت کا اظہار بھی کیا ہے۔

تنویرِ سحر تھے ہم تصویرِ شبِ غم ہیں
اے دوست گواہی دے تو نے ہمیں دیکھا ہے

وہ تاج جو ملا سرِ بازار خاک سار
تم کو ملے تو بر سرِ دربار دیکھنا
تم ابھی ہلاکتوں کے سوا کچھ نہ پاؤ گے،
یارو ہمیں کو دیکھو کہ اک تجربہ ہیں ہم

حقیقت یہ ہے کہ تاج نے اردو غزل میں مواد و صورت، اور موضوع و اسلوب کا جو حسین اور متوازن امتزاج پیش کیا ہے۔ وہ ان کا فنی اکتساب ہے۔ غزل میں سیاسی تصورات اور سماجی تہذیبی خیالات کس طرح موثر اور نازک انداز میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔؟ اس سوال کا ایک جواب تاج کی غزل گوئی بھی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے نئے شعور اور سوجھ بوجھ کے ساتھ شخصی تجربہ کی صداقت، لہجہ کا خلوص اور بے ساختگی، اور طرزِ اظہار کی تازگی ملتی ہے۔ انہوں نے پرانی اور نئی، علامتوں، استعاروں، اشاروں اور کنایوں کو اس طرح گھلا ملا دیا ہے۔ کہ ان کی غزلوں میں روایت کی خوش صورتی اور رعنائی کے ساتھ ساتھ نئے ذہن کی کشادگی اور وسعت اور جدت [illegible] سمٹ سمٹ کے آ گئی ہے

ان خصوصیات کی وجہ سے ان کی غزلیں ہر باشعور اور سنجیدہ ادبی ذوق رکھنے والے کے دل و دماغ کو متاثر کرتی رہیں گی۔ آئیے اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے ان کے کچھ اشعار سنیں اور مسرت و بصیرت دونوں حاصل کریں۔

چاند اس طرح سے مدھم ہے سرِ شاخِ گلاب
صورتِ زخم ہو جیسے کہ مسیحا چپ ہے
ہائے رے یہ تشنگی دستِ شوق!
ساغر سے بھی ترا دامن بھرا
آ کے بیٹھا تھا کہ کچھ وضعِ محبت رہ جائے
جا رہا ہوں کہ یہ محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
اب چاند ہے ہاتھوں میں سن لے پہلی گیتی
ہم ترے سے نے تجھ سے بھی آگے نکل آئے
اک تری یاد سے آرائشِ دل باقی ہے
کوئی تصویر ہٹا دے تو یہ دیوار گرے
شمع دہلیز پہ روشن رکھو ——!
کیا عجب ہے کہ وہ آ ہی جائے ——؟ ••

بقیہ: تیسری دنیا

آدمی ہوتا۔ روح لاش کو کپڑا اتار کر او ہر باڈی کا چیک کرتا ہائے۔ روپیا نہیں دینے سے بھوت آفٹ کرتا —— ہمن ہمرا اپنا گھر جانی ہائے۔ آپ لوگ جانے کی نہیں ہمرا اپنا گھر جا۔ اچھا ڈیکھو مین۔ ایک کام کرو۔ سات روپیا ہم کو ڈیڈو۔ بابی گاڈ بولتا ہائے۔ بھوت اچھا سے کام بنا کے دیں گا۔ ایک ڈم تمکو تمہارا وائف کا مالک۔●

گیا۔

بقیہ: کوئی آئے نہ آئے

معلوم ہو رہی تھیں۔ کیونکہ ہر ایک کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ پوپلے منہ دانتوں سے محروم تھے۔ ان کی دھنسی آنکھیں تھیں۔ تیز آنکھیں جو چھریاں بن کر خورشید کا پوسٹ مارٹم کر رہی تھیں۔ پھر سر ہلنے لگے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوئیں۔ دوبارہ ملنے کا وعدہ ہوا۔ اور وہ سب رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد سب خاموش رہے۔ خورشید نے بیش قیمت لباس اتار کر سفید کپڑے پہن لئے تھے۔ سوگوار لباس کا سوگوار دل......

دوسرے دن لڑکے والوں نے انکار کر دیا۔ اماں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بھائی پریشان دکھائی دینے لگے پہلی بار مخالف سمت سے انکار ہوا تھا۔ انکار کی وجہ یہ بتائی گئی کہ لڑکی کی عمر بڑی ہو چکی تھی۔ محدقیں گرگِ باراں دیدہ تھیں۔ انہوں نے یہ راز پا لیا تھا۔

میں نے خورشید کو دیکھا وہ پہلے کی طرح چپ تھی بالکل خاموش، مہر بلب، جیسے وہ اپنے غم سے سمجھوتہ کرنے پر تیار ہو گئی تھی جیسے وہ جان گئی تھی کہ اس کو جس کا انتظار تھا وہ اب کبھی نہیں آ سکتا۔ بھلا ایسے میں دل کے کواڑوں کو بے خواب چھوڑ دینے کا کیا فائدہ جبکہ دور —— حدِ نظر تک سناٹا ہی سناٹا ہو۔ ایسے میں کسی آہٹ۔ کسی دستک کی توقع عبث ہی تو ہے۔ ••

اسعد بدایونی

وزیر آغا کی نظمیں ـ ایک تاثر

وزیر آغا کی شاعری کھلے منظروں، خوش رنگ جہالوں اور پراسرار زمانوں سے عبارت ہے۔ ان کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا حسن بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اور فن کا نکھار بھی۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ جہاں انسانی قویٰ میں اضمحلال پیدا ہونے لگتا ہے وہیں فکر و فن پر بھی ناگوار اثرات پڑنے لگتے ہیں۔ اور وہ ولولہ وہ جوش جو عالم جوانی میں ہمارے شعرا کے یہاں نظر آتا ہے رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگتا ہے۔ مگر فطرت کی سخاوت کچھ حضرات میں نہ جسمانی اضمحلال پیدا ہونے دیتی ہے۔ اور نہ ہی ذہنی پژمردگی سے انہیں واسطہ پڑنے دیتی ہے ڈاکٹر وزیر آغا کا شمار اردو کے ان ہی خوش نصیب شاعروں اور فنکاروں کے ذیل میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے سرچشمۂ فطرت سے آب حیات پی لیا ہے۔ یہ آب حیات جسمانی طور پر ان کے لئے مفید ہو یا نہ ہو مگر ان کی ذہنی بالیدگی میں روز بروز اضافے کا سبب ضرور ہے۔

کچھ عرصہ پہلے وزیر آغا کی طویل خود سوانحی "نظم "آدھی صدی کے بعد" شائع ہوئی ہے۔ اور ایک بالکل نئے تجربے سے اردو دنیا کو روشناس کرا رہی ہے۔ خود کلامی کا جو اسلوب اس طویل نظم میں نظر آتا ہے اس کی مثال اس سے پہلے اردو دنیا میں نہیں ملتی۔ یہ نظم ترسیل و تخلیق کا سنگم معلوم ہوتی ہے۔ نہ اس میں بیان کی ژولیدگی ہے۔ اور نہ فکر کی کم مایگی۔ ایک عجیب وقار اور تمکنت کا احساس اس خوبصورت نظم کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ "آدھی صدی کے بعد" کا آہنگ ایک نرم رو شفاف دریا کا بہاؤ ہے۔ جس کے دونوں کناروں پر درختوں کی قطاریں اور سبزے کی صفیں ہیں۔ جس کے ساحل طمانیت اور آسودگی ساتھ دیکھنے والوں کو دعوت نگاہ دیتے ہیں:

سحر / روز کمرے کی چق کو ہٹاتی / مرے
پاس آتی، مجھے جیسے بیدار کر / گھر سے باہر
نکلنے پہ / مجبور کرتی یہ کہتی: / بہت سو لئے
تم / اٹھو / گھر سے باہر نکل کر کبھی دیکھو /
ہوا کیسی تازہ ہے / کومل ہے / اور دھوپ
کے لمس میں / کتنا نشہ ہے / لذت ہے /
کب تک یوں ہی / یوسٹی بن کے / بستر
میں لیٹے رہوگے

(آدھی صدی کے بعد)

وزیر آغا نے جس طرح اردو تنقید میں ایک بالکل اچھوتا راستہ اختیار کیا ہے۔ اپنی شاعری میں بھی وہ اسی

ح منفرد نظر آتے ہیں ۔ اور قابل غور بات یہ ہے کہ ان
نقادان کے شاعر پر غالب نہیں آتا ۔ جبکہ ہمارے بیشتر
نا دشاعر" شاعری کرتے وقت بھی تنقیدی تعصبات سے
یکارا حاصل نہیں کر پاتے ۔ اور نتیجے کے طور پر نہایت
میا شاعری ان سے سرزد ہوتی ہے ۔ وزیر آغا کا کمال یہ
ہے کہ ان کی تہہ دار شخصیت میں بیک وقت شاعر بھی موجود
ہے اور نقاد بھی ۔ مگر ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہوئے
بغیر ۔

وزیر آغا نے اپنی شاعری میں جن لفظوں اور علامتوں
کو برتا ہے وہ ہماری شعری روایت کا حصہ ہیں ۔ مگر انھوں
نے ان لفظوں اور علامتوں میں اپنی قوت تخلیق سے جو ندرت
پھونک دی ہے ۔ وہ دوسرے ہم عصر شعراء سے انہیں بالکل
جداگانہ حیثیت عطا کرتی ہے ۔ ان کی شاعری کی بنیادی
خصوصیت دھیما پن اور شگفتگی ہے ۔ ان کا لہجہ بھی کبھی
حد اعتدال سے تجاوز کرتا ہوا نہیں معلوم ہوتا ۔ اور جیسا کہ
میں نے ابتدا میں عرض کیا کہ ایک سبک خرام دریا اپنے
حال میں مست بانکپن سے بہتا چلا جاتا ہے ۔ خوبصورت
امیجری کی تخلیق وزیر آغا کا امتیاز ہے ۔ اور معمولی معمولی
چیزوں کو انہوں نے شعر میں اس طرح سمویا ہے کہ ان کی
نئی ترتیب ایک حیرت انگیز مسرت سے متعارف کراتی ہے:

میرا جسم / ریشم کا صد چاک خیمہ / کسی بے
کراں دشت میں بے سہارا اکھڑا ہے ۔
(سمندر اگر میرے اندر گرے)

ہوا ۔ ایک نابینا لڑکی ہے / آنکھوں
کے جنگل میں ہاتھوں سے رستہ بناتے
ہوئے چل رہی ہے ۔ کوئی اس کے کشکول
میں کوئی سکہ گرائے / جلی خشک روٹی
کا ٹکڑا اسے دے تو ۔ ہوا اپنے محسن کو

میٹھی سی کچی طلوع آدمی کے آگے کو بڑھتی
ہے / گہرے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی
منزل بے نشاں کی طرف / آسمان کی طرف
(دست بستہ کھڑا ہوں)

سمندر کے بوسوں سے ہاری ہوئی ریت
(ٹین کا ڈبہ)

بیاض شب و روز پر دستخط ترے
قدموں کے ہوں (دعا)

دریا کے دونوں کناروں میں سیال
سا رابطہ ہوں ۔
(ازل سے ابد تک)

وزیر آغا کی شاعری ایک گمبھیرتا کے ساتھ ساتھ
سرشاری اور لذت سے بھی بہرہ ور ہے ۔ انھوں نے
حیات و کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ کسی ایک جہت
سے نہیں بلکہ مختلف سمتوں سے کیا ہے ۔ اور اپنے تجربات
کو شعر کا پیکر حسن خوب صورتی کے ساتھ عطا کیا ہے ۔ وہ
قامت معنی پر کہیں بھی تنگ نہیں ۔ ان کی فکر ان کے لہو میں
رچی بسی ہے ۔ اور معروضی و موضوعی رشتوں کے کاروبار
کا ایک طویل سلسلہ ہے ۔ جو خوشگوار منظر نامے کو
تشکیل کرتا ہے ۔

وزیر آغا کی شاعری کا رشتہ زمین اور اس
کے مظاہر سے بہت مربوط اور پائدار ہے ۔ انہوں نے
زمین کی زرخیزی اور شادابی سے متعلق نئی نئی علامتیں
وضع کی ہیں ۔ جو ترسیل و ابلاغ کے نقطہ نظر سے بھی
کامیاب ہیں ۔ اور جمالیاتی طور پر بھی خوشگوار اثرات
کی حامل ہیں ۔ سطور تمثالوں کے تہہ در تہہ جہان اپنی
تمام تر نیرنگیوں کے ساتھ ان کے یہاں جلوہ گر ہیں ۔ ان
کا رخش خیال فکر و فن کی تنگ و تاریک اور پرخطر راہوں

سے معیار قیادی کے ساتھ گذرتا ہے ۔ اور کہیں ٹھوکر نہیں کھاتا ۔ جو ان کی فکری ذہنی چابک دستی کی غمازی کرتا ہے شعر و ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے ۔ اور انہوں نے اپنے شعری ذوق کی تربیت و تہذیب کے لئے جو سخت ریاضت کی ہے وہ ہمارے عہد میں کمیاب ہے ۔ ان کی شاعری میں رفعت خیال کے واضح نقوش دکھائی دیتے ہیں ۔

شاعری اپنے عہد کی تمام سفاکیوں، ناانصافیوں اور بیماریوں کو اگلی نسلوں تک پہونچانے کا کام بھی کرتی ہے اور ہم شاعری سے گذشتہ زمانوں کے حالات و واقعات کی ایک وسیع دستاویز تیار کر سکتے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دستاویز کی نوعیت تاریخی صداقت سے بالکل جدا ہوگی ۔ اور ہونا بھی چاہیئے کہ شاعرانہ صداقت بہرحال تاریخی صداقت سے بلند مرتبہ ہوتی ہے ۔ وزیر آغا کی شاعری سے ہمارے عہد کے تمام انتشار اور شکست و ریخت کی دستاویز بہ آسانی تیار کی جا سکتی ہے ۔ انہوں نے اپنی خود سوانحی نظم "آدھی صدی کے بعد" میں ذاتی واقعات کے ساتھ ساتھ ان کوائف کا اظہار بھی کیا ہے جو ہمارے عہد کا خاصہ ہیں ۔ ان کی دوسری نظموں میں بھی یہ رویّہ واضح طور پہ نظر آتا ہے ۔ مثال کے طور پہ یہ نظم ملاحظہ فرمائیں ۔

سحر ہوئی تو کسی نے اٹھا کر / لہو میں تر
ایک سرخ لوٹی بڑی کراہت سے آسماں
کے فراخ آنگن میں پھینک دی اور طویل
متلی کی جان لیوا سی کیفیت سے نجات
پائی مگر فلک کے فراخ آنگن میں / بادلوں
کے سفید سگ اس کے منتظر تھے جھپٹ
پڑے اس لہو میں تر دل کے لوتھڑے پر
جھپٹ پڑے ایک دوسرے پر / زمین
کے لوگوں نے دیر تک یہ لڑائی دیکھی ۔

سفید کتوں کے سرخ جبڑے / لہو میں تر
ایک لال ٹکڑا ۔ دریدہ سورج ۔ حریص
غراتے بادلوں کا طویل ۔ گھناؤنا دنگل
مری زمیں بھی تو گوشت کا لوتھڑا تھی جس کو
کسی نے اندھے خلا میں پھینکا ۔ مگر نہ کوئی
بھی اس پہ جھپٹا ۔ تب اس کے اندر سے
آئے باہر / اس کے دشمن اس کی بو پہ / ہزاروں
خونخوار تند کتے / حریص جبڑے / اور اب
دریدہ زمین ساری ٹپکتے گرتے لہو کے
قطروں میں رِس رہی ہے / خود اپنے
خونخوار تند بچوں کو تیز جبڑوں میں پس
رہی ہے ۔ (اس کے دشمن)

وزیر آغا کی شاعری یہ پتہ دیتی ہے کہ وہ انسان اور انسانیت سے مایوس نہیں ۔ البتہ ان کے یہاں ایک تڑپ ہے جو کہیں طنز کا روپ اختیار کر لیتی ہے ۔ ان کی خواہش ہے کہ یہ دنیا مزید خوبصورت ہو سکے ۔ اس پر بسنے والے خوش رہیں ۔ اور موسم اپنے الطاف و عنایات سے تزئین کائنات کا کام کرتے رہیں ۔ ان کی شاعری کا یہ رجائی پہلو بہت متوازن اور صحت مند ہے ۔

گھاس کو اذن دے وہ حسین سبز قالین
اپنا بچھائے، درختوں پہ گہرے نکھر آئیں
طائر چہکنے لگیں / برف پگھلے ۔ غصیلی،
سرفراز، بے رحم، ٹھنڈی ہوا اپنے
گھر کو سدھارے، دکھی فرش سے تا بہ
عرش تک / دھوپ کا اک چمکتا سمندر
رہے موجزن، جس میں ہم تو ادر میں / سرخ
بجروں کی صورت نہ ڈوبیں نہ ابھریں /
فقط دھوپ کو اپنے چہروں پہ مل کر ...

ہم اس ہو گئے۔ (دھوپ)

وزیر آغا نے اپنی ذات پہ گزرنے والی کیفیات کو جس طرح الفاظ اور علامتوں کا جامہ پہنایا ہے اس سے ان کی شاعری داخلی ہوتے ہوئے بھی خارج سے ایک مستحکم رشتہ قائم کرتی نظر آتی ہے۔ انتہائی داخلی کیفیت کو انہوں نے عمومی رنگ دیا ہے جس سے قاری کو ان کے تجربے کا شریک بننے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی جبکہ بیشتر جدید شعرا کے یہاں تجربہ کا بیان اتنا گنجلک اور پیچ در پیچ ہو جاتا ہے کہ وہاں تک قاری کی رسائی ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جاتی ہے۔

گلی بھی وہی ہے / مکاں بھی وہی ہے /
وہی ہے مکاں کا پراسرار زینہ مگر چور
قدموں کی بے نام آہٹ / ملائم لبادے
کی محجوب سی سرسراہٹ "ہٹو راستہ
چھوڑ دو" — کی جھنکتی غصیلی ادا / پھر
ہنسی ضبط کرنے کی مدھم صدا وہ صدا
اب نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں ہے / کہ
کچھ بھی نہیں ہے۔ خموشی کی بھیگی ہوئی
التجا کے سوا۔ (واپسی)

ہوا بہتی رہی اور نگر میں خشک چھاگل
اپنے دانتوں میں دبائے پیاس کی
برہنہ سیہ سے لڑ رہا تھا میں کہاں جاتا
مجھے سوزنوں کے رستے سے آگئیں تیرے دل کا
آنا / ادھر چھاگل سے ٹپک کر آب کا گرنا /
کسی بچے کا پانی مانگنا / بھولا نہیں تھا۔
میں کہہ جاتا
(ہوا بہتی رہی آہ)

ہندی کے سبک الفاظ کو شعر میں استعمال کرنے

ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے نئے شعرا کے یہاں ہندی شدومد سے نظر آنے لگی ہے۔ اور یہ یقیناً اچھی بات ہے۔ مگر لفظ کو برتنے کے لئے جس سلیقے اور بصیرت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ ہمارے بیشتر شعرا میں مفقود ہے۔ نتیجتاً ہندی کے الفاظ بھلے لگنے کے بجائے سماعت اور بصارت پر گراں گزرتے ہیں۔ وزیر آغا نے اپنی نظموں میں شعوری کوشش کی ہے کہ ہندی کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ کہ بصارت اور بصیرت دونوں ان پر مہربان ہیں۔ ان کی نظموں میں ہندی الفاظ بڑی خوب صورتی سے استعمال ہوئے ہیں۔ چند نظموں کے مصرعے بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔

سب ننگی تھیں / گھٹنے ٹیڑھے سایوں کے
گونگی بھاشا میں بول رہی تھیں۔
(دیواریں)

گرہ۔ جو صدیوں سے بننے والے بندھن
رشتوں کا آشرم ہے
(بیکراں وسعتوں میں تنہا)

مرے بند کا لونسا میں بھونروں کی بانی کا
امرت گرے۔ (دھوپ)

سنگت شب کا عجب سماں تھا
فلک تھا پیتل کا تھال جس میں
چمکتا کانسی کا چندرماں تھا
(ہوا کے جھونکے نے ملکہ کمر لے)

وزیر آغا نئی اردو شاعری کے رجحان ساز شاعروں میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں اور انہوں نے جہاں [illegible] وہاں فنی سطح پر کئی تجربات [illegible] ہیں اسی طرح شعر میں بھی [illegible] کی ہے۔

گیا

اقبال واجد

رشید امجد ـــــ ایک خصوصی مُطالعہ

داخلی، غیر منطقی، منتشر اور جزوی تخلیقی شعوریت سے فن کی تخلیق تو ہوتی ہے۔ مگر اس کے ذریعہ خاص طور پر افسانے میں حقیقی آگہی کی مثالیں کم بلکہ بہت کم دیکھنے کو ملی ہیں۔ دیکھیے رشید امجد کے مطالعہ سے کیا بات سامنے آتی ہے؟ جبکہ رشید امجد نے سمتوں سے لوٹ کر بے سمتی کا سفر شروع کیا ہے۔ جہاں ان کے صرف ایک لمحہ، ایک ہی لمحہ ہاتھ آیا ہے۔ اور داخلی تخلیقی شعور جزویت کے اس ایک لمحہ نے رشید امجد کو ایک عہد کی صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ عہد میرا ہے، آپ کا ہے، آدم کا ہے، گوتم کا ہے، غالب کا ہے، ٹیگور کا ہے، کرشن چندر کا ہے، پریم چند کا ہے، بیدی کا ہے، ارسطو کا ہے اور خود رشید امجد کا بھی ہے۔

رشید امجد نے اس پورے عہد کے تخلیقی سلسلۂ عمل سے گزرنے کی کوشش کی ہے۔ اور زندگی کی حقیقی جمالیاتی ماہیت پر غور کرتے ہوئے اسے ایک نئی تخلیقی اشاریت میں پیش کیا ہے۔ خاص طور پر ان کی تخلیقی شعوریت کسی ایک ہی زمانے سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے اندر تو وہ تمام تہذیبیں موجود ہیں جو انسان اس زمین پر گزار چکا ہے۔ فن کار چونکہ فطرت کی ایک اعلیٰ صفت ہے (اور جو خود عین فطرت ہے) اس لیے وہ کسی تخلیقی شعوریت سے نہیں گزر سکتا۔ یہ فطرت ہے جو خود کو ایک فن کار کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور خود اپنے آپ کو سمجھنے اور سمجھانے کا عمل شروع کرتی ہے۔ چونکہ میں ان باتوں پر یقین رکھتا ہوں۔ اس لیے میرے لئے دشواری یہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں سے لوگ بڑی آسانی سے کسی فن کار کو اچھا یا برا کہہ دیتے ہیں۔ اور اپنے اس فیصلے میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے ابھی ان صفحات میں یہ کہہ دینا کہ رشید امجد کوئی بڑا فن کار نہیں ہے۔ یا یہ بڑا فن کار ہے۔ میرے لئے کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس لئے ابھی مضمون ہذا میں میں نے رشید امجد کے افسانوں کے مطالعہ کے ذریعہ انہیں محض سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

فطرت اپنے آپ کو بنیادی طور پر شکل، رنگ، آواز اور رفتار کے ذریعہ ظاہر کرتی ہے۔ یہ اظہار عام طور پر فطرت کے ایک غیر تخلیقی رویہ ہے۔ لیکن وہی فطرت جب غیر تخلیقی رویہ سے تخلیقی رویہ کی طرف آتی ہے تو اسے خود اپنی ذات سے لذت محسوس ہوتی

ہیت

ہے۔ اور یہ خود اپنی ذات سے لذت لینا شروع کرتی ہے
عمل بھی فطرت کی ایک صفت ہے۔ اس لئے ہم ہوں
پ ہوں، رشید امجد ہوں یا کوئی اور شکل و صورت ہو
خود فطرت کی ایک تخلیقی شعوریت ہے۔ جسے ہم فن کا
م دے سکتے ہیں۔ فطرت کی یہی تخلیقی شعوریت خود
انسانی اذہان کی صورت میں نمایاں کرتی ہے۔ اور
س کا اظہار کہیں تان سین کے دیپک راگ میں ہوتا ہے
دیپک راگ کے الاپنے سے گانے والے کے جسم میں
آگ لگ جاتی ہے)، کہیں ورڈزورتھ، غالب اور ٹیگور
کی شاعری ہیں، کہیں آذر کے مجسموں میں، کہیں ملکہ
نور جہاں اور صابری برادران کی پکار میں، کہیں رشید
امجد کے افسانوں ہیں، کہیں منٹو اور بیدی کی روایت
میں۔ فطرت کی یہ تخلیقی شعوریت کہاں اور کس شکل میں نظر
آجائے کون کہہ سکتا ہے۔

ایسی صورت میں رشید امجد کے مطالعہ سے
اور ان کے افسانوں کی تخلیقی اور تجرباتی تنقید سے فطرت
کی تخلیقی شعوریت کی ایک ایسی ترقی یافتہ منزل کا پتہ
چلتا ہے۔ جہاں فطرت اپنی شناخت کے لئے علامتوں
اور تشبیہاتی استعاروں کا استعمال کرتی ہے۔ رشید
امجد کے افسانوں میں ہمیں علامتوں اور تشبیہاتی
استعاروں کے آزاد تجربوں کی تقلیدی مطابقیں دیکھنے
کو ملتی ہیں۔ جن لوگوں نے قاضی عبدالستار کو پڑھا ہے
وہ میرے اس اشارے کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔
رشید امجد کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے تشبیہاتی
استعاراتی قوس قزح کے ذریعہ نارسائی کی گرہیں
کھول کر رسائی کی آفاقیت کی لامعلوم وسعتوں میں
گم ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رشید امجد کا نام
اگر درج نہ بھی ہو تو ان کا افسانہ پہچان لیا جا سکتا ہے
اور یہ کسی افسانہ نگار کے لئے خوبی کی بات ہے۔ مثالیں:

"جب ڈاکٹر اس کی آنکھوں کی موہوم
گلیوں میں منظروں کے لُک چھپ جانے
کا تماشہ کر چکا تو اس نے اسے یہ خبر سنائی
کہ اس کی آنکھوں کی آرٹ گیلری میں
زندگی کی زنگار رنگ تصویریں ابھی دھندلائی
نہیں"

"کس بات کی تصدیق؟ ڈاکٹر اس کی
آواز کی گنبد کو دبوچتے ہوئے بولا"

"اس کے تلووں نے سڑک کی مانوسیت
کو بوسہ دیا"

"اس رات تنہائی نے اس پر پہلا فائر کیا"

"وہ اپنے سانسوں کے اون سے زندگی
کے قالین بنتا رہا"

"اس نے اپنے احساس کے لوتے پر
حیرت و استعجاب کے بے شمار قفلے تلے"

"اس کی یادداشت کی چڑیا صدیوں
کے گنجلک چہرے پر پھیلی پہچان کو دانہ
دانہ چگ رہی تھی"

"خاموشی کی مکڑی ان کے درمیان چپ
کا جالا بننے لگی"

"اندھیرا آنکھیں ملتا ہوا رات کے بستر
سے کہنیوں کے بل اٹھ رہا تھا"

"پچھلی ساری رات میں آنکھوں کی جھولی
میں انتظار کے پھول لئے نیند کی نیلی
چڑیا کی راہ تکتا رہا ہوں۔ لیکن نیند کا
جہاز میری پلکوں کی بندرگاہ میں لنگر
انداز نہیں ہوا"

یہ رشید امجد کے افسانوں کی پہلی شناخت ہے جس کے نمونے اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ ان نمونوں میں اور ان کے علاوہ ایسے بیشتر نمونوں میں ہیں رشید امجد کے کازاد معنویاتی استعاروں سے پیدا ہونے والے تخیلی آہنگ کی ایسی نادر کیفیات کا پتہ چلتا ہے جس کے باعث ان کے افسانوں میں بیشتر مقامات پر شعری لمس ابھرتے ڈوبتے محسوس ہوتے ہیں رشید امجد کے اسلوب میں ایک نہایت سبک سی شعریت ہے جسے بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے سہارے ان کے افسانوں کو تجزیاتی وضاحت کے ساتھ پرکھا جا سکتا ہے ایک امر کی طرف اشارہ چاہتا ہوں کہ رشید امجد کی اسلوبیاتی شعریت اور ان کی تشبیہاتی استعاریت کی تکراو ان کے افسانوں میں ایک سے دوسری جگہ ملتی ہے۔ اس وجہ سے اکثر پڑھنے والے کو موضوعاتی مشابہت سے دوچار ہونا پڑتا ہے

استعارہ اور علامت رشید امجد کے دو تخلیقی زاویئے ان دونوں کے برتاؤ میں ان کے یہاں واضح فرق ملتا ہے۔ استعارہ فن کار کی داخلی تخلیقی رمزیت کی جزیات کا محاکاتی پرتو ہے۔ یہ اپنی اصل میں کوئی واقعی یا غیر واقعی تصوراتی تشکل و صورت نہیں ہے۔ مگر تخلیقی ادب میں اس کا سلسلۂ عمل ہمیشہ موجوداتی یا کونیاتی ہوتا ہے۔ رشید امجد کے یہاں یہ ہے کہ ان کے استعارے امکانی سے زیادہ غیر امکانی موجودات اور کونیات کے تصوراتی تشخیص پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں بڑی حد تک حقیقت کی ترسیل کا غیر منطقانہ رویہ ملتا ہے۔ اور منطقی استدلال کی زبردست کمی کھٹکتی ہے۔ اس لئے استعارے کے ذریعہ جس داخلی تخلیقی رمزیت کی جزیات کا اظہار رشید امجد چاہتے ہیں۔ وہ سربستہ راز لگتا ہے۔ اور اسی سربستہ راز سے استعاراتی تناظرات اپنا معنویاتی تاثیر کھو بیٹھتے ہیں۔

علامت فن کار کی عمیق داخلی تخلیقی استعاریت کی وہ خارجی صورت حال ہے۔ جو اشیا احساس اشکال کی فوری تشکیلی شناخت قائم کرتی ہے۔ اور اشیا احساس اشکال کو کبھی بھی اس کے اپنے واسطے سے جاننے کو تیار نہیں ہوتی بلکہ یہ تو ہمیشہ اسے دوسروں کے واسطے سے جانتی اور سمجھتی ہے۔ علامت کی حقیقت شک ہے۔ لہذا یہ حقیقت کا کوئی صنعت نہیں ہو سکتی۔ رشید امجد کے افسانوں میں علامت کا استعمال پیش منظر کے طور پر ملتا ہے۔ اس لئے ان کی افسانوی علامتی قدریں حال سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اور نہ اکثر افسانوں میں ماضی کا پتہ دیتی ہیں۔

نئے افسانے میں ابھی تک مختلف اسلوبیاتی اظہار پیش ہوا ہے۔ اور نئے نئے اسالیب ہمارے سامنے آئے ہیں۔ جمالیاتی اسلوب، استعاراتی اسلوب، حیاتیاتی اسلوب، علامتی اسلوب، سائنسی اسلوب، کونیاتی اسلوب، تجزیاتی اسلوب، منطقی اسلوب، ان اسالیب استعاراتی اور علامتی اسالیب ان دونوں کثرت سے مستعمل ہیں۔ مگر رشید امجد نے ان کے استعمال میں انفرادیت برتی ہے۔ اور اپنا مخصوص انداز اختیار کیا ہے۔ یہ تخصیص غیاث احمد گدی، کلام حیدری، انتظار حسین، خالدہ اصغر کی نظریاتی خصوصیات سے جدا ہے۔ عرض کرتا چلوں کہ رشید امجد کا تشبیہاتی، استعاراتی خیالستان ہمارے یہاں ایک جگہ اور دیکھنے کو ملتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ رشید امجد کا لہجہ کی تازگی و ندرت ان میں نہیں ملتی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ احمد یوسف رشید امجد سے متاثر ہیں۔ یا رشید امجد قاضی عبدالستار سے براہ راست متاثر تھے۔ مگر یہ تو ضرور ہے کہ اس تثلیث میں اسلوبیاتی مشابہت کی کثیر جھلکیاں موجود ہیں۔ اس تثلیث کی یہ اسلوبیاتی مشابہت تخلیقی بھی ہو سکتی ہے اور تقلیدی بھی۔ اول الذکر صورت حال میں تجربے کی یکسانیت

شروع ہے۔ اور آخر الذکر صورت حال کسی بھی شرط سے ماورا ہے۔ لیکن ان تینوں میں رشید امجد کا اسلوب روشن تر ستارے کی مثال ہے۔

اور اب ہم رشید کے افسانوں کے موضوعاتی منطقے کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔ اور اس ضمن میں ان کے افسانوں کی موضوعاتی تشکیلی و توسیعی معنویتوں سے پردہ ہٹانا چاہتے ہیں۔ تاکہ ایک فن کار کو فن کے حقیقی جمالیاتی تکملے کے میزان پر تولا جا سکے۔ جن کے بغیر لامکانی اور لازمانی حدوں تک فن یا فن کار کی رسائی ناممکن ہے کسی فن کار کے فن کو یا خود اس کو سمجھنے کے لئے ایک آسان سی پرکھ یہ ہے کہ کائنات اور سماج فن کار کی نگاہ میں کیا ہیں؟ وہ ان کی ماہیت کہاں تک تسلیم کرتا ہے؟ انہیں کس زاویہ عقل سے دیکھتا ہے؟ ان سے کیا اثرات قبول کرتا ہے۔؟ ان سوالات کے جواب ہی میں فن کار کی ذات اور اس کے عقل کی تمام پہلو جھلک جاتے ہیں۔ یہیں سے کسی فن کار کا توسیعی، تشکیلی عمل شروع ہوتا ہے۔ اسے اپنے فطرت کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ اس کے فن میں فطرت کی پیچیدگیاں، النفس و آفاق کی رمزیت، علم و بصیرت کی تہذیب، وقوعات واقعات کا غیر متوقع پن، انا و ہوس کی کشمکش، فرد اور سماج کی وابستگی یہ سب کچھ بس ایک پل میں یوں جھلک جاتی ہیں جیسے گھپ اندھیری رات میں بجلی کی چمک سے گاؤں کی پگڈنڈی، کھجور کے درخت، بائیں ہاتھ کی طرف جوہڑ سے لگی ہوئی قبر، اور سامنے کی طرف مسجد کی گنبد اور دور کھجوروں کے درختوں سے بھی آگے ندی کے دوسرے کنارے پر صدیوں سے پڑا ہوا ایک ویران کھنڈر (شاید جسے کسی بادشاہ نے بنوایا ہو) ایک پل میں صاف جھلک جاتے ہیں۔

رشید امجد کے افسانوں کی داخلی

اور بیرونی ساخت کو ذہن میں لاتے ہوئے۔ ان کے مکمل تخلیقی تناظر سے کائنات اور سماج کی تفہیم کے لئے لازم ہے کہ ان کے افسانوں کی جزیات کو مرکز میں لایا جائے۔ تاکہ کائنات اور سماج کے تئیں رشید امجد کے نظریات کی پرکھ کے اندازے کے لئے شہادتی حوالے موجود ہوں۔ ان کے افسانے "لا ۔ ؟" "ناہو کی نئی تعبیر" "ایک خود کلامی" "پچھلے پہر کی موت" "ڈوبتے جسم کا ہاتھ" "تین بے رنگ تصویریں" اور "کچھ کچھ" "پچھلے پہر کی موت" میں ان کا نظریۂ حیات و کائنات صاف طور پر سامنے آتا ہے۔ کائنات رشید امجد کے نزدیک محض خارجی اشیا کے ادراک کا عمل ہے۔ یہ ایک ایسی تخلیقی عملیت کا نتیجہ ہے۔ جو مطالعہ و مشاہدہ کے عام قوانین کے تحت ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ اس لئے رشید امجد اسے انسان کے باطن کا اظہار سمجھتے ہیں۔ اور اس عمل و ناعمل میں ایک مسلسل تخلیقی جستجو سے دو چار نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ تخلیقی جستجو غالباً اقبال کے اس شعر کی حقیقت سے آگاہ ہے۔

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن ما!
چہ زماں و چہ مکاں شوخیٔ افکار من است

انسان اور سماج کے تئیں رشید امجد کا نقطۂ نظر بہت صاف ہے۔ وہ انسان سے سماج مراد لیتے ہیں۔ رشید امجد کا انسان کوئی ایک فرد نہیں ہے۔ وہ ازل سے ابد تک کا تمام انسان ہے۔ جو اس زمین پر اپنی زندگیاں جھیل چکا ہے۔ یا ابھی اس کا وجود میں آنا باقی ہے۔ اس لئے اس تصور انسان میں تمام انسانی اقدار اور انسانی تہذیبیں اور خود سماج کا تصور بھی شامل ہے۔ اسی طرح سماج سے مراد تمام انسانی اور سماجی اقدار ہیں۔ جن ساتھ ساتھ ہمارا آپ کا، رشید امجد کا، سب کا ساتھ شروع ہو چکا ہے۔ اس تصور کو اور مختصر الفاظ میں یوں

پیش نہیں کیا جا سکتا۔

رشید امجد کے افسانے میں جہاں انسان کا ذکر ہے وہاں وہ اس سے تمام انسانی تاریخ مراد رہے ہیں جہاں سماج سامنے ہے وہاں انسانی اقدار کی کہانی پوشیدہ ہے۔ مثلاً ان کے ایک افسانہ "نارسائی کی مٹھیوں میں" کا موضوع انسان کا وہ داخلی سفر ہے جو زندگی کی بے چینی، مشکلات اور آلام و مصائب کی مضبوط دیوار توڑ کر خود فریبی کے غار میں ہمیں لے جاتا ہے۔ اور انسان ان لمحوں میں اپنے گمشدہ وجود کے ٹکڑے ڈھونڈنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ یہ ہی جدوجہد دراصل ذات کی سرحدوں سے شروع ہوتی ہے اور ذات ہی کے وسیع کینوس پر جاری رہتی ہے جیسے جیسے یہ بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ سفر اور طویل ہوتا جاتا ہے:

"سیاہ گھنے درختوں کے ملائم ریشمی
چھاؤں میں اس کو جاننے پانے کی جستجو
میں ہم اپنی سوکھی انتڑیوں کو اپنی تنگی
ہڈیوں پر پیٹتے ہیں۔ سبز مخملی پتیوں کے
کومل چہروں پھیلتی ہوا ـــــــ
پتھروں کے ننگے سینوں پر جھاگ کے
پھلے بناتا بے لگام دریا ـــــــ
سڑکوں، دیواروں، اور چہروں پہ
اپنے نام کے نقش بناتا مٹاتا زمانہ
ـــــــ تینوں مل کر اشروں،
خیالوں، اور سڑکوں کو کھنڈروں کے
بے رنگ تابوتوں میں دفن کر رہے ہیں
ـــــــ کہ ہوا، دریا اور زمانہ
تینوں گونگے ہیں۔ اور ہم جو سانسوں
کی پتواروں سے اس بے کنار و بے گنت
سمندر میں اپنے وجود کی کشتیاں کھینچ
رہے ہیں ـــــــ مدتوں سے ہاں
اور نہیں کی بھول بھلیوں میں لٹکے ہوئے
ہیں۔ اپنے ہونے کے احساس کا کڑوا
پھل کھا رہے ہیں۔ ہم جو گھنے درختوں
درختوں کی ریشمی ملائم چھاؤں میں سبز
مخملی گھاس پہ خود کو جاننے پانے کی آرزو
میں اپنی سوکھی انتڑیوں کو اپنی ننگی ہڈیوں
پہ پیٹتے ہیں ـــــــ ہم بھی کیا ہیں"

(نارسائی کی مٹھیوں میں)

گمشدہ آواز کی دستک کا ثانی سطح پر پیدا شدہ خود سپردگی کے احساس کی کہانی ہے۔ جو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے لاشعوری طور پر ذہن کی گرہ کھولتا ہے۔ اور یہ اس کے پس پردہ زندگی کے بے معنویت چکر کا نتیجہ نظر آتی ہے۔ انسان ہر لمحہ یہی سوچتا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد احساس کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔ جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ کہانی کے 'وہ' کو ایک زمین کی تلاش ہے جس میں وہ اپنی مرضی کے مطابق کشادہ سے کشادہ قبر اپنے لئے کھدوا سکے۔

یہ قبر دراصل اس خاتمے کا اعلان ہے جو وہ اپنی زندگی ہی میں کرنا چاہتا ہے۔ اس کی باتوں میں ایک گہری سنجیدگی ہے۔ جسے اس کی بیوی سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ زندگی کے ظاہری رکھ رکھاؤ سے تنگ آچکا ہے۔ وہ آنے والے ہر لمحہ میں اپنی زندگی کا کڑوا زہر پیتا ہے۔

غرض فنا اور بقا کی دھند میں گھرا ہوا یہ پیکر خود اپنی موجودگی کے احساس سے گھبرا کر فنا کی تمام منزلوں کو

لوٹ دینا چاہتا ہے۔ مگر خود اس کے اندر کا خوف اسے آگے بڑھنے سے روکتا رہتا ہے۔ انہیں چند ملے جلے احساسات پر لکھی گئی یہ کہانی بذاتِ خود ایک مکمل علامت بن کر سامنے آتی ہے۔ اور مصنف کہیں دور کھڑا ایک ہیرو کی طرح ان پر روشنی کی شعاعیں بکھیر رہا ہوتا ہے۔

"الف لیلیٰ کا ایک گم شدہ ورق" ہمارے اسلاف کی اساطیر کا ورق ہے۔ یہ ہماری ہزاروں سال پرانی روایات کی ایک چھوٹی سی گرہ ہے۔ جسے مصنف لاشعور سے لا کر شعور کی سرزمین پر کھول دیتا ہے۔ اور اسلاف کی بے ڈھنگی قاری کے مد نظر ہوتی ہے۔ ہم "الف لیلیٰ کا ایک گم شدہ ورق" کے ذریعہ ارتقا کی اس [illegible] تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں انسان تہذیب اور غیر تہذیب کے بندھنوں میں جکڑا ہوا اپنے ہونے کے احساس کا کڑوا پھل کھا رہا ہے۔ اور ان ہی میں جو کئی پشتوں سے قبیلے کا سردار بنتا چلا آیا ہے۔ اور خون کے پیالوں کے نذرانے قبول کرتا ہے۔ اور قبیلے کی ایسی لڑکیاں لوگ اس کے حضور میں پیش کرتے آئے ہیں جن کی جانگھوں میں ایک بھی سلوٹ نہیں ہوتی۔ جہالت، ظلم، جبر، اور استحصال پر لکھی گئی یہ کہانی اپنی واضح CRAFTMANSHIP کی بنا پر ایک کامیاب علامتی کہانی ہے۔ مصنف نے بڑی آسانی سے ماضی اور حال کا قلابہ ملا کر ہماری نگاہیں وا کی ہیں۔ یہاں رشید امجد کا نقطۂ نظر قدرے اصلاحی ہے کل اور آج کا فرق دراصل منٹوں اور لمحوں کا فرق ہے اور ہمارا سستری اور جبری کردار سینکڑوں ہزاروں سال پرانا ہونے کے باوجود نئی شکلوں میں آج ہمارے اندر لاشعوری طور پر موجود ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دراصل یہ ماضی اور حال کا قلابہ لاشعور اور شعور کی جنگ ہے۔ جو حال کی روشنی میں دیکھی اور پرکھی جا سکتی

گیا •

ہے۔ "الف لیلیٰ کا ایک گم شدہ ورق" ینگ کے آرکی ٹائپ فلسفے سے بہت قریب ہے اور غالباً پوری کہانی اسی فلسفے پر لکھی گئی ہے۔ ••

بقیہ: لیزر کرنوں کی زد میں ایک شام

یہی ہوتا ہے۔ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ بیان کچھ اور ہوتا ہے۔ ہم حالات کی گرفت میں بری طرح پھنس چکے ہیں۔ ہماری جبلت جس راہ پر گامزن ہے اس کے آخری سرے پر ایسا کنواں ہے۔ جہاں موت بالکل یقینی ہے ایسے حالات میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔؟

سورج دریا کی وسعتوں میں مغرب کی سمت ڈوب رہا تھا۔ شفق کی سرخی دریا کی لہروں پر بکھیر رہی تھی۔ جیسے کائنات کا خون ہوا ہے۔ اور دریا کے چہرے پر وہی خون پھیل رہا ہے۔ اتنا دکھ لوگ کھڑے تھے جو خونی شام نظارے میں بجتے۔ وہ مجھے اصرار کر کے دریا کے کنارے آباد اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ پھر شراب کا دور شروع ہوا وہ ہر گھونٹ پر بڑھی والی عورت کی شرست بتاتی رہی لیکن میں اس کے جسم میں اترتا چلا گیا۔ مجھے کچھ بھی پتہ نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ میرے سامنے صرف اس کے جسم کے زاویئے تھے۔ جن میں شراب سے زیادہ خمار تھا۔ ••

۰۲۰

ناصر بغدادی (نائجیریا)

کوئی آئے نہ آئے

بھولی بھالی لڑکی! کتنی خاموشی سے اپنے جذبات و احساسات کو سینے میں چھپائے بیٹھی تھی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے نزدیک یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔ ہاتھ میں کتاب لئے، لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے، مطالعہ میں یوں ڈوبی ہوئی تھی جیسے ارد گرد جنم لینے والوں ہنگاموں سے مطلقاً بے خبر ہو۔ میں نے ایک بار پھر اس کو بغور دیکھا اور سوچنے لگا بعض لوگ خود کو کتنا دھوکہ دیتے ہیں۔

اس کی نگاہیں کتاب کے صفحات پر مرتکز تھیں۔

اس کے انداز سے انہماک اور یکسوئی مترشح تھی جیسے ان صفحات پر ان کی جیون کہانی لکھی ہو۔ اور وہ پڑھ کر معلوم کرنا چاہتی ہو کہ اس میں کتنی خوشیاں ہیں کتنے غم ہیں۔ ہر دو [illegible] کے بعد اس کا کتاب والا ہاتھ لرز جاتا تھا۔ کتاب گرنے لگتی تو وہ ہاتھ سے اسکو پکڑ لیتی۔ اور پھر مطالعہ میں ڈوب جاتی۔ میں نے پھر بہ نظر غائر اس کو دیکھا۔ اس کے یاقوتی لبوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔ اس کے دونوں ہونٹ بےقرار رہے تھے۔ جیسے مسکراہٹ کا بوجھ ان کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

آج گھر میں ایک نئے ہنگامے کی حکومت تھی۔ اور ویسے بھی ہمارا گھر نت نئے ہنگاموں کی آماجگاہ تھا۔ ہر لمحہ ایک [illegible] ہنگامہ جنم لیتا۔ اپنا رنگ جماتا اور پھر ڈوب جاتا۔ ان بوقلموں ہنگاموں کی رفاقت میں سب کی زندگیاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ شب و روز گذر رہے تھے ——— اور آج ایک نئے ہنگامے کی آمد آمد تھی۔ مکان اور مکین ——— دونوں اس ہنگامے سے اثر پذیر ہو رہے تھے ہمیشہ کی طرح! در و دیوار آئینہ خانے کی طرح چمک رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کو شوکیس کی طرح سجا دیا گیا تھا۔ جمالیاتی حسن کو فزوں کرنے کے لئے اشیا کی ترتیب بدل دی گئی تھی۔ نوکر بے چارے صبح ہی سے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اماں صحن میں کھڑی احکامات صادر کر رہی تھیں۔ وہ کام میں اس درجہ منہمک تھیں کہ انہیں اپنا بھی ہوش نہ تھا۔

ارے ممدو کے بچے! وہاں کونے میں کھڑا میرا کیا منہ تک رہا ہے۔ جا جلدی سے برآمدے کی صفائی شروع کر دے۔

مہمان آنے ہی والے ہوں گے اور تو ابھی تک مٹھائیاں نہیں لایا۔

بدتمیز! تو نے ابھی تک برتن صاف نہیں کئے؟

گھر کی ہر شے کا رنگ بدل گیا تھا۔ فضا تبدیل ہو گئی تھی۔ مگر ہم سب وہی تھے، وہی جذبات، وہی احساسات، سوچنے کا وہی انداز۔ میں کچھ دیر کھڑا وہیں اس ہنگامے کو دیکھتا رہا۔ اور پھر سرعت کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر میں نے حالات کا جائزہ لیا۔ میری نظریں ادھر ادھر چاروں طرف بھٹکتی رہیں۔ میں نے محسوس کیا جیسے خلا بوقلموں رنگوں کی پرچھائیوں سے بھر گیا ہو۔ نیلے پیلے سرخ، گلابی، ہلکے نیلے ——— اور پھر بے شمار رنگوں کے لہریئے فضا میں پھیلتے گئے۔ رنگوں کے اس دھنک [illegible] ایک پراسرار ماحول جنم لے رہا تھا۔ یہ سب کچھ کیا [illegible]

تھا، میرے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں جیسے ذہن کے مقفل تہہ خانے میں مقید ہو کر رہ گئی تھیں۔ اور پھر جب رنگ بھری پرچھائیوں کا رقص، شعلۂ مستعجل کی طرح معدوم ہوا تو میں نے اپنی یادداشت کے پردے پر اپنے ماضی کو آہستہ آہستہ ابھرتے ہوئے دیکھا۔

اور وہ دن ـــــ وہ دن کتنا مسرت آگیں تھا جب اس گھر کی دہلیز پر سے ہنگامے کی چاپ ابھری تھی۔ میں خوش تھا۔ اماں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں بھائی کا رواں رواں فرطِ جذبات سے کانپ رہا تھا۔ گھر کا ہر فرد مسکرا رہا تھا ـــ گھر کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا خوابوں کی تعبیر شرماتے ہوئے آ رہی تھی۔ وہ دن جس کا برسوں سے سب کا انتظار تھا بالآخر آ ہی گیا تھا۔ اماں ایک کونے میں بھائی سے محو گفتگو تھیں۔

خدا خیر و خوبی سے یہ کام پورا کرے۔ میں تو اس لڑکی کی وجہ سے پریشان تھی۔ تمہارے والد کے بعد میری کیا حالت ہوئی خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اماں کی حالت اس درماندہ مسافر سے مختلف نہ تھی۔ جو ریگستان میں طویل عرصہ بھٹکنے کے بعد اتفاقاً نخلستان میں پہونچ گیا ہو۔

اب فکر کے دن گزر گئے۔ بھائی نے طمانیت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گے۔

انکار، توبہ کرو، میری بچی لاکھوں میں ایک ہے چراغ لے کر ڈھونڈو تو بھی ایسا پھول نہ ملے۔ اماں نے فخریہ کہا۔ ایسی خوش سلیقہ، تعلیم یافتہ، اور خوب رو لڑکیاں آج کل کہاں ملتی ہیں۔ اگرچہ بھائی خاموش رہے۔ مگر ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اماں کی ہر بات سے سو فیصد متفق تھے۔

میں تو بہت تھک گئی ہوں۔ اماں پھر بولیں۔ اگر یہ بھی اٹھ جائے تو کچھ اطمینان ملے۔ اس کے بعد میں

تمہارے ساتھ رہی ....

اماں تم میری فکر نہ کرو۔ بھائی جلدی سے بول اٹھے۔

تو کیا تم شادی نہیں کروگے؟

کروں گا... مگر...... بھائی اس کے آگے نہ کہہ سکے۔ گھر کے بالکل سامنے ایک چمکتی سی کار آ کر رک گئی تھی۔ دونوں جانب سے دروازے کھلے اور تین چار عورتیں بناؤ سنگھار سے مزین، لباس مکلف میں آراستہ و پیراستہ، خوشبو بکھیرتی ہوئیں کار سے برآمد ہوئیں۔ ایک عورت عمر رسیدہ تھی مگر اس نے آرائش و سجاوٹ میں فیشن ایبل کنواری لڑکیوں کو بھی مات کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور سمندر کا سا ٹھہراؤ تھا۔ معلوم یوں ہوتا تھا جیسے اس کو ہیروں کے پرکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

گھر والوں کے لئے شاید یہ مہمان بڑے عزیز تھے۔ کیونکہ ان کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ خوشی کی زیادتی بھی شاید بوکھلا دیتی ہے۔ اس لئے کہ اماں نے حفظ مراتب کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے ایک جوان عورت کو مؤدبانہ انداز میں سلام کر دیا تھا۔ میں دروازے کی ایک ہلکی سی دراڑ سے تاک جھانک کر رہا تھا۔ مجھے یہ بات بہت بری معلوم ہوئی۔

میں نے دیکھا کہ سب کی نظریں ضرورت سے زیادہ کام کر رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم کی ہر شے کا بغور جائزہ لیا جا رہا تھا۔ نظروں ہی نظروں میں وہ سب ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے تھے۔ چند لمحوں تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور پھر سب مطلب کی طرف آ گئے۔

خورشید کو بلاؤ، اماں نے کسی سے کہا۔

اور پھر میں نے خورشید کو دیکھا۔ اس کے

بے مثال حسن کو دیکھا۔ حسن کی لازوال تمازت کو دیکھا۔
میرا بچپن اس کی گود میں گزرا تھا۔ میں اسے خوب جانتا تھا۔
پہچانتا تھا۔ اس کے ہر انداز سے واقف تھا۔ مگر اس دن
مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں پہلی مرتبہ اس کو دیکھ رہا تھا
حسن کے اس نئے روپ سے میں پہلی بار آشنا ہوا تھا۔ جھلملاتے
ہوئے بیش قیمت ملبوس میں زیورات سے لدی ہوئی
خورشید کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ دیومالائی کہانیوں
کی عدیم المثال دیوی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کمبخت بڑھیا
بلا پلک جھپکائے خورشید کو گھورے جا رہی تھی۔ مجھے غصہ
آگیا۔ جی چاہا اس کی دونوں آنکھیں نکال کر اس کے ہاتھ پر
رکھ دوں۔

خورشید سمٹ سمٹا کر اس بڑھیا کے پہلو میں بیٹھ
گئی۔ اس کے چہرے پر بیک وقت کئی رنگ آ رہے تھے
جا رہے تھے۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کو وہاں بیٹھنا
دوبھر ہو رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے دوپٹہ کا آنچل موڑنے لگتی۔ تو
کبھی بے مقصد سینڈل کی نوک سے فرش کو کھرچنے لگتی
جیسے حقیقت کی دنیا میں اس نے خوابوں کے رنگین حریر کی
کی جھلک دیکھ لی ہو۔ وہ عورت ابھی تک اس کو ٹکٹکی باندھ
کے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے دوسری عورتوں کو دیکھ
آنکھوں میں اشارے ہوئے۔ معنی خیز مسکراہٹیں ہونٹوں
پر بکھر گئیں۔ اور پھر بات چیت کا سلسلہ چھڑ گیا۔

وہ ایک امتحان تھا۔ سوالات کئے گئے۔ جوابات
دیئے گئے۔ اور نتیجہ آگیا۔ خورشید امتیازی نمبروں سے
کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کی کامیابی کی خوشی اس سے
کہیں زیادہ اماں کو ہوئی۔ بھائی کو ہوئی۔ خوشی ان کے
چہروں پر طلوع ہوتے سورج کی طرح کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔
... میری خورشید کو پسند کر لیا۔
اماں کا چہرہ گلاب کی طرح بنا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہدیا کہ

تفصیلی بالمشافہ گفتگو بعد میں ہوگی۔

بس اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں ہے۔ بھائی لپکے
میں کہتی ہوں کہ خورشید کی قسمت جاگ اٹھنے کی
اماں کی آواز فرط جذبات سے کانپ رہی تھی۔ لڑکا باہر سے
ڈاکٹری کی ڈگری لایا ہے۔ خوش شکل ہے۔

اماں نے ایک لحظہ کے لئے بھائی کو دیکھا۔ اور پھر
اپنی تقریر جاری رکھی۔ آجکل ایسے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔
لڑکوں کا تو جیسے کال ہو گیا ہو۔ جہاں کوئی اچھا لڑکا نظر آیا لڑکی
والے اس پر چھاپہ مار کر قبضہ کر لیتے ہیں۔

یہ نیا زمانہ ہے اماں۔ بھائی نے جواب دیا۔ آجکل
یہی فیشن کہلانے لگا ہے۔ دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔

ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اماں یہ
کہہ کر یک بیک خاموش ہو گئیں۔

ٹیلیفون کی گھنٹی ایک دم سے بج اٹھی۔ اماں ابھی کو ریسیو
کر کے آپے سے باہر ہو گئیں۔

نہیں ہمیں ایسا ڈاکٹر نہیں چاہئے۔ یہ شادی ہے
یا کوئی تجارت۔ آخر وہ کس بات کے پچیس ہزار روپے مانگتے
ہیں؟ شرم نہیں آتی۔ ہمارے پاس قارون کا خزانہ تو
نہیں۔ ان کی یہ شرط ہم پوری کریں۔ ہمیں ایسا رشتہ
منظور نہیں۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ اماں کو یقین تھا کہ ان کی بیٹی
حسن میں اپنا ثانی نہیں رکھتی اور یہ حقیقت بھی تھی۔
اور پھر تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوش سلیقہ خوش
خوش اطوار بھی ہے ... کہ ایسی لڑکی کے لئے رشتہ
کی کیا کمی۔ آج نہیں تو کل کوئی نہ کوئی اچھا رشتہ نفیس
نفیس گھر کی دہلیز پر قدم بوسی کے لئے آہی جائے گا۔ ایک
ہنگامہ اٹھا اور ختم ہو گیا۔ اماں کو ایک طرح ... پہلو تہی
کرنے کی ... سے ... شکست ...

کیونکہ انکار ان کی جانب سے ہوا تھا۔ بھلا دوسری طرف سے انکار کی جرات کس کو ہو سکتی تھی۔ چاند کو ٹھکرانے کی خواہش بھی آج تک کسی نے کی ہے۔؟

مگر اس کے بعد میں نے خورشید کو بدلا بدلا سا پایا۔ اس کی ہنس مکھ طبیعت کے خول میں زرد سا پڑ گیا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموش خاموش سی رہتی۔ جیسے اس نے اپنے دل کو مار لیا تھا۔ اگر کوئی پکارتا تو یوں چونک پڑتی۔ جیسے گہری تنویمی نیند سے اچانک بیدار ہو گئی ہو ——— اور پھر اس اندھیرے میں ایک دن اس کا ایک ننھا سا دیپ جگمگا اٹھا۔

ایک اور گھرانے سے رشتہ آیا۔ اور گھر کے در و دیوار پھر ایک نئے ہنگامے کی آہٹ پا کر جاگ اٹھے۔ گھر کو پھر نئے ارمانوں کے ساتھ سجایا گیا۔ خورشید کو ایک بار پھر بیش قیمت، نظروں کو خیرہ کر دینے والے لباس میں، زیورات سے مزین ہو کر دلہن کا ریہرسل کرنا پڑا ——— لڑکے نے کچھ عرصے قبل ایل ایل بی، کا امتحان پاس کیا تھا۔ اور ایک مشہور و معروف وکیل کے ساتھ پریکٹس شروع کرنے والا تھا۔ اس کے والد کی لاکھوں روپے کی جائیداد تھی۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا ——— اس بار جوڑوں کے پچیس ہزار روپے طلب نہیں کئے گئے۔ بس عورتوں نے خورشید کو دیکھا اور خوشی کی فراوانی سے پھول کر کپا ہو گئے۔

ہمیں منظور ہے۔ ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔ ایک عورت فرط جذبات سے مغلوب ہو کر چیخ اٹھی۔ شادی کے سلسلے میں بات چیت کے جو لوازمات ہوتے ہیں۔ ان سب کو بالائے طاق رکھ دیے گئے۔ مزید انتظار کی زحمت کو شاید انہوں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

گیا

ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ لڑکے کی ماں نے جھٹ پٹ خورشید کی بلائیں لیں۔ شکیل تو ایسی دلہن پا کر دیوانہ ہو جائے گا۔

مگر یہاں بھی بات آگے نہ بڑھ سکی۔ اماں نے یہ رشتہ بھی نامنظور کر دیا۔ لڑکے کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اور ناک پکوڑے کی طرح پھولی ہوئی تھی۔

وہ دولت مند ہی تو کیا ہوا۔ میں اپنی بچی کا مستقبل برباد نہیں کر سکتی۔ اماں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ خورشید ساری زندگی میرے نام کو روئے گی۔

مگر اماں...... آج کل لوگ رنگ کو نہیں دیکھتے بھائی نے دبے لہجے میں کہا۔

ارے چپ رہ لڑکے۔ اماں نے ان کو ڈانٹ پلائی کیا تو کوے کے رنگ کی دلہن پسند کرے گا۔؟

بھائی چپ ہو گئے۔ اماں گھر کی ڈکٹیٹر تھیں۔ بھلا ان کے آگے کسی کی کیا چل سکتی تھی۔ جانتی تو وہ بھی خوب تھیں کہ بے عیب صرف خدا کی ذات ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود نہ معلوم کیوں وہ ہر کام میں پرفیکشن (PREFECTION) کی قائل تھیں۔ اس واقعہ کا خورشید پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ وہ پہلے بھی خاموش تھی۔ اب بھی خاموش ہی رہی۔ اب وہ زیادہ تر کتابوں میں اپنا دل لگا رہی تھی۔ پڑھتے پڑھتے تھکن محسوس ہوتی یا بوریت کا احساس ہوتا تو جھاڑو لے کر گھر کے کونے کھدروں کو آئینہ خانے بنانے کی کوشش شروع کر دیتی۔ کبھی کبھی میں نے اسے رسوئی میں یوں پکوان میں سنجیدگی سے معروف دیکھا جیسے اس کی نجات و نروان کا یہی واحد ذریعہ ہو ———

اماں اپنی جگہ مطمئن تھیں۔ انھیں کامل یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن کوئی ان کی خورشید کے آگے خود گھٹنے ٹیک دے گا۔ اور وہ ——— وہ ڈاکٹر کی طرح لالچی

نہ ہوگا۔ وکیل کی طرح بدصورت نہ ہوگا وہ وہی ہوگا۔
جس کا انہیں مدتوں سے انتظار تھا۔ وہ جو صحیح معنوں میں
جمال و کمال کی منہ بولتی تصویر ہوگی ———— ایسی
تصویر جسکو انہوں نے عملی زندگی میں نہ سہی مگر خوابوں
میں بارہا ضرور دیکھا تھا۔

اور جب میرا رشتہ آیا۔ تو اماں خوشی سے پھول
کر کپا ہوگئیں۔ لڑکا بہت ہی خوبرو تھا۔ سرخ و سپید
رنگت، توانا جسم، بااخلاق، باادب، اور بے حد
دولت مند ———— اس میں وہ ساری خوبیاں
یکجا تھیں جن کو اماں اپنے ہونے والے داماد میں دیکھنے
کی خواہاں تھیں۔ اور پھر وہ لالچی بھی نہ تھا۔ اس کو صرف
دلہن کی ضرورت تھی۔ اس کو نہ پچیس ہزار روپے نقد
کی ضرورت تھی۔ اور نہ کسی چمکتی ہوئی نیو ماڈل کار کی۔
بس وہ ایک طرح سے اماں کے خواب کی تعبیر تھا۔ شادی
کے سلسلے میں ہونے والے سارے معاملات طے ہوگئے
ہر کام خوش اسلوبی سے انجام پا رہا تھا۔ بس شادی کی
تاریخ مقرر ہی ہوا چاہتی تھی۔

پھر ایک دن اچانک بھائی اس کے متعلق ایک
ایسی خبر لے کر آئے کہ اماں حواس گم ہوتے ہوتے رہ گئے
جس نے سنا انگشت بدنداں رہ گیا۔ وہ تو بھیڑ کے لباس
میں بھیڑیا نکلا۔ گندم نما جو فروش والی مثال اس پر
پوری صادق آتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ شادی شدہ تھا
بلکہ دو بچوں کا باپ بھی تھا۔ مزید براں بدقماشی اور
آوارگی میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ اماں نے خداوند
بزرگ و برتر کے حضور میں نفلیں ادا کر کے شکرگزاری
کا اظہار کیا۔

شکر ہے معبود کا۔ ہم بال بال بچ گئے۔ اماں
نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اگلے زمانے کے لوگوں کا خیال

ٹھیک ہی ہے کہ سات جوتیوں کے پھٹنے کے بعد ہی رشتہ
طے ہونا چاہیئے۔

اور پھر اس کے بعد کتنے ہنگامے ہوئے۔ مجھے ٹھیک
سے یاد نہیں۔ ہر بار گھر کو خورشید سے زیادہ سجایا گیا
ہر بار خورشید دلہن بنی، مگر اس کی ڈولی گھر سے باہر نہ
جا سکی۔ عورتیں آئیں اور اس کو مجبوراً سب کے سامنے
شرمانا پڑتا۔ اس کی حیثیت ایک ایسا تماشہ بن کر رہ
گئی جس کو دیکھنے کا ٹکٹ جیسے سب نے حاصل کر لیا تھا
ہر بار وہ پسند کی گئی۔ اس کی خوب صورتی، اس کے
حسن، اور اس کی خوش سلیقگی کو سراہا گیا۔ مگر ہر بار
اماں کی طرف سے انکار ہوا۔ کوئی نہ کوئی رکاوٹ دیوار
بن کر سامنے آ گئی۔ ہر بار اماں کو لڑکے میں کوئی نہ کوئی
عیب ایسا نظر آ گیا۔ کہ وہ ہاں نہ کہہ سکیں۔ ان کے
پرفیکشن کی کسوٹی پر کوئی پورا نہ اتر سکا۔

وقت گزر رہا تھا اور بڑی تیزی سے گزر رہا تھا
اب محلے والوں کی بے چین طبیعتوں نے بھی رنگ دکھانا
شروع کر دیا تھا۔ کانا پھوسی شروع ہوگئی۔ سرگوشیاں
پھیلنے لگیں۔ اشارے ہوئے، مسکراہٹیں ابھریں، خورشید
کی شادی محلے والوں کی گفتگو کا خاص موضوع بن کر رہ گئی
تھی ———— دوسری طرف گھر والے بھی امید کا
دامن چھوڑنے لگے تھے۔ بھائی نے ببانگ دہل کہہ دیا
تھا کہ اماں کو اپنا معیار بدلنا ہوگا۔ ان کے ذہن میں جس
لڑکے کی تصویر ہے وہ شاید روئے زمین پر نہ ملے۔ اس
لئے بہتر یہی ہے کہ کسی ایسے لڑکے کو پسند کیا جائے جس
میں نسبتاً کم خامیاں ہوں۔ اس پر اماں چپ رہی تھیں
شاید بھائی کی بات ان کے دل میں اتر گئی تھی۔

اور پھر آج ایک ہنگامے نے جنم لیا تھا۔ عورتیں
آ گئی تھیں۔ اس بار عورتیں زیادہ تجربہ کار اور جہاندیدہ

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

پاگل ہاتھی

راجہ کو اپنے ہاتھی پر بے حد ناز تھا

ہاتھی جب مستی میں جھومتا ہوا شاہراہ سے گذرتا تو اس کی گھنٹی کی آواز سن کر لوگ جلدی سے راستہ چھوڑ دیتے اور ہاتھی اپنی سونڈ لہراتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ اور جب ہاتھی آگے بڑھ جاتا تو راستے پر کھڑے ہوئے لوگ بڑے اشتیاق سے اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتے رہتے۔

راجہ نے ہاتھی کے گلے میں سونے کی گھنٹی لٹکا دی تھی۔ اس کے دونوں نمائشی دانتوں میں سونے کا خول چڑھا دیا تھا۔ اس کے کانوں میں سونے کے بڑے بڑے بالے ڈال دیئے تھے۔ پاؤں میں سونے کی پازیب پہنا دی تھی۔ اور اس کی پیٹھ پر مخمل کی گدی رکھ دی تھی۔ اور اس کی گدی کی دونوں جانب دو سونے کی زنجیر لٹکتی رہتی تھی۔ جس پر پاؤں رکھ کر راجہ ہاتھی پر چڑھتا تھا۔ اور شہر کا معائنہ کیا کرتا تھا۔

راجہ اپنی رعایا میں بے حد مقبول تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ بے حد انصاف پرور اور رحم دل انسان تھا۔ دوسروں کا دکھ دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا۔ اور رعایا کو خوش دیکھ کر خود بھی خوشی سے نہال ہو جاتا تھا۔

راجہ کی ایک رانی بھی تھی۔ رانی بڑی خوب صورت اور نیک دل تھی۔ راجہ رعایا کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اور رانی راجہ کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ایک دن جب راجہ شہر کا معائنہ کرنے کے لیے ہاتھی پر سوار ہو کر گشت کر رہا تھا۔ تو اچانک اس کی نگاہ راہ میں کھڑی ہوئی ایک دوشیزہ پر پڑی۔ وہ دوشیزہ راجہ کو ایسی بھائی کہ اس نے مہاوت سے فوراً ہاتھی روکنے کو کہا۔ اور جب ہاتھی زمین پر بیٹھ گیا تو راجہ کود کر نیچے اتر آیا۔ اور دوشیزہ کا ہاتھ پکڑ کر بولا — میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

بات راجہ کی تھی۔ اس لئے کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور یہ بات آناً فاناً دوشیزہ کے باپ تک پہونچ گئی۔ دوشیزہ کا باپ ہانپتا کانپتا ہوا راجہ کے پاس آیا۔ اور ادب سے جھک کر بولا — راجہ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن یہ شادی اتنی جلدی کیسے ہو سکتی ہے؟ ریاست کے رسم و رواج کے مطابق ہر باپ اپنی بیٹی کو جہیز دے کر رخصت کرتا ہے۔ لیکن میرے لئے اتنی جلدی شادی کا انتظام اور جہیز کا سامان مہیا کرنا ممکن نہیں۔ راجہ کی شادی تو شایان شان طریقے پر ہونی چاہیئے۔

دوشیزہ کے باپ کی بات سن کر راجہ مسکرایا — میں پرانے رسم و رواج کا قائل نہیں۔ مجھے جہیز نہیں چاہیئے دھوم دھام کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف رانی چاہیے اور کچھ نہیں۔

راجہ کا جواب سن کر دوشیزہ کا باپ راجہ کو اپنے گھر لے گیا۔ اپنے رشتہ داروں کو جمع کیا۔ اور قاضی کو بلا کر راجہ کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ اور راجہ بڑی سادگی سے رانی کو ہاتھی پر بیٹھا کر محل میں لے آیا۔

راجہ کا محل بھی کوئی عالیشان محل نہ تھا۔ اس کے محل میں نوکر چاکر بھی زیادہ نہ تھے کیونکہ وہ سادہ پہ

پہننے، سادہ کھانا کھانے، اور سادہ زندگی گذارنے کا
عادی تھا۔ اس کے محل کے قریب ایک دھوبی رہتا تھا۔
جس سے وہ کپڑے دھلواتا تھا۔ ایک درزی تھا جس سے
کپڑے سلواتا تھا۔ محل میں ایک ملازمہ تھی جو کھانا پکاتی
تھی۔ اور ایک ملازم تھا جو بازار سے سودا سلف لاتا
تھا۔

لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ رات کو صرف دو گھنٹے سوتا تھا
باقی وقت میں یا تو رعایا کی فلاح و بہبود کے بارے میں
سوچتا تھا۔ یا ہاتھی کے بارے میں۔ کبھی کبھی خلاف توقع
گاؤں، بازار، یا شہر کی طرف پیدل سے چل پڑتا اور بھیس
بدل کر گھومتا رہتا۔ اور رعایا کی خیریت دریافت کر کے واپس
چلا جاتا۔

اس نے اپنی ریاست میں جگہ جگہ کنوئیں اور نہریں
کھدوائی تھیں۔ تاکہ رعایا کو پانی کی تکلیف نہ ہو۔ مسجدیں اور
مندریں تعمیر کروائی تھیں۔ تاکہ نیک لوگوں کی تعداد میں اضافہ
ہو۔ مدرسے اسکول اور کالج بنوائے تھے تاکہ غریب رعایا
کے بچے بھی آسانی سے تعلیم حاصل کر سکیں۔ سڑکیں اور
شاہراہیں بنوائی تھیں تاکہ دور دراز کے علاقہ میں بسنے والی
رعایا کو سفر کی سہولتیں حاصل ہوں۔ کھیتوں میں غلے اگانے
کی مہم چلائی تھی۔ تاکہ ریاست کے لوگ پیٹ بھر کھا سکیں
لیکن اتنا کچھ کرنے پر بھی جہاں اس کی رعایا بے حد خوش تھی
وہاں کچھ لوگ اس سے ناراض تھے۔ کہ اس نے ریاست
میں چوری اور ڈاکہ زنی پر پابندی کیوں لگا رکھی تھی۔ اور
عورتوں کو اغوا کر کے حبس بے جا میں رکھنے کی اجازت
کیوں نہیں دیتا تھا۔

راجہ کا مہاوت بھی راجہ سے ناخوش تھا۔ بچپن میں
راجہ اور مہاوت نے ایک ہی اسکول میں تعلیم پائی تھی۔
ایک ساتھ گھڑ سواری کی تھی۔ اور ایک ہی ساتھ شکار کھیلے
تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بھی تھے۔
مہاوت کو توقع امید تھی کہ عنان حکومت ہاتھ میں آنے کے
بعد وہ اسے مزید کوئی بڑا عہدہ دے گا۔ لیکن راجہ نے
جب اسے مہاوت کا رتبہ دیا تو وہ دل ہی دل میں جل بھن
کر رہ گیا تھا۔

راجہ کو ہاتھی سے بڑی محبت تھی۔ اس نے اس
کی تربیت پر کافی روپیہ خرچ کیا تھا۔ اور دوسری ریاستوں
کے ہاتھی کے مقابلے میں اسے سدھانے میں بڑی محنت صرف
کی تھی۔ سالانہ تقریبات میں جب راجہ ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کا
گشت لگاتا۔ اور راستے کے دونوں کنارے پر کھڑی رعایا
قومی پرچم کی جھنڈیاں لہرا کر راجہ کا استقبال کرتے ہوئے
نعرے لگاتی۔ اور اس کے جواب میں ہاتھی اپنی سونڈ لہراتا
ہوا شاہانہ چال چلتا ہوا آگے بڑھتا۔ تو ہاتھی کی ایک ایک
ادا پر راجہ سو جان سے فریفتہ ہو جاتا۔ لیکن مہاوت کو یہ
بات بڑی ناگوار گزرتی۔ وہ اپنے دل میں سوچتا کہ میں
اتنا اچھا مہاوت ہوں کہ ایک اشارے پر ہاتھی کو چلتے
چلتے روک سکتا ہوں اگر چاہوں تو تمام مکانوں کو مسمار
کر سکتا ہوں۔ فصلیں برباد کر سکتا ہوں۔ اور ریاست کی ساری
آبادی کو ہاتھی کے پاؤں تلے ڈال کر کچل سکتا ہوں۔ پھر بھی
ریاست کی رعایا مجھے کوئی اہمیت نہ دیتی تھی۔ اور اس
کے برعکس راجہ کی گرویدہ تھی۔ اسے یہ سب سوچ کر بہت
دکھ ہوتا۔ اور اس دن وہ ساری رات بستر پر جاگتا رہتا
اور کروٹ بدل بدل کر رات گذار دیتا۔

مہاوت بڑا ذہین تھا۔ اس نے ایک دن ہاتھی
سے پوچھا ۔۔ کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے پاس کتنی
قوت موجود ہے؟

ہاتھی نے جواب دیا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔
جب میں چلتا ہوں تو زمین ہل جاتی ہے۔ لوگ راستہ

چھنگھاڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میری چال کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ پھر میرا ڈیل ڈول اتنا بڑا ہے کہ ریاست میں کوئی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں اس حقیقت سے بے خبر کیسے رہ سکتا ہوں۔

نہاوت نے کہا۔ کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر تم چاہو تو ریاست کے تمام شہروں ، دیہاتوں کو مسمار کر سکتے ہو۔ کھیتوں میں کھڑی فصلوں کو تباہ کر سکتے ہو۔ اور ساری آبادی کو اپنے پاؤں تلے روند سکتے ہو؟

ہاتھی نے جواب دیا ـــــ ہاں مجھے اپنی طاقت کا اندازہ ہے میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ اپنی چنگھاڑ سے مکانوں کو ڈھا سکتا ہوں۔ اور اپنی سونڈ سے پتھر اٹھا کر ساری رعایا کو سنگسار کر سکتا ہوں۔ اور انھیں اپنا غلام بنا سکتا ہوں

نہاوت نے اب محسوس کیا جیسے اس کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا ـــ جب تمہیں اپنی بے پناہ طاقت کا اندازہ ہے تو پھر تم اپنی پیٹھ پر راجہ کو اٹھائے کیوں پھرتے ہو؟

نہاوت کے اس سوال پر ہاتھی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ـــــ وہ اس لئے کہ راجہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ میری ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتا ہے۔ اس نے میرے گلے میں سونے کی گھنٹی ڈال دی ہے۔ جس کی آواز میں موسیقی کا لوچ اور رس ہے۔ اس نے میرے دانتوں میں سونے کا خول پہنا رکھا ہے جبکہ ریاست میں کسی کے دانت میں سونے کا خول نہیں ہے۔ اس نے میرے کانوں میں بالے پہنائے ہیں۔ جبکہ اس کی رانی کے کانوں میں بھی سونے کے بالے نہیں ہیں۔ اس نے میرے پاؤں میں پازیب پہنا دی ہے۔ جس کی چھم چھم کی آواز بڑی مسحور کن ہے۔ اس نے میری پیٹھ پر مخمل کی گدی رکھ دی ہے۔ جس کے دونوں طرف سونے کی زنجیر لٹکتی ہے۔ جس سے میری خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ میرے اندر خود اعتمادی آ گئی ہے۔ اور میں بھی اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔

نہاوت لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ لیکن جس جگہ یہ دونوں باتیں کر رہے تھے وہاں ایک دیوار کھڑی تھی جو اپنے دونوں کان کھڑے کئے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ پھر اس دیوار نے ساری باتیں وزیروں تک پہونچا دی وزیر بڑے متفکر ہوئے۔ کیونکہ وہ سب نہاوت کی باتوں کی تہہ تک پہونچ گئے تھے۔

وزیروں نے آپس میں صلاح و مشورے کئے۔ اور طے پایا کہ ساری باتیں راجہ کے کانوں تک پہونچا دی جائیں۔

ایک دن جب راجہ بہت اچھے موڈ میں تھا۔ وزیروں نے راجہ کو نہاوت سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا۔

وزیروں کی باتیں سن کر راجہ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے بولا ـــ "یہ تم لوگ کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہاتھی ہمیشہ سے راجہ کا سواری رہا ہے۔ اور ہاتھی کے ساتھ نہاوت بھی ہوتا ہے۔ اور نہاوت میرے بچپن کا دوست ہے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ گھوڑ سواری کی ہے۔ شکار کھیلے ہیں۔ وہ میرا وفادار نہاوت ہے اور مجھے عزیز بھی ہے"۔

وزیروں نے کہا۔ راجہ کی عمر دراز ہو۔ آپ کی باتیں سو فیصدی درست ہیں۔ لیکن ہماری ریاست کے موسموں کا کوئی ٹھیک نہیں۔ ایسا تو اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مطلع صاف ہے۔ دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ نیلا آسمان ہمارے سروں پر چادر کی طرح تنا ہوا ہے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر بادل چھا گئے۔ زوروں کا طوفان آیا۔ اور کتنی ہی بستیاں تاراج ہو گئیں۔ پھر ہمارے دریاؤں کا بھی یہی حال ہے۔ کہ شام تک موجیں ساکت ہوتی ہیں اور چاندنی میں نہائی ہوئی پانی کی سطح حد نظر تک چمک رہی ہوتی ہے

ن آدھی رات کو اتنی زور کا سیلاب آتا ہے کہ ساحلوں کو غرق دیتا ہے۔

راجہ اب کے مسکرایا اور اس نے وزیروں کو مخاطب تے ہوئے کہا ـــ ایک کہانی سنو! یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہماری ریاست میں ایک شیر نے انسانوں کی ہلاکت ا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مجھے خبر ملی تھی کہ ایک شیر روزانہ بستی کے اجی علاقوں میں گھس کر بے دریغ انسانوں کو ہلاک کر رہا تھا وں جوں دن گزر رہے تھے اس کی خون کی پیاس بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر طرف خوف و دہشت چھایا ہوا تھا۔ اور میری رعایا تیر کمان لے کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے میدان میں اتر آئی تھی۔ لیکن شیر طاقت ور بھی تھا۔ اور شاطر بھی۔ اس لئے ساری آبادی مقابلے پر آجانے کے بعد بھی شیر کو ہلاک کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ اور جان کا زیاں بڑھتا جا رہا تھا۔

جب مجھے یہ خبر ملی تو میں نے اسے اپنا فرض سمجھا کہ شیر کے ہلاک کرنے میں لوگوں کی مدد کروں۔ لہذا میں کتنے ہی دنوں تک جنگل میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اور شیر کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ میں شیر کو ہلاک کیا کرتا کہ خود ہی شیر کے نرغے میں آگیا۔ شیر اپنا جبڑا کھولے ہوئے میرے سامنے تھا۔ اور میں سر سے پاؤں تک شل ہو کر رہ گیا تھا۔ بس چند لمحوں کی بات تھی۔ شیر کو جست بھرنا تھا اور مجھے اپنے پنجے میں دبوچ لینا تھا۔ موت میرے سینے کھڑی تھی۔ اور زندگی کی کوئی بھی امید نہ تھی کہ اتنے میں میرے عقب سے دو تیر آئے اور شیر کی آنکھوں میں پیوست ہو گئے۔ اپنی بینائی کھو کر شیر کا نشانہ خطا کر گیا۔ اس نے جست بھری۔ لیکن میری طرف آنے کی بجائے دوسری طرف چلا گیا۔ اور آنکھوں کی تکلیف سے تڑپنے لگا۔ اور بڑی ہی خوفناک آواز میں گرجنے لگا۔ اتنی دیر میں تیر کمان اور بھالے بلم لئے ہوئے بہت سارے لوگ وہاں پہونچ گئے۔ اور ہم نے شیر کو ہلاک کر دیا۔ اور قتل و غارت گری سے نجات حاصل کر لی۔

اپنی کہانی ختم کر کے راجہ نے کہا ـــ میں اس دن بھی شیر کا نوالہ بن سکتا تھا۔ لیکن جب اس دن موت کے پنجے سے صحیح و سلامت نکل آیا تو اب مجھے موت کا خوف کیوں ہو۔ میری زندگی تو ایک عطیہ ہے۔ مجھے اس کی فکر کیوں ہو۔ لوگ ملبے کے ڈھیر سے بھی تو زندہ برآمد ہوتے ہیں۔ درخت کی پھنگیوں میں جھولتے ہوئے لوگ بھی زندہ بچ گئے ہیں۔ اور دریا میں ڈوب جانے والے بھی لوگ کنارے پر زندہ پائے گئے ہیں۔

راجہ کی باتیں سن کر وزرا خاموش ہو گئے۔ کیونکہ ان کے پاس مزید کہنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ خبر ہوا کی مانند ہوئی رانی تک جا پہونچی۔ اور رانی پریشان ہو اٹھی۔ پھر جب راجہ اپنے محل میں گیا تو رانی اپنے دونوں بچوں کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمٹائے ہوئے راجہ کا انتظار کر رہی تھی۔

راجہ نے خلاف معمول رانی کو پریشان دیکھ کر پوچھا نصیب دشمناں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے کہ آج تم بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو؟

رانی نے جواب دیا ـــ آج میں نے بہت برا خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ راجہ ہاتھی پر سوار ہو کر ریاست کے دورے پر نکلے ہیں۔ راستے میں مہاوت گرز مار کر ہاتھی کو اشتعال دلاتا ہے۔ اور جب ہاتھی مشتعل ہو جاتا ہے۔ تو خود ہاتھی سے کود کر اپنی جان بچا لیتا ہے۔ لیکن ہاتھی راجہ کو اپنی سونڈ کی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

رانی کی بات سن کر راجہ قہقہہ مار کر ہنسا۔!

تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو رانی۔ خواب کیا دن میں بھی دیکھے جاتے ہیں؟

تب رانی نے جواب دیا۔ کچھ ایسے خواب بھی ہیں جو جاگتے ہوئے دن میں بھی دیکھے جاتے ہیں۔

راجہ نے کہا۔ لیکن خواب کی تعبیر تو ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔

رانی نے جواب دیا۔ دن میں دیکھے جانیوالے خوابوں کی تعبیر الٹی نہیں ہوتی۔ پھر میں نے سنا ہے کہ جب ہوائیں سرگوشیاں کرنے لگیں تو کوئی ان ہونی بات ضرور ہوتی ہے۔ میں نے ہواؤں کی سرگوشیاں بھی سنی ہیں میں نے سنا ہے کہ طوفان آنے سے پہلے پرندے فضا کی بلندیوں میں بہت دوری پر پرواز کرنے لگتے ہیں۔ سو میں نے پرندوں کو آسمان کی دوسری بلندی پر پرواز کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور میں اس آنیوالے طوفان سے آپ کو باخبر کرتی ہوں۔

راجہ نے کہا۔ تم اس کی فکر نہ کرو کہ ہوائیں سرگوشیاں کرنے لگیں ہیں۔ اور پرندے بلندی پر پرواز کرنے لگے ہیں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اور آنے والے طوفان کو کوئی آج تک روک نہ سکا ہے۔

راجہ کی باتیں سن کر رانی اور بھی افسردہ ہو گئی۔ پھر اس نے راجہ سے پوچھا — مہاوت کو تبدیل نہیں کر سکتے؟

رانی کی باتیں سن کر راجہ سوچ میں پڑ گیا کیونکہ اسے جتنا پیار ہاتھی سے تھا اتنی ہی محبت مہاوت سے بھی تھی۔

پھر راجہ سوچتا ہی سوچتا رہا۔ اور رانی کا سوال ایک گونج بن کر اس کے ذہن میں بجتا رہا۔ مہاوت کو تبدیل نہیں کر سکتے؟ مہاوت کو تبدیل نہیں کر سکتے؟ مہاوت کو تبدیل نہیں کر سکتے؟؟

پھر یہ سوال بار بار دہرایا جانے لگا۔

وزیروں نے راجہ سے پوچھا۔ مہاوت کو تبدیل نہیں کر سکتے؟

ہواؤں نے راجہ سے پوچھا۔ مہاوت کو تبدیل نہیں کر سکتے؟

کالی گھٹاؤں نے راجہ سے پوچھا۔ مہاوت کو تبدیل نہیں کر سکتے؟

درختوں نے، پھولوں کے پودوں نے راجہ سے پوچھا۔ مہاوت کو تبدیل نہیں کر سکتے؟

لیکن راجہ ہاتھی پر سوار پوری ریاست کا گشت کرتا رہا اور مہاوت ہاتھی کی گردن پر سوار رہا۔ وزیروں، ہواؤں، کالی گھٹاؤں، درختوں، پھولوں کے پودوں کا سوال اس کے کانوں میں گونجتا رہا۔ اور راجہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔

پھر ایک دن سچ مچ راجہ نے مہاوت کو گھوڑے کے اصطبل میں تبدیل کر دیا۔ جواز یہ تھا کہ اصطبل کے گھوڑوں کی اعلیٰ تربیت کے لئے ایک ماہر گھڑ سوار کا ہونا ضروری ہے اور چونکہ مہاوت گھڑ سواری کے فن میں یکتا ہے اس لئے یہ ذمہ داری اسے اس کی فنی مہارت کے پیش نظر سونپی گئی ہے۔

لیکن مہاوت نے راجہ کے اس حکم کو اپنی توہین پر محمول کیا۔ مہاوت کے خیال میں ہاتھی سے مہاوت کو گھوڑے کے اصطبل میں تبدیل کرنے کے معنی یہ تھے کہ اسے اپنے عہدے سے نیچے گرا دیا گیا تھا کیوں کہ مہاوت اور اصطبل کے مدرس میں بڑا فرق تھا۔

راجہ کا حکم سن کر مہاوت آگ بگولہ ہو گیا۔ اور نہ

نے اس نے راجہ کا حکم ماننے سے انکار کیا۔ بلکہ راجہ سے
توہین کا انتقام لینے پر اُتر گیا۔

راجہ بھی راجہ تھا۔ اس نے اس کو زیادہ اہمیت
نہ دی۔ پھر ایسا ہوا کہ راجہ ریاست کے دورے پر نکلا
اور اپنے محل سے دور ایک پہاڑی علاقے میں شب
باشی کے لئے خیمہ زن ہوا۔ تو مہاوت نے نشہ آور
ادویات چارہ میں ملا کر ہاتھی کو کھلا دیا۔ اور ہاتھی
پاگل ہو گیا۔

رات کو جب راجہ جاگ رہا تھا۔ اور اس کا سارا
عملہ بے خبر اپنے خیمے میں سو رہا تھا۔ یکایک زوروں کی
بارش ہونے لگی۔ رات تاریکی میں ڈوب گئی۔ اور
جب رات تاریکی میں ڈوب گئی۔ تو ہاتھی چنگھاڑنے لگا
ہاتھی کی چنگھاڑ اس علاقے میں کوئی نئی بات نہ تھی اس
لئے لوگ اپنے اپنے بستر پر اطمینان سے سو رہے۔ ہاتھی
کی چنگھاڑ پر کسی نے بھی دھیان نہ دیا۔

پھر پاگل ہاتھی چنگھاڑتا ہوا راجہ کے خیمے میں داخل
ہو گیا۔ اور جب ہاتھی راجہ کے خیمے میں داخل ہوا تو راجہ
کے عملے نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ سبھوں کو کچلتا ہوا
آگے بڑھ گیا۔ اور راجہ کو اپنی سونڈ میں لپیٹ کر دے
مارا۔ اور اس کے جسم کو اپنے پیروں سے روند ڈالا۔

دوسری صبح پوری ریاست میں آگ کی طرح پھیل
گئی۔ کہ راجہ کا ہاتھی پاگل ہو گیا۔ اور اس پاگل ہاتھی نے
راجہ کو ہلاک کر دیا۔

ساری ریاست میں صف ماتم بچھ گئی۔ اور پاگل
ہاتھی کے خوف سے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے
بیٹھے رہے۔ اور پاگل ہاتھی شہر کا گشت کرتا رہا۔

پھر مہاوت نے خود کو ریاست کا راجہ ہونے کا
اعلان کیا۔ اور ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی یہ خبر پوری
ریاست میں پھیل گئی۔ دو دنوں تک ہاتھی چنگھاڑتا ہوا
گشت کرتا رہا۔ اور مہاوت کی حکمرانی چلتی رہی۔ تیسرے
دن ہاتھی گشت کرتا ہوا مہاوت کے پاس آگیا۔ اس
کی چال میں اب بھی وہی تمکنت تھی۔ اس کے گلے میں گھنٹی
بج رہی تھی۔ دانتوں میں سونے کا خول چڑھا ہوا تھا۔
کانوں میں سونے کے بالے جھول رہے تھے۔ پاؤں
میں سونے کی پازیب بج رہی تھی۔ اور اس کی پیٹھ پر
مخمل کی گدی تھی۔ جس کے دونوں طرف سونے کی زنجیر
لٹک رہی تھی۔ ہاتھی نے مہاوت کے قریب پہونچ کر اپنی سونڈ
بلند کر کے اسے سلامی دی۔ مہاوت نے اسے بیٹھنے کا حکم
دیا۔ ہاتھی بیٹھ گیا۔ پھر مہاوت نے سونے کی زنجیر پر پاؤں
رکھا۔ اور ہاتھی کی پیٹھ پر سوار ہو کر مخمل کی گدی پر بیٹھ گیا
مہاوت کی زندگی کا وہ زریں لمحہ تھا کہ اس کی برسوں
کی آرزو پوری ہو گئی تھی۔ اس نے خوشی کے جذبے سے
سرشار ہو کر اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اور ہاتھی
کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ لیکن پاگل ہاتھی اچانک بھڑک
گیا اس نے اپنے بھاری بھرکم جسم کو زور سے جنبش دی۔
اور مہاوت اپنا توازن کھو کر زمین پر آگیا۔ زمین پر گرتے
وقت اس کا پاؤں سونے کی زنجیر میں الجھ گیا۔ اور اس
کے ساتھ مخمل کی گدی بھی زمین پر آگئی۔

پھر پاگل ہاتھی نے مہاوت کو بھی اپنی سونڈ میں
لپیٹ کر زمین سے اوپر اٹھایا اور ہوا میں اچھال دیا۔

مہاوت بڑا ذہین تھا۔ ہاتھی کو سدھانے میں
بھی اسے مہارت حاصل تھی۔ لیکن نہ جانے اسے یہ کیوں
یاد نہ رہا کہ پاگل ہاتھی راجہ اور مہاوت کی پہچان کھو دیتا
ہے۔ ●●

آچاریہ شوکت خلیل

تیسری دنیا

(۱)

ہیلو آنٹی، گڈ مارننگ
مارننگ مَین، کالسا ہائے۔؟
فائن ویری فائن، ـــــ بٹ وہاٹ ہنڈ
ڈ لو آنٹی۔؟

ارے ہوئنگا کیا ڈلّو بابو ـــــ بٹ تم کو بتائیگا
ٹو بہوٹ تکلیف ہوئیگا تم کو بھی۔

ٹھیک ایک ڈم سچ باٹ بولتا ہائے۔ بلیو سی،
اڈر میں ایک ڈم بی ڈل نائیں لگتا۔

ایسا مانک کائے کو بولتا آنٹی۔ کیا ہوا؟ تمی بولو
کیو کچھ بولے ہے نا کی؟

ارے کیا بولیں گی میں۔ بولنے کا بہوٹ باٹ ہائے
راٹ کا نام عبدل کا بیٹا چوکڑا لوگ کے ساتھ میں تاس
کھیلتا تھا۔ بہوٹ بہوٹ جوڑ جوڑ سے ہلا ہو مار رہا ـــــ
ہمرا ہسبینڈ اس کو جاکے بولا۔ ڈیکھو بین راٹ کے ٹائم میں
ایسا مانک چلا چلی مٹ کرو۔ ہم لوگ کا سونے دو۔
بٹ اتنا سا باٹ بولنے کو۔ چلئے او بلاڈی کتا کا بچہ، ہمرا
ہسبینڈ کو گالی دے ڈیا۔ جوب تیرا ماں کا ......۔ آپن
او باسٹنڈ ہمرا ہسبینڈ کو مارنے کو ڈوڑا ـــــ ہمرا
ہسبینڈ ایک ڈم جلدی سے بھاگتا نہیں۔ ٹو تم کو سے

بولتا ہائے ڈلّو بابو وہ حرامی ہمرا ہسبینڈ کو جان سے مار
ڈیتا ـــــ (چند لمحے توقف اور پھر) ڈیکھو مین، ڈلّو
بابو۔ مسلمان کا جاٹ کتنا حرامی؟ کتنا برا برا گالی بولتا
ہے۔ کام کاج کچھ کرتا نائیں۔ ڈن بھر کھالی بیٹھ بیٹھ کے
تاس کھیلتا اور چوکڑی لوگ کا سیٹی مارتا ـــــ
تم کو سے تین ڈن آگے کا ایک ٹھو باٹ بولتا
ہائے۔ ٹو حمید کا بیٹا ایڈگا کا بیٹی کا ...... بائی گاڈ
ایک ڈم چیر ڈسی۔ چوکڑی لڑنے کو ہونا تھا ـــــ
بلیو می ہم کھڈ اپنا آنکھ سے ای سب ڈیکھا۔ آ ہم کو ڈل
ایک ڈم بہوٹ جوڑ سے ڈر ڈر کر گیا۔ او بلاڈی کتا کا بچہ
ایک ڈم بہوٹ تگڑا جوان، ٹھو مرڈ۔ اور ایڈگا کا بیٹی
ابھی کھالی چوڈہ پنڈرہ برس کا۔ بلیو می ڈلّو بابو۔ لو
ایک ڈم ابی ای سب کام کرنے کا لائک نائیں ہائے۔
چوکڑی ہم کو ڈیکھ کے بولا۔ ہم کو بچاؤ آنٹی۔ ڈیکھو ای
حرامی ہم کو ساتھ میں کالسا جنگلی کتا کا مافک کرتا ہائے
ڈیکھو آنٹی بائی گاڈ۔ ہمرا جان نکلتا ہے۔ بٹ ای جبر
ڈستی ہم کو ...... ڈیکھو ای ہمرا کالسا کھراب حالت
کر ڈیا۔ ابی ہم گھر جائیں گا۔ ٹو ممی کیا بولیں گا ـــــ؟
(پھر چند لمحے کا توقف اور اس کے بعد) ڈیکھو ڈلّو بابو۔
ایک باٹ تم کو بولتا ہائے۔ ابی اڈر میں کوئی کالون نائیں
چلتا ہائے۔ بٹ میں تم کو جاننا مانگے۔ ہم لوگ کے راج
میں کتنا کڑا کانون تھا۔ اور آدمی لوگ کتنا ڈرتا رہا کانون
سے ـــــ آپن کتنا حرامی لوگ کا سیدھا کر کے
رکھا ہم لوگ اپنا راج میں۔؟

آئی، تو لوڈ لڑ بابو۔ سیدھا کر کے رکھا کی نہیں ہم
لوگ اپنا راج میں۔؟

(۲)

سلام میم صاحب

سلام بابا سلام کاٹسا ہائے ؟

آپ لوگ کا دُعا سے اچھا ہے میم صاب

ارے ٹم کو ٹو مین ہم لوگ کا دعا سے اچھا ہائے

ٹب ہم لوگ کا ایک ڈم بی ابی اچھا نائیں ہائے ـــــ

ابی ہم کو ڈل ٹھوٹ جوڑ جوڑ سے رونے کو چا ہٹا ہائے

ڈیکھو مین۔ عبڈل میاں۔ ابی ہم ٹرام میں ولنگٹن سکیئر سے آٹا رہا۔ بس آکے ٹرام کو روک ڈیا۔ جھنڈا والا سب۔ آیمن بنگالی کا ایک ٹھوچھوکرا ٹرام میں گھس کے ہمرا...... کو ٹھوٹ جوڑ سے مسل ڈیا۔ ہم کو ٹھوٹ جوڑ سے ڈرڈ ہوگیا۔ ایک ڈم سے روڈیا ہم۔ ہمن اس کو ہم بولا۔ ایسا کاہے کو کرٹا ہائے حرامی ؟ بس وہ بلاڈی کتا کا بچہ ایک ڈم سے ایک ٹھوچھوڑا نکال کے ہم کو پیٹ میں لگا ڈیا۔ اور بولا۔ چھپ ٹیرا ماں کا...... آمین ٹھوٹ برا برا گالی ہم کو ڈینے لگا ـــــ (چند لمحے کا توقف اور پھر) ڈیکھو عبڈل میاں بنگالی کا جاٹ کٹنا حرامی ؟ ایک ڈم سے کالوں سے ڈرٹا ناہیں ہائے۔ بٹ ٹم کو ٹو ای باٹ جانٹا ہائے عبڈل میاں جب ای ملک میں ہم لوگ کا راج تھا۔ ٹب آڈمی لوگ کٹنا عزٹ کرٹا تھا کالوں کا اور کٹنا ڈر ہوٹا رہا آڈمی لوگ کا ڈل میں کالوں کا ـــــ آپمن لوگ کا راج میں کٹنا حرامی لوگ کا سیڈھا کر کے رکھا ـــــ ہئیو، اِلو عبڈل میاں۔ سیڈھا کر کے رکھا کی نہیں۔ ہم لوگ اپنا راج میں حرامی لوگ کا۔

(۳)

ہائے مین۔ تھیئٹر میں جائیں گا ہمرا ساٹھ میں ؟ کھالی ڈس روپیا لیں گا۔

کتنا بولا۔ دس روپیا ؟ ہش نہیں چلے گا۔

اوہ لو مین۔ ٹم ایسا ناٹک کاہے کو بولتا ہائے۔ ایک ڈم بی جاسٹی ناہیں بولا ٹم کو ـــــ ابی ٹم ہم کو ڈیکھا نائیں۔ ڈیکھو اپنا ای ہاٹھ ٹھوڑا لاؤ اڈر، لاؤ نہ، ارے سرماٹا کاہے کو ہائے مین۔ اڈر جرا باڈی کے بھیٹر میں چھپ کے ڈیکھو۔ ڈیکھا ؟ ایک ڈم بڑھیا والا ہائے کی ناہیں ؟ آمین جرا ٹم نیچے ڈیکھو۔ ارے ڈیکھو مین۔ ایک ڈم ٹھوکٹ میں چھپ کے ڈیکھنے کو بولٹا ہائے۔ بس ٹھیک ٹب چلتا ہمرا ساٹھ میں۔ جب ڈیکھیں گا ٹب ٹم بھی بولیں گا کی ڈس روپیہ ایک ڈم کم ہائے ہمرا واسطے۔

ڈیکھ لیا۔ ٹم ساٹھی سینچوری مار لیا ہے۔ دس روپیا میں نہیں چلے گا۔ دس روپیا میں ایک دم فرسٹ ہینڈ ملتا ہے ادھر میں۔ ٹم تو ساٹھی بیس برس کا بڑھیا ہے ـــــ

اوہ لو مین۔ بائی گاڈ ابی ہم بیس برس کی بڑھیا نہیں ہوا۔ ہم ٹم کو اپنا برتھ سرٹیفکیٹ ڈکھا نے سکتا ہائے۔ آئی ایم تھرٹین آن لی۔

ٹھیک ہے۔ مگر ہم دس روپیہ نہیں دے گا۔

اچھا لو ایک کام کرو مین۔ ٹم ہم کو نو روپیہ ڈے ڈو۔

نہیں۔ نو بھی بہت ہوتا ہے۔ پانچ روپیہ دیگا۔

اچھا ڈیکھو، ہم بی ٹم کو سے آکھری باٹ بولٹا ہائے آٹھ روپیہ ڈے ڈو۔

نہیں پانچ۔

ارے مین ٹم کٹنا جڈی ہائے۔ پلیز ٹھوڑا ایسا کنسیڈر کرو۔ پانچ روپیہ میں کاٹسا ہوئیگا ـــــ پانچ روپیہ میں دو روپیہ ہم کو کھولی کا بھاڑا دینا ہوئیگا ٹین ہم کو ہمرا بھاڈر کو آ مڈر کو ڈینے ہوئیں گا۔ ہمرا مسٹر اینڈ کا ٹم نہیں جانٹا۔ او بلاڈی ٹھوٹ حرامی

رحمٰن حمیدی

لرزتی کرنوں کی زد میں ایک شام

کیبن کے لیمپ کی روشنی ملگجے اندھیرے کو طے کرتی ہوئی اس کے کان کے لو کے آویزے میں پیوست ہیرے سے ٹکرائی۔ اور قوس و قزح کا رنگ پورے کیبن میں بکھر گیا۔ صاف و شفاف میز کی چمک میں اس کے شبابی چہرے کا عکس یوں جھلملانے لگا۔ جیسے متلاطم موجوں کی سطح پر کوئی لرزتا ہے میں کسی بھی کال گرل کی طرف مائل ہونے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن اس کا نیم عریاں جسم اور چہرے کی مقناطیسی کشش نے اس انداز سے محسوس کیا کہ میں اس کے ساتھ کافی ہاؤس کے کیبن میں چلا آیا۔ اس نے کافی کی بجائے شراب کا آرڈر دیا اور برق تبسم گراتی ہوئی مخاطب ہوئی۔

میں نے کبھی اپنے چہرے پر نقاب نہیں ڈالی۔ میری زندگی کھلی ہوئی کتاب ہے۔ دن ہو یا رات صرف شراب پیتی ہوں۔ شراب ہی میری زندگی ہے۔ میرے فرج میں شراب کی بوتل ہمیشہ رہتی ہے۔ شراب پینا اور پلانا میرا محبوب مشغلہ ہے۔

میں نے سگریٹ سلگایا۔ اور اس کی طرف بڑھا دیا اس نے لائٹر سے سگریٹ سلگا کر مزید کہا۔

آج آپ کے ساتھ وہ نہیں ہے اس نے کئی جگہوں پر میری شکایت کی ہے لیکن مجھے اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے جہاں جسم کا سودا ہوتا ہے۔ وہاں اس طرح کی باتوں پر کون دھیان دیتا ہے۔ میرا جسم ہی ایسا ہے کہ میرا مارکیٹ کبھی خراب ہی نہیں ہو سکتا —— کیا آپ دونوں کے مابین کوئی بات ہو گئی ہے ——؟

یہ بھی عجیب بات ہے مجھ سے زیادہ دوسروں کو اس کی غیر موجودگی محسوس ہو رہی ہے۔ میں تو صرف سوچ رہا ہوں۔

کیا سوچ رہے ہیں ——؟ اس نے بے تابی سے پوچھا

انسان کی ذات میں کتنے خانے ہوتے ہیں۔ ایک جسم پر کتنے چہرے ہو سکتے ہیں۔ وہ کتنی سرعت سے رنگ بدلتا ہے۔ اور پھر مرد و زن کی سرشت میں کتنا فرق ہے عورت متاعِ بے بہا لٹا کر بھی زرخیز رہتی ہے اور مرد سب کچھ پا کر بھی تہی دست رہتا ہے۔ آخر کیوں ——؟

اتنے میں بیرا شراب اور بھنا ہوا مرغ ٹرے میں لے کر آیا۔ اور میز پر قرینے سے رکھ کر چلا گیا۔ اس نے دو پیگ بنایا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

شروع کیجیے —— ہاں تو آپ کی فکر کا محور انسان کی ذات ہے۔ اور وہ لومڑی والی عورت نہیں —— حالانکہ پورا شہر اسی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

میں تو چاہتا ہوں کہ لومڑی والی عورت شہر میں اور آ جائیں۔ کیونکہ مردوں کے سمندر میں پانی والا ایکسرے بھی نہیں ہے۔ سمندر خشک ہو چکا ہے۔ صرف ہیولیٰ ہے۔ اصلیت بہت پہلے ہی سلب ہو چکی ہے۔ —— تم اس کی باتیں کر رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے بھاری جیب والے پر ڈورے ڈال رہی ہے —— یہ بتاؤ کیا تم نے لومڑی والی عورت کو قریب سے دیکھا ہے ——؟

ہاں سیکس کے اعتبار سے وہ مکمل عورت ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے شانے پر لومڑی بیٹھی رہتی ہے

لومڑی کی دم اس کی گردن میں زندہ سانپ کی طرح لپٹی رہتی ہے وہ جسم کے اعضا کی طرح دماغ کی ہر آواز سنتی ہے۔ اور اس کے ارشاد و حکم کی تعمیل کرتی ہے۔ لومڑی اس کے جسم سے اصیل بکھر زمین پہ آتی ہے۔ اسی کی طرح اس کی دم کھلتی جاتی ہے [illegible] ہو جاتی ہے۔ وہ شاہراہ پر جس طرف جانا چاہتی ہے۔ آسانی سے چلی جاتی ہے، کبھی وہ شانے پر رہتی ہے۔ اور کبھی پالتو بلی کی طرح گود میں بیٹھی رہتی ہے۔ جب وہ ہوٹل میں کال گرل کی طرح گم ہوتی تھی۔ تو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ اس کی پالتو لومڑی ہے۔ پیار و محبت سے شانے پر بیٹھی رہتی ہے۔ کیونکہ اس کے فراک کا کالر بڑا ہوتا ہے۔ جس سے اس کی گردن بالکل چھپ جاتی ہے۔ عورت کا جسم غضب کا ہے۔ آج تک میں نے کسی عورت کا جسم اتنا جاذب اور سڈول نہیں دیکھا۔ اسی طرح کے جسم اور حسن پر شہنشاہوں نے تاج و تخت قربان کر دیا وہ عورت بالکل بے ضرر ہے۔

تو پھر مردوں کی اموات کیسے ہوتی ہے ——؟

میں نے پوچھا۔

موت کی وجہ عورت نہیں لومڑی ہے۔ یہ جھپٹ کر عضو تناسل دانتوں سے چبا ڈالتی ہے —— اور پھر مرد تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتا ہے۔ ہر مرنے والے کے جنازے میں وہ ستی ساوتری کی طرح چلتی ہے۔ آخری رسوم ادا کرنے والوں کو عورت ناقابل تسخیر گھوڑے کی کہانی سناتی ہے جس کی بنیاد پر عہد ماضی میں حکومت کی سرحدیں قائم ہوا کرتی تھیں۔ اور شہنشاہ اسے ہون کی آگ میں قربانی کے طور پر ڈال دیتا تھا۔ اس کی وجہ سے یہ شہر مردوں کی وجہ سے خالی ہو رہا ہے۔

اس نے میز کی گھنٹی کا بٹن دبا کر بیرے کو بلایا اور

اور مزید بھنے ہوئے مرغ کا آرڈر دے کر کہا۔

اس طرح کی عورتوں کا نزول خاص خاص موقعے پر ہوا ہے میز پا بے

جب حکام جنسی ہوس میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ پر جنس ہی جنس طاری ہو جاتی ہے۔ تو بے حس حکام کی اندھی جبلت کی تسکین کے لئے اس طرح کی عورتیں آتی ہیں۔ یہ وقت کی سفاکی کی علامت ہے۔

میں تمہارے خیالات سے متفق نہیں —— ازل سے ابد تک وقت جوں کا توں ہے۔ شب و روز وہی ہیں۔ کائنات اپنی پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ وقت کی نہیں۔ انسان کی سفاکی ہے [illegible] چراغ ہیں۔ ایک ہی سال سے کسی ذہن کو سکون [illegible] حاصل ہوتی ہے اور کسی ذہن کو وحشت ہوتی ہے وہ زاویۂ فکر اور زاویۂ نگاہ میں فرق آگیا ہے یہ سفاکی وقت کی نہیں انسانی شعور کی ہے خون کی سفیدی کے یہ سارے کھیل ہیں —— شراب کا دور ختم ہو چکا تھا میں نے بل ادا کیا اور ہم دونوں کافی ہاؤس سے باہر آگئے۔

یہاں کی صحبت میں کوئی خاص مزہ نہیں آیا۔ چلئے پٹنہ مارکیٹ میں چہل قدمی کی جائے —— اس نے آفر کیا۔

ہم دونوں کافی ہاؤس سے باہر آگئے۔ ٹہلتے ہوئے پٹنہ مارکیٹ تک آگئے۔ مارکیٹ میں زبردست چہل پہل تھی۔ چہرے اور لباس سے خوش حالی ٹپک رہی تھی۔ مگر مارکیٹ میں زبردست شور ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ دکان داروں نے دکانوں کے شٹر گرا دیئے۔ ملے جلے شور سے یہی اندازہ ہوا کہ لومڑی والی عورت مارکیٹ میں آ گئی ہے ہم دونوں ایک کونے میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔ چند منٹ کے اندر مارکیٹ ویران ہو گیا۔ پتہ چلانے پر معلوم ہوا کہ ایک عورت اپنے ایلیشین کتے کے ساتھ آئی۔ جسے لوگوں نے لومڑی والی عورت [illegible] لوگوں نے سمجھ لیا۔ اور بھگدڑ مچ گئی ہم دونوں ہنستے ہوئے باہر آئے۔ نرس ہوسٹل کے کنارے سے ہو کر دریا کے کنارے آگئے۔ میں نے کہا۔

شاہم بارک پوری
(بنگلہ دیش)

آبلہ

اگر اچھی صحت اور ذہانت کسی کی شخصیت کا مظہر ہو تو یہ صفات اس میں موجود تھیں۔ اس کا چہرہ گلاب کی طرح ترو تازہ اور شاداب تھا۔ قندیل جیسی روشن آنکھیں، غنداں پیشانی۔ لبوں پر مسکراہٹ، گٹھیلے بازو، اور مضبوط پٹھے، امنگ اور حوصلے سے بھرا دل ـــــ زندگی کے سفر پر رواں دواں۔ شاداں و خرم مسافر جو ستاروں پر کمند پھینکنے کی تمنائے اپنی منزل پر گامزن تھا۔ وہ زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گیا تھا چھبیس برس کا خوبرو نوجوان ترقی کی راہ پر موج کی طرح بڑھا جا رہا تھا۔ اس کی ذہانت، عظمت اور استقلال سے اس کے احباب، رشتہ دار اور ہمسائے بھی متاثر تھے ـــــ!

اس کی صحت قابل رشک تھی۔ اچانک ایک دن اسے اپنے بائیں بازو میں تکلیف کا احساس ہوا جب سوزش حد سے بڑھی تو ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد نسخہ لکھ دیا۔ چند دنوں آرام کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا۔ وقت کی دیمک دھیرے دھیرے اس کے وجود کو چاٹ رہی تھی۔ اس نے اسپیشلسٹ سے معائنہ کروانا مناسب سمجھا۔ بڑے ڈاکٹر نے نیا نسخہ لکھ کر دیا۔ ساتھ ہی بازو پر مسلسل مالش کرنے کی تاکید کی ـــــ تاکہ رگوں میں دوران خون جاری رہے۔ اور اس کا ہاتھ معمول کے مطابق کام کرتا رہے ـــــ مگر یہ علاج بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ وہ درد کی تکلیف سے نڈھال آنے والی بدساعتوں سے خائف تھا۔

ایک صبح جب دھوپ کسی حسینہ کی سنہری زلفوں کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ وہ نیند سے بیدار ہوا۔ درد سے ہاتھ اٹھایا نہ جا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کا جائزہ لیا۔ اس کی چکنی جلد پر پھنسی نکل آئی تھی۔ وقت کے سانپ نے اس کے بازو پر ڈنک مار کر لہو کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر زہر بھر دیا تھا۔ چند روز گرم پانی میں روئی بھگو بھگو کر سینکتا رہا۔ اس پر بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اب پھنسی آبلے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ دامن صحرا سے بگولوں کا ہجوم اٹھا تھا۔ آبلے کی خلش سے اس کا سارا جسم اینٹھنے لگا۔ اس کے جسم کا ہر عضو متاثر ہو رہا تھا۔ اس کا انگ انگ درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ سوزش سے وہ تلملا رہا تھا۔

اس کی قسمت کے افق پر اضطراب کی ظلمت چھا گئی تھی۔ مرض ناگہانی سے اس کے چہرے کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ دن دن صحت گرتی جا رہی تھی۔ کرب و درد نے اس پر بری طرح اثر کیا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف وحشت کا ایک حصار پھیلا ہوا تھا۔

اس کے پڑوس میں ایک ماہر جراح رہتا تھا۔ جس کی شہرت سارے شہر میں تھی۔ اس نے اپنا کلینک بھی کھول رکھا تھا۔ وہ شہر کے سب سے بڑے ہسپتال کا ماہر جراح بھی تھا۔ وہ علاج کے لئے اس کے پاس گیا تاکہ زوال آفتاب سے پہلے غسل مہتاب ہو سکے۔

سرجن نے بہت دلچسپی [illegible] اور لگن سے اس کے عضو کے ہر حصے کو بغور جائزہ [illegible] کے آلات سے اس کے دست و بازو کا [illegible] لیا وہ بھی اس کی قابل رشک صحت [illegible] دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ سڈول اور [illegible] جس کی توانائی اپنی مثال آپ تھی [illegible] اس کے لئے پریشانی کا باعث بن گئی۔ شیشے کی طرح چکنے اور گٹھیلے بازو پر آبلہ بہت ہی تکلیف دہ تھا۔

تفصیلی معائنے کے بعد سرجن نے کہا۔ آپ کے اصل مرض کی جڑ یہ آبلہ ہے جس سے پورا بازو مبتلائے دلدل ہے۔ گویا گلشن میں خزاں برقرار رہے گی۔

ڈاکٹر صاحب اس کے علاج کے لئے کچھ کیجئے نا۔ اس نے بے چارگی سے سرجن کی طرف دیکھا۔

مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آبلے کے جراثیم آپ کے بازو میں پھیل چکے ہیں۔ سرجن کی دوربین نگاہیں اس کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کا بازو پیڑ تھا جو نہ سایہ دے سکے اور نہ پھل

کوئی جراثیم کش دوا دیجئے۔ تاکہ میرا بازو ٹھیک ہوجائے۔ اس پر سراسیمگی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ ساحل کی ریت پر بنائے ہوئے گھروندے کو وقت کی ایک ہی لہر آکر اپنے ساتھ بہا نہ لے جائے۔

بیکار۔ دوا دینے سے یہ جراثیم آپ کے بازو تک محدود نہیں رہیں گے۔ بلکہ سارے جسم میں پھیل جائیں گے ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر بھرپور نظر ڈالی۔ تاکہ اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا سکے۔ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ وہ جانتا تھا کہ تیرہ بختی کی پرچھائیاں قطار میں باندھے اس کے سامنے کھڑی ہیں۔

وہ کیا؟ اس نے ڈاکٹر کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ [illegible] ذہن میں بہتے ہوئے دھارے پہ گلاب کھلانے کا خیال جاگا۔

بہتر یہی ہے کہ آپریشن کرکے یہ بازو کاٹ دیا جائے ڈاکٹر کا جواب اس کے سینے پر تیر کی طرح لگا۔ آبلے کا سارا درد سمٹ کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔

نہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ کرسی سے اچھل پڑا۔ اس کے دماغ میں ایک بم سا پھٹا۔ چاند گرہن کے سفر کی ابتدا ہو چکی تھی۔ وہ چہرے پہ حسرت کا جنگل لئے ڈاکٹر کو تکنے لگا۔

مجبوری ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ڈاکٹر نے تاسف سے کہا۔ وہاں کے ماحول میں اسے شیشہ بھی کھردرا لگ رہا تھا۔ پتھر بھی۔

مگر ڈاکٹر صاحب۔ بغیر بازو کے میں بالکل ناکارہ اور بے کار ہوکر رہ جاؤں گا۔ کٹے ہوئے بازو سے نہ صرف میرا جسم بدنما دکھائی دے گا بلکہ بہت سا کام میں ایک بازو کے بغیر بحسن وخوبی انجام نہ دے سکوں گا۔ اس کی آنکھوں پر تاروں کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ آبلہ سانپ بنا پھنکاریں مار رہا تھا۔

اگر آپ کو اپنی جان عزیز ہے تو اس بازو سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ دیر نہ کیجئے۔ کل ہی میرے کلینک میں داخل ہو جائیے۔ میں یہ کام بڑی سرعت اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکوں گا۔ ڈاکٹر کا فیصلہ اٹل تھا۔

بے بسی اور مجبوری کی صورت میں بچے کو بھی اپنی مرضی سے ملنے کی اجازت نہیں۔ جب بھی میں اپنا ایک بازو بروئے کار لاؤں گا تو کٹے ہوئے بازو کے احساس سے میری انا کو ٹھیس پہنچے گی۔ عمل جراحت سے جب یہ بازو میرے جسم سے الگ کر دیا جائیگا تو میں کمتری اور

اور عروج کا شکار ہو جاؤں گا۔ اس کے لبوں پر تبسم کا ہر لہر اتا تھا
یہ احساس میرا ہر میری روح کو کچوکے دیتا رہتا ہے کہ میرا وہ میرا
بازو کہاں گیا۔ اگر پرندہ کا پنکھ اس کے گھونسلے میں تبدیل ہو جائے
تو اونچی اڑان کی حسرت اس کے دل میں رہ جاتی ہے۔ آپ برف
اپنے بازو کے لئے متفکر ہیں۔ ڈاکٹر نے بتایا آپ میرے کلینک
کی نمائش گاہ میں جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ جراحت کو ایک ایکیوریم
بنا رکھا ہے۔ مختلف لوگوں کا دماغ، دل ... کے بعد
مرتبان میں سجا ہوا ہے۔ یہ ایکیوریم ایک ... ہے کہ نہیں۔
اگر کبھی مجھے لیے اس ... آپ کے
ایکیوریم میں سجے ہوئے مرتبان میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تو
مجھ پر اس کا کیا ردعمل ہوگا۔ شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں۔
وہ حزن و ملال کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں لہریں
سی اٹھ رہی تھیں۔ اور دل ڈوبا جا رہا تھا۔

یہ میں نے آپ کی تشفی اور اطمینان کے لئے عرض کیا
تھا کہ عضو معطل کے لئے فکر مند نہ ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا۔
آپریشن کر کے آپ کا بازو کاٹ دینے کے علاوہ
کوئی صورت نہیں۔

آپ میرے معالج ہیں۔ آپ کے خیال میں بازو کاٹ
کر میری زندگی بچ سکتی ہے۔ تو پھر مری مرضی کو کوئی دخل
نہیں۔ وہ بڑے کرب سے بولا۔ میں کل آپ کے کلینک میں
حاضر ہو جاؤں گا۔ حقیقت کو تسلیم کرنے سے جینے کا کوئی پہلو
نکل آتا ہے۔ آپ کو خوش فہمی میں رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔
چنار کا درخت بڑھتا پھیلتا بہت ہے۔ لیکن پھل نہیں
دیتا۔ ڈاکٹر چارہ گر تھا اور وہ بے چارگی کا المیہ۔

جب وہ کلینک سے باہر نکلا۔ تو اس کے دماغ میں
خیالات کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بازو میں سوزش اور درد
کی تھی۔ آبلے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ بے چارگی اور
بے بسی میں بوجھل قدموں سے گھر کی طرف لوٹا۔

ڈاکٹر کے چیمبر سے نکلتے ہوئے اس نے اس کے لبوں
پر مکارانہ مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔
دراصل یہ ڈاکٹر بہت ہی چالاک مکار، مطلبی اور موقع
شناس تھا۔ اس نے ڈاکٹری کے معزز پیشے کو بدنام کر رکھا تھا
اچھے خاصے مریض کو نروس یا خوف زدہ کر کے اپنا الّو سیدھا
کرنا اس کے مفاد میں شامل تھا۔ مریض اسے منہ مانگی رقم دیتے
تھے۔ وہ مریضوں پر ایسا نفسیاتی اثر ڈالتا تھا۔ کہ وہ اس سے
مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ مسیحا سے اور کیا امید کی
جا سکتی ہے؟

رات بھر وہ بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔
خیالات اور حالات کے سمندر میں بہا جا رہا تھا۔ مجروح ہونے
کے خیال نے اس کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ بازو
کٹنے پر اس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اس کی حیثیت
عضو تناسل کی ہو جائے گی۔ رات ختم ہونے کو تھی اور آنکھوں
میں خواب نہیں۔ اس کی کس مپرسی میں قدرت بھی آنسو بہا رہی
تھی۔ بارش اور ہوا کے تند تیز جھونکوں سے کھڑکیوں کے پٹ
ہل رہے تھے۔ گرجتے ہوئے بادل اور چمکتی ہوئی بجلی سے
رات اور بھی بھیانک لگ رہی تھی۔ در و بام پر یاسیت چھائی
ہوئی تھی۔ اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا۔
صبح کسی بیوہ کی لٹی ہوئی مانگ کی طرح غم و اندوہ کا
پیغام لے آئی۔ مطلع ابر آلود تھا۔ بادل سمندر کی طرح آسمان
پر چھا گئے تھے۔ یہ کالی گھٹائیں دھوپ کو چاٹ گئی تھیں۔ وہ ما
کرب کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ جب وہ کلینک پہنچا۔
ڈاکٹر اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ وہاں اس کا منتظر تھا۔
ڈاکٹر نے آپریشن کے لئے جراحی کے ماہر ڈاکٹر کو بھی وہاں مدعو
کر رکھا تھا۔

اسے آپریشن کے کمرے میں لے جایا گیا۔ اچانک
اس کا دل الم آشنا ہو گیا۔ آپریشن سے پہلے اسے انجکشن دیا

گیا۔ اس پر غنودگی سی چھانے لگی۔ اس کے بازو کا آپریشن چشم زدن میں ہوا۔ اس کا ایک بازو کاٹ کر الگ کر دیا گیا جب آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے غنودگی کے بادل چھٹے اور عالم بیداری میں اس نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ تو اس پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھیانک خواب سے جاگا ہو۔ زندگی کے سانحہ اپنے بیکھ پھیلائے ہوا تھا۔ اسے خود اپنی شناخت نہیں ہو رہی تھی۔ درد کی ٹیس سے وہ بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اسے کٹے ہوئے بازو کا اتنا قلق ہوا کہ اس کی روح چیخ اٹھی۔

وہ لزماہ کلینک میں رہا۔ اس کا بازو رہا نہ آبلہ۔ جیسے سارے مرحلے کٹ گئے۔ جب وہ گھر لوٹا تو حسرت بھری نگاہوں سے کلینک کے گیٹ پر کھڑا اس عظیم عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کے مشرقی کمرے میں اس کا کٹا ہوا بازو پڑا ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کے احساس پر چھائی ہوئی اداسی کی دھند چھٹنے لگی۔ اس نے سینے پر صبر کی سِل رکھ لی بازو کٹوا کر اس نے قناعت کر لی۔ اور اپنا دوسرا بازو پر ہمت کے کار لا کر عملی میدان میں قدم رکھا۔ جیسے آسے زندگی کا عرفان مل گیا ہو۔ آہستہ آہستہ اسے ایک بازو سے کام کرنے کی عادت سی پڑ گئی۔ وہ عام آدمی کی طرح روزمرہ کی زندگی گزارنے لگا۔ کارزار حیات دائرے میں گھر ا چھلانگ رہا تھا۔

سب سے حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ جس مرض نے اس کا بازو کٹوایا تھا آپریشن کے دوران جراثیم سرعت کے جسم میں سرایت کر گئے تھے غیر متوقع طور پر اس کے جسم پر مختلف جگہ آبلے نمودار ہونے لگے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ اب اس موذی مرض سے وہ دوچار ہو رہا تھا۔ جس سے مریض نے اپنا بازو کٹوا کر چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔ ●●

سوھن راھی (لندن)

سماعتوں کے زخم خوردہ بول

سماعتوں کے زخم خوردہ بول
مجھ سے پوچھتے ہیں
کیا [illegible]؟
جو ہم نے [illegible] پر
ہم نے لکھا تھا

کیا ہوئیں؟
وہ منظروں کی آیتیں جو
ہم نے پڑھی تھیں
عہدِ ماضی کے سبزہ گاہوں کی
انجمن میں

کیا ہوئیں؟
وہ شمعِ نو جو
ہم نے روشن کی تھی
اپنا خون دے کر
بزمِ گیتی کے چاند تاروں کی روشنی سا
مسکراتا خون دے کر

کیا ہوا مفہوم؟
ان گیتوں کا، جو
ہم نے تھے گائے
آشنائے دار بن کر

کیا ہوا؟
وہ عہد نامہ
جو لکھا تھا
آنے والے جگ کی خاطر
ایک ایسے جگ کی خاطر
جس میں سب نسلیں ہماری
سکھ کی ٹھنڈی سانس لے کر
زندگی کرنے کے فن کو سیکھ سکیں

سماعتوں کے زخم خوردہ بول۔
مجھ سے پوچھتے ہیں۔

ضمیر قریشی

لہو لہو لفظوں کی بپتا.....

(نذرِ کلام حیدری)

لہو لہو لفظوں کی بپتا، لہو میں ڈوبا شخص لکھے
شہرِ طرب میں اک اکیلا، کھویا کھویا شخص لکھے

صدیوں سے پیاسا ہے صحرا آگ کا دریا بہتا ہے
قطرہ قطرہ شبنم ٹپکے، پیاسا پیاسا شخص لکھے

قلم، سیاہی اور کاغذ کا رشتہ ٹوٹ گیا جیسے
خونِ دل سے دیواروں پر وقت کا نوحا شخص لکھے

چہروں کے سیلاب رواں میں ڈھونڈ رہے اپنا چہرہ
میل ملاپ کی لمبی کہانی، خود سے بچھڑا شخص لکھے

ہر موسم منزل کی نگر میں یاد کی دھوپ بکھری ہے!
سر پہ خیالوں کی چادر ہے دھوپ میں جلتا شخص لکھے

دن کے زرد پہاڑ کے بعد بھی شب کا قصہ باقی ہے
آبلہ پا، درماندہ، شکستہ، درد کا قصہ شخص لکھے

گمنامی کی گرد میں ڈوبا خانہ گوشہ نشیں کوئی
موت سے پہلے اپنا کتبہ لکھنے والا شخص لکھے

ضمیر تمہارے ہاتھ لگا ہے گنجِ سخن اب شاد رہو
تم کو دنیا میر، و غالب کے گنجینے کا شخص لکھے!

سوچ کی سڑک.....

سوچ کی ویران سڑک پر ہم اکیلے چل رہے ہیں۔
اکادکا ہی کبھی صورت کوئی ہم جیسا مسافر
پاس سے گذرے تو لگتا ہے کہ جیسے ہم سفر ہو
شاہکار دستِ قدرت
جانے کب سے منزلوں کی جستجو کی داستاں ہے
گیان کے سورج کی کرنوں میں نہانے کے لئے ہر دم رواں ہے۔
روشنی کو ڈھونڈتا ہے
دشتِ ظلمت ہنس رہا ہے
اجڑے محلوں کی اداسی یاد کی دہلیز پر جم سی گئی ہے۔
ذہن کی آغوش سونی ہو گئی ہے
زندگی بے کیف لمحوں سے رہائی کی تمنا کے سرگرمِ سفر ہے
کتنی لمبی، سونی، اجڑی، دور تک پھیلی سڑک ہے
ہر مسافر خود کو تنہا پا رہا ہے
لمحوں کا جنازہ ٹوٹے کاندھوں پر اٹھائے چل رہے ہیں۔
کتنے اندیشے دلوں میں پل رہے ہیں۔
کون کب بے چہرہ، بے سر، بے صدا ہونے لگے
شیشہ پتھر کے نگر میں کب تلک محفوظ ہوگا
روز و شب کے مرحلوں میں دائرہ در دائرہ تقسیم ہونا ہی پڑے گا
خود کو کھونا ہی پڑے گا۔
سوچ کا یہ زہر آخر ہم کو نیلا کر نہ جائے
ہم میں جینے کی تمنا چلتے چلتے مر نہ جائے
سوچ کی لمبی سڑک پر چلتے چلتے تھک گئے ہیں۔
رات کی تاریکیوں سے صبح کی وادی میں کب سورج اُگے گا؟
جانے کب شب کا مسافر سوچ کی ویران سڑک سے دور ہوگا؟
نیند کی آغوش میں محصور ہوگا؟
سوچ کی لمبی سڑک کا سلسلہ کب ختم ہوگا؟

فضا ابن فیضی

خفا تھے لفظ، جو کہنا تھا کہہ گیا پھر بھی
بہت سلیس رہا طرزِ ماجرا پھر بھی

لہو کا خوف تھا خوشبو بنا لیا خود کو
سمٹ کے پھول بنے، ٹوٹنا پڑا پھر بھی

سنبھل سنبھل کے بہت زندگی گزاری تھی
ہمارے سر پہ گرا سنگِ حادثہ پھر بھی

ترا سلوک نہیں حادثوں کی دھوپ سے کم
میں کوئی برف نہیں تھا پگھل گیا پھر بھی

ہمارا حصہ نہ قطرے نہ سیپیاں نہ گہر
پڑا ہے ہم کو سمندر کھنگالنا پھر بھی

جو بے قصور رہا فردِ جرم اسی پہ لگی
زبانِ عدل ہے قاتل کا فیصلہ پھر بھی

وصالِ روح و بدن کو گزر گئیں صدیاں
وہی ہے بیچ میں سانسوں کا فاصلہ پھر بھی

جہاں سے اہلِ نظر پا بریدہ لوٹے تھے
مرا شعور اسی راہ پر چلا پھر بھی!

جبیں کی گرد بنی، اعتمادِ فن کی کرن
یہ آئینہ نہ مکدّر ہوا فضاؔ پھر بھی

ظہیر غازی پوری

خواب سفر ساماں کہاں تھا!
سبزہ تھا، میداں کہاں تھا

امنگوں بھری سرزنش اور تھی
جواں سال غم کی خلش اور تھی

پھول کے پتی توڑ کے رکھ لی!
تتلی کا امکان کہاں تھا

اشارہ لرزدہ رہ ارتقا
شب و روز کی چپقلش اور تھی

شاخوں شاخوں جھولتا اڑتا!
ممکن تھا، آسان کہاں تھا

سفر۔ لامکانی پہ آمادگی!
مگر خواب منظر روش اور تھی

میرے اندر، میرے جیسا!
اور کوئی انسان کہاں تھا

رہی برف آلود عمر رواں
مگر دل میں جولاں تپش اور تھی

پتوں پر شبنم کو چھوتا!
ارماں تھا، امکاں کہاں تھا

غم سوز پنہاں تھا جب دل رہا
تو کچھ موج خوں مرتعش اور تھی

رخت سفر کیا باندھ کے چلتا
حد سفر کا گیان کہاں تھا

ادھر حد امکاں ادھر صحن جاں
ہماری تمہاری روش اور تھی

کیا لے آتا، کیا لے جاتا
ساتھ میرے ساماں کہاں تھا

پرندہ کوئی مجھ میں اڑتا رہا
ظہیر اپنے گھر کی کشش اور تھی

شرون کمار ورما

ہر کوئی اپنا تھا لیکن کوئی بھی اپنا نہ تھا
زندگی نے اس طرح رشتہ کبھی لوٹا نہ تھا

مطمئن تھے زندگی سے جب کوئی خواہش نہ تھی
صاف تھا ہر عکس جب تک آئینہ دھندلا نہ تھا

مجھے یہ معلوم تھا مل کر پگھل جائے گا وہ
پھر ندی بن کر بہا لے جائے گا سوچا نہ تھا

خواہشوں کی بھیڑ سے نکلا تو یہ مشکل ہوئی
پاس تھا میرے سبھی کچھ ایک مل جہرا نہ تھا

کس طرح ڈوبا ہیں اس میں اور کیوں ابھرا نہیں
میں کوئی پتھر نہیں تھا وہ کوئی دریا نہ تھا

کس طرح ملتے کہ ہم تھے اپنی اپنی قید میں۔
وہ حیا اور میں ہوس کے جال سے نکلا نہ تھا

تھی ہمارے درمیاں ٹوٹے ہوئے رشتوں کی دھول
یہ نہیں ڈر تھا کہ ہم نے مڑ کے پھر دیکھا نہ تھا

اسعد بدایونی

راستوں کو حیرتوں سے بہرہ ور کرتا ہوا
میں چلا ہوں دوریاں سب مختصر کرتا ہوا

ہجر توں کے عکس آنکھوں میں کچھ ایسے بس گئے
مجھکو ہر منظر نظر آئے سفر کرتا ہوا!

قریۂ جاں سے ہوا صورت جو گزرا کون تھا
اپنے ہونے سے ہمیں بھی باخبر کرتا ہوا

دل درختوں سے گزرتا ہے عجب تیور لئے
ایک جھونکا پرسشِ برگ و ثمر کرتا ہوا

یاد رکھتے ہیں مجھے مکانوں کی تمام
میں اکیلا مدحتِ دیوار و در کرتا ہوا

حمید یورش
(پاکستان)

کس کس سے کیا امیدیں وابستہ تھیں
لیکن یہ ساری دیواریں خستہ تھیں
چوراہا تھا: میں اور میرا استفہام
اور جوابات سمتیں لب بستہ تھیں
ساحل پاس سنگِ معصوم تھیں جو لہریں
وہ بھی اک طوفان کا ہراول دستہ تھیں
گھر کا استحکام ہی تھا متحیر کن
برساتیں تو اب کے بھی برجستہ تھیں
یورش اپنا پرچم جب بھی خم نہ ہوا
دونوں باہیں تک بھی تب شکستہ تھیں

اور ہی لوگ تھے راہ کی تھکن سے جو گھبرائے
ہم دردلیشاں مقتلوں کے ورنہ لوٹ کے نہ آئے
ہم ہچکولوں درمیاں، لب بہ مقابل ناؤ
کون سی یاد کے آسرے رکھے قدم جمائے
ہم تجسیمِ تلاش ہیں، منتظر عکسِ سراب
رشتے، ربط، رفاقتیں، ہم تم، یہ سب سائے
کون سفر، کیا منزلیں، کیا رُخِ رفتار
ہم تو میل نشان کے پتھر ہیں اٹھائے
ظلمت راتوں رات جو بنتی رہی غبار
دھند تھی وہ تو بحر کی، دھوپ چڑھے اڑ جائے
وقت کی اندھی مصلحت گونگی ترغیبات
یورش سوچ کے شہر میں خوب ملے ہمسائے

بشیر سیفی
(پاکستان)

ملی ہے اب جو گہرائی نظر کی
کمائی ہے یہ میری عمر بھر کی

خلاف اپنے ہیں میری اپنی سوچیں
کہوں کس سے کہ یہ باتیں ہیں گھر کی

بھلا مجھ سا کوئی خود سر کہاں ہے
گدائی بھی جو کی تو اپنے در کی

مجھے کب اختیارِ خیر و شر تھا
مگر مجھ کو خبر تھی خیر و شر کی

طلوعِ شب کا منظر دیدنی تھا
میری نظروں سے پھوٹی ضو قمر کی

ارادہ تو نہ تھا جانے کا سیفی
مگر نکلی عجب صورت سفر کی!

احمد سعدی

بنگلہ دیش

شہرِ وفا میں تیز ہوا جب خستہ جاں کو مار چلی
طرزِ جفا کی رسم چلی، تو کوچہ تا بازار چلی

جوشِ جنوں میں ہوش و خرد سے ہم ایسے بیگانے تھے
وقتِ سفر سے منزل تک قدموں میں لڑکھڑا کر چلی

سورج جب بھی سر پر آیا، دھرتی جب بھی آگ بنی
سایہ بن کر ساتھ ہمارے چاہت کی دیوار چلی

راہِ طلب میں دل والوں پر کیا کیا نہ افتاد پڑی
کچھ لہرائی تیغِ ستم کی، کچھ غم کی تلوار چلی!

ایک تماشہ ہاتھ آیا ساحل پر رہنے والوں کو
اپنے محور پر کشتی کو لے کر جب منجدھار چلی!

فصلِ بہاراں کی آمد پر گلشن گلشن دھوم مچی
پھول کھلے تو صحرا صحرا پھولوں کی مہکار چلی

راہِ وفا میں مر مٹنے کی جب بھی ضرورت پیش آئی
دار سے لے کر مقتل تک دیوانوں کی یلغار چلی

ذکر ہمارا جب بھی چھڑا تو صدیوں اس کی گونج رہی
بات ہماری چل نکلی تو کتنے ہی ادوار چلی

بیٹھ رہے جب گھر میں چھپ کر سب جانے پہچانے لوگ
پیچ کسی کی رستے رستے ان کے نام پکار چلی

ہم نے وہ منظر بھی سعدی دیکھا ہے غم خانے میں
روزنِ در کی ایک کرن سے غم کی سیاہی ہار چلی

جب ہوئیں عام محبت میں ریا کی باتیں
دل پہ اک بوجھ بنیں رسمِ وفا کی باتیں

رُت جو بدلی تو زمانہ بھی کچھ ایسا بدلا
اب نہ گلزار، نہ خوشبو، نہ صبا کی باتیں

دستِ انصاف ہے پابندِ جفائے پیہم
صورتِ سنگِ گراں لطف و عطا کی باتیں!

روشنی دن کی ہے محبوس ردائے شب میں
وقت کے شور میں گم نور و ضیا کی باتیں

مشغلہ کچھ تو رہے فصلِ بہار آنے تک
نوکِ خنجر سے کریں رنگِ حنا کی باتیں!

شہرِ آشوب میں ہم ہی ہدفِ سنگ بنے
وقف ہم پر ہی ہوئیں کرب و بلا کی باتیں

پیرہن جسم کا بیگانۂ اطوارِ جہاں
تن کی عریانی کرے شرم و حیا کی باتیں

دوستی جب نہ رہی پیکرِ اخلاص و وفا
دوستو آؤ کریں مکر و دغا کی باتیں

ہم نہ پتھر کے صنم پوجیں تو چارہ کیا ہے
اب عبث کفر کی دنیا میں خدا کی باتیں!

ذات میں گم ہیں سبھی شہرِ عمل میں سعدی
محفلوں میں ہیں مگر جود و سخا کی باتیں

ناصر بغدادی (نائجیریا)

لوٹ آیا ہے وہ پھر لوٹ کے جانے والا
پھر قسم کھائی ہے، قسموں کو بھلانے والا

میں کہ جلتے ہوئے مندر کا ہوں تنہا دیوتا
تو پجاری ہے مگر آگ لگانے والا!

حادثہ یہ بھی اہم ہے اسے تاریخ میں لکھو
بن گیا دوست جو تھا آنکھ چرانے والا

خود بھی سوتا ہے کبھی سب کو سلا دیتا ہے
وہ جو رہبر تھا کبھی سب کو جگانے والا

لوگ آتے ہیں۔ چلے جاتے ہیں
ساتھ دیتا ہے کہاں کوئی زمانے والا

ہر نئے موڑ پہ اک دوست جدا ہوتا ہے
وقت ظالم ہے سدا دل کو دکھانے والا

خضر راہ راہ میں لٹ جاتے ہیں
راہ زن آج ہے کیوں راہ دکھانے والا

دل کو اب سنگ سار کر لوں گا
پتھروں سے میں پیار کر لوں گا

نفس کو زیر بار کر لوں گا!
آپ کا انتظار کر لوں گا!

دل بہلنے کا کوئی چارہ ہو
ترے وعدے شمار کر لوں گا

خواہشوں کی فصیل پہ چڑھ کر
خود کو اب شرمسار کر لوں گا

دوستوں سے نباہ کی میں نے
دشمنوں کو بھی یار کر لوں گا

زندگی کو بنا کے اک دلہن
زندگی سے میں پیار کر لوں گا

ایک

گیا

خورشید سحر

نہ کوئی نقش ہی باقی نہ کچھ نشاں دل کا
تمام ہوگیا قصہ بھی ناتواں دل کا

نفس نفس یہ ابھرتا ہوا دھواں دل کا
سمیٹ لے گا ہر اک نقش جاوداں دل کا

رہ طلب میں کئی نقش پا منور ہیں
بھٹک نہ جائے کہیں یہ کارواں دل کا

کسی سے وقت کی دیوار گر نہیں سکتی
اسے غرور تو مجھ کو بھی ہے گماں دل کا

وہ ایک نام جو روشن تھا اب بھی روشن ہے
خدا کا شکر کہ محفوظ ہے مکاں دل کا

گنوا نہ دینی تھی رنجش میں یوں متاع عزیز
بچا کے رکھنا تھا ہر نقش رائیگاں دل کا

عجیب دھند سی بکھری ہے جسم و جاں پہ سحرؔ
فصیل درد سے اونچا ہوا دھواں دل کا

اکرام الحق اورنگ

(بنگلہ دیش)

مہر گستر نہ سہی درپئے آزار تو تھا
کچھ نہ کچھ اس سے تعلق مرا ہموار تو تھا

یوں کسی طور نہ تھا چاند کا ہمسر جگنو
ظلمت شب سے مگر برسر پیکار تو تھا

جسم کا جاں سے گزرنا بڑا دشوار سہی
وہ انا دار وفا پھر بھی سر دار تو تھا

یوں مجھے دیکھ کے منہ پھیر لیا اس نے مگر
وہ بھی میری ہی طرح کرب سے دوچار تو تھا

یہ الگ بات کہ ہو زخم جگر کی صورت
میری تحویل میں اس کا کوئی شہکار تو تھا

یوں تری بزم میں وہ مہر بلب تھا لیکن
اپنے پیکر میں سراپا لب اظہار تو تھا

آپ کا وعدۂ فردا نہ وفا ہو لیکن
لمحہ لمحہ مرے احساس کا بیدار تو تھا

مثل گل، رنگ مگر اس کا پسندیدہ تو نہیں
مجھ کو تسلیم کہ اورنگ وہ اک خار تو تھا

ماہنامہ آہنگ میں شائع شدہ تخلیقات کا گوشوارہ

مرتبہ: ڈاکٹر محمد مثنیٰ

سال ۱۹۷۲ء

شمارہ	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
۲۶/۲۵	ادب میں بے معنویت کا تصور	ڈاکٹر محمد مثنیٰ	ادب میں بے معنویت کے مفہوم کا تجزیہ۔
	روسی ادب پر اسٹرن کے نقوش	میخائل نندور۔ نظر یوسفی	اسٹرن کا اثر روسی ادب پر
	آخری صنم	پرکاش فکری	مشینی زندگی کے انسان دشمن اثرات
۲۸/۲۷	آڈن اور اس کی شاعری۔ —ایک تعارف	ڈاکٹر محمد مثنیٰ	آڈن کی شاعری پر ایک مختصر مطالعہ
	شعور کی رو کیا ہے ؟	محمد وسیم	شعور کی رو کا تعارف
۲۹	بالزیک، پوئل اور اس کا فن	وہاب اشرفی	پوئل کے فکشن کی اہمیت
	"اعترافات" کے آئینہ خانہ میں آوارہ مسیحا — روسو	نظام صدیقی	روسو کی خودنوشت کا تنقیدی مطالعہ
	نیا ادب اور ذات کی تلاش	قمر اعظم ہاشمی	جدید ادب میں ذات کی تلاش کے رجحان پر ایک نظر
۳۱/۳۰	کبھی ایک چیخ تھا اب خامشی ہوں	زاہدہ زیدی	ارتیب کی شاعری کا مطالعہ
	آزادی کے بعد اردو تنقید کے اہم میلانات۔	قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی	جدید اردو تنقید پر ایک نظر۔

گہا

شمارہ	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
۳۱/۱	نثر۔ ایک تخلیقی عمل	عبدالخالق	صنف نثر کا فنی تجزیہ
۳۳/۳	عصری افکار	ڈاکٹر حسین مجید	عصر حاضر کے اہم مدرسہ ہائے فکر کے متعلق کچھ اشارے
	اردو میں فارسی، عربی کے فقرات کا استعمال	نام حلالی	فارسی عربی کا اثر اردو زبان پر۔
	فارسی نثر کے جدید رجحانات	محمد لوحید عالم	جدید فارسی نثر کے رجحانات کے تجزیہ۔
۳۴	تنبولا	بلراج مین را۔	جدیدیت کی علامت کا تجزیہ۔
	جدید ادب کا پس منظر	نظام صدیقی	جدید ادب کے تحریکات کے بارے میں چند خیالات
۳۶/۳۵	فرد اور ماحول	علی امام	فرد اور ماحول کی باہمی کشاکش کی تجزیہ
	وحشت کا تنقیدی شعور	عبدالرؤف	وحشت کی شاعری میں ان کے شعور کی کارفرمائی کی اہمیت
	غالب کی شاعری میں پیکر تراشی۔	طلعت جہاں فیروز	غالب کے یہاں پیکر تراشی کی ندرت اور اچھوتے پن کا مطالعہ

کہانی

شمارہ	کہانی	مصنف	شمارہ	کہانی	مصنف
۲۶/۲۵	بند مٹھی کا نوحہ	حسین الحق	۲۸/۲۷	سیڑھیاں	انور قمر
	اندھی دشاؤں کے سلسلے	"		تناؤ	سعادت شمیم
	کھلے ہونٹوں کی چاپ	"		کس کی کہانی	کلام حیدری
	میری تمہاری کہانی	"			
	بلبلہ	"	۲۹	ایک سے آگے	احمد یوسف
	شکستیدہ	"		جزیرہ آگ کا	جاوید نہال

شمارہ	کہانی	مصنف
۲۹	چیونٹیاں اور ٹیڑھے میڑھے راستے	نسیم اختر
	اپنا گھر، اپنا دکھ	صبوحی طارق
۳۱/۳۰	پاؤں کاٹی	قمر التوحید
	ترسے ہوئے آئینے	علی حیدر ملک
	کثافت	علی امام
	اکیلے آدمی کا احساس	حمید سہروردی
	روشنی بھاگتی رہی	شعیب شکیل
	قوسین کے درمیان	لطف الرحمن
۳۳/۳۲	افسانہ بنے	احمد یوسف
	نازک ہے بہت	شرون کمار ورما
	بے چہرہ عورت	علی حماد عباسی
	ملاقات	ڈاکٹر دریش
	مائی	انیس رفیع
۳۴	ایک رُت اور	جوگندر پال
	چہرہ ایک مسئلہ کا	ہریش بوکل / ڈاکٹر محمد محسن
	بارہ رنگوں والا کمرہ	عبد الصمد
	اپنی صلیب	"
	اوس اور کرنیں	"
	نہیں	"
۳۶/۳۵	امتحان	انور عظیم
۳۶/۳۵	گوریلا فائٹ	شمس ندیم
	اندھا سفر	علی حیدر ملک
	سبھی شام کی راکھ	انور خان

نظم

شمارہ	نظم	مصنف
۲۶/۲۵	تشکیک	عتیق اللہ
	پیش گوئی	"
	ماتم ایک شہر	"
	آخری الزام	علیم اللہ حالی
	آخری بوند کی فصل	وہاب دانش
	خارش زدہ کھال کے سکے	"
	ہشت ہشت	لطیف حسن
۲۸/۲۷	ہند کا یہ سفر روحانی	والد ہیں عبد الرؤف
	پہلا پتھر	مصطفیٰ زیدی
	سفر طویل ہے	نامی زیدی
	پتھر	رؤف نعیم
	ناریل کے درختوں سے	"
	عذاب	"
	انحلال	حمید سہروردی
	طلسم	
	پہچان	اکرام باگ

شمارہ	نظم	مصنف	شمارہ	نظم	مصنف
۲۹	باقیات	ایذرا پاؤنڈ مترجم ظہیر صدیقی	۳۱/۳۰	خیال	ڈاکٹر محمد حسن
	ایک ساحرہ	"		درد	"
	ایک دوشیزہ وش ایک	"		راحت	"
	دوست سے جدا ہوتے ہوئے	"		شکنجے	"
	تاریخ	عزیز قیسی		چنگاری	"
	تین نظمیں	صادق		اجنبی آسمان	"
		شاہد احمد شعیب		ابتدائے آخری	وہاب دانش
	جسم کی قید	"		سفید آواز فاحشہ	"
	نیلے پھولوں کا مشورہ			گیان کا کرب	خلیل تنویر
	یہ سرکار	ظفر حمیدی		جب آنکھ کھلی	"
	بصیرت	"		ماضی ایک عذاب	"
	انکشاف	"		پانچ بے عنوان نظمیں	نصر قریشی
	شناخت کا المیہ	"		لوگ	یوتوشنکو / وحید الحسن
	انوکھی آرزو	"		وحشیوں کا انتظار	کیوافی / عین رشید
	میں کب اس وادی کی باسی تھی	زاہدہ زیدی	۳۳/۳۲	کمار شو کے نئے گیت	کمار شو / عقیل شاداب
	اندھی کھڑکیاں	احمد اعجاز		ابوالعصام کی یاد میں	سلام مچھلی شہری
	اپریل کی عرضداشت نہیں ہے	.		گیت	صادق
	نفرت	محمود واجد		پہروں کو سخت کرو	صبا اکرام
				سنگ آستاں	کرشن موہن
۳۶/۳۰	میرا دل	سالک لکھنوی		نہیں مسلسل خزاں	اکرام باگ
	سوالیہ نشان	عبدالرؤف		کہا تھوں اسے لاؤ	"
	تہذیب	ڈاکٹر محمد حسن		مسیح کل	شہاب عراقی
	مجبوری	"		تریاک	"
	کوئی دوسرا	"		دو نظمیں	سید احمد شمیم

شمارہ	نظم	مصنف
۳۴	سیاہ جھاڑیاں اب بھی منتظر ہیں ۔	زاہدہ زیدی
	دو نظمیں صادق کیلئے	عتیق اللہ
	آخری منظوم کے بعد	اسلم عمادی
	گمنام شہری	آڈن / عین رشید
	ایک بات	یوتوشنکو / وحید الحسن
	جنم دن	" / "
	جھوٹ	" / "
	رنگا رنگ	" / "
	آؤٹ سائڈر	یوسف اعظمی
	بیسویں صدی	"
	آرزوؤں کی شہریت	یوسف جمال
	مقتل	صفدر
	سائے کا قد	عتیق الوزر
۳۵/۳۶	وہ زندہ ہے	سلام مچھلی شہری
	تم خوش رہو	حرمت الاکرام
	آٹھ رباعیاں	مظفر حنفی
	سہ سطری نظمیں	سلطان اختر
	نشاط مجبور	حق اعظمی
	شام	عین رشید
	رات جو بیسویں دسمبر	"

غزل

شمارہ	غزل	مصنف
۲۵/۲۶	غزل	مغنی تبسم
	"	مصور سبزواری
	"	آزاد گلاٹی
	"	نازش انصاری
	"	سلطان اختر
	"	لطف الرحمٰن
	"	ندیم گویائی
	"	شمیم احمد شمیم
	"	علی اسعد
	"	سعید قدرت
۲۷/۲۸	"	ثاقب عظیم آبادی
	"	مظہر امام
	"	سلطان اختر
	"	مدحت الاختر
	"	صفدر
	"	چندر پرکاش شاد
	"	احمد تبسم
	"	شاہ حسین
	"	نسیم جمیں
	"	اقبال اشہر
	"	مظفر النساء ناز

ت … گیا

ارہ	غزل	مصنف	شمارہ	غزل	مصنف
۲۹	غزل	علقمہ شبلی	۳۱/۳۰	غزل	شاہین بدر
	"	ابرار اعظمی		"	خلیل رمزی
	"	شاد لوحی			
	"	عبدالرحیم نشتر	۳۳/۳۲	"	شمیم فاروقی
	"	غلام مرتضیٰ راہی		"	عبدالرحیم نشتر
	"	شاہد کبیر		"	ابرار اعظمی
	"	عشرت ظفر		"	فاروق شفق
	"	تفضیل احمد		"	حسن لشیر
	"	جعفر عسکری		"	راہی قریشی
	"	منظور ہاشمی		"	پرویز رحمانی
	"	شمیم گوہر		"	سیف سہسرامی
	"	سعید کاشف		"	ساجد اثر
	"	دلکش اعظمی		"	فاروق راہب
				"	حسن رضا
۳۱/۳	"	شاہین		"	احترام اسلام اشک
	"	زیب غوری		"	قوس صدیقی
	"	حق اعظمی			
	"	مضطر حیدری	۳۴		نازش انصاری
	"	حبیب ہاشمی		"	غلام مرتضیٰ راہی
	"	ثروت کمار ورما		"	عشرت ظفر
	"	شہاب عراقی		"	میر تقی علی خاں ثاقب
	"	پدم کمار نظر		"	علقمہ شبلی
	"	کوثر چوہان		"	طلحہ رضوی برق
	"	کرشن کمار طور		"	نصر قریشی
	"	مان سنگھ خیال		"	احتشام اختر

شمارہ	غزل	مصنف
۳۴	غزل	عقیل شاداب
	"	نسیم اشفاق
	"	شاہ حسین
	"	منظور ہاشمی
	"	محسن جلگانوی
	"	شہزاد اختر
	"	دور آفریدی
	"	
۳۶/۳۵	"	سلطان اختر
	"	فضا ابن فیضی
	"	آزاد گلاٹی
	"	لطف الرحمٰن
	"	انیس الرحمٰن
	"	عشرت علوی
	"	عین تابش

تبصرے

شمارہ			
۲۶/۲۵	ارتکاز	عبدالرحیم نشتر	علی حیدر ملک
۲۸/۲۷	جوئے کہکشاں	امجد نجمی	محمود واجد
۲۹	حروف	بدیع الزماں خاور	محمود واجد
۳۱/۳۰	آواز کا جسم	مخمور سعیدی	محمود واجد

متفرقات

۲۸/۲۷	شہ مات	زاہد زیدی / سجول میکٹ (ڈراما)
۳۶/۳۵	رپورتاژ	احمد یوسف
	کیپٹن کا میز	احمد یوسف (ڈراما)

کلام حیدری

کے مختصر افسانوں کا

چوتھا نیا مجموعہ

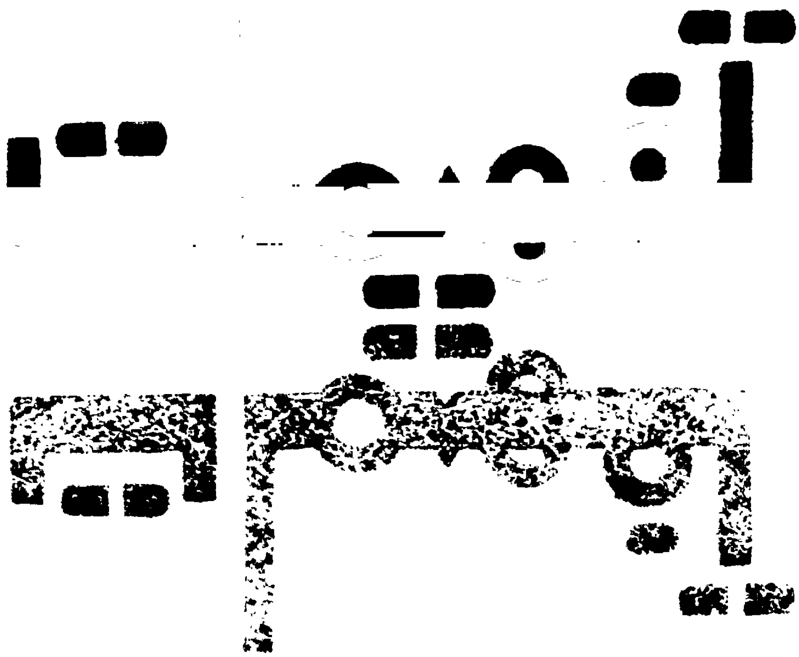
لہو رو کے لکھا

زیر طبع

دی کلچرل اکیڈمی گیا

N Regd 4253/64
T. Regd No. Gy. 7
hone---432

THE **AAHANG** Urdu Monthly
BAIRAGI. GAYA.



تنقیدی مضامین

کلام حیدری

PRICE Rs. 20/-

The Cultural Academy, Gaya.



Sept 1983

PRICE
Rs. 3/-

دی کلچرل اکیڈمی جگجیون روڈ گیا

قائم سنہ ۱۹۶۲ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

سالانہ خریداری — اڑتالیس روپئے

ایک شمارہ — تین روپئے

فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشابہ حق، عبدالصمد

محتویات

اداریہ

کشکول

گرچہ ستمبر کا شمارہ ستمبر میں ہی شائع ہو رہا ہے اور یہ خدا کا احسان ہے، مگر دیر سے شائع ہو رہا ہے۔ چیف ایڈیٹر کلام حیدری ۲۷ اگست سے ۱۰ ستمبر تک مسلسل تیز بخار میں مبتلا رہے، اس کا اثر ان کی صحت پر یوں پڑا کہ وہ بخار سے نجات پانے کے بعد پانچ چھ دنوں کے بعد ہی کچھ کام کر سکیں۔ بہر حال اب وہ بالکل اچھے ہیں اور نئے ولولوں اور حوصلوں کے ساتھ دی کلچرل اکیڈمی کے کاموں میں مشغول ہیں۔

آہنگ کو زندہ رکھنا فن کاروں کا کام ہے۔ ہم نے کبھی آہنگ کے لئے مالی مدد نہیں مانگی، کشکول لے کر گداگری بھی کر رہے ہیں تو اچھی تخلیقات کے لئے اچھے نوجوان، پختہ مشق فن کاروں کے یہاں کے ہی سوالی ہیں۔

ہم قارئین کرام کو ایک خوش خبری دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے کنبے میں ایک اچھا اضافہ ہو رہا ہے۔ پٹنہ سے مریخ نام کا ادبی ماہنامہ شائع ہو رہا ہے، ہم اسے خوش آمدید کہتے ہیں۔ صدق دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اُردو کے لئے جو بھی کچھ کرے اُس کی توقیر کریں۔ دوستانہ مقابلہ کریں کہ اس سے ادب اور زبان کا فروغ ہوگا۔ مگر حسد ہرگز نہ کریں کہ اس کے لئے ہماری شریعت میں سخت ممانعت ہے۔

ہم شاید آئندہ شمارے میں کسی خاص نمبر کا اعلان کریں جیسے جنوری یا فروری تک شائع کر دینے کا ارادہ ہے

موضوعات ہمارے بورڈ کے سامنے غور و خوض
کے لئے پیش کئے جارہے ہیں۔ کسی موضوع کا
انتخاب ہو جائے گا جبھی ہم نمبر کا
اعلان کر سکیں گے۔
ہمیں یقین ہے موضوع نیا ہوگا، یا
کم از کم کام نئی نوعیت کا ہوگا۔
دُعا کیجئے کہ ہم **خاص نمبر** شائع کرنے کا
فیصلہ حتمی طور پر بورڈ میں کر سکیں۔

اور پھر اُردو کے تمام فن کاروں سے ہماری اِستدعا ہوگی کہ وہ
آہنگ کے اس خاص نمبر کو پچھلے خاص نمبروں کی طرح پوری محبت
کے ساتھ بنانے، سجانے اور نکھارنے میں شریک ہوں۔

پروفیسر محمد بدرالدین

اردو زبان — میدان لسانیات میں تشنہ کام

یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ اردو اور ہندی جدید ہند آریائی خاندان کی دو اہم زبانیں ہیں۔ ہندی ہندوستان کی قومی اور سرکاری زبان ہے۔ اردو اور ہندی کے درمیان ماں اور بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہن بہن کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہونے والی جڑواں بہنیں ہیں۔ ہندی نے قواعدی نقطۂ نظر سے سنسکرت کے تدسم اور اردو نے تدبھو روپ کو اختیار کیا۔ جہاں تک دونوں زبانوں کے صوتی ماحول کا تعلق ہے تو دونوں میں بعض اصوات سے قطع نظر بہت زیادہ فرق نہیں ملتا۔ رسم تحریر کے معاملے میں ہندی نے دیوناگری رسم تحریر کو اپنے صوتی نظام و ماحول کا قائم مقام بنایا۔ اور زبان اردو نے ایرانی یا فارسی رسم تحریر کو۔ اس طرح دونوں کے درمیان پوشاک کا فرق ہے جسم کا نہیں۔ دونوں نے ایک ہی بطن مادر یعنی کھڑی بولی سے اور ایک ہی سرزمین میں جنم لیا۔ لیکن تاسف کا مقام ہے کہ بعض وجوہ سے ہندوستان میں ایک بہن کو تخت ملا۔ اور دوسری بہن کو سنیاس۔ اور فقر و درویشی۔ اور اس نابرابری کے لئے حکومت و عوام دونوں ذمہ دار ہیں۔

یہ بات بھی حقیقت سے بعید نہیں کہ زبان اردو کی ۷۵ فیصد آوازیں ہندوستانی ہیں۔ اور بقیہ ۲۵ فیصد آوازیں عربی، فارسی، ترکی، پرتگالی اور انگریزی آوازوں پر مشتمل ہیں۔ عربی اور فارسی اصوات بہ نسبت مذکورہ زبانوں کی آوازوں کے زیادہ ہیں۔ فارسی تراکیب الفاظ اور چند عربی اسماء و ضمائر کے مستعملات کی وجہ سے اردو میں شان و شکوہ اور جاہ و جلال کا مادہ نمو پذیر ہوا۔ اور حسن و دلکشی و جاذبیت کے عناصر بھی موجزن ہوئے۔ اگر ان عربی و فارسی کے دخیل الفاظ کا استخراج اس زبان سے کر دیا جائے تو پھر اس میں مذکورہ خصوصیات کی بجائے فسردگی اور خشکی اور حجابیت کے عناصر نمایاں ہو جائیں گے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح انگریزی زبان سے لاطینی گریک اور جرمانی الفاظ کو اور ہندی اور بنگلہ سے سنسکرت الفاظ کو خس و خاشاک کی مانند متروکات کے "ڈسٹ بن" میں ڈال دیا جائے تو ان زبانوں کی رونق، دلفریبی مفقود ہو جائیگی۔ اس لئے کہ زبانیں ایک دوسرے سے اثر و رسوخ قبول کرتی رہتی ہیں۔ اور اپنی زندگی کے ارتقائی منازل کے تقاضوں کو پورا کرتی رہتی ہیں۔ نو وارد دخیل الفاظ اپنے مخصوص صوتی و تشکیلی خصوصیات کے ساتھ کسی دوسری زبان میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اسی زبان کے اجزائے ترکیبی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جنہیں اس سے نکالنا، پھینکنا یا ترک کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔

ام معلوم ہونے لگتا ہے۔ دنیا کی زبانیں ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔

میرا منشائے گفتگو قطعی یہ نہیں کہ دنیا کے خاندانی السنہ کی تمام مروجہ زبانوں کا جائزہ لوں۔ بلکہ یہ ہے کہ زبان اردو کی کم مائیگی و تشنہ لبی لسانیات کے میدان میں کس حد تک ہے کے ضمن میں اظہار خیال کروں گا۔ اس ضمن میں محض انگریزی، ہندی اور بنگلہ زبانوں کے مقابلہ میں اردو زبان کا جائزہ لسانیات کی ترقی و ترویج کے پیش نظر لوں گا۔ محض اس لئے کہ انگریزی ایک بین الاقوامی سطح پر رابطے کی زبان ہے۔ اور ہندی ہندستان کی سرکاری اور بنگلہ بنگلہ دیش کی سرکاری اور مغربی بنگال کی دوسری دفتری زبان ہے۔ ہندی اور بنگلہ دونوں زبانوں نے کم و بیش انگریزی زبان کی ترویج و لتیا کیلئے کی گئی لسانی کوششوں سے اثر و رسوخ اور اتباع و تقلید کو قبول کر کے اپنے صوتی و تشکیلی دامن کو مالا مال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آج ان دونوں زبانوں میں لسانیات کے موضوع پر کافی مواد اکٹھا ہو گئے ہیں۔ لسانیات کے معاملہ میں اردو کو انگریزی کے مقابلہ میں لانا گویا سورج کو دیا دکھلانا ہوگا۔ اس لئے کہ اس زبان میں سینکڑوں کتابیں لسانیات کی مختلف شاخوں اور قسموں پر جداگانہ انداز میں تحریر کی جا چکی ہیں اور کی جا رہی ہیں۔ اور دنیا کی زبانوں کو سائنسی اور تجزیاتی انداز میں جانچنے اور پرکھنے کے علم کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔ جہاں تک ہندی اور بنگلہ کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان ہندی میں لسانیات کے میدان میں کی گئی کوششوں پر خاطر خواہ اقدام تحریری صورت میں کئے جا چکے ہیں۔ اور کئے جا رہے ہیں۔ اور یہی حال بنگلہ کا بھی ہے۔ اردو زبان بھی ایسی کوششوں سے یکسر خالی نہیں۔ لیکن اس زبان میں لسانیات کے موضوع پر کی گئی کاوشوں کی اہمیت ثانوی ہے۔

اردو کے ارباب لسانیات کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ جو کچھ بھی اردو زبان میں لسانیات کے موضوع پر کام ہوئے یا ہو رہے ہیں وہ لسانیات کے اصولی و نظریاتی پہلوؤں کو ہی روشن کرتے ہیں۔ عملی و تجزیاتی پہلو کو نہیں۔ اس لئے کہ لسانیات کو دور حاضر میں اس قدر مقبولیت حاصل ہو چکی ہے کہ اس نے اب میکانکی اور سطحی انداز کی کاوشوں سے بری الذمہ ہو کر عملی و تجربی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اور مختلف شاخوں اور قسموں پر منقسم ہو چکی ہے۔ دنیا کی مختلف شہرۂ آفاق یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں اس کا باضابطہ طور پر علیحدہ اور جداگانہ شعبہ بھی کھل چکا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی ایک اہم ترین شاخ صوتیات کا منفرد شعبہ بھی اپنی کرشمہ سازی سے شیدایان صوتیات کو متاثر کر رہا ہے۔ اور اس میں تخصیص کی سندیں حاصل کی جا رہی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ لسانیات دور حاضر میں کسی بھی سائنسی علم کے مدمقابل کھڑی ہو سکتی ہے

بعض حضرات اظہار خیال کریں گے کہ انگریزی تو ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ اور اس کو ہر نوع کی سہولت میسر ہے۔ اس لئے زبان و ادب کے معاملہ میں اس کا فروغ پذیر ہونا کوئی عجب بات نہیں۔ لیکن میں ایسا سوچنے والوں سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہندی اور بنگلہ میں بھی اس موضوع پر اتنے حقیقی کام کیوں کر ہو رہے ہیں؟ پھر چند ارباب فکر و شعور یہ بھی خیال ظاہر کر سکتے ہیں کہ ہندی کو تو سرکاری اعانت و مدد حاصل ہے۔ اور کسی قدر بنگلہ کو بھی۔ تو میرا کہنا

یہ ہے کہ پاکستان میں تو اردو سرکاری اور دفتری زبان ہے۔ تو پھر وہاں کیوں نہیں اردو میں لسانیات کے موضوع پر خاطر خواہ کام پایۂ انجام تک نہیں پہونچے۔؟ شاید اردو پر غور کیجئے اور افسوس کتنا ان کو جائے کہ اس وقت اردو آبادی اس طرح بے حس اور غفلت شعار ہو چکی ہے کہ اپنی زبان کی ترقی و تنزلی کے لئے ذرا بھی متفکر نہیں۔ حالانکہ کم از کم بہار کے بعض اضلاع میں یہ دوسری سرکاری زبان بن چکی ہے۔ جس کے رد عمل میں مترجموں کی بحالی بھی عمل میں آ چکی ہے۔ اور آ رہی ہے۔ لیکن قسمت کی ماری اردو آبادی کو دیکھئے کہ درخواستیں اردو زبان میں متعلقہ دفاتر میں بھیجنے میں شرم اور ندامت محسوس کرتی ہے۔

ہاں تو میں ہندی اور بنگلہ کی بات کر رہا تھا تو یہ ہے کہ بنگلہ کا ہندی سے متعلق بحث ابھی ابھی ہوئی، ہندوستان میں (بنگال کو چھوڑ کر) جو حال ہے اگر ہم اردو زبان کو ہندوستان میں عوام کی سطح پر زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ اردو نے ادبی طور پر یقینی طور پر کافی ترقی کی ہے۔ مثلاً اس میں ابتدائی دور سے اب تک اچھی داستانیں، اچھے ڈرامے، ناول، مختصر افسانے مرثیے، مثنویاں، قصیدے، غزلیں اور نظمیں زمان و مکان کے لحاظ سے پیش کئے گئے ہیں۔ بالخصوص اس دور میں نظم گوئی، غزل گوئی، ناول نگاری، افسانہ نگاری اور انشائیہ نگاری کو مختلف ہیئتی اور موضوعی تجربوں کے ساتھ فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور ان کو کافی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ تاہم یہ بات بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ کسی ادب کی ثروت مندی کے لئے اس کی زبان کو وسیع و بلیغ کرنا ہوگا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ محض ادب کے ذریعہ ہی کسی زبان کی خدمت عوامی سطح پر نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ ہم بنیادی تعلیم کی طرف عوام الناس

کو متوجہ نہ کریں۔ صرف حکومت کی نام نہاد اعانت و مدد اور اکیڈمیوں کی طرف سے کتابوں کی اشاعت سے کسی زبان کی خاطر خواہ خدمت سرانجام تک نہیں پہونچتی۔ بلکہ دنیا کی کوئی بھی زبان اس وقت ترقی کی منازل سے گزر سکتی ہے جب اس کے استعمال کرنے والوں اور بولنے والوں کی اکثریت اپنی زبان کے تئیں خبردار اور ہوشیار ہو جائے۔

اردو نہایت ہی پیاری اور دلفریب زبان ہے اس میں کیا شبہ ہے؟ لیکن ایسی باتیں ہمارے صرف چند اردو ناقدین ادب اور اردو قلم کار کرتے ہیں۔ لیکن جب ان حضرات کے ہونہار اولادوں اور رشتہ مندوں کی تعلیمی حالات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو چند کو چھوڑ کر تقریباً سبھی صاحبان اپنے ہاں بچوں کو ابتدائی تعلیم اردو سے نہیں بلکہ کسی دوسری تیسری زبان کے ذریعہ دیتے ہیں۔ ان کو ایسا محسوس ہوتا ہوگا کہ اردو پڑھا وقت میں پھنس گئے ہیں۔ اور ذاتی نسلوں کو بھی تو مصیبت میں پھنسانا نہیں چاہتے۔ پھنسیں تو صرف غربا اور مفلوک الحال [illegible]، نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اس کا دور رس اثر اردو آبادی پر مجموعی طور پر بڑا خراب پڑتا ہے۔ اردو شعرا، ادبا اور ناقدین ادب محض شعر گوئی، قصہ گوئی اور تنقید نگاری کو معراج زندگی قرار دیتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی چیزوں سے خاصی دلچسپی لیتے ہیں کہ وہ اپنی تخلیقات کو پڑھیں اور سنیں۔ اور خود کو داد و تحسین کی بوچھار سے پذیرائی میں مالا مال کریں۔ اور بہت [illegible] کے اہتمام سے اور فلمی دنیا کے گود کے [illegible] نغموں کے مجالس سے سامعین و ناظرین کو [illegible] اس سے یقینی طور پر زبان و ادب کی خدمت تو ہو سکتی

لیکن صفحۂ قرطاس کو سیاہ کرنے اور سینے کی حد تک۔ اور بغیر قاری کے یہ تمام اوراق سیاہ دیمک سے لبریز الماریوں کی زینت بن جاتے ہیں۔ اور سنی ہوئی تمام باتیں ہوا میں تحلیل ہو کر بے نام و نشان ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ ادب کے مطالعہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ بھی بہت حد تک اپنے آپ کو مستفیض کر سکتے ہیں۔ لیکن اردو کی پائندگی زندگی کا راز صرف ایسی کاوشوں پر منحصر نہیں۔ غیر اردو داں طبقہ میں غلط فہمیاں ملتی رہی ہیں کہ اردو غیر ہندوستانی اور غیر ملکی زبان ہے اور یہ غلط فہمیاں بے جا نہیں سمجھا ہے۔ اس لیے کہ ہمارے دور حاضر کے اردو ارباب نظر نے ایسی کارگزاریاں انجام نہیں دی ہیں کہ اردو کی سرشت و سرگزشت میں لکھی ہوئی تحریروں سے عوام دلچسپی لیں۔ اگر قدما کی کاوشیں اس ضمن میں ہوئی بھی ہیں۔ تو ان کو سراہنے اور سمجھنے والوں کی کمی ہے۔ جس کی وجہ ہر کس و ناکس پر واضح ہے۔

میرا مقصد گفتگو قطعی یہ نہیں ہے کہ اردو کے فروغ و بقا کے لئے اہل زبان و ادب اور صاحبان شعور و فہم کامیاب اقدام نہیں کئے ہیں۔ لیکن خام طریقے پر۔ ساتھ ہی اردو میں لسانیات کے موضوع پر جو کاوشیں عمل پذیر ہوئی ہیں وہ بھی قابل قدر ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت ابتدائی اور روایتی اور برعکس زمانہ ہے اس لئے کہ اس سائنسی دور میں سائنٹفک اور تجزیاتی کاوشوں کی ضرورت ہے۔ نہ کہ میکانکی اور سطحی کاوشوں کی۔ میں بعد ازاں بہت ہی ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو کام لسانیات کے موضوع پر انجام دیئے گئے ہیں وہ خاطر خواہ اور حسب وقت نہیں ہیں۔ میں پھر اس دور کے اہل علم و شعور کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ اردو زبان میں مذکورہ موضوع پر جو کا[illegible] ان کی کیا اہمیت اور قدر و قیمت ہے؟ ان کی نوعیت کیا ہے؟ کیا وہ حسب ضرورت ہیں؟ کیا اردو کی تاریخ اس کے صوتی نظام اور لفظی ذخیرے میں تغیر و تبدل اور ترقی و فروغ عمل میں نہیں آئے ہیں؟ ان مسئلوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور حسب ضرورت عمل پیرا ہونا ہمارے دانشوروں اور لسانیوں کا اولین فرض ہے۔ میرا خیال ہے کہ زبان اردو نے دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی طرح صوتی اور تشکیلی اعتبار سے ترقی غیر محسوس طور پر کرتے رہنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ لیکن اس زبان کی ترقی و تنزلی کو صوتی، نحوی، معنوی اور تشکیلی اعتبار سے جانچنے کے لئے جو کوششیں ہوئی ہیں وہ سراسر غیر تشفی بخش ہیں۔ اور اس دعویٰ کا ثبوت یہ ہے کہ اردو میں لسانیات کے موضوع پر جو کتابیں دستیاب ہیں وہ جدید لسانیات کے تقاضوں کو کلی طور پر پورا نہیں کرتیں۔ اپنی باتوں کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ذیل میں لسانیات پر مشتمل چند کتابوں کی فہرست پیش کرتا ہوں۔ بعد ازاں ان کتابوں پر اپنی رائے مختصر طور پر پیش کروں گا۔

(۱) ہندوستانی لسانیات۔ محی الدین قادری زور
(۲) اردوئے قدیم — شمس اللہ قادری
(۳) ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔ — سید احتشام حسین (مترجم)
(۴) مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں
(۵) داستان زبان اردو۔ شوکت سبزواری
(۶) اردو زبان کا ارتقا۔ ″ ″
(۷) اردو لسانیات۔ ″ ″
(۸) زبان اور علم زبان۔ عبدالقادر سروری
(۹) لسانی مطالعے۔ گیان چند جین۔

(۱۰) شعر و زبان — مسعود حسین خاں

(۱۱) جدید اردو لسانیات — ڈاکٹر امیر اللہ شاہین

(۱۲) لسانیات اور اردو — ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی

(۱۳) ہند آریائی اور ہندی (ترجمہ کردہ) — ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی

(۱۴) اردو کا لسانیاتی تجزیہ — شمشاد زیدی

(۱۵) دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی

(۱۶) پنجاب میں اردو — محمود شیرانی

(۱۷) تاریخ ادب اردو (جلد اول) جمیل جالبی ۔ (اسکا ابتدائیہ لسانیات سے متعلق ہے)

(۱۸) زبان اور کلچر — ڈاکٹر شکیل الرحمن

(۱۹) توضیحی لسانیات — ایچ اے گلیسن (جونیر) مترجم عتیق احمد صدیقی

(۲۰) اردو ولفظ کا صوتیاتی تجزیہ ۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں (انگریزی میں)

(۲۱) سرگذشت الفاظ — مولوی احمد دین

اب آئیے اور غور کیجئے کہ مذکورہ کتابیں لسانیات کی کن کن شاخوں اور پہلوؤں کو روشن کرتی ہیں خاکسار ہر کتاب پر فرداً فرداً روشنی ڈالنے کی جرأت کر رہا ہے۔

جہاں تک ہندوستانی لسانیات کا تعلق ہے تو اردو میں (لسانیات کے موضوع پر) سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو اس معاملہ میں لسانیات کے میدان کا سپہ سالار ہی نہیں بلکہ سرزمین لسانیات کا باوا آدم (اردو زبان میں) کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ موصوف کی لسانی خدمات بہت گراں قدر ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ایک تصنیف (HINDUSTANI PHORETIES) بھی اہمیت کی اہمیت کی حامل ہے۔ ہندوستانی لسانیات کے ضمن میں مزید عرض کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے لسانیات کے موضوع پر ایک منضبط کتاب اردو داں طبقہ اور طلبا لسانیات کو عنایت کی۔ جسے ہمارے آباؤ اجداد سے لے کر اب تک کی نسل زیر مطالعہ رکھتی چلی آ رہی ہے۔ موصوف نے لسانیات کے ضمن میں ایک جادۂ اعتدال بخشا۔ جس پر آج کے ماہرین لسانیات چل رہے نظر آتے ہیں۔ تاہم ان ساری خوبیوں کے باوجود یہ کتاب لسانیات کی جدید ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی۔

اردوئے قدیم ______ میں شمس اللہ قادری نے بھی اردو کی پیدائش وارتقا سے بحث کی ہے۔ اور اردو زبان کے تدریجی ارتقا و فروغ پر روشنی ڈالی ہے یہ کتاب بھی لسانیات کی اہم ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے سطحی انداز میں لسانی مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔ تاہم ابتدائی کاوش کی وجہ سے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

جہاں تک ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ______ کا تعلق ہے تو یہ پروفیسر احتشام حسین کی ذاتی تصنیف نہیں۔ بلکہ جان بیمز (JOHN BEAMS) کی کتاب (AN OUTLINE OF JANDIAN LINGUISTIES) کا ترجمہ ہے البتہ اس ترجمہ کردہ کتاب کے مقدمہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ موصوف نے دنیا کی مختلف زبانوں کے خدوخال اور بالخصوص ہندوستانی زبانوں کے خدوخال اور ان کی صوتی و لسانی خصوصیات پر عالمانہ طور پر روشنی ڈالی ہے۔ زیر نظر کتاب کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن لسانیات کے جدید تقاضوں کو چونکہ یہ کتاب پورا نہیں کرتی ہے۔ اس لئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض لسانیات کے ایک پہلو روشن کرتی ہے موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب توضیحی لسانیات

میں مثال ہے۔

مقدمہ تاریخ زبان اردو ______ محض اردو
زبان کی سرگزشت اور ہند آریائی زبانوں کی تفصیل پیش
کرتی ہے۔ مسعود حسین خاں نے اردو طلبائے لسانیات کو
یہ کتاب عنایت کرکے ان پر بڑا احسان کیا ہے۔ کتاب کی
اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتاب بھی توضیحی اور
تاریخی لسانیات کے زمرے میں آسکتی ہے۔ لیکن اور
کتابوں کی طرح یہ بھی لسانیات کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں
کرتی۔ اس لئے کہ کتاب حسب عنوان لکھی گئی ہے۔

داستان زبان اردو ______ میں شوکت
سبزواری نے بھی اردو زبان کی پیدائش اور ارتقاء سے
بحث کی ہے۔ یہ بھی لسانیات کے تمام پہلوؤں کو روشن
نہیں کرتی۔ اس لئے بھی اس کی ضمنی اہمیت ہے۔

اردو زبان کا ارتقاء ______ میں بھی
موصوف نے محض موضوع کے اعتبار سے بحث کی ہے

موصوف کی کتاب بعنوان، اردو لسانیات
______ کا بھی وہی حال ہے جو ان کی دیگر کتابوں کا
ہے۔ زیر نظر کتاب میں جا بجا اردو صوتیات اور اردو کی
تعمیر و تشکیل میں کارفرما عناصر سے متعلق بحثیں ملتی ہیں۔ یہ
اردو کے دامن کو لسانیات کے اہم نکات سے نہیں پُر کرتی
اس لئے اس کی بھی ثانوی اہمیت ہے۔

زبان اور علم زبان ______ میں عبدالقادر
سروری نے ایسا معلوم ہوتا ہے محنت و عرق ریزی سے کام
نہیں لیا ہے۔ بلکہ انگریزی کی چند بنیادی کتب سے خوشہ
چینی کی ہے۔ تاہم یہ کتاب کسی قدر لسانیات کے انتہائی
اہم پہلوؤں کو روشن کرنے میں پیش پیش نظر آتی ہے۔
اس لئے بھی اہمیت کے حامل ہے۔ موصوف نے طلبائے
لسانیات کی تشنہ لبی کو اپنی مخلصانہ محنت سے سیراب
کرنے کی کوشش کی ہے۔

لسانی مطالعے ______ میں گیان چند جین
نے جن نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ تو شیدایان
لسانیات کے لئے مفید ہیں ہی۔ لیکن وقت کے تقاضے کے
مطابق یہ بھی لسانیات کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔

جدید اردو لسانیات ______ میں ڈاکٹر امر
شاہین نے روایتی انداز میں اپنے خیالات کو ظاہر کرکے
توضیحی لسانیات کے ضمن میں ایک اچھی مثال پیش کردی۔
مزید براں زیر نظر کتاب میں شامل کردہ ایک مضمون بعنوا
"جدید لسانیات" اعضائے صوت یا اعضائے تکلم
کا حامل ہے۔ حالانکہ اس مضمون میں پیش کردہ خیالات
خاکسار کو اتفاق نہیں۔ اس لئے کہ مصوتے اور مصمتے کو
پیش کرنے میں ان سے بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ کتاب
کے مطالعہ سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کے ا
لسانیات سے متعلق غور و فکر کرنے کا مادہ ہے۔ لیکن
خام۔ میرا خیال ہے کہ ان کو لسانیات کا مطالعہ بغور کر
چاہئے۔ اور ہضم کئے ہوئے نظریات و خیالات کو بر
کار لانا چاہئے۔

لسانیات اور اردو ______ ڈاکٹر س
محمود الحسن رضوی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جو جدید لس
کے اہم تقاضوں اور مطالبوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے
چند عمومی باتیں پیش کی گئی ہیں۔ اور ادھر ادھر کے سط
خیالات ملتے ہیں اور بس۔

ہند آریائی اور ہندی ______ ور احمد
ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی کتاب IND ARYAN
AND HINDI کا ترجمہ ہے۔ محترم عتیق احمد صد
صاحب نے اس کا ترجمہ پیش کرکے بڑا احسان کیا
یہ کتاب لسانیات کے ضمنی پہلوؤں کو پیش کرتی

اس میں شک نہیں ہے کہ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی شہرۂ آفاق
شخصیت کا نام ہے ان کی لسانی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا
جاسکتا ہے۔ ترجمہ کے ذریعہ سے موصوف نے ان کے خیالات
کی ترسیل و تبلیغ بہت ہی موثر اور دلکش انداز میں کرنے کی
کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ تمام باتیں اپنی جگہ پر یقینی طور پر
صحیح ہیں۔ لیکن ترجمہ کو دوسرے درجے کا کام سمجھا جاتا ہے۔
اور اس نوع کے کام کو کار مستعار سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ
یہ ایک کار مستعار کی بین مثال ہے۔ اور بس ضرورت اس
بات کی تھی کہ لسانیات کے موضوع پر تحقیق و تفتیش اور غور و
فکر کر کے ہمارے ماہرین لسانیات کچھ مفید اور سود مند اقدام
کرتے۔ اور طلبائے لسانیات کو روایتی باتوں سے یکسر دور
رکھتے۔ اور عہد حاضر میں لسانیات کے میدان میں کی گئی
کوششوں کی پیروی کرتے۔ اور بالخصوص اردو کے طلبائے
لسانیات کو ایک نئی راہ دکھاتے۔

کتاب اردو زبان کا لسانیاتی تجزیہ ——
کا ایک تو عنوان ہی غلط ہے۔ اس لئے کہ زیر نظر کتاب میں
شامل کردہ مضامین میں صرف ایک مضمون ایسا ہے۔ جو
لسانیات کے نظریاتی و اصولی نکات کی طرف اشارہ کرتا
ہے۔ بقیہ مضامین صوتیات سے متعلق ہیں۔ جن کی تعداد
مذکورہ مضمون کو اپنے اندر تحلیل کر لیتی ہیں۔ اس لئے اس
مضمون کی اہمیت بالکل ثانوی ہے۔ چنانچہ میرے خیال
میں اگر شمشاد زیدی صاحب اس کتاب کا نام " اردو
زبان کا لسانیاتی تجزیہ" کی بجائے "اردو زبان کا صوتیاتی
تجزیہ" تجویز کرتے تو کہیں بہتر اور سچا ہوتا۔ بہرکیف کتاب
کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ موصوف نے بہت
ہی دیدہ ریزی اور چشم سوزی کے ساتھ اردو صوتیات کے
موضوع کو مختلف جدول اور خاکوں کے سہارے واضح کرنے
کی ایک قابل تعریف کوشش کی ہے۔ حالانکہ کتاب کی شکل
و ہیئت اور عبارت و ضخامت بہت مختصر ہے۔ لیکن
روح مضمون کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس نہج
سے غور کیا جائے تو موصوف دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔
اس لئے کہ انہوں نے سب سے پہلے صوتیات کے موضوع
پر ایک باضابطہ کتاب سپرد قلم کی ہے۔ لیکن چونکہ یہ کتاب
بھی لسانیات کی محض ایک شاخ کو روشن کرتی ہے۔ اس
لئے یہ کتاب لسانیات کے رو میں ایک ضمنی اہمیت کی
حامل ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب ،دکن میں اردو
—— میں اپنے عالمانہ اور دور رس خیالات کا ذکر
کیا ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر دلبستان میں کی گئی ادبی
کوششوں کی مفصل تاریخ پیش کرتی ہے۔ لیکن اس کے
ابتدائی ابواب میں دکن میں اردو زبان کی نشو نما اور فروغ
و ترقی کی داستان پیش کی گئی ہے۔ جو اردو کے طلبا کیلئے
کارآمد ہے۔ ساتھ ہی ان ابواب کی اہمیت لسانیات کے
نقطۂ نظر سے بہت ہے۔ اس کتاب کی بھی اس ضمن میں وہی
حیثیت ہے جو دیگر کتابوں کی ہے۔

شعر و زبان —— میں شامل کردہ مضامین
میں سے صرف ایک مضمون بعنوان" اردو صوتیات کا خاکہ"
اردو صوتیات کے ضمن میں اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مضمون بھی
لسانیات کے تمام گوشوں کو روشن نہیں کرتا ہے۔ اس لئے
اس کی اہمیت ضمنی ہے۔ سو مزید براں ایک مضمون صوتیات
سے متعلق لکھ کر لسانیات کے میدان جنگ میں شہید ہو جانا
کوئی بڑی بات نہیں۔ حالانکہ خاکسار کو موصوف کی لسانی
خدمات کی اہمیتوں سے انکار کرنے کی جرأت نہیں۔ یقیناً
ان کی اس نوع کی کوششیں گراں قدر ہیں۔ لیکن کسی
— POTENTIAL PERSONALITY
کچھ اور کی توقع کی جاتی ہے۔

پنجاب میں اردو ——— محمود شیرانی کی تصنیف ہے جس میں پنجاب میں اردو زبان وادب کی ترویج وارتقا پر بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اردو زبان کی پیدائش کو بطن زبان پنجابی سے منسوب کیا گیا ہے۔ موصوف نے بہت ہی دیدہ ریزی اور محققانہ محنت کے ساتھ لسانیات کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ حالانکہ اردو کی پیدائش کے نظریے کے ضمن میں جن خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ وہ جدید انکشافات کے ذریعے منسوخ ہو چکے ہیں تاہم موصوف قابل صد مبارکباد ہیں۔ لیکن چونکہ یہ کتاب بھی لسانیات کے تمام گوشوں کو روشن نہیں کرتی ہے اس لئے بھی اس ضمن میں اس کی ثانوی اہمیت ہے۔

تاریخ ادب اردو (حصہ اول) ——— جمیل جالبی کی تصنیف ہے اس کے ابتدائی باب میں موصوف نے اردو زبان کی پیدائش و آغاز اور اس کی اہمیت و خصوصیت سے متعلق بحث کی ہے۔ اس لئے اس کتاب کی اہمیت لسانیات کے نقطۂ نظر سے بڑھ جاتی ہے۔ ورنہ یہ کتاب اردو ادب کی مفصل تاریخ پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کی حیثیت محض ضمنی ہے۔

زبان اور کلچر ——— میں ڈاکٹر شکیل الرحمن صاحب نے زبان کی پیدائش کے ضمن میں بحث کی ہے ساتھ ہی رسم تحریر کی پیدائش وارتقا کی مفصل تاریخ پیش کی ہے۔ اس لئے لسانیات کی رو میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن ثانوی طور پر یہ لسانیات کے بعض پہلوؤں کو روشن کرتی ہے۔ اس لئے یہ کتاب اتنی مفید نہیں، جتنی کہ توضیح لسانیات کرتی ہے۔

مسعود حسین کی کتاب بعنوان "اردو لفظ کا صوتیاتی تجزیہ (انگریزی میں)" ——— پیش کی گئی ہے۔ جس میں موصوف نے صوتیات کے مسائل اور تقاضوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے چونکہ اردو لفظ کے صوتی ماحول کا تجزیاتی انداز میں مطالعہ کیا ہے اس لئے اس کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ کتاب لسانیات کی تمام ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی ہے اس لئے کہ کتاب حسب موضوع تحریر کی گئی ہے۔

توضیحی لسانیات ——— ایچ، اے گلین (جونیر) کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ عتیق احمد صدیقی نے کیا ہے۔ ترجمہ بڑا معیاری ہے۔ ان کی اس خدمت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن چونکہ ترجمہ کی اہمیت ثانوی ہوتی ہے اور ترجمے کے کاموں کو دوسرے درجے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جسے مستعار چیزوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لئے بھی اس کی اہمیت اصل متن کی طرح نہیں ہے۔ موضوعی اعتبار سے کتاب کی اہمیت ہے لیکن چونکہ لسانیات کے تمام پہلوؤں کو روشن کرنے میں یہ کتاب بھی ناکامیاب ہے اس لئے اس اعتبار سے اس کی بھی ثانوی حیثیت ہے

سرگذشت الفاظ ——— میں مولوی احمد دین صاحب نے الفاظ کی سرگذشت و تاریخ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لفظ جملے کی اکائی ہوسکتے ہیں۔ اور جملہ زبان کی۔ لفظ کے اندر جن صوتی و معنوی تبدیلیوں کے حادثے واقع ہوئے ہیں۔ ان کی دلچسپ کہانی اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔ اس بنا پر دیکھا جائے تو یہ کتاب توضیحی و تاریخی لسانیات کی مثال ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ لیکن یہ کتاب بھی لسانیات کے تمام گوشوں کو روشن نہیں کرتی ہے۔ اس لئے بھی اس کتاب کی ثانوی اہمیت ہے۔

بہر کیف یہ ہوئی لسانیات کے موضوع پر اردو میں لکھی گئی کتابوں کی کہانی۔ ان کتابوں کی خامیوں و خوبیوں کو دکھا کر یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ اردو زبان میں لسانیات

کے موضوع پر کام نہیں ہوئے ہیں۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں میں نے اقرار کیا ہے۔ مجھے افسوس اس لئے ہو رہا ہے کہ اڑیائی زبانوں اور بالخصوص ہندی بنگلہ اور دیگر زبانوں میں پیش کردہ لسانیات کے موضوع پر کتابیں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ جن کے مقابلے میں اردو زبان کا دامن ادھورا تو ہے ہی۔ ساتھ ہی مفلوک الحال اور مفلس بھی۔ انگریزی کا مقابلہ کرنا ہی بیکار ہے۔

میں مزید اپنے موقف کی تائید میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دور حاضر میں لسانیات نے کافی ترقی کی ہے۔ دنیا کی تقریباً سبھی یونیورسیٹوں کے نصابوں میں اس کو شامل کر کے اس کی خاطر خواہ تعلیم و توسیع فروغ پذیر ہو رہی ہے ہندوستان میں بھی بعض جگہوں میں علیحدہ ادارے اور شعبے قائم کئے گئے ہیں۔ اور قائم ہو رہے ہیں۔ جہاں طلبا لسانیات میں ڈگریاں اور سندیں حاصل کر رہے ہیں۔ لسانیات کی روز افزوں ترقی کا ثبوت یہ ہے کہ یہ آج مختلف شاخوں پر منقسم ہے۔ اور ہر شاخ پر جداگانہ طور پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں انگریزی زبان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہاں جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ لسانیات کی مختلف شاخیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن میں تاریخی لسانیات، تقابلی لسانیات، توضیحی لسانیات، سماجی لسانیات اور عملی لسانیات، (اس کے زمرے میں موضوعاً آتی ہے) نحو و صرف، معنیات، تشکیلیات، صوتیات، ارتقائی صوتیات، صوت تجربہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں زبانوں کو سائنسی اور تجزیاتی انداز میں جانا اور سمجھا جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں بعض اداروں میں باضابطہ تجربہ گاہوں کا انتظام ملتا ہے۔ جہاں جدید دور کی حیرت انگیز مشینیں رکھی جاتی ہیں۔ جن سے زبانوں کو اور ان کے صوتی نظام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

لسانیات کی ان تمام ترقیات کے ضمن میں ہمارا اردو زبان میں لکھی کتابیں زیادہ مواد فراہم نہیں کرتیں۔ جتنا ہندی اور بنگلہ زبان کی کتابیں۔ اور کیونکر ایسا ہو۔ اس لئے کہ اردو داں طبقہ اور اردو ادب پر شعراء و علماء محض، داستان ناول، ڈرامہ، کہانی، اور شعر و نغمہ کو سننے اور پڑھنے کے فطری طور پر عادی ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی توجہ لسانیات جیسی خشک چیز پر مرکوز نہیں ہوتی۔ اور اگر کبھی کبھار یا دل ناخواستہ لسانیات کی کتاب۔ اٹھائی بھی تو نیند انہیں تنگ کرنے لگتی ہے۔ اور سنجیدگی کی گولی لسانیات کی کتاب کو سمجھ کر غفلت شعاری کے حلق کے نیچے اتار دیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ آج کم از کم اردو زبان میں لسانیات کے موضوع پر نیند کی گولی نما لسانیات کی کتابیں بازار میں بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں۔ چنانچہ میرے خیال میں اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اردو ادب و زبان کے فروغ و بقا کے لئے اس کے استعمال کرنے والے اس کے لئے ہر وقت ALERT رہیں۔ ساتھ ہی ادبی تخلیقات و تنقیدات کو خوب عام کریں۔ اس کام سے کوئی روکتا نہیں۔ لیکن اردو ادب کے ذریعہ جسے اردو کہا جاتا ہے اس کی بقا و فروغ کی سرگذشت و سرشت کی ضامن اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ تو وہ صرف لسانیات ہی ہے۔ اردو زبان میں اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ کتابیں شائع ہوں۔ تاکہ اردو طلباء لسانیات کو اچھی کتابوں سے جدید لسانیات کے مواد دستیاب ہو سکیں ایسی کوششوں کی اس دور میں اشد ضرورت ہے۔ اردو کے نام نہاد ماہرین لسانیات کو بالخصوص اس بڑے فرض کی انجام دہی کے لئے مستعد ہونا چاہئے۔ تاکہ ان کو یونیورسٹیوں کے امتحانات میں روایتی انداز کے سوال سے قطع نظر جدید اور حالیہ لسانیات کے مطابق سوال

ستار طاہر

فردوسی کا شاہنامہ

شاہنامہ فردوسی کا شمار دنیا کی عظیم ترین رزمیہ شاعری میں ہوتا ہے۔ فارسی زبان میں ساٹھ ہزار پر مشتمل شاہنامہ فردوسی کا وہ عظیم شعری فن پارہ ہے جو بقائے دوام حاصل کر چکا ہے۔ فارسی زبان نے عظیم فن پارے تخلیق کئے ہیں۔ ان میں شاہنامہ کی حیثیت بے حد منفرد ہے۔

شاہنامہ ایک ایسی تصنیف ہے۔ جس کے بارے میں صدیوں سے لکھا جا رہا ہے۔ اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں شاہنامہ فردوسی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ سر جارج ہیلنین کے بارے میں بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ فردوسی کے سوانح نگار اور شاہنامہ کے مترجم کی حیثیت سے انگریزی میں جو کام کیا ہے اس کے حوالے سے ساری دنیا میں فردوسی کا شاہنامہ مقبول اور مشہور ہوا ہے۔

فردوسی ایک ایسی شخصیت ہے جسے اس کے اپنے دور میں اختلافی قرار دیا گیا تھا۔ شاہنامہ پر بھی خاصی لے دے ہوتی رہی ہے۔ پھر سلطان محمود غزنوی اور فردوسی کے حقیقی یا فرضی واقعہ کے حوالے سے بھی ایک طویل ترین بحث صدیوں سے جاری ہے۔ فردوسی کی زندگی کے حالات اور نظریات پر بھی علمی بحث ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں اردو زبان میں حافظ محمود شیرانی نے فردوسی پر گراں قدر کام کیا ہے۔ انھوں نے بڑی تحقیق و تدقیق سے فردوسی کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔

حافظ محمود شیرانی کی ایک کتاب " فردوسی پر چار مقالے" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

دنیا کا یہ عظیم شعری فن پارہ ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل شاہنامہ کیسے لکھا گیا اس کی شان نزول بہت ہی دلچسپ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر فردوسی کی زندگی میں ایک رات نہ آتی تو شاید شاہنامہ کبھی لکھا نہ جا سکتا۔ فردوسی عجیب طرح کے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ نیند آ رہی تھی۔ بیوی کو آواز دی۔ جس نے چراغ لا کر روشن کیا حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

الغرض چراغ اور چراغ کے ساتھ کسی قدر
میوے اور ایک جام شراب بھی لایا گیا
کچھ دیر شراب اور موسیقی ساز سے دل بہلایا
(فردوسی پر چار مقالے ص ۳)

اس کے بعد فردوسی کی بیوی نے کہا:

اگر تمہاری خوشی ہو تو دفتر باستان سے
میں تم کو ایک ایسی داستان سناؤں
جو رزم و بزم فریب اور محبت کے
واقعات پر مشتمل اور سنجیدہ اور خردمند
لوگوں کے ذکر سے مملو ہے۔ اور جس کے

سننے سے تم کو آسمان کی نیرنگیوں پر حیرت ہو گی۔ فردوسی نے اصرار سے کہا۔ اے ماہ رو آج رات یہ داستان تم مجھ کو سناؤ اس سے میری پریشان طبعیت کو سکون حاصل ہو گا۔ بیوی نے کہا میں داستان سنانے کو تیار ہوں اگر تم اقرار کرلو کہ سننے کے بعد تم اس کو نظم کر دو گے۔ فردوسی نے جواب دیا مجھے منظور ہے۔

(فردوسی پر چار مقالے صفحہ ۳)

اس رات فردوسی نے اپنی بیوی سے جو داستان سنی وہ داستان بیژن ہے۔ جس کا ذکر خود فردوسی نے کیا ہے۔ اس نے جس پہلی داستان کو شاہنامہ کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے نظم کیا وہ یہی داستان بیژن ہے۔ یہ داستان اسی زمانے میں شاہنامہ سے پہلے شائع ہوئی۔ مشہور ہوئی۔ اور اس شاہنامہ کی تکمیل کا محرک بنی۔

"دفتر باستان" یا "نامہ خسرواں" فردوسی کے زمانے سے دو ہزار سال قبل لکھی گئی تھی۔ جس میں قدیم ترین شاہان ایران کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ بعد میں اس کا اصل نسخہ غائب ہو گیا۔ مگر اس کے اجزا سلامت رہے جنہیں ۳۴۶ھ میں ابوالمنصور المعمری نے دوبارہ ترتیب دیا۔ حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ اگرچہ بعض واقعات فردوسی نے دیگر ذرائع سے حاصل کئے۔ لیکن دراصل دفتر باستان ہی شاہنامہ کا اصل ماخذ ہے۔

فردوسی کو ایک خاص شہرت حاصل رہی ہے۔ کہ وہ اختصار پسندی اور ایجاز گوئی میں کمال رکھتا ہے۔ اس کے ہاں بے جا طوالت دکھائی نہیں دیتی۔ جب اس نے شاہنامہ لکھنا شروع کیا۔ تو اس کی عمر چالیس پچاس برس کے درمیان تھی۔ شاہنامہ مکمل کرنے کے لئے وہ اصل نسخہ دفتر باستان کی تلاش میں بخارا، ہرات اور مرو بھی گیا۔

شاہنامہ کا آغاز کب ہوا۔ اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شاہنامہ کے خاتمے پر فردوسی خود بیان کرتا ہے کہ اس نے شاہنامہ پر ۳۵ برس صرف کئے۔ شاہنامہ ۴۰۰ھ میں مکمل ہوا۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

اس لئے ظاہر ہوا کہ ۳۶۵ھ میں شاہنامہ کا پہلا سنگ بنیاد قائم کیا گیا ہو گا اگر اس شعر پر اعتبار کیا جائے

بے رنج بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم بدیں پارسی

تو ۳۷۰ھ کی شاہنامہ کے آغاز کا سال ٹھہرتا ہے۔ ۳۸۹ھ میں سلطان محمود غزنوی کی تخت نشینی کے ایام میں جب وہ چھیاسٹھ سال کا ہے لکھتا ہے

سخن را نگہہ داشتم سال بیست
بداں تا سزاوار ایں گنج کیست

اس حساب سے ۳۶۸ھ پہلا سال ہے۔

(حافظ محمود شیرانی، فردوسی پر چار مقالے)

اس بحث و تحقیق کے بعد حافظ محمود شیرانی ۳۷۰ھ کو شاہنامہ کی باقاعدہ ابتدا کا پہلا سال قرار دیتے ہیں

شاہنامہ کے حوالے سے سلطان محمود غزنوی اور فردوسی کے قصے کو بڑی شہرت ہوئی اسے تاریخ کا ایک اہم حصہ بنا لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مختلف روایات ملتی ہیں۔

جاتی ہیں۔ ایک روایت عنصری سے منسوب ہے کہ عنصری کے حوالے سے فردوسی سلطان محمود غزنوی کے دربار میں پہونچا محمود غزنوی سے ملاقات ہوئی۔ ایک ہزار ابیات پہلے سے لکھے ہوئے تھے۔ جن کے بدلے میں فردوسی کو ایک ہزار طلائی درہم دینے پڑیں گے۔ جب شاہنامہ مکمل ہوا تو اسے چاندی کے ساٹھ ہزار درہم بھجوائے گئے۔ فردوسی اس وقت حمام میں تھا۔ اسے رنج ہوا۔ اس نے اسی وقت بیس ہزار درہم حمامی کو، اور بیس ہزار فقاعی کو اور بیس ہزار درہم لانے والے کو بطور انعام دے دیئے۔ بحر متقارب میں ہجو لکھی۔ سلطان محمود غزنوی کی نگاہ سے وہ ہجو گذری۔ تو وہ طیش میں آگیا۔ اس نے اس کی گرفتاری کے لئے انعام مقرر کر دیا۔

نظامی عروضی کی روایت اس سے بالکل مختلف ہے کہ شاہنامہ طوس میں مکمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی نے کم انعام دیا۔ فردوسی نے اسے بانٹا۔ سو ابیات پر مشتمل ہجو لکھی۔ طبرستان کے والی شہریار سے کہا کہ تمہارے آباواجداد کے کارنامے نظم کئے ہیں۔ اسے تمہارے نام معنون کرتا ہوں۔ والی طبرستان نے کہا۔ نہیں۔ اسے سلطان محمود غزنوی کے نام ہی رہنے دو۔ البتہ ہجو میں خریدنا چاہتا ہوں۔ اس نے ایک لاکھ درہم فردوسی کو بھجوائے،، ہجو کو دھو ڈالا۔

ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ انعام اس لئے کم دیا گیا کہ فردوسی سے مذہبی نقطہ نظر کا اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ کہ وہ معتزلی ہے

شاہنامہ میں ایسے کئی مواقع ہیں جہاں فردوسی نے سلطان محمود غزنوی کی مدح کی ہے۔ فردوسی سلطان محمود غزنوی کو "زندہ پیل" اور "رحمت بر اسپل" اور "دل دریا" نے نیاز کہتا ہے۔

حقیقت کچھ یوں ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے شاہنامہ کی تکمیل کی تشو کی اخلاقی ذمہ داری قبول نہ کی تھی۔ فردوسی نے اسے کسی بھی سرپرستی اور اعانت کا وعدہ لئے بغیر خود ہی شروع اور مکمل کیا تھا۔ فردوسی مال ودولت کا بھی رسیا نہ تھا۔ بقول حافظ محمود شیرانی فردوسی غذا، لباس اور بستر ان تین اشیا کو ہی ضرورت زندگی سمجھتا تھا۔ حافظ محمود شیرانی کے خیال میں فردوسی کا یہ اپنا ذاتی عمل تھا۔ سلطان محمود قصوروار نہ تھا۔

اس ضمن میں حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "فردوسی پر چار مقالے" میں تفصیل سے بحث کی ہے اس میں ایک مقالہ ہجو سلطان محمود غزنوی خصوصی مطالعے کی چیز ہے۔

فردوسی پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے عربوں کی فتوحات کا ذکر جان بوجھ کر گھٹا کر کیا ہے۔ اس طرح اسلامی جذبات کو مجروح کیا ہے۔ مذہبی حلقوں میں اس حوالے سے شاہنامہ پر بڑی تنقید ہوئی۔ حالانکہ یہ طرز فکر سراسر غلط تھا۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معاملہ ابتدا ہی سے ایک قسم کی غلط فہمی تھی۔ جس کی نازک اور کمزور بنیاد پر الزامات کے عالی شان قصر تعمیر کر لئے گئے۔ فردوسی ایرانی شاعر تھا۔ اور ایران مرحوم کی عظمت اور شکوہ کی افسانہ خوانی کر رہا تھا۔ کتاب جو اس کے پیش نظر تھی پہلوی تھی، یا پہلوی ذرائع تدوین ہوئی تھی۔ جس کا تمام نقطہ نظر ایرانی بلکہ یوں سمجھو کہ ساسانی تھا۔ اور ہم جانتے ہیں کہ قومی تفاخر و مباہات کا صنم کدہ

بقیہ مدہلہ ہے تو دوسری قوموں کے
کارناموں کی اس میں گنجائش نہیں
ہوتی جس صورت میں کہ رقابت کی
آگ بھی خاکستر ہو۔ فردوسی صنادید
عجم کی تاریخ لکھ رہا تھا۔ ساسانی ایران
اور کیانی ایران کی مرثیہ خوانی کر رہا تھا
وہ تاریخ عرب نہیں لکھ رہا تھا علاوہ
بریں اس معاملے میں اس کی حیثیت
ترجمان سے زیادہ نہیں تھی"۔

(فردوسی پر چار مقالے)

شیخ سعدی نے شاہنامہ کے بارے میں فرمایا ہے

سخن گوئے پیشیہ دانائے طوس
کہ آراست روئے سخن چوں عروس

ایک بار امام غزالی نے اثنائے وعظ فرمایا،
اے مسلمانو! میں تم کو وعظ و نصیحت کرتے مجھکو … برس
کا زمانہ گذرا۔ اس دراز زمانے میں جو پند و نصیحت
میں نے تم کو کی ہے فردوسی نے اس کو ایک شعر میں
ادا کر دیا ہے وہ شعر یہ ہے۔

تو رو نگرز گردن اندیشہ کن
پرستیدن داد گر پیشہ کن

اگر اس پر عمل کرو تو پھر تم کو کسی وعظ و نصیحت کی ضرورت
نہیں۔

ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل قدیم ایران کی تاریخ
کو لکھنے والا یہ عظیم شاعر فردوسی سنہ ۳۲۹ھ میں پیدا ہوا۔
اس کا نام منصور تھا۔ حکیم لقب، ابوالقاسم کنیت،
طوس کا ایک گاؤں شاداب اس کا مولد ہے۔ اس کا
باپ ایک فاضل مذہبی پیشوا تھا۔ ●

بقیہ: اردو زبان ــ میدان ....

پوچھنا چاہیے تاکہ اردو زبان کے اساتذہ اور طلباء کو مزید
اور کچھ سوچنے اور پڑھنے کا موقع مل سکے۔ ورنہ اردو محض
شعر و نغمہ اور قصہ گوئی کی محافل کی زینت اور مولویوں کی
تقاریر کا ذریعہ بن کر رہ جائے گی۔ عوام و حکومت کے
درمیان مفاہمت و صلح کے راستے مسدود ہو جائیں گے۔
اردو اپنے ہی ملک میں اجنبی اور دور دراز کی مہمان
اور غیر ملکی زبان تصور کی جاتی رہے گی۔ ●

کہکشاں تبسم

زہرا نگاہ — اپنی غزلوں کی روشنی میں

زہرا نگاہ اس وقت کی شاعرہ ہیں جب ترقی پسند تحریک کا زور ختم ہو رہا تھا مگر جدیدیت کے خدوخال واضح نہیں ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے انہیں عبوری دور کا شاعرہ کہا جا سکتا ہے انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ ان کی غزلیہ شاعری بڑی حد تک موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے روایتی نظر آتی ہے۔ مگر نظموں میں بڑی جدت طرازی ہے

"شام کا پہلا تارا" زہرا نگاہ کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو غزلوں اور نظموں پر مشتمل ان کے طویل شعری سفر کی پہلی داستان ہے ان کی شاعری کی مدت کو دیکھتے ہوئے یہ مجموعہ بڑا مختصر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زہرا نگاہ شروع ہی سے کم گو رہی ہیں اور بقول خود ترتیب کلام کے مرحلوں میں انہوں نے قطع و برید سے بھی کام لیا ہے۔

زہرا نگاہ کی شاعری کا بنیادی مزاج رومانی اور لب و لہجہ روایتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری تجربات عشق حادثات زندگی، اور تلخی ماحول سے عبارت ہے فیض احمد فیض نے زہرا کی شاعری کے تین مندرجہ ذیل ادوار مقرر کئے ہیں۔

(۱) ابتدائی کلام ——— جو غزلوں پر مشتمل ہے مگر اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس میں ایک نوعمر لڑکی کی شخصیت نظر نہیں آتی ہے۔

(۲) دوسرے دور کو رومانی واقعیت کا دور کہا جا سکتا ہے یہیں سے زہرا نگاہ کی نظم گوئی کا آغاز ہوتا ہے

(۳) تیسرا اور آخری دور وہ ہے جسے حقیقت پسندی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس زمانے میں زہرا کے یہاں کرب ذات کے ساتھ ساتھ غم کائنات کی پیش کش ملتی ہے۔

زہرا نگاہ کی غزلوں کا تجزیہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ان کی غزلیں روایتی سہی مگر ہر جگہ جذبے کی فراوانی موجود ہے اور ان جذبوں کے پس پردہ لطیف احساس لہریں لے رہا ہے ؎

کتنا ہے سخت جاں مرا ذوقِ بندگی
سو بار مٹ چکا ہے ترا سنگِ آستاں

حجاب

جہاں دیتے ہیں جاں دینے کا سودا ہی نہیں کرتے
شرمندۂ اعجاز مسیحا نہیں کرتے

ترا خیال فروزاں ہے دیکھئے کیا ہو!
خروشِ گردشِ دوراں ہے دیکھئے کیا ہو

جو سن سکو تو سب داستاں تمہاری ہے
ہزار بار جتایا، مگر نہیں مانے

سوزشِ قلب فلط آخر زباں تک آ گئیں
بات یہ اتنی سی تھی لیکن کہاں تک آ گئی

چاہتے ہم تو ترا نام بھی لے سکتے تھے
یہ خلش آج بانداز دگر ہوتی ہے

لب گویا تو مل گیا تھا ہمیں!
صرف اظہار مدعا نہ ہوا

مندرجہ بالا اشعار میں عام عاشقانہ تجربوں اور ...رداتوں کی پیشکش ہوئی ہے جس میں نہ موضوع کا نیا ...ن ہے اور نہ ہی فکر کی گہرائی، بلکہ سطحیت کا رنگ اس قدر ...ہوا ہے کہ زہرا نگاہ کی انفرادیت کہیں نہیں ابھر پاتی۔ ان ...خیالات و جذبات ایسے ہیں جنھیں قدیم غزل گو کسی نہ کسی طور ...پر پیش کر چکے ہیں۔ ان میں کوئی جدت تو نہیں۔ مگر جذبے ...کی شدت موجود ہے۔

مذکورہ مثال سے قطع نظر کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن میں نسوانی جذبات و احساسات اپنی تمام تر شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ ان میں خیال کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی نسائیت سے لبریز ملتا ہے۔ اور انہیں اشعار میں زہرا نگاہ کی انفرادیت اجاگر ہوتی ہے۔ مگر محض چند اشعار کی روشنی میں ان کے ادبی مرتبے کا تعین ممکن نہیں۔

اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا
کتنے دن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا
میں تو اپنے آپ کو اس دن بہت اچھی لگی
وہ جو تھک کر دیر سے آیا اسے کیسا لگا
آنکھوں میں دیدار کا کاجل ڈالا تھا
آنچل پہ امید کا تارا ٹانکا تھا

ہاتھوں کی بالیں چھن چھن چھن ہنستی تھی
پیروں کی جھانجن کو غصہ آتا تھا
ہوا سکھی تھی میری رت ہمجولی تھی
ہم تینوں نے مل کر کیا کیا سوچا تھا

اس نے آہستہ سے زہرا کہہ دیا دل کھل اٹھا
آج سے اس نام کی خوشبو میں بس جائیں گے ہم

تمام لوگوں سے رکھ رکھاؤ تری ہی چاہت کا تھا سلیقہ
تمام دنیا سے دوستی بھی تری محبت کے واسطے تھی

کبھی کبھی ہم عصر مشینی اور میکانیکی زندگی کا انتشار و بحران بھی شاعرہ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ جہاں تمام انسانی رشتے، آدرش اور اقدار سوسائٹی کی بھٹی میں تپ کر قطرہ قطرہ بہہ گئے ہیں۔ اور جہاں شاعرہ کے سامنے تہذیب و معاشرہ کا کھوکھلا پیکر اپنی بے لباسی پر رو رہا ہے۔ زہرا نگاہ نے ایسے احساسات کو ان کی تمام تر صداقت کے ساتھ پیش کر دیا ہے ؎

ہنستی بستی راہوں کا خوش باش مسافر
روزی کی بھٹی کا ایندھن بن جاتا ہے
دفتر منصب دونوں ذہن کو کھا لیتے ہیں
گھر والوں کی قسمت میں تن رہ جاتا ہے
اب اس گھر کی آبادی مہمانوں پر ہے
کوئی آ جائے تو وقت گزر جاتا ہے

ترے خیال، تری جستجو، تری خواہش
تفکرات زمانہ میں چھپ گئے یکسر

اب صحرا صحرا کیا گھومیں اب بستی بستی جائیں کیا !!
جو اپنے گھر میں چھوٹ گیا اب اسکا کھوج لگائیں کیا

گھر کے سارے پھول ہنگاموں کی رونق ہو گئے۔
خالی گل دانوں سے باتیں کر کے سو جائیں گے ہم

گو کہ ان اشعار میں استعارہ سازی اور علامت نگاری کی کوئی اعلیٰ مثال نہیں۔ مگر یہ دلکشی، جاذبیت، لطافت، اور اثر انگیزی کی بنا پر قاری کو مسحور کر لیتے ہیں۔

ان کے علاوہ زہرا نگاہ کی بیشتر شاعری پر ترقی پسند اثرات نمایاں ہیں۔ بالخصوص اسلوب کی سطح پر فیض کے لہجے کی گہری چھاپ ہے۔ ایسی مثالیں غزلوں میں بھی مل جاتی ہیں اور نظموں میں بھی۔ تراکیب و تشبیہات اور استعارات۔ بلاشبہ فیض ہی زیادہ مستعار ہیں غرض کہ مجموعی اعتبار سے زہرا کے اسلوب پر فیض کے اثرات حاوی ہیں۔ مثلاً:

اب ذوقِ طلب وجہِ جنوں ٹھہر گیا ہے
اور عرضِ وفا باعثِ رسوائی ہے دیکھو

اک یہ بھی ادائے دلِ آشفتہ سراں تھی!
بیٹھے نہ کہیں سایۂ دیوار کے ہوتے

ہر آستاں پہ لکھا تھا اب نامِ شہر یار
وابستگانِ دل کے لئے کوئی جا نہیں

ہم تہی دست بس اک دولتِ دل رکھتے ہیں
یہ نہ بک جائے کہیں مالِ غریباں کی طرح

کب تک جاں کو خاک کرو گے، کتنے اشک بہاؤ گے
اتنے چھینٹے دامن آخر کتنا قرض چکاؤ گے!
کل یہ سمندر خشک ہوا تو طرزِ ندامت کیا ہو گی!
کل یہ صحرا گرد ہوا تو کون سے رستے جاؤ گے!

چلو کہ اس حبسِ وجود میں نکلیں بہار آخر کدھر سے گزری
کہ اس گلستاں میں رہنے والے تو راہ تک تک کے تھک گئے ہیں

اے چارہ گرو! یہ رنجِ بے داد تو دیکھو
ہم سے وہ ادا ساز نہ خوش ہے نہ خفا ہے

حلقِ زنجیر صدائیں دے گا
اذنِ گفتار ملے یا نہ ملے!

مندرجہ بالا اشعار میں تراکیب و تشبیہات اور الفاظ کے استعمال کی سطح پر فیض کے لہجے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ بالخصوص وجہِ جنوں، ذوقِ طلب، عرضِ وفا، ادائے دلِ آشفتہ سراں، سایۂ دیوار، طرزِ ندامت، حادثۂ دل، وابستگانِ دل، تلخیِ دوراں، تارِ گریباں، انتظارِ بہاراں، اہلِ خرد، اہلِ جنوں، بندشِ غم، شکستِ ساغر، نظامِ میخانہ، مقامِ ہوش، سحرِ زندگانی، صاحبِ بصیرت، آدابِ جنوں، حلقِ زنجیر، اذنِ گفتار، گریۂ شبنم، مزاجِ دل، عمرِ گریزاں، دولتِ دل، مالِ غریباں، خوابِ پریشاں، سایۂ مژگاں، تنگیِ داماں، محفلِ یاراں، گردِ رہ گزر، متاعِ دیدۂ دل، رہ نوردِ راہِ جنوں، مسافتِ دشتِ وفا، انعامِ آبلہ پائی، جیسی تراکیب ترقی پسند شاعری سے مستعار ہیں۔ مرکبات میں کوہ و دمن، علم و حکمت، رنگ، بو، رسم و رسوم، سنگِ دشت

صبر و ضبط، عشق و محبت، ہجر و وصال، رسن و دار، سوز و ساز، رنج و محن، دل و نظر، اور ظلم و ستم وغیرہ اس بات کا اشارہ یہ ہیں کہ زہرا نگاہ قدیم شعری روایات سے زیادہ قریب ہیں۔

موضوعاتی اعتبار سے ان کی غزلوں میں کہیں کہیں جدت پسندی بھی ملتی ہے۔ گرچہ ترقی پسندانہ اثرات یہاں بھی حاوی نظر آتے ہیں۔ اس کے باوصف حقیقت پسندی کی کمی کھٹکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ایسی مثالیں کم ہیں۔ انہوں نے درحقیقت رومانی انداز نظر سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے۔ زہرا نگاہ کے یہاں عنفوان شباب کا وفور، آرزومندی، اور عشق و محبت کے نشیب و فراز زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق کی ناکامی نہیں بلکہ جذبۂ عشق کی سرشاری اور وارفتگی ملتی ہے۔ مثلاً ؎

سوچ لیں اگر تجھے تو کہاں جائیں کیا کریں
ہر لمحہ گزر میں تیرے گزرنے کا حسن ہے

میں بے طلب نہیں ہر سانس کو سوال سمجھ
کہ مانگنا مجھے الفاظ میں نہیں آتا !!

کچھ کہنا جرم ہے تو خطاوار میں بھی ہوں
یہ اور بات میرا کہا وہ سمجھ نہ پائے !

زہرا نگاہ کے اسلوب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جس پر فیض کے لہجے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ جسے موضوع اور اسلوب ہر اعتبار سے ترقی پسند شاعری کا عکس کہا جا سکتا ہے۔ اور جس کی مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں۔ دوسرا اسلوب وہ ہے جس کی تعمیر میں سیدھے سادے عام فہم اور سلیس الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ جہاں بے رنگ الفاظ بھی جذبۂ خلوص کی روشنی سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ مثلاً ؎

یہ اداسی یہ پھیلتے سائے
ہم تجھے یاد کر کے پچھتائے

کیوں گھر کے اب آئے ہیں یہ بادل یہ گھٹائیں
ہم نے تو تجھے دیر ہوئی یاد کیا تھا !
ان آنکھوں سے کیوں صبح کا سورج ہے گریزاں
جن آنکھوں نے راتوں میں ستاروں کو چنا تھا

دامن ہزار چاک گریباں ہزار وا !
یہ دیکھنا ہے کتنا گنہ گار کون ہے

تری نگاہ کی جنبش میں اب بھی شامل ہیں
مری حیات کے کچھ مختصر سے افسانے

صبر و ضبط کے لئے کر لیے شمار بہانے
تیری یاد آئی تھی آج دل کو سمجھانے

دل بجھنے لگا آتش رخسار کے ہوتے
تنہا نظر آتے ہیں غم یار کے ہوتے

ایسا دیکھا نہیں تنہائی کا سودا ہم نے
شعر تک کتنے دنوں سے نہیں لکھا ہم نے

ہاں سنو بت کہ تراشا تو بہت دھوم مچی
اور ٹوٹا تو کوئی شور نہ اٹھا لوگو !

برسوں ہوئے تم کہیں نہیں ہو
آج ایسا لگا یہیں کہیں ہو

نارسائی مزاج دل ٹھہری
ختم کوئی بھی سلسلہ نہ ہوا

زہرا کی غزلیں خالص عشقیہ اور جمالیاتی تجربے کی عکاس ہیں۔ جن کے متعلق فیض احمد فیض یوں رقمطراز ہیں

"یہ کلام پنجابی اصطلاح میں بالکل خالص
شاعری ہے۔ جو غالبؔ شاعری کا منتہی
مقام ہے زہرا کی شاعری آج کل اسی
مقام پر ہے"

(دیباچہ۔ شام کا پہلا تارا صفحہ ۱)

بہرکیف اپنے روایتی لب و لہجے اور مزاج کے باوجود زہرا نگاہ کی غزلیں اپنی تازگی و سادگی کے سبب جاذب نظر ہیں۔ شاعرے کی دنیا میں مقبول ہونے والی اس شاعرہ کے یہاں روایتی انداز سے قطع نظر کبھی کبھی ذات کے حصار سے نکلنے کی بھرپور کوشش نظر آتی ہے۔ اس صورت میں زہرا کائنات کو سمجھنے اور اپنانے کی بھرپور جدوجہد کرتی ہیں۔ اجتماعی جذبات کی توجہ کا مرکز بنتا ہے اور تب اس احساس کی سچائی کا اظہار بھی ہوتا ہے مگر خال خال۔ اسی موڑ پر زہرا کی انفرادیت روایت کے دائرے کو توڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور وہ ہم عصر رجحانات کی نمائندگی کرنے کی سعی کرتی ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی زہرا نگاہ کی غزلیں قدیم شعری مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔ اور تغزل کے سرور سے بھرپور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی انداز کے باوجود اپنی اثر آفرینی کی بنا پر قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں۔ جذبے کی صداقت اور اظہار کی سادگی زہرا کی غزلوں کی جان ہے۔ اور یہ بات ان کی فنکارانہ انفرادیت ہے●

بقیہ تبصرے

نہیں چلتا خالد نے ۱۹۲۵ء میں سب سے پہلی آزاد نظم کون سی کہی تھی۔ اور آیا وہ اس مجموعے میں شامل بھی ہے جب تک اس نظم کی نشان دہی نہیں ہو جاتی، ساغر نظامی، ڈاکٹر عبادت اللہ، اور طور ن م راشد کے بیانات کے باوجود تصدق حسین خالد کی اولیت غیر مسلمہ رہے گی

ان چند اختلافی مباحث سے قطع نظر زیر تبصرہ کتاب اور ایک جامع اور مکمل تصنیف ہے۔ جیسا کہ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے اس موضوع پر اب تک سب سے اچھا کام ہے۔ کتاب کے مطالعے کے بعد قارئین پروفیسر مسعود حسین کی اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ:

"اس تصنیف سے حنیف کیفی صاحب کے وسیع مطالعے اور علمی گرفت دونوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ......
یہ نہ صرف اس موضوع پر ایک اہم اضافے کا حکم رکھتی ہے بلکہ عرصے تک اس موضوع پر علمی کام کرنے والے کے لئے یہ ایک اہم حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھے گی"●

نسیم ستوکی
(پاکستان)

اپنی قبریں

جوں ہی میں نے دعا کے لئے ہاتھ اوپر اٹھائے بوڑھا مجاور اپنی کوٹھری سے نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور میرے ہاتھوں کو نیچا کر کے بولا۔

ٹھہرو — یہ بتاؤ کہ تمہارا فیصلہ درست تھا۔ اور اگر درست تھا تو اب یہاں کیا کرنے آئے ہو۔

میں عجیب پس و پیش میں تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کو کیا جواب دوں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

بابا — یہ تو میرا ذاتی قبرستان ہے — دیکھو — دیکھو یہ سب قبریں میرے آباواجداد اور میرے خاندان کے دیگر افراد کی ہیں۔ یہ جامن کا درخت اب بہت پرانا ہو چکا ہے۔ یہ گواہ ہے کہ جب سوکھے پتے ان قبروں پر گرتے تھے میں انہیں صاف کر کے لوبان جلا کر فاتحہ پڑھتا تھا۔ آج تم مجھے کیوں روک رہے ہو۔

بوڑھا کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا —

یہاں سے جاتے وقت تمہیں یہ قبریں یاد نہیں آئیں۔ اس وقت بھی یہ موجود تھیں۔ اگر ان سے محبت تھی تو انہیں چھوڑ کر کیوں گئے۔ تم نے فیصلہ کرتے وقت کچھ بھی سوچا۔

بابا — جہاں تک فیصلہ کرنے کا تعلق ہے میں اس قابل نہ تھا مجھ میں سوچنے کی صلاحیت نہ تھی۔

کیوں اور کیسے۔ بوڑھے مجاور نے سوال کیا۔

بات کچھ اس طرح سے ہے کہ آج سے بہت سال پہلے جب میں چھوٹا تھا۔ اس آبادی میں ایک شخص رہتا تھا جس کو سب لوگ بوڑھے جادوگر کہا کرتے تھے وہ ہر وقت بانسری بجاتا رہتا تھا۔ اس کی بانسری کی صدا سن کر سب لوگ اپنے گھروں سے نکل آتے۔ اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتے۔ اس جادوگر کی بانسری میں خصوصیت یہ تھی۔ کہ اس میں جتنے سوراخ تھے ہر سوراخ سے ایک حروف ہجی کی آواز نکلتی تھی۔ اور ان حروف سے مل کر ایک خوب صورت سا لفظ بن جاتا۔ لوگوں کے کانوں کو وہ لفظ اتنا بھلا لگتا کہ ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر وہ لفظ چڑھ گیا تھا — ان میں — میں بھی تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک اندھیری رات میں بوڑھے جادوگر نے یک بیک بانسری بجانا شروع کر دی۔ آبادی کے جوان بوڑھے بچے عورتیں لڑکیاں اپنا گھر بار چھوڑ کر اس کے پیچھے ہو لئے — جیسے جیسے بانسری کی آواز آگے بڑھ رہی تھی۔ اسی قدر ہجوم بھی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

میں تمہاری یہ داستان سننا نہیں چاہتا۔ بوڑھے نے کرخت لہجے میں کہا۔

تو پھر میں کس طرح اپنے فیصلے کے بارے میں سمجھاؤں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

اچھا۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔

ہم سب دریا پہاڑ جنگل عبور کر کے ایک ایسے مقام پر پہونچ گئے۔ جہاں ایک شیشے کا گھر بنا ہوا تھا ہم سب کو بوڑھے جادوگر نے شیشے کے گھر میں بند کر دیا۔ شیشے کے گھر کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ کوئی شخص اس سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ گھر کے باہر ہر وقت پہرہ

رہتا تھا۔ اس کے برعکس شیشے کے گھر میں بہت چمک دمک تھی۔ ہر طرف قد آدم آئینے لگے ہوئے تھے۔ مجھے میں اپنا چہرہ نظر نہیں آتا۔ باقی ہر شے نظر آتی۔ ہم سب کو ایک مخصوص تربیت دی گئی تھی۔ زور سے بولنا۔ چیخنا چلانا جرم تھا۔ ہر شخص آہستہ آہستہ بات کرتا۔ بلکہ اشاروں میں باتیں ہوتیں ——— مسافر بابا ———

میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے ان درختوں پر رنگ برنگے پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ایک شاخ سے پھدک کر دوسری شاخ پر چلے جاتے ہیں۔ قسم قسم کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی ہیں۔ لیکن شیشے کے گھر میں جو درخت ہیں۔ ان پر بیٹھے ہوئے پرندے گردن جھکا اپنی اپنی ٹہنیوں پر بیٹھے رہتے تھے۔ ہر چھوٹے بڑے کو شیشے کے گھر کی کرنٹ کرنی پڑتی تھی۔ جو ایسا نہیں کرتا اس کا کھانا پانی بند کر دیا جاتا۔ جب وہ بھوک سے مر جاتا تو سب کہتے اسے آسمان پر اٹھا لیا گیا۔

لیکن تم کپڑے تو بڑے اچھے پہنے ہو۔ بوڑھے مجاور نے پھر سوال کیا۔

میرے کپڑوں کی چمک دمک اس لئے ہے کہ شیشہ کو کوٹ پیس کر اس کے باریک ذروں کو کپڑا بنانے میں شامل کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا لباس بڑا خوب صورت ہے۔ لیکن بدن میں خارش ہوتی رہتی ہے ——— بابا میرے مقابلے میں تمہارے کپڑے بہت سادہ اور بوسیدہ ہیں ——— کیا تمہارے بدن میں بھی کھجلاہٹ ہوتی رہتی ہے۔

نہیں ——— بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

کیا وہ جادوگر اب بھی زندہ ہے۔ بوڑھے نے مزید دریافت کیا۔

کہتے ہیں کہ وہ مرگیا۔ اور اس کے مرنے کے بعد اس کی بانسری ٹوٹ گئی۔ مگر سوراخوں سے اب بھی وہی آواز آتی ہے۔ سنا ہے کہ شیشے کے گھر میں اس کی بڑی اونچی قبر بنائی گئی ہے۔ ہر شخص کو زبردستی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔

زبردستی۔ بوڑھے نے تعجب سے پوچھا ——— اور کچھ سوچ کر کہا ——— اچھا اب اپنی قبروں پہ فاتحہ پڑھ سکتے ہو۔ ●

—— ٠ ——

زین العابدین
(بنگلہ دیش)

چھتری

دو شخص ڈھاکہ سے چٹاگام جانے والی سڑک کے اس مقام پر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے جہاں سے پانچ میل دور رحمت نگر گاؤں آباد ہے۔ اس مقام پر سڑک اونٹ کے کوہان کی مانند مڑ تڑ کر تیلی ہو گئی ہے لہٰذا اس جگہ بسوں ٹرکوں اور پرائیوٹ کاروں کے ڈرائیور اپنی اپنی گاڑیاں کی رفتار سست کر دیتے ہیں۔ تاکہ کوئی حادثہ نہ ہو۔ اور اسی بہانے بس والے اکا دکا مسافر کو اٹھا کر دو چار ٹکے کھرے کر لیتے ہیں۔

دونوں اسی رحمت نگر گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اور سڑک کے کنارے کھڑے ڈھاکہ جانے والی بس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی باتوں کا موضوع رحمت نگر کی وہ مسجد تھی جو آزادی کے بعد اپنی دلکشی کھوتی جا رہی تھی۔ یہ مسجد کئی صدی پرانی تھی۔ جسے کسی بزرگ نے بنائی تھی۔ تاکہ گاؤں والے اس میں نماز ادا کر سکیں۔ مگر ان کی باتوں کا موضوع فوراً ہی بدل گیا تھا۔ کیونکہ دو ننگ دھڑنگ لڑکے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے ان کے قریب سے گذرے تھے۔ اور گاؤں جانے کے لئے سڑک سے اتر کر پگڈنڈیوں پر ہو گئے تھے۔

پہلے بھی ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ گاؤں کے بچے آپس میں ایک دوسرے کو گالیاں دیں۔ اللہ رحمت

ایک شخص نے ان لڑکوں کی حرکت پر اظہار افسوس کیا۔ اور اس پگڈنڈی کی طرف دیکھنے لگا۔ جس پر دونوں لڑکے ایک دوسرے کے آگے پیچھے جا رہے تھے۔

یہ شخص شکل و صورت سے کسان لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر میلی کچیلی پھٹی گنجی اور لنگی تھی۔ آنکھیں اور پیٹ اندر کو دھنس گئے تھے۔ تیس بتیس کی عمر ہو گی۔ مگر چہرے سے جھریاں جھول رہی تھیں۔ سر کے بال کچے پکے تھے۔ گردن اور کاندھوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے دوسرے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے دوبارہ کہا۔ جب ہم بچے تھے تو کبھی کسی کو گالیاں نہیں دیں۔ بڑوں کا احترام کیا۔ ان سے جھک کر باتیں کیں۔ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور اچانک پوچھا۔ ایسا کیوں ہوا ہے۔ ماسٹر بابو۔؟

ماسٹر بابو جو اب تک بڑے انہماک کے ساتھ کسان کی باتیں سن رہے تھے۔ اپنی ناک پر عینک درست کرتے ہوئے کہا۔ اس کا کارن یہ سڑک ہے۔ پھر ایک کار شن سے گذر گئی۔ اور سڑک پر ایک گہرا نشان چھوڑ گئی۔

پر پہلے بھی تو سڑک تھی۔

پہلے یہ سڑک کچی تھی۔ اب پکی ہے۔ پہلے اس پر بیل گاڑیاں چلا کرتی تھیں۔ اب ٹرکیں چلتی ہیں۔ پہلے وقت رینگتا تھا اور اب......ماسٹر بابو ماضی اور حال کا موازنہ کر رہے تھے۔ کیونکہ وہ گاؤں کے ایک پرائمری اسکول میں تقریباً دو جگ سے ٹیچر تھے۔ تاریخ پڑھاتے تھے۔ صرف پرانی تاریخ۔ نئی تاریخ تو انہیں یاد ہی نہیں رہا کرتی تھی۔ سو جب بھی لڑکے ان سے نئی تاریخ سے متعلق دریافت کرتے تو وہ انہیں ٹال جاتے۔ اور کہتے کہ وہ جس گلی میں رہتے ہیں۔ وہاں ہر شخص کے

سروں پر ایک بڑا چٹان معلق جھول رہا ہے ۔ پرسوں
حافظ نورالدین کے سر پر ایک چٹان گرا تھا ۔ اور
اس کی چھت میں بڑا سا سوراخ ہوگیا ہے ۔

لڑکے ان کی باتوں پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے ۔ اور
کہتے ماسٹر بابو کا دماغ چل گیا ہے ۔

پھر ماسٹر بابو اپنے بابا کی دی ہوئی عینک کو
صاف کرتے ہوئے کلاس سے نکل آتے ۔ اور اس
چھتری کو بغل میں دبائے گھر کی طرف روانہ ہوجاتے جسے
ان کے بابا نے مرتے وقت دی تھی ۔ اور انھیں تنبیہ
کی تھی کہ وہ اس چھتری کی ہمیشہ حفاظت کرتے رہیں ۔
کیونکہ اس چھتری کے نیچے سڑک کے علاوہ کڑی دھوپ
سے سروں کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے ۔ اور پھٹے پرانے
کپڑوں سے جھانکتے ہوئے جسم کو ڈھانپا جاسکتا ہے
اس کے پھیکے رنگ پر مت جاؤ ۔ یہ چھتری بڑی کام کی چیز
ہے ۔ ان کے بابا نے بستر مرگ پر لیٹے لیٹے ان سے کہا ۔
اسے سنبھال کر رکھنا ۔ اور پھر ان کے بابا کی آنکھیں ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں ۔ تب سے ماسٹر بابو اپنے بابا
کی دی ہوئی نشانیوں کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز
رکھتے تھے ۔

بابا کی یاد آتے ہی ماسٹر بابو کی آنکھیں بھر آئیں ۔
انھوں نے عینک اتاری اور اپنے کاندھے سے جھولتی
ہوئی پھٹی چادر کے ایک کونے سے آنکھیں پونچھیں ۔
اور آنکھوں پر دوبارہ عینک چڑھالی ۔

آسمان پر سورج جل رہا تھا ۔ اور اس کی دھوپ
کی تمازت میں سڑک تپ رہی تھی ۔ ٹریفک کا تانتا
بندھا ہوا تھا ۔ منٹ منٹ پر کبھی کوئی کار گزرتی ۔
کبھی بس ۔ اور کبھی ٹرک ۔۔۔۔۔

ماسٹر بابو اپنی باتیں ختم کر چکے تو کسان نے کہا ۔

ماسٹر بابو یہ سڑک بہت پرانی ہے ۔ اتنی پرانی کہ تب
ہم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے ۔ سات پرکھوں نے جیسی
چھوڑی تھی ۔ ویسی ہی ہے ۔ وہ ماسٹر بابو کو سڑک
کی کہانی سنا رہا تھا ۔ اور ماسٹر بابو اس کی آنکھوں
میں دیکھ رہے تھے ۔ جہاں پرکھوں کے احترام کے لئے
اضطراب و جذبات تھے ۔

آج اس پر ٹرکیں چلتی ہیں تو کیا ہوا ۔ ہماری
جندگی تو نہیں بدل گئی ۔ پہلے ہم بھوکے رہتے تھے اور
آج ہم بھوکوں مرتے ہیں ۔ کل جندگی سے پیار تھا اور آج
جندگی سے نفرت ۔ پہلے ہمارے مسائل نہ تھے اور آج
ان گنت مسائل ہیں ۔

اس لئے اس سڑک کو کاٹ کر دوسری
جانب سے ایک نئی سڑک نکالی جارہی ہے ۔ تاکہ
گاؤں والے بھوکوں نہ مریں ۔ ماسٹر بابو نے جیسے تاریخ کا
ایک نیا باب الٹا ۔ نئی سڑک کے بنتے ہی فاصلے اور
وقت کم ہوجائیں گے ۔

ماسٹر بابو کی اس بات پر کسان یوں مسکرایا ۔
جیسے ماسٹر بابو نے تاریخ کا کوئی غلط واقعہ بیان کردیا ہو
دو جگ بیت گئے ہیں پر اب تک آدھ میل
راستہ بھی نہیں بن سکا ہے ۔ اس انکشاف پر ماسٹر
بابو نے کسان کی جانب حیرت سے دیکھا ۔ راستہ بنانے
کے لئے مٹی درکار ہے پر مٹی کہاں سے آئیگی ۔ دس
بیس گاؤں کی مٹیاں کاٹ کر بھری جائیں ۔ تب بھی
سڑک نہیں بنے گی ۔ ایک تیز رفتار بوجھ سے لدی
ہوئی ٹرک دھول اڑاتی ہوئی سڑک سے گذر گئی ۔
دھول کسان کی ناک میں گھس گئی ۔ وہ کھنکھارنے
لگا ۔ پھر اس نے تھوک دیا ۔ لیکن ماسٹر بابو نے ٹرک
کے جاتے ہی جھٹ سے اپنی ناک پر چادر کا ایک

ایک کونا رکھ لیا تھا۔ سو گرد ان کی ناک میں نہ گھس سکی۔ البتہ دھول ان کی موٹی فریم والی عینک پر چڑھ گئی تھی۔ جس کو انہوں نے چادر کے دوسرے کونے سے صاف کیا اور دوبارہ آنکھوں پر چڑھا لی۔

ایسا لگتا ہے کہ تم نئی سڑک کے خلاف ہو۔

جو بات سچی ہے وہی کہتا ہے۔ اس علاقے میں اتنے کھڈ اور خندقیں ہیں کہ انہیں بھرنے کے لئے کئی پرکھوں کی نسلیں درکار ہوں گی۔

اب دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے قریب سے کئی بسیں گذریں۔ مگر انہوں نے کسی کو رکنے کے لئے اشارہ نہیں کیا۔ کیونکہ ان کی رفتار تیز تھی۔ اور وہ مسافروں اور مال سے لدی ہوئی تھیں۔ کسان کہے چلا جا رہا تھا۔

یہ علاقہ کبھی قبرستان تھا۔ پھر یہاں سیلاب آیا۔ اور ساری قبریں کھڈ ندی اور نالوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اب یہ علاقہ آسیب زدہ ہے۔ یہاں بھوت پریت اور جن رہتے ہیں۔ لہٰذا یہاں مزدور تین چار دن کام کرنے کے بعد بیمار پڑ جاتے ہیں۔ پھر خون تھوکتے تھوکتے مر جاتے ہیں۔

ماسٹر بابو بڑے اشتیاق سے کسان کی کہانیاں سن رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ یہ کسان نہ صرف کھیت میں ہل جوتتا ہے بلکہ دھرتی کی کہانی سے بھی باخبر ہے۔ انہوں نے پوچھا۔ آسیب پر قابو پانے کے لئے تم نے کبھی کسی فقیر یا درویش سے رجوع کیا تھا۔

دم کیا ہوا پانی چھڑکا گیا تھا۔

ماسٹر بابو اور کسان کے چہرے پسینوں میں شرابور ہو رہے تھے۔ جیسے دم کیا ہوا پانی بھوتوں اور جنوں کے بجائے ان کے چہروں سے ٹپک رہے تھے۔

ایک عورت لہراتی بل کھاتی ان کے قریب سے گذری

اس نے اپنا سارا جسم چھتری کے اندر ڈھک رکھا تھا۔ صرف اس کے پاؤں ننگے تھے۔ جو تپتی مٹی پر نشان بناتے ہوئے چلے گئے۔ ہوا چل رہی تھی۔ اور سورج کے ٹکیہ کو سلگا رہی تھی۔ عورت کے جاتے ہی ماسٹر بابو نے کسان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

یہ دو عورت کی خوب صورتی ہے۔ ماسٹر بابو کی یہ بات سن کر کسان اچنبھے میں پڑ گیا۔ اسے عجیب سا لگا کہ ماسٹر بابو نے اچانک گفتگو کا موضوع کیوں بدل دیا۔ وہ ابھی ماسٹر بابو کی جذبات کی تہہ میں پہونچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ماسٹر بابو دوبارہ بولے۔

اگر یہ نہ ہو تو عورت، عورت نہیں کہلائے گی۔

پھر ماسٹر بابو نے بغل سے چھتری نکالی۔ اور اپنے اوپر تانتے ہوئے کسان سے کہا کہ وہ بھی اس کے سایہ میں چلا آئے

بڑی پرانی ہے یہ چھتری۔ کسان نے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ بہت خوب صورت ہے اس کا دستہ۔ پھر اس نے ماسٹر بابو کی جانب دیکھا۔ جو اب تک عورت کے قدموں کے نشانات کو تک رہے تھے عین اسی وقت ایک پرائیوٹ کار آئی۔ اور دھول اڑاتی ہوئی چلی گئی۔ نشانات دھول سے اٹ گئے۔ نشانات سے نظریں ہٹا لیں۔

اس کے کپڑے کیوں نہیں بدلواتے ہیں۔؟

کپڑے بدل گئے تو چھتری کی خوب صورتی جاتی رہےگی ماسٹر بابو نے کہا۔

ہوا تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔ گرد سے بچنے کے لئے ماسٹر بابو نے چھتری کو سامنے کی طرف قدرے جھکا دیا تھا۔ اور دستے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ چھتری سڑک کے آڑے آ گئی تھی۔ کسان نے سڑک کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس کا رنگ پھیکا ہو چکا ہے۔

یہی اس کی خصوصیت ہے۔ کاریں، بسیں اور ٹرکیں دندناتی ہوئی گذر رہی تھیں۔ جیسے انھوں نے فیصلہ کیا ہو کہ سڑک کی گردش کو تیز تر کرتے رہیں گے۔

ہزاروں چھتریوں کے درمیان رکھ دو لوگ اسی چھتری کو پسند کریں گے۔ ماسٹر بابو نے دعویٰ کیا اور کسان کی جانب یوں دیکھا۔ جیسے وہ اس بات کا اطمینان کرنا چاہتے ہوں۔ کہ کسان کو بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں مگر کسان سوچ رہا تھا کہ آج بسوں کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ رک کیوں نہیں رہے ہیں۔ کیا اس مقام پر سڑک چوڑی ہو گئی ہے۔ کیا ڈرائیور ......

اچانک کئی ٹرکیں سڑک سے گذریں۔ جن کی گڑگڑاہٹ سے ان کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

پھر ان ٹرکوں کے جانے کے بعد ہواؤں کا ایک تند بگولا اٹھا اور ماسٹر بابو کے ہاتھ سے چھتری اڑا لے گئی۔ ماسٹر بابو اور کسان دونوں اس چھتری کے پیچھے بھاگے۔ بے تحاشہ دوڑ رہے تھے۔ کسان آگے تھا اور ماسٹر بابو پیچھے۔ اور چھتری ہوا کے دوش پر اڑتی چلی جا رہی تھی۔ ماسٹر بابو ہانپ رہے تھے اور ان کی رفتار سست پڑتی جا رہی تھی۔ لیکن اس کے برعکس کسان کے پاؤں میں جیسے پر لگ گئے ہوں۔ وہ دوڑ رہا تھا ..... اور دوڑ رہا تھا .... پھر جیسے ہی اس نے جست لگا کر چھتری کا دستہ پکڑا۔ ایک بس اسے کچلتی ہوئی گذر گئی۔ یہ بس شاید وہی بس تھی۔ جو کچھ دیر کے لئے ٹکر پر رکی تھی۔ کسان خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔ مگر اس کی گرفت چھتری کے دستے پر مضبوط تھی۔ ماسٹر بابو بدحواس بھاگتے ہوئے اس کے پاس گئے۔ اور اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر اس کا جسم بھاری ہو چکا تھا۔

سڑک پر ٹریفک رک گئی تھی۔ اور ایک ہجوم ماسٹر بابو اور کسان کے ارد گرد جمع ہو گیا تھا۔

ماسٹر بابو نے جوں ہی کسان کے سر کو اپنے گود میں لیا تو کسان نے ہچکی لیتے ہوئے اپنی نحیف آواز میں کہا ماسٹر بابو ہم نے آپ کے بابا کی دی ہوئی چھتری کو بس کے نیچے آنے سے بچا لیا ہے۔ پھر اس کی گردن ڈھلک گئی۔ ○

—○—

گیا

شام بارکپوری

ناول کا کفن

ارشاد بیابانی بستر پر لیٹا مطالعہ میں غرق تھا عین اسی
ت کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کی بیوی سعدیہ
، دروازہ کھولا۔
مجھے ارشاد صاحب سے ملنا ہے۔ اس شخص نے
ہا۔
اس کی بیوی نے آکر اطلاع دی کہ کوئی شخص اس سے
ا چاہتا ہے۔ اس نے اسے اندر بلا لیا۔
مجھے آپ سے ضروری کام ہے۔ اس شخص نے کھڑے
ی کھڑے کہا۔
کیا کام ہے بھائی؟ وہ تکیہ کے سہارے اٹھنے کی
شش کرنے لگا۔
میرا یہی کہنا تھا آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہے۔ اس شخص
نے طنز سے کہا۔ کچھ دن قبل آپ میری دکان سے چند کتابیں
ر پالائے تھے۔ ایک کی قیمت پانچ روپے، دوسری کی
ساڑھے تین روپے اور تیسری کی دو روپئے۔ براہ مہربانی
یمت ادا کر دیں۔
ان دنوں تو میں مجبور ہوں۔ دو چار دنوں کے اندر
ادا کر دوں گا۔ اس نے معذرت چاہی۔
ٹھیک ہے ایک ہفتہ بعد پھر حاضر ہوں گا۔ مگر اس
بلا خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔ اس شخص نے بڑی بے رخی
سے کہا اور باہر نکل گیا۔
اس نے اپنی بیوی کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی
وہ غم کی تصویر بنی اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ اس مفلسی اور
تنگدستی میں بھی اس کا جوبن شباب پر تھا۔
سعدیہ! قسمت کا کھیل، دیکھا؟ اب لوگ تقاضا
کے لئے گھر تک آنے لگے ہیں۔ دولت اور مایا کے جادو کے
سامنے قلم کار کے قلم کا جادو نہیں چل سکتا۔ اللہ جانے آگے
کیا ہوگا؟

ارشاد بیابانی کا شمار ملک کے صف اول کے ناول نگاروں
میں ہوتا تھا۔ وہ ضماد ... ر ادیب تھا۔ اس کے افسانے
ڈرامے، ناولٹ، ملک کے چوٹی کے رسالوں میں شائع ہو
چکے تھے۔ ادب کی دنیا میں اس کے ناولوں نے تہلکا مچا
دیا تھا۔ اس کی ناولیں بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت
ہو جاتیں۔ اس کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے تھے۔ شہرت
اس کے قدم چوم رہی تھی۔ اس کی نگارشات کے لئے ایڈیٹروں
کے خطوط پر خطوط آتے تھے۔ پبلیشر اس کے گھر کا چکر لگاتے
مگر اتنا کچھ لکھنے اور شہرت کی بلندی پر پہونچنے کے باوجود
اس کا ہاتھ خالی کا خالی تھا۔ اس کی معاشی حالت دن دن
بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ پبلیشر اس کے مسودے
بڑے چاؤ اور خوشامد سے لے جاتے۔ کبھی کبھار کچھ معاوضہ
دیتے اور باقی وعدہ فردا پر ٹرخا دیتے۔ ضرورت کے
پیش نظر اسے جو کچھ بھی ملتا قبول کر لیتا۔ اس کی ناولیں چھاپ
کر پبلشروں نے ہزاروں لاکھوں کما لئے۔ مگر وہ اپنے قلم کی
روزی سے پیٹ کی آگ نہ بجھا سکا۔ گھریلو ضروریات پورا
کرنے کے لئے اسے ادھار لینا پڑتا۔ اس کا بال بال قرض
میں بندھا ہوا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے بیمار رہتا تھا۔
مگر دوا کے لئے اس کی جیب خالی تھی۔ بس اس کی

شریک حیات تھی جس کی ہمت اور حوصلہ افزائی کے سہارے زندگی کے دن گذار رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کا دوست شاہد اقبال آواز دیتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ بھی مصنف تھا اور اچھے ادیبوں میں شمار کیا جاتا تھا۔

کیوں بھابی! اب اس کی طبیعت کیسی ہے۔؟ وہ سعدیہ سے پوچھ بیٹھا۔

بھیا! آپ ہی دیکھ لیجئے۔ چند دنوں میں کیا حالت ہو گئی ہے۔ اکثر بخار بھی آتا ہے۔ وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔

ارے بھابی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس نے دلجوئی کے لئے کہا۔

آپ آج کل کیا کر رہے ہیں؟ بھابی نے پوچھا۔

ارے آپ کو معلوم نہیں فٹ پاتھ پر کتابیں بیچتا ہوں۔ میری کتابوں کا جو ذخیرہ تھا نا ـــــ فٹ پاتھ پر آٹھ آٹھ آنے کی صدا لگا کر بیچتا ہوں۔

آپ جیسے مشہور و معروف مصنف کو یہ کام زیب نہیں دیتا۔ کیا تصنیف و تالیف کا کام چھوڑ دیا؟ بھابی کے لہجے میں حیرت تھی۔

ہمارے ملک میں قلم کاروں اور فن کاروں کو بھوکا مرنا پڑتا ہے۔ لکھنے لکھانے سے شوق اور ارمان پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن پیٹ نہیں بھر سکتا۔

ارشاد چپ چاپ دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے اندر آتش فشاں سلگ رہا تھا۔ مجبوری کے کفن میں لپٹا اپنی قسمت کا ستارہ گن رہا تھا۔ شاہد کی باتوں سے جیسے وہ امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہو۔

شاہد اگر تم وقت کے آگے ہتھیار ڈال دو گے تو عوام کی زندگی میں حرارت کیسے پیدا ہو گی۔ ان کے مستقبل کا کنول کیسے کھلے گا۔ ہم اپنا خون جلا کر آنے والی نسلوں کی زندگی کا چراغ روشن کرتے ہیں۔ اگر ہم نہ ہوں تو اسکول کالج اور یونیورسٹیاں سب بند ہو جائیں گی۔ اور آنے والی نسلیں جاہل رہ جائیں گی۔

یار تمہاری طرح میں نے بھی بہت سنہرا خواب دیکھا تھا۔ مگر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھتے ہی پتا چلا کہ انسان پیٹ کی چکی میں پس کر قلم کی شتی نہیں چلا سکتا۔ شاہد بہت ہی دل برداشتہ نظر آ رہا تھا۔

انسان کو ثابت قدم رہنا چاہیئے۔ چٹان کی طرح ـــــ مصیبت اور تکلیف کے بعد ہی راحت اور مسرت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ اور اسی وقت سچی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ ارشاد دھیمے سے مسکرایا۔

بس بس، رہنے دیجئے اپنی لمبی چوڑی تقریر اور دھواں دار لکچر ـــــ شاہد بھائی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ مسائل کا حل ڈھونڈھنے کے لئے انسان کو حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنا پڑتا ہے۔ اگر آج آپ کسی اچھی جگہ نوکری کرتے تو ہمارے تمام دکھ دلدر دور ہو جاتے۔ بیوی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

سعدیہ تم بھی ہمت ہار بیٹھیں۔ اندھیرے کے بعد ہی سویرا ہوتا ہے۔ اور میں اس سے نا امید نہیں ہوں۔

تھوڑی دیر تک دونوں دوستوں میں اسی موضوع پر بحث ہوتی رہی۔ پھر وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ عین اسی وقت اس کا ایک اور دوست اس کے کمرے میں داخل ہوا جو ایک پبلشنگ بک ہاؤس کا مالک تھا۔

اس بحث و مباحثہ نے ارشاد کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تھکن اور کمزوری سے ہانپنے لگا تھا۔ اس لئے آنکھیں بند کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔

پبلشر بختیار رانا نے اشارے سے بھابی سے اس

کا حال دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ ویسا ہی ہے۔
بھابی شہر میں بہت بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں۔ بہتر
ہوتا کہ ان سے علاج کرائیں، پبلشر نے کہا۔ میں نے سب
انتظام کر لیا ہے۔ بس آپ اسے کسی طرح راضی کر لیں۔
آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ کسی کی مدد کے طلب گار
نہیں۔ اور نہ کسی کا احسان اٹھانا چاہتے ہیں۔
اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ اگر ایک
دوست دوسرے دوست کا کام نہ آسکا تو پھر دوستی کیسی؟
تب سعدیہ اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ سنتے
ہیں! بختیار بھائی کیا کہہ رہے ہیں؟
نہیں اب میں پہلے سے بہتر ہوں ارشاد نے اپنی
آنکھیں کھولیں جن میں خودداری کی جھلک تھی۔
"ارے بھائی ارشاد ٹال مٹول سے کام نہیں چلے گا
تمہیں اپنے لئے نہیں تو بھابی کا خیال کر کے علاج کرانا ہی
چاہئے۔ وہ بیچاری کتنی پریشان رہتی ہیں۔ اس نے
رضامند کرنے کے لئے اپنی کوشش کی۔
نہیں میں ٹھیک ہوں بس ذرا سی کمزوری ہے
وہ بھی چند دنوں میں دور ہو جائے گی۔ وہ ٹس سے
مس نہیں ہوا۔ وہ اپنے ضمیر کا سودا کرنے کو تیار نہ تھا۔
بختیار رانا آخر تھک ہار کر واپس جانے کے لئے مڑا۔
جب وہ باہر نکل رہا تھا تو اندر داخل ہوتے ہوئے ایک
نوجوان سے ٹکرا گیا۔ دونوں کے منہ سے ایک ساتھ
"ساری" (SORRY) نکلا۔
پبلشر کے جانے کے بعد وہ اپنی بھابی پر برس پڑا
بھابی اس قسم کے خود غرض اور مطلبی لوگوں کو گھر میں گھسنے
کیوں دیتی ہیں؟
کیوں؟ کیا ہوا؟ شریف آدمی لگتا ہے۔ آخر
اس میں کیا برائی ہے۔ وہ اپنے دیور کو سمجھانے لگی۔
برائی اسے دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ
جاتی ہے۔ اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑا۔

چند دنوں کے بعد بختیار رانا پھر آیا۔ وہ دوسرے کمرے
میں سعدیہ سے ناول کی طباعت کے بارے میں اظہار خیال
کرنے لگا۔ ساتھ والے کمرے میں ارشاد سو رہا تھا۔
بھابی، نیا ناول عنقریب پریس سے چھپ کر مارکٹ
میں آنے والا ہے۔ اس میں پرنٹر اور پبلیشر کے طور پر
آپ کا نام دوں گا۔ بختیار نے بہت ہی چاہت سے کہا۔
کیوں؟ میرا نام چھاپنے کی کیا ضرورت ہے؟
اس کا معاوضہ مل جائے تو یہی کافی ہے۔
بھابی آپ نہیں جانتیں۔ میری نظر میں آپ کی
کیا قدر و منزلت ہے۔ آپ وہ حسین پھول ہیں۔ جس کو
دیکھنے سے میرے دل کو تقویت محسوس ہوتی ہے۔ اس
کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ بہت دنوں سے وہ اپنا جذبۂ
محبت چھپائے بیٹھا تھا۔
چپ رہئے۔ آپ کو ایسی بات کرتے شرم نہیں آتی
میں آپ کے دوست کی بیوی ہوں۔ وہ بھڑک اٹھی۔
آپ جیسی گل رعنا اس کوٹھری کے لئے نہیں
بلکہ کسی گلدستہ کی زینت بننے کے لائق ہے۔ دل کے
ہاتھوں مجبور ہو کر آخر وہ اظہار محبت کر بیٹھا۔
آپ کے لئے بہتر ہوگا کہ یا تو اپنے دوست کے
کمرے میں تشریف رکھیں یا پھر جا سکتے ہیں۔ اس کی اس
حرکت پر وہ کھول اٹھی۔
بہتر ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ پھر کسی دن آؤں گا
وہ دال گلتی نہ دیکھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ مگر پھر فوراً
واپس آگیا۔
آپ پھر واپس آگئے۔ وہ غصے میں دانت پیستی

ہوئی بولی۔

دیکھئے دروازے پر ایک پھول بیچنے والا مل گیا تھا اس سے میں نے یہ چنبیلی کے پھول آپ کے لئے خریدے ہیں۔ یہ کہکر اس نے چنبیلی کی مالائیں اس کی طرف بڑھا دیں۔ سعدیہ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ اگر تم میری نہ بن سکیں تو تمہارا یہ شباب اور پرنور چہرہ چند دنوں کے بعد ان پھولوں کی طرح مرجھا جائیگا۔ اس کے ترکش میں جو آخری تیر تھا اسے بھی آزمانا چاہا۔

آپ ابھی یہاں سے نکل جایئے۔ میں دوبارہ کبھی بھی آپ کی صورت اس گھر میں دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔ سعدیہ کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگی تھیں غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ مجتبیٰ رانا معاملے کی نزاکت بھانپ گیا۔ کہ اگر اس نے چیخ و پکار شروع کر دی تو اس کی بڑی رسوائی ہوگی۔ اس لئے وہاں سے چپکے سے کھسکنے ہی میں اسے اپنی عافیت نظر آئی۔

اپنی اس بے بسی پر سعدیہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ جذبات کی شدت سے اس کی سانس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ اسی وقت اس کا دیور ارشد اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ساڑی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی بولی۔ کیا ہوا ارشد بھاگے بھاگے چلے آرہے ہو۔؟

ہاں بھابی۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔ ملک کے بڑے بڑے ناول نگاروں کی تخلیقات کا کمپٹیشن ہو رہا ہے۔ اس لئے ارشاد بھائی کا ناول مقابلے میں ضرور بھیجنا چاہئے۔ آج داخلے کی آخری تاریخ ہے۔

اپنے بھیا سے کہو اگر وہ راضی ہوں جب نا! سعدیہ ارشاد کی طرف اشارہ کرکے بولی۔

کیا فائدہ؟ ارشاد کے چہرے پر مایوسیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ خواہ مخواہ کی دوڑ دھوپ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

بھائی جان! آپ ہمیشہ ناامیدی کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر اس بار آپ کی نہیں سنوں گا۔ وہ بضد ہو گیا۔ بھابی سے کہہ کر ناول کے مسودے کی نقل نکلوائی۔ اور خود ہی ناول کا مسودہ مقابلے میں داخل کرانے کے لئے جانے لگا۔ جاتے جاتے اچانک کسی خیال سے ٹھٹھک گیا۔

ایک جگہ اسٹینو کی ایک سروس خالی ہوئی ہے علی احمد صاحب کے دفتر میں ——— اگر آپ کہیں تو میں یہ نوکری پکی کرادوں؟

اس کے متعلق اپنے بھیا سے پوچھو تو بہتر ہے۔ بغیر ان کی مرضی کے میں کچھ بھی نہیں کرسکتی

آپ ہی پوچھئے نا بھابی۔ ارشد نے خوشامد کی۔

ارشد جو نوکری کے بارے میں کہہ رہا ہے آپ کا کیا خیال ہے؟ اس نے ارشاد سے پوچھا۔

طوفان میں اگر تناور درخت گرنا چاہے تو لاکھ جتن کے باوجود اس کی لپٹی ہوئی شاخیں اسے گرنے سے نہیں روک سکتیں۔ تم لوگوں کی کوششوں سے کیا حاصل ہوگا۔ وہ ٹکٹکی باندھے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں سے امید کی کرن پھوٹتی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔

اپنی کتابوں میں اس نکتے پر زور صرف کرتے ہیں کہ انسان کے لئے ناکامی کوئی شئے نہیں۔ اصلی چیز ہمت استقلال اور سعی پیہم ہے۔ مگر حقیقی زندگی میں آپ اس سے منہ کیوں موڑتے ہیں۔ سعدیہ اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے کوئی۔

اعتراض نہیں۔ اس نے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہتھیار
ڈال دیا وہ کافی لاغر ہوگیا تھا۔ بلکہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔
اس کے ایک ہفتہ بعد شام کو سورج غروب ہونے
سے قبل اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ کھانستے کھانستے اس کے
منہ سے کف بہنے لگا۔ سعدیہ جلدی جلدی اس کا سینہ سہلانے
لگی۔ بخار سے اس کا جسم پھنک رہا تھا۔
ارے آپ کو تو تیز بخار ہے۔ سعدیہ گھبرا کر بولی۔
ٹھیک ہوں گھبرانے کی بات نہیں معمولی بخار ہے۔
ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ نقاہت سے بولا۔
آج شام تمہاری سروس CONFIRM ہونے
والی ہے اسی لئے فوراً آفس چلی جاؤ۔
آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں؟
کوئی خاص بات نہیں۔ اب میری طبیعت ٹھیک ہے
تم فوراً روانہ ہو جاؤ۔
تو پھر مجھ سے وعدہ کیجئے کہ میرے جانے کے بعد بستر
سے اٹھ کر لکھنے کی میز پر نہ جائیں گے۔ کیونکہ ڈاکٹر نے آپ
کو چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔
اچھا میں وعدہ کرتا ہوں پھر اس نے پوچھا ارشد کہاں
گیا ابھی کچھ دیر قبل تو یہیں تھا
ناولوں کا جو مقابلہ تھا آج اس کا رزلٹ نکلنے
والا ہے شاید وہیں گیا ہو۔
وہ آفس جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ عین اسی
وقت ایک آدمی نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھولتے
ہی وہ آدمی فوراً بولا۔
پبلشر بختیار رانا نے ارشاد بیامی صاحب کے پاس
بھیجا ہے۔ پریس سے ان کا نیا ناول چھپ کر آگیا ہے انہیں
دینے آیا ہوں۔
یہ کہہ کر وہ بلا روک ٹوک سیدھا اندر گھستا چلا آیا۔
اور ارشاد کے بستر کے قریب جا کر چھپا ہوا ناول اس کے ہاتھ
میں دے دیا۔ ناول پر نظر پڑتے ہی غصہ سے اس کی آنکھیں
سرخ ہو گئیں۔
بختیار رانا نے یہ کیا حرکت کی۔ یہ کہتے کہتے اس پر کھانسی
کا دورہ پڑا۔
صاحب آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ آپ کا ناول زیور
طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آگیا ہے۔
ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ اس کا گٹ اپ کتنا شاندار
ہے۔ کتابت و طباعت بھی عمدہ ہے۔ ایسا گٹ اپ تو میں نے
زندگی میں کبھی بھی نہیں دیکھا۔ اس کی مسلسل کھانسی سے
سعدیہ پریشان ہو گئی۔ صراحی سے گلاس میں پانی انڈیل کر
پلایا پھر بھی اس کی طبیعت بحال نہیں ہوئی۔
آپ کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ میں ڈاکٹر کو بلواتی
سعدیہ نے یہ کہہ کر اس کے سرہانے سے اٹھنا چاہا۔ مگر ارشد
نے اس کا بازو زور سے پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔
ڈاکٹر کو بلوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بے
ہو کر بولا میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔
کہاں درد ہو رہا ہے مجھے بھی تو بتائیے۔ وہ اس
کا سینہ سہلانے لگی۔
کہاں کہاں کا درد بتاؤں۔ ویسے سارا جسم
بری طرح جل رہا ہے۔ وہ کھانستے کھانستے دوبارہ بستر
لیٹ گیا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ اس نے منہ
اگالدان میں خون تھوکا۔ یہ دیکھ کر سعدیہ کے ہاتھوں
طوطے اڑ گئے۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔
وہ ارشاد کی حالت دیکھ کر رونے لگی۔ عین
ارشد خوشی سے جھومتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وا
سے سسکتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔
کیا ہوا ابا جی! اس نے ابا جی کو گمبھیر دیکھ کر

سعدیہ کے چہرے پر ہوائی اڑ رہی تھی۔

پہلے یہ بتاؤ کہ ناول کا کیا ہوا؟ اس نے بات کاٹ کر پوچھا۔ اس نے ارشاد کی کیفیت فوراً ارشد پر ظاہر کرنے سے گریز کیا۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بھائی جان کا ناول مقابلے میں اول قرار دیا گیا ہے۔ ارشد کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

"سچ" چند لمحے کے لئے اس کے چہرے کی مرجھائی ہوئی کلیاں کھل اٹھیں۔

ہاں بھابی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خوشی میں ناچوں یا گاؤں وہ مسرت سے سرشار ہو کر بولا۔ ساتھ ہی بھائی جان کو دو ہزار روپے نقد انعام ملنے کا اعلان ہوا ہے۔

وہ دونوں گفتگو کرتے ہوئے ارشاد کے بستر کے قریب آئے۔ اس وقت وہ آدمی واپس جا چکا تھا۔ جو چھپا ہوا ناول لے کر حاضر ہوا تھا۔

وہ بستر پر لیٹے ہوئے اپنے شوہر کو یہ خوشخبری سنانا چاہتی تھی۔

سنا آپ نے۔ آپ کا ناول اول قرار دیا گیا ہے اور ساتھ ہی دو ہزار روپے کا انعام بھی۔

جب اس نے غور سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا تو چونک پڑی۔

ارے ابتک، آپ کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ گھبراہٹ اور پریشانی میں اپنے آنچل سے اس کے منہ کا بہتا ہوا خون پونچھنے لگی۔

ارے بھابی یہ کیا؟ ارشد نے میز پر پڑا ہوا ناول اٹھا کر ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

وہ اس کی طرف مڑی کیوں؟ کیا ہوا؟

ہم نے انعام یافتہ مسودہ جو مقابلے میں شرکت کے لئے دیا تھا۔ وہ ناول تو سنجیدہ رانا نے اپنے نام سے چھپوا کر شائع کیا ہے۔ غصے سے ارشد لال پیلا ہو رہا تھا۔

سعدیہ اپنے شوہر کے سرہانے تکیہ ٹھیک سے لگانا چاہتی تھی کہ سناٹے میں آگئی۔ ناول نگار کا جسم ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ اور ارشد کے ہاتھ میں ناول تخلیق کار کا کفن محسوس ہو رہا تھا۔ ●

———— ۰۰ ————

خورشید حیات

آگ لگنے کے بعد

آگ..... آگ..... شعلہ..... یہ کیا ہوگیا؟
دیکھتے دیکھتے سارا مکان لپک اٹھا۔ دھواں، شعلہ اور گرمی، اس پر چیختے بلکتے بچے۔ بوڑھے اور سینا پیٹتی ہوئی عورتیں۔ ایک خلفشار سا مچ گیا تھا۔ شور اور ہنگامے نے پاس پڑوس کی ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی۔

پھر ہوتا یوں ہے کہ اچانک آگ بجھنے لگی سا اور دھواں سا پھیلنے لگا لوگ دھوئیں سے تنگ آ کر کنارے ہٹنے لگے۔ اور جلتا ہوا مکان اب دھوئیں کا مسکن بن گیا تھا۔ پھر آگ سرد ہوگئی، دھواں بھی زائل ہوگیا۔ یہاں تک کہ آگ اور دھواں ایک کہانی بن کر رہ گیا۔ مگر مالک مکان کو ایک اگ پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ کہ اس کے جسم پر ایک انجانی چنگاری آ کر کام کر گئی تھی۔ اور اس کا تن من جسم اس طرح لپک رہا تھا جیسے ساری آگ اس کے جسم میں بھر دی گئی ہو۔ کبھی کبھی فطرت کا مذاق بھی عجیب ہوتا ہے۔ آتش بازی بنانے والا وہ شخص آج خود آتش بازی کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہا تھا

آگ کیوں لگتی ہے؟

آگ لگتی ہے یا لگائی جاتی ہے؟ آگ تو تہذیب کی نشانی ہے اور تہذیب ہمیشہ حسن کی قائل ہوتی ہے۔ مگر یہ آگ تو سب کچھ کالا کر رہی تھی۔ اور جو کالا نہ ہوتا تھا اس کا بھسم بنا دے رہی تھی۔

میں دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کہ اچانک میرے ذہن و دماغ میں آگ کے شعلے اٹھنے لگے۔ اور نگاہوں کے سامنے چنگاریوں کا ایک ہجوم سا لگ گیا۔ میں چلانے لگا۔ آگ لگ گئی ہے۔ بجھاؤ، بجھاؤ۔ مگر کسی کے سمجھ میں کچھ نہیں آیا میں جلتا رہا اور میرا اندرون خاکستر ہوتا رہا۔ میرا ایک دوست جو مجھ سے بہت قریب تھا۔ میرا گھبرایا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ بھی نہ جلنے لگے۔ مگر میرے منع کرنے کے باوجود وہ مجھ سے لپٹا رہا اور میں اسے ٹالتا رہا۔ مگر ہوا یہ کہ آگ کی ایک چنگاری اسے بھی لگ گئی۔ اور پھر ہم دونوں پانی کی تلاش میں دوڑنے لگے۔ ہم دونوں پاگلوں کی طرح ایک سمت میں دوڑے جا رہے تھے۔ اور زمانہ ہمیں مجنوں سمجھ کر ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ راستہ آگے بڑھتا رہا ہم چلتے رہے چلتے چلتے ہم ایک بستی میں آئے۔ یہ تالابوں کی بستی تھی۔ یہاں ہماری سوزش کم ہوتی۔ مگر یہاں جب پہونچا تو محسوس ہوا کہ تالاب سراب بن گئے ہیں۔ اور ان کا پانی، پانی نہیں رہا ہے۔ وہ ریت کی طرح تبدیل ہو کر جل رہے تھے۔ اب ہمارے سامنے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہماری جان نکل جائے گی۔ اور ہم خاک کے تودا ہو کر رہ جائیں گے۔ کہ ہم دونوں نے پھر ہمت کر کے آگے کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایک پہاڑ پر پہونچا۔ اور اوپر کی طرف چلنے لگا۔ ابھی پوری طرح سے چوٹی پر پہونچا بھی نہ تھا کہ محسوس ہوا ہماری چنگاری شعلہ بن رہی ہے۔ اور اس نے پہاڑ کی ساری چوٹی کو منور کر رکھا ہے۔ بستی کے اور گرد کے لوگ اس نور کو دیکھنے کے خاطر جمع ہوئے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ اب اس آگ کے عادی بن گئے ہیں ہمارا بدن آگ کا بن گیا ہے۔ اور اب ہم دوسروں کو جلا سکتے ہیں۔ ہم روشنی پیدا کر سکتے ہیں مگر خود سوزش محسوس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آگ نے ہم کو آگ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب ہم خود جلتے ہیں، جلاتے ہیں کہ جلنا اور جلانا ہمارا

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

رقص ناتمام

مشعلیں جل اٹھیں
شور برپا ہوا
رقص کرنے لگے بہکے بہکے قدم
جا بہ جا، صف بہ صف
دھواں اڑنے لگی راہ میں ہر طرف

جسم اکڑے ہوئے عالم وجد میں
چہرے وحشت زدہ، بال الجھے ہوئے
چشم خونبار میں غم کی پرچھائیاں
لب پہ شعلہ فشاں نعرہ ہائے طلب
ہاتھ میں پرچم نوا اٹھائے ہوئے
ایک سیل رواں
عاشقان چمن، ارض جنت نشاں
اپنے نادیدہ محبوب کی چاہ میں
جذبۂ شوق دیدار دل میں لئے
جوش دیوانگی میں ادھر سے ادھر

گشت کرتے رہے، رقص کرتے رہے
رقص کرتے رہے، گشت کرتے رہے

مشعلیں جل بجھیں
شور مدھم ہوا
رقص بھی تھم گیا

پھر وہی شاہراہیں، وہی راستے
آسماں کی طرف سر اٹھائے ہوئے
ایستادہ مکاں
پھر وہی کوچے، بازاروں کے پیچ و خم
پتھروں کے صنم
پھر وہی مرحلے
آسماں تا زمیں پھر وہی دوریاں
پھر وہی فاصلے
کوئی نامہ نہ پیغام عہد وفا
پھر وہی بے رخی، برہمی، اجنبی اجنبی، آشنا خال و خط
پھر وہی غیریت کے لبادے میں لپٹی فضا
زندگی مضطرب
پھر وہی کرب آلود مایوسیاں
پھر وہی شہر کی اونگھتی بستیاں
گہری خاموشیاں

وقت کروٹ پہ کروٹ بدلتا رہا
رقص کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا

ظہیر غازیپوری

چار مختصر نظمیں

صبح

گل گوں رخساروں والی
ایک دوشیزہ کی
انگڑائی ہے
جس کا افسوں
ٹوٹ کے بھی
خوشبو کا جھونکا
بن جائے

دوپہر

اُجلے ملبوسات میں
کوئی بیوہ
کالی سڑکوں پر
آبِ ندامت آنکھ سے پونچھے
آہوں کی بھی گرد اڑا لے
اپنی بدبختی کو
اک ٹکسالی گالی دے کر
گھر کی دہلیز کو لانگھے
بستر پر گر جائے۔

شام

سانولی لڑکی
دن بھر اپنے بدن کی لذت
بانٹ کے جب گھر لوٹے
پرس کو اپنے نوٹوں کے دیکھے
نیلے ہرجائی کاغذ
نیچے اوپر تہہ کرکے
کالے بلاؤز میں ٹھونسے
اپنے آپ میں گم ہو جائے

رات

بند آنکھوں کے
لامحدود جہاں میں
جو کچھ ہوتا ہے
ان سب کا تم سے
گہرا رشتہ ہے
میں نے
بند آنکھوں میں بسنے والے
اک اک پیکر کو
تم سے ہی منسوب کیا ہے
تم ہو سمندر
گہرا، کالا، نیلا اور چمکیلا سا۔

شاہد میر

"تیسرا سورج"

کروڑوں میل لمبی رات آخر طے ہوئی
آنکھوں کی پتھریلی زمیں پر خواب کے پودے ابھر آئے
سبھی کو ایک ساعت مسرور نظر آئے
دشاؤں کا دھندلکا کم ہوا
سورج نکلنے کی خبر چاروں طرف پھیلی
اجالوں کے تمنائی اجالوں کی طرف دوڑے
کسی نے یہ نہیں سوچا
نئے سورج کے چہرے پر لہو کی سرخیاں کیوں ہیں
پس منظر کراہوں کی صدائیں کیوں ابھرتی ہیں۔
"نیا سورج" تو قدرے مشترک ہے
کس لئے پھر دھوپ دو حصوں میں بٹ جائے
بالآخر روشنی ہونے لگی.....
فضا میں شور ابھرا وہ نیا سورج ابھر آیا
سنہری روشنی پھیلی تو اندازہ ہوا
اطراف میں گرتی رہی ہے برف صدیوں تک
نیا سورج کئی درجہ حرارت لے کے آیا تھا
ہزاروں سال لیکن لگ گئے موسم بدلنے میں۔
کہ ان برف کے تودے پگھلنے میں

نیا سورج حرارت اپنی کھو بیٹھا!؟
اور اس کے بعد ہی اک دوسرا سورج نکلنے کی خبر پھیلی
کئی اذہان خوش فہمی میں گرویدہ نظر آئے
قیاس آرائیاں تھیں اصل سورج ہے یہی
جو اب کے نکلا ہے
مگر جس وقت یہ سورج بلندی پر نظر آیا
تمازت اس کی کم ہونے لگی
آنکھوں نے پھر دیکھا کہ یہ سورج بڑا خود غرض ہے
تیرہ دیاروں سے
سسکتے برف زاروں سے
سدا آنکھیں چراتا ہے
یہ سورج چند لمحوں میں سلگ کر بجھ گیا آخر.....
سنا ہے کچھ دنوں سے پھر
خبر پھیلی ہوئی ہے تیسرا سورج نکلنے کی
مگر میں سوچتا ہوں ان زمینوں پر
کبھی سورج نہیں نکلا
فقط کچھ دور پر بیٹھے ہوئے "آئینہ گر" اسی سمت تفریحاً
کوئی آئینہ چمکاتے ہیں۔
سورج کے نکل آنے کی افواہیں اڑاتے ہیں۔
..... فضا میں برف باری اب بھی جاری ہے
کروڑوں میل لمبی رات طاری ہے۔

شہیر رسول

کون ہے

سوکھے پیڑ کی سوکھی آنکھیں
برسوں برسوں کھوج رہی ہیں
دھند کے مٹمیلے مگھوں میں اپنا سایہ
پر کیا پایا
کوئی پوچھے ؟
کوئی پوچھے ان آنکھوں سے ؟ ؟
کرب تمہارا روشن کس پر ؟
درد تمہارا کس کو پیارا ۔ ؟
کون ہے ایسا من اجیارا ۔ ؟

جو
سوچوں کے ہاتھ بڑھا کر
دھند کے مٹمیلے مگھوں کو
اپنے گھر کے اندر بھر لے
اور
تمہارا سوکھا سایہ
تم کو یوں دکھلائے ـــــ جیسے
دل کے آئینہ میں خود کو دیکھ رہا ہو ۔

حنیف کیفی

فشارِ حیات

وہ گھٹ گھٹ کے ایک روز مر بھی جائے گی
مگر ـــــ
کسی کو یہ خیال تک نہ آئے گا
کہ ایک مورِ ناتواں
دبی ہوئی تھی کیسے کیسے بوجھ کے تلے
پہاڑ تو اٹل رہے
مگر وہ مورِ ناتواں
حیات کے فشار سے
سسک سسک کے مر گئی

رشتوں کا سفر

راہ رشتوں کے سفر کی کس قدر دشوار تھی ۔
جیسے کوئی پل صراط
قربتوں کے سنگ میل
امتیازات وآں کی گرد میں کھوئے ہوئے
اک اندھیرا ـــــ ایک صحرا ـــــ اک خلیج
رہرو دل کا نصیب
قربتوں کے نقش دھندلائے گئے
فاصلے بڑھتے گئے ـــــ بڑھتے گئے ـــــ بڑھتے گئے

یوسف جمال

شخصیت پر مری دو چار مقالے دینا
ایک فن کار ہوں شہرت کے اجالے دینا

زیر کرنا ہو تو رکھو یہ غزل پیش نظر
بحث میں تم مرے شعروں کے حوالے دینا

دیکھنا میں اسے پی جاؤں گا امرت کی طرح
بے تامل مجھے، تم زہر کے پیالے دینا

وہ جو سوغات مرے نام سے مانگے کوئی
اسے کرنوں کے چمکتے ہوئے ہالے دینا

اس کی دشنام طرازی پہ رہوں میں خاموش
نطق سجتا ہے تو پھر ضبط کے تالے دینا

دیکھتے دیکھتے یہ معرکہ سر کر لوں گا
شرط یہ ہے کہ مجھے چند جیالے دینا

جس سے دل مردہ ہو وہ رزق نہ دینا مجھ کو
روح بالیدہ ہو جس سے وہ نوالے دینا

اے خدا تو نے بنایا جو قلم کار مجھے
قدر داں فن کے ہوں وہ چاہنے والے دینا

ساتھ اس کے میں تجھے اسلئے کرتا ہوں جمال
چال بہکے تو ذرا اس کو سنبھالے دینا

شمس تبریزی

رات جب رنگ اپنا جمانے لگی!
زندگی پھر اسے منہ چڑھانے لگی!

کوئی کہتا تھا اب نیند کے واسطے
گولیاں خواب آور وہ کھانے لگی

جب سے میں نے اسے کہہ دیا چاندنی
تب سے پلکوں پہ سپنے سجانے لگی

کون اس افراتفری میں پہچانتا
گرد منزل کا رستہ بتانے لگی

پیڑ پیپل کا چوپال، کچی سڑک
یاد گزرے دنوں کی ستانے لگی

کون جانے شجر پہ ہے کیسا دھواں
کس کی سازش شجر کو جلانے لگی

فرحت شہزاد (کینیڈا)

کیسا شام ہے کہ زخم گل تر لگے مجھے
اور لمس تیری یاد کا نشتر لگے مجھے

مشکل پسندیاں یوں طبیعت میں رچ گئیں
کانٹوں کی سیج پہلو کے دلبر لگے مجھے

ویران ہو رہی ہو کسی کا بھی زندگی !!
تخریب اپنی ذات کے اندر لگے مجھے

شاید شکست ایسے ہی لمحے کا نام ہے
اب وقت اپنے ہاتھ سے باہر لگے مجھے

ویرانیاں بسی ہیں یوں نس نس میں ان دنوں
گلشن، گلوں کی رت میں مرا گھر لگے مجھے

جس کو سمیٹنے میں گزاری ہے زندگی
بکھرا ہوا سا آج وہ پیکر لگے مجھے!

سقراط کہ حسینؓ یا شہزاد و کوہکن
ہر دل کے پار ایک ہی خنجر لگے مجھے

ایم۔ اے۔ ضیاء

جھوٹ بے معنی ہے سچ بھی پر اثر ہوتی نہیں
اجنبی کی بات شاید معتبر ہوتی نہیں

شخصیت کا تجزیہ نظریں کریں ممکن نہیں
ہر نظر اٹھتی ہے جو صاحب نظر ہوتی نہیں

رات کا ہر ایک لمحہ ہے سمندر کی طرح
شام گذری شب گذرتی ہے سحر ہوتی نہیں

جس مکاں میں جو بھی جانے جب بھی چاہے گھس پڑے
اس مکاں کی چھت کسی دیوار پر ہوتی نہیں

پیچ خم جیسے پہاڑی راستوں کے سلسلے
زندگی کتنی آسان لگتی تو مگر ہوتی نہیں

فاصلوں کی اب خبر منٹوں میں پا لیتے ہیں گو
حادثہ یہ ہے پڑوسی کی خبر ہوتی نہیں

چاندنی کے کیف سے واقف نہ ہوتے تم اگر
چلچلاتی دھوپ کی گرد و سفر ہوتی نہیں

شہاب الدین ثاقب

کب سنانے کے لئے اوروں کو اپنا غم گئے
ہم وہ خود سر تھے کہ در پہ دوسروں کے کم گئے

اب کہاں یادوں کی خوشبو، اب کہاں جاکے بہت سے پھول
پھر کبھی واپس نہ آئے جب سے وہ موسم گئے

کچھ دنوں پہلے تھا موسم ہجر کا برسات تھی!
کیا ہرا ہے دل! آہ اب اشکوں کے بادل تھم گئے

ذکر میرے غم کا جب اس بزم میں چھیڑا گیا
سننے والے جتنے تھے سب لیکے چشم نم گئے

وقت کے سورج کی کرنوں سے بھی وہ پگھلے نہیں
برف کی چٹانوں میں کچھ لوگ ایسے جم گئے!

شفیع اللہ خاں راز

رات بھر جاگتا رہا برگد
دھوپ نکلی تو سوگیا برگد

دفعتاً سرخ ہوگئیں شاخیں
دیر تک خون روئے گا برگد

جانے کیا کہہ دیا ہواؤں نے
جھوم کر مست ہوگیا برگد

موت کی نیند سو نہ جائیں پرند
اس لئے جاگتا رہا برگد

جس کی تصویر تم نے کھینچی تھی
غالباً وہ یہیں پہ تھا برگد

جس کی چھاؤں میں زندگی گذری
کیا بتائیں وہ کیا ہوا برگد

ڈالی ڈالی پہ جال پھیلا ہے
جان لیوا ہے خوش نما برگد

راز شاخوں میں ناگ لپٹے ہیں
ہوشیار ان سے توڑنا برگد!

نذیر فتح پوری

کھینچی سمندروں نے مری آس کی لکیر!
ہونٹوں پہ پھر بھی پھیل گئی پیاس کی لکیر

اک دن کھنگال آؤں گا میں بھی دشاؤں کو
میری ہتھیلیوں میں ہے بن باس کی لکیر

خونِ جگر سے مانگ ستاروں کی کیا بھریں
اتری ہوئی لہو میں ہو جب یاس کی لکیر

سانپوں نے کر لیا ہے بدن کا محاصرہ
لپٹی ہوئی ہے روح سے الماس کی لکیر

کون و مکاں سے جسم کا پھر واسطہ ہی کیا
جب ٹوٹ جائے ذہن سے احساس کی لکیر

تھے جس سے میرے اول و آخر کے رابطے
خوں میں ہی توڑ آیا وہ اتہاس کی لکیر

کنجِ قفس میں رکھ کے مجھے مطمئن نذیر
تنہائیوں نے کاٹ دی ہر آس کی لکیر

باقی غازی پوری

پیڑ سے پھل تو کم گرا لوگو!
پیڑ زخمی بہت ہوا لوگو!

ہائے رے انقلاب موسم کا
پھول کانٹوں پہ ہنس پڑا لوگو!

جانے وہ مسکرا سکا کہ نہیں
میں تو جی بھر کے رو چکا لوگو!

آگ سی کیوں لگی ہے گلشن میں
ہے تو موسم بہار کا لوگو!

کٹ گئی اپنی رات آنکھوں میں
وہ بھی شاید نہ سو سکا لوگو!

سوکھے پتے چمن میں رہ نہ سکے
کس قدر تیز تھی ہوا لوگو!

تھیں تعاقب میں تو نگاہیں بہت
میں ہی تنہا نہ مل سکا لوگو!

جلتی پھرتی سی لاش ہے باقی
تم نے اس وقت سچ کہا لوگو!

خورشید طلب

اونگھتے سناٹے میں گھر گھر دیکھ لے
شام سے پہلے یہاں تو شب کا منظر دیکھ لے

دن بدن صحرا بن جاتی ہے یہ ساری زمیں
آسماں پہ بس گئے جا کے سمندر دیکھ لے

حرف کی کشتی ابھی کاغذ کے ساحل سے ہے دور
تو کہیں لہروں کی تحریریں سنا کر دیکھ لے

انسیت ہو جائے گی خانہ بدوشوں سے تجھے
زندگی میں کاش تو بھی ہو کے بے گھر دیکھ لے

ڈھونڈھتا ہوں جس کی پرچھائیں حقیقت میں بہت
وہ کبھی تو خواب ہی میں آ مجھ کو آکر دیکھ لے

سال بیتا، اس کی تاریخیں پرانی ہو گئیں
تو بھی آئینے میں فرسودہ کلینڈر دیکھ لے

ہر قدم پہ قہقہوں میں تو مرے شامل رہا
خامشی کا قہر اب ٹوٹا ہے مجھ پر دیکھ لے

پیاس کا اظہار اپنے ہونٹ سے ہونے نہ دے
سانس جب گھٹنے لگے صحرا، سمندر دیکھ لے

منبر پیڑوں پہ ہی کیوں تیری نگاہیں جم گئیں
زرد پتے بھی یہیں ہوں گے کہیں پر دیکھ لے

توتلی آواز اب لہجہ بدلنے ہی کو ہے!
اس کا قد بھی ہو گیا تیرے برابر دیکھ لے

خورشید سحر

کیا جانے کیا ہوا کہ وہ روپوش ہو گیا
دو دن میں زندگی سے سبکدوش ہو گیا

ہر شخص اپنے آپ کا تنہا گواہ تھا
یہ کیا ہوا کہ ہر کوئی خاموش ہو گیا

آخر زمیں کو چھوڑ کر جاتے بھی ہم کہاں
اک آسماں تھا وہ بھی سیہ پوش ہو گیا

بچوں کے شور سے ہمیں نفرت نہیں مگر
ہنگامہ وہ بڑھا کہ گراں گوش ہو گیا

وہم و گماں کی خاک میں اسکو نہ ڈھونڈیے
وہ لمحۂ یقیں تو روپوش ہو گیا

دلدار دل کی اپنی حفاظت وہ کیوں کرے
رشتوں کا بوجھ جب کہ سبکدوش ہو گیا

روشن پٹیالوی

آرزو دل میں پہلو بدلتی رہی!
زندگی غم کے سانچے میں ڈھلتی رہی

راس آئی نہ اسکو کوئی بھی فضا
زندگی لاکھ پہلو بدلتی رہی

اس پہ سایہ ہمیشہ خزاں کا رہا
شاخ امید کی پھر بھی پھلتی رہی

لوگ سنتے رہے شوق سے داستاں
نیند آتی گئی، بات چلتی رہی

ان سے ملنے کی حسرت رہی عمر بھر
آگ فرقت کی سینے میں جلتی رہی

دل میں امید کے پھول کھلتے رہے
جس سے میری طبیعت بہلتی رہی

زندگی اپنی یوں ہی بسر ہو گئی
دن گزرتا گیا رات ڈھلتی رہی

سخت جاں اس قدر ہے یہ بیمارِ غم
آ کے سر پر اجل اس کے ٹلتی رہی

میں رہا راہِ الفت میں ثابت قدم!
لاکھ بادِ مخالف بھی چلتی رہی!

ضبط کرتا گیا، ضبط ہوتا رہا
آہ! آنے کو کب تک مچلتی رہی

ان کا دیدار حاصل نہیں ہو سکا
دل میں امید لیکن مچلتی رہی

آگ الفت کی روشن ہوئی تیز تر
زندگی میری دن رات جلتی رہی!

شجاع خاور

ہم اپنے نظریات کو ٹھکرائے ہوئے ہیں
وہ ہم کو اسی بات پہ اپنائے ہوئے ہیں

تنہائی کا اک اور مزہ لوٹ رہا ہوں
مہمان مرے گھر میں بہت آئے ہوئے ہیں

میں نے ابھی ان پر کوئی تنقید نہیں کی
کچھ دوست اسی بات پہ گھبرائے ہوئے ہیں

سر دھنتے ہیں اخبار کو پڑھ پڑھ کے یہاں لوگ
یعنی ادب و شعر سے اکتائے ہوئے ہیں

کیا رکھا ہے اس حلقۂ احباب میں لیکن
ہم تم سے نہ ملنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں

تبصرہ

نام کتاب : اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم
نام مصنف : ڈاکٹر حنیف کیفی
سائز : $\frac{22 \times 18}{8}$
ضخامت : چھ سو صفحات
قیمت : ساٹھ روپے
پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی
مبصر : ڈاکٹر مغنی تبسم

ڈاکٹر حنیف کیفی نے گذشتہ چند برسوں میں اپنی تصانیف اور مضامین کے ذریعہ اردو دنیا میں ایک معتبر محقق اور سلجھے ہوئے نقاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی ہے۔ زیر نظر کتاب ڈاکٹر حنیف کیفی کا مقالہ ہے جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ ایک اچھا محقق اور نقاد بننے کے لئے صاحب ذوق ہونا اولین شرط ہے۔ جو شخص شعر و ادب کا مذاق صحیح نہ رکھتا ہو وہ تحقیق و تنقید کے میدان میں کوئی قابل قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ حنیف کیفی اس شرط کو بدرجہ احسن پورا کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو شعر و ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ مغربی ادب سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ عروض و بلاغت اور بدیع پر انہیں مکمل دسترس حاصل ہے۔ جس کے بغیر اس مقالے کے موضوع سے انصاف کرنا ممکن نہ تھا۔

اردو میں معرّی اور آزاد نظم نگاری پر بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ کنول کرشن مالی نے آزاد نظم پر ایک مختصر کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کے باوجود معرّا نظم اور آزاد نظم کے سانچوں اور فن کے تعلق سے بہت سے مسائل مزید تحقیق و تفتیش کے محتاج رہے۔ اردو میں ان سانچوں کے اختراع اور ارتقا کے بارے میں بھی کافی اختلاف رائے رہا ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی نے نہایت تحقیق اور غور و فکر کے ساتھ ان مسائل کا جائزہ لیا ہے اور بہت سے امور کی یکسوئی کردی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بعض نئے مباحث اٹھائے ہیں۔ جن سے غور و فکر کی راہیں کھلتی ہیں۔

کتاب کے پہلے باب میں اردو شاعری پر انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن کی وجہ سے اردو میں جدید نظم نگاری کی تحریک شروع ہوئی اور نئی اصناف شاعری کا رواج شروع ہوا۔ ان کے علاوہ ہندی اور سنسکرت کے اثرات اور ان سے ماخوذ شعری اصناف سے بھی بحث کی ہے اس سلسلے میں انھوں نے اسٹانزا فارم، [illegible] اردو گیت، اور گیت نما نظموں اور ادب لطیف کا جائزہ لیا ہے۔ یہ باب نہایت معلومات آفریں ہے۔

بعد کے ابواب میں انھوں نے نظم معرّا اور نظم آزاد کی ساخت اور تکنیک سے بحث کی ہے۔ اور ان کے اصول و لوازم کا تعین کیا ہے۔ ایک مستقل باب انگریزی بلینک ورس کے بارے میں ہے۔ اردو میں نظم معرّا اور نظم آزاد کے آغاز و ارتقا کا جائزہ الگ الگ ابواب میں تفصیل کے ساتھ لیا گیا ہے۔ اور مصنف نے تمام

زوری مواد نہ صرف سلیقے کے ساتھ یکجا کر دیا ہے بلکہ ن کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر حنیف کیفی نے آزاد نظم میں داخلی آہنگ ور خارجی آہنگ کے توافق پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے وضع کردہ قانون کی تائید کرتے ہوئے انھوں نے ایک ہی بحر کے ارکان کی کمی بیشی پر اصرار کیا ہے جو نامناسب ہے۔ آزاد نظم کے تجربے کی ضرورت اس لئے تھی کہ ارکان بحر کی تکرار سے پیدا ہونے والے روایتی غنائی آہنگ کی یکسانیت پیچیدہ تجربوں کے صوتی اظہار میں رکاوٹ حائل کرتی ہے۔ اصل مقصد اس روایتی آہنگ کی گرفت سے رہائی حاصل کرنا تھا تاکہ داخلی واردات اور تجربوں اور ان کے صوتی ابلاغ میں دوئی نہ رہے۔ نام نہاد آزاد نظم نگاروں نے ارکان بحر کی پابندی اور بحروں کے محدود انتخاب کے ذریعہ اس مقصد کو کھو دیا۔ بحروں سے منسلک رہتے ہوئے بھی آہنگ کے بے شمار تجربوں کی گنجائش تھی جس کا کم ہی استحصال کیا گیا۔ ڈاکٹر حنیف کیفی نے شمس الرحمٰن فاروقی کی اس تجویز سے اختلاف کیا ہے۔ کہ ایک دو افاعیل کی باقاعدہ تکرار ہی سے نظموں کا ڈھانچہ تیار کرنے کے بجائے اس بحر کے زحافات کو بھی کام میں لانا چاہیئے۔ علاوہ ازیں ایک ہی نظم میں مختلف بحریں استعمال کرنے کی بھی انھوں نے رائے دی ہے۔ جس سے حنیف کیفی متفق نہیں ہیں۔ ان کو اندیشہ ہے کہ اس کی وجہ سے آہنگ بگڑ جائیگا اور نظم ایک میکانکی عمل ہو کر رہ جائے گی۔ یہ اندیشہ درست نہیں ہے۔ شاعر اگر اچھا صناع ہو تو وہ زحافات کا استعمال اس انداز سے کرے گا کہ آہنگ بگڑے گا نہیں۔ بلکہ ایک خوشگوار تنوع پیدا ہو جائے گا۔ ایک سے زیادہ بحروں کے استعمال کی گنجائش خود ہمارے عروضی نظام ہی نکل آتی ہے۔ ایک دائرے سے تعلق رکھنے والی بحریں چھوٹے اور طویل معمولوں کی مخصوص ترتیب سے بننے والی زنجیر کا حصہ ہوتی ہیں۔ ان بحروں کی باہم تبدیلی اور امتزاج سے آہنگ کے نئے اور خوشگوار تجربے کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہزج اور رمل کو بآسانی ایک دوسرے میں مدغم کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر حنیف کیفی نے اس تنازع کو حل کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ نظم آزاد کا موجد کون ہے۔ شرر نے بحر کی پابندی کے ساتھ جو منظوم "ڈراما" "فتح اندلس" لکھا تھا، ڈاکٹر گیان چند نے اسے آزاد نظم قرار دیا ہے ڈاکٹر حنیف کیفی کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ اسے نظم معریٰ کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف مکالموں کو ملاکر پڑھیں تو مصرعے مکمل ہو جاتے ہیں۔ لیکن مختلف کرداروں کے مکالموں کو ملاکر پڑھا جائے تو ڈرامائیت باقی نہیں رہے گی۔ اور جب ہر مکالمہ جداگانہ لہجے میں ادا کیا جائیگا تو نظم کی بحر کا روایتی آہنگ برقرار نہیں رہے گا۔ اس اعتبار سے "فتح اندلس" کے سکیچ کو آزاد نظم ہی کہنا مناسب ہوگا۔ اس بنا پر نظم آزاد کی ایجاد کا سہرا شرر ہی کے سر جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس تجربے کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ تا آں کہ تصدق حسین، خالد، ن م راشد، اور میراجی نے اس صنف کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

اب رہا یہ سوال کہ آزاد نظم کے تجربے کی تجدید اور احیا کس نے کی۔ ڈاکٹر حنیف کیفی نے یہ شہادت فراہم کی ہے کہ تصدق حسین خالد نے ۱۹۲۵ء میں آزاد نظمیں کہی تھیں جبکہ ن، م راشد کی پہلی آزاد نظم ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس لئے ان کے خیال میں اولیت خالد کو حاصل ہے خالد کی نظموں کا مجموعہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ یہ پتا

امیر حیدر ملک ادبی ایوارڈ

کیلئے

کتابیں جمع کرنے کی تاریخ میں توسیع

دی کلچرل اکیڈمی گیا نے امیر حیدر ملک ادبی ایوارڈ کے لئے کتابیں جمع کرنے کی آخری تاریخ ۳۱ اگست ۸۳ء سے بڑھا کر ۳۰ ستمبر ۸۳ء کر دی ہے لہٰذا مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ ۳۰ ستمبر ۸۳ء تک کتابیں جمع ہوں گی۔

شرائط:-

(۱) ہر تصنیف مطبوعہ ۸۲ء کی پانچ جلدیں داخل کی جائیں گی

(۲) کتابوں کے ساتھ مصنف کے دستخط سے ایک خط اکیڈمی کے نام ہونا ضروری ہے جس میں واضح طور پر یہ تحریر کیا ہو کہ کتابیں وہ خود داخل کر رہا ہے اور اسے اکیڈمی کے فیصلہ کا ہر حال میں منظور ہوگا۔

(۳) ہر تصنیف (مطبوعہ ۸۲ء) کی پانچ جلدیں ۳۰ ستمبر ۸۳ء تک دفتر اکیڈمی میں چیئرمین کے نام پہونچ جائے۔

(۴) انعام یافتہ کتابیں بھی داخل کی جاسکتی ہیں۔ انعام نقد کی شکل میں دیا جائے گا۔

چیئرمین

دی کلچرل اکیڈمی جگجیون روڈ گیا

ماہنامہ آہنگ میں شائع شدہ تخلیقات کا گوشوارہ

مرتبہ:

ڈاکٹر محمد مثنیٰ

سال ۱۹۷۳ء

شمارہ	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
۲ ۳ تا ۴ جون	احتشام حسین نمبر	مرتبین	کلام حیدری، وہاب اشرفی، احمد یوسف، پرکاش فکری اور تاج انور
	احتشام حسین اور تنقید	اختر اورینوی	احتشام حسین کی تنقید نگاری پر [illegible] میں
	احتشام حسین کا ذہنی تجزیہ	ڈاکٹر اعجاز حسین	
	احتشام حسین کا تنقیدی رویہ	ڈاکٹر وہاب اشرفی	
	احتشام حسین اور عملی تنقید	عبد المغنی	
	احتشام حسین اور نئی نسل	عبد المغنی	
	احتشام حسین انسان اور نقاد	ہنس راج رہبر	
	ایک نظریہ ساز ناقد احتشام حسین	نظام صدیقی	
	مارکسی تنقید اور احتشام حسین	ظہیر صدیقی	
	احتشام حسین کا رویہ جدید نسل کے ساتھ	مظہر امام	
	پروفیسر احتشام حسین کا اسلوب تنقید	قمر اعظم ہاشمی	
	اردو تنقید میں احتشام حسین کی قدر و قیمت	ڈاکٹر محمد مثنیٰ	

شمارہ	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
	احتشام حسین کے افسانے	احمد یوسف	احتشام حسین کی تنقید نگاری پر مضامین
	ساحل اور سمندر ایک مطالعہ	قیصر شمیم	
	مارکسی نظریۂ شعور اور احتشام حسین	ایم اے ضیا	
	احتشام حسین ایک نقاد	تاج پیامی	
شخصیت			
	آبروئے زبان و ادب احتشام حسین	کوثر چاندپوری	احتشام حسین کی شخصیت پر مضامین
	احتشام صاحب	سید محمد عقیل	
	احتشام بھائی	شکیلہ اختر	
	احتشام صاحب چند یادیں، ملاقاتیں باتیں۔	عبدالقوی دسنوی	
	دور کا آئینہ	شمیم احمد	
	آؤ آئینۂ دل میں دیکھیں تمہیں !	ابن فرید	
	والد صاحب گھر میں	جعفر عسکری	
	احتشام حسین کی ہمہ گیر شخصیت	رحمٰن حمیدی	
روشنی کے نقطے :-			
	سفر روس کی ڈائری کا پہلا ورق	احتشام حسین	احتشام حسین کی تحریریں، غزلیں، نظمیں
	فن کار کی آزادی کا مفہوم	"	
	آخری تحریر	"	
	غزلیں	"	
	نظمیں	"	
	خطوط بنام کلام حیدری	"	
	خطوط بنام سلام مچھلی شہری	"	
	نگارشات احتشام	عبدالقوی دسنوی	احتشام حسین کی نگارشات کی فہرست
گلہائے عقیدت			
	آہ ! احتشام صاحب	جمیل مظہری	جذبۂ عقیدت سے معمور شعری تخلیقات

شمارہ	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
	مری نگاہ میں زندہ ہے احتشام ابھی	علی جواد زیدی	
	ٹوٹے شیشوں کا مسیحا احتشام	نصر قریشی	
	آغاز سفر	جعفر عسکری	
	چراغ انجمن	"	
	اے قلم سوگ منا	سیف سہسرامی	
	وہ!	"	
	کیسی آس	"	
متفرقات			
	رپورتاژ	احمد یوسف	حلقۂ ادب کا دو روزہ ادبی اجلاس منعقدہ ۲۱ اور ۲۲ اپریل ۷۳ء بیاد گار احتشام حسین
		سال ۱۹۷۴ء	
۴۲/۴۳	نہ کوئی لطف سماعت نہ کوئی لذت دید	احمد یوسف	مظہر امام کے ساتھ بیتے ہوئے دنوں کا تفصیلی بیان
	ادب اور اخلاقیات	قیصر ضحیٰ عالم	ادب سے مذہب اور اخلاقیات کے تعلق پر باتیں
	جسموں کا بن باس		
	جسموں کا بن باس۔ ایک جائزہ	منصور سبزواری	ناصر کاظمی کی شاعری کا مطالعہ
۴۴	جدیدیت اور ناجدیدیت	نظام صدیقی	جدیدیت کا صحیح تصور
۴۵/۴۶	عزیز احمد کی ناول نگاری	شمیم اختر قمر	عزیز احمد کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ
۴۷/۴۸	ادب اور عقیدہ	نرمل ورما/سعادت شمیم	ادب میں عقیدے کی اہمیت۔
۴۹/۵۰	نئے کلاسک پر ایک تنقیدی تبصرہ!	عبدالمغنی	جدید فنکاروں کا انتخاب "نئے کلاسک" کا تنقیدی مطالعہ۔

جلد ۲ بعنوان مسعود شاد سے شمس کی شگفتگیاں

شمارہ	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
	اردو شعر میں حافظ کا اثر	سید نہال اختر	حافظ شیرازی کی شاعری کا اردو شاعری پر اثر
	سفینۂ زرگل ایک جائزہ	جمیل ظہیر	فضا ابن فیضی کی شاعری کا مطالعہ "سفینۂ زرگل" کی روشنی میں۔
۵۱	جدید یوروپی ادب کے نئے زاویے	نظام صدیقی	یورپ کے جدید ادبی رجحانات کا تنقیدی مطالعہ
	نئے کلاسک پر ایک تنقیدی تبصرہ - ۲	عبدالمغنی	جدید فنکاروں کا انتخاب "نئے کلاسک" کا تنقیدی مطالعہ
	پطرس اور مرحوم کی یاد میں	احمد یوسف	پطرس کے فن کی قدر و قیمت کا تعین۔
۵۲	اردو کے چند البیلے افسانے	وزیر آغا	اردو کے بعض اہم افسانوں کا تنقیدی مطالعہ
	جوگندر پال کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر وہاب اشرفی	جوگندر پال کی افسانہ نگاری کا جائزہ
۵۴/۵۳	جدید شاعری کے چند نئے موضوعات	اسلم عمادی	نئی شاعری کے نئے موضوعات کی جھلکیں
	شاد عارفی کی شاعری کا انفرادی پہلو	مظہر امام	شاد عارفی کی شاعرانہ انفرادیت

افسانے

شمارہ	افسانے	مصنف	شمارہ	افسانے	مصنف
۴۳/۴۴	مٹی شیش محل	جاوید نہال	۴۴	صداؤں سے بنا آدمی	انور خاں
	سوکھی ٹھٹھری ندی	شبیر احمد		ترمیم شدہ اکٹوپس	انیس رفیع
	آدھا چاند پورا چاند	ابواللیث جاوید		آخری لمحہ، پہلا قدم	قیصر رضا
	اعتراف	سلام بن رزاق		لو دہ لیتے	نیناگورا / الیار محمد مثنیٰ
	خالی بوتل	ڈاکٹر نرنیش			
۴۴	دشمن	شکیلہ اختر	۴۶/۴۵	سیاہ، سفید، سرخ	اختر اورینوی
				ماں کی موت	اندرا من رائے

شمارہ	افسانے	مصنف
۴۶/۴۵	بازی گر کا دوسرا سفر	شفق
	باردار	علی امام
	دوسرا، دھند میں کوئی رہ گزر کا۔	حسین الحق
	بالشت بھر رات	اظہار الاسلام
	بے وقوف	نشاط الایمان
	سمندر کیا کہتا ہے؟	عبدالصمد
۴۸/۴۷	بہت جانی پہچانی راہیں	احمد یوسف
	اس کے روز و شب	غیاث احمد گدی
	سچے لوگ	اندرا سین رائے
	ویرانہ	اے خیام
	چاندی کی گھنٹیاں	ڈاکٹر نرشل
۵۰/۴۹	کوئی پکڑو	جوگندر پال
	میں گوتم ہوں	عشرت ظہیر
	ڈوبتے سورج کا کرب	عابد ضمیر
	ہکر، پکھر ملبہ بیکاشم	ونشنکر واس گپتا / اظہار الاسلام
۵۱	خوبصورت سینڈل	لوکیش کمار
	اندھیرے میں چلتے ہوئے	شانتا سنہا
	پرانا افسانہ نمبر ایک	قاضی نور الاسلام
	بابو	سلام حیدری
	سلگتے لمحوں کا منظر	ایبا اہر ظہر گ / سادات شمیم

شمارہ	افسانے	مصنف
		[redacted]
۵۲	آگیا بیتال	الطاف فاطمہ
	آزاد بستی	شفق
	مستثنیات - ۱	ابرار الحسن
۵۴/۵۳	مستثنیات - ۲	ابرار الحسن
	ایک بات	نظام صدیقی
	ایسا ہوا	عبدالمتین
	ایک اور ایک - ایک	عبدالصمد

نظم

شمارہ	نظم	مصنف
۴۳/۴۲	میں کی تلاش	وحید اختر
	استبداد	حق اعظمی
	لو	اکرام باگ
	اندر کے آدمی کی التجا	احمد اعجاز
	مگر خوف سے لوٹ جانے کا حاصل ہی کیا ہے	"
	چار مختصر نظمیں	کرشن موہن
	میرے لوگ	طلاگیس / ظہیر صدیقی
	مجھلا	کبیر الاسلام / رونق نعیم
	دو نظمیں	" / "
	ممتاز کی صبح کے لئے	" / "
	پانچ نظمیں	اسعد بدایونی / خلیل تنویر

شمارہ	نظم	مصنف
۴۴	لہو لہو نظمیں	ہلال جعفری
	چھ نظمیں	صادق
	وندانہ	شہاب جعفری
۴۵/۴۶	لہو لہو نظمیں	ہلال جعفری
	آگ پھول اور گیت	شاہد اختر
	حباب سے بھرے منظر	اکرام باگ
	ہجر	"
	پانچ مختصر نظمیں	خلیل تنویر
	قطعات	نازش انصاری
	قتل کی رات کا آخری بیان	انیس لیتائی / ندیم گویائی
	آخری لفظ	انیس لیتائی / ندیم گویائی
۴۷/۴۸	جمود	اختر پیامی
	اے نگار وطن	"
	قطعہ	"
	گنگ و جمن	"
	احمد آباد	بمل کرشن اشک
	جشن دن	حمید الماس
	رائیگاں	اکرام باگ
	روزن	"
	ایک عجیب رات	صلاح الدین پرویز
	نیک دل لڑکی کے نام	"
	سفر	"

شمارہ	نظم	مصنف
	دو نظمیں	عبدالرؤف
۴۹/۵۰	دیوداسی	صلاح الدین پرویز
	ایک منظر	"
	کالا گورا	"
	دائرہ، نقطہ اور صفر	رونق نعیم
	صبح آئے کہ شب	اکرام باگ
	خدا کوئی ہنسی ہے	فخر زمنری
	دھیرج رکھو	اختر یوسف
۵۱	وش کنیا	ندیم گویائی
	نامرد آسمان	"
	تین مختصر نظمیں	رؤف صادق
	مدھر چندر	عابدہ احمد
	نور جل	صلاح الدین پرویز
	اترے ہوئے پراہن	احمد اعجاز
	تمہارے ہی عطیات ہیں سب	"
۵۲	ایک عظیم المرتبت ہے	صلاح الدین پرویز
	انت آغاز انت	"
	بت پرست	خلیل تنویر
	رتضاد	"
	سڑکوں سے تلوؤں کا رشتہ	عقیل شاداب
	اتنا سارا زہر	رونق نعیم
	بے نام دلوں کی ایک نظم	اختر یوسف

نمبر شمارہ	نظم	مصنف	شمارہ	مصنف	شمارہ	مصنف
۵۲	ایک نظم	غنی حیدر	۴۴	وحید اختر		دلکش اعظمی
	ایک نظم	عبدالمنان		مظفر حنفی		
	انتظار اور ابھی	سوہن راہی		فضا ابن فیضی	۴۹/۵۰	حسن نعیم
				ریب غوری		مظہر امام
۵۳/۵۴	اے میری انا جاگ	قتیل شفائی		یوسف جمال		سلطان اختر
	تین نظمیں	شاہین		چندر پرکاش شاد		مظفر حنفی
	میرا ایک شیلف خالی ہے	شاہد احمد شعیب		صفدر		نادم بلخی
	سوزش غم	ہارون رشید		فاروق شفق		ظہیر غازی پوری
	گھڑی کے الارم سے طلوع			جمنا پرشاد راہی		شمیم قاسمی
	ہری ہوئی بھول کا کرب	ظفر صہبائی		عقیل اعظمی		نصر قریشی
	ایبسٹرکٹ نظم	"		نظیر مظفر پوری		حسین الحق
	ایک لمحہ	شاہد ماہلی				فاروق شفق
	بدخواب اندھیروں کی جڑیں	اشہر ہاشمی	۴۵/۴۶	ممتاز راشد		معین تابش
	سوغات	سوہن راہی		شاہد کبیر		کرشن کمار طور
				احمد اعجاز		نسیم رحمانی
				رشید افروز		رئیس باغی
				صفدر		شاہ حسین
				معین تابش		جمنا پرشاد راہی
						احمد تنویر
			۴۷/۴۸	شمس الرحمن فاروقی		راہی قریشی
				حرمت الاکرام		حسن رضا
				لطف الرحمن		
				فضا ابن فیضی	۵۱	ندا فاضلی
				غلام مرتضی راہی		منصور سبزواری
				عبداللہ کمال		علقمہ شبلی

غزلیں

نمبر شمارہ	مصنف	نمبر شمارہ	مصنف
۴۲/۴۳	باقر مہدی		مشتاق جاوید
	حرمت الاکرام		جمنا پرشاد راہی
	عزیز قیسی		مان سنگھ خیال
	شہاب جعفری		فاروق راہب
	فضل تابش		قوس صدیقی
	سید احمد شمیم		

شمارہ	مصنف	شمارہ	مصنف
۵۱	جمنا پرشاد راہی پرکاش فکری پریم وار برٹنی حامد کاشمیری جعفر عسکری رشید نثار اسد بدایونی شمیم قاسمی رونق گیا	۵۴/۵۳	ذکی بلگرامی مظفر وارثی ماجد الباقری مظفر حنفی غلام مرتضیٰ راہی پرکاش فکری حق اعظمی یوسف اعظمی عبداللہ کمال انور ادیب فاروق شفق اقبال ماہر نصیر پرواز نصر قریشی ظہیر غازی پوری
۵۲	احمد ندیم قاسمی حسن نعیم فضا ابن فیضی شاہین اختر الاسلام عشرت ظفر		

تبصرے

شمارہ	تبصرہ	مبصر
۴۴	تیسرا جسم آواز کا رنگ	کلام حیدری کلام حیدری
۴۸/۴۷	امیج لاریب	شمس الرحمٰن فاروقی ڈاکٹر محمد مثنیٰ
۵۰/۴۹	اشعار آواز کا رنگ	شکیل الرحمٰن اعظمی کلام حیدری
۵۴/۵۳	نذر سجاد گناہ کا رشتہ دائرہ دائرہ	کلام حیدری کلام حیدری کلام حیدری

متفرقات

شمارہ	متفرقات	
۴۴	خصوصی پیش کش، ایک فن کار	حق اعظمی
۴۸/۴۷	کاغذ کی دمچی (ڈراما)	ابراہیم یوسف
۵۲	سجاد ظہیر (خاکہ) کاغذ کی دمچی (ڈراما)	فہمیدہ ریاض ابراہیم یوسف

P N. Regd 4[illegible]3/64
P T. Regd No. Gy. 7
Phone - 43[illegible]

THE AAHANG Urdu Monthly
BAIRAGI, G A Y A.

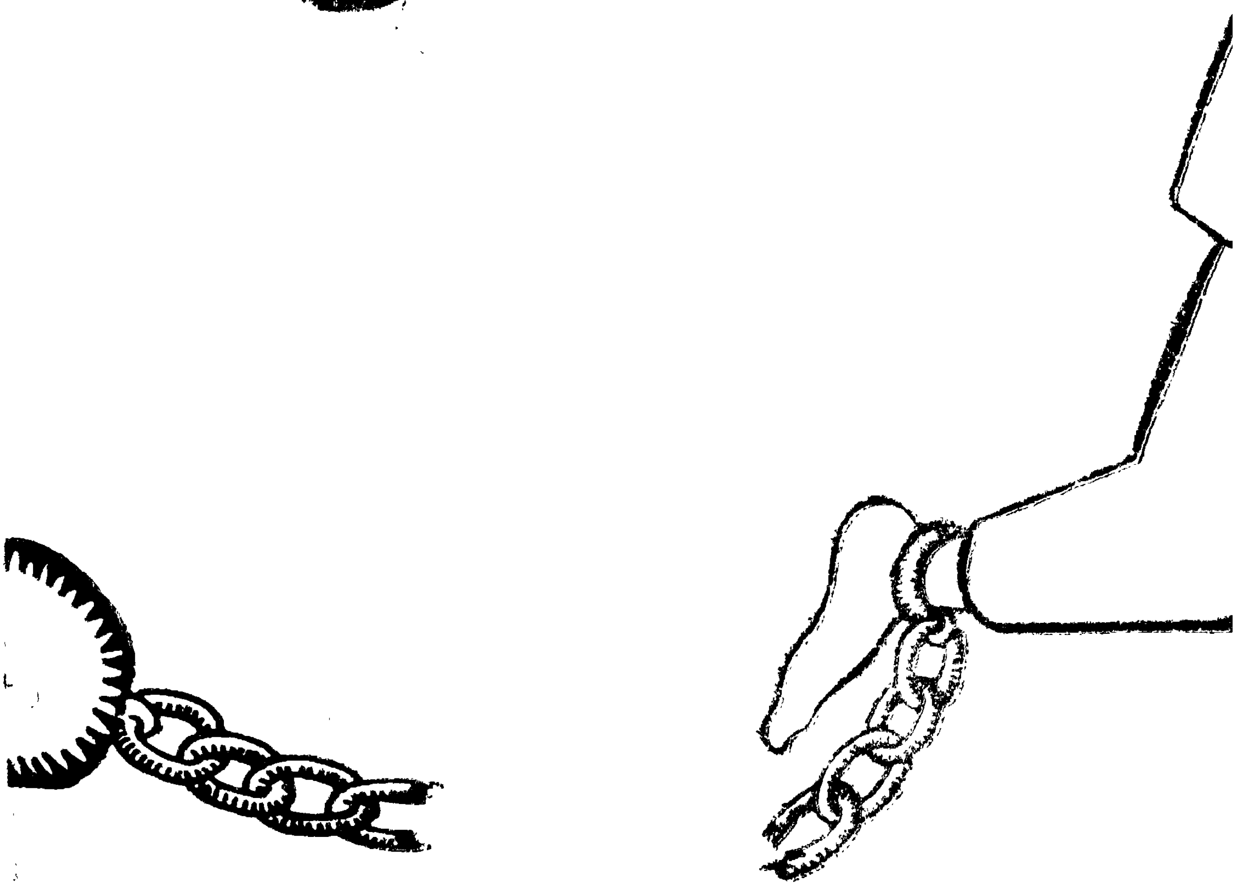
تفہیمات

تنقیدی مضامین

کلام حیدری

PRICE Rs 20

The Cultural Academy, Gaya.



October 1988

PRICE

Rs. 3/-

دی کلچرل اکیڈمی ریبنہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ سنہ ۱۹۶۴ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری:

بارہ شمارے ——— چھتیس روپے
ایک شمارہ ——— تین روپے

فون نمبر 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹرز
نوشابہ حق، عبدالصمد

محتویات

اداریہ

کشکول

بندھے ٹکے اصولوں کے تحت ادبی میدان میں قدم رکھنا عاقبت سنوار سکتا ہے مگر ادب کی دنیا میں یہ اصول پرستی جمود کہلاتی ہے اور تخلیقی تحریک، ابال اور جوش و خروش کو یہ اصول راس نہیں آتے۔

مثلاً ادبی رسالے کے تاج کے طور پر لکھ دیا کہ "ترقی پسند مصنفین کا ترجمان" یا یہ کہ "متوازن اور صالح ادب کا ترجمان" وغیرہ وغیرہ۔

ادب کے ساتھ ایجاب وقبول کے قواعد کے تحت زندگی بسر کرنے والے پرہیزگار لوگوں کا احترام، مگر ادب، مشکل یہ ہے کہ قواعد وضوابط سے زیادہ انکار، انحراف اور اجتہاد کی جانب کھینچتا بھی ہے اور کھنچتا بھی ہے۔ اس لئے تخلیقی ادب کو آداب و پابندیٔ رسوم و قیود کی فضا میں گھٹن محسوس ہوتی ہے اور اس کی طراری اور لپک ختم ہو جاتی ہے یا مرجھا جاتی ہے۔ یہ صورت حال پیدا نہ کی جائے اور تخلیقی محرکات کو فوجی قسم کے ڈسپلن کی بیڑیاں نہ پہنائی جائیں تو ادبی تخلیق نئے معیار بھی بناتی ہے۔ نئے جہان بھی دریافت کرتی ہے اور پرانی دنیا کی آرائش وزیبائش بھی اس قدر جذبی طور پر کرتی ہے کہ وہ نئی لگنے لگتی ہے۔

شاعری میں اُپج ہو۔ اُس سے سماج کو بدلنے کا کام لیا جائے اُس میں یہ ہو وہ ہو ——

افسانے میں پلاٹ ہو، ماجرا ہو، نقطۂ عروج ہو —— ہو بالکل ہو، ان تقاضوں پر کسے اعتراض ہوگا؟ مگر ان تقاضوں

کا ہم افسانے کو زندانی بنائیں کیا ؟

یہ سوال بڑا اہم ہے کیونکہ ادب ہر شئے کے لئے آزادی کا مطالبہ کرتا ہے وہ خود کو زندانی بنائے جانے پر آمادہ تو خیر کیا ہوگا ——— باغی ہوجائے گا ۔

ادب باغی نہیں ہوگا تو کشمیر کی مشہور "ڈل جھیل" سے زیادہ خوب صورت نہیں ہوسکتا ——— مگر ادب باغی ہوتا ہے تو سمندروں کی موج بن جاتا ہے بیکراں بن جاتا ہے اور اپنی تہہ میں خزانوں کے خزانے جمع کرتا رہتا ہے ———

"آب رواں" کے سوا کوئی پانی پاک نہیں ۔ ادب کو صنفی قواعد و ضوابط کے حصار میں قید کرنا اس کی روانی کو روک کر اسے ناپاک کرنے کے مترادف نہیں سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے ؟

——— کلام حیدری

انور سدید
(پاکستان)

اردو انشائیہ

انشائیہ اردو ادب کی نوخیز صنف اظہار ہے اگرچہ بعض محققین کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے حال ہی میں اس کے آثار اٹھارہویں صدی کی ادبی نثر میں بھی دریافت کرلئے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اردو ادب کی ایک الگ صنف کی حیثیت میں اس کی عمر بیس پچیس سال سے زیادہ نہیں۔ اس مختصر سے عرصے میں انشائیہ نے قارئین کا ایک شائستہ حلقہ پیدا کیا ہے۔ اور بعض موثر ناقدین کی توجہ اپنی طرف کھینچی ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس صنف ادب میں داخلی طور پر نمو کی قوت موجود ہے۔ اور یہ دائم زندگی کے حصول کے لئے پڑھنے والوں کے ساتھ رشتہ قائم کرکے اپنی جڑیں گہری زمین میں اتارتی جارہی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ادب کی بیشتر دوسری اصناف کی طرح انشائیہ بھی ایک درآمدی صنف ادب ہے۔ مغرب میں اس کی ابتدا مانتین اور بیکن سے منسوب کی جاتی ہے۔ لیکن انگریزی انشائیوں کے ایک مرتب آر۔ ڈبلیو۔ جیپسن کا خیال ہے کہ اس صنف کے پدری رشتے ایران ولونان کے قدیم ادیبوں میں بھی ملتے ہیں۔ اس اظہار سے جیپسن کا مقصد شاید یہ ہے کہ بعض قدیم اکابر ادب کی تحریروں میں جو خصوصیات بکھری ہوئی موجود ہیں جو بعد میں انشائیہ کے عناصر کا فطری مصدر قرار پائیں۔ تاہم اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انشائیہ صنف ادب کے طور پر ایران اور یونان قدیم میں موجود نہیں تھا۔ اور جن ادیبوں نے اولین طور پر انشائیہ کو انفرادی اظہار کا وسیلہ بنا کر اس کے بکھرے ہوئے صنفی عناصر کو جمع کیا ان میں مانتین اور بیکن کو فوقیت حاصل ہے۔

اردو ادب میں انشائیہ کی ابتدا کے بارے میں صورت حال اس سے مختلف نہیں ہے کچھ محققین نے اس کا سراغ پرانی نثر میں لگایا ہے۔ تو وہ اس حد تک حق بجانب ہیں کہ انھوں نے ان تحریروں میں انشائیہ کی بعض اساسی خصوصیات کو منتشر حالت میں پایا ہے۔ مثال کے طور پر میر امن کے اسلوب میں جو روح پرور شگفتگی ملتی ہے وہ انشائیہ کے مزاج کے ایک غالب عنصر سے مماثل ہے۔ میرزا غالب کے خطوط میں جو غیر رسمی انداز موجود ہے یہ انشائیہ کی بنیادی صفات میں سے ہے۔ سرسید نے واضح طور پر سپکیٹیٹر اور ٹیٹلر کو مثال بنایا اور بعض ایسے موضوعات پر اظہار خیال کیا جنھیں اس زمانے کا قاری یقیناً انوکھا تصور کرتا ہوگا۔ موضوع کا انوکھا پن انشائیہ کا لازمی جزو ہے۔ اسی قسم کے کچھ عناصر عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی حتیٰ کہ مولانا الطاف حسین حالی، پریم چند، نیاز فتح پوری، خلیقی دہلوی، اور راشد الخیری میں بھی تلاش کئے جاسکتے ہیں

لیکن جس طرح ان سب کی نثر کے انفرادی اوصاف مجتمع کرنے سے صنف انشائیہ کا مزاج مرتب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اس صنف کی کسی ایک روشن کرن کی موجودگی کی بدولت ان میں سے کسی ادیب کو انشائیہ کا موجد بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تحریر کی متذکرہ خصوصیت اس ادیب کے شخصی اسلوب کا امتیازی نشان ہے۔ اور صرف اس ایک خوبی کی بنا پر قیاس کرنا موزوں نہیں کہ وہ کسی نئی صنف کی ترویج میں شعوری یا لاشعوری طور پر شریک تھے۔ ان محققین کی دریافت دراصل اس الٹے عمل REVERSE ACTION کا نتیجہ ہے جو انشائیہ کے وجود میں آنے اور اس کی ایک مناسب تعریف وضع ہونے کے بعد شروع ہوا۔ چنانچہ ان محققین نے کمال خوبی سے پرانے ادیبوں کی تحریروں کی بعض خوبیوں کو انشائیہ کے فریم میں نصب کر کے اطمینان کا سانس لیا کہ انہوں نے ایک نئی صنف کی دریافت کا کارنامہ سر انجام دے لیا ہے۔ اگر اردو میں انشائیہ کی ابتدا دس پندرہ سال پرے جا پڑتی تو شاید بیچارے ادیب انشائیہ نگار ہونے کی سعادت سے آج بھی محروم ہوتے۔

اردو ادب میں انشائیہ کی کچھ اولین جھلکیاں فلک پیما میں نظر آتی ہیں۔ اور انھوں نے اپنی تخلیقات کا مجموعہ مضامین فلک پیما کے عنوان سے پیش کیا۔ تو میرا قیاس ہے کہ ان کے سامنے مضامین کا انگریزی ماڈل ہی ہوگا۔ اور انھوں نے لفظ ایسے ESSAYS ہی کو "مضامین" میں ڈھالا ہوگا۔ تاہم اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ فلک پیما کے مضامین میں بھی انشائیہ کا مزاج جزوی طور پر موجود ہے اور ان کے یہاں بھی اس صنف کے نقوش غیر مجتمع حالت میں ملتے ہیں۔ اور اسی لئے انشائیہ ایک مکمل وحدت کے طور پر فلک پیما کے مضامین سے بھی ابھر نہیں سکا۔ اردو میں جن ادیبوں نے انشائیہ کو ایک الگ صنف اظہار کے طور پر قبول کیا اور اسے بطور ایک مکمل وحدت کے پیش کرنے کی کوشش کی ان میں اولاً ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے بعد مشکور حسین یاد کے نام آتے ہیں۔ نظیر صدیقی کے بعد اس صنف میں، مشتاق قمر، جمیل آذر، اور غلام جیلانی اصغر سلیم آغا قزلباش، کامل القادری، راحت ابھی، پرویز عالم رام لعل نابھوی وغیرہ بھی شریک ہو گئے۔ کچھ اور لوگ مثلاً رضیہ، فصیح احمد، منصور قیصر، فرخندہ لودھی، اور اجمل نیازی وغیرہ نے بھی اس صنف میں اظہار کی کوشش کی ہے لیکن شاید انھوں نے ابھی انشائیہ کا مزاج اور اس کی مقتضیات کو صحیح طور پر نہیں پہچانا۔ اور شاید اسی لئے جب وہ انشائیہ لکھنے کی کاوش کرتے ہیں۔ تو ان کے اعصاب پر شدید بوجھ محسوس ہوتا ہے اور وہ طنز کے خار زار میں الجھ جاتے ہیں یا پھر خالص مزاح کی وادی میں کھو جاتے ہیں۔ انگریزی ادب کے برعکس جہاں انشائیہ کی تنقید بعض منتخب مجموعوں کے ابتدائیوں اور دیباچوں تک محدود ہے اردو ادب کی خوش قسمتی یہ ہے کہ جن لوگوں نے اولین انشائیے لکھے ان میں سے بیشتر نے اس کی تنقید اور وکالت کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ انشائیہ کی تعریف اور مزاج کے بارے میں ان ادیبوں کے نقطۂ نظر میں دلچسپ اختلاف موجود ہے۔ تاہم اس اختلاف کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس سے انشائیہ کی بحث کو آگے بڑھانے اور نئے سوالات اٹھانے کا موقع پیدا ہوا ___ اور قاری کو بعض بنیادی گتھیاں سلجھانے میں مدد ملی۔

انگریزی میں انشائیہ کی متبادل اصطلاح ایسے (ESSEY) ہے۔ مغربی ادب میں اس کی باقاعدہ

لے مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، جمیل آذر، مشتاق قمر وغیرہ۔

ابتدا سولہویں صدی میں ہوئی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی انشائیہ کا دورِ عروج شمار ہوتا ہے۔ اس طویل عرصے کے دوران کئی مرتبہ ایسے کی موت کا رسمی اعلان بھی ہو چکا ہے لیکن ققنس کی طرح اس صنف ادب نے ہمیشہ اپنے خاکستر سے دوبارہ جنم لیا ہے۔ چنانچہ جمود کے ایک دور کے بعد جب انشائیہ کے احیا کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تو نئے ادیبوں نے اس صنف کو اس طور استعمال کیا کہ پہلے اور دوسرے دور کے انشائیوں میں قدر مشترک تلاش کرنا مشکل ہو گیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مغرب میں ایسے کی کوئی بے لوچ RIGID تعریف ابھی تک وضع نہیں ہو سکی۔ اور ایسے کے جو مجموعے بازار میں دستیاب ہیں ان میں انکشاف ذات سے لے کر افسانہ، خاکہ، سوانح، تنقید، سیاست اور فلسفہ غرض کہ ہر موضوع پر مضامین شامل ملتے ہیں۔

اردو انشائیہ کی بحث بھی کچھ اسی انداز میں گڈمڈ ہوئی ہے انشائیہ کے اہم ترین نقاد ڈاکٹر وزیر آغا انشائیہ کو انگریزی ایسے کی اس نوع سے عبارت کرتے ہیں جسے (پرسنل ایسے) (PERSONAL ESSEY) کا عنوان دیا جاتا ہے چنانچہ وہ انشائیہ کو انکشاف ذات کا ذریعہ اور دیکھنے کا ایک تیکھا زاویہ تصور کرتے ہیں۔ اور شگفتہ بیانی کو اس کا قیمتی جز قرار دیتے ہیں۔ نظیر صدیقی کا خیال ہے کہ انگریزی ادب میں ایسے کی جو تعریف متعین کی جاتی ہے۔ وہ صرف پرسنل ایسے پر صادق آتی ہے۔ جبکہ انشائیہ کے مجموعوں میں بے شمار مضامین ملتے ہیں۔ جو اس تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ چنانچہ وہ ایسے اور پرسنل ایسے میں تخصیص پیدا کرنے کی خواہش کے باوجود اسے مزید وسعت دے کر طنزیہ، مزاحیہ، فلسفیانہ مضامین کی شمولیت کا جواز بھی پیدا کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ نظیر صدیقی شگفتگی کی اہمیت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ اسے انشائیہ کی بنیادی صفت یا ضرورت قرار نہیں دیتے۔ اور اسے مصنف کے اسلوب کی ایک ذاتی خاصیت قرار دے کر اس کی قدر و قیمت نسبتاً کم کر ڈالتے ہیں۔ ان کے اپنے انشائیوں پر چونکہ طنز و مزاح کا رنگ غالب ہے شاید اسی لئے انہوں نے انشائیہ کی بحث میں طنز و مزاح کی اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ کچھ اسی قسم کا رویہ عرش صدیقی صاحب نے بھی اختیار کیا ہے۔ اور طنز و مزاح کو انشائیے میں بے محابا داخل کرنے کی سفارش کی ہے۔

ان کے برعکس مشکور حسین یاد انشائیہ میں سنجیدگی کو فوقیت دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات فلسفیانہ اظہار خیال اور اصلاحی مقاصد کو بھی اس لطیف صنف کا حصہ بنانے کی کاوش کرتے ہیں۔ اس کا باعث بھی شاید یہ ہو کہ ان کے اپنے انشائیوں پر مصلحانہ رنگ چھایا ہوا ہے۔ اور وہ اکثر اونچی سطح پر کھڑے ہو کر معلم اخلاق بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر نظیر صدیقی، مشکور حسین یاد اور عرش صدیقی صاحب کے وسیع تر مفہوم کا اطلاق اردو انشائیہ پر کر دیا جائے تو مجھے خدشہ ہے کہ یہ بھی انگریزی ایسے کی طرح ایک ایسا ملغوبہ بن جائے گا جس کی کوئی متعین تعریف دو اڑھائی سو سال بعد بھی وضع نہ ہو سکے گی۔

عملی سطح پر دیکھئے تو نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد نے انشائیے کی دو مختلف انداز رائج کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ دونوں انداز قبول عام کا مقام حاصل نہیں کر سکے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہیں مروج کرنے والے بھی ان کو مقبول بنانے میں اب کچھ سنجیدہ نظر نہیں آتے اور ان دنوں وہ خود بھی اپنے انداز کی نمائندہ تخلیقات نہیں پیش کر رہے ہیں۔ نظیر صدیقی نے گذشتہ کئی سالوں سے انشائیہ نہیں لکھا۔ اور مشکور حسین یاد نے کافی عرصے کے بعد جو چند انشائیے لکھے ہیں وہ ان

کے بنیادی موقف سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اور ان پر سنجیدگی بجائے طنز و مزاح کا رنگ غالب ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی جس نوع کو مروّج کرنے کی سعی کی وہ نہ صرف مقبول ہوئی بلکہ اس نوع میں تخلیق کرنے والے کچھ زیرک انشائیہ نگار بھی پیدا ہوئے۔ مثال کے طور پر غلام جیلانی اصغر کا "بستر میں لیٹنا" اور محمود ہاشم کا "کم ہمتی" سلیم آغا کا "ہل چلانا" کامل القادری کا "انگلی" اور "سرِ لیسُّن کا درخت" پر ویز عالم کا "عینک" وغیرہ انشائیہ کے اسی انداز کے مظہر ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور انشائیہ نگاروں نے اس نوع کے مسلسل انشائیے لکھ کر اس صنف میں اونچا مقام بنا لیا ہے۔ میری مراد مشتاق قمر اور جمیل آذر سے ہے۔ جو ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری سے متاثر ہیں۔ اور ایک عرصہ سے اس قسم کے انشائیے لکھ رہے ہیں جن کا بنیادی مقصد مصنف کی ذات کے بعض نادر اور پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کرنا ہے۔

اس ضمن میں ایک اور بات یہ ہے کہ اردو ادب میں طنزیہ، مزاحیہ یا سنجیدہ مضامین کا ایک قابل ذکر ذخیرہ موجود ہے۔ سرسید سے شروع کریں تو حسن نظامی پطرس بخاری، مُلّا رموزی، اور کنھیا لعل کپور سے گذر کر مشتاق احمد یوسفی، مسعود مفتی، اُمجد حسین، اور سید باقر علیم تک کئی ایسے ادیبوں سے ملاقات ہو جاتی ہے جنھوں نے طنز و مزاح اور سنجیدہ اصناف میں انفرادیت پیدا کی۔ تاہم ایک بات واضح ہے کہ ان ادبا کی ادبی نگارشات میں شخصیت کو بے نقاب کرنے کی کاوش کہیں نظر نہیں آتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دور کا ادیب اپنی ذات کو ایک ایسا آبگینہ تصور کرتا ہے کہ جس پر کسی دبے [illegible]

اسی دور کا ادیب "ہم" کے نقاب سے کبھی باہر نہیں آیا اور اس کی شخصیت ہمیشہ مستور رہی ہے۔ چنانچہ کسی نئے مزاح نگار کی آمد قاری کو چونکانے پر بھی آمادہ نہیں کر سکی۔ ایک اور پہلو یہ ہے کہ مزاحیہ مضمون نگار خارج کی ناہمواری کو موضوع بناتا ہے۔ اور اس کے پیش نظر ایک واضح اصلاحی مقصد ہوتا ہے۔ جبکہ انشائیہ ایک داخلی صنف ہے یہ صنف جب خارج پر نظر ڈالتی ہے تب بھی اس کا ردعمل داخل کے وسیلے سے ہی ہوتا ہے۔ انشائیہ تفنّنِ طبع کا کام تو دیتا ہے لیکن اس کے پیش نظر کوئی اصلاحی مقصد نہیں ہوتا چنانچہ ۱۹۵۷ء کے لگ بھگ جب غیر تبلیغی اور غیر اصلاحی مضامین کے ایک خاص سلسلہ کو انکشاف ذات کا وسیلہ بنایا گیا تو قاری کو نئے پن کا احساس زیادہ شدت سے ہوا سلسلہ انشائیہ ایک الگ صنف ادب کے طور پر[1] ابھرنے لگا۔ اور بعد میں بحث و نظر سے اس کے انفرادی نقوش بھی نکھرتے چلے گئے

---

[1] اس ضمن میں مولانا صلاح الدین احمد پر بحث کی جو کیفیت طاری ہوئی اس کا حوالہ بے محل نہ ہوگا:

"رفیق گرامی ڈاکٹر وزیر آغا چند دنوں سے ہمارے بعض بلند پایہ رسائل میں کچھ ایسے مضامین لکھ رہے تھے جنھیں پڑھ کر ناظر کی کیفیت اس بچے کی سی ہو جاتی ہے جو اسکول میں دیر سے پہنچا ہو اور جس نے گھر کا کام بھی نہ کیا ہو لیکن اس کے ہاتھوں پر بید پڑنے کی بجائے ان میں برفی اور قلاقند کے دو بڑے لفافے تھما دیئے جائیں میں کچھ عرصے تک ان کی شعبدہ بازی کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کر رہا تھا لیکن سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس یافت لطیف کو عام کیونکر کیا جائے"

(ادبی دنیا "خیال پارے" ۔ مولانا صلاح الدین احمد)

اب تک کی بحث کا اجمالی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انشائیہ اردو کی ایک نئی صنف ادب ہے اور اس کے دائرہ عمل میں وہ نگارشات لطیف آتی ہیں جن کا انگریزی مترادف پرسنل ایسے (PERSONAL ESSEY) ہے۔

بادی النظر میں پرسنل ایسے (انشائیہ) کی اصطلاح اس بات کی متقاضی ہے کہ اس صنف کا خالق موضوع کو اپنی ذات کے حوالے سے پیش کرے۔ لیکن انشائیہ نگار کا موضوع اپنی ذات ہرگز نہیں ہوتا۔ مانتین نے جب یہ اعلان کیا تھا کہ "اپنی کتاب کا موضوع میں خود ہوں" تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ خود مرکزیت کا کا شکار ہے۔ اور انشائیہ کے وسیلے سے اپنی ذات کے کوائف بہم پہونچانا چاہتا ہے انشائیہ کا موضوع مصنف کی "میں" نہیں ہوتا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو خالص انشائیہ کسی ادب میں بھی پرورش نہیں پا سکتا۔ اور اس کی ترقی کا گراف آگے بڑھنے کی بجائے مانتین پر ہی رک جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ میں شخص کی خود معقود بالذات نہیں۔ بلکہ محض ایک وسیلہ ہوتی ہے۔ موضوع کتنا ہی غیر اہم کیوں نہ ہو جب یہ مصنف کی شخصیت کے گداز لمس سے آشنا ہوتا ہے تو خود بخود ایک انشائیہ میں ڈھل جاتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ کے باطن سے کسی ادیب کی شخصیت کی بعض دل نواز جھلکیاں تو نظر آسکتی ہیں۔ لیکن اس سے ادیب کی سوانح عمری مرتب نہیں ہو سکتی اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کسی مصنف کے اندر جھانکنے کے لئے انشائیہ سے بہتر کوئی کھڑکی نہیں۔

ادب میں ادیب کی شخصیت کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اور ہر فن پارے میں اس کے خالق کا پرتو کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ تاہم یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ادب کی دوسری اصناف میں شخصیت کا اظہار بلاواسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ ہوتا ہے بیشتر ادیبوں نے صنف اظہار کو سخن کا پردہ قرار دیا ہے چنانچہ میر جیسے قلندر شاعر کو بھی اعتراف کرنا پڑا۔

کیا تھا عشق کو پردہ سخن کا
سو آخر کو وہ ٹھہرا فن ہمارا

افسانہ اور ناول میں ادیب اپنے کینوس کی حدود میں پابند ہے شاعری میں ردیف، قافیہ، وزن اور بحر وغیرہ کی موجودگی شاعر پر ایسی پابندیاں عائد کر دیتی ہے۔ جس سے اس کا تخلیقی ابال کسی نہ کسی حد تک کم ہو جاتا ہے۔ پھر نظم کی ہیئت شاعر اور قاری کے درمیان ایک دبیز پردہ کھڑا کر دیتی ہے۔ بعض اوقات مصرعوں کی تعداد اور ارکان کی گنتی بھی شاعر کے مستقیم اظہار میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اور وہ پوری تخلیقی سرگرمی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اور اس طرح فن پارے میں اس کی شخصیت کا پورا انعکاس نہیں ہو پاتا۔ اس کے برعکس انشائیہ ایک ایسی ننگی صنف ادب ہے جو کسی واسطے سے پردے کو قبول نہیں کرتی۔ یہ تمام رسمی پابندیوں سے آزاد ہے۔ پاسبان عقل کو فاصلے پر چھوڑ کر وجود میں آتی ہے اور بعض اوقات موضوع کے حوالے سے ادیب کی شخصیت کے کچھ ایسے گوشوں کو بھی آشکارا کر دیتی ہے جنہیں رسمی انداز میں لکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں انشائیہ نگاروں نے شخصیت کے بعض ایسے گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جنہیں کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا:۔

حضرت مشن رخصت ہوئے تھے
کہ میرے عزیز ترین دوست اور بزرگ

جناب ص نے ٹیلی فون پر مجھے مبارکباد دی
کہا "عزیز من، چالیسویں سالگرہ مبارک ہو!
اب گویا تم نے ذہنی پختگی کے دور میں اپنا
پہلا قدم رکھا"۔ ریسیور میں نے رکھ دیا۔
اور سوچنے لگا کہ چار کتابیں، دو بچے
ایک مکان اور لاتعداد دوست پیدا کرنے
کے بعد بھی اگر میں اب تک ذہنی ناپختگی کے
دور میں تھا تو آنے والے ذہنی پختگی کے
ایام" یں کیا ہوگا"

(میری چالیسویں سالگرہ ۔ ڈاکٹر وزیر آغا)

"نیم پلیٹ پڑھنا میری محبوب ترین ہابی
ہے۔ یہ بات جب میں نے ایک انٹرویو میں
صاحب صدر سے کہی تو وہ ایک طنز آمیز
ہنسی برلب وہن لاکر بولے "بھئی یہ تو کوئی
ہابی نہیں ......" ان کا خیال تھا کہ یہ
نیم پلیٹ پڑھنے کا شغل ایک غیر دانشمندانہ
اور احمقانہ فعل ہے۔ مگر میرا آج بھی یہ
خیال ہے کہ اس سے بڑھ کر دلچسپ فکر
انگیز اور مفید شغل اور کوئی نہیں۔ کہ
بغیر افراد کے ملے ہم ان کی شخصیت سے
لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ان کے شعور
اور تحت الشعور میں تیراکی کی مشق کرسکتے
ہیں۔ اور ان کے حمام میں جھانک سکتے ہیں"

(نیم پلیٹ ۔ جمیل آذر)

چھڑی کی معیت میں مجھے اپنی غیر متوازی
حالت سے چھٹکارا ملا ہے۔ اور یوں محسوس
ہوا ہے جیسے میں کسی آشرم میں پہنچ گیا
ہوں ۔ یا میرا جہاز کسی چھوٹی سی بندرگاہ
پر لنگر انداز ہونے کے بعد خراب ہو گیا ہے
یہی نہیں بلکہ چھڑی ہاتھ میں لیتے ہی مجھے اپنے
اندر ایک عجیب سی جذبۂ افتخار کی کلبلاہٹ
محسوس ہونے لگتی ہے ۔ میں اپنے آپ
کو سب سے الگ تھلگ اور جدا ایک اونچے
سنگھاسن پر کھڑا پاتا ہوں اور کوئی شئے
مجھے ایک زوردار تقریر کرنے پر اکساتی ہے"

("چھڑی" ۔ مشتاق قمر)

ان اقتباسات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ محولہ بالا انشائیہ نگاروں نے "چالیسویں سالگرہ" "نیم پلیٹ" اور "چھڑی" جیسے غیر معروف موضوعات پر صرف اپنے محسوسات بیان کئے ہیں۔ لیکن آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ اس عمل میں انشائیہ نگار کی شخصیت کی کئی چھپی ہوئی پرتیں بھی عریاں ہو گئی ہیں۔ زندگی کی ان پرتوں کو ایک عام آدمی کی زندگی میں عموماً کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن شخصیت سازی میں یہی غیر اہم پرتیں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اور اگر انشائیہ نگار ان موضوعات پر اظہار خیال نہ کرتا تو شاید یہ پہلو کبھی منظر عام پر نہ آتے ۔ انشائیہ میں ادیب اپنی ذات کو جس حد تک وسیلہ بناتا ہے انشائیہ بھی اسی حد تک قاری کو حظ مہیا کرتا ہے ۔ اور یوں قاری مصنف سے پیار ہی نہیں کرنے لگتا بلکہ اس کے تجربات کے الجھیڑوں میں شریک بھی ہو جاتا ہے ۔ ایک کامیاب انشائیہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو اپنے محسوسات میں شریک کرکے اسے اپنا ہم خیال نہیں بلکہ ہم جلیس بنا لے ۔ انشائیہ نگار کے پاس نہ کہانی کا پلاٹ ہوتا ہے کہ وہ قاری کی توجہ اس میں جذب کر لے۔ اور نہ موسیقی سے لبریز ردیف اور قافیے کہ سامع ان کے پُر آہنگ سحر میں گرفتار ہو جائے ۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انشائیہ نگار قاری کو گرفت میں لینے کے لئے کوئی سبب نظر

نہیں مانتا بلکہ صرف اپنے انوکھے انداز بیان سے اسے اپنے قریب لانے کی سعی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا عمل مثبت اور سامنے کا ہے اور یہ اپنی کامیابی صرف شگفتگی اور تازگی کی بدولت حاصل کرتا ہے۔

انشائیہ کی بحث میں عموماً شگفتگی کو طنز و مزاح کا مترادف تصور کر لیا جاتا ہے۔ اور اس طرح انشائیہ اور ظرافت کی حدود کو آپس میں گڈمڈ ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ مزاح دراصل ایک مضحک عمل اور طنز ایک سنجیدہ عمل ہے۔ انشائیہ ان دونوں عوامل سے فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن انہیں اپنے اصلی مزاج پر غالب نہیں آنے دیتا۔ بلکہ انشائیہ ایک ایسا غیر رسمی عمل ہے جو سنجیدگی اور تضحیک دونوں کی تلافی کر ڈالتا ہے۔ شخصیت کے حوالے سے بات کی جائے تو میں کہوں گا کہ [illegible] شخصیت کا، مزاح انفعالی شخصیت کا اور انشائیہ نسبتاً ہموار شخصیت کا عمل ہے [illegible] ادیب ایک مصلح کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اور [illegible] کی ہر چیز پر ایک [illegible] فقرہ ڈالتا ہے۔ مزاح میں ادیب استہزا اور [illegible] کا خود نشانہ بنتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ نشیب میں گر کر ناظر کے جذبۂ رحم کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ پہلے ناظر کے لبوں پر قہقہہ بیدار ہوتا ہے پھر دل کی کسی اندرونی گہرائی میں رحم کا جذبہ۔ انشائیہ میں ادیب ایک ہموار سطح پر ناظر کے دوش بدوش کھڑا ہو کر منظر سے تحصیل مسرت کرتا ہے۔ اور اپنا ردعمل بھی لذا[illegible] دواں انداز میں بیان کرتا جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے میں اس کی مثال کیچڑ میں لتھڑے ہوئے کسی آدمی سے دوں گا۔ صنف مزاح میں کیچڑ میں یہ لتھڑا ہوا آدمی خود مزاح نگار ہے جو پاس کھڑے ہوئے صاف ستھرے تماشائیوں سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہے۔ دوسری طرف طنز میں سارا بدلا[illegible] کردار طنز نگار ادا کرتا ہے۔ اب کیچڑ میں لتھڑے ہوئے آدمی کی ہیئت کذائی پر خود طنز نگار قہقہہ لگا رہا ہے اور اپنی صاف ستھرائی پر تفاخر کا اظہار بھی کر رہا ہے۔ ان دونوں کے برعکس انشائیہ نگار اس انبوہ میں شریک ہے۔ جو پگڈنڈی پر چلتے چلتے کیچڑ میں لتھڑ گیا ہے۔ لیکن زہرخند یا ہنسی کو جنم دینے کی بجائے انشائیہ نگار اس کیچڑ سے اکتساب سرور کر رہا ہے اور اپنے ساتھیوں کو ایسی شگفتہ باتیں بتا رہا ہے جو اسے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھنے، زمین کے لمس سے آشنا ہونے اور کیچڑ کا ذائقہ چکھنے سے پہلے معلوم نہیں تھیں۔ [illegible] کہنے کا مقصد یہ ہے کہ طنز و مزاح میں زندگی کے ایک موجود زاویے پر مثبت یا منفی تبصرہ ہوتا ہے۔ جبکہ انشائیہ اس موجود زاویئے کی جہت ہی بدل ڈالتا ہے۔ اور ناظر کو حقیقت معلومہ سے ہٹ کر زندگی کے کچھ نامعلوم زاویوں سے آشنا کر ڈالتا ہے۔ اور یہ پہلو اتنے انوکھے ہوتے ہیں کہ ہمیں ان کی دریافت پر مسرت اور سرخوشی کا ایک عجیب سا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس تمام عمل میں انشائیہ نگار کا انداز پیشکش اتنا دوستانہ ہوتا ہے کہ قاری اس کے خلوص کو شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ بالفاظ دیگر انشائیہ نمائش، تصنع، آرائش اور تکلف کی فضا کے برعکس دوستانہ اور غیر رسمی ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔ اور انشائیہ نگار اپنی ذات کی بارہ دری کے سب دروازے کھول دیتا ہے۔ اور نہ صرف صاف ستھری ہوا منزہ چاندنی یا نکھری ہوئی اجلی دھوپ ہی کو اندر آنے کی اجازت دیتا ہے بلکہ قاری کو بھی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اندر لے آتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ کھاٹ پر بٹھا لیتا ہے اور دوئی کے تمام پردے ہٹا کر ایک اچھے میزبان کی طرح زندگی کے ایسے موضوعات پر گفتگو شروع کر دیتا ہے جو [illegible] ہموار دھہان کے لئے تازہ دم ہونے کا سامان موجود

اس تمام گفتگو میں اس کے پیش نظر صرف ایک ہی بات رہتی ہے کہ مہمان کو کوئی بات ناگوار نہ گذرے اور وہ اس کی باتوں سے بہجت کی کیفیت محسوس کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لہجے میں درشتی کی بجائے حلاوت اور سنگینی کی بجائے توازن ہوتا ہے اور اسی لئے بیشتر انشائیہ نگاروں نے اظہار خیال کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جن کا انوکھا پن قاری کو اولین نگاہ ہی میں اپنی طرف متوجہ کر لے۔ مثال کے طور پر "کھٹمل کی موت" (ورجینیا وولف) "برطانوی عجائب گھر کے کبوتر" (رچرڈ ریفریز) "غلطیوں کی تعریف میں" (رابرٹ لینڈ) "طوطا پالنا" (ڈاکٹر وزیر آغا) "آتش دان کے پاس بلی" (ولیہ ہینٹ) "آئس کریم کھانا" (مشتاق قمر) "تمباکو نوشی" (جمیل آذر) "بے ترتیبی" (جاوید صدیقی) "انگلی کی انگوٹھی" (انجم انصار) "نیورانی ہونا" (پرویز عالم) "فٹ نوٹ" (کامل القادری) "گالی دینا" (غلام جیلانی اصغر) وغیرہ چند ایسے ہی دلچسپ عنوانات ہیں جنھیں پڑھتے ہی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مصنف ضرور کوئی نئی اور غیر رسمی بات کہنے والا ہے۔

جس طرح میزبان اپنے کسی دوست مہمان کے ساتھ تمام باتیں ایک ہی نشست میں ختم نہیں کر ڈالتا بلکہ "یار زندہ صحبت باقی" کے مصداق کچھ باتیں اگلی ملاقات پر بھی اٹھا رکھتا ہے اسی طرح انشائیہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں کسی باضابطہ تکمیل کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک گونہ تشنگی باقی رہتی ہے غزل کا ایک شعر، ایک عمدہ نظم، ایک اچھا افسانہ، یا ایک اعلیٰ تنقیدی مضمون جس تکمیل کا متقاضی ہوتا ہے انشائیہ کا مزاج اس کا روادار بھی نہیں۔ انشائیہ تو زندگی کے غیر مختتم کل میں سے صرف ایک ٹکڑے کو گرفت میں لیتا ہے۔ اور اسے ایک ایسا شرار بنا کر چھوڑ دیتا ہے جس سے زندگی کے بقیہ تمام حصے روشنی اور توانائی حاصل کر سکتے ہیں۔ انشائیہ ماضی اور حال سے شروع ہوتا ہے لیکن اپنی گرفت مستقبل پر رکھتا ہے۔ اور اس لحاظ سے اس کی جہت منفی نہیں بلکہ مستقیم ہے اور یہ بجائے پیچھے یا دائیں بائیں جانے کے آگے کی طرف سفر کرتا ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ انشائیہ غیر معمولی طوالت یا بے جا تفصیلات کا متحمل نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس کے فنی تقاضوں میں عدم تکمیل کے ساتھ اختصار اور کفایت لفظی کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ عام طور پر صفحات کی تعداد سے اختصار یا طوالت کی پیمائش کی جاتی ہے لیکن بدقسمتی سے انشائیہ کے باب میں یہ پیمانہ بھی کارآمد ثابت نہیں ہوا۔ انشائیہ دو تین صفحات کا بھی ہو سکتا ہے جیسے بیکن کا "سفر کے بارے میں" جو صرف دو صفحات میں ہی سما گیا ہے۔ اور پندرہ بیس صفحات کا بھی جیسے ہنری ڈیوڈ کا "زندگی بغیر اصول کے" جو باریک ٹائپ کے انیس صفحات پر محیط ہے۔ اردو میں ڈاکٹر وزیر آغا کا انشائیہ مختصر ہوتا ہے۔ لیکن غلام جیلانی اصغر اور مشتاق قمر کے یہاں نسبتاً طوالت کا رجحان ملتا ہے۔ انشائیہ چونکہ انوکھے پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ اس لئے اس میں الفاظ جتنے کم اور چنیدہ ہوں گے انوکھے پہلو اتنے ہی زیادہ شدت سے ابھریں گے طویل انشائیوں میں غیر ضروری تفصیلات کا در آنا لابدی ہے جو نہ صرف تاثر کی گہرائی کو کم کر دیتے ہیں بلکہ اکثر اوقات انشائیہ کے بنیادی مفہوم پر بھی گرد ڈال دیتے ہیں

یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اختصار اور طوالت کے بارے میں کوئی قاعدہ یا قانون وضع نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی انشائیہ نگار کو مجبور کیا جا سکتا ہے

کہ وہ موضوع کو صفحات کی ایک مخصوص تعداد کا پابند کرے۔ کچھ موضوعات ایسے ہوتے ہیں کہ چند صفحات کی تنگنائے میں سما نہیں سکتے۔ اسی طرح بعض اوقات انشائیہ نگار کی شخصیت اتنی توانا ہوتی ہے کہ موضوع کے ساتھ مس کرتے ہی بے شمار نئے لفظوں کو جنم دے ڈالتی ہے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ بے جا طوالت انشائیہ کے مزاج کے منافی ہے انشائیہ نگار موضوع کی مناسبت کو ملحوظ نظر رکھ کر ہی انشائیہ کے قد وقامت کا تعین کر سکتا ہے جونہی اس میں غیر ضروری باتیں در آئیں گی انشائیہ کی شادابی اور ندرت ختم ہو جائیگی

ڈاکٹر جانسن نے جو خود بھی صف اول کے انشائیہ نگار شمار ہوتے ہیں۔ انشائیہ کو ایک بے قاعدہ اور غیر منظم کمپوزیشن قرار دیتے ہوئے اسے ناہضم مواد کا بے ترتیب ٹکڑا اور دانش کی ڈھیلی ڈھالی اختراع کہا ہے۔ انشائیہ کے بارے میں ڈاکٹر جانسن کی یہ تعریف بہت اہم شمار کی جاتی ہے اور انشائیہ کی ساری تنقید اسی تعریف کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر جانسن نے انشائیہ کو ہر قسم کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دے کر اسے فطرت کے بالکل قریب کر دیا ہے۔ شاید اسی لئے انگریزی کے ایک نقاد کا قول ہے کہ انشائیہ لکھنا اتنا ہی فطری ہے جتنا سانس لینا۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ نگار کو بے پر کی اڑانے یا بے سروپا باتیں کرنے کی کھلی چھٹی ہے۔ اظہار کی اس وسیع آزادی کے باوجود انشائیہ سیانیٹ کی طرح ایک نازک صنف ہے۔ اور مصنف کی ذرا سی بے احتیاطی سے اس کا سارا پیکر ڈول جاتا ہے۔ پھر انشائیہ میں ناہضم یا کچی باتوں کا اظہار بھی نہیں ہوتا۔ اس کے پیکر میں صرف وہی باتیں سما سکتی ہیں جو انشائیہ نگار کے لاشعور میں سالہا سال تک منہ بند سیپ کی طرح پڑی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ تخلیق کا وہ لمحہ آجاتا ہے جب انشائیہ نگار اس سمندر میں ایک گہرا غوطہ لگاتا ہے اور اس گوہر ناسفتہ کو برآمد کر لیتا ہے۔ بقول رابرٹ لنڈ اچھا انشائیہ نگار ہر غوطے کے ساتھ ایک خزانہ ساتھ لاتا ہے لیکن ایک عام انشائیہ نگار بار بار کے غوطے کے باوجود خالی ہاتھ ہی لوٹ آتا ہے۔ شاید اسی لئے انشائیہ لکھنا آسان کام نہیں سمجھا جاتا۔

انشائیہ اس لحاظ سے ایک غیر مقصدی صنف ادب ہے کہ یہ فرد کو عرفان کی کسی منزل سے ہم کنار کرنے کی دعوے دار نہیں۔ لیکن اس لحاظ سے ضرور افادی ہے کہ یہ فرد کے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون مہیا کرتی ہے یہ زندگی کے اندھیرے میں ایک روشن جگنو کی طرح ہے۔ جو منزل کی امید تو دلاتا ہے لیکن خود منزل نہیں بنتا اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ انشائیہ بحیثیت ایک صنف ادب کے مقصدیت کے آلہ کار کبھی نہیں بن سکا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انشائیہ کو ان ممالک میں زیادہ فروغ ملا ہے۔ جہاں ادب کو مقصد کے زیر نگیں نہیں کیا جاتا۔ اور بعض ایسے ممالک میں جہاں ادب کو نظریاتی پروپیگنڈے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے انشائیہ بالکل پنپ نہیں سکا۔ پاکستانی ادب کا جائزہ لیں تو احساس ہوگا کہ ترقی پسند تحریک سے متعلق کوئی ادیب بھی انشائیہ لکھنے پر قادر نہیں ہو سکا۔ بلکہ ان میں سے بیشتر کے یہاں تو انشائیہ کی پہچان کا ذوق بھی موجود نہیں۔ اور کئی ایک ادیب آج بھی اپنے رسائل میں جو تخلیقات انشائیہ کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں وہ خالص مزاحیہ مضامین ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اچھا انشائیہ ہر دور میں پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے صرف اس

ور میں پنپ سکتا ہے جب کہ ماحول اور حالات سے
لیے شدید بے اطمینانی کا احساس پایا جائے ڈاکٹر
بانسن نے سٹیل کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ غیر
طمئن عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے ایسے لکھتا ہے اور
س نے نثر میں غیر جارحانہ اور سرد رویہ کی عکاسی کر کے
سیاست کی پیدا کردہ گرمی کو معتدل بنانے کی کاوش
کی ہے" اس زاویئے سے برصغیر کو اس کے سیاسی اور
سماجی پس منظر میں دیکھئے تو آزادی سے پہلے کا زمانہ
شدید سیاسی تحریک اور نعرہ بازی کا زمانہ نظر آتا ہے
س قسم کا ماحول انشائیہ کے لئے سازگار نہیں ہوتا۔
زادی کے بعد فرد نئے معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں
صروف ہو گیا۔ اور اس دور میں اس نے نہ صرف آسودگی
لے ایک خود ساختہ تصور کی پرورش کی بلکہ مستقبل کے
رے میں بھی اس نے بعض مافوق الخیال امیدوں کو پالا
سے ماحول اور حالات سے بے اطمینانی کا احساس
اس وقت ہوا جب اس کے آسودہ مستقبل کے تمام
راب چکنا چور ہو گئے۔ اور سیاسی و معاشرتی مطلع
بر آلود ہو گیا۔ شاید یہی وقت تھا جب انشائیہ کی
یدائش عمل میں آ سکتی تھی۔ چنانچہ اسی دور میں
یانی کی شگفتہ اور غیر رسمی تقریریں ابھریں۔ اور اسی
مانے میں اردو انشائیہ وجود میں آیا جس نے زندگی کی
آسودگی کو کم کرنے کے لئے ذہن کو تازہ خیالات کی
سیجن بہم پہنچانے کا فریضہ قبول کیا۔ انگریزی ادب
یں انشائیہ کی پرورش جن ادیبوں نے کی ہے ان میں
ے زیادہ نامور ادیب مختلف اوقات میں اخبارات
ے ساتھ متعلق رہے ہیں۔ جوزف ایڈیسن، اور رچرڈ
ٹیل، ٹیٹلر اور سپکٹیٹر میں باقاعدگی سے کالم لکھتے
ہے۔ چارلس لیمب اور ہیزلٹ کئی رسائل کے ساتھ

متعلق رہے رابرٹ لینڈ نے قریباً بیس سال تک نیو سٹیٹسمین
میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ وڈ براؤن
"مارننگ ٹیلی گراف" کے ساتھ اور مارٹن "ہارپرز ویکلی" کے
ساتھ متعلق تھے۔ کالہنی "ٹک مین" سے اور جیمز تھربر کولمبس
"ڈسپیچ" سے ابھرے اور مقبول ہوئے۔ دلچسپ بات یہ
ہے کہ ان ادیبوں کو محدود وقت میں اپنے کالم کی معینہ حدود
میں کسی ایسے موضوع پر اظہار خیال کرنا پڑتا تھا جو عوامی
دلچسپی کا حامل ہو اور سماجی اعتبار سے غیر مطمئن قاری کو
لطافت اور مسرت کے چند لذت خیز لمحے مہیا کر سکے۔ ان
پابندیوں کے باوصف ایڈیسن سٹیل اور لینڈ وغیرہ نے
ایسی بے مثال کامیابی حاصل کی کہ قارئین ان کے کالم کا
انتظار ہمیشہ بے تابی سے کرتے۔ گزشتہ ربع صدی کے
دوران اردو صحافت میں کالم نگاری کو بہت فروغ حاصل
ہوا ہے لیکن اخبارات کے صفحات سے ابھی تک کوئی
انشائیہ نگار ابھر نہیں سکا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے
کہ انشائیہ نگاری کے لئے دھیمے مزاج، شائستہ طبیعت
کشادہ ظرف اور بوقلموں شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے
اور اردو کالم نگاروں کے ہاں یہی چند چیزیں عنقا ہیں چند
کالم نگاروں نے اپنا ایک حلقۂ قرأت ضرور پیدا کیا ہے۔
لیکن ابھی تک وہ کوئی مثبت اور دیرپا تاثر پیدا کرنے
میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اردو صحافت میں انتظار حسین
کی ضلع جگت، ابن انشاء کا انکسار، ظہیر کاشمیری کی
کھرکھراہٹ، احمد بشیر کی جھلاہٹ، اور احمد ندیم قاسمی کی
رقت ان کے کالم کا امتیازی وصف بن چکی ہے۔ لیکن
ان میں سے کوئی بھی طنز کی جراحت، مزاح کے پھکڑپن، اور
ذاتیات کے منفی ردعمل سے بلند ہو کر انشائیہ کی شائستگی
قبول نہیں کر سکا۔ ●

برائے اساتذہ

پروفیسر معین الدین

غزل کی تدریس

یوں تو غزل کی تدریس بھی تدریس نظم کے ہی تحت آتی ہے لیکن غزل کی ہیئت اور اسلوب کی انفرادی حیثیت کی وجہ سے یہ صنف ایک منفرد طریقہ تدریس کی متقاضی ہے۔ غزل کی تدریس نظم کی تدریس کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے اس عمل میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ استاذ غزل کی ساخت، اسلوب اور عہد بہ عہد ترقیات سے واقف ہو۔ اسے ہر دور کی نمائندہ غزلوں کا شعور ہو اور وہ غزل کا ایک رچا ہوا مذاق رکھتا ہو۔ اسی صورت میں وہ اپنے شاگردوں کو غزل سے لطف اندوز کرا سکتا ہے

شاگردوں کے لئے بھی اس اعتبار سے یہ مشکل صنف ہے کہ غزلوں میں عام طور سے کوئی ایک مرکزی خیال نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ غزل کا اسلوب علامتی اور اشاراتی ہوتا ہے۔ اس لئے غزل کی تفہیم و تحسین میں طلبا کو دشواری محسوس ہوتی ہے۔ تعلیمی معیار کی پستی خصوصیت کے ساتھ غزل کی تدریس میں دشواری پیدا کرتی ہے اور اکثر اساتذہ کو اس بے بسی پر رونا آتا ہے۔ کہ شعر سے لطف اندوز ہونا تو درکنار شاگرد شعر کو موزوں کر کے پڑھ بھی نہیں سکتے

نظم کے اسباق کی طرح غزل کے سبق کو بھی اچھی طرح تیار کر لینا چاہئے۔ بغیر تیاری کے اگر سبق پڑھایا گیا تو لائق سے لائق استاد کو بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑیگا سبق کی تیاری میں انتخاب متن، تعین مقاصد اور طریقہ تدریس سے متعلق تمام امور پر غور کرنا شامل ہے۔ لیکن غزل کی تدریس میں مضمون کی تیاری خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے استاد کو اپنے محدود علم پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ وسیع مطالعہ کے ذریعے اپنے علم کو تازہ کرتے رہنا چاہیئے۔ اکثر غزلیں بظاہر بہت سادہ نظر آتی ہیں۔ لیکن معنی و مطلب کے لحاظ سے ادق اور مشکل ہوتی ہیں۔ اس لئے ایسی غزلوں کو پڑھانے کے لئے خصوصیت کے ساتھ تیاری کرنی چاہیئے۔

مقاصد

سبق کی کامیابی اور ناکامیابی کا انحصار بہت کچھ تدریسی مقاصد کے تعین پر ہے اگر استاد نے ذہن کی صفائی کے ساتھ مقاصد پر غور نہیں کیا ہے تو پڑھانے کا عمل مشکل ہوجائے گا۔ لیکن اگر مقاصد کا تعین واضح طور پر کر لیا گیا ہے تو تدریسی عمل نسبتاً سہل ہوجائے گا پھر استاد خود اعتمادی کے ساتھ سبق کا آغاز کر سکتا ہے۔ لہذا مقاصد طے کرتے وقت ان تمام گوشوں پر غور کر لینا چاہیے جن سے سبق کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا جا سکے۔

تمہید

پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ تمہید کا مقصد طلبا میں تحریک ذہنی پیدا کرنا ہے اور اس کے ذریعہ اس سبق کو متعارف کرانا ہے۔ جو پڑھانے کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ تمہید کی بنیاد عام طور پر سابقہ معلومات پر ہوتی ہے تاکہ آموزشی عمل میں تسلسل اور ربط قائم رہے۔ لیکن غزل کے سبق میں عام طور پر سابقہ معلومات کی بنیاد پر تمہید اٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور فائدہ ہوتا ہے کہ استاد کو سبق کا آغاز کرنے کے لئے ایک مضبوط زمین مل جاتی ہے۔

تمہیدی گفتگو کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ غزل کے موضوعات اور شاعر کی زندگی کے حالات کو موضوع بحث بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس طریقہ میں عام طور سے یہ دشواری پیش آتی ہے کہ ان دونوں پہلوؤں سے طلبا کو بہت کم دلچسپی ہوتی ہے اور درجہ کے اندر ایک بے کیفی سی طاری رہتی ہے۔ بی ایڈ کے زیر تربیت اساتذہ مشقی اسباق کے دوران اکثر اس دشواری سے دوچار ہوتے ہیں اور مؤثر تمہید کے لئے سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اس جستجو میں وہ کہیں سے کہیں بھٹک جاتے ہیں۔

تمہید کی منزل پر مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں غزل کے اسلوب کو گفتگو کا موضوع بنایا جائے یعنی غزل کس لحاظ سے نظم سے مختلف ہے۔ یا غزل کے اجزائے ترکیبی کا ذکر کیا جائے یا غزل کے اشاریت اور رمزیت کو تمہیدی گفتگو کا وسیلہ بنایا جائے۔

عام طور پر غزل میں کوئی ایک مرکزی خیال نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی تصوراتی وحدت ملتی ہے ممکن ہے بعض غزلوں کے اشعار میں بے ربطی نظر آئے لیکن بباطن ان میں ربط اور تسلسل پایا جائے اگر غزل کی مجموعی کیفیت کو ذہن نشین کرلیں تو بنیادی وحدت بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔ غزلوں کے انتخاب میں اگر کاوش کی جائے تو ایسی غزلیں مل سکتی ہیں جن میں ربط تسلسل اور وحدت ملتی ہے۔ لیکن ایسی غزلیں بہت کم داخل نصاب ہوتی ہیں۔

تمہیدی سوالات ایسے ہونے چاہئیں جن کے ذریعہ طلبا کے ذہن کی سبق تک رسائی ہو سکے۔ لیکن اگر سابقہ معلومات کی بنیاد پر تمہید نہ اٹھائی گئی تو پھر سوالات کی ضرورت نہیں۔ استاد کے ذریعہ تمہیدی گفتگو کافی ہے

اعلان سبق

مؤثر تمہید کا نقطۂ عروج اعلان سبق کی منزل ہوتی ہے یعنی اس منزل کے اختتام پر اپنے شاگردوں پر یہ استاد واضح کردیتا ہے کہ انہیں کون سی غزل پڑھنی ہے اور اس غزل میں کون کون سے ایسے پہلو ہیں جن پر خاص طور سے توجہ کرنی ہے اگر طالب علموں کے سامنے یہ بات واضح کردی جائے تو پھر غزل کی تفہیم و تحسین میں بڑی سہولت پیدا ہو سکتی ہے۔

نمونے کی بلند خوانی

تمہید کے عمل بخوبی انجام د کے بعد سبق پیش کرنے کی منزل آتی ہے اس منزل پر استا غزل پڑھ کر سناتا ہے یہ ایک قسم کی تاثراتی بلند خوانی ہوتی ہے جس میں خوش خوانی کے تمام اوصاف ہوتے ہیں۔ استا بلند خوانی کرتے وقت صحت زبان، لب و لہجہ، اور مصرعوں کی موزونیت کا خاص طور پر خیال رکھتا ہے استاد کے ذریعہ بلند خوانی جس حد تک عمدہ ہوگی اسی قدر شاگردوں کو تفہیم و تحسین میں سہولت ہوگی۔ شعر اگر سلیقے سے پڑھا جائے اور صوتی آہنگ کو ملحوظ رکھا جائے تو مفہوم بہتر طور سے ذہن نشیں ہو جاتا ہے اور مفہوم کے وسیلے سے جمالیاتی قدر شناسی کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے لہٰ تدریس غزل میں نمونہ کی بلند خوانی کی خصوصی اہمیت ہے

جائزہ

نظم کی تدریس کے سلسلے میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اجمالی جائزے سے بحیثیت مجموعی نظم کی جانب شاگردوں کو متوجہ کرانا مقصود ہوتا ہے تاکہ وہ نظم کے ماحول سے بخوبی روشناس ہو جائیں اور نظم کی ایک مکمل تصویر ان کے سامنے آ جائے۔ لہٰذا غزل میں اگر ربط، تسلسل اور وحدت موجود ہو۔ تو استاد کو اجمالی جائزے میں یہاں بھی وہی طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے جو نظم کے سلسلے میں اپنایا جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر غزل کا ہر شعر بذات خود ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ غزل کا ایک شعر بھی ہوتا ہے یعنی وہ کُل بھی ہوتا ہے اور کُل کا جز بھی رہتا ہے۔ لیکن غزلوں میں عام طور پر مضامین کا تنوع ملتا ہے اس لئے پوری غزل ایک مرکزی خیال کی حامل نہیں ہوتی۔ اس صورت میں اجمالی جائزے کا کام کسی قدر دشوار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا استاد کو چاہئے کہ وہ غزل کی بجائے شعر کو اکائی تصور کرے اور ہر شعر کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لے۔ یہ جائزہ اجمالی بھی ہوگا اور تفصیلی بھی یعنی شعر میں جو مضمون باندھا گیا ہے اس سے متعلق طلباء سے بات چیت کرنا یا سوال و جواب اجمالی جائزے کا عمل ہوگا۔ اور جن جذبات و احساسات اور تجربات کو پیش کیا گیا ہے۔ ان سے متعلق تفصیل کے ساتھ طلبا سے اظہار خیال کرانا تفصیلی جائزے کا کام ہوگا۔ اس منزل پر شعر کی تشریح، توضیح اور تفہیم کے دوران شعر کے امتیازی وصف کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس طرح شاگردوں کے شوق کو ابھارا جائے گا۔

استحسان غزل

غزل میں چونکہ اسلوب بیان رمزیہ اور علامتی ہوتا ہے اس لئے استحسان شعر نظم کے مقابلے میں کسی قدر دشوار عمل ہوتا ہے۔ اور استاد سے زیادہ بصارت و بصیرت کا مطالعہ کرتا ہے لیکن اس کی تدریس میں عام طور پر روایتی طریقہ اپنایا جاتا ہے ان میں سے ایک روایت شعر کے نثر کرانے کی ہے۔ استاد ہر مصرعے کی نثر کراتا ہے۔ اور پھر مطلب سمجھاتا ہے حالانکہ مصرعے کی نثر کرانا محض تضیع اوقات ہے بلکہ یہ لطف اندوزی کے عمل میں مانع بھی ہے۔ اس طرح شعر پڑھاتے وقت الفاظ کے معنی پورے اہتمام سے بتائے جاتے ہیں۔ یعنی شاگردوں سے معنی اخذ کرانا۔ الفاظ کو جملوں میں استعمال کرانا۔ الفاظ کو تختہ سیاہ پر لکھنا اور شاگردوں سے نوٹ کرانا وغیرہ تمام کام نہایت انہماک سے انجام دیئے جاتے ہیں۔ ان کے باعث نہ تو شعر خوانی کا خوشگوار ماحول پیدا ہو پاتا ہے اور نہ ہی ذوق سلیم کی تربیت ہو پاتی ہے۔

دراصل الفاظ کے سہل یا ادق ہونے سے لطف اندوزی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا البتہ تفہیم میں دشواری ہو سکتی ہے۔ یعنی بعض صورتوں میں الفاظ کے معنی معلوم کئے بغیر شعر کی تفہیم نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادق الفاظ، تراکیب اور تلازموں کے بارے میں اس طرح بات چیت کی جائے یا سوال و جواب کیا جائے کہ معنی خود بخود واضح ہو جائیں۔ اور الفاظ کی تشریح اور صراحت توضیح مطالب کا ایک جز معلوم ہو۔ اس طرح تلمیحات، تشبیہات اور استعارات سے متعلق بھی شاگردوں سے سوالات پوچھے جائیں اور جوابات حاصل کرنے کے دوران اپنے الفاظ میں شعری محاسن اجاگر کر دیئے جائیں۔

دراصل شعر آسان یا مشکل اپنے تصوراتی اور فکری مواد کی وجہ سے ہوتا ہے الفاظ کے ادق یا سہل ہونے سے نہیں، درج ذیل مثال سے اس کی وضاحت بخوبی ہو جاتی ہے۔

۵ سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے (میر)

اس شعر کو پڑھاتے وقت زیادہ سے زیادہ ایک لفظ کے معنی بتانے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ وہ ہے "ٹک" لیکن کیا اس لفظ کے معنی بتانے سے شعر کی تفہیم آسان ہوجائے گی اور اس کا استحسان ممکن ہوجائے گا۔؟ یہ دونوں باتیں مشکل ہیں۔ اس لئے کہ اس شعر میں جو جہان معنی پوشیدہ ہے اس کے استحسان کے لئے استاد کو بہت جتن کرنے پڑیں گے ورنہ شعر کا حق ادا نہ ہوگا۔

انتخاب کلام میر کے مقدمے میں ڈاکٹر عبدالحق نے اس شعر سے متعلق ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے:

"یہ شعر کس قدر سادہ ہے، اس سے زیادہ آسان، عام اور معمولی الفاظ اور کیا ہوں گے لیکن انداز درد سے لبریز ہے اور لفظ سے لفظ سے حسرت و یاس ٹپکتی ہے۔ اردو کیا ہے مشکل سے کسی زبان میں ایسے پلے کا اور ایسا درد انگیز شعر ملے گا۔ ایک دوسری بات اس شعر میں قابل غور یہ ہے کہ جو شخص دوسروں کو شور و غل نہ کرنے اور آہستہ بولنے کی ہدایت کر رہا ہے وہ بھی ہمارے پاس بیٹھا ہے اور اس پر لازم ہے کہ بات آہستہ سے کہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ لفظ ایسے چھوٹے اور سلیس اور دھیمے ہوں کہ دھیمی سے دھیمی آواز میں ادا ہو سکیں۔ اب اس شعر کو دیکھئے کہ لفظ تو کیا ایک حرف بھی ایسا نہیں کہ جو حرکت، یا ہونٹوں کے ذرا سے اشارے سے بھی نہ ادا ہو سکتا ہو۔"

تدریس غزل میں تفہیم و تحسین کی منزل بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے تفصیلی جائزے کے دوران غزل کے ادبی اور جمالیاتی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اس منزل پر استاد اور شاگرد کے درمیان جو رابطہ قائم ہوتا ہے۔ وہ لطف اندوزی کا ذریعہ بنتا ہے اور اس کی بنیاد پر شاگردوں میں ایک ایسی نظر پیدا ہوسکتی ہے جس سے وہ اچھے اور برے شعر میں تمیز کر سکیں۔ کھرے کھوٹے کو پرکھ سکیں۔ اور ادبی قدروں کا عرفان حاصل کر سکیں۔ استحسان شعر کی یہی منزل ہوتی ہے لہذا استاد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ شعر کی ظاہری اور باطنی خوبیوں سے طلبا کو لطف اندوز کرائے گا۔ اور ان میں اس بات کا شعور پیدا کرائے گا کہ وہ غزل کی رمزیت اور اشاریت سے حظ اٹھا سکیں۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ، مرغ و قفس، طور و کلیم اور اس قسم کی دیگر تراکیب کے ساتھ ان سے متعلق تصورات کی بھی تحسین کر سکیں۔

اسلوب بیان

تدریس غزل میں استحسان شعر کا عمل اس وقت موثر سمجھا جاتا ہے جب غزل کی لسانی اور ادبی خوبیوں کی بنیاد پر طلبا بذات خود شاعر کا اسلوب بیان اخذ کر سکیں عام طور پر درسی کتابوں میں شاعر کے اسلوب بیان یا طرز بیان کا ذکر بہت میکانکی طریقہ سے کیا جاتا ہے۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ طرز بیان کے ذکر کے ساتھ جو غزل پیش کی جاتی ہے وہ اس مخصوص طرز بیان سے عاری ہوتی ہے۔ اس لئے شاگردوں میں اس بات کا ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ غزل کی بنیاد پر بذات خود اسلوب بیان اخذ کر سکیں۔ یہ عمل بھی سوال و جواب پر مبنی ہوگا۔ لہذا سوالات کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے جس سے اسلوب بیان اخذ کرانے میں سہولت ہو۔

اگر غزل میں کوئی وحدت خیال، ربط اور تسلسل قائم ہو تو ایسی صورت میں اسی مضمون سے مشابہ کوئی اور غزل منتخب کی جا سکتی ہے۔ موازنے کی غزل پیش کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ استاد کسی چارٹ یا رول اپ بورڈ پر غزل لکھ کر لائے اور کمرۂ جماعت میں آویزاں کرنے پہلے خود بلند آواز میں غزل پڑھ کر سنائے پھر دو ایک طالب علموں سے پڑھوائے اور سوالات کے ذریعہ مماثل پہلوؤں کا اخذ کرائے۔ اس طرح شاگردوں میں نہ صرف شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوگا۔ بلکہ ان کے تنقیدی شعور کی بھی نشو و نما ہو سکتی ہے۔

غزل کی تدریس
انفرادی بلند خوانی
میں نظم کی طرح

آخری منزل انفرادی بلند خوانی کی ہے۔ اس منزل پر طلبا سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ لطف کے ساتھ غزل کے اشعار پڑھ کر سنائیں اور شعر پڑھتے وقت تلفظ، لب و لہجہ، اور آہنگ کا خاص طور پر خیال رکھیں۔ ●

بقیہ: مسیحا

مار ڈالا۔ لیکن اسی وقت کسی نے اپنی رائفل اٹھائی اور اس فوجی کے سر پر کندا مار کر گرا دیا۔ اور پھر چاروں طرف سے گولیاں برسنے لگیں۔ یہ لڑائی رات گئے تک چلتی رہی....

اور پھر آگ بھڑک اٹھی۔ اور قلعہ کے بڑے تاریخی ستون کو بھورے دھوئیں نے اور سارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ●

بقیہ: اعتماد

سر پچھلے سال میں ایک دن بھی ایسا نہیں آیا جب میں نے اپنا کام مکمل نہ کیا ہو۔ میں نے آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ لیکن آج جب آپ نے مجھے یہ فائل دے کر ہدایت کی کہ اسے آج ہی نمٹنا چاہئے تو مجھے محسوس ہوا کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔ آپ مجھے آج تک پہچانے ہی نہیں۔ اس لئے......"

میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا

میرے جسم میں لرزش پیدا ہوگئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میری آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں۔

میں نے آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اپنے افسر کی طرف دیکھا۔

حیرت سے اس کا منہ کھلا اور وہ مجھے گھور رہا تھا۔

میں آنسو بہاتا اس کے کمرے سے باہر نکلا

میرے ساتھیوں نے میرے چہرے پر بہتے آنسوؤں کو دیکھا اور مجھے گھورتے رہ گئے۔

آنسو پونچھے بغیر میں دفتر سے باہر نکل آیا۔ ●

ستار طاہر
(پاکستان)

اعتماد

میں بے کار تھا مجھے ملازمت کی تلاش تھی۔

بہت انکار سننے اور دھکے کھانے کے بعد مجھے ملازمت مل گئی۔ یہ ملازمت میرے تصور اور میرے ذہنی معیار سے کم تر تھی۔ لیکن میں نے اسے بخوشی قبول کر لیا۔

میں چاہتا کہ میرے افسر مجھ سے خوش رہیں مجھ پر اعتماد کریں مجھے اپنا فرماں بردار سمجھیں۔ میں ارادہ کر لیا تھا کہ میں ان کی خوشنودی کا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔ وہ جو کام کہیں گے محنت اور توجہ اور تندہی سے کروں گا۔ جب وہ مجھے بلائیں گے تو میں سر جھکا کر مودب بن کر ان کی بات سنوں گا۔ اپنی زبان اور اپنے عمل سے ثابت کروں گا کہ مجھ سے زیادہ وفادار پورے دفتر میں کوئی دوسرا کلرک نہیں ہے۔

دفتر کے پرانے اور سینئر کارکن مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ وہ بعض اوقات میری عادات کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ پہلے چوری چھپے سرگوشیوں میں پھر میرے سامنے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا یہ لوگ جو چاہیں کہیں میرے بارے میں جو بھی رائے قائم کریں میں اپنی ڈگر پر چلتا رہوں گا۔

میں سمجھتا تھا میرے افسر مجھ سے خوش ہیں۔ مجھ پر مہربان ہیں۔ میرا دل مطمئن تھا۔ میں اپنا کام بڑی توجہ اور محنت سے کرتا تھا۔ میرے ساتھی میرا مذاق اڑاتے تھے لیکن میں ان کی مطلق پروا نہ کرتا تھا۔

میری زندگی ایک دائرے میں گھوم رہی تھی۔

میں صبح چھ بجے بستر سے اٹھتا۔ نہا دھو کر لباس بدلتا۔ چائے کی ایک دوکان پر ناشتہ کرتا۔ وہاں چائے کی چسکیوں کے دوران اخبار کی سرخیوں پر ایک نظر بھی ڈال لیتا۔ پھر مزے سے ٹہلتا ہوا اپنے دفتر پہونچتا۔ اپنی میز کی چیزوں کو خود جھاڑتا۔ میز کو صاف کرتا۔ چپراسی مسکراتا رہتا۔ اس کے بعد میں اپنے کام میں جت جاتا۔ ایک بجے لنچ ٹائم پر دفتر کی کینٹین میں اکیلے کھانا کھاتا۔ اور لنچ کا وقفہ ختم ہونے سے پہلے پھر اپنی میز پر پہونچ جاتا۔ جب تک اس روز کا کام ختم نہ ہوتا، فائلوں پر سر کھپاتا رہتا۔ مجھے اپنے کام سے عشق تھا۔ کام ختم کر کے میں دفتر سے نکلتا۔ شام کا جھٹپٹا ہو چکا ہوتا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے میں ایک خاص تیسرے درجے کے ہوٹل میں پہونچ جاتا۔ رات کا کھانا کھاتا اور پھر ٹہلتا ہوا اپنے کمرے میں پہونچتا۔ کچھ دیر ریڈیو سنتا اور پھر سو جاتا۔

ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مجھے ستو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ ان پانچ سو روپوں میں سے ایک سو روپے ہر ماہ اپنی ماں کو گاؤں منی آرڈر کر دیتا۔ چار سو روپوں میں بڑی آسانی سے اپنا گزارا کر لیتا تھا۔ میرے اخراجات محدود تھے مہینے میں چار چھ کپڑوں کی دھلائی۔ صابن، ٹوتھ پیسٹ کا خرچ، پچاس کمرے کا کرایہ، صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، رات کا کھانا، ہاں جمعہ کو چھٹی کے دن میں فلم ضرور دیکھتا تھا۔ ہر مہینے میں دس بیس روپے بچا ہی لیتا تھا۔ نہ میں سگریٹ پیتا تھا نہ بار بار چائے۔ دوستوں کا روگ بھی میں نے نہیں پالا تھا۔ آگے پیچھے ایک بوڑھی ماں کے سوا کوئی نہ تھا جو آبائی گاؤں میں چھوٹے سے کچے گھر میں زندگی کے دن گزار رہی تھی۔

کبھی میرے دل میں بڑا آدمی بننے زندگی کی

آسودگیوں سے لطف اندوز ہونے کی خواہش بہت شدید تھی لیکن بے کاری کے لمبے عرصے نے سب خواہشوں اور امیدوں کو گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔ جب مجھے نوکری ملی تو میں بہت ہی بدل چکا تھا۔ اب زندگی ایک دائرے میں گھوم رہی تھی دفتر، کرائے کا کمرہ بس ......

میں نہیں جانتا یہ دائرہ کب ٹوٹا۔ کب اس دائرے میں ناہمواری پیدا ہوئی۔ ہاں مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک روز میرے بڑے افسر نے مجھے بلوایا۔ میں اپنی عادت کے مطابق سر جھکائے مودب انداز میں ان کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں سکڑ سمٹ کر کرسی میں سما گیا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔ افسر میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

میں نہال ہو گیا۔ جب بھی میرے افسر مجھے دیکھ کر مسکراتے تھے میں سمجھتا تھا کہ وہ مجھ سے بے حد خوش اور مطمئن ہیں۔ مجھ پر بے حد مہربان ہیں۔ اس روز بھی میں نے اسی ردعمل کو محسوس کیا۔ افسر کہہ رہا تھا۔

یہ فائل ضروری ہے اسے ختم کر کے جائیں۔

اس کا لہجہ معمول کے مطابق تھا۔ آواز کا اتار چڑھاؤ، الفاظ کا انتخاب ایسا ہی تھا جیسا کہ پہلے ہوتا تھا۔ لیکن اپنے افسر کی مسکراہٹ سے میرے اندر جو ردعمل پیدا ہوا تھا وہ یکسر ختم ہو گیا۔ اس جملے نے میری ذہنی کیفیت ہی بدل دی۔ ایک عجیب طرح کی کڑواہٹ اور تلخی کو میں نے محسوس کیا۔ میرا جھکا ہوا سر خود بخود اوپر اٹھ گیا۔ میں نے فائل اٹھائی اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے افسر کی طرف دیکھا مجھے یقین ہے کہ وہ حسب معمول مجھ سے یہ توقع کر رہا تھا کہ میں بڑے مہذب اور مودب لہجے میں کہوں گا "سر آپ کا حکم پورا ہو گا"۔

یہ الفاظ معمول کے مطابق میرے ہونٹوں تک پہنچے لیکن میری زبان کو حرکت نہ ہوئی۔ مجھے خود بھی حیرت ہوئی کہ آج میں نے اپنے افسر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ جملہ کیوں نہیں کہا۔

میں فائل اٹھا کر افسر کو سلام کیے اور کچھ کہے بغیر اس کے دفتر سے باہر نکل آیا۔ اس روز وہ فائل مجھے بوجھل اور بھاری لگی۔ حالانکہ اس سے پہلے میں نے فائلوں کے انبار اٹھائے تھے۔ اور وہ مجھے کبھی بھاری نہیں لگی تھی۔

اپنی میز پر بیٹھ کر میں نے فائل کو پڑھنا شروع کیا۔ لفظ میری آنکھوں کے سامنے دھندلانے لگے۔ ناچنے لگے۔ میں ان دھندلاتے اور ناچتے ہوئے لفظوں کو اپنی نظر کی گرفت میں لینے کی بہت کوشش کی۔ لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میرے دل میں ایک عجیب طرح کی تلخی اور کڑواہٹ پیدا ہو گئی تھی جس کا ذائقہ میں اپنی زبان تک پر محسوس کر رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ لیکن میں اس فائل پر کام نہ کر سکا۔ میں نے کئی بار ذہن کو جھٹکا، اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ سوچا کہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے کام میں میرا دل کیوں نہیں لگتا۔ مجھے اس دفتر میں اس سیٹ پر کام کرتے چار برس ہو چکے تھے۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ میں نے کام میں دلچسپی نہ لی ہو۔ میرے اندر ایک عجیب طرح کی کشمکش ہونے لگی۔ میں جب بھی اپنے ذہن کو سمیٹ کر توجہ سے فائل کو دیکھنا شروع کرتا مجھے افسر کا مسکراتا چہرہ دکھائی دیتا۔ اور اس کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی۔

یہ فائل ضروری ہے اسے آج ختم کر کے جائیں۔

اس جملے کی بازگشت کے ساتھ میرا ذہن منتشر ہو جاتا۔ میں نے فائل بند کی۔ اور کھانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا

کینٹین میں ہر روز کی طرح شور ہو رہا تھا ایک ہی وقت میں درجنوں آدمی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے جبڑے تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ وہ کچے پکے گوشت اور روٹیوں

کو جا رہے تھے۔ میں نے پہلے کبھی ایسی باتوں کی طرف توجہ نہ دی تھی۔ لیکن آج میں سب کچھ سن اور دیکھ رہا تھا۔ مجھے گھن سی آنے لگی۔ میں نے سوچا کہ میں بھی تو ان ہی کی طرح جبڑے ہلا رہا ہوں اس کے بعد مجھ سے کھانا نہ کھایا جا سکا۔

میں کینٹین سے نکل کر اپنے کمرے میں منتظر اپنی کرسی کی طرف نہیں گیا۔ بلکہ سڑک کے کنارے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نہیں جانتا۔ عادت اور معمول کے خلاف میرے قدم مجھے دفتر کی بجائے دفتر سے باہر کیوں لے آئے تھے۔ سڑک آباد تھی۔ تانگے رکشے۔ کاریں، بسیں آ جا رہی تھیں۔ طرح طرح کے مختلف چہروں والے انسان سڑک سے گزر رہے تھے۔ میں کچھ حیرت سے کچھ دلچسپی سے ان کو دیکھتا رہا۔ وقت گزرنے کا مجھے مطلق احساس نہ ہو رہا تھا۔ اچانک جب مجھے احساس ہوا کہ میں دفتری اوقات میں دفتر سے باہر کھڑا ہوں۔ تو میرے جسم میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ میں مسکرا رہا ہوں۔ میرا جی چاہا کہ کاش اس وقت میرے پاس آئینہ ہوتا۔ تو میں اس میں اپنا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ سکتا۔

اپنی میز پر بیٹھ کر میں نے پھر فائل کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ ضروری فائل میرے سامنے پڑی رہی۔ میرے دفتر کے ساتھی حیرت اور دلچسپی سے مجھے بے کار بیٹھے دیکھتے رہے تھے۔ ایک دو نے مجھے پر اسرار استفہامیہ انداز میں دیکھا۔ پھر ایک سینئر کلرک بول اٹھا۔

مسٹر کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش رہا۔ دو کلرک ہنس پڑے مجھے پتہ تھا کہ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ پھر ایک حیران کن بات ہوئی میں نے ان کے قہقہوں میں اپنے قہقہے کی آواز بھی سنی۔ میں ہنس رہا تھا۔

وہ سب مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ان کے قہقہوں نے دم توڑ دیا۔ لیکن میرا قہقہہ گونجتا رہا۔ میں کئی منٹوں تک

اکیلا ہی ہنستا رہا۔ وہ سب اب پریشان دکھائی دینے لگے تھے۔ پھر خاموشی چھا گئی لیکن میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا ——— اور قہقہے کی آواز سن رہا تھا جو مجھے اچھی لگ رہی تھی۔

میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ضروری فائل میرے سامنے بند پڑی تھی۔ پھر دفتر کے کلرک اور ساتھی اٹھنے لگے۔ ایک ایک کر کے۔ دفتر کا وقت ختم ہونے والا تھا۔

چپڑاسی اینٹھتا ہوا میری میز کے پاس آ کر رکا۔ "صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔" میں اٹھا۔ میں نے فائل اٹھائی۔

صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ میرا افسر مجھے بیٹھنے کے لئے اشارہ کرتا۔ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں بڑے اطمینان سے بے جھجک اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔

میں نے وہ فائل اپنے افسر کے سامنے رکھ دی۔

میرا سر جھکا ہوا نہیں تھا۔ نہ ہی میں کرسی میں سکڑا سمٹا بیٹھا ہوا تھا۔

"گڈ" میرے افسر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ نے کام ختم کر لیا"

میں نے اپنے افسر کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں اور بولا جی نہیں سر۔ میں نے آج کوئی کام نہیں کیا۔

حیرت اور غصے کے آثار مجھے اپنے افسر کے چہرے پر صاف دکھائی دیئے۔

آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے آپ کو حکم دیا تھا کہ یہ فائل بہت ضروری ہے۔ اس کا آج نمٹ جانا بہت ضروری تھا آپ نے کام کیوں نہیں کیا؟

میری آنکھیں اب بھی افسر کی آنکھوں کو گھور رہی تھیں۔

سر آج مجھے محسوس ہوا کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔

کیا کہہ رہے ہو تم۔ افسر آپے سے باہر آ گیا۔ کیسا اعتماد۔

ممتاز احمد خاں
(پاکستان)

ناجائز تجاوزات

بہت پرانی ایک شام جبکہ سورج ڈھلنے میں کچھ وقت باقی رہ گیا تھا اور گلیاں سنسان ہونے کی بولیاں دینے لگی تھیں تو سید محتشم میاں عرف میاں جی کا لڑکا احتشام باہر نکلا۔ تھوڑی دیر بعد اسے زار و قطار روتے اور پھٹے کپڑوں میں دیکھا گیا۔

"ہونہہ قصائی کی اولاد۔ نیچ ذات۔ یہ زمانہ آ گیا ہے کہ شرفا کی لڑکیوں کو تکتا ہے"۔

محلے کے ایک بزرگ نے مدھم لہجے میں یہ جملے کہے اور آگے بڑھ گئے موصوف یقیناً ان لوگوں میں سے ایک ہوں گے جو زندگی کے ہر عمل میں اونچی اور نیچی ذات کے درمیان حد فاصل کھینچنے کو ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔

تو جھگڑا سید محتشم کے لڑکے احتشام میاں اور فریدے قصائی کے لڑکے مستان کے درمیان ہوا تھا۔ مستان کا اصلی نام فریدے اور دیدے قسم کا ہی ہوگا۔ پر وہ مستان اس لئے کہلانے لگا کہ وہ گرمی اور سردی دونوں موسموں میں دھوتی پہنتا۔ سردیوں کے دوران جب فریدے اس سے کہتا کیوں بے۔ قمیص اور سوئٹر کیوں نہیں پہنتا؟ تو وہ جواب دیتا میرے جسم میں آگ جل رہی ہے ابا۔ فریدے لال پیلا ہوتے ہوئے کہتا آگ لگے تیرے جسم کی گرمی کو۔ چل دفع ہو یہاں سے نامراد۔

مستان دفع ہونے سے قبل فریدے کے کان میں کہتا۔ ابا مجھے ٹھکانے سے لگا دو نا۔

پھر فریدے اپنا لبدا اٹھا کر بڑھا ہوا اسے کاٹ ڈالنے کے لئے دوڑتا۔ مگر لبدا اوپر کا اوپر رہ جاتا اور مستان بھاگ کر ایک قدم چنڈو خانے میں پناہ لیتا۔

چند ہی لمحوں بعد خبر سید محتشم میاں عرف میاں جی کو پہونچی۔ وہ بھاگے بھاگے آئے اور دیکھا کہ احتشام میاں کا گریبان پھٹا ہوا ہے۔ اور مستان احتشام میاں کے سینے پر سوار ہے۔

میاں جی کو دیکھ کر وہ کود کر علٰحدہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ احتشام میاں گالی دیتے شرم نہیں آتی؟

اتفاق سے فریدے بھی ادھر سے گذرا۔ مستان نے چھوٹی شرکا پتوں کا ڈھیر الٹ دیا۔ فریدے نے میاں جی کے سامنے اس وقت زبان نہیں کھولی۔ البتہ ہاتھ ملنے لگا کہ میاں جی پر واضح ہو جائے کہ وہ احتشام میاں کے رویے پر نادم ہے۔

میاں جی کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔ انہوں نے احتشام میاں کا ہاتھ پکڑا۔ اور گھر چلے گئے اور پھر سب لوگوں نے سنا کہ انہوں نے زندگی میں پہلی بار چھڑی کا استعمال کیا۔ وہ اس قدر غصے میں بھرے ہوئے تھے کہ جب احتشام میاں کی ماں نے ان سے چھڑی چھیننے کی کوشش کی تو انہوں نے جھٹ طلاق کی دھمکی دیدی۔ اور وہ تھر تھر کانپتی ہوئی اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئیں۔

اب لاکھ احتشام میاں نے کہا کہ مستان نے ان پر گالی کا غلط الزام لگایا تھا اور یہ کہ انہوں نے تو مستان سے صرف اتنا کہا تھا کہ اسے محلے کی جوان لڑکی کو تانگے کا پردہ اٹھا کر نہیں دیکھنا چاہئے تھا۔ اس پر مستان نے الٹا ان پر زد و کوب کیا تھا۔ لیکن میاں جی کچھ سننے اور یقین کرنے

تیار نہ تھے۔

اسی رات جب مستان نے فریدے کو بتایا کہ احتشام میاں تو بالکل بے قصور تھے۔ تو اس پر فریدے نے جب سالن کی پلیٹ اس کے منہ پر دے ماری۔ اور وہ اپنی آنکھوں پر بھیگی تولیہ لگائے زنگی کا ناچ ناچنے لگا۔

یہ تم سے معافی مانگنے آیا ہے۔ میاں جی نے احتشام میاں کو آگے بڑھا دیا۔

فریدے نے فوراً میاں جی کا دامن پکڑ لیا اور اسے بار بار آنکھوں سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔ یہ نہیں ہو سکتا میاں جی —— دراصل قصور مستان کا بھی تھا۔

پھر کئی برس بیت گئے تو میاں جی نے اپنے آپ کو اتنی تیز روشنی میں موجود پایا کہ انہیں محسوس ہوا کہ ان کے سامنے سب کچھ اندھیرے کے سمندر میں ڈوب چکا ہے کبھی کبھی وہ سوچتے —— ہم خود بھی اس میں ڈبکیاں مارتے تہہ میں اتر جائیں گے۔ البتہ لوگ سمجھتے تھے کہ میاں جی بڑے خوش نصیب ہیں اس لئے کہ انہوں نے گیا وقت بھی دیکھا تھا اور موجودہ وقت میں بھی سانس لے رہے تھے۔ حالانکہ وہ اپنے تئیں سمجھتے تھے کہ وہ دو زمانوں کے درمیان محض پل کا کام انجام دے رہے ہیں

لیکن فریدے اور مستان کا کچھ پتہ نہ چلا۔ میاں جی کا خیال تھا کہ تقسیم ہند کے موقع پر ہنگاموں کی نذر ہو چکا ہوگا۔ ادھر فریدے بھی میاں جی کے گھرانے کے متعلق یہی گمان رکھتا تھا۔ کہ وہ مر کھپ گئے ہوں گے۔

میاں جی کی اللہ اللہ کی دنیا وہیں کی وہیں تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اس دنیا کو سرائے سمجھ کر تمام عمر اگلی دنیا کے لئے زاد راہ جمع کرنے میں جٹے رہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی وہ سوچتے کہ کیا وہ وہی ہیں جو وہ اگلے دنوں میں تھے؟ احتشام میاں جو شہر کے کامیاب بزنس مین تھے۔ جب رات گئے کلب یا پارٹیوں میں سے جھومتے جھامتے واپس آتے تو وہ پہلی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی کھول کر ان پر افسوس کی نگاہ ڈالتے اور بستر پر جا پڑتے۔ لیکن ان میں احتشام میاں کو نصیحت کرنے کا جذبہ مفقود ہو گیا تھا۔ عجیب لاچار ہو گئے تھے وہ۔

ایک دن انہوں نے دیکھا کہ احتشام میاں ایک رسالہ پڑھ کر خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ انہوں نے وہ رسالہ مانگ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں ان کے ایک بھتیجے کی لڑکی حمیرا کا انٹرویو چھپا تھا۔ جس میں اس نے شادی سے قبل لڑکے اور لڑکی کے آزادانہ میل جول کی حمایت کی تھی۔ حمیرا یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ اور میاں جی کے پوتے یعنی احتشام میاں کے لاڈلے لڑکے ببی اس پر جان چھڑکتے تھے۔

میاں جی انٹرویو پڑھ کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے۔ اور احتشام میاں ان کی اس کیفیت سے بڑے محظوظ ہوئے

ہر شخص کی زندگی میں متوازی واقعات ضرور وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ بات میاں جی کے ذہن میں اس وقت آئی جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا پوتا ببی اسی علاقے کے ایک کوٹھی میں رہنے والے ہم جماعت لڑکے عارف خاں کو زد و کوب کر رہا ہے۔ اچانک احتشام میاں وہاں گئے اور دونوں کو الگ کیا۔ بعد میں میاں جی بھی وہاں پہونچ گئے۔ ایک لمحے کو ان کے دل میں خیال آیا کہ کاش وہ ببی کو گولی مار سکتے۔

ببی احتشام میاں اور میاں جی کی موجودگی میں بدستور عارف خاں کو مغلظات سنا رہا ہے۔ احتشام میاں نے بڑی نرمی سے ببی سے کہا۔

آپ یہاں سے جائیے۔

ببی نے تیزی سے اپنے گڈو، پپو، سونی، سٹو کی

اور ڈو ڈو قسم کے دوستوں کو اپنی اسپورٹس کار میں بٹھایا اور رفو چکر ہو گیا۔ عارف بھی کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور اپنی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

احتشام میاں میاں جی کو دیکھتے ہوئے بولے، ہونہہ یہ سب کم عقل بچے ہیں آپ ہی سدھر جائیں گے۔

میاں جی کچھ جواب دینا چاہتے تھے۔ کہ احتشام میاں اپنی کار میں بیٹھے اور ہوا ہو گئے۔ اس طرح میاں جی منہ لٹکائے گھر واپس آ گئے

بڑھاپے میں ہر شخص کو کسی نہ کسی قسم کی کرید یا فکر ہوتی ہے۔ میاں جی بھی اس عادت سے مبرا نہ تھے۔ انہوں نے جلد یہ پتہ چلا لیا کہ عارف خاں اسی علاقے کی پانچویں لین میں رہتا تھا اس کے باپ چھوٹے خاں صاحب کے نام سے مشہور تھے۔

پھر جب ایک دن یہ ہوا کہ بچی کی کار پر نامعلوم لوگوں نے لگاتار گولیاں برسائیں جس سے اس کی کار کی ٹائر پھٹ گئے اور شیشے چکنا چور ہو گئے، اور وہ خود زندہ رہا تو احتشام میاں اشتعال میں آ گئے۔ انہوں نے شبہ ظاہر کیا کہ یہ سب عارف خاں کی کارستانی ہے وہ اس کے خلاف اقدام قتل کی رپورٹ لکھوانے کے لئے تیار ہو گئے لیکن میاں جی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ذرا توقف کریں۔

کیوں؟ احتشام میاں نے ترشی کے ساتھ پوچھا

میں اس لڑکے کے باپ سے خود ملوں گا۔

پھر کیا ہوگا؟

جھگڑا رفع دفع ہو جائے گا۔

یہ محض آپ کا خیال ہے۔ احتشام میاں نے جواب دیا۔

اتنے میں بچی بھی آ گیا۔ وہ بڑا بپھرا ہوا تھا میاں جی نے اسے سمجھایا کہ وہ خون خرابے سے بچے۔ ورنہ اس کی لپیٹ میں سب آ جائیں گے۔

میں خون خرابے سے نہیں ڈرتا دادا۔ بچی چیخا۔ ویسے جب تک میں زندہ ہوں وہ حمیرا سے شادی نہیں کر سکتا۔

خیر میں چھوٹے خاں صاحب سے بات ضرور کروں گا۔ میاں جی نے بڑی ہمت کر کے کہا۔ اور کمرے سے اٹھ کر چلے گئے۔

یہ نہیں بدلیں گے احتشام میاں نے میاں جی کے لئے رائے پیش کی۔

احتشام میاں کی بیوی جو یہ منظر خاموشی سے دیکھ رہی تھیں کہنے لگیں۔

تم اور تمہاری اولاد بدل گئی لہذا فکر کی کیا ضرورت ہے۔؟

احتشام میاں ان کا وار سہہ گئے۔ اور دیوار پر ٹنگی نیم برہنہ عورت کی تصویر پر نگاہیں گاڑ دیں۔

دوسری طرف میاں جی چھوٹے خاں صاحب پر مذہبی اصولوں کی بنیاد پر یہ زور دے رہے تھے کہ مسلمان کو مسلمان کے ہاتھ سے گزند نہیں پہونچنا چاہئے۔ ادھر چھوٹے خاں صاحب سر ہلا ہلا کر ان کی ہر بات کی تائید کرتے جا رہے تھے۔ پھر وہ ذرا تیز لہجے میں بولے۔

عارف خاں ہمارا اکلوتا بچہ ہے۔ ہم تو اس کی ہر خواہش پوری کرنے کے لئے جان تک لڑا دیتے ہیں۔

اس کا تو آپ کو حق ہے۔ میاں جی انکساری کے ساتھ بولے۔ تو میں یہ سمجھوں کہ اب جھگڑا ختم؟

چھوٹے خاں صاحب مسکرائے اور بولے ہم تو پہلے ہی رفع شر کا اہتمام کر چکے ہیں۔

کیا مطلب؟ میاں جی نے بھولے پن سے پوچھا۔

میں ابھی آیا؟ چھوٹے خاں صاحب اندر گئے۔

اور ساتھ ہی حمیرا اور عارف خاں کے ساتھ برآمد ہوئے۔

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر)

شام بارکپوری

جمنا

عرصۂ دراز سے مشرقی بنگال کے شمال میں رواں دواں ہوں۔ میری روانی اور بہاؤ میں ایسی مستی ہے کہ مجھ پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہوگئی ہے میری چنچل موجیں اور چھل مل کرتا پانی دعوت نظارہ دیتا ہے۔ میری تہہ میں ہزاروں قسم کی مچھلیاں، جھینگے، کیکڑے، کچھوے، گھڑیال، مگرمچھ اور آبی جانور تیرتے پھر رہے ہیں۔ اپنی کاوش اور جدوجہد سے لہروں کو قابو میں رکھا ہے۔ جب کبھی میری رگوں میں لہریں برافروختہ ہوکر سرکشی کرنا چاہتی ہیں تو میری بردباری سے وہ سرنگوں ہوجاتی ہیں۔ جذبات کا لاوا اندر ہی اندر کھول کر جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ پھر میں بےخودی اور سیماب کی طرح بہتی چلی جاتی ہوں۔ ظاہری طور پر پرسکون ——— لیکن اندر سے ہیجان اور اشتعال

نہ جانے آج میں کیوں اپنے وجود کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوگئی ہوں۔ میرے ذہن میں بھولی بسری یادوں کی لہریں سی اٹھنے لگی ہیں۔ اپنی زندگی کی تاریخ کا ہر صفحہ کھول کر پڑھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ بنگلہ دیش کے شمال میں بہہ رہی ہوں۔ لوگ مجھے "جمنا" کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ دریائے جمنا نہیں جو ہندوستان میں بہتا ہے۔ میں اس کی ہم نام مگر چھوٹے ملک کی چھوٹی سی ندی ——— میں اپنی برق رفتاری، طوفانی موجوں اور غضب ناک لہروں کے باعث بڑے بڑے دریاؤں کو نیچا دکھاتی ہوں۔ میرے دامن میں سکون بھی ہے۔ اور ہنگامہ بھی۔ میری سرشت میں محبت کی ٹھنڈک بھی ہے۔ اور غضب ناک لہروں کا شور بھی۔

میں کب وجود میں آئی یہ بتانا میرے لئے مشکل ہے میرا جنم داتا ہمالہ ہے۔ وہ ہمالہ جو تمام دریاؤں کا منبع ہے جہاں سے تمام دریاؤں کی شاخیں نکلتی ہیں۔ کبھی کبھی میرے ذہن میں بچپن کا دھندلا سا عکس ابھر آتا ہے۔ وہ خیالی خاکہ میرے ذہن میں چند لمحے کے لئے تاثر پیدا کردیتا ہے۔ صدیوں پہلے ہمالہ کے برفانی علاقے میں گشت کرتی رہی۔ سردی سے ٹھٹھری ماری ماری پھر رہی تھی۔ برفانی ہوائیں جیسے مجھے سنجد کئے دے رہی تھیں۔ دنیا دیکھنے کی خواہش میرے دل میں انگڑائیاں لینے لگی تھی۔ میں ڈری سہمی پہاڑی علاقے سے نکلنے کی جان توڑ کوشش کرنے لگی۔ لیکن سر بفلک پہاڑ میرے سامنے رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ میری ننھی سی جان ان کی ہیبت سے خوف زدہ تھی۔ ان کے خوف سے اور بھی منجمد ہو جاتی۔ لیکن اس خول سے نکلنے کی جان توڑ کوشش اور باہر کی دنیا کی کشش نے میری رگ وپے میں جوش اور ولولہ بھر دیا تھا۔ میں نئی دنیا کی جیتی جاگتی، رنگا رنگ زندگی کی دھڑکنیں سننے کو بےتاب تھی۔ میرے لئے نئی دنیا تجسس کا باعث تھی۔ میری رگوں میں ایک نئی لہ دوڑنے لگی تھی۔ میرا انگ انگ سدِّراہ کو پار کر کے چنچل ندی کی طرح بہہ نکلنے کو بےقرار تھا۔ مجھے اپنی بےبسی پر غصہ آتا۔ میں غم واندوہ میں ڈوب جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی مجھے روشنی کی دنیا کی طرف آواز دے کر بلا رہا ہے۔ جب کبھی تاریک غار کی دراڑوں میں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر آتیں میرے

دل میں بھی بحرِ ظلمات سے نکل کر روشنی کے آبشار سے غسل کرنے کی خواہش کروٹیں لینے لگتی۔ آرزو جس کی کوئی حد مقرر نہیں۔ نئی دنیا سے ہم آغوش ہونے کا خیال میرے دماغ میں شمع کی طرح فروزاں تھا۔ میرا بہاؤ اور روانی محدود تھی۔ میں شکستگی اور طاقت کی محرومی کا شکار تھی۔ اچانک آفتاب کی شعاعوں نے مجھے خواب سے بیدار کردیا۔ اس سے باہر کی دنیا سے رابطہ قائم کرنے کے حوصلے کو تقویت پہونچی۔ ان پہاڑوں سے نظریں بچاکر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔

میری سعیِ پیہم اور ارادے کی پختگی رائیگاں نہ گئی۔ اچانک ایک دن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری قوت پہلے سے کئی گنا اضافہ ہوگئی ہے۔ میں متحرک بن گئی۔ سبک خرامی کی جگہ بپھری ہوئی موجوں میں تبدیل ہوگئی۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کون سا لمحہ اور کون سا جذبہ تھا۔ جب میری رگوں میں برقی لہریں دوڑ گئیں۔ اور میں باڑھ کے ریلے کی طرح اپنے سامنے آئی ہوئی ہر چیز کو تنکوں کی طرح ہٹاتی ہوئی نکل گئی۔ میں پتھروں، چٹانوں، پہاڑوں، ٹیلوں، جنگلوں، میدانوں، سبزہ زاروں میں لہراتی، بل کھاتی بہتی ہوئی گذرنے لگی۔ میری تندی رفتار سے بے رحم پتھر اور سخت چٹانیں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔ میری خشمگیں لہریں جب ٹیلوں سے ٹکرائیں تو وہ ریزہ ریزہ ہوگئے۔ جب سورج کی کرنیں میرے صاف و شفاف پانی پر پڑتیں تو میرا جسم سیماب کی طرح جھلمل جھلمل کرنے لگتا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ بہتیرا مجھے یہاں لے آیا تھا۔ اب محسوس کرتی ہوں کہ قدرت نے مجھے کوہستانی قید و بند سے نکلنے کی عظیم طاقت عطا کی تھی۔ اس کی کرامت اور نیاز مندی سے میرے سامنے کھڑی ہوئی تمام دیواریں مسمار ہوگئیں جس کے بل بوتے پر پہاڑوں کے سینے چیرتی ہوئی اور ان کے سروں سے گزرتی ہوئی روانی سے بہتی ہوئی یہاں تک آ گئی۔

پہاڑی سلسلے سے نکلنے کے بعد پہلے پہل تو غیض و غضب سے میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ رفتہ رفتہ میری رفتار میں سبک خرامی آگئی۔ اب اونچے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ میں میدانی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ سرسبز و شاداب راہوں پر چلتے ہوئے میری رفتار میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ خوشی سے سرشار۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں سے گلے ملتے ہوئے، پرپیچ راستوں سے گزرتے ہوئے آخر کار نغمہ و آہنگ اور سبزہ زاروں کی سرزمین بنگلہ دیش میں ایک بڑی ندی بن کر نمودار ہوئی۔ یہاں کا قدرتی حسن دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ میری جو ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ سرور و انبساط میں بدل گئی۔

مجھے ایک عورت سے مثال دی جاسکتی ہے جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو دودھ پلا پلا کر پروان چڑھاتی ہے ندی بھی اپنے پانی سے خشک اور بنجر زمین کو سینچ کر زرخیز بناتی ہے۔ تب کاشتکاری ہوتی ہے۔ فصلیں اگتی ہیں اور انسان کے پیٹ کی آگ بجھتی ہے۔

جب میں یہاں کے کھیتوں میں دھان کی بالیوں کی سنہری چمک، درختوں میں پکے ہوئے پھلوں کی خوشبو اور محنت کش دہقانوں کے جسم سے نکلی ہوئی مٹی کی مہک سونگھتی ہوں۔ تو میرا دل خوشی سے معمور ہو جاتا ہے جس طرح ماں اپنے بچے کو کبھی جھڑکتی ہے، مارتی ہے اور کبھی سینے سے بھی لگاتی ہے میری فطرت بھی ایسی ہے

درختوں کے سرسبز پتوں، پھول کی پنکھڑیوں، اور درختوں پر آبدار موتی کی طرح چمکتے ہوئے شبنم کے قطروں سے میں مدہوش ہو جاتی ہوں۔ سنسان جنگل میں خوش الحان چڑیوں کی چہکار سے زندگی اپنی پوری

رعنائی سے عود کر آتی ہے۔ صبح کے وقت سورج کی کرنیں، زمین پر سونا بکھیرتی ہیں۔ فلک نیلگوں پر اڑتے ہوئے سفید سفید بادلوں کے قافلے دلکشی میں چار چاند لگاتے ہیں۔ دور کسی بانسری کی لے سے فضا میں موسیقی سے بکھر جاتی ہے۔ ہر طرف مسرت و شادمانی کا سماں نظر آتا ہے

جب میں ظلمت کے غار سے نکلی تو ان حسین مناظر کو حیرت سے تکتی، دونوں کناروں کے حسین نظاروں کو دیکھ کر جنت ارضی کا گمان ہونے لگا۔ قدرت کی صناعی کی قائل ہو گئی۔

دھان اور پٹسن کے لہلہاتے کھیتوں سے میری آنکھوں میں تراوٹ گھلنے لگتی ہے۔ دونوں کناروں پر سینکڑوں گاؤں، بازار اور گھاٹ آباد ہیں۔ انسان کی خوشی اور غم دیکھ کر حیران رہ جاتی ہوں۔ ان کے دکھی دلوں کی زبان سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ صبح و شام ہشیار اسٹیمر، لانچ اور مچھیروں کی کشتیاں میرے سینے پر دندناتی ہوئی گذرتی ہیں۔ شام کو شفق پھولتی ہے اور صبح کو آفتاب اپنی سنہری کرنیں بکھیرنے لگتا ہے۔ تو ماجھیوں کی بھٹیالی، مرشدی اور باؤل گیت کی مدھر تان فضا میں رس گھولنے لگتی ہے۔

میں بنگلہ دیش کی ندیوں میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہوں۔ چہرے پر چاندی کی چمک، جسم میرے شوخ اور چنچل لہروں کا کارواں، دل میں سرور و کیف کی جھنکار، دماغ میں کیف و مستی کا ترنم جاگزیں ہیں۔ میرے بے شمار روپ ہیں۔ کبھی پر سکون جیسے شہر خموشاں کبھی بے چین جیسے ماہی بے آب، کبھی متین و سنجیدہ جیسے فلسفی کی گتھی سلجھانے کی کوشش، کبھی بپھری ہوئی جیسے بپھری رگ رگ میں بجلی دوڑ رہی ہو۔ کبھی اتنی غضب ناک کہ آسمان بھی اشکبار ہو جائے۔ کبھی اتنی نادان کہ اپنی عشوہ طرازیوں سے مسحور کردوں۔ کبھی خادمہ جیسی کہ دوسروں کی خدمت گذاری سے اپنے دل میں انوکھی لذت محسوس کرتی۔ موسم کی تبدیلی کے ساتھ میرا مزاج، رنگ و روپ بھی بدل جاتا ہے۔

ہر موسم میں میرے روپ، خیالات اور جذبات میں تبدیلی آجاتی ہے۔ سردی میں سکڑ کر پر سکون ہو جاتی ہوں۔ روانی میں سبک خرامی آجاتی ہے۔ موسم سرما میں کہر کی چادر اوڑھے سوئی رہتی ہوں۔ جب سورج کی نرم نرم کرنیں میری رگوں میں حرارت پیدا کرتی ہیں۔ تو بیدار ہو جاتی ہوں کہر کے دبیز پردے سے آہستہ آہستہ جھانکتی ہوں اور عزم و استقلال کی دیوی بن جاتی ہوں۔

برسات میں جو کچھ حاصل کرتی ہوں سردی میں خاموشی سے لوٹا دیتی ہوں۔

موسم بہار میں کوئل کی کوک سنائی دیتی ہے خوشگوار ہوائیں جب درخت کے پتوں سے ٹکراتی ہیں تو جلترنگ سا بجنے لگتا ہے۔ درختوں میں نئی نئی کونپلیں آرزوں کی طرح پھوٹنے لگتی ہیں۔ میرے چہرے کی رونق اور شادابی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تصور میں سنہرے خواب بننے لگتی ہوں۔ آشاؤں کے دیپ روشن ہو جاتے ہیں۔ دونوں کناروں کے جنگلوں کو سدا بہار دیکھ کر میرا دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔

بیساکھ میں تیور بدل کر جنگ جو بن جاتی ہوں۔ میرا کردار سوتیلی ماں کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس موسم میں جب تند و تیز ہوائیں میرے سینے میں سوئیاں چبھوتی ہوئی گذرتی ہیں تو سیلاب کا لشکر حملہ آور ہوتا ہے۔ تاڑ ناریل، کیلے، آم، جامن، کٹھل، کے درختوں اور ماجھیوں کی رواں دواں کشتیوں کو تہہ و بالا کر دیتی ہوں۔ اس وقت خواب غفلت میں پڑی ہوئی میری فوجیں شمشیر برہنہ ہو

جاتی ہیں۔ معرکہ آرائی کا عجیب منظر ہو جاتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ سبھوں کو شکست دے کر فتح کا پرچم لہراتی ہوں۔ اس سیلابی جنگ میں کتنے گھر تباہ، کتنی جھونپڑیاں برباد، کتنے درخت زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ کتنے جہاز اور کشتیاں ڈوب جاتی ہیں۔ بے شمار انسان لقمۂ اجل ہو جاتے ہیں۔

جب جذبات کی آنچ دھیمی پڑتی ہے۔ خیالات میں ٹھہراؤ آتا ہے۔ اور موسم کا تیور بدل جاتا ہے تو میرے اندر کی ممتا جاگ اٹھتی ہے۔ افسوس کہ میں پریشان حالوں اور زخمیوں کو دلاسا بھی نہیں دے سکتی۔ یہ میرے اختیار اور قدرت کے بنائے ہوئے قانون سے باہر ہے۔

اکثر یہ خیال میرے ذہن میں کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ میرا وجود کس لئے ہے؟ دنیا میں میرا مقام کیا ہے؟ جب غور سے ان تمام باتوں کا جائزہ لیتی ہوں۔ تو یہ عقدہ کھلتا ہے کہ انسان کے کام آنے کے لئے ہماری زندگی وقف کر دی گئی ہے۔ قدرت کا نظام چلانے کے لئے ہمیں وجود میں لایا گیا ہے۔ اپنے لئے تو سبھی جیتے ہیں۔ دوسروں کے لئے قربانی کون دیتا ہے؟ قدرت کی حکم عدولی کی مجھ میں جرأت نہیں۔ میں حالات کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے والی ندی ہوں جس کی زرخیزی انسان کی بھوک مٹاتی ہے۔ اور کبھی قہر الٰہی بن کر انہیں تہہ و بالا کر دیتی ہے۔ ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ قدرت نے میری فطرت میں تخریب و تعمیر دونوں عناصر شامل کر دیئے ہیں۔

برسوں سے میں بنگلہ دیش کے سینے پر نشیب و فراز کا مرکز بن گئی ہوں۔ میرا کام مسلسل بہنا ہے۔ رکنا نہیں۔ اسی طرح بہتے بہتے ایک دن اپنی ایک بہن "پدما" سے ناگر باڑی کے سنگم پر میری ملاقات ہوئی۔ وہ بھی سالہا سال سے شمال مغرب سے بہتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ وہ کچھ سست اور پژمردہ دکھائی دی۔ اس کی روانی میں تیزی اور تندی نہ تھی۔ کبھی اس کی جولانئ طبیعت سے یہ ملک ہرا بھرا رہتا تھا۔ موسم سرما میں اس کے چہرے پر اداسی دیکھ کر افسوس ہوا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ ہم دونوں سرمستی کے عالم میں بانہوں میں بانہیں ڈالے بہے جا رہے تھے۔

ندی کے بیچ میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے ٹاپو ابھر آتے ہیں۔ وہاں کی جھونپڑیوں میں کسان ملاح رہتے ہیں اور وہ کاشت کار جو دھان بوتے اور کاٹتے ہیں سبھوں کو موسم کے تیور سے آگاہ کرتی ہوں۔ پناہ کی تلاش اور ہوشیار رہنے کی تلقین کرتی ہوں۔ اس کے بعد مٹی، پانی، اور ہوا کا طاغوتی چکر شروع ہو جاتا ہے۔ پہاڑ اپنا پانی ڈھکیلتا ہوا ہماری طرف ڈھکیل دیتا ہے۔ سمندر سے جوار بھاٹا کا ایسا ریلا آتا ہے کہ ہماری بساط سے باہر ہو جاتا ہے۔ میں اتنے سارے ریلوں کو کہاں کہاں جگہ دوں گی میری گہرائی میں اتنی وسعت کہاں؟ اس لئے سیلاب آتا ہے اور زوردار آتا ہے۔ یہاں تک کہ سب کچھ بہا لے جاتا ہے۔

پانی کی یورش ہر چیز کو بہا لے جاتی ہے۔ اتنے دنوں جو چھوٹے چھوٹے ٹاپو چھپ گئے تھے حملہ کر کے دوبارہ ان پر قابض ہو جاتی ہوں۔ دریا کے دونوں کناروں کی مٹی کے تودے کٹ کٹ کر گرنے لگے ہیں جب پانی کی سطح آہستہ آہستہ کم ہوتی ہے۔ میں سکڑنے لگتی ہوں۔ تو زرخیز مٹی کا ذخیرہ چھوڑ آتی ہوں۔ جو فصلوں کی کاشت میں نیا خون بن جاتا ہے۔ فائدے کے لئے چھوٹا موٹا نقصانات اٹھانا عین فطرت ہے۔ جبکہ یہاں کی سرزمین طوفانوں کی لوریاں اور سیلابوں کی تھپکیاں سننے کی عادی ہے۔

برسات میں میرے جوبن کا نکھار بڑھ جاتا ہے۔ میرے چہرے کا اصلی رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ آسمان پر اودے اودے بادل، بارش کی رم جھم، پہاڑیوں سے آیا ہوا گدلا پانی جنوب میں خلیج بنگال سے آئے ہوئے مدوجزر کا زور، چنگھاڑتی ہوئی ہوا کا شور ـــــ سب مل کر برکھا رت کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔ جہاں سردیوں میں میرے کانوں میں "باؤل" نغمے کا رس گھل جاتا ہے۔ اب اس کی جگہ میگھ ملہار کی راگ سنائی دیتی ہے۔ بانسری کی سحر آگیں آواز جادو بکھیر دیتی ہے۔ ڈھول اور تاشے کی آواز سے فضا گونج اٹھتی ہے۔

"پدما" میری ہم رکاب ہے چاندپور کے قریب "میگھنا" سے مل کر بڑی مست ہوئی۔ وہ شمال مشرق سے بہتی ہوئی اپنے ساتھ سیلاب کا گدلا پانی لے کر آئی۔ ہم تینوں کے ملاپ سے ہمارا صاف و شفاف بدن بھی مٹیالا ہو جاتا ہے۔ موجوں کے شور اور تھپیڑوں سے ہمارے سینے کا زیر و بم قابل دید ہوتا ہے۔ نیلے آکاش پر جب کالے کالے میگھ چھا جاتے ہیں۔ اور جھما جھم پانی برسنے لگتا ہے تو میرا رنگ بھی گدلا اور مٹیالا ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لئے اس کا نام "میگھنا" ہے بہرحال ہم تینوں ہنستے، کھیلتے، کودتے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے ایک دریا بن جاتے ہیں ـــــ اپنی چھالانی فطرت کے باوجود پدما اور میگھنا دونوں کو ہمسفر بنائے ہوئے تیزی سے سمندر کی طرف بڑھتی جا رہی ہوں۔

نہ معلوم کتنے دنوں اور کب تک یوں ہی بہتی رہوں گی میری کارگزاریوں سے ندی میں ٹاپو ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ کبھی ندی کے پاٹ کشادہ ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی سکڑ کر کسی حسینہ کے خوب صورت لب بن جاتے ہیں۔ جس کے درمیان دانتوں کی لڑیاں ندی کی طرح آبدار اور شفاف دکھائی دیتی ہیں۔ نسیم صبح کے خوشگوار جھونکے، دوپہر میں چمکتا ہوا سورج، رات میں ستاروں کا جال، چھٹکی ہوئی چاندنی فلک کی وسعتوں پر مائل پرواز پرندے ـــــ یہ بھی میرے ہمسفر ہیں۔ مسکان اور آنسو، غم اور خوشی محبت اور نفرت شکست اور ریخت، کی تاریخ اپنے سینے میں دفن کئے بس بہے جا رہی ہوں۔

چاندپور کے کنارے پر ہم دو کے بجائے تین دریا مل کر ایک بڑے دریا میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہماری تیز رفتار کسی رکاوٹ کے بغیر ساگر کی طرف لے جا رہی ہے۔ سمندر میں مدغم ہو جانا ہماری زندگی کی تکمیل ہے۔ قطرے کو موتی بننے کے لئے ایک کٹھن مرحلے سے گذرنا پڑتا ہے۔ میں جو ایک ندی ہوں خلیج بنگال میں گر کر سمندر میں شامل ہو جانا ہی میری منزل ہے۔

میں اپنی لہروں کے بازو پھیلائے سمندر سے گلے ملنے کے لئے بیقراری سے بڑھ رہی ہوں۔ بحر بیکراں اپنا سینہ کشادہ کئے مجھے گلے لگانے کے لئے بے تاب ہے۔ میں اس کے دامن میں پھیل کر سمندر بن جاؤں گی۔ گویا یہی میری تقدیر بھی ہے۔ اور زندگی کا مقصد بھی۔ ●

غضنفر

عمارت

کہا جاتا ہے اور دیکھا بھی گیا ہے کہ جب جب کرۂ ارض پر کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی ہوئی تب تب یہ اعلان ہوا:

لوگو! تمہارے لئے ایک عمارت تعمیر کر
دی گئی ہے۔ ایسی عمارت جو آکسیجن
سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں داخل ہو جاؤ
تمہارے پھیپھڑے کاربن سے محفوظ ہو جائینگے
اور تم ابد تک سکون کی سانس لے سکوگے۔

کاربنی فضا میں گھٹتے ہوئے عاجز و پریشان لوگ یہ اعلان سنتے ہی اس عمارت میں داخل ہو گئے۔ کچھ عرصے تک ان کے پھیپھڑے کاربن ڈائی آکسائیڈ سے محفوظ رہے۔ لیکن دھیرے دھیرے اس عمارت کی آکسیجن کم ہوتی گئی۔ اور ایک دن ایسا آگیا کہ وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ سے بھر گئی۔ واقعی وہ کاربن سے بھر گئی۔ یا لوگوں کو ایسا محسوس ہوا۔ یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ حقیقت ضرور ہے کہ لوگوں کی سانسیں پھولنے لگیں۔ اور ان کا دم گھٹنے لگا۔ ان کی بے چینی اتنی بڑھ گئی۔ کہ وہ اس عمارت کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ عمارت سے باہر آکر انہیں آکسیجن حاصل ہو گئی ...... باہر ان کی گھٹن اور بڑھ گئی۔ اور وہ آکسیجن کی طلب اور تلاش میں تڑپنے لگے ...... اس وقت پھر اعلان ہوا:

اے پریشان لوگو! گھبراؤ نہیں۔ تمہارے
لئے ایک عمارت بنا دی گئی ہے۔ اس
میں داخل ہو جاؤ! تمہیں ہمیشہ کے لئے
سکون حاصل ہو جائے گا۔

لوگ پھر اس عمارت میں داخل ہو گئے۔ ان کی کھنچی ہوئی مٹھیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ پھولی ہوئی رگیں معمول پر آگئیں۔ اور تنفس کے راستے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے شکنجوں سے آزاد ہو گئے۔ لیکن کچھ عرصے بعد لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ان کی گردنیں کھنچنے لگی ہیں۔ رگیں پھولتی جا رہی ہیں اور تنفس کے راستے کسی شکنجے میں جکڑنے لگے ہیں۔

رفتہ رفتہ لوگ اس عمارت سے بھی باہر آگئے۔ اور اضطراب کے ساتھ کسی محفوظ جگہ کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔

پھر ایک عمارت کا اعلان ہوا۔ ...... لوگ اس میں داخل ہوئے ...... آکسیجن ...... پھر کاربن ڈائی آکسائیڈ ...... پھر عمارت کا اعلان ...... اور پھر آکسیجن اور کاربن کا سلسلہ ......

یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا۔ آخر کار وہ غیبی اعلان کچھ اضافے کے ساتھ یوں ہوا۔

مژدہ اے جاں بلب لوگو! تمہارے
لئے معمار اعلیٰ نے ایک ایسی عمارت تعمیر
کر دی ہے جو اندر، باہر، اوپر، نیچے،
دائیں، بائیں ہر طرف سے محفوظ ہے۔ اور
نہایت ہی پر سکون ہے۔ اس میں ایسی
آکسیجن بھری گئی ہے۔ جو کبھی ختم نہیں
ہوگی۔ اور جو ابد تک تمہاری ضرورتیں

پوری کرتی رہے گی ۔ اور اس میں کبھی
تمہارا دم نہیں گھٹے گا ...... یاد رکھو
یہ کرۂ ارض پر آخری عمارت ہے اس کے
بعد کوئی عمارت تعمیر نہیں کی جائے گی۔
اس لئے کہ یہ عمارت ہر طرح سے مکمل ہے
اس میں داخل ہو جاؤ! ہمیشہ ہمیش کے
لئے محفوظ اور پرسکون ہو جاؤ گے ؛

کاربن زدہ لوگ تیزی سے اس عمارت میں داخل ہو گئے۔ آکسیجن ان کی نس نس میں سرایت کر گئی ۔ اور وہ ایک طویل مدت تک وہ کوئی اسٹور نیز میں رکھے ہوئے پھلوں کے مانند ترو تازہ رہے ۔ لیکن دھیرے دھیرے وہ خود کو کچھ برسوں کے بعد گوداموں میں ٹھوسی ہوئی اشیاء کی طرح محسوس کرنے لگے ۔ اس عمارت کی آکسیجن واقعی کم ہو گئی ۔ یا لوگوں کو ایسا محسوس ہوا ۔ یہ کہنا آسان نہیں ہے ۔ ہاں یہ یقیناً سچ ہے کہ لوگوں کے دم گھٹے اور اتنے گھٹے کہ وہ اس عمارت میں بھی عاجز آ گئے ۔ لیکن اس عمارت سے باہر نکلنا مشکل تھا ۔ اس لئے کہ یہ اعلان ان کے کانوں میں گونج رہا تھا کہ یہ آخری عمارت ہے اس کے بعد کرۂ ارض پر کوئی اور عمارت نہیں بنائی جائے گی ۔

یہ بھی دیکھا گیا کہ اس عمارت میں لوگ جب داخل ہوئے تھے ۔ تو ان کے قد مختصر ، اور سر کافی چھوٹے تھے ۔ بعد میں ان کے قد اور سر میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا ۔

کچھ لوگوں نے جرأت کی کہ اور اس عمارت سے باہر نکل آئے ۔ لیکن باہر اندر سے زیادہ گھٹن تھی ۔ کچھ لوگوں نے اپنے بڑے سروں کو استعمال کیا ۔ اور عمارتیں بنا ڈالیں مگر ان کی بنائی ہوئی عمارتیں زیادہ دنوں تک ان کے پھیپھڑوں کو محفوظ نہ رکھ سکیں ۔ اور وہ ان میں سے بھی باہر نکل آئے اب عمارت کے اندر اور باہر دونوں جگہوں کے

لوگ شدت سے یہ محسوس کرنے لگے ۔ کہ جلد سے جلد کوئی ایسی عمارت بننی چاہئے ۔ جس کی آکسیجن کبھی ختم نہ ہو ۔ اور جو ابدی سکون دے سکے ۔ لیکن وہ عمارت کس طرح بنے ۔؟ کون بنائے ؟ معمار اول تو یہ پہلے ہی اعلان کر چکا ہے کہ اس مکمل عمارت کے بعد کوئی اور عمارت نہیں بنائی جائے گی ۔ کیا معمار اعلا کو یہ پتہ نہیں کہ اس مکمل عمارت میں رہنے والے لوگوں کے قد اونچے اور سر بڑے ہو چکے ہیں ۔؟ اور اس عمارت کی بھی آکسیجن ختم ہو چکی ہے ۔ یا اس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ بھر گئی ہے ۔ یا لوگ اس میں گھٹن محسوس کرنے لگے ہیں ۔ ؟ ؟ ؟ ●

بقیہ :- ناجائز تجاوزات

ان دونوں نے نکاح کروالیا ہے ۔ بس جی محبت کی شادی ہے ۔ ہم نے حمیرا کے ڈیڈی کو اطلاع کرادی ہے وہ بھی جلد ہی اس نکاح کی حقیقت کو تسلیم کر لیں گے ٹھیک ہے نا ۔؟

میاں جی نے حمیرا کو گھور کر دیکھا ۔ وہ مسکرا دی ۔ اور پھر عارف کا ہاتھ پکڑ کر اندر چل دی ۔ ساتھ ہی ایک بہت ہی بوڑھا شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا ۔ وہ بالکل روئی کا گالا نظر آ رہا تھا ۔ چھوٹے خاں صاحب ادب سے کھڑے ہو گئے ۔ اور بولے ۔

یہ میرے والد ہیں ۔ بڑے خاں صاحب ۔

میاں جی نے بڑے خاں صاحب سے ہاتھ ملایا ۔ دونوں چند لمحوں کے لئے خاموش رہے ۔ اسی اثنا میں چھوٹے خاں صاحب کو کوئی اہم اپائنٹمنٹ یاد آ گیا جس کے بہانے وہ رخصت ہو گئے اب آمنے سامنے میاں جی اور بڑے خاں صاحب رہ گئے ۔ دونوں ماضی میں غرق نظر آتے تھے ۔ جب کچھ دیر بعد میاں جی زمانۂ ماضی سے نکلے تو ان کے چہرے پر اضطراب کی کمی اور ان تھی ——— پر ان کے سامنے بیٹھا ہوا فریدے زمانۂ حال پہ بڑا نازاں نظر آرہا تھا ●

سوویت کہانی

عبداللہ قہار

مسیحا

اور اس مضبوط جسم والے احمد کو پھانسی ہو جائیگی ناٹے اور گٹھیلے جسم کا جلاد جس کی موجودگی ہی پروانۂ موت ہوتی ہے اس نے احمد کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ تین دنوں کی سخت محنت کے بعد احمد اپنے ہاتھوں کے بل پیچھے کی طرف گرا جو اس کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ پچھلے تین دنوں میں اس کی جو درگت بنائی گئی تھی۔ اس سے سارا جسم مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوئے احمد نے اپنے بازوؤں کو ادھر ادھر کیا۔ تاکہ اس کو یقین ہو کہ اس کا جسم صحیح سلامت ہے اور یہ جان کر کہ وہ صحیح سلامت ہے اس نے کافی اطمینان محسوس کیا کیونکہ جلدی ہی اس کا گلا کاٹا جانے والا تھا۔

میدان کے بیچ ایک مٹی کا ڈائس تھا۔ جس کے چاروں طرف پھول ہی پھول تھے۔ اس سبزہ پر بدمعاشوں کا سرغنہ بدصورت کانا کرباشی لیٹا ہوا تھا۔ اور ایک آدمی اس کے پاؤں پر مالش کر رہا تھا۔

اس کے قریبی دوست اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ عالم (شریعت کا ایک ماہر) اور ایک طبیب اور اس مکان کا مالک بڑے شریفانہ انداز میں ان کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔

سو بدنصیب آدمی تمہاری صرف ایک ہی زندگی ہے۔ کرباشی احمد پر غرایا۔ تمہارے اور ساتھی کون کون ہیں؟ ان کے نام بتاؤ۔

عالم نے رضامندی سے گردن ہلائی۔ جیسے ڈرپوک کتے عام طور پر اپنے مالکوں کے پیچھے سے ہی بھونکتے ہیں۔ اور مکان کے مالک نے بھی کچھ مناسب الفاظ کرباشی کی جگہ لیتے ہوئے کہے۔

طبیب نے احمد کو برا بھلا کہا۔

احمد کو پھانسی ہونی تھی فیصلہ یہی تھا۔ اس کا جرم بڑا تھا۔ اور اسے اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس نے آفندی اسحاق کو قتل کیا تھا۔ اور کرباشی کے دائیں بازو کو اس نے جدا کر دیا تھا۔

ہو سکتا تھا کہ آفندی خون کی کمی کی وجہ سے ہی مر جاتا۔ لیکن احمد نے اسے ایک معمولی کلہاڑی سے مار دیا تھا اس کلہاڑی سے جس سے عام طور پر لوگ لکڑیاں کاٹتے ہیں

یہ سارا واقعہ اس طرح پیش آیا تھا۔ آفندی الکلہ کے قریب ایک جنگ میں گولی سے زخمی ہوا تھا۔ کرباشی نے اسے اٹھایا تھا۔ اور مرہم پٹی کر کے اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

اسی رات کو کرباشی اپنی فوج کے ساتھ اس پہاڑی گاؤں میں آیا تھا۔ جہاں احمد رہتا تھا۔ آفندی کا خاصا خون نکل چکا تھا۔ اور کرباشی اسے کچھ اچھے لوگوں کے درمیان چھوڑ گیا تھا۔ وہاں اسے کچھ لوگ اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے کرباشی کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے سب سے پہلا کام یہ کرنا تھا۔ کہ آفندی کو کسی ایسے غریب گھر میں چھپانا چاہتا تھا سرخ فوج کے لوگوں کو شک نہ ہو۔ جو اس بدمعاش گروہ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

اور یہ غریب آدمی احمد تھا اس نے اسحٰق کو اپنے

گھر پر رکھنے میں کوئی تامل نہ کیا۔ لیکن وہاں سے نکلنے سے پہلے ہی اس نے اس آدمی کو کلہاڑی سے قتل کر دیا تھا۔

اور اس جرم کے لئے اسے بہت پشیمانی تھی۔

آفندی کے قتل کے ۳۰ دن بعد کرباشی نے احمد کو اس کے اپنے ہی گھر میں پکڑا تھا۔ اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر یہاں لایا تھا۔

دوسرے دن دوپہر تک گاؤں کو علم نہیں تھا کہ احمد کا اغوا ہو چکا ہے۔ اور تب احمد کے پڑوسی سود خور عابد سرکار نے اپنے جذباتی ملازموں سے یہ سننے کے بعد کہا۔

او ہ ٹھیک ہے .... کیا آج بدھ ہے۔؟

میں احمد کا گھر لے لوں گا اور جب تمہارے پاس روپیہ ہو گا تو میں تمہارے ہاتھ فروخت کر دوں گا۔

اور اب کرباشی اور اس کے دکلا اس پھانسی والے کی قسمت کا انتظار کر رہے تھے احمد نے کرباشی کے چہرے پر نظریں گڑا دیں اور بولا۔

میرے شہزادے یہ لفظ اس نے بڑی دھیمی آواز میں بولا۔ آفندی کو میں نے اسی وجہ سے قتل کیا تھا جس کی وجہ سے تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن مرنے سے قبل میں ایک نیک کام کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری خاطر نہیں۔ بلکہ خدا سے دعا کرنا چاہتا ہوں میری دو آنکھیں ہیں۔ اگر میں ایک کھو دوں تو تمہاری نظریں ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنا نیک کام برا نہیں ہے۔

کرباشی نے سوچا احمد اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس لئے وہ اس پر بہت چیخا چلایا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی وہ احمد کو سوائے سزا موت کے اور کیا سزا دے سکتا تھا۔

میرے شہزادے ناواقف مت ہو۔ احمد نے کرباشی کی گالیوں اور دشنام طرازیوں کی بوچھار طبیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید آپ مجھے سمجھ سکیں۔ میں کرباشی کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ شاید اس کی نابینا آنکھیں ٹھیک ہو جائیں اگر آپ ایک اچھے طبیب ہوں گے تو میری باتوں کا مطلب سمجھ سکیں گے۔ لیکن آپ حقیقی معالج نہیں ہیں۔ اور کرباشی کی باتوں میں آجائیں گے تو پھر مجھے آپ پاگل کہہ سکتے ہیں۔

طبیب نے پریشان نظروں سے کرباشی کو دیکھا۔ جواب میں اسے اپنی زبان میں گالیاں دے رہا تھا اور آخر کرباشی خاموش ہو گیا۔ اب ہر شخص اس خود ساختہ مسیحا کو دیکھ رہا تھا۔

احمد نے طبیب سے کہا۔ حکیم صاحب کرباشی کو اپنی آنکھیں بند کرنے دیجئے۔ اور آپ اس کی پلکیں انگلیوں سے دبائیں گے۔

کرباشی نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا اور پھر کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ طبیب کی طرف مڑا۔ اور اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے اس شخص کو حکم دیا کہ اپنی انگلیوں سے اسے دبائے طبیب نے ویسا ہی کیا۔ جیسا اس سے کہا گیا تھا۔

تم کیا دیکھ رہے ہو؟ احمد نے پوچھا۔

کچھ بھی نہیں۔ کرباشی نے جواب دیا۔

حکیم صاحب ذرا سختی سے دبائیں۔ میرے شہزادے اپنی آنکھیں اتنی سختی سے مت بند کرو۔ اور نیچے دیکھو! کیا تم نیچے ایک آگ کی چھوٹی گنبد دیکھ رہے ہو۔

ہاں!

تب طبیب نے جلدی سے خود اپنی ایک آنکھ بند کر کے انگلی سے اسے دبایا۔ عالم نے بھی ایسا ہی کیا اور اس کے بعد کرباشی کے سبھی آدمیوں نے ایسا ہی کیا۔

میں اسے دیکھ رہا ہوں۔

میں بھی ......

ٹھیک ہے تم لوگ آگ کی جلتی ہوئی پھوکنی کو اس لئے دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ تمہاری دوسری آنکھ ٹھیک ہے۔ احمد نے کہا۔

طبیب بہت جذباتی ہو گیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ کرباشی کا مرض ٹھیک ہو گیا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے اندھاپن دور کرنا سیکھ لیا تھا۔ اگر کرباشی علاج کرانے سے انکار کر دیتا۔ تو طبیب خود ہی اپنی آنکھ گنوا دینے پر مجبور ہو جاتا تا کہ احمد کو اپنی مہارت دکھلانے پر مجبور ہونا پڑتا۔ طبیب نے کرباشی سے کچھ کانا پھوسی کی۔ سب ہی لوگ خاموش تھے۔ اور تب ہی کرباشی نے احمد کو حکم دیا۔ کہ وہ اپنا طریقہ علاج جاری رکھے۔

احمد نے کہا کہ اسے ایک انڈا۔ دو کھجوریں، جنگلی بھر زیرے کے بیج، بھولنا نہیں۔ اور ایک چمچہ شہد کی ضرورت ہے اتفاق سے مالک مکان کے پاس یہ سب چیزیں تھیں۔ جب یہ ساری چیزیں آگئیں تو طبیب نے ان کا تجزیہ کرنے کے بعد غور کرنا شروع کر دیا۔ عالم نے پریشان نظروں سے اور غصے میں احمد کو دیکھا۔ احمد نے ان ساری چیزوں کو ایک تانبے کے برتن میں رکھنے اور انہیں ایک کٹورے میں ابالنے کا حکم دیا۔

جب یہ سب ہو چکا تو احمد نے کہا

ایک شمع لاؤ اور اسے ٹھیک کرباشی کے اندھی آنکھوں کے سامنے رکھ دو۔

یہ کام بھی ہو گیا۔

پھر آخر میں طبیب نے پوچھا: کیا تم نے اس سے قبل بھی کسی کا اندھاپن دور کیا ہے؟

نہیں۔ احمد نے کرباشی کی اجازت حاصل کرتے ہوئے کہا۔ میرے استاد نے کیا تھا لیکن اسے بھی صرف ایک ہی بار کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ خود ہی اندھا ہو گیا۔ اور پھر گیارہ دنوں کے بعد اندھا ہو گیا تھا۔ ان کا نام بعد میں بتاؤں گا۔ ان کی عمر ۸۳ برس تھی۔

کرباشی کے آدمیوں میں سے ایک نے برتن میں سب چیزیں ڈالیں۔ جنہیں احمد بغور دیکھ رہا تھا۔ اور اب وہ آگ بجھا دینا چاہتا تھا۔ اور ایک ایسا پتھر جسے پانی نے کبھی چھوا نہ ہو تلاش کیا جائے۔ احمد کے حکم کو کرباشی کے حکم سے زیادہ اہمیت دی جا رہی تھی۔

پتھروں کا ایک بڑا ڈھیر لایا گیا۔ لیکن ایک ایک پتھر جانچنے کے بعد احمد نے انہیں یہ کہتے ہوئے رد کر دیا کہ انہیں پانی نے پہلے ہی چھو رکھا ہے۔ اور پتھر لائے گئے احمد نے ان میں ایک کا انتخاب کیا۔ جس کا وزن تقریباً ۲ پاؤنڈ تھا۔ اور اسے دیکھ کر یہ حکم دیا کہ اسے اچھی طرح رگڑا جائے اور اسے ہل کی شکل بنا دیا جائے۔ اور جب پتھر تیار ہو گیا تو احمد نے کہا اب اسے پانی میں ڈال دیا جائے۔

طبیب نے اسی طرح ڈالنا شروع کیا جس طرح احمد ہدایتیں دیتا رہا۔ احمد کی بھرپور ہدایتوں اور کوششوں کے باوجود طبیب احمد کی ہدایتوں پر عمل کرنے میں ناکام رہا۔ اور اس پر دیر تک کام کرتا رہا۔ کرباشی کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اور اس نے حکم دیا کہ قیدی کے ہاتھ باندھ دو۔ احمد جیسے ہی آزاد ہوا اس پر ہر طرف سے لاٹھیوں کا نشانہ بنا لیا گیا۔ اور جلاد کی تلوار بھی اس کے سر پر منڈلانے لگیں۔ احمد خود ہی پتھروں کو ڈالنا بند کر رہا تھا۔ اور اسے سکھانے کے لئے قریب ہی رکھ دیا تھا۔

اب مجھے آدھا کٹورا انسانی خون چاہئے۔ اس نے کہا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا میں سوچتا ہوں کہ جو شخص اپنی آنکھ کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوا ہے کیوں نہ اسی کے خون سے آدھا کٹورا بھر لیا جائے۔ میرے شہزاد

جلاد کہ میری ایک انگلی کاٹ لے۔

عالم کے لئے یہ بات بہت پریشان کن تھی۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ طبیب نے اس مالک مکان کو دیکھا احمد نے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی نکالی۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ جلاد نے جلدی سے اپنی تلوار نکالی۔ اور اس کی انگلی کٹ کر زمین پر لڑھک گئی۔ احمد کا ماتھا پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ جب کٹورا خون سے آدھا بھر گیا۔ تو طبیب نے کچھ پاؤڈر چھڑکا اور خون بہنا بند ہو گیا۔ کچھ دیر بعد احمد نے آنکھیں کھولیں۔ اور خون اس کٹورے میں ڈال دیا۔ پھر اس نے کرباشی کے سامنے سنگیوں کے جلانے کا حکم دیا۔ اور اسی وقت موم بتیاں روشن کر دی گئیں۔ بتی لو تھرتھرانے لگی۔ دھواں گہرا لیا تھا

اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور رائفلیں ایک بار پھر اس کا نشانہ بنانے لگیں۔ اور جلاد کی تلوار اس کے سر پر منڈلانے لگی

میرے شہزادے احمد نے کرباشی سے اجازت لیتے ہوئے ڈانس کے قریب آتے ہوئے کہا میں ایک انگلی قربان کر چکا ہوں اور اب میں اپنی آنکھیں قربان کرنے جا رہا ہوں۔ لیکن مجھے ایک درخواست کرنی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تم اپنی جان بخشوانا چاہتے ہو

او نہیں میرے شہزادے۔ ایک غریب شخص اپنی بینائی کھو چکا ہو وہ ایسی کوئی خواہش نہیں کر سکتا بلکہ میں تو اس کے برخلاف یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے مارنے کا ارادہ نہ بدل دیں۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ جب آپ کی بینائی واپس آ جائے گی اور میں نابینا ہو جاؤں گا تو شاید آپ مجھے مارنے کا حکم نہ دیں۔

میں تمہیں ختم کروں گا۔

مجھے ڈر ہے جناب، میرے شہزادے۔

تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن ... ابھی شبہ ہے میں اس خیال سے ہی خوف زدہ ہوں کہ میری یہ نیکی مجھے ایسا نہ کرنے دے اور پھر۔

ٹھیک ہے تم کیا چاہتے ہو؟

میں صرف یہ یقین چاہتا ہوں کہ جیسے ہی آپ ٹھیک ہو جائیں گے ضرور قتل کر دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ غصے میں رہیں کہ آپ اتنے غصے میں ہوں کہ آپ مجھے مار ہی ڈالیں چاہے مجھے آپ کے علاج سو برس تک جینا نصیب کیوں نہ ہو۔ مجھ سے وعدہ کیجئے کہ میں جو کچھ بھی دس منٹ تک کہوں گا کہنے دیں گے۔ میرے الفاظ ہی میری موت بلائیں گے۔

الفاظ۔ کرباشی نے حیرت سے کہا۔ ٹھیک ہے بولو۔

احمد نے دھیرے سے اپنی گردن کرباشی کی طرف کی اور ان لوگوں سے کہنے لگا جنگی رائفلیں ان کی طرف تنی ہوئی تھیں۔

بہادرو! آپ کو اس بات سے حیران نہیں ہونا چاہئے کہ میں اپنی آنکھ اور انگلی دشمن کو دے رہا ہوں تو بہتر ہے کہ آپ خود سے یہ پوچھیں کہ آپ اپنے والدین اور بچوں کو، اپنے بھائیوں اور بہنوں کو دشمن کو کیوں دے رہے ہیں۔ اور خود اپنے گاؤں سے انتقام کیوں لے رہے ہیں۔ تم لوگ اپنی گولیاں خود پر برسا رہے ہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں پاگل ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں اور تمہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو کیا کر رہے ہو میں تمہاری آنکھیں سچائی کی طرف مبذول کراؤں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے اپنی ہڈیاں ہی کیوں نہ تڑوانی پڑیں۔ اور اسے سنگ کے نیچے ہی دفن نہ کر دیں۔ میں مرنے کے قریب ہوں لیکن مرنے سے قبل میں یہ جاننا چاہتا ہوں گا کہ تم لوگ کس لئے رائفلوں کے ساتھ تیار پہاڑوں میں چھپے رہتے ہو؟ کس لئے تم اپنے بھائیوں کو پریشانیوں میں مبتلا کرتے ہو؟ کس لئے تم نے بدمعاشوں کے گروہ کو اپنا رکھا ہے؟ یقیناً تم لوگ یہ نہیں

سمجھ لے ہو گے کہ تم کاشت کار ہو۔

مالک مکان کرباشی کے پیچھے خوف زدہ حالت میں چھپا ہوا تھا۔ عالم نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کرباشی سے کچھ کہا جو احمد پر چلایا۔ بلکہ اسے خاموش کرنے کے بجائے اسے زور زور سے بولنے دیا اور اس کا ہر ہر لفظ سپاہیوں کے دلوں پہ سیدھا اثر کر رہا تھا۔

سود خوروں کو ڈر ہے کہ اگر بدمعاشوں کے گروہ نہ ہوئے تو ان کی ساری دولت ختم ہو جائے گی اور تم کو کس چیز کے کھونے کا خوف ہے۔

جلاد نے احمد کو تلوار کی مٹھ سے خاموش کرانے کے لئے مارا۔ کرباشی اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور چیختے چلاتے ہوئے کوڑے مارے۔

میرے شہزادے کیا تم ناراض ہو؟ لیکن یہ تو محض الفاظ تھے ...... احمد کرباشی کے آگے تعظیماً جھکا۔

مجھے اس کا علاج نہیں کرانا۔ اسے یہاں سے لے جاؤ کرباشی دہاڑا۔

لیکن طبیب نے اس کے کان میں کچھ کہا اور کرباشی کا غصہ کچھ نرم پڑا۔

اپنا علاج جاری رکھو۔ وہ احمد کو دیکھتا ہوا چلایا۔

پھر احمد نے کرباشی کو گھرے دھنوئیں پر جھکنے کے لئے کہا اور وہ پتھر طبیب کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اسے تیز دھار کی طرف سے پکڑ کر اندھی آنکھوں کی طرف لے جا کر آہستہ سے رگڑو۔

کرباشی دھنوئیں پر جھک پڑا۔

اوہ سچائی کے حاکم ہو سکتا ہے کہ اس سے تمہاری آنکھوں کو نقصان پہونچ جائے۔ مالک مکان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اندھی آنکھوں کو بھلا اس سے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟

احمد نے اعتراض کیا۔ اگر تم اس کی اچھی آنکھ کے لئے پریشان ہو تو اسے اندھا ہی رہنے دو۔

طبیب راضی ہو گیا۔ اور پھر کرباشی نے اپنی ٹوپی ... اور اپنی اچھی آنکھ کو ریشمی رومال سے باندھ لیا۔

طبیب پتھر کو اسی طرح پکڑے رہا جس طرح اس کو بتایا گیا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح صفائی کرے۔

اس طرح نہیں احمد چلایا۔

دھنوئیں میں کرباشی کا دم گھٹ رہا تھا۔ اور آخر ... وہ پھنسی ہوئی آواز میں چلایا۔

حکیم یہ پتھر اسے خود ہی تھما دو اور اسے خود ہی کرنے ... پہلے پہل کو سب نے احمد کی طرف دیکھا کہ وہ اندھا ہو ... کب شروع ہوتا ہے لیکن دھیرے دھیرے ان کی نظریں اس شمع پر جم گئیں جس کا ابھی تک بالکل شروع ... اور احمد بہت پریشان نظروں سے یہ یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ٹھیک طرح جل رہی ہے۔

حکیم اس شمع کو دیکھو۔ اس نے طبیب سے کہا۔ اگر یہ بجھ جائے تو مجھے فوراً بتا دینا۔

احمد کرباشی پر اس گہرے دھنوئیں میں جھکا اور اس کی اندھی آنکھوں کے سامنے اس پتھر کو سہلانے لگا ... حرکت سے پتلیاں تیزی سے جلنا شروع ہو گئیں۔ اور چاروں طرف دھنواں پھیل گیا جس میں صرف آدمی نظر آ رہے تھے۔

شمع ہوا سے لہرائی اور ہر شخص بڑی بے چینی سے اس معجزہ کا انتظار کر رہا تھا جو جلد ہی متوقع تھا۔

اچانک احمد چلایا شمع ! ! اور کرباشی کا سر اس تیز دھار والے پتھر سے رگڑ دیا۔ اور فوجی جو کرباشی کے داہنی جانب کھڑا تھا اس نے احمد پر تین فائر کئے اور اسے

بقیہ صفحہ ۱۹

انشائیہ

محمد اسد اللہ

عینک

کئی مرتبہ آنکھیں ٹٹول ڈالیں۔ معتبر اشخاص سے استفسار کیا۔ آئینوں میں تانک جھانک کی۔ مگر اس نادیدہ عینک کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ یوں تو پہلے بھی بجز اس احساس کے کہ میری آنکھوں پر ایک عینک چڑھی ہے اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ اور وہ زمانہ بھی معلومات کے گھر سے لانے ہے۔ جب مذکورہ بالا عینک میری آنکھوں پر آ لگی۔ بارہا محسوس ہوا گویا وہ عینک بھی آنکھ، ناک کان کے قبیلے کا کوئی فرد ہو۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کا احساس بھی دھندلا دھندلا سا ہو گیا مگر اس کا عدم جو محسوسات تک محیط تھا اس کے نادیدہ وجود کی نفی نہ کر سکا۔ اس عینک کی فریم تو خیر سے سر متجسس یا متبہ دیتی ہی نہیں۔ شیشوں نے بھی لبصد ناچار رکھا ہے۔ ہمیشہ ہی سے عینک میرے لئے بے بسی، بے خبری، اور خود فریبی کی علامت رہی ہے مگر نہ جانے کیوں یہ نادیدہ شئے برسوں اپنے اندر کل بکاؤلی کی سی پراسراریت چھپائے رہی۔ احساس کے تذکروں میں اس کا بڑا شہرہ رہا۔ مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ اسے آنکھوں سے لگایا اور بینائی لوٹ آئی۔ اور میری ذات پہ ایک جہاں روشن ہو گیا۔ چونکہ اس کا وجود محض واہموں میں ۔۔ تھا۔ لہذا عقل اور آنکھ دونوں پہ دبیز پردے پڑے رہنے کے باوجود میں علی الصبح بیدار ہوتا۔ تو

سب سے پہلے اسے آنکھوں پر ٹٹولتا۔ آئینے میں اپنے چہرے کے اس غیر مرئی جز کو تلاش کرتا۔ اور آخر کار اپنے آپ کو تسلی دیتا کہ وہم کا سایہ طبعی موت مر گیا۔ لیکن دن کی بھرپور روشنی یا دھندلی دھندلی چاندنی میں باہر نکلتا تو یہ سایہ از سر نو زندہ ہو کر پالتو کتے کی طرح ساتھ ہو لیتا۔ تب عینک دوپہر کے وقت گھومتے ہوئے پھیری والے کی طرح ہر موڑ اور ہر گلی میں ہانک لگا کر اپنے وجود کا احساس دلاتی۔

البتہ کبھی صبح و شام کے خوش توفیق لمحات میں یہ عینک یکایک کھل جاتی ہے۔ تو عقل کے آگے پیچھے سنگین بردار سپاہیوں کی طرح کھڑے مناظر فی الفور فنا کی گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ تب میں گرانبار فلسفوں اور نظریوں کے بوجھ سے سبکبار ہو کر جاگتے خوابوں کی سنہری سرزمین پر آ اترا آتا ہوں۔ تو چاہتا ہوں کہ میرے ارد گرد کھڑے لوگوں کے چہروں پہ لگے گاگلز بھی کھل جاتیں سوچتا ہوں کہ یہ عمل عالمی پیمانے پر رواج پا گیا تو ہمیں چاند اور مریخ کی خاک چھاننے کی چنداں ضرورت نہیں ہوگی۔ عجیب و غریب مخلوقات سے آباد ایک انوکھا سیارہ کھٹ سے ہمارے پہلو سے نکل آئیگا لیکن اول تو ان لوگوں میں سے کوئی میری اس بات کو قبول ہی نہیں کرتا کہ ان کے چہروں پر کوئی عینک نہیں ہے

گویا ہم عینک کو سینگوں کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ دوئم مان بھی لیں تو اسے آثار نے پر کسی طور راضی نہیں۔ اور یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے۔ کہ وہ ان دیکھی دنیا عینک زدہ بینائی کے جال میں آتی ہی نہیں۔

پچھلے دنوں یوں ہوا کہ مجھے بار بار ٹھوکریں لگیں۔ میں چلتے چلتے ایسی جگہوں سے کترانے لگا۔ جہاں منڈیر یا ٹیلہ نما اونچائی ہو۔ اور ان مقامات سے گذرنے کی کوشش کرتا جہاں اس قسم کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ مگر ٹھوکر لگتی تو عقدہ کھلتا کہ جہاں زمین کو ہلا آباد سمجھا تھا وہیں وہ سر بریدہ کی طرح اٹھی ہوئی تھی۔ اور جہاں زمین کو بلندی سے سرفراز خیال کیا وہاں وہ سر تسلیم خم کئے ہوئے اپنی آغوش میں ایک گڑھا کھلا رہی تھی۔ مجھے کئی ٹھوکریں لگیں۔ بار بار گرتے گرتے بچا۔ اور بعض اوقات بچ بھی نہ پایا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سب ایک مخصوص نظریہ کی وجہ سے ہو رہا ہے ہوا یوں کہ پچھلے دنوں اس قدر سر کے ہوا سے لوگوں سے پالا پڑا کہ مجھے یقین کامل ہو گیا کہ دنیا کا ہر آدمی سرکا ہوا ہے۔ ہر کسی کا دماغ کم و بیش اپنی جگہ سے کھسکا ہوا ہے۔ بلکہ دنیا ہی کے دو چار اسکرو ڈھیلے ہیں۔ اس کے بعد عجائبات عالم پر نظر ثانی کی تو ہر چیز اپنی جگہ چھوڑی ہوئی نظر آئی۔ خود زمین اپنے مقام پر سیدھی نہ تھی۔ ممکن ہے جغرافیہ کے کسی طالب علم ہی نے کرہ ارض کا اصل زاویہ دیکھ کر دنیا کے پاگل ہونے کا تصور پیش کیا ہو۔ بس پھر کیا تھا اسی دن سے یہ ساری گڑبڑ شروع ہو گئی۔ اور سرکنے کا یہ عمل ساری کائنات سے شروع ہو کر میری آنکھوں تک آ گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میرے دماغ پر ہی اثر انداز ہو گیا مگر میں اس سے متفق نہیں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ماہر چشم سے رجوع کیجئے۔ ورنہ یہ آنکھیں آپ کو کسی دن گٹر میں لے ڈوبیں گی۔ ڈاکٹر سے رجوع کیا تو اس نے آنکھوں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ اور ایک عینک تھما دی۔ حکم صادر کیا کہ اسے ہمہ وقت آنکھوں پر سجائے رکھو۔

اس سے قبل بقول اقبال اعصاب پر عورت سوار تھی۔ اب آنکھوں پر عینک سوار ہو گئی۔ جب عینک پہن کر سڑک پر نکلا دنیا دیکھی تو بہت گھبرایا۔ اس خیال سے کہ کہیں میرے اعصاب ستی بس نہ بن جائیں۔ جس میں سواریاں اس بے دردی سے ٹھونسی جاتی ہیں جیسے کوئی بورے میں ٹھونس ٹھونس کر کپاس بھر رہا ہو۔ یہ خدشہ اس لئے لاحق ہوا کہ اس عینک سے عورتیں بہت خوب صورت نظر آتی ہیں۔

اس عینک کو آنکھوں سے لگایا تو لگا کہ وہ گم شدہ عینک جو خدا کی طرح محسوس ہوا کرتی تھی۔ کسی ٹھوس مادے میں ڈھل کر میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ گویا کسی نے خدا کے نام پر مٹی اور پتھر کے گول ٹکڑے پکڑا دیئے۔ کہ یہی خدا ہے اور میں شک و تردد میں اس پر سوچ رہا ہوں کہ اتنے دنوں سے جس خدا کی تلاش تھی۔ کیا وہ یہی پتھر کا ٹکڑا ہے پہلے وہ نادیدہ عینک میرے اور خدا کے درمیان حائل تھی۔ اس وقت یہ عالم تھا کہ خدا بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور یہ عینک بھی نظروں سے اوجھل تھی۔ بصیرت کی داڑھ طوئی تو اب بھی خدا کی تجلی سے عاری تھی۔ مگر عینک میرے روبرو ٹیبل پر جلوہ افروز تھی۔ اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ پچھلی جاہل قوموں کی طرح اس عینک کی پرستش کروں۔ یا موجودہ دہریوں کی طرح عینک کو آنکھوں پر رکھ کر تمام مناظر سے دنیا کو تنہا کر دوں۔ اور تیسرا راستہ یہ تھا کہ اس عینک کو توڑ کر پھینک دوں (اگرچہ یہ عمل خیال اور سوچ ہی کی حد پر کیوں نہ ہو)

اس عینک سے اطراف کی اشیا پہ۔

و شفاف نظر آتی ہیں۔ اس قدر شفاف کہ مجھے لگتا ہے
کہ میں اسے پہن کر "انتریامی" بن گیا ہوں۔ نہ صرف
چہرے صاف نظر آتے ہیں۔ بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ میں
لوگوں کے اندر تک اتر کر دیکھ رہا ہوں۔ میں دنیا کو اتنا
واضح اور برہنہ ہرگز نہیں دیکھنا چاہتا۔ عینک کے
پہنتے ہی سب سے پہلا ردعمل یہ ہوا کہ مجھے خواب نظر آنے
بند ہو گئے۔ دن رات کے کسی حصہ میں خوابوں کی بھیڑ بھاڑ
سی محسوس ہوتی تو خوابوں سے مدبھیڑ ہونے سے
معلوم ہو جاتا کہ جن خوابوں نے میری آنکھوں کو
میں رخت سفر باندھا تھا اور قریب تھا کہ وہ منزل
مقصود کے مضافات میں قدم دھرتے۔ عین اسی
وقت انھیں عینک کے قوی GLANCES کی
صاف شفاف اور واضح بینائی کی خبر مل گئی۔ خوابوں
کو پتہ چل گیا کہ عینک کے شیشے ماہر جاسوس کی طرح
ہر دھندلکے اور مبہم منظر کا پول کھول کر میری آنکھوں
کو حقیقت سے باخبر کر دیتے ہیں۔ اور خواب تو سراپا
ہی ریشمی دھندلکے کا نت اندھا روپ تھے سارے
کے سارے الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔

عینک کے یہ حساس شیشے میرے ایک سوال کا
جواب دینے سے قاصر اور معذرت خواہ ہیں کہ عینک کی
رفاقت کے بعد نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ ہر چیز مجھ پر
بظاہر روز روشن کی طرح عیاں ہے جہاں پہلے درخت
کا سبز ہیولیٰ نظر آتا تھا اب وہاں ایک ایک پتی بھی
دکھائی دے جاتی تھی۔ زمین جو بن عینک آنکھوں کو
ڈبل روٹی کے گوندھے ہوئے مٹیالے خمیر کی مانند نظر
آتی تھی۔ اب ریت کے ذروں کا اژدہام محسوس ہوتی
ہے لیکن اس کے باوجود مجھے اس بات کا شدید
احساس ہے کہ بہت ساری اشیاء اس عینک نے
میری نظر بچا کر کہیں چھپا دی ہیں۔ گویا میرا تجسس اور
جھنجلایا ہوا ذہن ایک ضدی بچہ ہے۔ جو کسی مانگ پر
اڑا ہوا اور رو کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اور
عینک - سامنے بکھرے ہوئے مختلف مناظر کے
کھلونوں سے بہلا رہی ہے۔ اصل مدعا غائب کر کے چالاکی
سے اس کوشش میں ہے کہ میرے ذہن میں چھپا ہوا
مانگ کا کانٹا نکل جائے یا ایک مدت گزرنے پر وہیں
سڑ کر ختم ہو جائے۔ میں اپنی طلب بھول کر ان مناظر میں
کھو جاؤں۔ عینک مند رہے مجھے ان مناظر کے بنانے
سے جڑے ہونے کا احساس مجھ میں برگد کی جڑوں کی
طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ ستم ظریفی ملاحظہ فرمائے
کہ ان چیزوں کے تصورات کے چھلکے میرے احساس کو
مصروف کار رکھتے ہیں۔ جبکہ اصل مغز سے مجموعی طور پر
میں خود بھی نابلد ہوں۔ ممکن ہے عینک کے ساتھ بھی یہی
معاملہ ہو لہٰذا وہ ایسی چیزیں مجھے کیونکر دکھاتے جن کو خود
نہ دیکھے۔ اور جو چیزیں جس انداز میں وہ دکھانا چاہتی ہے
میں دیکھنا نہیں چاہتا۔

عینک کی ایک اور خوبی کی طرف توجہ مبذول کرانا
چاہوں گا کہ یہ بصارت کی آبی سطح پر ابھرتے ہوئے
سرابوں کے حباب سلامت اٹھاتی ہے ان ہی حبابوں
میں ہماری اندر کی آنکھ خوابوں کے شہر آباد کرتی ہے۔
لہٰذا حقائق کی سنگلاخ زمین پر گزر بسر کے لئے عینک کا وجود
ناگزیر ہے اسی لئے میں آج کل اسے باقاعدگی سے
استعمال کرتا ہوں۔ اس کی حفاظت کرتا ہوں شیشوں
پر گرد جم جاتی ہے تو صاف کر لیتا ہوں مگر سمجھتا ہوں
کہ زندگی عینک کی طرح سرابوں کی نگہداری کے لئے نہیں
ملی۔ دیکھنا ہر آنکھ والے کی مجبوری ہے۔ میں بھی مجبور ہوں
کیونکہ آنکھوں کے لئے عینک کی بیساکھی بہرحال ضروری ہے۔

کرشن موہن

محویت

ریستوران میں
اک چنچل، رنگیں رقاصہ
ننگے پیشانوں پر جلتی شمعیں رکھ کر
ناچ رہی ہے
اتنی محو ہے اپنے فن میں
اس کے من میں
کومل تن میں
جلنے کا احساس نہیں ہے
کھیل تماشا، بھوگ کہیں بے حس لوگ اس کو
میں تو اس محویت فن کو یوگ کہوں گا۔

—٭—

سرد آہوں کا دھواں

اب ہمارے درمیاں
گفتگو سے بھی اہم ہے خامشی
خامشی جیسے ہماری رازداں، محرومیوں کی داستاں
سرد آہوں کا دھواں
ابتدائے شوق میں تھے کس قدر پر شور ہم پر جوش ہم
اختتام شوق میں ہیں کس قدر خاموش ہم

—٭—

دیوداسی پرتھا

کچھ ایسے بگڑی
وہ ایشور پریت ریت بھارت میں کرشن موہن
کہ دیوتاؤں کی پرتیمائیں
بنیں مہنتوں کی داشتائیں

—٭—

نصر قریشی

سوچ کی صلیب

کہاں ہم آ گئے ہیں؟
یہاں تو زندگی بے بس پرندے کی طرح لرزاں
یہاں تو روشنی ظلمت قدوں میں قید ہو جیسے
سکوں ناپید ہو جیسے
کسی دم ساز کی حسرت لیے سارا جہاں گھومو
سلگتی دھوپ میں اک سائباں ڈھونڈو
ہمارے سر پہ ساتوں آسماں بھی بے اماں ٹھہرے
حدیثِ دل سنائیں کس کو، کوئی مہرباں ٹھہرے
کوئی رکتا نہیں، بھاری صلیب اپنی ہی ڈھونا ہے
کسی کا ظلمتوں کے اس سفر میں کون ہوتا ہے؟
کہاں ہم آ گئے ہیں؟
لالہ زاروں، مرغزاروں، آبشاروں سے پرے
ویران راہوں کے نظارے مسکراتے ہیں
نہ وہ یادوں کی پریاں ساحلوں کی ریت پر گیسو سکھاتی ہیں
نہ وہ پھولوں کے گجرے پہنے دوشیزائیں گاتی ہیں
رہٹ کے نغمے فولادی مشینوں میں ڈھلے آخر
نشیلی رات پونم کی کفن بردوش ہو جیسے
کہاں ہم آ گئے ہیں؟
نہ وہ مکتب، مدرسہ، اور نہ وہ کالج کے ہنگامے
کشادہ سڑکوں پہ وہ شب کے ہمراہی، چہل قدمی
کسی ہوٹل کے گوشے میں زمانے بھر کی وہ باتیں
مسرت سے بھرے دن، رتجگوں کی چاندنی راتیں
کسی دہلیز پر قدموں کی آہٹ سے فضا جاگے
کوئی دروازہ دستک کی صدا کو رات بھر ترسے
نجانے کس نے سب کچھ آج چھینا ہے؟
کہاں ہم آ گئے ہیں؟
نئے اندیشے لمحوں کے سمندر سے ابھرتے ہیں
ہوا میں اڑنے والے طائروں کے پر بکھرتے ہیں
ہم اب فائل کا حصہ ہیں۔
اگر مر جائیں تو پھر دو گھڑی خاموش رہنا سب پہ بھاری ہے
سبھوں کو ذات کے صحرا میں اپنا جسم ڈھونا ہے
ہمارا اپنا سب کچھ لوٹ کر بکھرا ہوا ہے غیر کی راہوں میں
سفر صحراؤں کا درپیش ہے لمحوں کے مقتل میں
صداؤں کے جنازے ڈھونڈتے ہیں کنجِ خاموشی
کہاں ہم آ گئے ہیں؟
جہاں پر بے نشاں ٹھہرے
کس دارالاماں کی کھوج میں ہم بے اماں ٹھہرے
ہم اپنا نام بھی اب بھولتے جاتے ہیں
کہ ہم کیا تھے؟
آج ہم کیا ہیں؟

شہپر رسول

بادبرہمی

ہمارے گھر کی دیواریں بھی ہل سکتی ہیں
بادبرہمی کا کوئی جھونکا وہم کے صحرا سے اٹھے
تو ـــــ اس کے سامنے سینہ سپر رہنا پڑیگا مجھ کو اور تم کو

سہیلی پارٹی میں راہ دیکھے گی تمہاری
جاؤ ـــــ تم سے کیا کہوں اب
گھر اکیلا ہے
مرے آفس میں بھی کچھ ایکسپرٹس آئے ہوئے ہوں گے
مری میٹنگ شاید دیر تک چلتی رہے گی
اس لئے ـــــ میں صبح لوٹوں گا
اگر شب کو
اکیلے پن میں باہر کا اندھیرا دیو بن جائے
ڈرائے
تو
یہ پردے کھینچ دینا کھڑکیوں کے
اور ـــــ سو جانا
مری میٹنگ شاید دیر تک چلتی رہے گی
اس لئے ـــــ میں صبح لوٹوں گا۔

ـــــ ٭ ـــــ

انجم عثمانی

آنیوالی نسل جب پوچھے گی

آنے والی نسل جب پوچھے گی تم سے
کیا ہوا چہرہ تمہارا
جس سے ملتی پہچان قائم
نور کا ہالہ تھا جس کے چار جانب
روشنی آنکھوں کی کیسے کھو گئی
جس سے تاریکی میں بھی تم
دیکھ لیتے تھے ہر اک شئے
کیا ہوا وہ دل تمہارا
جو خدائے لم یزل کی
غیر فانی
محبت کا امیں تھا
کیا ہوئے اوصاف سارے
جن کے باعث
فرشتوں سے بھی اونچا مرتبہ تم کو ملا تھا
تم نے ورثہ کھو دیا کیونکر سلف کا؟

ـــــ ٭ ـــــ

فضا ابن فیضی

غزل

آئینے جھوٹے، نہ چہرے جھوٹے
زاویے خود ہیں کے جھوٹے

ہم نے سمجھا انہیں ایمانِ حیات
عذر دنیا نے تراشے جھوٹے

کھوج میں نکلے ہیں سچائی کی
لے کے سینوں میں عقیدے جھوٹے

کیا کروں، ذوقِ تماشا مجھ کو!
آنکھیں معصوم ہیں جلوے جھوٹے

رائیگاں حکمتِ خسرو نہ گئی
سب کے ہاتھوں میں ہیں تیشے جھوٹے

سو ملا ٹال گیا، چپ رہنا
بولنے والے ہی ٹھہرے جھوٹے

مغز کے نام نہ کچھ پاؤ گے
کھوکھلے ذہن ہیں، جذبے جھوٹے

جاں گسل ہے یہ حقائق کا تضاد
سچے ہاتھوں میں صحیفے جھوٹے

ہائے یہ تیرہ نگاہی، کہ ہوئے
دانش و فن کے اجالے جھوٹے

اب کسی بات میں ابلاغ کہاں
لفظ و معنی کے وسیلے جھوٹے

مر گیا آنکھ کا پانی لوگو!!
پڑ گئے خون کے رشتے جھوٹے

دیکھیے! یہ شام و سحر کا مسلک
وقت گمراہ ہے، لمحے جھوٹے

محتسب کون یہاں ہو کس کا
ایک ہی صف میں ہیں سچے جھوٹے

سچ کی تلخی کو بھلانا تھا فضاؔ
لکھ گئے لوگ قصیدے جھوٹے

حنیف کیفی

غزلیں

بہ شکل قطرہ تھی میرے وجود کی پہچان
ہوا میں بڑھ کے سمندر تو کھو گئی پہچان

یہ ہے تری نگہہ انتخاب کی پہچان
ہجوم شہر میں چہروں سے آدمی پہچان

مرے نشاں پتہ اپنا پائیں گے راہی
میں اپنی راہ کو دے جاؤں گا کوئی پہچان

حد ادب ہے کہیں کیا کہ اب ادیبوں نے
اک اشتہار بنا لی ہے منصبی پہچان

نہ روشنی کا ضمیمہ سمجھ کے کر تحقیر
شعار سایہ ہے رفتار وقت کی پہچان

چڑھا وہ سیل انا شخصیت کو لے ڈوبا
ابھارتی مجھے کیا میری ڈوبتی پہچان

ہے بے نیاز ظواہر اک آدمی کیفی
لباس سے پاک ہے وہ اس کی سادگی پہچان

بھری زمین کھلا آسمان میرا تھا
جواں تھا دل تو یہ سارا جہان میرا تھا

یہ دن بھی ہیں کہ سبھی بدگمان ہیں مجھ سے
وہ دن بھی تھے کہ ہر اک ہم زبان میرا تھا

بھرے جہان کی بارش اتار کر سر پر
رکا نہیں آ کے یہاں سائبان میرا تھا

قدم قدم پہ تھے اوہام سر اٹھائے ہوئے
مرا یقین ہی اک پاسبان میرا تھا

وہیں سے راہ میں اٹھتی گئی کوئی دیوار
جہاں جہاں بھی قدم درمیان میرا تھا

سلامتی سے جو گزرا وہ کون تھا کیفی
قدم قدم پہ یہاں امتحان میرا تھا۔

غزلیں

احمد سعدی
(بنگلہ دیش)

موسم گل میں چمن کا دلنشیں منظر نہ تھا
شاخ گل پر شعلہ ساماں پھول کا پیکر نہ تھا

دے گیا جو شخص مجھ کو زخم ہائے بے شمار
دوست دیرینہ تھا اس کے ہاتھ میں خنجر نہ تھا

جانے کیوں محروم تھا وہ قوت پرواز سے
اس پرندے کا تراشیدہ تو کوئی پر نہ تھا

کوئی بھی ثابت نہ تھا اس شہر میں شیشے کا گھر!
دور تک راہوں میں لیکن ایک بھی پتھر نہ تھا

ساتھ کیا دیتے وہ منزل تک رہ دشوار میں
معتبر اب کے سفر میں کوئی بھی رہبر نہ تھا

لوگ دستک دے رہے تھے جانے کیا کچھ سوچ کر
ان مکانوں کی فصیلوں میں تو کوئی در نہ تھا

آشنا کتنے تھے سعدی کیسے ہم پہچانتے
بے سر بے جان جسموں پر کسی کا سر نہ تھا

افتخار اجمل شاہین

جو ہے اندر باہر دیکھا
سات رتوں کا منظر دیکھا

اس کی میں تشہیر کروں کیا؟
جو ساگر کے تٹ پر دیکھا

جانے لوگ لگا یہ کیسے
میں نے تو بس پل بھر دیکھا

انجانے میں کیا کہہ بیٹھا
اس نے کیوں مڑ مڑ کر دیکھا

اس نے پائل باندھ لیا کیوں
کس نے دکھ کا منظر دیکھا

یاد بہت آتے ہیں بچے
دور جو گھر سے رہ کر دیکھا

غربت نے سب رشتے توڑے
کھیل یہ ہم نے اکثر دیکھا

شاہین تیرے شعر کو ہم نے
دکھ کا ایک سمندر دیکھا

غزلیں

حمیدؔ یورش
(پاکستان)

پہچان میری اس سے فقط غائبانہ تھی
پھر بھی لگا کہ دونوں کی ہستی جدا نہ تھی

کتنوں نے اس کے سامنے سر کو جھکا دیا
یہ جانتے ہوئے بھی کہ خواہش خدا نہ تھی

سورج تھا، اس کی دھوپ تھی بے بس درخت تھے
سر پر کسی کے ابر کی لیکن ردا نہ تھی

تحسینِ شہریار کا غوغا سنو لیجور
رہنا گواہ اس میں ہماری صدا نہ تھی

یورشؔ ہمارا اپنا ہی پہرہ فرات پر
اس کربلا سے بڑھ کے کوئی کربلا نہ تھی

یاور امانؔ
(بنگلہ دیش)

داستانِ عہدِ ماضی خوں چکاں
نقشِ پائے حال خوابِ رفتگاں

امتحانِ آدمیت الاماں
وقت کے سنگین مسائل بیکراں

لمحہ لمحہ ٹوٹتے رشتوں کا درد
سیلِ آتش بار ہیں ہر دم رواں

پھیلتی بڑھتی حدیں توسیع کی
اب خلاؤں کی فضا بھی بے اماں

آگ میں خود اپنی جلتی یہ زمیں
بانجھ پن کا بوجھ لادے آسماں

لاش اپنی اپنے کاندھے پر اٹھائے
آج کا انساں سرگرمِ فغاں!

راستے کے سنگِ میلوں پر اماںؔ
مرتسم ہیں سبز قدموں کے نشاں

غزلیں

فرحت قادری

آج انساں کو اتنی فرصت کہاں؟
ناچتی ہیں فقط ان کی پرچھائیاں
ڈھونڈتے ہو جسے، اب نہیں ہے یہاں
آدمی اٹھ گیا، رہ گئی داستاں

آج پتھر ہے ہر شخص کے ہاتھ میں
بچ سکے گا نہ شیشے کا کوئی مکاں

بس اسی بات پر قتل ہو جاؤ گے
اپنے دکھ بھی کسی سے نہ کرنا بیاں

بھوک سے لوگ جس وقت مرنے لگے
گونج اٹھیں سیٹھ کے گھر میں شہنائیاں

اب کوئی زہر کا پینے والا نہیں
بیچ ساگر تڑپنے لگیں مچھلیاں!

کاغذی پھول رکھنے سے کیا فائدہ؟
اتنی ناداں نہیں ہوتیں تتلیاں!

ریڈیو اور اخبار خاموش تھے
بات سب کہہ گئے چند جلتے مکاں

دھول ہی دھول ہے دور تک راہ میں
جانے کس موڑ پر لٹ گیا کارواں

ہم سے فرحت خدارا نہ کچھ پوچھیے
ہم زباں رکھ کے بھی ہو گئے بے زباں

نذیر فتح پوری

زور کچھ اپنے عزائم کا دکھا پانی پر
ناؤ کاغذ کی سہی پھر بھی چلا پانی پر

عکس در عکس جھلکنے لگا قطرہ قطرہ
چاند تاروں کا دریچہ جو کھلا پانی پر

اب کے برسات میں وہ سارے شجر ٹوٹ گئے
منحصر جن کی سمجھتے تھے بقا پانی پر

تشنگی خوب دشاؤں نے بجھائی یعنی
لے کے سورج کا نہ اک داؤ چلا پانی پر

راستہ دے دیا پھر سے ہمیں دریاؤں نے
جب بھی مارا کسی موسیٰ نے عصا پانی پر

جلترنگ آج ہواؤں میں بھی بکھرا ہے نذیر
دل کی لہروں سے جو اک گیت اگا پانی پر

غزلیں

شمیم مرتضیٰ دامن

دشوار رہگذر ہے، ذرا دیکھ کر چلو
کانٹوں کا اس پہ ڈھیر ہے ذرا دیکھ کر چلو

مست خرامِ ناز کو لازم ہے احتیاط
اس خاک میں شرر ہے، ذرا دیکھ کر چلو

منزل کی ہے تلاش تو اتنا رہے خیال
یہ راہ پُر خطر ہے، ذرا دیکھ کر چلو

یہ بھی کہیں نہ دشمنِ جاں بن کے لوٹ لیں
اب دوستوں سے ڈر ہے، ذرا دیکھ کر چلو

اب بے خطر نہیں ہے بہارِ چمن کی سیر
ہر پھول میں شرر ہے ذرا دیکھ کر چلو

کیا بات ہے کہ اہلِ سیاست کی آج بھی
تم پر کڑی نظر ہے، ذرا دیکھ کر چلو

ایسا نہ ہو کہ ٹھیس لگے اعتماد کو!
رہزن ہی راہبر ہے، ذرا دیکھ کر چلو!

یہ ناخدائے کشتیٔ دوراں بھی آج کل
کچھ غیر معتبر ہے، ذرا دیکھ کر چلو

دامنؔ بہر قدم قیامت کا سامنا
تکرارِ خیر و شر ہے، ذرا دیکھ کر چلو

حمید الماس

میرے وجود سے مری آبادیاں گئیں
سب کچھ مٹا کے شہر سے بربادیاں گئیں

بچوں نے، بھائیوں نے مجھے قتل کر دیا
میرے لہو کے ساتھ ہی جلادیاں گئیں

چاروں طرف کھڑی ہیں مسلح ہدایتیں
دل کیا ہوا مریض کہ آزادیاں گئیں

فردا کی آہٹوں سے ہراساں ہے تشنگی
پہلوئے شب سے صبح کی شہزادیاں گئیں

پیڑوں کے خط و خال سے سائے نکل گئے
قدموں سے سبزہ زار نما وادیاں گئیں

غزلیں

ساغر شولاپوری

مجھ سے قسمت میری خفا سی لگے
زندگانی بھی اب سزا سی لگے

ڈگریوں کو سجا کے شیشوں میں
سر اٹھاتے ہوئے حیا سی لگے!

بے وفائی بھی تیری آج صنم!
مسکراتی ہوئی ادا سی لگے!

گر گئیں آنکھیں پیار کو سجدے!
جانے کیوں آج تو خدا سی لگے!

بند پلکوں میں دل کی پیاس ہے تو!
آنکھ کھلتے ہی کیوں جدا سی لگے!

زندگی تیری نگاہوں میں!
جب کبھی دیکھوں تجھے ادا سی لگے!

آج ہر سانس جانے کیوں ساغر!
ایک مفلس کی بددعا سی لگے!

جعفر عسکری

جب تک اک قندیل تمنا روشن ہے
حد نظر تک درد کا صحرا روشن ہے

کیسا معانی خیز اجالا ہے اب تو
عریاں ہو کر سب کا سراپا روشن ہے

صف آرا میدان میں لشکر ہیں کتنے
امکاں پھر اک جنگ کا کتنا روشن ہے

محلوں محلوں برق تعیش کی لہریں
کوچہ کوچہ غم کا اندھیرا روشن ہے

قائل ہے دامان و نظر کی ویرانی
پوچھ نہ اس بازار میں کیا کیا روشن ہے

ہستی کے سفاک اندھیروں میں جعفر
ذات ہماری تنہا تنہا روشن ہے

قارئینِ

سواد وصوت

محب من جناب کلام حیدری ! تسلیمات

تذکرہ شعرائے گجرات مرتبہ تو آپ کی نگارش اور عرق ریزی کا آئینہ دار ہے موصول ہوا۔ آپ نے فی الواقعی گجرات کے ان شعرا کو زندہ جاوید کر دیا۔ ورنہ نہ معلوم اس کتاب کس کباڑیئے یا کسی ردی کی ٹوکری میں پڑی رہتی۔ اردو ادب اور ان شعرائے کرام پر یہ آپ کا احسان عظیم ہے ورنہ کون ان بھلے مانسوں کو آج پوچھتا ہے یا ان کا تعارف کرانا پسند کرتا۔

فی زمانہ عالم۔ دانشور ادیب تو غالب اور اقبال کو چمٹے ہوئے ہیں کہ ان مشاہیر کے نام اور ناموری پر اپنی شہرت منوالیں۔ آپ کی اس مساعی پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اردو کے دیگر ادیبوں کو بھی ایسی توفیق عطا ہو کہ وہ غیر معروف علمی ادبی ہستیوں کو متعارف کرائیں۔

آپ کی تخلیقات نظر نواز ہوتی رہتی ہیں۔ انشاءاللہ اکاڈمی کے دو شمارے " امکان " آپ کی خدمت میں بہت جلد پیش کروں گا۔

خواجہ عبد الغفور بمبئی

برادر محترم جناب کلام حیدری صاحب ! تسلیمات

آہنگ اور مورچہ IRREGULAR طور پر REGULARLY مل جایا کرتے ہیں جن کے لئے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔

آہنگ کے زیر نظر شمارے میں حسب معمول مشمولات اچھے اور معیاری ہیں خصوصاً جوگندر پال کا مضمون " فکر تونسوی کی عمومیت " ایک مختصر مگر اچھا جائزہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے مزاح و طنز نگار کو لوگ کبھی SERIOUSLY نہیں لیتے۔ اور نقاد حضرات تو انہیں کوئی چیز ہی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شیکسپیر کے بعد انگریزی ادب کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار بنیادی طور پر مزاح اور طنز نگار ہی تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فکر تونسوی ایک زمانے سے لکھ رہے ہیں لیکن اب ان کے فن میں جو MATURTY آگئی ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شہزاد منظر، ابراہیم جلیس کی شخصیت اور فن کی تفصیلات میں جاتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ چودھری مجیب رضا کا مضمون " معاصر طور، ایک جائزہ " تنقید کے تقاضے کو پورا نہیں کرتا۔ ذاتیات کی پیمائش و لب و لہجے کے لحاظ سے ناج پائی اور چودھری رضا صاحبان نے جو بھی لکھا ہے وہ ہو کر لکھا جس سے ان دونوں کا بھلا ہو تو ہو اردو ادب اور تنقید کا کچھ بھلا نہیں ہوتا۔ ادب کو کوئی خدمت ؟

شمس ندیم کاکلی پہاڑی

طوفانوں کی سرزمین **بنگلہ دیش** کے انوکھی پیشکش

—— : ادارہ : ——

مشرقی تہذیب کا سدا بہار کلاسیکی اور عصری ادب کا ترجمان

ششماہی ادبی رسالہ —— ڈھاکہ —— شمارہ ۱

نو بہار

اعزازی مدیر		مُدیر
پروفیسر ہمایوں کبیر	صفحات تقریباً بیش پانچ سو • طباعت آفسیٹ باتصویر سائز ڈیمائی، کاغذ سفید گلیز • سرورق سہ رنگ	قاضی محی الدین وکرم پوری

اس شمارے میں عالمی شہرت یافتہ ۱۳۰ قلمکار شریک ہیں۔ طویل انتظار کے بعد اب عنقریب شائع ہونے جا رہا ہے

بنگلہ دیش خوابوں کی سرزمین ہے، یہاں نہ صرف لہلہاتے ہوئے سبزہ زار، ندیوں کی جھلملاہٹ، جھرنوں کی نغمگی، پرندوں کی چہچہاہٹ، اور پھولوں کا تبسم ہے —— بلکہ شدید طوفانوں کی گھن گرج میں پھیلی ہوئی زندگی بھی اپنی فطری قدوقامت میں اجاگر ہے —— ادارہ کی خاص فرمائش پر بیشتر معروف ترین قلم کاروں نے اپنی بیش بہا تحریروں میں بنگلہ دیش کی زمین کو والہانہ محبت کا خراج پیش کیا ہے اور جنھیں ہم بصد شکریہ شائع کر رہے ہیں۔

—— : پتہ : ——

ایڈیٹر "نو بہار" ۵۳ ٹیپو سلطان روڈ، ڈھاکہ ۱ بنگلہ دیش

ماہنامہ آہنگ میں شائع شدہ تخلیقات کا
ــــــ شـــــوارہ

ــــ : مرتبہ : ــــ

ڈاکٹر محمد مثنیٰ

مضامین سال ۱۹۷۶ء

نمبر شمارہ	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
۶۶/۶۷	غلام عباس	مرزا ظفر الحسن	غلام عباس کی اول زندگی پر ایک طائرانہ نظر
〃	اردو افسانے کے آس پاس کچھ چہرے	رام لعل	کبھی کبھار افسانے لکھنے والوں کے متعلق چند اشارے
۶۸/۶۹	نامرادانہ زیست کرتا تھا	احمد یوسف	ثاقب کی ادبی شخصیت کے خدوخال
۷۰/۷۱	ادب اور جنس کا مسئلہ نئی دنیا کا مسافر	وزیر آغا سلیم احمد	ادب میں جنسی موضوع کے تخلیقی اور فنی اظہار کا مسئلہ ناصر کاظمی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ
۷۲/۷۳	کوئی مضمون شامل نہیں ہے		
۷۴/۷۵	جدید ادبی رویّہ اور مسعود اشعر	محمود واجد	مسعود اشعر کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

شمارہ نمبر	مضامین	مصنف	مضمون کا تعارف
۷۴/۷۵	سال بیلو کی ناول نگاری	وہاب اشرفی	سال بیلو کے فن ناول نگاری کا جائزہ
۷۶/۷۷	کلام حیدری کے افسانے	نظام صدیقی	کلام حیدری کے فن کا تنقیدی مطالعہ
	تخلیقی عمل۔ ایک مطالعہ	کلام حیدری	وزیر آغا کے تنقیدی تصنیف تخلیقی عمل پر ایک مطالعہ

افسانے

شمارہ نمبر	افسانے	افسانہ نگار	شمارہ نمبر	افسانے	افسانہ نگار
۶۶/۶۷	اسٹل لائف	جیلانی بانو	۷۲/۷۳	میں ایک پھیلتا ہوا دائرہ	سلطان سبحانی
	گرتے ہوئے درخت	شروَن کمار ورما		ٹرین	پیغام آفاقی
	نور کا ہالہ	عبدالمغنی			
	سپنی سنہرا	علی امام	۷۴/۷۵	گل مہر کے پاس	انور عظیم
	کشتی کی تلاش	عبدالصمد		روتی ہوئی آواز	غیاث احمد گدی
	راز کو راز ہی رہنے دو	عطیہ پروین		وہ جو کچھ بھی نہیں ہے	رشید امجد
				کپل دیو	عشرت ظہیر
۶۸/۶۹	تقاضا کوئی دن اور	رضیہ فصیح احمد		لمبا منظر	ہاجرہ شکور
	کٹا ہوا ہاتھ	لوک راج			
			۷۶/۷۷	بستیاں	جوگندر پال
۷۰/۷۱	اے خالق کائنات	عبدالمتین		ریت رسی اور موت	رشید امجد
	تصویر	الطاف فاطمہ		قیدی پیکر	ملبینہ امام
	دی ٹکیٹوز	مشتاق قمر			
	بوجھ	یونس جاوید			
	شاخِ گل	اختر جمال			

نظمیں

شمارہ نمبر	نظم	شاعر
٦٦/٦٧	حمد	غلام مرتضیٰ راہی
	آج کا المیہ	اسعد بدایونی
	بسم اللہ کی دو ہندی نظموں کے منظوم ترجمے	اختر الاسلام
	سویمبر اور بن باس	فیاض اختر
	جاڑے کے نام	علقمہ شبلی
٦٨/٦٩	رباعیات	ثاقب عظیم آبادی
	دو لمحے	حرمت الاکرام
	ولا تمنن تستکثر ولن تہجرت	طارق عظیم آبادی
٧٠/٧١	مچھلیاں۔ محو تماشا۔ خیر من النوم۔ سوچ کی شام، خوشبو سا خنجر	عادل منصوری
	کیف وصال	کرشن موہن
	ورثہ	وقار خلیل
	ایک نظم	نصر حمید غلشی
٧٢/٧٣	یس عمر، ہجر	عزیز تمیسی
	تیسری تخلیق۔ چاندنی کا کھنڈر	یوسف اعظمی
٧٤/٧٥	رباعیات	حرمت الاکرام
٧٦/٧٧	خون کی خموشی ہے اور زمین بنجر ہے	عادل منصوری
٧٦/٧٧	ملگجے میلے ماحول کے چمن میں	عادل منصوری
	صحرا کا سفر	شاہد کلیم
	آدرشوں کے کھنڈر	اعجاز اعظمی

غزلیں

شمارہ نمبر	غزلیں	شاعر
٦٦/٦٧	غزل	ندا فاضلی
	،،	ممتاز راشد
	،،	مدحت الاختر
	،،	جاوید
	،،	منظور ہاشمی
	،،	راغب شکیب
	،،	رونق گیاوی
	،،	نکری بدایونی
	،،	شاد لوحی
	،،	
٦٨/٦٩	،،	ثاقب عظیم آبادی
	،،	
٧٠/٧١	،،	پرکاش فکری
	،،	عتیق اللہ
	،،	سلطان سبحانی
	،،	صفدر
	،،	ساجد اثر
٧٢/٧٣	،،	حسن نعیم

نمبر شمارہ	غزل	شاعر
۷۲/۷۳	"	لطف الرحمٰن
	"	وقار واثقی
	"	غلام مرتضیٰ راہی
	"	نجم عثمانی
	"	پرکاش فکری
	"	
۷۴/۷۵	"	عادل منصوری
	"	مصطفےٰ مومن
	"	نازش انصاری
	"	انور شمیم
۷۶/۷۷	"	خلیل الرحمٰن اعظمی
	"	منظر شہاب
	"	حق اعظمی
	"	سید احمد شمیم

تبصرہ

نمبر شمارہ	تبصرہ	مبصر
۶۶/۶۷	ارتعاش	کلام حیدری
	جلوۂ خضر	کلام حیدری
۶۸/۶۹	دھرتی کا لمس	عشرت ظہیر
	ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر	عشرت ظہیر

نمبر شمارہ	تبصرہ	مبصر
۷۰/۷۱	سائے اور ہمسائے	عشرت ظہیر
	نورشید	"
	آواز نما	"
	اجنبی خدا	"
۷۲/۷۳	تنکے کا سہارا	کلام حیدری
	شرار سنگ	"
	شجر صدا	"
۷۴/۷۵	سلوٹیں	احمد یوسف
۷۶/۷۷	گردش رنگ	عشرت ظہیر
	الفاظ	"

متفرقات

۶۸/۶۹	لڈو سے الائچی کے پان تک (خاکہ)	مرزا ظ
	ننگے پاؤں، گرم ریت (ڈرامہ)	مرزا ا
۷۲/۷۳	فسانہ بے گاکل (رپوتاژ ۱)	احمد
	دہلی میں ترقی پسند ادیبوں کا یادگار اجتماع (رپوتاژ)	قمر ر
۷۴/۷۵	فسانہ بے گاکل (رپوتاژ ۳)	احمد

R N Regd 4 /61
P. T. Regd No Gy 7
Phone – 43

The AAHANG Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA.

تفہیمات

PRICE Rs

THE Cultural Academy, Gaya.

Printed Union Press, Gaya.



Nov. 1983

PRICE Rs. 3/-

دی کلچرل اکیڈمی ریتہ ہاؤس جگجیون روڈ گیا

قائم شدہ سنہ ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

ایک سال کیلئے :- چھتیس ۳۶ روپے
ایک شمارہ :- تین روپے

فون نمبر- 432

چیف ایڈیٹر
کلام حیدری

ایڈیٹرز
نوشابہ حق، عبدالصمد

محتویات

مضامین

افسانے

نظمیں

غزلیں

اداریہ

کشکول

اپنا ادبی موقف رکھنا، اس پر عمل کرنا اور اس موقف کی حمایت میں استدلال پیش کرنا —— ہر ادیب کا حق ہے۔ اور اسی طرح ہر ادیب کا یہ بھی حق ہے کہ وہ کسی موقف کے کھوکھلے پن، غیر ادبی ہونے پر بحث کرے۔ قارئین ادب مختلف نظریوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور ردّ و قبول کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ ادب کی تخلیق کیلئے معاون ہوتا ہے۔ ایسا اگر نہ ہو تو تخلیق کا دریا ایک جگہ آکر ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات ادبی تخلیق اور ادبی فکر کے لئے مضر ہے۔ ظاہر ہے سچا ادیب ادب کی تخلیقی قوتوں کو کمزور یا ختم کرنے کا کام نہیں کر سکتا، کر ہی نہیں سکتا —— شرط صرف یہ ہے کہ وہ سچا ادیب ہو۔ وہ ہو سکتا ہے آج ایک موقف کو صحیح سمجھ کر اختیار کرے مگر تجربے اور فکر کی پختگی کے ساتھ وہ اس موقف کی پاسداری کو غلط یا جزوی طور پر غلط سمجھنے لگے —— غرض ادیب اور اس کا ذہن ہمیشہ آگے بڑھتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہر شئے کو شبہ اور شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اتنا وسیع القلب اور وسیع النظر ہوتا ہے کہ خود اپنے موقف کو بھی غلط کہنے سے باز نہیں آتا اگر اسے وہ غلط لگنے لگے۔

"صرف پابند نظمیں"

"(صرف) پابند غزلیں"

"(صرف) عام فہم با ماجرا افسانے"

اگر صرف اتنے پر کوئی ادیب اکتفا کر لے تو ظاہر ہے، سوچنے والے یہ ضرور سوچیں گے کہ ان سے الگ جو تخلیقات ہیں ان کو دریا برد کر دیا جائے۔ اور ادیبوں، شاعروں پر یہ پابندی لگا دی جائے کہ وہ ایسی تخلیقات کو ظہور میں آنے سے پہلے اپنے اندر ہی قتل کر دیں؟۔

'بے ماجرا' اور 'علامتی افسانوں' کو اپنے رسالے میں جگہ نہ دینا اور یہ اعلان کر کے کہ "ہم نے انہیں رد کر دیا" پتہ نہیں رد کرنے والے کے ذہن کی کون سی تصویر پیش کرتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ ادب بھی تحکم اور جبر کے نرغے میں آگیا ہے۔ یہ رجحان بلکہ یہ 'عمل' کہاں تک ادیبوں اور شاعروں کے لئے اور خود ادب کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے یہ بات سوچنے کی ہے۔

"کیا ہمارے افسانہ نگار عام فہم با ماجرا افسانہ نگار نہیں رہے؟" نہیں ایسی بات نہیں

ایسے اہل افسانہ نگاروں کے بیسویں صدی، ادبی، شمع، اور اس قبیل کے رسائل میں شائع ہونے والے سینکڑوں افسانے گواہ ہیں کہ ہمارے یہاں "عام فہم با ماجرا" افسانہ نگاروں کی تعداد بیدی، غیاث احمد گدی جوگندر پال، رام لعل، سریندر پرکاش، احمد یوسف وغیرہ سے بہت زیادہ ہے۔ مگر ان "اہل" افسانہ نگاروں کا مرتبہ بحیثیت فن کار کیا ہے۔ اور کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے۔

صرف یہ معلوم کرنے کے لئے "وہ" (یعنی افسانہ نگار) کسی خاص رسالے کے لئے خاص طور پر عام فہم با ماجرا افسانے لکھ سکتے ہیں کہ نہیں، ان سے عام فہم با ماجرا افسانے طلب کئے جائیں تو ایسا لگتا ہے کہ رسالے کے ذریعے ایک "امتحان" لیا جا رہا ہے۔ کیا یہ "امتحان" بہت مشکل ہے؟ بہت ضروری ہے؟ جب کہ کسی بھی فن کار کو ایک نہیں کئی امتحانات سے گذرنا پڑتا ہے۔ کچھ تخلیق سے پہلے، اور بہت زیادہ تخلیق شائع ہونے کے بعد ——— یہ ادبی رسالے کا موقف نہیں ہو سکتا کہ فنکاروں کا ایسا گھٹیا قسم کا امتحان لیا جائے اس کے لئے کالجوں کے "انعامی مقابلے" ہی کافی ہیں۔

"ہم فطری طور پر (عام فہم با ماجرا افسانہ نہ لکھنے والے اور پابند نظمیں نہ کہنے والوں) کو اناڑی کہنے پر مجبور ہیں" ——— فطری طور پر تو کوئی کچھ بھی کہنے پر مجبور ہو سکتا ہے مگر علمی اور ادبی طور پر بے ماجرا اور خاص فہم افسانہ نگاروں کو "اناڑی" کہہ دینا اتنا آسان نہیں جتنا آ۔ ان ۔ کار سے وظیفہ یا انعام یا گرانٹ حاصل کر لینا ہے۔

ذاتی رائے کی آزادی ہے مگر ذاتی رائے کو جرنیلی حکم بنانا سچے فنکار اور نقاد کا کام نہیں ہو سکتا۔
یہ باتیں قارئین ادب اور ادب کے خالقوں کے سوچنے کی ہیں۔

——— ۔ح۔ ———

باخبری:

آس پاس

["آہنگ" ایک ادبی رسالہ ہے سیاست سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن ہماری قومی زندگی میں سیاست کو جو اہم مقام حاصل ہے۔ اس سے سبھی واقف ہیں۔ ہم اس شمارے سے سیاسی تبصرے کا ایک مستقل کالم شروع کر رہے ہیں جس میں قومی اور بین الاقوامی صورت حال پر اپنے سیاسی مبصر کا تبصرہ شائع کریں گے۔ یہ تبصرہ غیر جانب دار، بے لاگ اور آزاد ہوں گے ہم اپنی اس کاوش میں قارئین کی توجہ کے مستحق ہیں۔ اڈیٹر]

غیر سنجیدگی

پچھلے دنوں سری نگر میں چندر شیکھر کی قیادت والے تیسرے حزب مخالف گروپ کے لیڈروں کا اجتماع ہوا۔ اس سے پہلے وجے واڑہ اور دہلی میں بھی یہ اجتماعات ہو چکے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اجتماعات بے شک اہم ہیں کہ پہلی بار ملک میں حزب مخالف کے لیڈران چند ٹھوس مسئلوں پر غور و فکر کے لئے جمع ہو رہے ہیں ورنہ اب تک تو ملک میں صف آرائی کی سیاست رائج رہی ہے۔ آپ اگر حکمران جماعت، چاہے وہ کانگریس ہو، جنتا پارٹی ہو یا نیشنل کانفرنس ہو اور حزب مخالف کے اب تک کے تعلقات پر نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ یہ دو پرانے اور جانی دشمنوں کی داستان ہے ظاہر ہے کہ یہ چیز جمہوریت کے فروغ میں سدراہ بنی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ملک میں تشدد کی ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس پر حکومت وقت قابو پانے میں ناکام رہی ہے۔

آزادی کے بعد کئی کوششیں کی گئیں۔ کہ حزب مخالف ایک پلیٹ فارم پر مجتمع ہو۔ اور ملک کے سامنے درپیش مسئلوں پر سنجیدگی سے غور و فکر کی جائے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کا آپس کا یہ اتحاد محض حکومت سازی کے مقصد کے پیش نظر رہا ہے یہ اتحاد کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ اور بہت ہی افسوس ناک حالات میں اس کا خاتمہ ہوا۔ اس سے ملکی سیاست پر جو اثرات مرتب ہوئے وہ بہت ہی خراب نتائج کے حامل ہیں۔ بہر کیف اگر ان خراب تجربات سے سبق لیا جائے تو بلاشبہ یہ بہت اچھی بات ہوگی۔ اور اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے۔ جمہوریت کو اس وقت تک فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ حکمران اور مخالف جماعتیں اپنے فرائض کو نہیں سمجھیں۔ اس سلسلہ کر کوئی

سنجیدگی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے سامنے آتا ہے تو وہ ہر طرح کے تعاون کا مستحق ہے۔

سری نگر کے اجتماع کے جو ایجنڈے سامنے آرہے تھے ان سے یہ امید بندھ چلی تھی کہ ریاست اور مرکز کے تعلقات کے بارے میں بہت سی مفید باتیں سامنے آئیں گی۔ ابھی حال ہی میں اس مسئلے پر مرکزی حکومت نے سرکاریہ کمیشن کی جو تشکیل کی ہے۔ اسے بھی ان خیالات کی روشنی میں کام کرنے میں آسانی ہوگی۔ لیکن ان مشوروں اور خیالات کا تجزیہ کرنے پر یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ صف آرائی کی سیاست در پردہ کام کر رہی تھی۔ اور بالآخر وہ حاوی بھی ہوئی۔

گورنر کی بحالی کے سلسلے میں یہ بات کہی گئی۔ کہ مرکز کا اس میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ سنجیدگی کا وہاں کوئی گزر ہی نہیں تھا۔ ہمارا آئین کچھ اس ڈھنگ کا ہے کہ ہم اس کے ذریعہ عائد کردہ حدود میں رہکر ہی بات کرسکتے ہیں اس نے ملک میں دو سطحوں پر حکومت کا قیام عمل میں لایا ہے ایک مرکزی سطح پر، دوسرا ریاستی سطح پر۔ اس نے مرکز کو واضح اور وسیع اختیارات دیئے ہیں۔ کہیں کہیں پر مرکز اور ریاستی حکومتوں کے اختیارات میں ٹکراؤ بھی ہوا ہے۔ ایسی صورت میں آئین نے مرکزی حکومت کی بالادستی کو واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ پارلیامنٹ جن ذمہ داریوں اور جواب دہی کے پیش نظر بنی جاتی ہے۔ جن سے وہ منہ موڑ نہیں سکتی۔ لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ بے شک ریاستوں کا ہے لیکن اگر ریاستیں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوتیں تو اپنے اختیارات کے مطابق مرکز ریاستوں میں مداخلت کرنے کا حق رکھتا ہے۔ مرکز کو یہ بھی حق ہے کہ وہ ریاستوں کے اندرونی معاملات کے بارے میں باخبر رہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا ذریعہ ہے جس کی مدد سے مرکز ریاستوں کے بارے میں خبریں حاصل کرے۔ ذریعہ بھی ایسا ہونا چاہیے جس پر پورا بھروسہ کیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ گورنر، مرکز کو ریاستوں کے حالات کے بارے میں جو رپورٹیں بھیجتے ہیں ان کے لئے وہ کسی کے مشورے کے محتاج نہیں ہوتے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ گورنر کو ایک ریاست میں دو طرح کے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔ ایک ریاست کے آئینی حکمراں کے طور پر۔ دوسرے مرکز کے نمائندے کے طور پر۔ ——— آئینی حکمراں کا فرض نبھاتے ہوئے وہ عوام کی منتخب کردہ حکومت کے مشوروں پر عمل کرتا ہے۔ دوسری طرف مرکز کا نمائندہ ہوتے ہوئے اسے کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات بے حد ضروری ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے گورنر مرکز کا وفادار رہے۔ اور مرکز کو اس پر مکمل اعتماد ہو۔ اس کے بغیر وہ اپنی ذمہ داریوں سے بہتر طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ایک گورنر جب کسی ریاست میں جاتا ہے تو اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس ریاست کا باشندہ نہیں ہوتا لیکن وہ ریاست کا پہلا شہری ہوتا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور قابل مذمت ہے کہ گورنر کے عہدے کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اگر اس روشنی میں حزب مخالف کا اجتماع اپنے خیالات کا اظہار کرتا تو یہ ایک بہتر بات ہوتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آج جو لوگ حزب مخالف میں ہیں۔ انہیں جب ایوانِ حکومت میں جانے کا موقع ملا تو انہوں نے بھی گورنر کے عہدے کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اس لئے ان کے پاس اب کون سا اخلاقی جواز رہ جاتا ہے کہ وہ اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔

عقل حیراں ہے

اس وقت ملک کے سیاسی افق پر تین طاقتیں

ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ ایک حکمراں جماعت اندرا کانگریس۔ دوسری چندر شیکھر کی قیادت میں دائیں بازو کی مخالف جماعتیں۔ تیسری اٹل بہاری واجپائی، اور چرن سنگھ کے قیادت میں ابھرنے والا محاذ۔ اندرا کانگریس دراصل آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ جس نے گاندھی نہرو، اور آزاد کی قیادت میں ہندوستان کی جنگ آزادی لڑی۔ ملک میں ایک سیکولر نظام قائم کیا۔ اور اپنے آپ کو سوشلسٹ راہوں پر گامزن کیا۔ نہرو کے بعد اس جماعت نے کئی شکلیں بدلیں۔ لیکن ہر بار اس کے طاقت ور شکل کی قیادت نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی کے ہاتھوں میں رہی۔ کانگریس کا ملک میں ایک ایسا کلچر رہا جو خالص سیکولر تھا۔ بدقسمتی سے آج اس جماعت کا سیکولر کردار مشتبہ ہوگیا ہے۔ اور اس کے جنرل سکریٹری کہتے ہیں کہ ہندو کلچر، کانگریس کلچر ہے۔ بہرکیف! یہ ایک الگ بحث ہے جس پر پھر کبھی تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

دوسری بڑی طاقت چندر شیکھر کی قیادت میں ابھرنے والا محاذ ہے چندر شیکھر جنتا پارٹی کے صدر ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب جنتا پارٹی میں، جن سنگھ (موجودہ بھارتیہ جنتا پارٹی) لوک دل اور سوشلسٹ پارٹیاں شامل تھیں۔ اور مرکز اور کئی ریاستوں میں ان کی حکومتیں قائم تھیں۔ آج کی طرح تب بھی جن سنگھ اور آر ایس ایس کی ممبری ایک ہی سکے کے دو رُخ تھے۔ اس وقت چرن سنگھ نے محض اس بنیاد پر جنتا پارٹی سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ جس کے نتیجے میں جنتا حکومت کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ اور اس نے اندرا کانگریس کی شاندار واپسی کی راہیں ہموار کی تھیں۔ اس وقت چندر شیکھر اور ان کے ساتھیوں نے اس سوال پر خاموشی کو راہ دی تھی۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جنتا پارٹی تو وہی ہے اور اس کے صدر بھی چندر شیکھر ہی ہیں۔ لیکن یہ دایاں بازو کے محاذ

کی لیڈر ہیں۔ اس محاذ میں بہوگنا، ڈاکٹر بھائی اڈوانی، فاروق عبداللہ، این۔ ٹی راما راؤ وغیرہ شامل ہیں۔ دونوں کمیونسٹ پارٹیوں کی بھرپور حمایت بھی اسے حاصل ہے۔ اس نے واضح طور پر اپنے آپ کو دایاں بازو سے منسلک کیا ہے۔ چندر جیت یادو جیسے ممتاز ترقی پسند لیڈر اس کے ہراول دستے میں شامل ہیں۔ اس دفعہ چرن سنگھ اٹل بہاری واجپائی کی گود میں جا بیٹھے ہیں۔ یا اٹل بہاری واجپائی کو چرن سنگھ کی بوڑھی گود میں سکون ملا ہے۔ چرن سنگھ نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ آر ایس ایس کے ایشو پر ان کے خیالات صحیح نہیں تھے۔ لوک دل اور بھارتیہ جنتا پارٹی کا محاذ ایک کٹر فرقہ پرست اور قدامت پسند خیالات پر مبنی گروپ کی شکل میں ابھرا ہے چرن سنگھ ہندوستان کے سیاسی جنگل کے ایک ایسے رنگے سیار ہیں جس نے سارے جنگل کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ہندوستان کے کسانوں کے عظیم نیتا ہیں۔ جب یہ حضرت جنتا حکومت میں وزیر داخلہ تھے تب یہ اپنی سالگرہ کے موقع پر راجدھانی میں کسانوں کا ایک بڑا میلہ منعقد کرچکے ہیں۔ لیکن یہ بات کبھی مت بھولئے کہ اس وقت ہریانہ، یوپی، اور بہار میں اس کے نامزد کردہ افراد وزیر اعلیٰ تھے۔ یہ بات بھی بتانے کی غالباً ضرورت نہیں کہ وزرائے اعلیٰ کے بہت سے فرائض میں ایک اہم فرض یہ بھی شامل ہے کہ اپنی جماعتوں کی طاقت کی نمائش میں ٹرکوں ٹرک افراد کو بھیجنے کا بندوبست کریں۔ یہ حضرت جب آر ایس ایس کے ایشو پر جنتا پارٹی سے الگ ہوئے تھے تب ایسا لگ رہا تھا کہ ملک کے سیاسی افق پر ایک سیکولر اور صاف ذہن کے لیڈر کا ظہور عمل میں آرہا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ امیدوں کا سارا محل تاش کے پتوں کی طرح ڈھ گیا۔ اور افق پر ایک گہری تاریکی چھا گئی۔

جب ۱۹۸۰ء میں انہیں کے کرائے ہوئے انتخابات کے نتیجے میں اندرا کانگریس کو زبردست اور غیر معمولی کامیابی

حاصل ہوئی۔ اور انہیں کراری شکست۔ تو کچھ عرصہ کے لئے تو یہ اپنے زخم چاٹتے رہے۔ پھر کچھ صحت پاکر انہوں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے جگ جیون رام سے یارانہ گانٹھا۔ جن کے وہ ایک زمانہ میں کھلم کھلا دشمن ہوا کرتے تھے۔ کئی سیاسی جلسوں میں وہ جگ جیون رام کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے عوام کے سامنے آئے۔ جلد ہی انہیں محسوس ہوا کہ جتنے پانی میں وہ خود ہیں۔ اس سے کم پانی میں جگ جیون رام تیر رہے ہیں۔ تب انہوں نے جگ جیون رام سے کٹی کر لی۔ اور اٹل بہاری واجپائی سے پینگیں بڑھائیں اور ان کی کمر میں ہاتھ ڈالے باغ سیاست میں چہل قدمی کرتے نظر آنے لگے۔ خیر ان کی فطرت سے اہل ملک اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لئے ان کی حرکتیں عجیب نہیں لگتیں۔ لیکن یہ اٹل بہاری کو کیا ہو گیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں تین بڑے سیاسی لیڈر ہیں۔ اندرا گاندھی، اٹل بہاری واجپائی۔ اور چندر شیکھر، یہ چرن سنگھ تو اب صوبائی سطح کے لیڈر بھی نہیں رہے۔ مغربی اتر پردیش کے کچھ ضلعوں میں ان کے جاننے والے موجود ہیں۔ لیکن جب سے انہوں نے مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کی ہے ان کی یہ پوزیشن بھی مشکوک ہو گئی ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی ایک بڑی جماعت ہے اندرا کانگریس کے بعد وہی سب سے بڑی جماعت ہے۔ جس کی شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک معنی میں تو یہ اندرا کانگریس سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ کہ یہ ایک CADRE BASED پارٹی ہے۔ جبکہ اندرا کانگریس میں اس کے جنرل سکریٹری راجیو گاندھی کی کوششوں کے باوجود cadre نہیں بن سکا ہے۔ جلسوں کا اہتمام بی جے پی والے کرتے ہیں اٹل بہاری کو دیکھنے اور سننے کے لئے اس کے حمایتی آتے ہیں۔ اور اس سے خطاب کرتے ہیں چرن سنگھ۔ اس کے بعد اٹل بہاری کو موقع ملتا ہے۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ

چرن سنگھ اٹل بہاری سے بھی بڑے لیڈر ہیں۔ اور ان کے جلسوں میں لاکھوں افراد شریک ہوتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بی جے پی کو چرن سنگھ سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ وہ لوگ آخر چرن سنگھ کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں۔ واجپائی تو ایک ہوشیار اور عقل مند آدمی ہیں۔ کیا ان کی نگاہیں یہ نہیں دیکھتیں کہ ملک بھر میں اس گٹھ جوڑ کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اور اس سے خود واجپائی کی ساکھ کو نقصان پہونچ رہا ہے۔ چرن سنگھ کے ملک کی صنعتی ترقی، پنجاب و آسام کے مسئلوں اور مسلمانوں کے بارے میں کیا خیالات ہیں۔ اس سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ چندر جیت یادو، کرپوری ٹھاکر، مدھو لمیے، اور ربی رائے جیسے لوگ جب تک ان کے ساتھ تھے وہ کس حد تک قابل قبول تھے۔ لیکن اب تو وہ اپنی پارٹی لوک دل کے مائی باپ ہیں۔ جس کو چاہا۔ کان پکڑ کر نکال دیا۔ اور جب جہاں چاہا اپنی پارٹی کا سودا کر لیا۔ ایک عادت ان کی یہ بھی رہی ہے کہ یہ زیادہ دیر تک کسی کے ساتھ ٹک کے نہیں بیٹھ سکتے۔ اس لئے اٹل بہاری سے ان کا یارانہ کب تک جاری رہتا ہے یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ دراصل بی جے پی والے چرن سنگھ کو چاروں طرف سے گھیر رہے ہیں کہ وہ رسی تڑا کر بھاگ نہ سکیں۔ لیکن خود بی جے پی کو اس سے کیا حاصل ہوگا

شناختی کارڈ

آر ایس ایس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے افکار و عمل سے ملک میں اقلیت کے خلاف ایک فضا بنائیں جہاں اس کی کوششوں سے یہ بات ہوتی ہے وہاں تو خیر اسے کامیابی کا تمغہ ملتا ہی ہے اب تو اس نے دوسروں کی کوششوں سے بھی فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ آسام کی مثال سامنے ہے۔ ادھر بہار میں پورنیہ، کشن گنج، کٹیہار وغیرہ کے

علاقے میں آر ایس ایس بہت سرگرم نظر آ رہی ہے۔ یہ علاقے مسلم اکثریت کے ہیں۔ اور معاشی اعتبار سے یہ خاصے خوشحال ہیں۔ ان کی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ علاقے ملک کی مشرقی سرحد پر واقع ہیں۔ دوسری طرف بنگلہ دیش کی سرحدیں ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں جب بنگلہ دیش کی جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی اور ہندوستان اس میں دامے، درمے، سخنے، مدد کر رہا تھا تو پاکستانی فوجیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر بہت سے بنگلہ دیشی ہندوستان آ گئے تھے۔ اور ہندوستان کے لئے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ بہر کیف ملک نے سخت حالات کا مقابلہ کیا۔ بنگلہ دیش کو آزادی حاصل ہوئی۔ اور یہ رفیوجی باعزت اپنے گھر کو لوٹے۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے ہندوستانی شہریت حاصل کر لی۔ اور یہیں کے ہو رہے۔ بہت دنوں سے گاہے گاہے یہ آواز اٹھائی جاتی رہی ہے کہ پورنیہ وغیرہ کے علاقے میں بہت سے غیر ملکی گھس آئے ہیں۔ اور انہیں نکال باہر کرنا چاہئے۔ پہلے تو اس بکواس پر دھیان نہیں دیا گیا۔ لیکن جب آسام میں اس مسئلے پر بہت بڑا خون خرابہ ہوا تو حکومت یہاں بھی بیدار ہونے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ الیکشن کمیشن کی ہدایت پر حکومت نے کئی ہزار افراد کو یہ نوٹس جاری کی ہے۔ کہ وہ اپنی ہندوستانی شہریت کو ثابت کریں۔ اس طرح گویا آر ایس ایس کے مطالبے کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اب ذرا اسی نوٹس کے خطرناک نتائج پر غور کیجئے۔ حکومت کی اس کارروائی نے وہاں کے مسلمانوں کو مشکوک تو بنا ہی دیا ہے۔ اگر وہ کسی طرح یہ ثابت نہ کر سکے تو ان کا ہوگا کیا ——— بلا سے وہ سینکڑوں ہزاروں برسوں سے یہاں رہتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے پاس ثبوت کیا ہے کہ وہ ہندوستان کے شہری ہیں۔ اگر وہ پڑھے لکھے ہیں تب تو وہ اسکول کا، کالج کا، ووٹر لسٹ کا ثبوت پیش کر کے اپنے آپ کو ہندوستانی ثابت کر دیں گے۔ لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کی بڑی اکثریت جاہل ہے۔ اور اس میں مسلمانوں کی تعداد تو اور زیادہ ہے۔ ایسے لوگ جنھوں نے اسکول میں پڑھا ہے نہ کالج میں۔ ووٹر لسٹ میں نام درج کرانے کی پیچیدگیوں سے بھی وہ واقف نہیں۔ وہ کہاں سے اپنے آپ کو ہندوستانی ثابت کر سکیں گے۔ اس مسئلے کے پس پشت ہماری حکومت کی مشینری کی ناکردگیاں اور متعصب رویہ کار فرما ہے۔ اگر سرحد پار کر کے کوئی اس ملک میں گھس آتا ہے تو ہماری سرحدی فوجیں کیا کر رہی ہیں۔ کیا ان کا کام صرف مرغیاں اور بکرے پکڑنا اور عیش کرنا ہے۔ جہاں تک کہ ہماری بارڈر سیکورٹی فورس کی کارکردگی کا تعلق ہے اس نے ملک کے مختلف حصوں میں امن و امان قائم کرنے میں مقامی پولس کی مدد کر کے اپنی بہتر کارکردگی کا ثبوت کئی بار پیش کیا ہے۔ اس لئے اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں شک و شبہ کرنا ان کی ایمانداری پر حرف لانا ہے۔ لیکن ہماری حکومت اپنی کارروائی سے ایسا ضرور کر رہی ہے

دوسری بات یہ ہے کہ شہریت ثابت کرنے کے لئے صرف مسلمانوں ہی کو نوٹس کیوں دی گئی؟ سرحد پار سے چوری چھپے آنے کا سلسلہ تو تقسیم ملک کے بعد ہی سے جاری ہے۔ پھر کیوں نہ کوئی ایک تاریخ مقرر کر کے ایسا رویہ اختیار کیا گیا۔ کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ آسام میں اس مسئلے پر تین چار سال سے خون ریزی جاری ہے۔ لیکن وہاں حکومت نے صحیح موقف اختیار کر رکھا ہے۔ آخر اس پالیسی سے یہاں کیوں فرار اختیار کیا گیا۔ یہ سب ایسے سوالات ہیں جن کا جواب حکومت کے پاس نہیں۔ دراصل حکومت ہر کام انتخاب کو سامنے رکھ کر کرتی ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ وہ ایسا رویہ اختیار کر کے ملک کی اکثریت کی ہمدردیاں حاصل کر سکے گی۔ اور اسے ووٹ مل سکیں گے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو بہت ہی افسوسناک ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ نوٹس جاری کر کے جو عظیم غلطی کی گئی ہے۔ اس کے تدارک کے لئے فوری اور موثر کارروائی کی جائے۔ اور ہندوستان کے تمام شہریوں کو شناختی کارڈ

طاہر تونسوی
(پاکستان)

لفظوں کا قتلِ عام اور گیلے حرف کے افسانے

نیا افسانہ پرانے افسانے سے انحراف کی ایک صورت ہے۔ اس لئے آج کا افسانہ نگار نہ تو پلاٹ میں گرہیں ڈالتا ہے کہ کہانی پن اور دلچسپی کا عنصر قائم رہے۔ اور نہ ہی ان گرہوں کو خود بخود کھولنے لگ جاتا ہے بلکہ وہ چونکانے کے طریقے کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ آج کا افسانہ نگار زندگی کے ایک پہلو کا انتخاب کرتا ہے۔ اور پھر علامت کے حوالے سے فنی مہارت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ وہ صرف خرابیوں کی نشاندہی کرتا ہے حل نہیں بتاتا۔ یوں آج کا فنکار قاری میں صرف بے بسی کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ اس سارے تخلیقی عمل میں علامت ایک پل کا کام دیتی ہے۔ اگر علامت رابطے کا کام نہ دے سکے تو کہانی رائگاں جاتی ہے۔ اور افسانہ نگار خود اپنے پیدا کردہ ابہام کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جب قاری کو علامتی افسانے سے ابلاغ کے نہ ہونے کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ اس اختلافی مسئلے پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ اس لئے میں اس میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ علامتی افسانہ نگار کو خیالی علامتیں برتنے کی بجائے زمینی علامتیں استعمال کرنی چاہئیں۔ تاکہ قاری اور فنکار کا رشتہ برقرار رہے اور آج کا فنکار اگر مفہوم کو قاری کے ذہن میں نہ بٹھا سکے تو کم از کم احساس تو منتقل کر دے۔ رخسانہ صولت نے علامتی افسانہ نگار ہونے کے باوجود اس بات کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ ایسا کر بھی دکھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سترہ افسانوں کا احساس قاری کے ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے۔ رشید امجد نے گیلے حرف کے دیباچے میں تحریر کیا ہے کہ "سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد سے جن افسانہ نگاروں نے اپنی پہچان کرائی ہے ان میں رخسانہ صولت شامل ہیں" اس حساب سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ رخسانہ صولت پچھلے بیس برس سے لکھ رہی ہیں۔ میرے خیال میں سنہ کی غلطی دیباچہ نگار سے ہوئی ہے۔ اس لئے کہ وہ بھی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ اور ہر چیز کا حساب رکھنا ڈاکٹر وزیر آغا کے ادبی مزاج کو زیب دیتا ہے۔ میں رخسانہ صولت کی عمر کا اندازہ لگاتے ہوئے دس سال کا مزید اضافہ کرتا ہوں۔ گویا ترمیمی مردم شماری کے حساب سے سنہ ۱۹۷۰ء کے بعد سے جن افسانہ نگاروں نے اپنی پہچان کرائی ہے۔ ان میں رخسانہ صولت کا نام خاصا اہم ہے ترقی پسندی اور رجعت پسندی قوتوں کے خلاف جنگ کرنے کے حوالے سے سنہ ۱۹۷۰ء کا سال خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ رخسانہ صولت نے اپنی پہچان کرا دی ہے

گیلے حرف کے تین فلیپوں اور ایک دیباچے کو دیکھ کر مجھے بڑی
مایوسی ہوئی کہ ان میں سے کوئی تحریر بھی ڈاکٹر وزیر آغا کی نہیں
ہے۔ اور افسوس یہ ہے کہ رخسانہ صولت غلام الثقلین نقوی
جیسے صف اول کے افسانہ نگاروں کی صف میں نہیں آئیں۔
ورنہ انور سدید کو ہر جگہ نہ صرف اس کی تائید کرنا پڑتی بلکہ محکمۃ
الآرا رائے کو DEFEND بھی کرنا پڑتا کہ برصغیر میں ولیش
اس روایت کے حامل رہے ہیں۔ اس بات سے البتہ مجھے یقین
ہو گیا ہے کہ رخسانہ صولت واقعی افسانہ نگار ہیں۔ کہ میں نے
بیساکھیوں کا سہارا نہیں لیا۔ البتہ اسے انور سدید جیسے سچے اور
کھرے نقاد سے ڈرتے رہنا چاہئے۔ کہ وہ کسی وقت بھی حملہ
آور ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اب تو ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب
بھی ان سے ڈرنے لگے ہیں۔ (حوالے کے لئے دیکھئے غالب کا
خط، ص ۱۰، تخلیق شمارہ ۱-۲، جلد نمبر ۱) بات انور سدید کی
افسانہ نگاروں کی فہرست کی طرح پھیل گئی۔ اور مجھے خیال بھی
نہ رہا کہ سامعین کا وقت بہت قیمتی ہے۔ ہاں تو بات رخسانہ
صولت کے افسانوں کی تھی۔ گیلے حرف کے افسانے دو خانوں میں
بٹے ہوئے ہیں۔ زندگی کے خلاف تو کہانیاں ہیں۔ اور زندگی
کے آٹھ کہانیاں۔ زندگی کے خلاف کہانیاں یاسیت کا پرتو
لئے ہوئے ہیں۔ اور زندگی کے لئے کہانیوں میں خوشگواریت
کا احساس ہے۔ ایک میں منفی اور ایک میں کمی اس بات کو
ظاہر کرتی ہے کہ افسانہ نگار کا رویہ زندگی کے خلاف زیادہ شدید
ہے۔ ان کہانیوں کے تجزیاتی مطالعے سے جو نتائج برآمد ہوتے
ہیں اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔

گیلے حرف ـــــ آشوب ذات کی تنہائی
اور محرومی کے حوالے سے اجتماعی کرب کا نوحہ ہے۔

نہ میں نہ تو پھر کون ـــــ بوٹیوں میں بٹی ہوئی
ذات کے پس منظر میں انسان کی آپس میں نفرتوں پر بھرپور
طنز ہے۔

نور کا طور ـــــ معاشرے اور سوسائٹی
کے منافقانہ رویتے کے خلاف بھرپور احتجاج ہے۔

آدھی رات کی دھوپ ـــــ خیر و شر کی تفریق
کا بے باکانہ اظہار ہے۔

ننگی ـــــ سماجی ناانصافی پر گہرا طنز ہے

آگ مٹی اور پانی ـــــ انسانی اقدار کے مٹ
جانے کا ماتم ہے۔ دھرتی کے اناج پیدا کرنے کی بجائے گولہ بارود
اگانے کے المیہ کا اظہار ہے۔

آج کا نوحہ ـــــ عنوان کے حوالے سے ہی
انسان کی اپنی ذات سے دشمنی کا بیان ہے کہ آدمی کا شیطان
آدمی ہے۔

درد کا ازلی سمندر ـــــ آج کے ادیب
کی بے قدری کا نوحہ ہے۔ وہ جس طرح ناقدری زمانہ کا شکار
ہے اور جس طرح احساس کی صلیب پر لٹکا ہوا ہے۔ اس کا
موضوع ہے۔

دم کٹا انسان ـــــ رنگ و نسل کے امتیاز،
چھوٹے بڑے ملکوں کے پس منظر میں استحصالی قوتوں کے
ہتھکنڈے۔ افریقی عوام کی بیداری کی کہانی ہے۔

کالے سورج کی موت ـــــ جاگیردارانہ
نظام کے خلاف عزم و عمل کی بشارت ہے۔

لفظوں کی موت ـــــ حالات کے دھاروں
پر اپنے آپ کو بہانے والوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

موت کا سفر ـــــ مشرق پر مغرب کا تسلط
مشرقی بیداری گویا تیسری دنیا کی بیداری کی داستان ہے۔

نئی دنیا کی موت ـــــ ظلم و جبر کے خلاف
احتجاج اور انسانوں کی بے بسی کا نوحہ ہے۔

پرایا کفن ـــــ اپنی ذات پر بھروسہ
کرنے اور دوسروں کی مدد اور آسرے پر زندہ رہنے

والوں کے لئے عبرت کا ایک مرقع ہے۔

نیلی سٹرک اور جنازہ ——— دنیا سے کٹ جانے اور الگ رہنے کے شاخسانے پہ اس کی بنیاد ہے

زندہ لوگوں کا قبرستان ——— جبر، مجبوری ناانصافی کی داستان الم ہے۔

چہرہ برف پھول آنکھیں ——— اصولوں کے لئے جنگ پہ آمادگی اور اپنے حقوق چھیننے کے لائحہ عمل کی نشاندہی ہے۔

ان تمام کہانیوں کو رخسانہ صولت نے علامت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس نے ایسی علامتیں برتی ہیں جو قاری سے ابلاغ کا رابطہ استوار رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس کی زندگی کے خلاف کہانیاں ہوں یا زندگی کے لئے کہانیاں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اور اس طرح اس کی علامتیں رائیگاں نہیں جاتیں۔ اور نہ ہی علامتوں کی شامت آتی ہے کہ قاری بھول بھلیوں میں پھنسا رہے۔ یا قدرت اللہ شہاب کے کہنے کے مطابق، کراس ورڈز پزل حل کرتا رہے۔ رخسانہ صولت نے اپنی ان کہانیوں میں بڑے ہی اہم مگر نازک موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اس نے جس فکری لبرلی اور سوچ کی دیانت داری سے یہ تانا بانا بنا ہے۔ اس کی بنا پر اس نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے یا محسوس کیا ہے یا اس پر بیتا ہے اسے اسی طرح قارئین کو لوٹا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانی، داستانی اور طلسماتی نہیں۔ بلکہ ہماری دنیا کی جیتی جاگتی کہانیاں لگتی ہیں۔ اس لئے بھی کہ اس نے لگے لپٹے رہنے کا انداز اختیار نہیں کیا۔ کہانیوں کے موضوعات سے ہی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ترقی پسند افسانہ نگار ہے۔ ترقی پسند کی اصطلاح خاصی گھسی پٹی سی ہے۔ بلکہ آج کل تو اچھے معنوں میں بھی استعمال نہیں ہوتی۔ مگر میں ترقی پسند کہنے کے بعد یہ مراد لیتا ہوں کہ فن کار نے منافقتوں۔ بے انصافیوں جبر، تشدد، ظلم، چھوٹے بڑے کا فرق، رنگ و نسل کا امتیاز، ایسی منفی قدروں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ان کے خلاف نہ صرف احتجاج کیا ہے بلکہ قلمی جہاد بھی کیا ہے۔ چنانچہ ان کہانیوں میں رخسانہ صولت نے زندگی اور اس سے پیدا شدہ منفی اقدار کے خلاف زبردست جنگ لڑی ہے۔ آج کے فنکار کی طرح اس نے ان تمام منفی اقدار کا احساس قاری کو منتقل کر دیا ہے۔ سچ اور جھوٹ کا فرق بتا دیا ہے۔ خیر و شر کی تمیز واضح کر دی ہے۔ اصولوں کی اس جنگ میں رخسانہ صولت نے کسی مقام پر بھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اور نہ ہی ادیب اور فنکار کے فرض اور منصب سے غداری کی ہے۔ اس نے بڑے بے باکانہ انداز میں معاشرے کی منافقانہ پہلوؤں پر تنقید کی ہے۔ گہرا طنز کیا ہے۔ ماحول کی زہرناکیوں اور معاشرے کی ناہمواریوں کا سر بازار بھانڈا پھوڑا ہے کہیں کہیں اس کے تیور بہت تیکھے ہیں۔ اور کہیں لہجہ باغیانہ ہے۔ لیکن وہ نہ تو کہیں جھنجھلائی ہے اور نہ اس میں بیزاری کا احساس پیدا ہوا ہے۔ بلکہ اس نے بڑی فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ تیشہ چلایا ہے۔ اور مجسمہ تراشا ہے۔ اس کے تراشیدہ پیکر ہماری آپ بیتیاں ہیں۔ ہماری کہانیاں ہیں۔ ہم ہی ان کے کردار ہیں۔ ہم ہی ان کے ہیرو ہیں۔ یہ واقعات ہمارے ہیں۔ یہ داستانیں ہماری ہیں۔ یہ قصے ہمارے ہیں۔ یہ المیے ہمارے ہیں۔ یہ کرب ناکیاں ہماری پیدا کردہ ہیں۔ یہ زہرناکیاں ہماری پھیلائی ہوئی ہیں یہ یہ ناگ ہم نے چھوڑ رکھے ہیں۔ یہ دیواریں ہم نے کھڑی کی ہیں۔ ہم سب ان باتوں کے ذمہ دار ہیں کہ ہم نے اس کائنات کو دوزخ بنا دیا ہے۔ ہمیں ان سب کے خلاف احتجاج کرنا پڑیگا جہاد کرنا پڑے گا، انقلاب لانا پڑے گا۔ جنگ کرنی پڑے گی اور یہ سب کچھ ہماری اپنی ذات کے خلاف ہوگا۔ ہمیں خود اپنے آپ سے احتجاج کرنا ہوگا۔ اپنی ذات سے جنگ کرنا ہوگی۔ یہ تمام وہ باتیں ہیں جو رخسانہ صولت کی کہانیوں کا

موضوع ہیں۔ انسان کی اپنے ہاتھوں ۔ بے بسی کا نوحہ ہیں۔ جنھیں اپنی ذات کے حوالے سے "گیلے حرف" میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ ویسے تو رخسانہ صولت نے بڑی خوب صورت علامتیں برتی ہیں۔ مگر ایک علامت جو بہت زیادہ استعمال ہوئی ہے وہ ہے "موت" گیلے حرف کی بیشتر کہانیوں میں یہ موجود ہے۔ موت دراصل ایک نظام کے خاتمے اور دوسرے نظام کی آمد کی بشارت ہے۔ اس تناظر میں کالے سورج کی موت، نغمہ کی موت، موت کا سفر، نئی دنیا کی موت، پرایا کفن، نیلی سڑک اور جنازہ، زندہ لوگوں کا قبرستان ——— ظلم کے خلاف احتجاج، جبر و تشدد کے خلاف آواز اٹھانے، جاگیرداری نظام کو ختم کرنے، تیسری دنیا کے قیام، اصولوں کے لئے جنگ، اپنی دنیا آپ پیدا کرنے اور اس طرح کے دوسرے موضوعات کی بشارتیں ہیں۔ ایک اور اہم بات جو رخسانہ صولت کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہے وہ ہے عورت کی نفسیات۔ چونکہ رخسانہ صولت بھی اس صنف سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے عورت کی کردار نگاری میں اس نے مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اور عورت کے جذبات کی صحیح معنوں میں ترجمانی کی ہے۔ کہانیوں کی کرافٹنگ میں بھی اس نے کمال دکھایا ہے۔ اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کہانیاں طویل نہیں بلکہ مختصر ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اس میں اثریت زیادہ ہے۔ افسانوں کی زبان بڑی خوب صورت ہے۔ بعض جملے غزلوں کے حسین و جمیل مصرعے لگتے ہیں۔ اس اعتبار سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ رخسانہ صولت کے افسانوں کی زبان اکتسابی نہیں بلکہ تخلیقی ہے۔ اور اس کے ہاں لفظ گونگے اور بہرے نہیں بلکہ بولتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی علامتیں مردہ نہیں بلکہ ہمارے عہد کا زندہ استعارہ ہیں۔ اور یوں ننگے مقبرے کے سنگ ریزے آسودگی کے صدف کے ساتھ مل کر گیلے حرف تشکیل دیتے ہیں۔ خدا کرے کہ رخسانہ صولت لفظوں کا یہ عمل عام جاری رکھیں۔ تاکہ ان کے حوالے سے ہی سہی صبح صادق کا نور تاریکیوں کو نگل لے۔ اور آج کے عہد کا انسان اپنی ذات کے خول سے نکل آئے۔ اور اپنی ذات کا عرفان حاصل کر سکے اس طرح گیلے حرف کے افسانے آج کے انسان کے لئے چیلنج کا اعلان نامہ ہیں۔ اور رجعت پسند قوتوں کے لئے عبرت نامہ ●

-٥-

ڈاکٹر عبدالمنان

ڈاکٹر وہاب اشرفی

تنقید کے آئینہ میں

آزادی کے بعد اردو تنقید نگاری نے تیز گامی اختیار کی ہے۔ اور اس کے معیار و مقام کے تعین کی خاطر بڑی سنجیدگی کے ساتھ ناقدین فن نے توجہ مبذول کی ہے۔ اس سے قبل اردو تنقید نگاری کے خزانے میں توصیفی کلمات اور چند محاکمہ جاتی سکے موجود تھے۔ جو باعتبار فکر و فن قیمتی شے کے مترادف ضرور تھے۔ لیکن بیش بہا نہیں۔ آزادی کے بعد تنقید کے مختلف دروازے کھلے۔ اور مختلف انداز سے ناقدین فن نے وسعت و جامعیت کے نئے امکانات پیدا کئے۔ تاریخی، سماجی اور خارجی زندگی سے ذرا آگے قدم بڑھا کر داخلیت کی جو، غواصی کی اور جمالیات کی موتی نکالے۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ تنقیدی روش پر گامزن ہونے والے ناقدوں نے حقیقت حال سے چشم پوشی کرنا مذہب تنقید میں گناہ سمجھا ہے۔ اور ادب کے پرکھنے کے چند قابل قدر اصول وضع کئے ہیں۔ یوں تو نئے ناموں کی ایک لمبی فہرست ہے جو تنقید نگاری کے صف میں اپنی متاع فکر لئے کھڑے ہیں۔ لیکن بعض ایسے ناقدین ہیں۔ جن کا قد یقیناً اونچا ہے۔ اور ان کی خدمات نقد اردو ادب کے گرانقدر سرمائے ہیں۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی کا شمار انہیں ناقدوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے شعور و فکر کا ایک گہرا مربوط اور مستحکم نقش چھوڑا ہے۔ اور اپنی علمی و تنقیدی صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ بھی کیا ہے

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا افسانے سے کی۔ چند افسانے لکھے جو "صنم" اور ہندوستان کے مختلف جریدوں میں شائع ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شباب کی بیل جذبات کے سہارے اوپر چڑھ رہی تھی۔ اور طبیعت میں رومان کا حسین رنگ محل آباد تھا۔ ایسے عالم میں دنیا بڑی حسین معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے گلستاں میں خزاں کی توقع نہیں کی جاتی ہے۔ آرزوؤں اور تمناؤں کے صحن میں باد سموم کا جھونکا نہیں آتا۔ اور اگر آتا بھی ہے تو احساس کے بہار اسے فنا کر دیتی ہے۔ انہوں نے ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز سرزمین کلکتہ میں کیا۔ لیکن اسے بہار میں جلا بخشی کہ بغرض ملازمت بہار جانا پڑا۔ اور چند برس پٹنہ میں گزارنے کے بعد اپنے شفیق استاذ ڈاکٹر اختر قادری کی نگرانی میں اردو میں ایم اے پاس کیا۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں مکمل طور پر تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہوئے۔ "صنم" کے اجرا کے زمانہ میں ادب کی مختلف اصناف کا گہرا مطالعہ بھی کرنا پڑا۔ اور عصری ادب پر بغائر توجہ مبذول بھی کرنا پڑی۔ نیز ان ارباب قلم کی نگارشات کا مطالعہ کرنا پڑا۔ جو بغرض اشاعت صنم میں آتیں۔ اور موصوف کے مطالعہ سے گزرتیں۔ فنی، بصیرت، طبعی مناسبت، اور فکری جودت نے انہیں ایک

اچھے مدیر بننے پر ہمیشہ دست گیری کی۔ بالآخر ان کا یہ ایمان ہوگیا۔ کہ بہتر ادب وہی ہے جو زندگی سے غذا حاصل کرتا ہو۔ اور محض اخلاقی نظام کی تعمیر اور اشتراکی نظریات کی تشہیر سے ماوراء ہو۔ میرے کہنے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ادب میں اشتراکی نظریے کا اظہار یا اخلاقی قدروں کا بیان خذف ریزے کے مترادف ہے۔ بلکہ اس میں ہر نظریۂ حیات کی گنجائش ہے شرط یہ ہے کہ ادب میں جذبے سے وفاداری کا لحاظ رکھا جائے اور ایسی سچائی ہو جو زندگی کا عرفان دینے والی ہو ؎

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

یہ وہ زمانہ تھا جب اشرفی ادب کے ریگستان میں طویل سفر کا آغاز کر رہے تھے۔ بڑے جوش و ولولے تھے۔ بڑی توانائی تھی۔ ذوق مطالعہ اور فن پر کلی نظر نے انھیں آگے بڑھنے پر مجبور کیا تھا۔ ہر چند احباب اور معاصرین کی کم نگہی اور رشک و رقابت نے راہ میں روڑے بچھانے کی کوشش کی لیکن حوصلہ اتنا جوان تھا کہ موصوف ویرانے میں بھی پھول کھلاتے چلے گئے۔ اور ایک وقت ایسا آیا جب ان کی حیثیت مسلم و مستحکم ہوگئی۔ یہاں تک کہ بہار کے صف اول کے ناقدوں میں شمار ہوتے ہیں۔

موصوف نے اپنی علمی و ادبی زندگی کو پٹنہ کے ادبی ماحول میں پروان چڑھایا۔ بہار یونیورسٹی (مظفر پور) سے تحقیقی سند حاصل کرنے کے بعد مگدھ یونیورسٹی شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے۔ اور تقریباً پانچ سال کی مدت میں تصنیف و تالیف کی رفتار تیز کی۔ اس زمانہ میں متعدد تنقیدی، تحقیقی مقالے سپرد قلم کیے۔ اور کل ہند سیمینار میں شریک ہوتے رہے۔ علاوہ ازیں اپنا تحقیقی مقالہ "شاد عظیم آبادی کی نثر نگاری" شائع کیا۔ جو مقبول خاص و عام ہوا۔ "کہانی کے روپ" "قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ" اور دیگر کتابیں اسی زمانے کی یادگار

ہیں۔ چونکہ تخلیق کا امڈتا ہوا دریا سکوت و جمود اور قناعت و استغنا کے ساحل پر ہمیشہ ضربیں لگا رہا تھا۔ اور طبیعت کسی ایک منزل پر ہمیشہ کے لئے رک جانا نہیں چاہتی تھی اس لئے انھوں نے ہمیشہ قدم آگے بڑھانے کی خاطر راہیں ہموار کیں۔ اپنی جودت طبع، اولوالعزمی، بلند حوصلگی، علمی بصیرت، اور فنی کمالات سے میں نے موصوف کے چند اوراق زندگی کو محض اس مقصد کے تحت الٹنا چاہا کہ ان کی شخصیت کے چند نقوش سامنے آجائیں۔ تاکہ ان کی خدمات کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اسلوب شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور خالق کا مزاج و افتاد، نظریہ و خیال، اور مشاہدہ و تجربہ اس کے آئینہ تخلیق میں منعکس ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ڈاکٹر وہاب اشرفی پر صادق آتی ہے۔ یوں تو موصوف کی شخصیت کی تعمیر میں مذکورہ باتوں کے علاوہ دیگر عوامل بھی معاون ثابت ہوئے ہیں۔ جن کا اظہار طوالت کے خوف سے نہیں کرنا چاہتا۔ تاہم سنجیدہ مزاجی اور عزم راسخ ایسی پونجیاں ہیں۔ جو ان کے تخلیقی خزانے میں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ اور شخصیت کی تشکیل میں معاونت کی ہے۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی کی تنقیدی حیثیت کے تعین سے پہلے اس بات کی جانب توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ موصوف کے دور سے قبل تا حال اردو تنقید کی صورت حال کیا رہی ہے۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ حالی نے اردو تنقید کی باقاعدہ ابتدا کی۔ اور "مقدمہ شعر و شاعری" کو پہلے صحیفہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔ جس میں شاعری کے حسن و قبح اور اصول و نقد پر بحث کی گئی۔ لیکن شاعری کو اخلاق کا نائب مناب یا تمام معلم کہتے تھے۔ اس عہد میں حالی کے غالب اثرات کے نتیجے میں ادب کی اپنی مخصوص بصیرت، اس کی مخصوص آگہی اور خود نقاد مقصدیت پر زور دینے والے بھی بعض اوقات ال

اساسی عوامل کو نظر انداز کرنے لگے ۔ جو ادب کے لئے ناگزیر ہیں۔ لیکن چونکہ حالی کی نیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور ان کی کاوش سے منحرف نہیں ہوا جاسکتا ۔ اس لئے ان کے بارے میں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ انھوں نے اردو تنقید کے دروازے کھول دیئے ۔ اور آنے والی نسلوں کو دعوت فکر دی۔ نتیجہ کے طور پر ایک قافلہ رواں دواں ہوا۔ جنھوں نے مختلف رجحانات سے روشناس کیا۔ حالی سے لے کر موجودہ دور کے ناقدوں تک بقدر استطاعت مغربی ادبیات سے استفادہ کیا۔ اور اپنی فنی فکری صلاحیت کو جلا بخشی ۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی بھی مغربی ادبیات سے استفادہ کے قائل ہیں ۔ کہ مغرب یا ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین ادب کا وسیع مطالعہ ہی دراصل کسی نقاد کی نگارشات کو وقیع بنا سکتا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں:

> "میں ادب میں آفاقیت کا قائل ہوں ۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین ادب کا وسیع مطالعہ ہی کسی نقاد کی نگارشات کو وقیع بنا سکتا ہے ۔ ورنہ مقامی روایات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پسماندہ ادب اسے ہمیشہ عظیم نظر آئے گا ۔ . . . . ایسی صورت میں مغربی شعر و ادب اور تنقید کی طرف بار بار مڑ کر دیکھنا ضروری ہے"

دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے بہترین ادب کے گہرے مطالعہ کے نتیجے میں کسی نقاد کی نگارشات وقیع و بلیغ ہو سکتی ہیں ۔ اور ایسے ادب میں آفاقیت جذب ہوتی ہے ۔ ایسی صورت میں مغربی شعر و ادب سے استفادہ نہ مغرب زدگی ہے اور نہ فیشن پرستی ۔ ہاں محض مغرب کی دلدادگی اور مشرقی ادبیات سے چشم پوشی ، ایک قسم کی تعصب پرستی اور مغربی ادبیات کو کم مایہ سمجھنے کی بے جا کوشش ہے ۔ اگر موصوف کی نگارشات کا مطالعہ کیا جائے ۔ تو حقیقت عیاں ہوگی کہ انھوں نے مشرقی علوم و فنون کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ اور مغرب سے اکتساب کرنے میں بھی فیاضی برتی ہے ۔ اور بقدر ضرورت دونوں گلستاں کی خوشہ چینی کی ہے ۔ جس سے ان کے افکار و نظریات کا دامن وقیع ہو گیا ہے ۔ ان کی کل متاع نقد کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان کی تخلیقات میں مشرقیت و مغربیت کا حسین امتزاج ہے ان کے محاسبے اور محاکمے کا انفرادی پیمانہ ہے ۔ جس میں مغربی و مشرقی تنقید سے استفادہ کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں ۔ مثال کے طور پر وہاب اشرفی کی ایک نئی کتاب "معنی کی تلاش" کو پیش کیا جا سکتا ہے ۔ جس میں نثری نظم ، افسانے کا منصب کنکریٹ شاعری ، اقبال کی شاعری کا علامتی پہلو ، شعر غیر شعر اور نثر ، جمیل مظہری وغیرہ ایسے موضوعات ہیں ۔ جس میں مغرب و مشرق کے سنگم کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے "افسانے کا منصب" میں چند فرانسیسی اور انگریزی کے مفکرین کی مثالوں کے ذریعہ اردو افسانے کے منصب اور غایت پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ موصوف کی نظر میں افسانہ ہیرا کی مانند ہے ۔ اور ہیرا اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے پہاڑ سے زیادہ اہم ہوتا ہے ۔ اگرچہ پہاڑ کی بھی اپنی افادیت ہوتی ہے لیکن اس کی چٹانیں ہیرے کے مترادف نہیں قرار دی جا سکتیں ان کا خیال ہے کہ افسانہ اپنے کینوس میں زندگی کے کسی ایک گوشہ کی کل کائنات چھپائے رکھتا ہے ۔ یہ دراصل دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی صنف ہے ۔ جو یقیناً دقت طلب ہے اور اس راہ پُر خطر سے سلامت روی کے ساتھ گزرنا ایک مشکل فعل ہے ۔ کبھی کبھی اس راہ دشوار کو عبور کرنے میں فن کے باگ ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے ۔ لیکن ایک کامیاب افسانہ نگار ہر گام پر فن اور فکر کے حسین امتزاج کا لحاظ رکھتا ہے

اردو میں نثری نظم لفظ ابھی ۔ ابھی معروضیت سے آگے نہیں بڑھی ہے ۔ لیکن مختصر سے عرصے میں خاصی ترقی کا

ثبوت دیا ہے۔ چند ادبی جریدوں اور رسالوں میں نثری نظم کے امکانات پر مختلف زاویوں سے بحث ہوئی ہے۔ چند نا قدوں نے اس کے مستقبل اور مستقل حیثیت کا اعتراف کیا ہے۔ اور چند نے اس کے وجود کو مہمل قرار دیا ہے۔ نثری نظم مغرب میں کوئی نئی صنف نہیں۔ اس کی سالمیت اور وجود کی تاریخ ڈیڑھ سو برس پر محیط ہے۔ اور چند ایسے قابل قدر شعرا پیدا ہوئے ہیں۔ جن کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً الوسیس برٹرینڈ نے ۱۸۴۲ء میں نثری نظم لکھی۔ فرانسیسی شاعر عینی لوتن اور مان تسقی نے نثری نظم کی تخلیق کی۔ بوڈلیئر اور رین بو کی شاعرانہ حیثیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان بزرگوں نے کامیاب نثری نظمیں لکھیں۔ بوڈلیئر کی شہرت کا راز PETITS POEM IN PROSE ہے۔ اور رین بو کی عظمت ILLUMINATIONS کی وجہ سے ہے۔ نثری نظم کے خالقوں میں ایک نام ملارمے کا بھی ہے۔ جن کی نظموں کو آج تک فرانسیسی نقادوں نے سوائے نثری نظم کے اور کوئی دوسری چیز نہیں سمجھا۔ ڈاکٹر اشرفی نے مغرب کے مذکورہ شعرا کا بطور خاص حوالہ دیکر نثری نظم کی روایت کا اعتراف کیا ہے۔ اور اردو میں اس صنف کے وجود کو ہر ممکن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو اس کا سن صغیر مغرب کی اس روایت کے شباب تک رسائی حاصل نہیں کرتا۔ لیکن گمان اغلب ہے کہ اگر شعرا نے بطور خاص توجہ مبذول کی اور اس صنف کے بھی خاطر خواہ تجربے ہوئے تو اس کی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکے گا۔ ڈاکٹر اشرفی نے اس امر کی طرف بڑی خوب صورتی سے توجہ مبذول کی، وہ فرماتے ہیں:

> "میرا ذاتی خیال ہے کہ نثری نظم کو شاعری کے زمرے میں شامل کرنا غلطی ہوگی۔ مگر اس کے امکانات کا جائزہ لئے بغیر یا یوں کہہ لیجیے کہ اسے پرکھے بغیر ترک کر دینا یا اس کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا بھی مستحسن نہ ہوگا اگر انشائے لطیف کے نام سے کئے گئے تجربات کسی نہ کسی وجہ سے ناکام ہو چکے ہیں۔ تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہاں کا انصاف ہوگا کہ نثری نظم کا تجربہ بھی لازمی طور پر ناکام ہو جائے گا"
>
> (نثری نظم ایک تجزیہ، وزیر آغا)

ڈاکٹر اشرفی نے صرف مذکورہ اقتباس کے ایک جملہ پر اپنے نظریہ کی اساس قائم کی ہے کہ ——— "میرا ذاتی خیال ہے کہ نثری نظم کو شاعری کے زمرے میں شامل کرنا غلطی ہوگی" اگر اشرفی صاحب اس کے بعد کے جملوں پر توجہ مبذول کرتے تو اندازہ ہوتا کہ وزیر آغا نے نثری نظم کی گردن زدنی نہیں کی ہے۔ بلکہ اردو میں اس کے امکانات پر توجہ صرف کی ہے۔ اردو میں جس صنف کا سکہ جاری ہوتا ہے اور اس کی جڑیں ادبی تاریخ کی آب و گل میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس پر ایمان لانا اور اس کے ہر پہلو پر نظر رکھنا اور معیار و مقام کا اعتراف کرنا، فرض منصبی سمجھا جاتا ہے۔ اور نئے تجرباتی امکانات پر سنجیدگی سے غور کرنا اور ان کی تاریخ بنانا، قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ احساس کمتری ہے یا ہماری تساہلی کہ ہم حدود حصار کو توڑ کر باہر نکلنا اور نئی فکری و فنی دنیا سے ہم آہنگ ہونا ادبی شعار تصور نہیں کرتے۔ اگر یہی عمل اردو ادب کے دربار سے جڑا رہا تو اغلب ہے کہ تو اس کے تمام ستون کمزور ہو جائیں گے۔ اور اس کی سلطنت ناتواں ہو جائے گی۔ نثری نظم کے مستقبل اور اس کی مستقل حیثیت پر بھرپور مقالہ اب تک سپرد قلم نہیں کیا جا سکا ہے۔ چند مختصر ترین مقالے ملتے ہیں۔ جو اس صنف پر مختصر ترین روشنی ڈالتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ موصوف وزیر آغا کے ایک جملہ سے الگ ہٹ کر نثری نظم کے فن اور ارتقا کی صورت حال پر مکمل و مفصل روشنی ڈالتے۔

"علامہ جمیل مظہری کا تخلیقی رویہ" ایک قابل قدر مضمون ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ بڑے شاعر یا اچھے شاعر کی پہچان کیا ہے؟ اور وہ اس ضمن میں اپنے موقف کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"میں نہیں کہتا کہ روایت پر نگاہ رکھنے والا شاعر
اچھا شاعر یا بڑا شاعر نہیں ہوتا یا نہیں ہو سکتا
روایت پر نگاہ رکھنی اور روایت کے تتبع میں
بڑا فرق ہے روایت راستہ دکھا سکتی ہے لیکن
وہ منزل نہیں بن سکتی یہی وجہ ہے کہ بڑا شاعر
یا اچھا شاعر روایت سے روشنی تو لیتا ہے لیکن
اس میں ضم نہیں ہوتا بلکہ اس کی توسیع کر دیتا
ہے اور اس کے حدود بڑھا دیتا ہے"

بلاشبہ بڑا شاعر تخلیقی عمل سے گذر کر اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑتا ہے جس میں اس کے انفرادی جذبات، تجربات اور مشاہدات منعکس نظر آتے ہیں۔ یہاں اس کی نظر فن پر بھی ہوتی ہے، اور فکر پر بھی۔ گویا تخلیقی عمل کی مشین میں فن و فکر اس طرح حلول ہو جاتے ہیں۔ کہ ایک نئی شئے پیدا ہو جاتی ہے جو خالق کی شخصیت کی پہچان بھی ہوتی ہے۔ اور اس کی انفرادیت کی علامت بھی۔ رہی روایت کی بات تو یہ امر مسلمہ ہے کہ روایت پر نگاہ مرکوز ہونی چاہیے۔ لیکن اس میں ضم نہیں ہونا چاہیے بڑا شاعر نہ صرف روایت سے روشنی حاصل کرتا ہے بلکہ نئی روایت کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ وہ لکیر کا فقیر نہیں ہوتا۔ وہ اسلاف کے کارناموں کا احترام کر سکتا ہے۔ اور ان کی صحت مند قدروں کا اعتراف بھی۔ لیکن وہ اسی دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتا ہے۔ بڑا فنکار اپنے وقت کی روایت کا پروردہ ہی نہیں پروردگار بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایک کُن سے اپنی دنیا کی تخلیق نہیں کرتا بلکہ مدتوں فن کی بھٹی میں تپ کر کندن بنتا ہے۔ اور ایک جہان تازہ کی تخلیق کرتا ہے۔ علامہ جمیل مظہری کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کی دنیا وسیع کی۔ اپنے مخصوص افکار و نظریات سے اس کے نگارخانے سجائے ڈاکٹر اشرفی نے علامہ جمیل مظہری کے فلسفیانہ خیالات کی گہرائیوں میں اترنے کے بجائے ان کی شاعرانہ قدرت پر غائر نظر ڈالی ہے وہ فرماتے ہیں؛

"مجھے اس کی فکر نہیں کہ جمیل مظہری کی غزلوں
میں تغزل کی کیا کیفیت ہے؟ یا ان کی نظموں
میں کونسا نظام زندگی منظوم ہوا ہے مجھے
اس کی تلاش نہیں کہ ان کے خیالات کتنے ارفع
و اعلیٰ ہیں۔ مجھے اس کی بھی غرض نہیں کہ ہماری
مستحسن قدریں کس حد تک ان کی شاعری کا
حصہ نہیں ہیں۔ یا زندگی کے کیسے کیسے اقدار و
معیار ان کی فکر رسا کا ساتھ دے سکے ہیں
مجھے ان کی تخلیقی رویے سے بحث ہے"

انہوں نے جمیل مظہری کے شاعرانہ محاسن کی پہنائیوں میں اترنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان تمام فنی لوازمات پر نظر ڈالی ہے۔ جو جمیل مظہری کی شاعری کو عظیم اور بلند بناتے ہیں۔ اس ضمن میں جمیل کے استعاراتی نظام، پیکر تراشی اور الفاظ کے تخلیقی استعمال پر بحث کی گئی ہے۔ اور ان اشعار کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ جو جمیل مظہری کی فنکارانہ بصیرت کے واضح نمونے ہیں۔ ناقد کو شاعر کے موقف اور فنی رنگ و آہنگ دونوں پر غائر نظر رکھنی چاہئے۔ کبھی کبھی نظریہ فن پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ شعریت مجروح ہو جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی فن کی تیز آنچ اس حد تک تیز ہو جاتی ہے کہ نظریہ پگھل کر اپنا وجود کھو دیتا ہے ناقد کا فرض یہ ہے کہ وہ ان دونوں صورتوں کو واضح کرے۔ وہاب اشرفی صاحب نے علامہ جمیل مظہری کے تخلیقی رویئے سے متعلق بڑے منصفانہ انداز سے اپنا نگاہ نقد ڈالی ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت کا اظہار کیا ہے۔ انھوں اس بات کا

اعتراف ہے کہ علامہ نے عمیق اور گہرے فلسفیانہ خیالات کی وضاحت کے باوجود فن کے دامن کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔

ڈاکٹر اشرفی نے مغربی جرمنی کے ایک ناول نگار ہائنریخ بوئل کی ناول نگاری پر بحث کی ہے۔ بوئل جرمن کے ایک مشہور شہر کالن Colodge میں پیدا ہوا خاندان بے انتہا غریب تھا۔ اس لئے اس نے ابتدائی زندگی بڑی عسرت میں گذاری۔ اور جب ہوش سنبھالا تو کتابوں کی تجارت کرنے لگا۔ اس نے ابتدائی زندگی جہاں گذاری وہاں متحدہ افواج کا قبضہ تھا۔ جب جوان ہوا تو فوج میں داخل ہونا پڑا۔ اور چار بار جنگ میں زخمی ہوا۔ اس نے نہ صرف جنگی حالات سے نہ واقفیت حاصل کی بلکہ جنگ کی سنگینی اس کے خوفناک حالات اور دور رس نتائج سے بھی آشنا ہوا۔ اسے یہ احساس تھا کہ سپاہی کی زندگی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں خوشیوں کے چند لمحات شبنمی قطروں کی طرح ہوتے ہیں۔ جنسی بھوک اس کے لئے کتنی ہیجان انگیز ہوتی ہے۔ بوئل کے یہ مشاہدات اس کی کہانیوں میں اس حد تک ثبت ہو چکے ہیں کہ فوجی زندگی سے الگ ہٹ کر بوئل کی کہانیوں کا مطالعہ بے سود ہوگا۔ انھوں نے چند افسانے بھی لکھے اور ناول بھی۔ بعض افسانے بے حد کامیاب ہوئے۔ اور بعض ناولوں کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی لیکن ان کی مقبولیت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ انہوں نے جنگ کی ہولناکیوں اور زندگی پر اس کے شدید رد عمل کو اپنا موضوع خاص بنایا۔ اور اس میں حتی الوسع فن کی چاشنی پیوست کرنے کی کوشش کی۔ بوئل کی فنی روش خارجی و داخلی ادغام سے تشکیل پائی۔ ان کے کردار میں زندگی کی سچائیاں اور حقیقتیں اس قدر مدغم ہیں کہ وہ صفحۂ قرطاس پر جیتے جاگتے فرد کی صورت میں متحرک نظر آتے ہیں۔ انھیں کھری کردار نگاری کی بنا پر انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ بقول اشرفی:

"ناول کے فن پر کلی دسترس بوئل کا خاصہ وصف ہے اور اس وصف کو مزید صیقل کرنے میں اس کی نثر کا تیکھا پن اور لہجہ انداز اور بھی معاون بنا ہے۔ تیکھی، دیکھی اور تمثیلی نثر تجربہ عنوانات کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ اور ان کے ذہن پر دور رس اثر چھوڑتی ہے۔"

مذکورہ مضامین کے علاوہ اور جتنے مضامین شامل ہیں ان کے اظہار میں ڈاکٹر اشرفی نے توازن، تناسب اور تنقیدی اصول سے عہدہ برآ ہونے کی کامیاب سعی کی ہے۔ مصنف نے اپنے ہر موضوع کی تہہ میں غواصی کی ہے۔ اور وہی جوہر نکالا ہے جو اس کی مرکزی خصوصیات کا غماز ہے علاوہ ازیں اس مرکزی عنصر صنف کی روح سے اپنی تنقیدی قوتوں کو جلا بخشی ہے۔ اور نہایت متوازن انداز سے قارئین کے جذبۂ بازیافت کو تسکین بخشی ہے۔ وہ حیات و کائنات کے مسائل سے گفتگو میں عقیدت کی باگ نہیں تھامتے بلکہ مسائل کے ساتھ انصاف کرتے اور اپنے موقف کو حقائق کے جلو میں متعین کرنے کا کامیاب سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ یورپ کے مفکرین سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ اور اردو کے کلاسکی سرمایہ کا بھی نہایت ہی متناسب انداز میں تجزیہ کرتے ہیں۔

"شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری" ڈاکٹر اشرفی کا مقالہ امتحانیہ ہے جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ یہ مقالہ شاد کی گوناگوں خصوصیات کو اپنے احاطے میں گھیرتا ہے۔ اور ان کی نثر نگاری پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ شاد بلاشبہ اردو کے ان محسنوں میں سے ہیں۔ جو صف اول میں جگہ پاتے ہیں۔ نثر کی کئی اصناف پر شاد نے توجہ صرف کی۔ اور اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑا۔ ناول، افسانہ، سیرت، تذکرہ، سوانح نگاری، تنقید نگاری، مکتوب نگاری، خود نوشت سوانح حیات، لسانیات اور عروض وغیرہ سے متعلق متعدد تصنیفات اور

رسائل ان کی ذات سے منسوب ہے۔ ان کے بلند خیالات سے علاوہ فکر ندرت ادا، جدت طرازی، اور زبان میں پورب دیس کی نرمی لوچ اور صداقت اور موسیقیت ان کی نثر کے خاص اوصاف میں سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں خاصے بحث کے موضوع بنے رہے۔ اور ان کی کتابوں کے رد میں کتابیں لکھی گئیں لیکن کسی بھی طرح شاد کی انفرادیت کا نقش مٹ نہیں سکا ڈاکٹر اشرفی نے شاد عظیم آبادی کی متنوع اور متضاد شخصیت کے دبیز پردوں کو اٹھانے میں بڑی ہنرمندی اور ناقدانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ اور ہر گام پر توازن سے کام لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

"میں نے تمام معاملات کو منطقی طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور کہیں بھی کسی قسم کی طرف داری یا چشم پوشی کو راہ نہیں دی ہے۔ جو باتیں دلیل و برہان کے پس منظر میں حقیقی نظر آئیں ان کے اظہار میں ہچک محسوس نہیں کی"

قاضی عبدالودود جیسی عظیم المرتبت محقق اور محسن اردو نے ڈاکٹر اشرفی کی تحقیق کا اعتراف یوں کیا ہے:

"میں نے اس مقالے کو ابتدا سے انتہا تک غائر نظر سے دیکھا ہے اور مجھے اس میں کوئی ایسی بات جو مقالہ نگار کے دعوی کے مصداق نہ ہو۔ نہیں ملی"

قاضی عبدالودود کی یہ مختصر ترین رائے ڈاکٹر اشرفی کی تحقیقی کاوش کی ایسی سند ہے جو بڑی ڈگری کے مترادف ہے۔

پروفیسر محمد بدر الدین

دورِ حاضر میں لسانیات کی افادیت و ضرورت

کائنات کی مرئی اور غیر مرئی اشیا کی متعلقہ افادیت و ضرورت کو واضح کرنے سے قبل ان کی شناخت، تعریف اور تسمیہ سے متعلق معلومات حاصل کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے چنانچہ اس حقیقت کے پیش نظر لسانیات کی تعریف و تسمیہ کی صراحت پیش کرنا میرے خیال میں نامناسب بھی نہیں ہوگا لسانیات عربی لفظ لسن (ل، س، ن) سے مشتق ہے جس کے مترادف الفاظ علم زبان، مطالعہ زبان، اور LINGUISTIES ہیں۔ یہ مذکورہ الفاظ عربی، فارسی اور انگریزی الفاظ ہیں جو ہم معنی ہیں۔ یعنی لسانیات علوم کی وہ شاخ ہے جو دنیا کی تمام مردہ و زندہ، قدیم و جدید یا ہم عصر اور چھوٹی بڑی زبانوں کی اندرونی و ظاہری کیفیات کا مطالعہ تاریخی، تقابلی، توضیحی اور تجزیاتی انداز میں پیش کرتی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں چند ماہرین لسانیات کے خیالات و نظریات پر غور کیا جاسکتا ہے۔

ایچ، اے گلیسن (جونیر) اپنی کتاب "توضیحی لسانیات" میں لسانیات کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ

"لسانیات وہ علم ہے جس میں زبان کی اندرونی ساخت کے اعتبار سے اسے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے"

اور اردو کے بابائے لسانیات محی الدین قادری زور اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں اس ضمن میں اس طرح خیال کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے زبان کی ماہیت تشکیل، ارتقا، زندگی اور وفات کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے"

معلوم ہوا کہ لسانیات کی دنیا زبانوں کی مختلف اور گوناگوں خد و خال اور خصوصیات کو بروئے کار لانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے، جس طرح تواریخ انسانی زندگی کے ماضی کے سربرآوردہ اعمال و کردار اور مزاج و ماحول کی داستان کو، یا جغرافیہ کرۂ ارض کی اندرونی و ظاہری کیفیات اور خصوصیات کو، یا عمرانیات انسان کی پیدائش اور اس کی نشو و نما کو، یا سماجیات سماج کی تنظیم و تشکیل اور اس کے مختلف پہلوؤں کو یا علم نفسیات انسانی ذہن و دل شعور لاشعور اور تحت الشعور اور انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کارفرما عناصر اور اس کی نفسیات و جبلت میں پیدا ہونے والی کیفیات کے مختلف پہلوؤں کو یا علم طبعیات (PHYSICS) کائنات کے ٹھوس مادوں کی خصوصیت و فطرت کو اور اسی طرح بعض دیگر مروجہ علوم اپنے متعلقہ مسائل کو واضح کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ لہٰذا لسانیات بھی زبانوں کے مسائل متنازعہ پر بحث کرنے میں

گیا

کا مطالعہ ہوتا آ رہا ہے

دورِ حاضر میں اس علم نے ہمہ گیر حیثیت و مقام حاصل کر لیا ہے۔ سائنسی علوم کی ترقیات کے دوش بدوش تقریباً ایک سو سالہ علم زبان اپنے متعلقہ مقاصد و اغراض کی تکمیل دائرہ کار میں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ نتیجہ کے طور پر آج حیرت انگیز سائنسی آلات زبانوں کی بنیادی آوازوں کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ امریکہ، انگلینڈ، فرانس، جرمنی، ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں بالخصوص لسانیات کو عام کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں دیگر چند براعظموں کے مختلف ممالک میں بھی اس علم کو عام اور مقبول کیا جا رہا ہے۔ اور اس امر میں حیرت انگیز کامیابی بھی ملتی چلی آ رہی ہے۔ جس کے پس پردہ کوئی نہ کوئی راز ناگزیر طور پر مضمر ہے۔

دنیا کے مختلف ماہرین و طلبائے لسانیات کے علاوہ دیگر سائنسی و سماجی علوم کے ماہرین بھی اس علم کی افادیت و اہمیت کے پیش نظر اس کو فروغ دینے کا اقدامات کر رہے ہیں۔

چنانچہ اس حیرت انگیز مقبولیت کے پیش نظر مزید چند باتیں پیش کی جا سکتی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

جیسا کہ ابھی ابھی معلوم ہوا کہ علم زبان نے ہمہ گیریت و شہرت حاصل کر لی ہے۔ اور کسی ہمہ گیر شئے کی اہمیت و افادیت سے چشم پوشی کرنا حقیقت کو دروغ ثابت کرنے سے عبارت ہے۔ چنانچہ لسانیات کی اس خوبی کے پیش نظر یہ باتیں سپرد قلم کی جا سکتی ہیں کہ ــــــ

دنیا کے مختلف گوشوں میں اور بالخصوص امریکہ میں مبتدیوں کو کسی اجنبی زبان سکھانے کی راہ میں لسانیات کے ضوابط و اصول کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ اس سے بھی اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

یہ علم عوام کی زندگی اور انسانی تہذیب و تمدن کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے میں بھی معلومات فراہم کرتا ہے

دنیا کے ادب ہائے قدیم کے معانی و مفاہیم، ان کے وسیلوں یعنی زبانوں کے الفاظ کی آوازوں کی صحیح ادائیگی اور لفظوں کے صحیح استعمال کے مسائل کا حل پیش کرنے میں لسانیات ہی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ علم زبان کا ہی کمال ہے کہ وہ ترجموں کے طریقوں اور ٹائپ رائٹنگ مشین کی ترویج میں ہمیشہ استاد حقیقی کی مانند ایک فریضہ عالیہ کی انجام دہی میں مصروف رہتی چلی آ رہی ہے۔

یہ زبان اور رسم تحریر کی تصحیح و اصلاح کے امور میں مددگار ثابت ہوتی رہی ہے۔

یہ کسی زبان کے لئے رسم تحریر اس کی قواعد و لغت وغیرہ کی تدریس و تعلیم کے اغراض کی تکمیل کے لئے نصابی کتب کی اشاعت و تصنیف میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی ہے

اس کے ذریعہ سے زبانوں کے خد و خال کو سمجھنے کی راہ میں متعلقہ عہدوں کی تاریخی، جغرافیائی، نفسیاتی، سماجی، منطقی، مذہبی، ادبی و علمی ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی رہی ہے۔

خصوصاً دورِ حاضر میں یہ علم دنیا کے مختلف ممالک کے لسانی تضادات - (LINGUISTIC CONFLI-CTS) کو یکسر دور کرنے میں جدید و جلیل حاکم وقت سے بھی بڑھ کر کامیاب ہو سکتی ہے۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر دنیا کا کوئی علم اس وقت لسانیاتی تضادات و فسادات کو ختم کر سکتا ہے تو وہ صرف علم زبان ہی ہے۔

نتیجہ کے طور پر لسانیات کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے میں پھر ایک بار خیال ظاہر کرنا چاہوں گا کہ عہد جدید کا تقاضا ہے کہ عالمی انسانیت، اخوت، اور دوستی کے نازک جذبات کو مستحکم کرنے کی کوشش کی راہ میں یہی

علم معاون و مددگار ثابت ہو سکتا ہے اس لئے کہ دنیا کے تمام تعلیم یافتہ حضرات ایک دوسرے کی زبانوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے بعض ہی نہیں۔ ایسے حضرات دنیا کے خاندان السنہ کی توضیح و تفسیر کرنے کے دوران مختلف نسلوں اور قوموں کی سرشت و حقیقت کا مطالعہ کرنے میں کامیابی حاصل کرلیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک دوسرے کی زبانوں کے لئے ان کے دلوں میں محبت وانس کے عناصر موجزن ہو جائیں گے۔

بالخصوص ہندوستان جدید کے عوام کے دلوں سے لسانی تضادات کے زیر اثر پیدا شدہ انسانیت کش جذبات کے راون کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اردو اور ہندی کے باہمی تضادات کی بیخ کنی ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اردو داں طبقہ ہندی کے لئے اور ہندی داں طبقہ اردو کے لئے اپنے دل میں نیک خیال و جذبہ پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کرے گا۔ اور یہ اقدام اس وقت ممکن ہوگا جب ہندوستان کی ایک بڑی آبادی لسانیات کے مطالعہ کے ذریعہ زبانوں کی تاریخ، ابتدا، ارتقا، زوال، نسل اور خاندان کے پیش نظر زندگی گذارنے کی سعی کرے گی۔

لسانیات کے مطالعہ کو عام کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کم از کم ہندوستان کے نام نہاد موقع پرست اور حقیقت فروش لیڈروں کا دل زبان اردو کے بارے میں صاف و پاکیزہ ہو جائے گا۔ اور وہ ایسی صورت میں اردو کو غیر ملکی اور پاکستانی زبان قرار دینے میں شرم محسوس کریں گے۔ ان کی جہالت اور ذہن کا فتور دور ہو جائے گا۔ ساتھ ہی کم از کم ہندی زبان کے ایک نام نہاد شاعرہ اردو کو ہندی کی شیلی قرار دینے میں شرم و لجاجت محسوس کرے گی۔ اور ایسے ہی کم ظرف، وطن فروش، تمدن کش، تنگ نظر اور حقیقت سے چشم پوشی کرنے والے ہندوستانیوں کی ہمت نہ ہوگی کہ اردو ہندی کی شیلی ہے۔ جیسے بتلے تراشتے پھریں۔

ایسے لوگ اصل میں اردو دشمنی کو عام کرنے کے درپے ہیں۔ اور ہندوستانی قومی وحدت کی بیخ کنی کرکے اس کے شیرازے کو منتشر کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کم از کم لسانیات کی بھاری کام کرم کتابوں کا تو نہیں کسی بھی ہلکی پھلکی لسانیات کی عام کتاب کی مطالعہ کرنا چاہئے۔ کہ ان کے ماؤف ذہن کا صحیح علاج ہو سکے۔ ان کو کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے کہ کہیں دو زبانوں کے درمیان صوتی مماثلت کے باوجود ان میں خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے۔ اور یہ خط امتیاز ان کی رسم تحریر اور بعض بنیادی آوازوں اور فطری مزاج کے پیش نظر ہی کھینچا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو اور ہندی دونوں جدید ہند آریائی خاندان کی خالص ہندوستانی زبانیں ہیں۔ ہندی اور اردو نے کھڑی بولی کے خون کو اپنے جسموں میں جاری وساری کرنے کا شرف حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم ان حقائق کے باوجود دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہندوستان کے قانون کی کتاب کے آٹھویں شیڈول میں زبان اردو اور ہندی کو الگ الگ زبانیں تسلیم کیا گیا ہے۔ کیا ایک ہی ماں کے بطن سے پیدا ہونے والی جڑواں اولادوں کی الگ الگ خصلت وخصوصیت عادات و اطوار رفتار و گفتار میں فرق نہیں ہوتا؟ یقیناً یہ فرق ہوتا ہے اور ہم لوگ روزمرہ کی زندگی میں اپنے ہی خاندان اور سماج میں ایسے ہی حادثے اور واقعے دیکھتے رہتے ہیں۔ اردو زبان کی خوشبو اس کی ہیئت اور اس کا رنگ ہندی سے بالکل الگ ہے۔ چنانچہ قطعی طور پر کوئی بھی حقیر سے حقیر آدمی یہ فیصلہ صادر کر سکتا ہے کہ اردو اور ہندی دونوں ایک دوسرے سے یکسر علاحدہ اور جداگانہ زبانیں ہیں۔ ایسی حقیقتوں سے آشنا کوئی چیز اگر کر سکتی ہے تو وہ محض لسانیات ہی ہے۔ علاوہ ازیں ایسی حقیقتوں سے واقفیت حاصل کرلینے کے بعد کوئی شخص صحیح اور مناسب فیصلہ کسی زبان کی اصلیت کے ضمن میں صادر کر سکتا ہے تھوڑی دیر کے لئے لسانیات کی حقیقتوں

احمد یوسف

وقت رخصت

میں تھا اور میرے مقابل میرا کزن علی تھا۔ اور سفر کے لئے گھر سے نکلنے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ یہ وہ سفر نہیں تھا کہ جس کے بعد دو چار دن، دو چار ہفتے یا دو چار مہینے پر واپس آنا لازمی امر تھا۔ اور نہ یہ وہ جدائی تھی جس کے بعد دو چار دن دو چار ہفتے، یا دو چار مہینوں کے اندر دوبارہ ملنے کی امید ہو کیونکہ حقیقت تو یہ تھی کہ ہم دونوں ایک بہت بڑی بساط کے انتہائی حقیر اور بے وقعت مہرے تھے۔ اور ہم وقت یہ سوچتے رہتے تھے کہ —— پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے۔

میں نے علی سے کہا —— علی پچھلے دنوں میں نے ایک آسیب زدہ شہر کی داستان رقم کی تھی۔ جہاں کے باسیوں کو ۲۴ گھنٹے میں صرف ایک گھنٹہ آزادی کا ملتا تھا۔ وہ اس ایک گھنٹے کو بھی غنیمت جانتے تھے۔ کہ ایک گھنٹے میں .. ۳۶ سکنڈ ہوتے ہیں۔ اس ایک گھنٹے کے لئے انہوں نے ایسی گھڑیاں رکھ چھوڑی تھیں۔ جو سکنڈ کے حساب سے چلتی تھی۔ چنانچہ ۲۳ گھنٹے گذرنے پر وہ سب اپنی اپنی کلائیوں پر سکنڈ والی گھڑیاں لگا لیتے تھے۔"

اس پہ علی جو بڑی غور سے میری باتیں سن رہا تھا کہنے لگا۔ تو فی الوقت ہم لوگ بھی سکنڈ والی گھڑیاں لگالیں۔

لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا بولیں۔ دراصل اتنے تھوڑے سے وقفے میں کاروباری باتیں تو ہو سکتی ہیں۔ لیکن جو باتیں ہم اس وقت کرنا چاہتے تھے ان کے لئے بڑے پر سکون ماحول کی ضرورت تھی۔ یہاں تو یہ حال تھا کہ ہماری کلائیوں پر بھاگتی دوڑتی گھڑیاں بندھی تھیں۔ اور دل اتنے بھرے ہوئے تھے کہ سوجھتا نہ تھا کہ کیا کریں۔ خود کو سنبھالیں یا آنسوؤں کو سنبھالیں۔

"خواب کی طرح یہ دن گذر گئے علی"

ڈھائی ماہ پہلے جب ہم ایک عرصۂ مدید کے بعد اس شہر میں ملے تھے۔ تو دیر تک ہم ایک دوسرے میں لپٹے رہے تھے اور جب قلب کی حالت کچھ درست ہوئی تھی۔ تو میں نے علی سے پوچھا تھا —— علی میرے بھائی "تم تو بڑے حساب داں رہ چکے ہو۔ یہ بتاؤ کہ ہم لوگ کتنے دنوں بعد ملے ہیں۔

تب علی نے انگلیوں پہ حساب شروع کیا تھا۔ اور کچھ دیر بعد بولا تھا۔

"۲۵ برس، ۳ مہینے، ۲ دن"

صحیح حساب کیا تم نے۔ اتنی طویل جدائی تو ہزاروں سال پہلے کے لوگوں نے بھی نہیں جھیلی تھی۔

میں نے علی کی طرف دیکھا تو اس کے کالے گھنے بال خزاں کی نذر ہو چکے تھے۔ اور اس کے ساحلوں پہ یہاں سے وہاں تک سفید اور کالی پٹیاں سی نظر آرہی تھیں۔ اس کا رنگ ماند پڑ گیا تھا۔ اور دانت۔

علی نے کہا دراصل ہماری آخری شہادت، شہادت کے ایک طویل سلسلے کے بعد انجام پائی ہے۔ سو میرے باب میں اوپر اور نیچے کے چند دانتوں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔

تب ہی علی کی دولہن اور بچے بھی مجھ سے ملنے آگئے تھے۔ اور سلام کر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تھے۔ علی نے ان کا تعارف کرایا تھا۔

یہ بڑا بیٹا جسیم میڈیکل کے چوتھے سال میں ہے۔

دیہاتی اسکول میں، ندیم ساتویں جماعت میں، بڑی بیٹی روانہ بی اے کر چکی ہے۔ اس سے چھوٹی شبانہ امسال انٹر کا امتحان دے گی۔ اور رخسانہ نویں جماعت میں ہے ـــــ اس وقت میں نے محسوس کیا کالی کے سیاہ گھنے بال جسم کے سرپر آگئے تھے۔ اس کی رنگت نسیم نے لے لی تھی اس کے موتی جیسے دانت ندیم کے حصے میں آگئے تھے اس کی آنکھوں کی چمک روانہ کو ملی تھی۔ تو اس کی مسکراہٹ شبانہ کو اور اس کے بات کرنے کا انداز رخسانہ نے پالیا تھا۔

علی مجھ سے پوچھ رہا تھا ـــ گھر اور اس کے در و دیوار آنگن اور چھت ـــ اور وہ جن سے اس کا جنم جنم کا رشتہ ہے۔ پھر شہر، اس کے کوچہ و بازار، اور وہ سمندر جیسا دریا......

اس پر میں نے علی سے کہا تھا۔ سب کچھ اسی طرح ہونے کے باوجود، سب کچھ اسی طرح نہیں ہے۔ کہ ٹھہرے ہوئے پانی اور بہتے پانی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

تب ہی علی کو جیسے کچھ یاد آگیا تھا۔ بھائی صاحب اس شہر میں...... علی نے ان واقعات کو چھیڑ دیا تھا جن سے میں کما حقہٗ واقف تھا۔ سو میں نے سوچا کہ علی سے کہہ دوں کہ اس خونیں داستان کو دہرانے کا کیا حاصل کہ ماضی تو وہ سنگلاخ زمین ہے۔ جس پر تبدیلی کا کوئی کدال اثر نہیں کرتا۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ میں اس کا بڑا بھائی ہوں اگر اس کی زبان سے اس کا دکھ درد سن لوں گا۔ تو یقین ہے کہ اس کا دل ہلکا ہو جائے گا۔

میں نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔

ایک مسلح ہجوم ہمارے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔ تو ہم نے اپنی کوٹھیاں، اپنی کاریں، اور اپنا سارا اثاثہ دریا برد کر دیا۔ صرف بیوی بال بچوں کو بچا لائے۔ کہ سب سے قیمتی سرمایہ تھے ...... اب تپتی دھوپ کے اس شہر میں خدا کا شکر ہے کہ ہمیں دو وقت روکھی سوکھی مل جاتی ہے۔ تن ڈھانکنے کو کپڑے مل جاتے ہیں۔ سر پہ ایک چھت ہے۔ اور بچے پڑھ رہے ہیں۔

...... پونجی سے پونجی بنتی ہے۔ لیکن یہاں تو ہم آٹھ نفوس کا ایک ایسا قافلہ لے کر آئے تھے۔ جس کے پاس صرف اللہ کا نام تھا۔

علی جذباتی ہو گیا۔ اب میں محنت سے سرمایہ پیدا کرنے کی کوشش میں ہوں۔ مگر شاید......

اس شاید کے بعد علی غالباً یہ کہنا چاہتا ہوگا۔ کہ یکن نہیں دکھائی دیتا۔ کیوں کہ اب وہ خزاں کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔

مثلاً مجھے وہ بھونرا یاد آگیا۔ جو بہار کے دنوں میں خرمستیاں کرتا رہا تھا۔ اور خزاں کی دنوں میں شہد کی مکھی سے تھوڑے سے شہد کی بھیک مانگنے گیا تھا۔ آج اگر وہ بھونرا ہوتا تو نہایت ہی استہزائیہ انداز میں شہد کی مکھی سے کہتا ـــ بی بی تم نے تو بہار کے دنوں میں سخت جانفشانی کی تھی۔ اور بہت سارا شہد جمع کیا تھا۔

یہ کہانی آج بے معنی ہو گئی تھی۔

میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ اور علی سے یوں مخاطب ہوا۔

علی یہ نہ بھولوں کہ ہماری گھڑیاں اب تک ایک ہزار سیکنڈ کھو چکی ہیں۔ میرے بھائی بہتر یہ ہے کہ ہم ان لمحوں کو یوں ضائع نہ کریں۔ کہ یہاں جو لمحے آپ کی گرفت میں ہیں۔ وہی آپ کے ہیں ورنہ سب کچھ ماضی، سب کچھ مستقبل۔

سوچو کہ ہم لوگ پچیس سال بعد ملے ہیں۔ اور اگر پھر اگلے پچیس سال کی بات کی جائے۔ تو کیا ہم لوگ اس وقت تک زندہ رہیں گے۔؟

علی نے کہا۔ یہاں تو پل کی خبر نہیں۔

- وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا۔ لیکن ادھر کئی عارضے اس کی جان کو لگ گئے تھے۔ میں یقیناً اس سے زیادہ صحت مند تھا۔ لیکن ایک بار جب ہم چوڑی سڑک پار کر رہے تھے تو علی

نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس طور پر جیسے وہ مجھے سہارا دے رہا ہو۔
حالانکہ اس کی ضرورت علی کو تھی۔ تب ہی میرے ذہن میں یہ بات
آئی کہ بچہ بڑے کی مدد سے سڑک پار کرتا ہے۔ لیکن وہی بچہ
جب ایک خاص عمر سے تجاوز کر جاتا ہے۔ تو پھر اس کے چھوٹے
اسے سڑک پار کراتے ہیں۔ میں بھی تو علی کا بڑا بھائی تھا۔

اس دن میں اس کے ساتھ میں ایک لمبے سفر پر جا رہا تھا
اس لئے ہمیں بس سے جانا تھا۔ بڑی مشکلوں سے ہمیں ایک منی
بس ملی۔ پہلے ہی سے بھری ہوئی تھی۔ مجبوراً ہمیں کھڑے کھڑے
سفر کرنا پڑا۔ ویسے کھڑے کیا خاک تھے۔ ہم تو دراصل رکوع میں تھے
اس واسطے کہ بس کی چھت بے طرح نیچی تھی۔ کچھ دور چل کر گاڑی
رکی۔ اور ایک سیٹ خالی ہوئی۔ تو علی نے مجھے اس پر زبردستی
بٹھا دیا۔ حالانکہ وہ مجھ سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔ اس پر میں نے
سوچا، علی واقعی مجھے خود سے کمزور سمجھتا ہے۔ لیکن دوسری
ہی ساعت مجھے یہ خیال آیا کہ ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ بھائی
کو بیٹھنا چاہیئے پھر یہ کہ میں اس کا مہمان بھی تھا۔

علی کچھ بولو، میرے بھائی۔ دیکھو یہ گھڑیاں سخت
بے وفا ہوتی ہیں۔ چشم زدن میں دو ہزار سکنڈ گذر گئے۔

لیکن ہم لوگ بس ایک دوسرے کو تک رہے تھے شاید
ہمیں ماضی قریب کے دو ڈھائی مہینے یاد آ رہے تھے۔ جن میں
ان مہ و سال کو یاد کرنا ہمارا بہترین مشغلہ تھا۔ جو پچیس سال
ادھر بیتے تھے۔

عزیزوں اور قرابت مندوں سے گذر کر ہم محلوں
ٹھیلوں کی باتیں کرنے لگے۔

اچانک ایک دن علی پوچھ بیٹھا۔ پتنگیں اب بھی اڑتی ہیں؟
میں نے کہا۔ ہاں اب بھی پتنگیں اڑتی ہیں۔ اب
بھی شب برات کا تہوار آتا ہے۔ لیکن چونکہ دوسری دلچسپیاں
بڑھ گئی ہیں۔ اس لئے اب تمہارے وقتوں کا زور نہیں ہے۔

اتنے میں علی کی دلہن نے مجھے ایک پیکٹ لاکر دیا۔

بھائی صاحب! یہ ایک حقیر سا تحفہ ہے۔

لو لیجئے، پیکٹ میں ایک قمیص، ایک پتلون کا پیس
اور ایک گھڑی والا قلم جھانک رہا تھا۔

قلم تو شاید اس لئے تھا کہ میں اپنے غم کی داستانیں
لکھتا رہوں۔ لیکن یہ کپڑے۔؟

تب میں نے علی سے کہا۔ علی تمہیں ان حالات میں یہ
سب نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

علی آبدیدہ ہو گیا۔ بھائی صاحب آپ اتنے
دنوں بعد آئے تھے میں تو کچھ بھی نہیں کر سکا آپ کے ساتھ۔

میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ علی یہ وقت ان
باتوں کا نہیں ہے۔ سوچو کہ بہ فرض محال ہم اگلے پچیس سال تک
زندہ بھی رہے تو کیا ہم اس لائق رہیں گے کہ ایک طول طویل
مسافت کا بار سہہ سکیں۔

معذوروں کی کرسی پر بیٹھ کر آنے کا حاصل کیا ہو گا
میرے بھائی۔

بس اب پانچ سو سکنڈ اور رہ گئے ہیں۔ کچھ باتیں کرو۔
اچانک علی کھڑا ہو کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اور پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے بعد مجھے بھی ضبط کا یارا نہیں تھا
تب ہی ہم نے ایک دوسرے کی پیشانیوں کو بوسہ دیا۔
علی نے کہا۔ یہ وہ پیشانیاں ہیں۔ جن پر ہمارے دادا
باپ کی مہریں ثبت ہیں۔

خوش نصیب ہیں آپ کہ بزرگوں کی قربت حاصل
ہے۔ کبھی کبھار میری طرف سے بھی فاتحہ پڑھ لیا کیجئے۔
اب وہ گھڑی بند ہو چکی تھی۔ اور ہم اپنی نم آنکھیں
لئے ایک طویل جدائی کی سمت نکل پڑے تھے۔ ●

حسین الحق

کربلا کے بعد

میں بھاگتا رہا.....

پلٹ پلٹ کے دیکھتا رہا......

اور میری نظروں کے سامنے سب کچھ راکھ ہوتا رہا....

اور یہ راکھ اب خواب بن گئی ہے اور یہ خواب خواب
راکھ میرے پورے وجود پر خود کو حاوی کر کے "مجھے بھبھوت" بنا گئی
ہے۔ اور میرا خارج ایک شریف شہری کا جامہ زیب تن کئے ہوئے
ہے لیکن میرے داخل میں وہ ہا ہا کار مچی ہے کہ خود اپنی سوچ
آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر آواز کو دوسری آواز کاٹتی گذر
جاتی ہے۔ اور میں حیران و ششدر تیز و تند ہوا کے سہارے
پر سے تا بار رقص کرتا رہ جاتا ہوں لیکن یہ ہمت نہیں ہوتی کہ مقام
متعینہ سے ایک قدم آگے بڑھ سکوں۔

مرشد کو میں نے ختم کیا۔ عبداللہ حالات کی نذر ہو گیا
اور ذکی بھائی جانے کس سمت نکل گئے۔ سو اب صرف میں ہوں۔
اور میرے ارد گرد ایک اژدہام۔ اس اژدہام میں زیادہ تر
لوگ چپ ہیں کچھ بولتے ہی نہیں۔ یہ شاید مجبوراً ہو کی مورتیاں
ہیں کہ ان کے سامنے اگر غلط آسن سے مباشرت بھی کی جائے۔
تو یہ کچھ کہنے نہیں آئیں گی......

کچھ لوگ جو مورتی نہیں ہیں وہ شاید
(عبداللہ حالات کی نذر)
صبح ... دوپہر... شام... رات .... صبح ....
دوپہر... شام.... رات .... نہیں شاید.... رات، شام،
دوپہر، صبح ..... یا شاید دوپہر، صبح، رات، شام... شاید
یوں... شاید یوں....

اب یہاں کچھ نہیں ہے ... صرف رات .... ایک طویل....
تھکا دینے والی رات.... اور اس رات میں کوئی خواب نہیں.... سب
خواب جل بجھے،... اب صرف راکھ ہے .... راکھ راکھ خواب .... راکھ راکھ
رات .... اور اس رات کے ایک سرے سے اس سرے تک چیخوں اور
کراہوں کا سلسلہ....

لوگ کہتے ہیں سکون ہو چکا ہے۔ پناہ گاہوں میں نگرانی
کے ذمہ دار حضرات کی طرف کھانے تقسیم کئے جاتے ہیں......
راتوں کو جوان پھر بڑی مستعدی کے ساتھ پہرے دیتے ہیں..
اور آدھی رات کے سناٹے میں رات کی تاریکی کا سینہ چیر کر.
.... بلکہ میرا سینہ چیر کر..... ایک آواز..... میرے
اندر..... بہت دور تک..... اترتی چلی جاتی ہے
.....جاگتے رہو .... جاگتے رہو.......

میں بے تابانہ دوڑتا ہوں اور ایک ایک کو پکڑ کر کہتا ہوا
.....سو جاؤ..... مت جاگو ...... خدارا سو جاؤ
...... مگر وہ میری باتوں پر کان دھرنے کے بجائے میرے
بیارے مجھ سے لپٹ کر رونے لگتے ہیں۔ آبا میرا ماتھا چومنے
لگتے ہیں۔ اماں مجھے اپنی آغوش میں چھپا لیتی ہیں۔ میری بیوی
کی آنکھیں جن میں کیلے ساحلوں کے عکس جگمگاتے ہیں مجھے
اپنے وجود کے سمندر میں سمو لینے کے لئے بے تاب ہیں۔ میری بیٹی
مجھے ٹکر ٹکر دیکھتی ہے۔ اور میرا بھائی جس کے سینے میں آگ
دھدھکتا سمندر کروٹیں لیتا رہتا ہے۔ شاعری بھول چکا
اور اب سب سے چھپ کر اپنی عینک صاف کرتا رہتا ہے
...... اور میرا بس نہیں چلتا کہ "جاگتے رہو" کی آواز بلند

رنے والی کی گردن دبا دوں۔

کیا حاصل ؟

ہاں ..... آخر کیا حاصل ؟

اس دن بھی تو آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لوگ بکائے جا رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب ہوا جسے میں نے "ہمیشہ قصۂ پارینہ" کی حیثیت دی۔ ..... مگر وہی "قصۂ پارینہ" اب اس طرح جگمگا رہا ہے۔ جیسے کربلا میں قمقمے روشن کئے گئے ہوں۔ ..... اور صدیوں کی مسافت طے کرتی چور چور میٹھی نوحہ بلند کرتی ہے ..... ہائے سکینہ ..... ہائے سکینہ ..... ہائے سکینہ ..... اور ساری سکینائیں، رالجائیں، طاہرائیں، اور عمارائیں مجھے ٹوٹی ٹوٹی بیکس نگاہوں سے دیکھتی ہیں۔ اور میں آہستہ سے نظریں جھکا لیتا ہوں۔

اور نظریں جھکا لیتا ہوں تو فضاؤں میں عفعف کی صدائیں گونجتی ہیں ———

کوئی ہرن چوکڑیاں بھرتا ہوا ٹیلے پر چڑھ جاتا ہے۔ اور حکمران حیران کہ بلند ٹیلہ۔ لوں کی پناہ کیسے بن گیا ..... اور ایک شخص دانتوں سے مشکیزہ دبائے دوڑ رہا ہے۔ اور ہر چہار اطراف سے دشمنوں کی یلغار سہہ رہا ہے ..... اور دمشق شہر پر منجنیق برسائی جا رہی ہے ..... اور شہر شہر قریہ قریہ میدان کارزار گرم ہے ..... اور پھر سب کچھ گڈ مڈ ہو جاتا ہے ..... سوال بھی اور جواب بھی ..... تب فرار کے علاوہ چارۂ کار کیا تھا؟ ......

جس جنگ میں میری تلوار شامل نہیں ہوئی۔ اس میں میں اپنی زبان کیوں شامل کروں۔ ؟

کیا جنگ ختم ہو چکی ؟

سوال اندر ہی اندر سر اٹھاتا ہے۔ اور اندر ہی اندر چھائی دھند میں سب گڈ مڈ ہو جاتا ہے ..... پرچھائیوں کی پہچان مشکل۔ کہ عبداللہ ابن عباس کے سینے پر فلاں ابن فلاں سوار ہے ..... ابن حنبل کا جسم کوڑوں کی ضرب سے پھٹ گیا ہے۔ اور فقیہہ کا خون رنگ لا رہا ہے ..... سب تاریخوں کو دیمک چاٹ گئی ہے ..... ابن خلدون دیوار پھلانگ کر دوسری سمت بھاگتا چلا آ رہا ہے ..... اور ابن تیمیہ استقبال کو کھڑے ہیں۔

تو دم آخر یہ حادثہ گذرا کہ اندر ہی اندر ایک گھمسان کا رن پڑا اور سب گڈ مڈ ہو گیا ..... اور اب ایک پرچھائیں کو دوسری پرچھائیں کاٹتی اور دبوچتی چلی جا رہی ہے ....."

اور میں حیران و ششدر نظریں جھکائے کھڑا ہوں .....

نظریں جھکائے کھڑا ہوں ..... اور دیکھ رہا ہوں ...

دشت تو دشت ہیں .....

آ کے بیٹھے بھی نہ تھے .....

سوال اور جواب ..... دونوں یوں یوں .....

آپ سے اس جانب داری کی امید نہیں تھی بیرسٹر صاحب مگر آپ کا بھی کیا قصور ..... کہ آپ تو .....

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا .....

تو مولا، شہباز سے لڑ گیا .....

اور آپ رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹنگ گئے۔

> بتاریخ فلاں، مطابق فلاں سلطان ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ کا عرس مبارک منعقد ہو گا۔ جس میں فلاں فلاں نامور قوالان اور قوالائیں شرکت کر رہی ہیں۔ معتقدین حضرت ٹیپو شہید سے جوق در جوق شرکت کی درخواست ہے۔

آ سمجھ کو بتاتا ہوں .....

یہ آخر ہے بیرسٹر صاحب

مرشد کو میں نے خود ختم کیا..... معبداللہ حالات کی
نذر.... اور ذکی بھائی جانے کہاں نکل گئے اور اب صرف
میں ہوں۔

اپنے آپ میں سمٹا ہوا اور سہما ہوا میں ...... اور
میرے اردگرد کے مناظر...... جو مناظر پیچھے چھوٹ گئے وہ لاکھ
لاکھ خواب ہیں...... اور میں بھبھوت ہوں ...... اور یہ
بھبھوت اپنے اردگرد بھبھوتوں کا تماشائی ہے ...... کہ
تماشہ میری تقدیر ہے۔

سب ختم ہو چکا ہے ..... دور کا کوئی منظر روشن
نہیں ..... ابد لینے ہی چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے
...... جوان پہرے دے رہے ہیں ..... اور آواز بلند
کر رہے ہیں۔ ..... جاگتے رہو ..... اور سب مطمئن ہو کر سو
جاتے ہیں ..... اور تب ایسے میں بغیر نقابوں کے کھلے چہروں
والے ..... رات کی سیاہی میں ایک خیمے سے دوسرے خیمے
میں جھانکتے پھرتے ہیں ...... اور ساری رالبائیں، طاہرائیں
اور عمارائیں بہے پرندے کا استعارہ !

کئی راتوں سے یہ تماشہ جاری ہے اور جب سے یہ
سب کچھ ہو رہا ہے تب سے میں ہوں بھی اور نہیں بھی۔ کہ اب
کوئی مرشد مجھے نئے جہانوں کی سیر نہیں کراتا ..... سو
اب میں زمان و مکان کی قید میں ہوں۔ اور ماورائے زمان و
مکان کا کوئی پتہ نہیں۔

مجھے پتہ نہیں ساحل پہ کشتیاں جلائی گئیں یا نہیں ....
مجھے واقفیت نہیں کہ فوجوں کے روانہ ہو جانے پر نہ
جا سکنے والا دریا یا ہنسا ......
مجھے خبر نہیں کہ ماں سینے پر زخم تلاش کر رہی تھی یا
دل کی دھڑکنیں گن رہی تھی ......
مجھے علم نہیں کہ قد بڑا دکھانے کے لئے بیساکھیاں تلاش
کی گئیں یا نہیں ......
مجھے معلوم نہیں، بیت المال کی تقسیم کس طرح عمل میں
....
میں کیا جانوں کہ تقسیم کنندہ کی بیٹی کی انگلیاں جیسے
ہیں۔ یا نگینہ جگمگا رہا ہے ......
مجھے کیا غرض کہ سنجی گفتگو کے دوران چراغ جلنے اور
کے مسئلے پر غور کروں ......
مجھے کیا پڑی ہے کہ پتہ لگاتا پھروں کہ کھیر کہاں سے
گئی ....
مجھے کچھ خبر نہیں ......
بابا مجھے کچھ پتہ نہیں ...... میں کچھ نہیں جانتا
اور نہ جاننا چاہتا ہوں ..... اور نہ جان
ہوں ......
میری تو ساری ساری رات ان کی چاپ لیتے
جاتی ہے ......
جو پھر مستعد ہو گئے ہیں ...... ●

بقیہ: آس پاس

جاری کئے جائیں۔ جب ہر جگہ غیر ملکیوں کا مسئلہ سر اٹھا ر
تو اس کے حل کی اس سے زیادہ اچھی کوئی ترکیب نہیں ہو
یوں بھی شناختی کارڈ جاری کرنا ہمارے ملک کی سلامتی
و امان اور دفاع کے لئے ایک بہترین کارروائی ہوگی۔ ا
غلط قسم کے عناصر کے پروپیگنڈے بند کئے جا سکیں گے

شمیم صادقہ

کوڑی بدلے جائے

کمرے میں خوابناک اور کیف اور ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہے۔ بیلگوں نیلی لمبے لمبے پردے اڑ رہے ہیں نیلی دیواروں پہ دو ایک پینٹنگز آویزاں ہیں۔ اور فل اسپیڈ میں چلتے ہوئے نیلے پنکھے کی تیزی میں نہ گھبراہٹ ہے نہ اضطراب۔

سامنے کے سنگل بیڈ پہ صبا بے صبر سو رہی ہے۔ اس کے گھنیرے سیاہ بال بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہیں کچھ تکیے پہ، کچھ گردن پہ لپٹے ہیں۔ اس کی باریک سوتی ساری بے ترتیبی سے جسم پر لپٹی ہے۔ اور حسب معمول اس کا چہرہ سوتے ہوئے میں بھی اس قدر پرسکون ہے کہ میری نظر ہی نہیں ہٹتی۔ اس نے خود دریچے پہ صراحی لا رکھا تھا۔ حالانکہ کمرے میں فریج تھا۔

لیکن آج شام میں چائے پی رہی تھی کہ رکشے کی ٹن ٹن سن کر میں نے حیرانی سے کہا تھا۔

ذرا دیکھو باہر کون آیا ہے؟

مگر جبرانی کے جانے اور لوٹ کر آنے کے قبل ہی کاندھے سے پرس لگائے ــــ ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بریف کیس لئے ایک ہاتھ سے بکھرے بالوں کو سمیٹتی ہوئی وہ خود آن پہونچی۔ میں تو ایک لمحے کو اسے پہچان بھی نہ سکی۔ ہمارے درمیان چودہ سال کا عرصہ دیوار بن چکا تھا۔ مگر وہ بغیر جھجکے ہٹ سکے۔

بے تکلفی سے بول اٹھی۔

بھئی مشہور ہونے کا بڑا فائدہ ہے۔ یہاں تو بچہ بچہ پہچانتا ہے۔ بس محلے میں انٹر کرتے ہی لوگوں نے بتا دیا سلطانہ زیدی صاحبہ کہاں رہتی ہیں۔

تب تک میں ماہ و سال کے گرد و غبار کو ہٹا کر چودہ سال پیچھے پہونچ چکی تھی۔

ارے صبا ــــ تم ــــ تو آج کے سیمینار کی چیف گیسٹ تم ہو ــــ مجھے بھی لگا تو تھا ــــ مگر کنفرم نہیں تھی ــــ آؤ ــــ بیٹھو ــــ چائے پیو ــــ میرے ہزبینڈ ــــ ایم اے زیدی ــــ فزکس میں پی جی کے ہیڈ ہیں ــــ اور یہ مشہور شاعرہ صبا......

لیکن صبا نے میرے پرتکلف تعارف کو نظر انداز کرتے ہوئے فوری طور پر کہا تھا

اوہ ــــ اس فارملی تعارف کی کیا ضرورت تھی میں ذرا منہ ہاتھ تو دھو لوں۔

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی اٹیچی سے صابن تولیہ وغیرہ نکال چکی تھی۔ میں اشارے سے ٹوائلیٹ بتایا۔ اور وہ فریش ہونے چلی گئی ــــ چند منٹ بعد تولیہ سے چہرے کو پوچھتی ہوئی میرے پاس کرسی کو بے تکلفی سے کھینچ کر بولی۔

ہاں ــــ چینی صرف ہاف ٹیسپون بس

مسٹر زیدی جو بڑے باتونی مشہور ہیں۔ اور جن کے لئے میرا پریشن تھا کہ بہت ہی اجنبی شخص ہو یا بہت ہی اہم شخصیت۔ وہ منٹوں میں اسے امپریس کر لیتے ہیں۔ وہ بھی ہکا بکا اس بے تکلف شخصیت کو دیکھے جا رہے تھے جو شروع سے اخیر تک بہت ہی پرخلوص اور بہت ہی سادہ طبیعت ملکی میں ہو لیسے بھی ایک عورت تھی۔ اور گو سماجی اور معاشی اعتبار سے بے حد کامیاب عورت۔ مجھے یوں ہار مان لینا کب گوارا ہوتا۔ اس لئے میں نے دوسرے جال بچھا دیا۔

تمہارے کتنے بچے ہیں صبا ۔ ـــــ تمہارے شوہر کیا کرتے ہیں ـــــ اور تم ان دنوں کہاں رہتی ہو؟

میرے تین بچے ہیں ۔ تینوں اسکول میں پڑھتے ہیں شوہر ایک دفتر میں کام کرتے ہیں ۔ اور اسی شہر میں رہتی ہوں جہاں ہم اکٹھے پڑھتے تھے ۔

اپنا گھر ہے ؟ میں نے بجز ذرا مضبوط کی ـــــ

ارے نہیں بھئی ! بالکل کرائے کا ہے بھلا محدود اور جائز آمدنی میں کوئی بارہ تیرہ سال میں گھر بنا لیتا ہے ۔

تو کیا تمہارے شوہر دفتر میں ـــــ

ہاں ـــــ بالکل کلرکی کرتے ہیں ۔ اور کیا حکومت کرنے لگیں گے ـــــ ارے بس ہم آنا کما لیتے ہیں کہ سکون کے ساتھ جی رہے ہیں اور خوش رہتے ہیں ۔

اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بڑی لاپرواہی سے کہا اور پیالے سیب کرنے لگی ۔ پھر کچھ یاد کر کے بول اٹھی ۔

اور تمہارے بچے ؟

میرے دو لڑکے دہرہ دون میں پڑھتے ہیں اور لڑکی دلی سے آرکی ٹیکیٹ کا کورس کر رہی ہے ۔

ارے تم نے بچوں کو اتنی دور کیسے بھیج دیا ۔ اکیلے تمہارا جی نہیں گھبراتا ـــــ

وہ حیرت سے چپٹ پڑی ۔ ـــــ

اور تب اتنی دیر سے موقع ڈھونڈنے والے میرے شوہر کو موقع ہاتھ آیا ـــــ بول پڑے ـــــ

ارے فرصت کس کو ہے ۔ یہاں تو دم مارنے کی بھی مہلت نہیں ملتی ۔ ہم دونوں ہی سنڈیکیٹ کے ممبر ہیں ـــــ انہوں نے ایک ورکنگ ویمنس ایسوسی ایشن بنایا ہے ۔ اس کی میٹنگ ہوتی رہتی ہے ۔ پھر سوشل سروس کے دوروں پر ہم اکثر جاتے ہیں ۔ اور پھر سارے ساتھی یونیورسٹی کے کتنے ہی میرے اور ان کے ساتھ مل کر یہاں آ کر جمع ہو سکتے ہیں ۔ یہ تو اتفاق

کی بات تھی کہ آج صرف ہم دونوں چلے ہی رہے تھے ۔ ورنہ یہاں تو چائے پہ مجمع لگا رہتا ہے ۔ زیدی بے تکان بولے رہے تھے ۔ اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکا جھپکا کے سن جا رہی تھی ۔ پھر تاسف کے ساتھ بولی ۔

صبا یہ سارے کام دوسروں سے ہی ریلیٹیڈ ہیں مگر بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنی ہوتی ہے ـــــ اس قدر دور کہ زیدی نے فوراً بات اچک لی ۔

بھئی یہاں کی تعلیم کا وہاں کے معیار سے مقابلہ ہے مگر اس قدر اچھی تعلیم ہے وہاں کی کہ لوگ افورڈ نہیں کر پاتے ورنہ ـــــ

"جی ہاں" ـــــ صبا نے گویا بات ختم کر ڈالی اور اٹھتی ہوئی بولی ـــــ

چلو تمہارا گھر دیکھیں ۔ ـــــ

یوں اس کا اٹھ جانا گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ کی باتوں سے وہ بور ہو رہی تھی ۔ اور یہ احساس ہی میرے لئے کوفت کا سبب تھا کہ میرے شوہر جن سے وی سی تک ہوتے تھے اور کسی بھی سبجکٹ کی تھیسس کا وائی وا ہو ایکسٹرنل کو ریسیو کرنے کی ساری ذمہ داری ہمیشہ انہیں کی جاتی تھی ۔ وہ اس صبا کی بچی سے اس طرح مات کھا چکے میں اندر اندر جھلاتی ہوئی بظاہر خوش اخلاقی بولی ـــــ

یہ دونوں کمرے ہمارے ڈرائنگ روم ہیں ۔ یہاں تو کچھ لوگ آ گئے ہیں ۔ ـــــ اور پھر کچھ ایسے آ گئے ہوں جو ان کے بالکل اینٹی گروپ ہیں ۔ تو ظاہر ہے کرا کے اپنا پوزیشن نا اس ہو جائے گی ۔ اسی لئے یہ دو الگ الگ انتظام ہیں کہ ڈرائنگ روم ٹھہرانے کا آئیڈیا میرے کا ہے ـــــ

مگر سلطانہ ـــــ اپنے دوستوں کا ا

دائرہ ہوتا ہے۔ اور یہ دائرہ چند لکیروں سے بنتا ہے پھر کیا تم لوگوں کی شخصیت کھلا ہوا میدان ہے کہ جو چاہے آجائے۔

اس نے کچھ اس طرح پوچھا کہ میں ایک لمحے کو بالکل گڑبڑا کے رہ کر رہ گئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔

دراصل یہی یونیورسٹی کی پالیٹکس ہے اور ہم لوگ دونوں گروپ میں ہر دلعزیز ہیں۔

اس کا مطلب ہے ـــــ اچھا چھوڑو ـــ

یہ پانچ بیڈروم ہوئے ـــــ اور یہ ڈرائنگ ـــــ اب اپنی گارڈننگ دکھاؤ ـــــ

میں اسے کوری ڈور والے راستے سے ہو کر باہر کمپاؤنڈ میں لے گئی ـــــ سرخ ٹائلس کا پتلا سا راستہ بنا ہوا تھا۔ اور یہی راستہ ذرا سا کج ہو کر گیٹ تک پہونچتا تھا۔ اس کے دونوں کناروں سرمئی رنگ کے سیمنٹ گملے رکھے تھے ـــــ اور گملوں میں قیمتی کروٹن اور کیکٹس کے پودے تھے۔ دروازے کے باہری سرے سے بالکل قریب مالتی اور منی پلانٹ کی بیلیں تھیں جو گرِل کے سبز رنگ سے لپٹ کے اسی کا ایک حصہ محسوس ہوتی تھیں۔ فینسنگ کے کے پودوں کو تراش کر سلیقے سے برابر کیا ہوا تھا۔ اور درمیان میں اگائی ہوئی گھانس کا لان تھا۔ اور اس کے کنارے کنارے چائنیز گلاب کے پودے ـــــ لان میں کرسیاں پڑی تھیں۔ صبا کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

بھئی سلطانہ ـــــ بس یہ بیلیں مجھے اچھی لگیں۔

ارے بھئی پھولوں کو اپنے ملک کا ہونا چاہیے۔ بیلا، گلاب جوہی، یہ سب لگاتیں۔ اور گرمی کی راتوں میں ان کی خوشبوؤں سے سب کچھ مہک اٹھتا۔ دو ایک درخت لگواتیں۔ ہمارے یہاں گھر کا تصور آنگن کے بغیر، اور پھلواری کا تصور پھلدار درختوں اور سبزی ترکاری کی کیاریوں کے بغیر ادھورا ہوتا ہے جانتی ہو ہمارے کرائے کے گھر میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہم نے آم اور امرود کے درخت بھی لگا دیے ہیں شام کو احاطہ تو کیا پھولوں کی خوشبو سے پورا گھر مہک اٹھتا ہے ـــــ

مان لو تمہیں یکبارگی گھر چھوڑنا پڑا تو۔؟

او ـــــ اتنا میں مائنڈیڈ کون ہوتا ہے چھوڑنے کو تو ایک دن سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے آدمی چل پڑتا ہے۔ مگر پہچان کی جو لکیر چھوڑ جاتا ہے۔ وہ انمٹ ہوتا ہے

صبا نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔ اور مجھے اس کی اس بے فکری کے آگے اپنا آپ بہت چھوٹا اور لونا سا لگا۔ مگر عورت اور خصوصاً دولت مند عورت مات کھانے پر کچلی ہوئی ناگن سی بن جاتی ہے۔ میری حالت بھی ویسی ہی ہو رہی تھی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا میں ارجن کی طرح کا نشانہ کیسے بناؤں۔ پھر ہماری دیگر سہیلیوں کا ذکر نکل آیا۔ کون کہاں ہے ـــــ کیسی ہے ـــــ کیا کرتی ہے ـــ کس کے کتنے بچے ہیں ـــــ زندگی کی جنگ میں کون فتح یاب ہوئی ـــــ اور کس نے کس کے ہاتھوں مات کھائی ـــــ یہ ساری باتیں کرتے کرتے کتنا وقت گزر گیا کچھ احساس ہی نہ ہوا۔ بس ان تمام باتوں کے درمیان ایک ہی احساس میرے اندر کرنٹ کی طرح دوڑ رہا تھا کہ صبا آج بھی پہلے کی طرح نرم دل اور حساس ہے۔ آج بھی وہ اتنی ہی وسیع القلب ہے جتنی کہ پہلے تھی۔ اسے اپنی تمام سہیلیوں کے متعلق سب کچھ پتہ تھا۔ کیونکہ وہ ذہنی طور پر ان کے دکھ سکھ میں شریک تھی۔ کسی کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آواز دکھ سے بوجھل تھی تو کسی کی خوشیوں کا احساس اس کی آنکھوں سے چھلکا پڑتا تھا۔ خود اس کی اپنی ذات، اپنی زندگی کہیں بھی الزلو نہ تھی۔ وہ ان سب سے اوپر تھی۔ اور میں خود کو اس قدر نیچے محسوس کر رہی تھی کہ اس کی تمام تر شخصیت کو دیکھنے کیلئے خود لینا توازنے

کھوناپڑنا ______

ارے گیارہ بج گئے۔ چلو بھی سلطانہ ______ کھانا کھا لیا جائے صبح جلدی اٹھنا بھی تو ہے۔

وہ جمائی لیتے ہوئے اٹھتی ہوئی بولی۔ جیسے میزبان وہی ہو میں اسے لئے ہوئے اندر آئی۔ اور ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ زیدی کھانا کھا کر کمرے میں جا چکے تھے۔ نوکر نے کھانا سرو کیا۔ اور وہ بے تکلفی سے اپنی پلیٹ میں روٹی اور سبزی لے کر کھانے لگی۔

ارے صبا ______ یہ پراٹھے لو، یا چاول کھاؤ یہ شامی کباب بھی تمہارے لئے ہی بنوایا ہے۔ یہ میٹ لو ______ یہ سب پڑا ہے ______ میں ایک ایک چیز بڑھانے لگی ______

وہ مجھے روکتی ہوئی بولی ______

وہ تو میں دیکھ رہی ہوں ______ بس یہ ایک کباب لے لیا۔ اصل میں رات کو میں نان ویج نہیں کھاتی جانتی ہو نیند کو پرسکون ہونا چاہئے۔ اس لئے رات کو ہمیشہ ہلکا اور سمپل کھانا کھانا چاہیئے۔

اب میرے سامنے کوئی جواز نہ تھا۔ میں خاموشی سے زہر مار کرتی رہی۔ پھر میں اسے اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ جہاں دو پلنگ لگے تھے۔ مچھر دانی بھی گری ہوئی تھی۔ میں نے کہا ______

لو صبا ______ اس پر تم سو جاؤ۔ اس پر میں سوئی ہوں۔ رات میں باتیں کریں گے۔

ہاں ______ ہاں ______ ضرور ______

وہ بولی۔ اور مچھر دانی کے کنارے موڑنے لگی۔ میں نے بھی مچھر دانی موڑی۔ اور لیٹتی ہوئی بولی۔

اچھا صبا ______ اب اپنے شوہر کے متعلق بتاؤ۔ کیسے ہیں۔ کیسے کیسے شادی ہوئی۔ سسرال کہاں ہے

بھئی شادی عام ارینج شادی جیسے ہوتی ہے۔ ہوئی۔ سسرال الہ آباد کے ایک گاؤں میں ہے۔ تھوڑی بہت زمین ہے وہاں۔ ان کی تین بہنیں ہیں۔ دو شادی شدہ تھیں۔ ایک کی شادی ہم لوگوں نے کی۔ ساس، سسر ہیں نہیں۔ یہ اکیلے بھائی ہیں۔ مگر رشتے کے سارے لوگ اچھے ہیں اور ہم لوگوں کی بڑی اچھی انڈراسٹنڈنگ ہے۔ جب شادی ہوئی تھی تب انہوں نے نوکری شروع کی تھی۔ ایک تو یہ کہ تنخواہ بہت ہی کم۔ اور نئی شادی کے بعد تو بہت سارے شوق ہوتے ہیں جو آدمی پورے نہیں کر پاتا تو جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ اور پھر کالج چھوڑنے کے فوراً بعد ہی دفتر میں بیٹھ کر کام کرنے سے سوفوکیشن تو ہوتا ہی ہے۔ اس لئے شروع میں مجھے بھی کوفت ہوئی۔ یہ دفتر سے ایسا خراب موڈ لے کر آتے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں کیسے ٹھیک کروں۔ مگر دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو گیا۔

کیسے؟ میں نے پوچھا۔

جب ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا تو جیسے وقت ہمارا ہو گیا۔ اور اب تو ان کو اتنا کام کرنا پڑتا ہے کہ بالکل تھکے ماندے گھر آتے ہیں۔ اور پھر میری ادبی مشغولیت بھی تو ہے۔ لکھنا، پڑھنا، آرٹیکل فیئر کرنا۔ پوسٹ کرنا۔ ڈاک دیکھنا۔ ظاہر ہے جو وقت ملتا ہے وہ اسی میں کٹ جاتا ہے۔ پھر بچوں کے کام الگ ہوتے ہیں۔

تمہارے ہزبینڈ کو تمہاری مصروفیتوں پہ اعتراض نہیں ______

نہیں ______ بالکل ہی نہیں ہے ______ شروع میں یہ اندر سے چاہتے ضرور تھے کہ میری ادبی مشغولیت نہ ہو۔ لیکن چونکہ ہمارے اندر کوئی کنفیوژن یا کنٹراڈکشن نہیں رہا۔ اس لئے اب ان کو بھی اعتراض کی جگہ فخر ہے۔

اچھا سلطانہ ______ غضب کا نیند آ رہا ہے

گڈنائٹ ——

میں نے دیکھا اسے واقعی جمائی پر جمائی آرہی تھی۔

گڈنائٹ —— اور منٹوں میں گہری نیند سو گئی۔

مجھے بہت تعجب ہوا کہ نئی جگہ اور بدلے ہوئے بستر پر کیسے وہ اتنی گہری نیند سو گئی۔ جبکہ خود اپنے کمرے میں اپنے بستر پہ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔

میرے سامنے وہ سلطانہ آن کھڑی ہوئی جو صبا کی دوست تھی۔ جس نے صبا کے ساتھ مل کر اسکول کے ان گنت موقعوں پہ کلچرل پروگرامس دیئے تھے شرارتیں کر کے سزائیں پائی تھیں۔ اور کالج میں بھی دونوں کی دوستی مثالی مانی جاتی تھی ٹیوٹوریل کی تیاری سے لے کر اسپورٹس تک ہر مقابلے میں سلطانہ اور صبا یوں ساتھ ساتھ تھی کہ اکثر لڑکیوں کو کنفیوژن ہوتا کہ کہ سلطانہ صبا ایک ہی نام ہے اور اگر دو ہے تو پتہ نہیں کون سا نام کس کا ہے —— پھر آج چند برسوں کے فاصلے میں اتنی زبردست منفی قوت کہاں سے آ گئی کہ دونوں کے بیچ دو کناروں کا فاصلہ ہے۔ نہ جانے یہ وقت کا دریا کہاں سے بیچ میں آ گیا۔

نہیں —— یہ میں نہیں ہوں —— یہ کوئی اور سلطانہ ہے جسے وقت نے مسز زیدی کے فریم میں مصلوب کر دیا ہے —— حالانکہ یونیورسٹی کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد بہت سے رشتوں کے بیچ سے چھان پھٹک کے زیدی صاحب کا انتخاب ہوا تھا۔ تو وہ بھی بہت خوش تھی کہ وہ ایک لکچرر ہیں —— ظاہر ہے کالج کا یہ ماحول اس سے بالکل ہی نہیں چھن جائے گا۔ کالج کے ہنگامے، تقریبات اور اس کی مصروفیتوں کا ذکر گھر پہ بھی ہوگا۔ اور لکچرر تو بڑے زندہ دل اور بشاش طبیعت ہوتے ہیں۔ زیدی صاحب کے ساتھ زندگی کبھی بوجھ محسوس نہ ہوگی۔ کالج کے دنوں میں صبا کو شاعری، افسانہ نگاری اور مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ اس کی نظمیں خصوصی طور پر بڑی معیاری ہوتی تھیں۔ کالج میگزین میں ہم لوگوں کی تخلیقات چھپتی تھیں۔ اور دونوں ہی ایک دوسرے کی تخلیقات پر بے لاگ تبصرے کرتے —— میں اس لئے بھی خوش تھی کہ زیدی صاحب کی رفاقت میں میری تخلیقات کو اشاعتی ماحول ملے گا۔ اور میرے شوق کا پودا شاداب رہ سکے گا۔ اتفاق کی بات تھی کہ شادی کے دوسرے سال ہی مجھے بھی ایک گرلس کالج میں ملازمت مل گئی۔ زیدی صاحب کو سمجھنے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی کہ بے حس ہونے کی حد تک پلینڈ آدمی تھے۔ ابتدائی چند سال تک تو بچوں کی پیدائش کا سوال ہی نہ تھا۔ ہر چھٹیاں میں ہل اسٹیشن کے پروگرام بنتے۔ اور وہ یوں قاعدے کے ساتھ گھومنے نکلتے جیسے وہ بھی ان کی ڈیوٹی ہو۔ حد تو یہ کہ جتنے دن کا پروگرام ہوتا ان دنوں کو وہ پہلے ہی سے منقسم کر لیتے۔ کہ آج کہاں کہاں جانا ہے۔ کتنے بجے واپس آنا ہے وغیرہ۔ بجٹ کے بھی وہ بڑے سخت گیر تھے۔ کس شہر میں کب کس چیز کی مارکٹنگ کرنی ہے۔ سب پہلے سے طے رہتا۔ دھیرے دھیرے مجھے ان تقریبات سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس طرح زنجیروں میں جکڑے ہوئے دل اور ذہن کے ساتھ نئے شہروں کی نئی نئی چیزوں کو، تاریخی عمارتوں کو دیکھ کر بھی جیسے میں دیکھ نہ پاتی ذہن کی جکڑبندی مجھے کسی چیز کو محسوس ہی نہ کرنے دیتی —

پھر خواہ مخواہ کی تھکاوٹ اور فضول خرچی سے فائدہ بھی کیا۔ دھیرے دھیرے زیدی صاحب کی ڈومینیٹنگ پرسنالیٹی اس پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ وہ ہر معاملے میں دخل انداز ہونے اور وہ بھی قطعیت کے ساتھ۔ کون سی سبزی فائدہ مند ہے۔ اور کون سی نہیں۔ چائے پینی چاہئے یا نہیں۔ کس گریڈ کے مہمان کی کس طرح خاطر کرنی چاہئے۔ اور میں مجبوراً ان کی باتیں مانتے مانتے دل سے بھی قبولتی چلی گئی۔ یہ قاعدہ قانون اس طرح میری زندگی میں در آیا کہ میں کالج میں بھی اس کا خیال رکھنے لگی —— اسی لئے دو دن بعد پرنسپل

پرنسپل کی عزیز تر ہوتی گئی۔ اور جو پرنسپل کا عزیز ہوتا ہے۔ اس کی ذمہ داریاں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ اس لئے میرا زیادہ وقت کالج میں ہی بیت جاتا۔ پھر میں اپنے مسائل کا ذکر زیدی صاحب سے بھی کرنے لگی۔ زیدی صاحب بھی اپنے یہاں کی باتیں کرتے۔ دونوں کی سرکل ایک دوسرے سے متعارف ہوئی۔ اور یوں میرا گھر پالیٹکس کا اکھاڑہ بنتا چلا گیا۔ اسی طرح پانچ پانچ سال کے گیپ پر تینوں بچے ہوئے۔ بچوں کی پرورش آیا کے ہاتھوں ہوئی۔ اور جب یہ ذرا بڑے ہوئے تو زیدی صاحب نے بہتر تعلیم کے لئے انہیں گھر سے دور بھیج دیا۔ پھر مصروفیتوں کی نوعیت بدلنے کا سوال ہی نہ تھا۔ یہ مصروفیتیں دن بدن تہہ دار ہوتی گئیں۔ ہم دونوں نے اپنی بچت اسکیم کے تحت گاڑی، باڑی، ساڑی سب کچھ حاصل کرلیا۔ میں رشتہ داروں میں خوش قسمت ترین سمجھی جانے لگی شاید اس لئے کہ میں زیدی صاحب کے مزاج میں اس طرح رنگ گئی تھی کہ فطرت سے خلوص کا نام و نشان مٹ گیا تھا میں دوستوں اور دشمنوں سے یکساں انداز سے ٹریٹ کرتی جیسے کہ یہ سب کچھ اپنی مرضی کا مرنا جینا نہ ہو۔ اسٹیج کی اداکاری ہو حالانکہ اداکاروں کو پردہ گرنے کے بعد ریلیکس کرنے کی امید تو ہوتی ہے یہاں شب و روز کا پل پل ایک ہی جیسا تھا ۔ دوسروں کا اور صرف دوسروں کا ـــــ مگر نہیں ـــــ میں نے۔ اس سلطانہ نے تو سب کچھ پالیا ہے۔ شوہر کی توجہ ـــــ بچے ـــــ دولت ـــــ ہر دلعزیزی ـــــ

اس نے خود کو تشفی دینی چاہی۔

مگر کس قیمت پر۔ ایٹ دی کوسٹ آف سلف!

اور میں یوں اٹھ بیٹھی جیسے بستر پر کانٹے بچھے ہوں ـــــ سامنے صبا گہری نیند سو رہی تھی۔ آج بہت دنوں بعد میرا جی چاہا کہ اپنی نظموں کی ڈائری نکال کر پڑھوں میں دھیرے سے اٹھی اور اپنی الماری سے ڈائری نکال کر پڑھنے لگی ـــــ

خوابوں کے غالیچے یہ ـــــ نرم و نازک، مہکے مہکے لفظوں میں پروئی ہوئی نظم ـــــ خوابوں اور آرزوؤں کا ایک جہاں سمیٹے ہوئے ـــــ کیا یہ ساری خوابناک تمنائیں میری ہی ہیں۔

"دسمبر کی سسکیاں" انسانیت کا سارا درد سمیٹ کر گویا یہ نظم ایک کشکول بن گیا تھا۔ اور خدا کے روبرو اپنے سوال کے کے جواب کا طلب گار تھا کہ آخر یہ موسم کا بھیانک پن کیوں۔ کس کی سزا کے لئے۔ جب دنیا میں ایک جیسے لوگ نہیں بستے۔ ایک سے حالات نہیں ہوتے۔ کیا اسے یاد نہیں کہ فٹ پاتھوں اور جھونپڑیوں میں کیڑے مکوڑوں کی طرح جینے مرنے والے لوگ بھی اسی کی تخلیق ہیں۔

میں صفحے الٹتی گئی۔ اور جیسے جیسے ماضی بیدار ہوتا گیا۔ حال کی جکڑ بندیوں سے میں آزاد سی ہو گئی ـــــ اور تب میں نے غور کیا۔ دل کے اندر ایک اور جو دل ہوتا ہے۔ جو اپنا اور صرف اپنا ہوتا ہے۔ اس دل نے تو آج تک حال کی کسی بھی جھک ومک کو کبھی قبول ہی نہیں کیا تھا۔ وہ شاید نا آشنا کی دیواروں میں قید کے دن گزار رہا ہے۔ اور باہری دنیا سے اتنا ہی اجنبی ہے جتنا پہلے روز تھا۔ یہ بچے بھی، شاید پوری طرح اس کی ممتا جھنجھوڑ نہ سکے۔ شاید وہ ان کے لئے جو محبت تھی اس کی تڑپ کو میں خود ہی جذب نہ کر گئی کتنا فرسودہ خیال ہے کہ عورت جب ماں بن کر بچے کو جنم دیتی ہے تو وہ بچہ اس کی کل کائنات ہوتا ہے ـــــ شاید یہ لوگوں کو پتہ نہیں کہ جس مرد کو عورت کا دل پوری طرح قبول نہیں کرتا اس کے بچوں میں آئینے۔ میں اسے اپنی شکست کا عکس نظر آتی ہے ـــــ کبھی صورت و شکل میں، کبھی عادت و فطرت میں۔ تو کبھی لب و لہجے میں۔ شاید اسی لئے

زیدی صاحب نے بچوں کو اتنی دور بھیج دیا تو مجھے جو دکھ ہوا تھا اس میں وہ دلی کرب شامل نہ تھا جو جسم کو کسی حصے کو الگ کر دینے سے ہوتا ہے۔

شاید میں بی لیو یور سلف کرتے کرتے ایک مشینی پرزہ بن گئی ہوں۔

اگر میں اپنی نظموں کو اشاعت کے لئے ارسال کروں تو لوگ باگ کیا کہیں گے۔ یہ جو اتنی بڑی میری اور زیدی صاحب کی سرکل ہے یہ تو میرا مذاق اڑانے لگے گی کہ اب عمر کے اس موڑ پہ مجھے خواب نظر آنے لگے ہیں۔ اور پھر یہ جو احمد صاحب ہیں جن کا ایک ساتھ کئی طالبات سے معاشقہ چلتا ہے یہ تو صاف کہیں گے میری نظمیں گویا ایک طرح سے رومانی بلاوا ہیں میں فلرٹ کرنے لگی ہوں۔ کیا پتہ جھوٹی سچی کہانی گڑھ کے یہ بھی ثابت کر لیں کہ میں شروع سے ہی فلرٹ ہوں۔ یہ نگیٹیو طور پر ذہین لوگ جب کچھ نہیں کر پاتے تو دوسروں کو اتنی صفائی سے کیچڑ اچھالنے لگتے ہیں کہ خود ان کے دامن پہ ایک بھی چھینٹا نہیں پڑتا۔ اور بے قصور فرد سر سے پاؤں تک آلودہ ہو جاتا ہے ——

میں نے خود کو تشفی دینے کی ہر ممکن کوشش کی مگر میں "وہ میں" جو آج برسوں بعد بیدار ہوئی تھی مجھے جھنجھوڑنے لگی۔ —— کہ وقت اور افراد نے ہر فن کار کو مصلوب کیا ہے۔ ذوق کی جماعت اور صدر الدین کے آزردہ جیسے تو ہر دور میں ہوتے ہیں۔ پھر کیا غالب ان کی موت مر جاتا ہے کیا میں ان کے ڈر سے اپنے فن کا گلا گھونٹ دوں۔ میرے اندر آج بھی محسوسات کا ایک آتش کدہ ہے۔ اس کی آگ شاید کبھی بجھی نہ تھی۔ اس کے سمندر آج بھی میرے دل اور دماغ میں رینگ رہے ہیں۔ اس غیر فانی آگ سے جو کیڑے جنم لیتے ہیں وہ نام کے سمندر ہوتے ہیں۔ یہ سمندر صفت بھی ہوتے ہیں۔ فنکار کا سکون ان کے وجود میں ہے۔ ان سے فرار ممکن نہیں۔

میرے پاس خود کو ایکسپریس کرنے کے لئے آج بھی لفظوں کا آلبا ہے ——

مجھے محسوس ہوا جیسے مجھے زیدی صاحب سے بے پناہ نفرت ہے۔ وہی نفرت جو انگلیوں کی سختی بن کر گردن میں جذب بھی ہو سکتی ہے۔ یا پھر ضد میں آ کر مخالف سمت میں چلتے چلتے تھک کے گر بھی جاتی ہے —— آخر یہ سارے انٹلکچوئل عورتوں کا مقدر کیوں ہوتا ہے کہ انہیں عادت اور فطرت سے ہی نہیں، دل اور دماغ سے بھی، لب و لہجے سے بھی، پسند و ناپسند سے بھی، اس آدمی کے رنگ میں رنگ جانا پڑتا ہے۔ جو اسے کسی طور پر گوارا نہیں ہوتا ہے —— یہ زیدی صاحب نے ہی ٹوک ٹوک کے، اعتراض کر کر کے، مجھے اپنے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔

شاید میں خود کو دھوکہ دے رہی تھی۔ خود فریبی کی برساتی میں میں نے خود کو اس طرح چھپا لیا تھا کہ سلف کے برستے ہوئے شفاف قطرے مجھے چھو نہ سکے تھے۔ مجھے احساس بھی نہ ہو سکا کہ زیدی صاحب کی پازیسو (POSSRIUE) فطرت مجھ سے کیا کچھ چھینتی جا رہی ہے۔ جیسے ان دنوں مجھے خود بھی ڈرائنگ روم کی شوکیس بننا اچھا لگتا تھا۔

جب میں زیدی صاحب کے دوستوں کی ریمارکس سنتی۔

"مسز زیدی بہت ہی ویل مینرڈ ہیں!"

"مسز زیدی کی مہمان نوازی مسلم کلچر کا سمبل ہے۔"

"زیدی صاحب بہت لکی ہیں۔ ان کی بیوی گھر کو آئینہ خانے بنائے رکھتی ہے۔"

لیکن مجھے احساس ہی نہ ہو سکا کہ کیسے کیسے گفتگو کی تہہ داری، میری شخصیت کی پیچ و خم سے الجھی پھیلی گئی ہے یہ گھر شاید میرا اپنا ہوتے ہوئے بھی میرا اپنا نہیں ہے —— یہاں میری مرضی کا کیا ہے۔ نہ پھول ہے نہ گملے —— نہ دیوار کی رنگ نہ پردے کی پرنٹ —— نہ فرنیچر کی

سٹنگ نہ گھر کے مکین ــــــ دراصل میں یہاں ایک طرح سے ہاؤس اریسٹ ہوں۔ یہ ایک دائرہ ہے جس کے باہر میرا ذہن تک نہیں پہونچ سکتا ــــــ فرق یہ ہے کہ سیتا کو تو راون کھینچ لے گیا تھا اور یہاں راون ہی مجھے دھکے مار کر دائرے کے اندر کر گیا ہے۔ میری اپنی کون سی پہچان ہے ـ صبح کی بیڈ ٹی کے بعد سے ہی آنے والوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جبکہ مجھے صبح سویرے اٹھ کر ننگے پاؤں بھیگی بھیگی گھانس پر چلنا جی جان سے پسند تھا۔ اور تب میں محسوس کرتی تھی کہ بیداری کا احساس میرے اندر دور تک رچ بس گیا ہے۔ یوں ٹہلتے ٹہلتے کتنے ہی خیالات دل کے ساحل سے بے کل موجوں کی طرح ٹکراتے، اور کبھی کبھی کوئی بہت ہی اچھوتا خیال اپنے اظہار کے لئے پیکر تراش لیتا۔

اور اب بس صبح ہوتے ہی ڈرائنگ روم ارینج کرو زیدی صاحب کو صفائی خبط ہے۔ آج کی چادر ــــــ پردے ــــــ غلاف ــــــ میز پوش کچھ بھی دوسرے دن استعمال نہیں ہو سکتے۔ جلدی جلدی سب کچھ بدلو غسل سے فارغ ہو کر بال بناؤ۔ اپنے کو تیار رکھو۔ حالانکہ پہلے میں چھٹیوں کے دن سارا سارا دن قصداً بال کھلے چھوڑ دیتی۔ کسی دن موڈ ہوا تو جوڑا بنا لیا۔ ورنہ دن بھر بال بکھرائے گھوما کرتی۔ اکثر بستر پہ لیٹے لیٹے کتابیں پڑھتی۔ یا کبھی صرف اپنی پسند کے ریکارڈ سنا کرتی۔

مگر اب دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک پل بھی میرا نہیں۔ جسے میں اپنے لئے استعمال کر سکوں۔

سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ کہ صبح صبا نے بیدار کیا۔

اب اٹھو بھی ــــــ کب تک سوتی رہو گی ــــــ دیکھو میں تیار ہو گئی ہوں۔ تمہاری بوا سے چائے بنوا کر پی لی ہے ــــــ کیونکہ مجھے آج ہی فنکشن والوں کے یہاں جانا ہے

آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور بوجھل آواز سے پوچھا ــــــ

اتنی صبح کیوں ــــــ ؟

وہ ہنس پڑی ــــــ

فار، فار منیٹی ــــــ مجھے آج وہیں ٹھہرنا پڑیگا جہاں لوگوں نے انتظام کیا ہے۔ کیونکہ سمینار تو آج ہی ہے نا ــــــ اور آج ہی رات کی ٹرین سے چلی جاؤں گی۔ کیونکہ کل سے ٹیلو کا ٹرمینل ہے۔ اچھا، بائی

اور بے خیالی میں میرے منہ سے نکلا۔ خدا حافظ!

میں متحیر سی اسے دیکھتی رہی ــــــ معاً میری نظر گھڑی پہ پڑی۔ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی ــــــ تکیئے کے پاس ڈائری پڑی تھی۔ اسے جلدی سے الماری میں ڈالا۔

اور خود کو مشینی انداز سے مصروفیتوں کے اس اژدہے کے منہ میں جھونک دیا جو منہ کھولے میرا ہی منتظر تھا۔ ●

بقیہ :- لسانیات کی افادیت و ضرورت

کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر کوئی باشعور آدمی ہندی کی بابت یہ فیصلہ قائم کرے کہ ہندی اردو کی شیلی ہے تو ہندی والوں کے دلوں میں کیا گذر سکتا ہے ؟ ـ یہ ان حضرات کو ہی اچھی طرح محسوس ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے تمدن کش اور ضمیر و قوم فروش لوگوں کو مکتب لسانیات کی ابتدائی کلاس میں فوراً داخل لینا چاہیئے کہ اس مکتب میں حقیقت و اصلیت پر اعتماد و ایمان رکھنے والے اساتذہ نظریات ہی برسر روزگار ہیں۔

بہر کیف ! اخیر میں یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ دور حاضر میں لسانیات کی اہمیت و ضرورت کے پیش نظر اس کی تو سیع و ترویج کو عام کرنے سے بہت سارے مغالطے دور ہو سکتے ہیں۔ ●

نسیم ستر گھی
(پاکستان)

کھلونا چاک اور کمہار

چاک پہلے آہستہ آہستہ گھوما۔ پھر اس کی رفتار بڑھ گئی۔ گیلی مٹی کے تودے کی شکل آہستہ آہستہ تبدیل ہونا شروع ہوئی۔ پھر اس نے ایک کھلونے کی شکل اختیار کی۔ چاک کی تیز رفتاری سے کھلونا تیار ہوتا اور چاک سے الگ ہو جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینکڑوں کی تعداد میں نئے کھلونے چاک کے ارد گرد زمین پر پھیل گئے۔ وہ سب کے سب خوب صورت نہ تھے۔ ان میں سے کچھ بھدے اور بدصورت کوئی ٹیڑھا کوئی بڑا تھا۔ سورج کی گرمی سے وہ اس قدر سوکھ گئے کہ ان کا وزن کم ہو گیا۔

پھر یوں ہوا کہ ایک اندھیری رات میں ایک طوفانی آندھی آئی۔ تیز ہوا کے جھکڑوں نے ان کھلونوں کو مکینوں کے گھروں تک پہنچا دیا۔ صبح کو جب گاؤں والوں نے اپنے اپنے گھروں میں یہ کھلونے دیکھے۔ تو وہ سب کے سب حیرت زدہ ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے سے اس طرح کہنے لگے۔

"رات کا طوفان شاید یہ ہی لے کر آیا تھا"۔ ایک بولا۔

"یقیناً کوئی اور آفت آنے والی ہے"۔ دوسرے نے کہا۔

"ہمیں ان کو توڑ دینا چاہیے"۔ تیسرا بولا۔

"ان کے بنانے والے کو تلاش کیا جائے"۔ چوتھے نے کہا۔

"جب یہ ہمارے گھروں میں داخل ہوئے تو ہمارے ... گائے، بھینسوں نے چارہ کھانا چھوڑ دیا"۔ پانچواں بولا۔

"ہاں! ہمارے کتے اور بلیاں ان سے خوف زدہ ہیں"۔ چھٹے کی آواز تھی۔

"تعجب تو یہ ہے کہ رات کی تیز آندھی میں یہ کھلونے ہمارے گھروں میں گرے اور ٹوٹے نہیں"۔ ساتواں بولا۔

آخر کار سب نے مل کر یہ طے کیا کہ ان کا بنانے والا کوئی کمہار ہوگا۔ جو ان کو بنا کر کہیں چھپ گیا ہے۔ اس کمہار کو تلاش کیا جائے وہ سب کے سب کمہار کی تلاش میں نکل پڑے۔ گاؤں کا چپہ چپہ چھان ڈالا۔ لیکن کمہار کہیں نظر نہیں آیا ——— جب وہ اپنی آبادی سے کوسوں فاصلے طے کر چکے۔ تو انہیں ایک جنگل نظر آیا جس کے درخت پر بندر بیٹھے تھے۔ جن کی دم لمبی اور منہ سیاہ تھے۔ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ لگا کر جا رہے تھے ان بندروں کو دیکھ کر وہ کچھ خوف زدہ ہوئے۔ لیکن ڈرتے ڈرتے انھوں نے جنگل عبور کر لیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد انہیں بڑی بڑی پہاڑیوں کے ٹیلے نظر آئے۔ آس پاس پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ آگے چل کر انھیں ایک میدان نظر آیا جس کی مٹی کالی تھی۔ جہاں تک نظر جاتی۔ سیاہی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ قریب ہی پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ تھا جس کا پانی ایک جھیل کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جھیل کے قریب کچھ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پڑے تھے۔ جنھیں دیکھ کر وہ سب کے سب وہیں ٹھہر گئے۔ اور آپس میں یوں باتیں کرنے لگے ———

"یہی وہ چاک ہے جس سے وہ کھلونے بنائے گئے ہیں"۔ ایک شخص کی آواز۔

"ہاں! اگر ان کے سب ٹکڑوں کو جوڑ دیا جائے۔ تو گول ہو جائے گا"۔ دوسرے کی آواز۔

"مگر اب تو یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا"۔ تیسرے کی آواز۔

"ہو سکتا ہے کہ کمہار بھی یہیں کہیں ہو"۔ چوتھی آواز۔

"اگر ہوا بھی تو ہمیں کس طرح پہچان ہو گی کہ یہ کمہار ہے

نسیم سترکھی
(پاکستان)

بزنس سنٹر

وہ سب کے سب ایک ساتھ گردش کرنے لگے ۔ نوں نے اپنے ننگے جسموں کو چادروں سے لپیٹ رکھا تھا ۔ گردش تے کرتے وہ ہاتھوں کو اوپر اٹھاتے رہے ۔ پھر سب کے سب ند مقامات پر چڑھ کر ڈھیلے برسانے لگے ۔ ان میں سے ہر ک ڈھیلے مار کر خوش ہو رہا تھا ____ پھر سب نے چھریاں ٹھائیں ، بے زبان جانور چیخے چلائے لیکن کچھ نہ ہو سکا ____ ن کی آن میں پہاڑی کا دامن لہو لہان ہو گیا ____ دیکھتے ی دیکھتے ان کے خیموں میں آگ لگ گئی ____ سامان جل یا کچھ وہ بھی جل گئے ____ فائر بریگیڈ نے آگ پر قابو یا ____ لیکن وہ یہی کہتے رہے ____ ہوا کا رخ پھر گیا ____ ہوا کا رخ پھر گیا ____

اس شہر سے آیا ہوا ایک شخص میرے پاس بھی آیا ۔ ور مجھ سے آتے ہی اس نے کہا ۔

"لو اس کو کھا لو ____ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔"

یہ ان کا پہلا ذریعہ تھا ____ یہ میرے پیٹ میں یڑے پیدا کرے گی ۔ میں روٹی کھاتا ہوں ۔ جو میرے جسم کو انائی پہونچاتی ہے ۔

میرے اس جواب سے اس شخص کے ہونٹوں کی حرکت اور تیز ہو گئی ۔ اس کی انگلیاں گول چمکیلے دانوں پر پڑنے لگیں ۔ جو ایک دھاگے میں پروئے گئے تھے ۔ گول دانہ جب انگلیوں کے ذریعے نیچے کھسکتا اس کے ساتھ ہی اس شخص کے ہونٹ ملتے ____ اس نے آہستہ سے اپنے تھیلے سے ایک بوتل نکالی گلاس میں اس کا پانی انڈیل کر میرے سامنے رکھ دیا ۔

"اسے پی لو ____ کوئی بیماری قریب نہیں آئے گی تمہاری ہر مصیبت دور ہو جائے گی ۔"

یہ ان کا دوسرا ذریعہ تھا ____ بات کچھ یوں ہے کہ میرے کنوئیں کا پانی زیادہ اچھا ہے لیکن اس پانی کے گرد لاکھوں افراد جمع ہو کر اپنی بیماریوں کے جراثیم اس میں شامل کر دیتے ہیں ۔

میرے یہ الفاظ سن کر وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا ۔ اس کی آنکھیں میرے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں ۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی شے کو تلاش کر رہی ہیں ____ جب اس نے سامنے دیوار پر لٹکے ہوئے کلنڈر کو دیکھا جس میں غار کے اندر بیٹھا ہوا برہنہ شخص گوشت کے ٹکڑوں کو دانتوں سے نوچ رہا تھا ۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لیں ۔ اور تھیلے میں دبا ہوا ایک ٹکڑا آگے بڑھا دیا ۔ جو تقریباً چار فٹ لمبا اور دو فٹ چوڑا تھا ۔

"کیا اس کو بھی نہیں لو گے ؟" ٹکڑا بڑھاتے ہوئے ۔

یہ ان کا تیسرا ذریعہ تھا ____ دراصل قصہ یہ ہے کہ اٹھتے بیٹھتے مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے ۔ خصوصاً جب میں داہنے پیر کے پنجہ پر انگلیوں کے سہارے بیٹھتا ہوں تو پنجہ میں تکلیف ہونے لگتی ہے ۔ جبکہ اس میں ریڑھ کی ہڈی ،

ـیں میں وارد ہونے لگتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ عمل ایک
ـتا اور جلدی کرنا پڑتا ہے۔

"یہ تمہیں ضرور لینا ہوگا۔ اس کو پڑھو تمہاری سمجھ میں
ـب کچھ آجائے گا"۔

یہ ان کا چوتھا ذریعہ تھا ——— میں نے
ـر لیا ہے اس میں وہی سب کچھ لکھا ہے جو اس عہد میں
ـا تھا۔ اس میں تیس چھوٹی بڑی کہانیاں ہیں۔ جو اپنے
ـر کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ کچھ سنی سنائی
ـیں ہیں۔ کچھ راوی نے خراب اور کچھ عجیب و غریب نستلیاں

"تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ
ـیں آتا۔ بار بار جو تم یہ پہلا ذریعہ یہ دوسرا ذریعہ
ـراتے ہو اس کا کیا مطلب ہے"؟ اس نے سخت لہجہ میں کہا

"ہر بات کا مطلب سمجھایا نہیں جاتا۔ جو لوگ وضاحت
ـتے ہیں وہ جھوٹے کہلاتے ہیں"۔

"اچھا ——— اب میں سمجھا جو تم کہنا چاہتے ہو
ـر یہ سوچ کر نقار خانے میں طوطی کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے"۔

"یہ ٹھیک ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ جیومیٹری کے
ـیک پوائنٹ پر بہت سی لائنیں آکر ملتی ہیں۔ اور اسی پوائنٹ
ـے اطراف میں پھیلتی ہیں۔ لائنز Lines کے مقابلے
ـیں پوائنٹ کی عبارت کم ہوتی ہے"۔

میرے اس جملے کو سنتے ہی وہ شخص اٹھ کھڑا ہوا۔
ـصہ میں وہ اپنا سامان بھی بھول گیا ——— پھر یوں ہوا
ـہ ایک عرصہ دراز کے بعد خبر آئی کہ وہ شخص مر گیا۔ مجھے اس کے
مرنے کا احساس تھا۔ کیونکہ وہ صرف شخص ہی نہ تھا۔ بلکہ میرا
باپ بھی تھا۔ مجھے اپنے باپ کی یاد آئی۔ ایک دن میں نے
اس کا صندوق کھولا۔ تمام سامان پر کیڑے رینگ رہے تھے●

بقیہ:- کھلونا چاک اور کمہار

پانچویں آواز۔

"اب کمہار کی تلاش بیکار ہے۔ ہمیں اپنے اپنے گھروں کو واپس چلا جانا چاہئے"۔ چھٹی آواز۔

"ہم اتنی دور نکل آئے ہیں کہ ہماری واپسی مشکل ہوگئی ہے"۔ ساتویں نے کہا۔

ساتویں شخص کی آواز پر وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر وہ اپنی واپسی پر آمادہ ہوگئے۔ اب جو انہوں نے راستہ اختیار کیا وہ پہلے راستہ سے مختلف تھا۔ کچھ سفر انہوں نے پیدل طے کیا۔ آگے چل کر انھیں اونٹوں کا ایک قافلہ ملا۔ وہ بھی اونٹوں پر سوار ہو کر اپنی منزل کی جانب بڑھے۔ ان کے راستہ میں ایک بہت بڑا دریا حائل ہوگیا۔ میر کارواں نے آگے جانے سے انکار کردیا۔ پھر انہیں کشتیوں کے ذریعہ یہ دریا پار کرنا پڑا۔ دریا کے کنارے بہت بڑا شہر آباد تھا جس میں عالیشان مکانات، پکی سڑکیں بنی ہوئی تھیں۔ اور کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ یہاں انھیں اپنا سفر تیز رفتار بسوں کے ذریعہ طے کرنا پڑا۔ بسوں نے ان سب کو لے جا کر ایک سنسان سرحد پر چھوڑ دیا۔ یہ سرحد کئی ہزار میل لمبی چوڑی تھی۔ مدتوں پیدل چلنے کے بعد یہ سب اپنے اپنے گھروں کو پہونچ گئے۔ گھروں میں پہونچ کر جب ان کی نظریں کھلونوں پر پڑیں تو ہر کھلونا ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا●

شام بارکپوری

اجنبی جزیرہ کا مسافر

نیرنگ اور طلسمات کی یہ سرزمین قدرت کے حسین نظاروں کا مرقع ہے اس نے نیلگوں آسمان کی طرف سر اٹھا کر گہری سانس لی۔ سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو میں اسے اپنائیت محسوس ہوئی۔ سر پر سورج چمک رہا تھا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔ وہ لمبی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ کندھے پر جھولا لٹکائے تیز تیز قدموں سے پگڈنڈی پر چل پڑا۔ جس کے دونوں جانب دھان کے سرسبز کھیت لہلہا رہے تھے۔ اودے اودے بادل ——— جھومتے ہوئے ناریل ——— سپاری کے درخت ——— سبزہ زاروں کا لامتناہی سلسلہ ——— جیسے کسی نے سبز مخملی قالین زمین پر بچھا دیا ہو۔ ساتھ ہی تند و تیز ندی روانی کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ سرکش موجیں کنارے سے ٹکرا رہی تھیں۔ سبک خرام ہوا جب سنہری بالیوں سے اٹکھیلیاں کرتی تو فضا میں نغمہ سا بکھر جاتا۔ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے گل مہر کے درخت قدرت کے شاہکار تھے۔ جس کے سرخ سرخ پھول یاقوت کی شعاعیں بکھیر رہے تھے۔

ایک تناور درخت جڑ سے اکھڑ کر گر گیا تھا۔ گذری ہوئی آندھی اپنے پیچھے یہ سرنگوں درخت چھوڑ گئی تھی۔ جس کے پاس چند بے فکرے بیٹھے آپس میں محو گفتگو تھے۔ جھریاں پڑے چہرے بھی تھے۔ مایوسی کی پھیلی ہوئی شکلیں بھی تھیں۔ شاہراہ زندگی کے تمام جاندار اپنے مسائل پر سر جوڑے غور کر رہے تھے۔

وہ پریشان حال الجھے ہوئے بال، سفید کرتے پائجامے میں ملبوس، وہاں سے گذرا۔ اسے دیکھ کر ان کی باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ان میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ وہ حیران و پریشان کھڑا ——— انہیں پریشان ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کی موجودگی ان کے لئے تحیر کی باعث تھی۔ وہ خوش شکل اور صحت و تندرستی کا پیکر تھا۔ اس کی آنکھوں سے دانائی ٹپک رہی تھی۔ اس کے گٹھے ہوئے مضبوط بازو سے محنت کش ہونے کا اندازہ ہوتا تھا۔

"بھائی میری غیر متوقع آمد سے آپ لوگ متفکر کیوں ہیں؟" اس نے بے جھجک پوچھا۔

"آپ کا لب و لہجہ اور طرز لباس ہمارے لئے اجنبی ہے" ایک ضعیف شخص نے کہا۔

"میری زبان، رنگ و نسل، لباس اجنبیت نہیں بلکہ میری موجودگی میرے اجنبی ہونے کا زیادہ احساس دلا رہی ہے" وہ دھیرے سے مسکرایا "کبھی آپ لوگوں نے اس بات پر غور کیا کہ میں بھی آپ لوگوں کی طرح ایک انسان ہوں"

"آپ میں اور ہم لوگوں میں بڑا فرق ہے"، ادھیڑ عمر کے شخص نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"اللہ تعالیٰ نے جس مٹی سے آپ لوگوں کی تخلیق کی میں بھی اسی مٹی کا پیکر ہوں"

"اس سرزمین کی مٹی دوسری جگہوں کی بہ نسبت مختلف ہے"۔ تیسرا شخص جیسے تفکرات کے گہرے غار سے نکلا۔

"یہ سرزمین بھی خدا کی بنائی ہوئی ہے"۔ اجنبی زیر لب مسکرایا "مجھے بھی اس دھرتی اور یہاں کے لوگوں سے پیار ہے"

"اگر ہر شخص اس دھرتی پر اپنا حق جتانے لگے۔ تو ہماری کیا حیثیت ہوگی"؟ نوجوان کے تیور سے طیش کے آثار ظاہر

" زمین کا خالق وہی ہے جس نے تخلیق کائنات کی ۔ اس نے کسی کو حاکمیت کا اختیار نہیں دیا ۔ انسان وطنی اور جغرافیائی حدیں بنالیں"۔ اجنبی سنجیدگی سے بولا ۔ "اگر ایک فرد کے رہنے سے زمین زیر و زبر نہیں ہو جائے گی ۔ مختلف علاقوں میں مختلف نسلیں بستی ہیں ۔ پھر وہاں خلط ملط سے ایک قوم بنتی ہے ۔ جبکہ ہم ایک ہی خون، رسم و رواج، تہذیب اور مذہب سے منسلک ہیں ۔ جو مشرق کے ریگ زاروں سے اٹھے ہیں"۔

" اس سرزمین کی مٹی سے اگا ہوا پودا اپنا الگ رنگ و بو رکھتا ہے"۔ ادھیڑ عمر کے شخص کی جوشیلی آواز ابھری ۔

" میرے بھائی، زمین و آسمان ندی، نالے، کھیت پہاڑ ـــــــ سب قدرت کے پیداوار ہیں"۔

" مگر یہاں کی آب و ہوا سبھوں کو راس نہیں آسکتی"۔ پانچواں شخص کا لہجہ سخت تھا ۔

" جب زمین کی تخلیق اللہ نے کی ہے تو پھر دوسروں کے قدم پڑنے سے دھنس نہیں جائے گی"۔ اجنبی نے احتجاج کیا ۔

" بے شک ۔ آپ کے نقش قدم سے یہاں کی مٹی پر جو چھاپ پڑے گی اس سے مادر گیتی کا چہرہ مسخ ہو جائے گا"۔ نوجوان دلائل کا قائل نہ تھا ۔

" میں تو یہاں زندگی کو ایک نئے ڈھنگ سے گزارنے آیا ہوں ۔ میری آمد سے یہاں ترقی کے راستے کھل جائیں گے ۔ کھیتوں میں ٹریکٹر چلا کر پیداوار بڑھاؤں گا ۔ پمپ لگا کر آب پاشی کا نظام بہتر بناؤں گا ۔ تاکہ ایک سنہری دور کا آغاز ہو"۔ اجنبی کے چہرے پر درخشاں مستقبل کا پرتو تھا ۔

" ہمیں سبز باغ دکھانے کی ضرورت نہیں ۔ آپ کی خمیر اس مٹی کی نہیں ۔ آپ کی آمد سے یہاں کا قدرتی حسن ماند پڑ جائے گا ۔ سبزہ زاروں کی رعنائی پھیکی پڑ جائے گی ۔ اور ہمارے کھلیانوں میں آگ لگ جائے گی"۔ مایوسی کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں ۔

" آپ زندگی کو [illegible] بیڑیوں [illegible] ہیں ہمیں ہنرمند اور ترقی یافتہ ہوں ۔ اپنے ساتھ زر کثیر لایا ہوں ۔ آج اس ندی میں کشتیاں چل رہی ہیں ۔ کل یہاں لانچ اور اسٹیمر چلیں گے"۔

" آپ کے اس منصوبے سے ہماری اصلیت کھو جائیگی ہم یہاں کی مٹی پر آپ کے قدم جمنے نہیں دیں گے"۔ اس کے مزاج میں تندی پیدا ہو گئی تھی ۔

" آپ لوگ بھی ہمارے جیسے انسان ہیں ۔ آپ اور ہم قدم مل کر کیوں نہیں چل سکتے"۔؟ اس کے احساسات کی گنبد میں اجنبی کا پیغام گونج رہا تھا ۔

" آپ یہ درخت دیکھ رہے ہیں"۔ پانچویں آدمی نے گرے ہوئے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ ایک ایسا درخت ہے جو پھلوں سے بھرا پڑا تھا ۔ اور کل آندھیوں کی زد پر آ کر گر پڑا"۔

" یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ گرے ہوئے درخت کا پھل کھا رہے ہیں"۔ اجنبی کے جملے سے آئینہ گر پڑا ۔ جس میں ان لوگوں کے خد و خال نمایاں تھے ۔

" اس پھل کے درخت کو ہمارے خون نے سینچا تھا ۔ اس کا پودا بہت دور سے لاکر لگایا گیا تھا ۔ مگر اس کی جڑیں یہاں کی مٹی میں پیوست نہ ہو سکیں ۔ اس لئے ہوا کے تیز جھونکوں سے گر پڑا ۔ کوئی بھی بیرونی چیز یہاں کے لئے کارآمد ثابت نہیں ہو گی"۔ انتباہ کی گونج سنائی دے رہی تھی ۔

یہ ضروری نہیں ہے ۔ آپ لوگ چاروں طرف سرخ سرخ پھولوں سے دھکا ہوا گل مہر کا درخت دیکھ رہے ہیں ۔ جسے یہاں کرشنا چوڑا کہا جاتا ہے ۔ سینکڑوں سال قبل دور دراز کے علاقوں سے لاکر لگایا گیا تھا ۔ آج ہر طرف اس کی سرخی سے رنگ و نور کا سیل رواں ہے"۔

" یہ ایک قصۂ پارینہ ہے ۔ اب وقت اور زمانہ بدل گیا ہے"۔ چھٹا آدمی جیں بہ جبیں ہو کر بولا ۔

" کوئی سرزمین اپنی تاریخ سے انحراف نہیں کر سکتی ۔ انسانوں کا ذہن جغرافیائی حد بندیاں کر دیتا ہے مگر تاریخ

کی جڑیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں۔ کہ زمان و مکان کی تبدیلی کے باوجود اس کے آثار باقی رہ جاتے ہیں۔ اکثر تاریخ کی باتیں صرف کتابوں میں رہ جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ قومیں اور تہذیبیں بدل جاتی ہیں ـــــ۔ اور حال اپنی سچائی کا کرشمہ دکھاتا رہتا ہے۔"

"اگر انسان صرف حال کو مدنظر رکھے۔ تو پھر مستقبل کے بارے میں کون سوچے گا۔"؟

"آنے والے دن کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔"

چوتھے شخص نے بے پروائی سے کہا۔

"مستقبل کے لئے ایک لائحہ عمل ضرور بنانا چاہئے۔ ورنہ حال کے دلدل میں پھنس کر انسان ڈوب جاتا ہے۔"

"آپ کی دوربینی اور تحلیل نفسی کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوگا" دوسرے آدمی نے کہا۔ "آپ کھڑے کھڑے تھک گئے ہوں گے کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھ کر سستا لیں۔"

یہ کہکر اس نے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ اپنا تھیلا رکھ کر ان کے ساتھ گھاس پر بیٹھ گیا۔

ایک شخص پان کھا رہا تھا۔ اس نے پان کھانے کو بڑھایا۔ اجنبی پان چبانے لگا۔ اس کی زبان کٹ گئی۔ شاید پان میں چونا کچھ زیادہ تھا۔

"آپ ہمارے لئے ترقی اور خوشحالی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ دریا کا دوسرا کنارہ کافی شاد و آباد ہے۔ انہوں نے ہمارے کھیتوں سے اپنا کھلیان سنبھالیا ہے۔ ہمارے کھیتوں میں بھوک اگی ہوئی ہے۔"

"یہ صرف آپ لوگوں کے سوچنے کا انداز ہے۔ گمراہی کے راستے پر چلنے سے زندگی کی حقیقی منزل نہیں ملتی۔"

"لغو"! چوتھا شخص جز بز ہوکر بولا۔ "دریا کے دوسرے کنارے کے باسی ہماری ندی سے مچھلیاں پکڑا کرتے ہیں۔ ہم کشتیاں اور جال لے کر خالی ہاتھ واپس آتے ہیں"۔

"غلط بیانی سے گمراہی پھیلتی ہے۔ سچائی آئینہ کی طرح ہوتی ہے۔ دریا میں سبھوں کو مچھلی پکڑنے کا حق ہے۔ اپنی محنت اور لگن سے جال میں مچھلیاں آتی ہیں۔"

"آپ لوگوں کی آمد سے ہماری زندگی میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ آپ لوگوں کے استحصال سے ہماری جھونپڑیوں پر پچھلے نے اپنا سایہ ڈال دیا ہے۔"

"یہ بدگمانی ہے۔ ہم بھی آپ لوگوں کو زندگی کی دوڑ میں آسودہ اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"مبالغہ سے ہمارا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ آپ لوگوں کی اجارہ داری اور غلامی سے ہم تنگ آچکے ہیں۔ ہمارے مسئلہ کا واحد حل آزادی ہے۔" چھٹا آدمی جوش میں بولا۔

"قنوطی اور محروم قوم استحصال کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ آزادی پھل کھانے کی آرزومند ہوتی ہے۔ پھر پھل چکھتی ہے تو تلخی کا احساس ہوتا ہے"۔

"انسان کے اندر ایسی حیوانی صفت پائی جاتی ہے۔ کہ خود کو تو وہ آباد دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر جب محکوم قوم آزادی کی تمنا کرتی ہے۔ تو اسے بھیانک خواب کی تعبیر قرار دیتا ہے۔ تاکہ ہمیشہ حاکم بن کر محکوم قوم کے پیروں میں غلامی کی بیڑیاں ڈال رکھیں"۔

"جب ایک قوم غلامی کا طوق اتار پھینکتی ہے۔ اور آزادی کا سانس لینے لگتی ہے۔ تو خود اس کے اندر اپنے سابقہ حاکموں کی سی خصلت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے بھائیوں کی آبادی برباد کر دیتی ہے"۔

"ہم اپنی زمین پر اپنی حاکمیت تسلیم کرتے ہیں۔ آپ کو اس سرزمین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ کا قدم ہماری مٹی پر رہے گا۔ اور نظریں ندی کے اس پار۔" چھٹے شخص نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ کو اس سرزمین پر رہنے کا حق نہیں پہونچتا۔ اور نہ یہ مٹی راس آئیگی"۔

اجنبی گمبھیر ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اداسی کے سائے لہرانے لگے۔ اس کے وطن کی اپنی کوئی سرزمین نہ تھی۔ وہ چوبیس سال سے بھٹک رہا تھا۔ وہ جس سرزمین پر قدم رکھتا، تنگ ہو جاتی۔ اس دنیا میں سبھوں نے حصے بخرے کر کے اپنی اپنی زمینیں بانٹ لی تھی لیکن اس کے لئے زمین کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا جس پر وہ قدم جما سکتا۔ قدرت نے آدم و حوا کو تخلیق کر کے اتنی بڑی دنیا ودیعت کر دی تھی۔ مگر اس دنیا میں لٹے ہوئے کارواں کے لئے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یہ عقدہ اب تک حل طلب تھا کہ تخلیق آدم پہلے ہوئی، یا تخلیق کائنات۔ ؟ اگر دنیا نہ ہوتی تو انسان نہ آتا۔ اور انسان نہ آتا تو وہ یہاں اجنبی نہ ہوتا۔

خدا نے ہر انسان کو رہنے کے لئے دنیا تخلیق کی تھی۔ مگر انسانوں نے اس زمین کے حصے بخرے کر لئے۔ آپس کے لوٹ کھسوٹ میں اب تک اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کہ زمین کا اصلی وارث کون ہے؟۔

اجنبی نے حسرت بھری نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھا۔

وہ لوگ بھی بے تعلقی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

اس نے بڑے تحمل سے کہا۔ "میں تو اب ایسے جزیرے میں ہوں جس کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟"

"ہمارا یہ فیصلہ ہے، جتنی جلدی ممکن ہو یہاں سے چلے جاؤ تمہارا وجود ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے" چھپے آدمی نے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

وہ ڈگمگاتے قدموں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جس پگڈنڈی سے آیا تھا۔ اب وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

میرا راستہ مسدود ہے۔ دوسری طرف سے اب کسی اسٹیمر کے آنے کی امید نہیں۔ اجنبی نے سہم کر آخری بار التجا کی۔

ہم کیا کر سکتے ہیں، اپنی سلامتی چاہتے ہو تو جہاں تک ممکن ہو جلد یہاں سے چلے جاؤ۔ سبھوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اسے نکالنے کے لئے وہ لوگ اتنی زور سے چیخے کہ درخت پر بیٹھے کوّے "کائیں کائیں" کرتے اڑ گئے، جیسے وہ بھی ہاں میں ہاں ملا رہے ہوں۔ بھاگو بھاگو ...... کائیں کائیں۔

وہ بے چارگی کی تصویر بنا کبھی ان کی طرف اور کبھی دریا پار دیکھنے لگا۔ ان لوگوں کے جذبات کا الاؤ بھڑک اٹھا۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کا تھیلا چھین لیا۔ تھیلے سے اس کا سامان نکال نکال کر اپنے قبضے میں کرنے لگے۔ تھیلے سے کبوتر نکل کر اڑ گیا۔ وہ بے بسی سے کھڑا تماشا دیکھنے لگا۔ چند لوگوں کو ان کے حصے نہ ملے تو اس کی طرف غضب ناک نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ اسے خطرہ محسوس ہوا۔

اپنی جان بچانے کے لئے سرپٹ بھاگا۔ وہ اپنے پیچھے ان لوگوں کا فلک شگاف قہقہہ سن رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ آج کا ہر انسان بھاگ رہا ہے۔ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک۔ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک

جیسے کسی کو بھی جائے پناہ نہ مل رہی ہو۔ اور زندگی کی طرح زمین بھی تنگ ہو گئی ہو۔

جب وہ دریا کنارے پہونچا۔ تو آمد و رفت کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ تمام کشتیاں ہٹالی گئی تھیں۔ ندی پار کرنا ایک دشوار مسئلہ بن گیا۔ اگر پل صراط ہوتا تو شاید اسے بھی پار کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کا ذہن ماضی کی طرف منتقل ہو گیا جب اس سرزمین پر اس نے قدم رکھا تھا۔

سورج بادل کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کے پاؤں گیلی مٹی میں دھنس گئے تھے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دلدل میں پھنس گیا ہو۔ ●

اعجاز راہی (پاکستان)

اعتراف شکست

حرمتیں نادیدنی
مفہوم و معنی بے محل
زندگی ناگفتنی
سب خواہشیں کا راجل
بے نشاں اندھے کنوئیں ہیں
کس کے آوازہ لگانے کا عمل
سب بے عمل
ہر مرحلہ بے آبرو
ہر سوچ رنج و جانگسل
کیسے کروں جینے کی خواہش
کن امیدوں پر امیدیں باندھ لوں
اب سفر، زادِ سفر، رختِ سفر
سب بے اماں
گھور جنگل ہیں درندے چار سو
راستے پگڈنڈیاں خنجر بکف
لفظ و معنی کے بگولے
بے اماں سوچوں کی اندھی بارشوں میں تر بتر
ممیٹوں پر چیختی چیلوں کے سائے چار سو
کیوں ہری شاخوں کی کرنا آرزو
اور برہنہ ٹہنیوں پر چپ پرندے دیکھنا!

طارق بشیر (پاکستان)

پرندہ میرے گھر اترا

روپہلی اجلی صبحوں میں
کہ جب لوگوں کے سر پہ جال تھے رنگین خوابوں کے
سنہرے ساحلوں کے
ریشمی دھوپی جزیروں کے
سفر تھا دن کا اور رستے گئی راتوں میں ڈوبے تھے
تھکن نتھنوں سے اور آنکھوں سے، اندر دھول کی صورت اترتی تھی
اور ان کے پاس سب ہتھیار تھے، حربے تھے، اور سارے طریقے تھے
مگر اس کیفیت ہونے پہ بھی وہ مرمریں۔
سب سے حسیں، گلگوں پرندہ میرے گھر اترا
پرندہ میرے گھر اترا تو سب صحنوں میں اس کے پھڑپھڑانے کی صدا گونجارتی اتری۔
سبھی کے جال مکڑی کی طرح تن تن اٹھے، لیکن پرندے نے فقط میرے ہی آنگن
میرے بام و در ہی کو چہکار کی تو دی۔
پرندے تجھکو اب دیکھتا ہوں تو مجھے الحمد کہنے والے کے ایمان پہ خود رشک آتا ہے
تری آواز سنتا ہوں تو اپنی ہی صدا کا عکس چنتا ہوں
ترے ان چہچہوں میں میرے اپنے قہقہوں کی خوشبوئیں اڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔
ترے اڑنے میں اور چکر لگانے میں مجھے اپنی تخیل آفرینی روپ لیتی مسکراتی سی نظر آئے۔
میں اپنے رزق دینے والے کی مدحت کروں کہ اس نے میرے مٹھی بھر آنگن کو ایسا نغمہ
بخشا ہے کہ میرے رات دن بہجت سے اب لبریز رہتے ہیں۔
میرے خوابوں کے کھلنے اور میرے رتجگوں کا اجر ملنے کا زمانہ لوٹ آئے تو پرندہ یونہی
میرا ہمدم و دمساز بن کر میرے آنگن میں رہے
اور میرے ہمرہ دھوپ اور بارش سہے۔
اور تیری مدحت کہے!

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

فاصلے

زمیں سے رشتۂ قدم کا اگر کشیدہ رہے
فلک جو ہم پہ ہوا مہرباں تو کیا حاصل
ہوائیں اڑنے بہت بادلوں کے پیراہن
ہمارے سر پہ ہوں سایہ کناں تو کیا حاصل
اندھیری رات میں گم گشتہ رہ نوردوں کے
رہے شریک سفر کہکشاں تو کیا حاصل
بتوں کے شہر میں ساکت ہر اک زباں ہوگی
مزار جیسے ہوئے دلستاں تو کیا حاصل
فضا میں زہر بھرا ہوا ہو تو زندگی کیسی!
ہمارے نام ہوئی داستاں تو کیا حاصل

گلوں کے کھلنے کا موسم حسیں سہی لیکن
نظر نواز کوئی صحن گلستاں بھی تو ہو!

جو زلف یار معطر ہوئی لہراتی ہوئی
کوئی دریچہ کوئی بام رشک جاں بھی تو ہو
وفور شوق میں گھبرا کے سر جو ٹکرائیں
کوئی فصیل کوئی سنگ جان جاں بھی تو ہو
سکون قلب کی خاطر کہاں پناہ ڈھونڈیں
زمیں پہ ایسا کوئی گوشہ اماں بھی تو ہو
[illegible]
در حبیب تو ہو سنگ آستاں بھی تو ہو

خزاں نصیب چمن ہو تو پھر بہار کہاں
جو ذہن و دل ہوں پریشاں تو پھر قرار کہاں
کوئی سبیل ہو ایسی کہ فاصلے کم ہوں
نہ زخم دل ہی کھلے اور نہ آنکھیں نم ہوں

نصر قریشی

حکمِ خدائے وقت

رات کو دن، ظلمت کے نگر کو روشنی کا مینارا لکھیں
حکمِ خدائے وقت ہے یارو، زہر کو امرت دھارا لکھیں

ظلم و جور کے اندھیاروں میں شمعِ غزل روشن رکھیں
درباروں سے خلعت پائیں، شاہ کو دھروتارا لکھیں

سچائی کے کڑوے گھونٹ کو، کون خوشی سے پیتا ہے
جھوٹ کو سچ جانیں، جھوٹوں کو سچائی کا نعرا لکھیں

[illegible] ابن الوقت نہیں ہم لوگ
حاکمِ وقت کا لکھیں قصیدہ اسکو سب کا پیارا لکھیں

انسانوں کا خون بہے تو اپنی زباں کو بند رکھیں
تختِ شاہی کے خطروں کو باغی اور آوارا لکھیں

قحط، وبا، سیلاب، بلا سے ہر جانب کہرام مچے
جائے اماں جو ڈھونڈ رہے ہیں انکو ہم بنجارا لکھیں

فریادوں سے ملنے والی نفرت کی وہ زنجیر کہاں!
کوئی عدالت یا منصف ہو دکھیاروں کا [illegible]

[illegible] لوح و قلم کے رکھوالے
حرف و لفظ [illegible] پھر بھی جگ اجیارا لکھیں

سوہن راہی (لندن)

تیری تشبیہوں کے پیکر

راستوں کی گرد وابستہ ہے دامانِ حیات
…نس میں تیری پائل کی وہی جھنکار ہے
…ن سے تیرے حسن کا موسم جگا
…یا تیری معصومیت سے
پیار کا محشر اٹھا

وقت کے ہاتھوں میں میرا دل
میرا مجروح دل
جس کے خوں میں
شام و صبح کی شفق کے تازہ پھول
تیرے عکسِ رخ کا آئینہ بنیں

رات کی بے سنگ خاموشی
تیری زلفوں کے پیچ
ایک سے ہیں ۔

ایک ہی طرح سے مجھکو ڈس گئے
جب کوئی وعدہ
وفا کے رنگ میں کھلتا نہیں
جب مرے اشکوں کو تیرے ہاتھ کا غنچہ
کبھی چھوتا نہیں

چاند، سورج اور تارے
تیری تشبیہوں کے پیکر
آج پھر خاموش ہیں
میری طرح گریۂ جاں
بیکراں سوزِ دروں
داستاں در داستاں ۔

فضا ابن فیضی

چہرہ سالم، نہ نظر ہی قائم !!
بے ستوں سب کی حویلی قائم

نہ رہی پاؤں تلے اس کی زمیں
میں ہوں اپنی جگہ اب بھی قائم

ہاتھ سے موجوں نے رکھ دی پتوار
کیسے دھارے پہ ہے کشتی قائم

سائے دیوار کے ٹیڑھے ترچھے
اور دیوار، کہ سیدھی قائم

زیست ہے کچے گھڑے کے مانند
بہتے پانی پہ ہے مٹی قائم

نصب کر اپنی صلیبیں مجھ پر
کہ انا تو رہے تیری قائم

آسماں تھا، کہ بہت خاک ہوا
اپنی ضد پہ رہی پستی قائم

تم ابھی تک ہو سراپا تشکیک
اس نے اک رائے تو کر لی قائم

سب ہیں ٹوٹی ہوئی قدروں کے کھنڈر
کون ہے وضع پہ اپنی قائم

میں بھی کاغذ ہوں یہ کیسا آخر
حرف نابود، سیاہی قائم

خود کو کس سطح پہ زندہ رکھوں
لفظ دائم ہیں، نہ معنی قائم

گرد بن کر جو ہے اب چہروں پر
آسماں پہ وہ زمیں تھی قائم

ہے بڑی بات جو رہ جائے فضاؔ
سطحِ سنجیدہ نگاہی قائم

ظہیر غازی پوری

صبح بدن مصلوب کہ سورج اندھا ہے
دھند کہر محبوب کہ سورج اندھا ہے
چشم بصیرت کھول، شواہد کیا کم ہیں
قوس قزح محجوب کہ سورج اندھا ہے
کالے ارادوں کی سنگینی زندہ باد!
نور نوا مغلوب کہ سورج اندھا ہے
پھول، کرن، مہتاب تصور خوف زدہ
فکر نہ ہو معتوب کہ سورج اندھا ہے
درد اثر بیدار، تقاضے قتل ہوئے
عقل ہے اب مجذوب کہ سورج اندھا ہے
لاثانی افکار کی قیمت، ریت غبار
شعر بیاں ناخوب کہ سورج اندھا ہے
پتھر ہیں الماس روایت کے صدقے
آئینے مرعوب کہ سورج اندھا ہے
خاک بداماں پھرنے والے کتنے ذہن
آج ہیں خوش اسلوب کہ سورج اندھا ہے

پلکوں پر قندیلیں سجا دو
شہر سیہ کو دھوپ دکھا دو
ہر شئے نرغے میں آجائے
جذبوں کو سیلاب بنا دو
اپنا بدن ہے خواب مقتل
جب چاہو تلوار چلا دو
روشن ذہنی جب کھو بیٹھے
چن چن کر ہر شہر جلا دو
احساسات ہیں سوئے سوئے
منظر منظر خواب سجا دو
گرم نظر کی تاب نہیں ہے
برق گرانی ہو تو گرا دو
سب سے چھیڑ کیا کرتی ہے
خوشبو کو بیڑی پہنا دو
لب بستہ جب کر دے دنیا
لفظوں کو نقارہ بنا دو

شہپر رسول

اپنے گزرے ہوئے حالات نہ اب یاد کرے
اس سے کہنا کہ وہ شہرت کا سبب یاد کرے

نامکمل کوئی سایہ ہے قلندر کیسا
چشم پُر آب سے جو مرگ طلب یاد کرے

کب ملا اس کو خود اپنے ہی تعاقب سے فرار
سیلِ بے رنگ میں وہ آپ کو کب یاد کرے

شہر نے نام دیا اس کو یہ سچ ہے لیکن
روڑا گاؤں کے جب اس نے لقب یاد کیے

پیڑ کو بھول کے بیٹھا ہے جو برگ و گل میں
پیڑ جا ہے تو ابھی نام و نسب یاد کرے!

اف! وہ تنبیہہ بزرگاں مری تعمیر کے ساتھ
آنکھ بھر آئی جو وہ غیض و غضب یاد کرے

حمید الماس

سرحدِ گل سے نکل کر ہم جدا ہو جائیں گے!
کل تمہاری قیدِ خوشبو سے رہا ہو جائیں گے!

ذہن میں احساسِ رفعت ہی نہ ہوگا شام تک
بڑھتے بڑھتے دن کے لمحے یوں ہوا ہو جائیں گے

چھوڑ جاؤ دامنِ امروز میں بھی کچھ نہ کچھ
ورنہ تم سے طائرِ فردا خفا ہو جائیں گے

جب نہ ہوگا تنفس تو پھر ہمارے ساتھ ساتھ
یہ زمیں و آسماں دونوں فنا ہو جائیں گے

سامنے ہے ساعتِ آخر کا ان دیکھا عذاب
عمر بھر کہتے رہے اب بے نوا ہو جائیں گے

شفیع اللہ خاں راز آبادی

اس نے جتنے سجائے تھے چہرے
غالباً سب پرائے تھے چہرے

آئینے زد میں آکے ٹوٹ گئے
پتھروں نے اگائے تھے چہرے

دوستی کی بساط اُف ہم پر
دشمنوں نے بچھائے تھے چہرے

ہم سے پوچھو کہ ہم بتائیں گے!
کتنے نقلی لگائے تھے چہرے

آج بے حد اداس لگتے ہیں
کل یہی مسکرائے تھے چہرے

میری آنکھوں میں اب بھی پھرتے ہیں
تم نے جتنے بتائے تھے چہرے

سرخیاں راز یہ بتاتی ہیں
کب لہو میں نہائے تھے چہرے

افتخار احمد شاہین
پاکستان

دکھ کا لاکھ اندھیرا ہوگا
سکھ کا ساتھ سویرا ہوگا

پیڑ ہیں سائے سہمے سہمے!
جن یا بھوت کا ڈیرا ہوگا

جگ میں کیا سکھ چین ملے گا
جیون ایک بکھیڑا ہوگا

تنہا اس پتھ پہ مت جانا
رستہ ٹیڑھا میڑھا ہوگا

بات سمجھ میں کچھ نہیں آئی،
سوچ سمجھ کا پھیرا ہوگا

کتنی روشن ہیں یہ گلیاں
اس کا یہیں بسیرا ہوگا

چاندنی شب کا لطف اٹھاؤ
پھر تو گھور اندھیرا ہوگا

آج بہت غمگین تھا شاہین
آشاؤں نے گھیرا ہوگا

قاضی انصار

خدا کی یاد کریں نا خدا کی پابندی
سفر طویل ہے ہم پر ہوا کی پابندی

مرض مریض میں کچھ اس طرح تصادم ہے
دوا کے نام سے ضد اور دوا کی پابندی

لگا دی شرط یہ ماحول کے اندھیروں نے
کہ راہ ڈھونڈیے رکھ کر ضیا کی پابندی

یہ کیسی شرط ہے کیسی ہے یہ زباں بندی
دعا کو ہاتھ اٹھائیں دعا کی پابندی

یہ امتحان بھی کیسا ہے امتحاں یارو
لہو میں ہاتھ رنگائے حنا کی پابندی

چلا ہی جاتا ہے یہ صبح و شام کا جھگڑا
ہے عمر بھر کے لئے بارہا کی پابندی

حفیظ مومن

تلخ اوروں کی زندگی نہ کرو
اپنے گھر میں کوئی خوشی نہ کرو

نذرِ افکار زندگی نہ کرو
لمحہ لمحہ یہ خودکشی نہ کرو

ہو نہ جائے کہیں نظر بیکار
اس قدر تیز روشنی نہ کرو

مجھکو تہمت نہ دو شرافت کی
آدمی ہوں میری ہنسی نہ کرو

کوئی دشمن نہ ہوگا دنیا میں
شرط یہ ہے کہ دوستی نہ کرو

سر پھروں کا ہے یہ نگر مومنؔ
تم یہاں بات ہوش کی نہ کرو

شہاب الدین ثاقب

ان دنوں آؤ چلیں دیر و کلیسا کی طرف!
زندگی ہے تو چلیں گے کبھی کعبہ کی طرف!؟

مٹ گئیں اب وہ محبت میں جنوں کی رسمیں
ایسے دیوانے کہاں؟ جائیں جو صحرا کی طرف

حسرت و رنج و غم جاں کے سوا کچھ بھی نہ تھا
لے گیا دل جو مجھے شہر تمنا کی طرف

پستیوں نے تو بجز خاک ہمیں کچھ نہ دیا
اب ذرا آؤ چلیں اوج ثریا کی طرف

یوں تو ہر قسم کے تھے پھول چمن میں لیکن
ہم گئے جب، تو گئے نرگس شہلا کی طرف

صابر فخر الدین

چاند آدھا تھا رات آدھی تھی
میری اور ان کی بات آدھی تھی

ایک میں ہی تو پورا پورا تھا
اور سب کائنات آدھی تھی

میں نے مفہوم پا لیا آخر!
گو کتابوں میں بات آدھی تھی

سر پہ یوں سورج آ کے ڈوب گیا
جیسے اس کی حیات آدھی تھی

حادثہ ایسے کیسے ٹل جاتا
کی گئی احتیاط آدھی تھی

...حق اورنگ
(بنگلہ دیش)

چہرے پہ خاک دھول بدن پر ملے ہوئے
کتنی صدی کے تھے وہ مسافر چلے ہوئے
آنے لگے ہیں صبح گزیدہ جو ہوش میں
سورج کو کتنی دیر ہوئی ہے ڈھلے ہوئے
تو سب کی متصل تھی رگ جاں سے دوستو
چھپنے دیئے تھے رخ پہ ہوا کے جلے ہوئے
موسم کی انتہائی تگ و دو کے بعد بھی
گلشن میں چند شگوفے ہی پھولے پھلے ہوئے
...سا کا کرم تھا یہ کہ ستاروں کی چال تھی
درپیش نت نئے جو مجھے مسئلے ہوئے
اپنا لہو تھا شفق پی گئی تو کیا!
...تو ہے گلال بدن پر ملے ہوئے
...ت کا سدباب کوئی مسئلہ نہیں
...یا اگر چراغ عمل ہوں جلے ہوئے
شکوہ تھا یہ کسی کی عدم التفات کا
...بنا ہوا ب مرے مشغلے ہوئے
...ب پہ عذر ہو گی تو کب ہوا!
اور... بلکہ مرے ... لے ہوئے

قیصر ارتن پوری

یہ زمیں دیوار ہے، یہ آسماں دیوار ہے
گونجتی ہے چیخ میری یہ جہاں دیوار ہے
کس طرف جائیں گے ہم اب زندگی کی کھوج میں
دور تک پھیلی ہوئی بس بے کراں دیوار ہے
شیشہ شیشہ ہو رہی ہے اب تو میری زندگی
تک رہا ہے مجھ کو جیسے راز داں دیوار ہے
روک پائے گی بھلا کیا آندھیوں کو وقت کی
خوش گماں ہیں لوگ کتنے پاسباں دیوار ہے
دوپہر کی دھوپ ہے اب زندگی کی راہ میں
جل رہا ہے سایہ سایہ اب کہاں دیوار ہے
دسترس سے دور ہیں حالات سے مجبور ہیں
کیا شریک درد ہوں ہم درمیاں دیوار ہے
تو نہیں تو کیا ہوا پھر عکس روشن ہے ترا
اب بھی تیری یاد کی جائے اذاں دیوار ہے
دشمنی ہی اچھی قیصر راستا دیتی تو ہے
ورنہ ہر جانب سلوک دوستاں دیوار ہے

N. Regd 425 [illegible] 64
P. Regd No. [illegible] 7
[illegible]ne – 432

The AAHANG Urdu Monthly
BAIRAGI GAYA

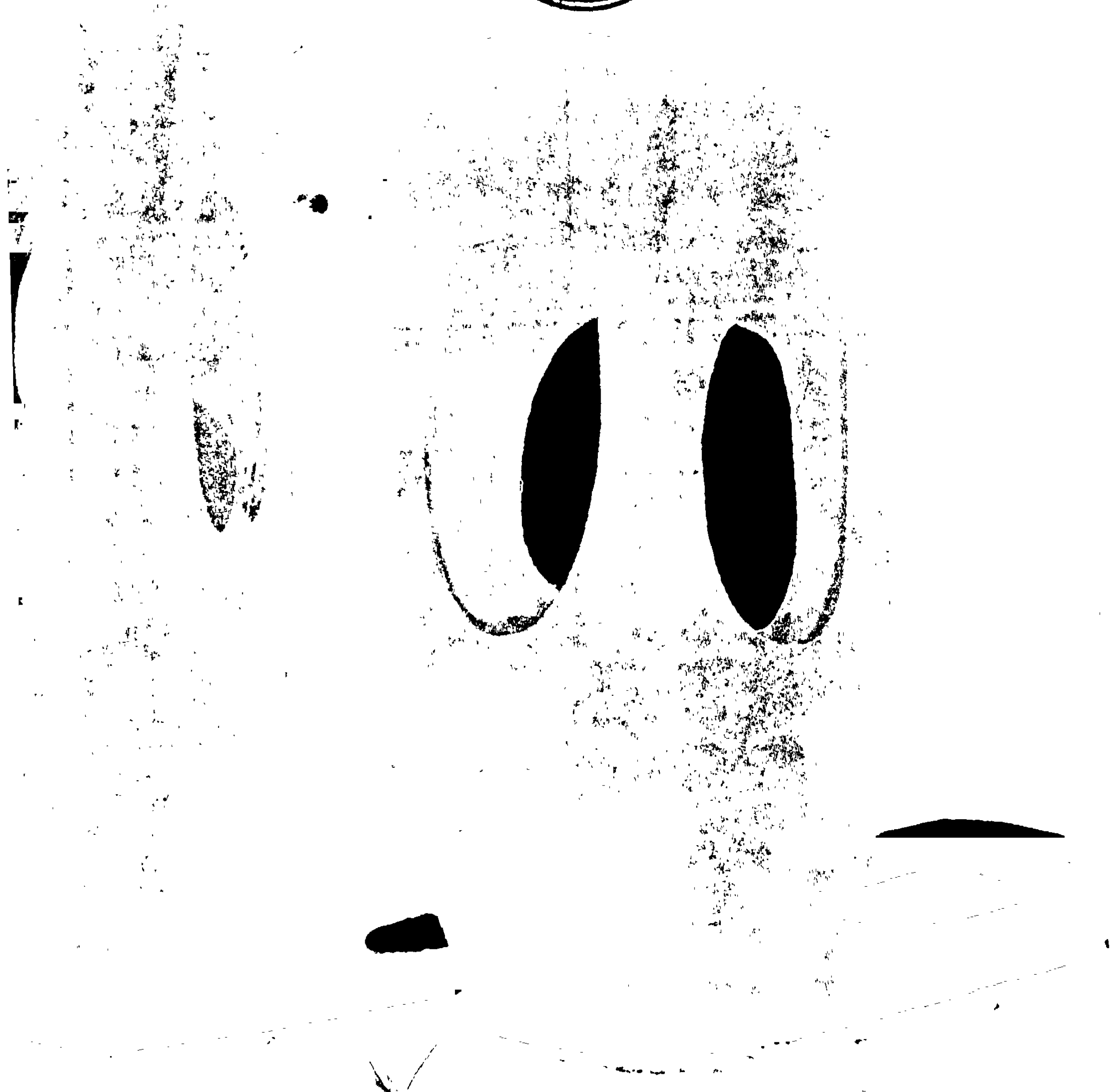
تفہیمات

تنقیدی مقالات

کلام حیدری

PRICE [illegible]

THE
CULTURAL ACADEMY, GAYA



— 1983

دی کلچرل اکیڈمی رینہ ہاؤس جگ جیون روڈ، گیا

قائم شدہ : ۱۹۶۳ء

ماہنامہ آہنگ گیا

شرح خریداری

ایک شمارہ ——— ۳ روپے

سالانہ ——— ۳۶ روپے

فون نمبر : 432

چیف ایڈیٹر

کلام حیدری

ایڈیٹرز

نوشابہ حق، عبد الصمد

محتویات

دی کلچرل اکیڈمی کے اراکین اور دیگر کام کرنے والوں نے
جناب کلیم الدین احمد کے انتقال کی خبر کو صدمے اور صبر کے ساتھ سنا۔
صدمہ اس لئے کہ اردو کو دوسرا کلیم الدین احمد نصیب
نہ ہوگا۔ صبر اس لئے کہ یہ ہماری مجبوری ہے۔

الوداع !

کلیم الدین احمد !

صبر !

کلیم الدین احمد کے ورثا و متعلقین !

عزم ! کہ ہم کلیم الدین احمد کے نام اور کام کی لاج رکھیں گے

کلام حیدری

باخبر

آس پاس

کس کا انتظار ہے؟

پنجاب کے مسئلے پر ہر شخص ہراساں نظر آتا ہے۔ مرکزی سرکار نے کیا منصوبہ بنا رکھا ہے اس کی خبر کسی کو نہیں ہے کیونکہ آج جو بیان آتا ہے کل اس کی تردید بھی آ جاتی ہے اس لئے سرکار کے ذہن کو پڑھنا ایک بہت ہی مشکل امر ہے۔

اکالی دل سکھوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ بالکل اس طرح کرتی ہے جس طرح کبھی مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی دعویٰ کرتی تھی۔ یہ سبھی جانتے اور مانتے ہیں کہ ہزار خرابیوں اور خامیوں کے باوجود کانگریس ایک سیکولر جماعت ہے اس نے سیاسی محاذ پر اکالی دل کو بالکل اس طرح شکست دی۔ جس طرح اس نے مسلم لیگ کو دی تھی۔ پچھلی تواریخ کو کریدنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم ۱۹۸۰ء سے اپنی بات شروع کرتے ہیں کہ جب پارلیمانی انتخابات میں پنجاب میں اکالی دل کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکی تو پھر ایک آس یہ باقی تھی کہ وہ اسمبلی کے انتخابات میں مزید کامیاب ہوگی لیکن اتفاق کہ یہ بھی ممکن نہ ہوا۔ تب اس نے اپنی بقا کے لئے مذہبی اور جذباتی نعروں کا سہارا لیا۔ یہ ہندوستان کی ایک بڑی بدنصیبی ہے کہ جب معاشی اور سیاسی محاذ پر اسے کامیابیاں نہ ملنے لگتی ہیں تو ان کا رُخ مذہب اور جذباتیت کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ جس کا بہاؤ اتنا تیز اور طاقتور رہتا ہے کہ پھر اس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ بہرکیف! اکالی دل نے چند ایسے ہی نعروں کی تشکیل کی اور اپنی جد و جہد میں لگ گئے۔

جہاں تک کہ ان مسائل کے حل کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مرکزی سرکار نے جان توڑ کوشش کی۔ اور اس میں بھی کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ اکالی دل کی کوششوں میں خلوص کا فقدان تھا۔ پہلے تو آنند پور ستجاویز کی بات کی گئی جس کا مرکزی مقصد ملک کی تقسیم اور اس کی بربادی کے سوا کچھ نہیں تھا جب اس کے خطرناک نتائج کی طرف توجہ دلائی گئی تو اس مطالبے کو پس پشت رکھ کر چند مذہبی اور دیگر مطالبات سامنے لائے گئے۔ اگرچہ سنت بھنڈرا(ا) والے کو ایک مقصد کے تحت شہرت دی گئی۔ اور ان کی زبان سے آنند پور ستجاویز کو بار بار دہرایا گیا بہرکیف! یہ ایک الگ بحث ہے جس پر پھر کبھی بات ہوگی۔ فی الحال ہم اکالی دل اور مرکزی سرکار کے رویّہ پر بات کریں گے۔ اکالی دل کے مذہبی مطالبات کو مان لینے کی بات عرصہ سے کہی جا رہی ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنے میں کون سی بات مانع ہے، ہم سمجھنے سے قاصر ہیں اگر چند شرارت پسند افراد راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں تو کیا مرکزی سرکار اتنی کمزور ہے کہ اس کی ان کے سامنے بالکل نہیں چلتی اس کی وجہ کہ صورت حال جو ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے کیا اس کی سرکار کو بالکل خبر نہیں ہے۔

اکالی دل کا ایک بڑا مطالبہ چنڈی گڑھ کو پنجاب میں

شامل کرانا ہے اتفاق یہ ہے کہ اس مطالبہ کو برسوں پہلے تسلیم کیا جا
چکا ہے صرف اس پر عمل باقی ہے اگر ۱۹۶۶ء میں نہرو کہا گیا تو یہ سوال مرکزی
حکومت سے کرنا چاہیے کہ اس مجرمانہ غفلت کی وجہ کیا ہے۔ کمال یہ
ہے کہ پنجاب کی اس وقت کی حکومت کو اس مطالبہ کے تسلیم کیے جانے پر
کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چنڈی گڑھ کے بدلے اسے زمین اور روپے
بھی ملے تھے۔ ایسا موقع آنے ہی کیوں دیا گیا کہ نئے سرے سے
یہ مطالبہ سامنے آ سکا۔ اس معاملے کو جس طرح الجھایا گیا اس سے
صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کی نیت صاف نہیں تھی۔

آج صورت حال یہ ہے کہ پنجاب کا لا اینڈ آرڈر قابو
سے باہر ہو چکا ہے پولس اور فوج کے حکام بھی بے بس نظر آتے
ہیں۔ مرکزی حکومت نے کئی قسم کے آرڈی ننس جاری کئے لیکن
کوئی بھی اثر انگیز نہیں ہو سکے۔ انتظامیہ کے ایک قابل فخر ہیرے
بھیرو دت پانڈے کو مخصوص اختیارات کے ساتھ پنجاب کا گورنر
بنا کر بھیجا گیا۔ سہندر کو مخصوص اختیارات کے ساتھ آئی جی
بنا کر بھیجا گیا۔ اور بھی کئی طرح کی سخت کاروائیاں کی گئیں سبھی
بے اثر ہیں۔ بسوں سے مسافروں کو پہچان پہچان کر اتارا جا رہا
ہے اور ہراس کا بے رحمانہ قتل ہو رہا ہے۔ پنجاب میں کوئی آدمی
اپنے کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ پولس کے لوگوں نے ناموں اور عہدے
کا بیج لگانا بند کر دیا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ ـــــ
آخر ہماری حکومت کیا کر رہی ہے؟ کیا اسے کسی اوتار کا انتظار
ہے ـــــ؟؟

کہاں ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب بابو جگجیون رام کا طوطی بولتا تھا۔
ہندوستانی جمہوریت کی سیاست کے وہ ایک ایسے فرد ہیں
جنھوں نے سبھی طرح کے نشیب و فراز اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
۱۹۴۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو کی سرکردگی میں پہلی عبوری
حکومت بنی تھی تو جگ جیون رام اس کے ایک رکن تھے۔ اور وہ واحد
فرد ہیں جو آج بھی نہ صرف زندہ و تابندہ ہیں بلکہ کسی حد تک سرگرم
بھی ہیں۔ وہ پنڈت نہرو کی کابینہ میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ درمیان
میں کامراج پلان کے تحت الگ کئے گئے۔ اندرا گاندھی کی کابینہ میں پھر
شامل ہوئے۔ اور ۱۹۷۷ء کے فروری تک وہ پھر اندرا گاندھی کے
ساتھ رہے۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے موقع پر جب اندرا گاندھی
کا ستارہ غروب ہونے لگا تو جگ جیون رام ان کا ساتھ چھوڑ گئے انہیں
وزیر اعظم کی گدی کی جھلک دکھائی گئی تھی۔ لیکن ہوا یوں کہ انہیں وہی
کچھ ملا جو اندرا گاندھی کی کابینہ میں ملا ہوا تھا۔ اور وہ بھی دو قدح
کے بعد۔ دو تین برس کے بعد پتہ چلا کہ ہندوستان کی وزارت
عظمیٰ اب ایک ہریجن کے ہاتھوں میں آ جائے گی کہ ایک دکنی برہمن
کی شاطرانہ چالوں سے شمالی علاقہ کے ایک جاٹ کی قسمت کھل گئی
اور عظیم ہریجن لیڈر پھر تماشائے اہل کرم دیکھتے رہے۔ اس
کے بعد کے دو تین سالوں میں انہوں نے دو تین جماعتوں کو بدلنے
کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور آخر میں اپنے ہی نام کی ایک جماعت
جگ جیون کانگریس بنا کر مطمئن ہو گئے۔ جلد ہی انہیں پتہ چلا کہ
عظیم ہریجن لیڈر ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس اندرا گاندھی
والا جادو نہیں۔ اندرا گاندھی والا کرشمہ نہیں۔ تو پھر انہوں نے
ساتھی کی تلاش شروع کی۔ قسمت انہیں چرن سنگھ کے چرنوں
میں لے آئی۔ اتفاق سے ان پر دو دو بار وزارت عظمیٰ کا
دروازہ بند کر چکے تھے۔ چرن سنگھ کے سوشلسٹ ساتھی ان کا
ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اس لئے وہ بھی خالی خالی سے تھے۔ چنانچہ
دونوں نے آپس میں خوب پینگیں بڑھائیں۔ خوب واہ واہ
ہوئی۔ خوب جے جے کار ہوا۔ کئی بڑے شہروں میں دونوں جنتا
کے سامنے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آئے۔ اور سیاسی پنڈتوں
نے حساب لگانا شروع کر دیا کہ ہریجن + جاٹ = ؟)، کے
فارمولے کا کیا بنے گا۔ حسب دستور چرن سنگھ جلد ہی اس دوستی
سے اوب گئے اب ان کے نئے بوائے فرینڈ اٹل بہاری واجپائی
ہو گئے۔ اور وہ واجپائی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر رومان کی نئی
وادیوں میں گم ہو گئے۔ رہ گئے بابو جگ جیون رام تو بیچارے

پہلے بھی بے یار و مددگار تھے اب بھی ہیں۔ ادھر اندرا کے چیف منسٹر یا ماراکو اپوزیشن کی لیڈر(؟) کا شوق چرایا۔ تو انہوں نے دیے واڑہ میں ایک اجتماع کیا جس میں جگ جیون رام کو بھی نیوتہ دیا جگ جیون رام خوشی خوشی وہاں گئے لیکن یہ نہیں انہیں وہاں کیا گیان ہوا کہ اگلی بار سری نگر میں جب یہی اجتماع ہوا تو وہ وہاں نہیں گئے اور گھر ہی میں روٹھ کر بیٹھ گئے۔ تب سے وہ اس آس میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں کہ کوئی آئے اور ان کو منا کر لے جائے لیکن بابو جگ جیون رام اتنے بھولے نہیں ہیں جتنے دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل اس وقت حالات پر ان کا کوئی اختیار نہیں ہے اس لئے ان کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے کہ کیا کیا جائے۔ خبر آتی ہے کہ اندرا گاندھی سے ان کے تعلقات استوار ہو رہے ہیں۔ اور وہ یا ان کے صاحبزادے سریش رام کانگریس میں شامل ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہو بھی گیا تو جگ جیون رام کے ماضی اور ان کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اندرا گاندھی اور جگ جیون رام میں کون کس کی کتنی زیادہ قیمت لگاتا ہے۔

کیا جھوٹ کیا سچ

جگن ناتھ مشرا جب بہار کے وزیر اعلیٰ تھے تو ان پر اور سب الزامات کے علاوہ ایک الزام یہ بھی تھا کہ ان کے دور وزارت میں بہار میں بجلی کے محکمہ کی کارکردگی بہت خراب ہو گئی ہے۔ اتفاق سے ان کی جگہ پر جو صاحب آئے وہ مرکز میں توانائی کے وزیر تھے۔ اور جب وزیر تھے تو انہوں نے بھی بہار حکومت کی بجلی کے سلسلے میں نا اہلی کی مذمت کی تھی۔ چنانچہ چندر شیکھر سنگھ نے سب سے پہلے تو بجلی کے محکمے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا اور چند ہفتوں کے اندر انہوں اخباری نمائندوں کو بتایا کہ بہار میں بجلی کی پیداوار نہ صرف تشفی بخش ہے بلکہ اتنی فاضل بجلی پیدا ہو رہی ہے کہ ہم دوسرے صوبوں کو بھی بجلی دے رہے ہیں۔ لوگوں کو یہ سن کر اچنبھا ہوا تھا اور ساتھ ہی خوشی بھی کہ بہار میں ایک ایسا مرد آہن پیدا ہوا کہ جس نے چند ہفتوں کے اندر وہ کام کر ڈالا جو اب دنیا کی کسی طاقت کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ لیکن ہوا یوں کہ آنکھیں اس تحیر انگیز تبدیلی کو دیکھنے سے قاصر رہیں۔ گیا، بہار شریف، دربھنگہ مظفر پور وغیرہ میں تو یہ حال ہے کہ چوبیس گھنٹوں میں مشکل سے پانچ چھ گھنٹے بجلی سپلائی ہو سکتی ہے۔ پٹنہ میں (چند اعلیٰ علاقوں VIP AREA کو چھوڑ کر) جہاں آدھ گھنٹہ ایک گھنٹہ کی لوڈ شیڈنگ ہوتی تھی اب دو گھنٹے، چار گھنٹے، چھ گھنٹے کی کوئی شرط نہیں۔ کچھ عرصہ قبل تک مختلف علاقوں پر وقت متعین تھے اب یہ اصول بھی اٹھ گیا اس لئے جب پٹنہ سمیت بہار کے شہری اپنے وزیر اعلیٰ کا باہمت بیان چراغ کی روشنی میں پڑھتے ہیں تو انہیں سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے

بجلی بورڈ کی کارکردگی پر نظر ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ اس کے افراد کو کام وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں یہ ایک حیرت انگیز امر ہے کہ بجلی بورڈ میں ایسے افراد بکثرت موجود ہیں جن کو اپنے کام کے سلسلے میں نہ تو کسی قسم کی ٹریننگ ملی ہے اور نہ وہ اپنے فرائض کے الف ب سے واقف ہیں۔ وہ تو اس لئے وہاں بحال ہوئے ہیں کہ ان کی ذات (جات) کا کوئی فرد ایسے عہدے پر ہے جہاں بیٹھ کر وہ بحالی کر سکتا ہے۔ پورا بورڈ ذات پات کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے جس ذات کے افراد کو جس طرح موقع ملا ہے انہوں نے اپنے طور پر دل کھول کر گروپ بندی کی ہے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ چنانچہ جب ایک ذات کا کوئی فرد ایسے کام کرتے سے گریز نہیں کرتے جس سے اس کی اچھی طرح بدنامی ہو ایسے کاموں میں کام نہیں کرنا اور جان بوجھ کر غفلت برتنا بھی شامل ہے دوسری بات یہ ہے کہ بجلی پیدا کرنے میں جو آلات کام میں آتے ہیں وہ اس طرح فرسودہ اور بیکار ہو چکے ہیں کہ اب ان سے کام لینا بھی ممکن نہیں رہا۔ سرکار کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ نئے

ڈاکٹر محسن حسین آرزو

سخن ہائے ناگفتنی

(علم الاعداد کی رہنمائی میں سعادت یار خاں رنگین کی مقابل تردید تاریخ پیدائش کا تعین)

اسے میرا ایک اقرار (CONFESSION)
سمجھیے اور بس۔ منظور ہے گزارش احوال واقعی۔ چناں چہ میں بلا تکلف اس دل چسپ حقیقت کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ جب میں رسوائے زمانہ شاعر "سعادت یار خاں رنگین" پر اپنا تحقیقی مقالہ سپرد قلم کر رہا تھا۔ ان دنوں ان کے سال پیدائش سن ۱۱۷۰ ہجری سے مجھے پہلے ایک کھٹک سی محسوس ہوئی۔ پھر یہ خلش بڑھ کر ایک ذہنی کشمکش میں تبدیل ہو گئی۔ برسوں یہ دل کی پھانس بنی رہی۔ اور میں ایک ذہنی کوفت میں مبتلا رہا۔ اصل میں رنگین کی سال وفات ۱۲۵۱ ہجری کے بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ لیکن ان کی پیدائش کے سلسلے میں ایک سال کا اختلاف ہو رہا تھا۔ اور میرے لئے سبب آزار یہ ہوا کہ میں نے علم الاعداد کی مخفی قوتوں کے پس منظر میں ان کی شخصیت کو پڑھنے کی حماقت شروع کر دی تھی۔ ہر چند اس بات سے مقالہ کا کوئی براہ راست تعلق نہ تھا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ رنگین خود بھی مخفی علوم سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اور انہوں نے ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔

بہر حال! میرے نزدیک علم الاعداد کی رو سے رنگین نمبر (۸) کے آدمی ثابت ہوتے تھے۔ ان کا نام سعادت یار (۸) بھی اس بات کی شہادت دیتا تھا۔ علم رمل اور دیگر علوم سے بھی اسی قسم کے احکام صادر ہوتے تھے۔ اس بات کی مزید تائید ان کی حیات اور سیرت و شخصیت کی "" ہی تصویر کرتی تھی۔ کہ ان کی عمر اسی سال (ہشتاد سالہ) ہی ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اور اس لحاظ سے ان کا سال پیدائش ۱۱۷۰ ہجری کی جگہ ۱۱۷۱ ہجری ہونا چاہئے تھا ——————

لیکن کیا کیا جائے کہ جب مصنف یا شاعر اپنے خود نوشتوں ہی میں شک و شبہات کے دریچے کھول دے تو اس کے نوشتوں کو رد کر دینا آسان بات نہیں ہوتی۔ اور وہ بھی محض مخفی علوم کے بل بوتے پر جسے آج تک ادبی تنقید یا تحقیق کے میدان میں کسی نے نہیں برتا تھا ——————

چنانچہ میں نے سب سے پہلے انڈیا آفس لائبریری لندن کی ہندوستانی مخطوطات کی تفصیلی جائزہ فہرست مرتبہ بلوم ہارٹ کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ کیوں کہ یہاں رنگین کے خود نوشتے اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں کہ دنیا میں کسی جگہ نہیں ملتے۔ بلوم ہارٹ نے واضح طور پر یہ بات ان کے خود نوشتوں کی روشنی میں لکھی ہے "کہ رنگین سرہند میں ۱۱۷۰ ہجری (۵۷-۱۷۵۶) میں پیدا ہوئے"۔ یہی بات ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے یہاں بھی کچھ زیادہ وضاحت سے ملی۔

اور رنگین کی مختلف تحریروں کی داخلی شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی ولادت سنہ ۱۱۷۰ھ میں سرہند میں ہوئی۔ یہی قول صحیح ہے۔

اگرچہ ایک موقعہ پر "خمسۂ رنگین" میں وہ
(رنگین) ۱۱۷۰ھ کی جگہ ۱۱۶۱ھ بھی لکھتے
ہیں جو ان کا سہو یا سہو کاتب ہے" ملے

اب بات بالکل صاف تھی۔ اور زیادہ وضاحت کے ساتھ کی گئی تھی۔ اس طرح ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے اس بیان سے مولوی کریم الدین شیفتہ اور کچھ دیگر پرانے تذکرہ نگاروں کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی تھی کہ رنگین نے اسّی سال کی عمر میں وفات پائی۔ غرض رنگین کے خود نوشتوں کی روشنی میں متذکرہ بالا بیانات سے رنگین کی عمر اکیاسی سال ہو جاتی تھی۔ جسے میرا دل قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیتا تھا۔ کیوں کہ مخفی علوم کچھ اور ہی اشارے کر رہے تھے ______ لیکن میرا موضوع قلزمِ تحقیق تھا جہاں میں غوطے کھا رہا تھا۔ یہ جذبوں، تخیلات اور اشاروں کی دنیا نہ تھی۔ بلکہ دلیل و براہین، شہادت و ثبوت، سند اور معتبر اور روشن سند کی دنیا تھی ______ دوسری طرف میرے مطالعہ کی روشنی میں جس قدر رنگین کی شخصیت اور سیرت کے خد و خال زیادہ گہرے اور روشن ہوتے جاتے تھے۔ اسی قدر یہ کشمکش شدید ہوتی جاتی تھی۔ چنانچہ میرے نزدیک ۱۸۰ سا قدیم میں ان کی تصویر کسی طور سے بھی درست نہیں۔ مشکل تھی بالمیہ یہ تھا کہ میرے پاس ایسا کوئی معتبر اور مستند حوالہ نہ تھا جو خود رنگین کے نوشتوں کی [illegible] ٹ کر سکے۔ اور ادبی تحقیق کی دنیا میں سکہ رائج الوقت بھی ہو۔ یہاں محض یہ کہنے سے کام نہیں چل سکتا تھا کہ ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

چنانچہ مجھے پائے چوبیں کی تلاش تھی۔ یوں بھی فارسی شعراء سے لے کر اردو شعراء تک کے تذکروں میں زبان و بیان کی کھوکھلی آرائشوں کے علاوہ جو چیزیں ملتی ہیں۔ ان کا زیادہ حصہ محض گپ داستان طرازی اور کچھ استاد و شاگرد کے کھیلوں کی دنیا ہوتی ہے۔ لہٰذا میں رنگین پر بھی آسانی سے اعتبار کر لینا نہیں چاہتا تھا۔ اور اپنے موضوع کی دلچسپی کے باوجود رنگین کو معصوم سمجھ لینے کی حماقت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم آغازِ انصاف تو یہی اپنے موضوع سے کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ میں رنگین کی ہر کے کچھ اہم بیانات کو ان تمام وسائل کی روشنی میں جو کچھ مجھے میسر تھے بغیر جانچے پرکھے قبول کر لینے پر تیار نہ تھا۔ اور ان میں سے ایک وسیلہ مخفی علوم کا بھی تھا۔

رنگین کی سیرت و شخصیت میں مخفی علوم کی طرف ان کا میلان لکھنؤ کے مرزا مومن بیگ جیسے قیافہ شناس سے ان کا ملنا جلنا اور دیگر واقعات کے علاوہ ان کی ایک قلمی نثری تصنیف "امتحان رنگین" اس بات کی بھی شہادت دے رہی تھی۔ کہ کس طرح وہ نہ صرف اپنے تمام ہم عصروں سے بلکہ گزشتہ تمام عہد کے شعراء سے خود کو بلند ترین مقام کا حامل سمجھتے تھے۔ وہ اپنی اس تصنیف میں خود کو دنیائے ادب کا یکہ و تنہا علامہ قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ جب کہ ان کے نزدیک قلمرو ادب میں علامہ سے بڑا مقام نہیں ہوتا ہے۔ دراصل وہ اپنے شناختہ عدد (۸) کی وجہ سے ایسا کہنے پر مجبور تھے۔ اس عدد کے آدمی کا علوم مخفی کی طرف بھی خاص میلان ہوتا ہے۔ ویسے مطالعہ اور اپنے نصب العین کی طرف خاموش جد و جہد کے علاوہ یہ لوگ خصوصاً اپنے ہم عصروں سے خود کو مختلف و ممیز سمجھتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ لوگ انہیں غلط طور پر سمجھتے ہیں۔ ان میں انفرادیت کی بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ اور عام طور پر اپنی زندگی میں کچھ اہم کارنامے انجام دیتے ہیں ______ لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ لوگ شاذ و نادر ہی کبھی اپنے تمام بہترین کارناموں کا صلہ اپنی زندگی میں پاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مرنے کے بعد ان کے کاموں کی قدر کا تعین جدید کیا جاتا ہے۔ یا ان کی تعریف و تحسین ہوتی ہے وغیرہ ______ رنگین کو بھی اپنے بہترین کاموں کا پھل اپنی زندگی میں نہیں ملا تھا۔ ہر چند ایسی اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں لیکن رنگین خیال فرمائیے جس نے مختصر وقفہ باخود

میں شاعری کی تھی۔ کم از کم اپنے ہم عصر اساتذہ کے مقابلہ میں بھی سراہا نہیں گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں رنگین نے اپنی زندگی میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ جن کی مثال اردو ادب میں مشکل سے ملتی ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ رنگین کو لوگ ان کی زندگی میں ایک کم سواد" اور کم زبان" آدمی سمجھتے تھے۔ وہ اپنی ایک تصنیف "اخبار رنگین" میں اس بات پر خون کے آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔

"سعادت یار خاں رنگین نے شاہ جہاں آباد
میں ہشت زبان میں ایک دیوان کہا اور اس
کا مجموعہ رنگین نام ٹھہرایا۔ واقعی بڑے زور و
شور سے اپنا خون پانی ایک کر کے ایسا نسخہ
بہم پہونچایا سو اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ دیوان
مجموعہ رنگین اس کے منہ پر زیب نہیں دیتا
کیونکہ وہ تو ایک کم زبان آدمی ہے" ؎

یعنی رنگین کی زندگی میں انہیں ہشت زبانوں سے واقفیت کے باوجود ایک کم زبان آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کا اظہار کرتے تھے۔ اور انہیں غلط طور پر سمجھتے تھے ہو سکتا ہے اس میں معاصرانہ رشک و حسد کا بھی دخل ہو۔ بہر حال یہاں بھی سعادت یار خاں رنگین ہشت زبان جس کا عدد صغیر (۷ + ۱) = (۸) ہوتا ہے کہ اسیر نظر آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے سولہ یا اٹھارہ زبانوں میں اپنا دیوان مجموعہ رنگین کیوں نہیں قلم بند کیا؟ انہیں ہشت زبانوں پر جس کا عدد صغیر (۸) ہوتا ہے کیوں دسترس حاصل رہی؟ پھر کیا رنگین اپنی تمام زندگی میں اور کسی حد تک مرنے کے بعد بھی غلط طور پر محض ایک "ریختی گو" اور فحش گو ہی سمجھے جاتے رہے؟

لیکن آج تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد صورت حال یہ ہے کہ ہندوستان سے پروفیسر محمد حسن جیسے ترقی پسند نقاد بھی جب اپنے ادبی سفر پر یورپ جاتے ہیں اور لندن یا آکسفورڈ کے کتب خانے میں اردو شہ پاروں کو کھنگالتے ہیں تو جس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں وہ سعادت یار خاں رنگین کی ہوتی ہے ؎ پاکستان کے ڈاکٹر صابر علی خاں استاد اردو گورنمنٹ میری کالج لاہور اپنے تحقیقی مقالہ میں رنگین کے کارناموں کو نہ صرف خراج تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ انہیں اردو ادب کی ایک "دیو قامت شخصیت" قرار دیتے ہیں۔ اور انہیں ان کے ہم عصر جرأت و انشا بلکہ تمام اردو ادب کے شعراء پر چند لحاظ سے افضل مقام کا حامل بتاتے ہیں۔ ؎

بہر حال ان دنوں میرے نزدیک ڈاکٹر صابر علی خاں کی کتاب ایک اہم کارنامے سے کم نہ تھی لیکن جب وہ بھی رنگین کے نوشتوں کی روشنی میں رنگین کا سال پیدائش ۱۱۷۱ھ ہجری کی جگہ ۱۱۶۷ھ ہجری ہی لکھتے نظر آئے تو میں نے کتاب بند کر کے تھوڑی دیر کے لئے رکھ دی ——— کیونکہ رنگین کے اہم ایک قطعہ تاریخ وفات خود سے بھی رہ پوری طرح آگاہ تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ میرے لئے ان کا یہ فیصلہ ایک آگ کا دریا ہے۔ اور تیر کے جانے سے کم بات نہ تھی۔ یقینی طور پر اب اس سلسلہ میں میری جد و جہد کی رفتار سست پڑنے لگی ——— تب میں نے ایک دن غیبیات کی دنیا کے لسان الغیب حافظ شیرازی کے دیوان سے فال دیکھنی چاہی۔ فال تو صوفیوں کا بھی طریق رہا ہے اور ہجر عاشقوں کا بھی۔ اور میں ان میں سے کچھ بھی نہ تھا فال سے میرا مدعا خود کو نہیں کرنا تھا یا اپنے اس یقین کو ——— کہ رنگین دہلوی کی پیدائش ۱۱۷۱ھ ہجری میں ہوئی تھی ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا تھا۔

فال اور خواب یقین جانئے ان دو چیزوں نے ملکوں اور قوموں کی تقدیریں بدل کر رکھ دی ہیں۔ اور میرا دعویٰ ہے کہ انہوں نے حرکت و عمل کی راہیں کشادہ کی ہیں۔ آپ نے سوچا ہے کہ ملک گیری، دنیا سازی اور جہاں بانی کے لئے

گیا

ان سے بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں۔ امیر تیمور صاحب قرآن سے لیکر بابر و ہمایوں اور آل بابر کے جاہ و جلال و فتح و کامرانیوں کے عزائم و حوصلے ان سے برانگیختہ و بیدار و مہمیز ملتے رہے۔ میں آپ کو تاریخ کی دنیا میں زیادہ دور لے جانا نہیں چاہتا۔ امیر تیمور لنگ صاحب قرآن کو میدان کارزار میں جب ظفریابی ہونے لگی۔ تو اس نے ہندوستان کو بھی تاراج کرنا چاہا جہاں دہلی میں مسلم سلطنت قائم تھی تمام جنگی تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ اور اب نوجوان کو مہمیز کرنا تھا کہ اتنی لڑائی کے سفر سے وہ بددل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ امیر تیمور لنگ نے روئے زمین کے سب سے اہم صحیفۂ آسمانی سے دانائی کی فال دیکھی۔ پھر لشکریوں میں اعلان کر دیا گیا کہ امیر نے فال دیکھی ہے۔ کہ اب وہ اپنا عظیم الشان لشکر جرار لے کر ہندوستان پر لشکر کشی کرے ______ اور ایسا ہی ہوا۔ دسمبر ۱۳۹۸ء میں دہلی کی مسلم سلطنت کو تاراج کر دیا گیا۔ دہلی کے باسیوں پر قیامت صغریٰ ٹوٹ پڑی۔ بہت سے بوڑھے، بچے، عورتیں شہر کی جامع مسجد میں اپنے بچے دبائے پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ کہ دشمن آخر مسلمان ہے کہ خدا کا گھر کا تو پاس کرے گا ہی۔ تیمور لنگ کو اس کے لشکریوں نے خبر دی کہ زیادہ تر مسلمان مسجد میں پناہ گزیں ہیں۔ اور اپنے ساتھ زیورات طلائی و نقرئی اور نقدی کے صندوق اور پٹارے بھی لیتے گئے ہیں۔ امیر کو محسوس ہوا کہ اس کے لشکری خانہ خدا کا احترام کر رہے ہیں۔ مسئلہ ذرا پیچیدہ تھا۔ اس نے ایک بار پھر دانائی کی فال دیکھی۔ اور حکم دیا کہ خدا کا حکم ہے کہ خدا کے گھر کو پاک کر دیا جائے ______ اب لشکریوں کو کوئی ہچکچاہٹ نہ تھی۔ انہیں برانگیختہ اور مہمیز کر دیا گیا تھا۔ پھر سے ہوس لشکریوں نے فال کے احکام مقدس کی فوراً تعمیل کر دی۔ اور ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر مسجد کو پاک و صاف کر دیا ______ فال کی مخفی قوتوں کو سمجھنے کے لئے یہ ایک مثال کافی ہے۔ فال کا یہ استعمال غلط ہوا یا صحیح یہ اور بات ہے۔ میرے نزدیک امیر

تیمور لنگ کی یہ فالیں ایسے لنگ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ عا[illegible] نفسیات میں بھی جسمانی عیوب رکھنے والوں کی حرکات متعدد امثال [illegible] ذکر ملتا ہے اور مخفی علوم میں بھی ______ مجھے [illegible] اس بات پہ تعجب بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی جب میں نے پڑھا تھا [illegible] ۱۹۴۱ء میں سمرقند میں امیر تیمور لنگ کا مزار کھولا گیا صرف اس بات کی تحقیق کرنے کے لئے کہ کیا وہ واقعی لنگڑا تھا؟ چنان[illegible] مزار کھودنے پہ تابوت میں بند اس کا ڈھانچہ صحیح حالت میں ملا لیکن اس کا ایک پاؤں آٹھ سینٹی میٹر چھوٹا تھا۔ چلئے تحقیق مکمل [illegible] گئی۔ خارجی دنیا کے لئے یہ صحیح اور سائنٹیفک تحقیق تھی۔ [illegible] آنکھ نہ ہو تو چھو کر بھی دیکھ لو۔ اور وہ تھی مخفیات کی دنیا۔ جس کے سہارے میں تحقیق کا موتی حاصل کرنے کے چکر میں تھا ج[illegible] دیدۂ دل کو وا بھی کرنا ہوتا ہے۔ غرض میں نے اپنے دل کی بات نکالنے کا ایک قطعی فیصلہ کرنے کے لئے اب کے لسان الغیب [illegible] رجوع کیا۔ تو حافظ نے یہ بشارت دی کہ ؎

دلے کہ غیب نماست و جام جم دارد
ز خاتمے کہ از و گم شود چہ غم دارد (حافظ)

دل میں تصور بندھا کہ گویا کہ اس کی تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ م[illegible] رنگین کی پیدائش سنہ ۱۱۸۰ھ کی بات فراموش کر دوں۔ اور اس[illegible] کوئی غم نہ کروں کیوں کہ میرے پاس ایسی کوئی معتبر دستاویز نہ[illegible] جس کی بنیاد پہ رنگین کی بیان کی تردید کی جا سکے۔ میں نے [illegible] کر پھر انگلی رکھی۔ کہ ذرا وضاحت سے قطعی فیصلہ کی کوئی بات سامنے آئے۔ یعنی اب مزید جد و جہد جاری رکھی جائے۔ [illegible] ختم کر دی جائے۔ جواب ملا ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید
یا جاں رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید (حافظ)

"دلے کہ غیب نماست" اور "دست از طلب ندارم...." نے ایک طور سے مجھے برانگیختہ و مہمیز کر دیا۔ چنانچہ میں نے پھر خود کو ایک طویل سفر طے کرنے کے لئے پہ [illegible]

تیار کر لیا اور بنارس ہندو یونی ورسٹی اور الہ آباد یونی ورسٹی کی خاک چھانتا ہوا علی گڑھ پہنچا۔ اور مولانا آزاد مسلم یونی ورسٹی لائبریری میں جم گیا۔ ان دنوں وہاں کے کچھ نوادرات ضائع ہو گئے تھے۔ لہٰذا لائبریری کی آخری بالائی منزل بند کر دی گئی تھی پھر بھی وہی چہل پہل تھی۔ اب کے بار میں خصوصیت سے عظیم آباد کی دو مایہ ناز مقتدر ہستیوں ایک مکرمی سید حسن عسکری صاحب مدظلہ اور دوسرے قاضی عبدالودود صاحب مدظلہٗ سے نیاز حاصل کر کے چلا تھا۔ مکرمی سید حسن عسکری صاحب مدظلہٗ نے خاکسار سے رنگینؔ کے والد طہماسپ بیگ (جن کی شخصیت متاخرین مغلوں کے عہد میں ایک اہم مقام حاصل کر چکی تھی) کی فارسی قلمی تاریخ کا سرسری ذکر کیا تھا۔ یہ بات کانوں میں پڑی ہوئی تھی۔ مختصر یہ کہ مجھے یہاں سبحان اللہ کلکشن میں قصۂ طہماسپ مسکین (قلمی) از طہماسپ مسکین (حصہ دوم) ملی۔ یہ فارسی قلمی کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پہلا حصہ حبیب گنج کلکشن کی ملک ہے۔ اس دوسرے حصے میں دیگر کام ملی کی باتوں کے اس کے ورق ۱۵ ب پر یہ اہم تحریر نظر سے گذری:

نام آں فرزند بسم اللہ یار خاں موسوم ساختم
کہ سن ہجری ۱۱۶۸ھ ...... در شاہجہاں آباد
...... تولد شدہ ؎

یہ میرے موضوع سعادت یار خاں رنگینؔ کے بڑے بھائی بسم اللہ یار خاں کا ذکر تھا۔ دلچسپی اور بڑھی اور اب "در دشت جنوں من ......" کا نقشہ سامنے تھا۔ اور گوہر مقصود بہ کمند آمد کا یقین دل میں ____________ انگلیاں ورق گردانی میں مصروف تھیں۔ کہ ورق ۶۷ ب پر نظر پڑی اور جم کر رہ گئی سعادت یار خاں کے والد طہماسپ بیگ نے لکھا تھا۔

بعد از داخل شدن بسرہند در عرصۂ یک
ماہ از فضل خدائے تعالیٰ یک فرزند سعید
تولد شد کہ نام اورا سعادت یار خاں نہادم
(حاشیہ پر سرخ روشنائی سے) در ۱۱۷۱ ہجری
یک ہزار و یک صد و ہفتاد و یک، ہفدہم
ذلقعد، روز پنجشنبہ یک پاس شب باقی
ماندہ، در قلعہ سرہند، در حویلی نادر ملاقی
تولد شدہ ؎

اب مجھے میرا گوہر مقصود مل چکا تھا۔ رنگینؔ کی پیدائش کی تاریخ ہفدہم ذلقعد ۱۱۷۱ تھی۔ چنانچہ (۱۷) کا عدد یہاں بھی موجود تھا۔ سن ۱۱۷۱ھ مرتھا جس کی مجھے سند اور معتبر سند کے ساتھ تلاش تھی۔ اور اب مجھے کسی مزید حوالے یا دستاویز کی ضرورت نہ تھی۔ اور نہ کسی بحث کی گنجائش ____________ رنگینؔ کی پیدائش کے سلسلے میں یہ بیان ان کے والد کا تھا اب اس روشنی میں دوسرے بیانات خواہ وہ رنگینؔ ہی کے کیوں نہ ہوں۔ ان کی صحت محفوظ نہیں سمجھی جا سکتی ____________ میں اٹھا اور اس خوشی میں اپنے معبود حقیقی کے سامنے سربسجود ہو گیا ____________

حاصل کلام یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر تحقیق کے اس مرحلہ میں جب دوسری راہیں مسدود نظر آئیں تو اور وسیلوں کے علاوہ فکر و دانش کے ان مخفی بجھے ہوئے چراغوں کو بھی جلا کر روشنی حاصل کرنے کا ایک عملی تجربہ کیا تھا۔ جب کہ میں روزانہ کی زندگی میں اس سے دور رہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میرا کوئی دعویٰ کوئی چیلنج نہیں۔ اس اقرار سے میری غرض و غایت بس اتنی ہے کہ شاید دوسروں کو بھی اس سے کوئی فائدہ پہنچ سکے تو بہتر ہے۔ ورنہ اگر دامن عقل کے جلنے کا اندیشہ ہو تو ان چراغوں کو بجھا رہنے دینا ہی زیادہ سود مند ثابت ہوگا۔ یہ محض میری اپنی سرگذشت ہے ____________

"جستجو لے کی کہاں کہاں مجھکو"؟ لیکن اس طرح اب نہ صرف رنگینؔ دہلوی کے سال پیدائش کا معتبر ترین حوالے کی روشنی میں صحیح تعین ہو گیا بلکہ مندرجہ بالا تحریر کی تلاش سے رنگینؔ کا سال پیدائش، مہینا، تاریخ، دن، ساعت، مقام، حویلی

صبا اکرام
پاکستان

جدید افسانے میں علامت نگاری

ہر جنگ کا اپنا ایک منصوبہ ہوتا ہے اور برصغیر میں آزادی کی جنگ بھی ایک خاص منصوبے کے ساتھ لڑی جارہی تھی۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ اس جنگ کے دوران لکھے جانے والے افسانے بغیر کسی منصوبہ بندی کے تحریر کیے جاتے۔ ہر افسانے سے قبل افسانہ کی منصوبہ بندی کرلی جاتی تھی۔ اور جس طرح جنگ سے پہلے خندقیں کھودنا جنگ کی منصوبہ بندی کا ایک اہم حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس دور میں افسانہ لکھنے سے پہلے افسانے کا پلاٹ تیار کرلینا ہر ترقی پسند افسانہ نگار نہایت ضروری سمجھتا تھا۔ اس سے ہوتا یہ تھا کہ جس طرح جنگ شروع ہوتے ہی سپاہی خندقوں سے نکل کر اچانک اپنے دشمنوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح افسانے کے مطالعے کے دوران افسانے کے پلاٹ کے مختلف خانوں میں چھپے کردار اچانک سامنے آکر اپنے قاری پر گھڑے گھڑائے مکالموں اور تقریروں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے تھے۔ دراصل اس دور میں ہر ترقی پسند افسانہ نگار براہ راست نہ سہی، بالواسطہ طور پر آزادی کی جنگ میں شریک تھا۔ اس کے پاس ایک نعرہ تھا، ایک پیغام، اور ایک مقصد تھا۔ جسے لوگوں تک اس انداز سے پہونچانا تھا کہ وہ فوری طور پر اثر پزیر ہو۔ اور اس کے لئے آسان اور سہل اسلوب اور انداز بیان ناگزیر تھا۔

مختصر یہ کہ افسانے کا بیانیہ طرز اظہار اس وقت کی ضرورت تھ
آزادی کے بعد صورت حال بدلی۔ اب جو افسانہ نگ
سامنے آئے ان کے آگے کوئی مشترک مقصد تھا نہ کوئی ایسا
جسے لوگوں تک پہونچانے کے لئے افسانے کو وسیلہ بنایا جاتا۔ لہ
لوگوں سے مخاطب ہونے کی بجائے جدید افسانہ نگار نے خود ا
طرف دیکھا۔ اور اپنے آپ سے ہم کلامی شروع کی۔ اسی ہم کلا
نے اسے انگلی پکڑ کر مادی اور خارجی دنیا کی بھول بھولیوں سے
اور اپنی ذات کے اندر چھپی ایک نئی اور پراسرار دنیا میں پہ
دیا۔ اس دنیا میں پہونچنے والا ہر افسانہ نگار اب کسی نعرہ
کا نمائندہ ہونے کی بجائے خود اپنا نمائندہ تھا۔ وہ اپنی
کا اور اپنی ذات کے اندر چھپی ایک کائنات کا نمائندہ تھا۔
بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کی ذات کائنات اصغر کی حیثیت
رکھتی ہے۔

جو تھا وہ ترقی پسند افسانے نے دکھایا۔ اور علام
افسانے کی خوبی یہ ہے کہ "جو ہے" سے زیادہ "جس کا ام
ہے" اسے دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس کے لئے
کا علامتی طرز اظہار ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آ
رائے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اپنے مضمون "

افسانہ ـــــ ایک منفی تحریک" ؟ میں فرماتے ہیں۔

"علامت عکاسی کا نہیں۔ دریافت اور قلب ماہیت کا عمل ہے۔ یہ کسی مرتب شدہ صورت حال کو سامنے نہیں لاتی۔ بلکہ امکانات کو مَس کرتی ہے۔ تاکہ حقیقت کی پراسراریت کو جان سکے"

مگر علامت نگاری کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ علامتیں سوچے سمجھے ارادے کے ساتھ گھڑی اور تخلیق کی جائیں۔ اس طرح افسانے کا چہرہ مسخ ہو جائے گا۔ اور وہ افسانہ قاری کے ذہن پر اپنی پوری شدت کے ساتھ اثر انداز ہونے میں ناکام رہے گا۔ علامتی افسانے اسی صورت میں کامیاب اور موثر ہوں گے جب علامتوں کی تخلیق کا عمل خود کار اور فطری ہو گا۔

افسانے کے اہم نقاد شہزاد منظر اپنے مضمون "افسانے میں رمز و علامت کا استعمال" میں علامت نگاری پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ افسانے میں علامت کے استعمال میں ایک ایسی تکنک اختیار کی جائے کہ وہ کہانی کا ایک فطری اور لازمی حصہ معلوم ہو اور یہ نہ محسوس ہو کہ علامتیں گھڑی گئی ہیں"۔

اس معیار کو سامنے رکھکر پاکستان میں گذشتہ چند برسوں میں لکھے جانے والے کامیاب علامتی افسانوں کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو انور سجاد کا "گائے" رشید امجد کا "سپملتی ڈھلوان پر رکا ہوا ان کا ایک لمحہ" علی حیدر ملک کا "بڑھتے فاصلوں کے درمیان" آغا آذر کا "ٹیڑھی انگلی" اے خیام کا "لوہے چاند کی کھوئی رات" احمد داؤد کا "وہسکی اور پرندے کا گوشت" نجم الحسن رضوی کا "کھوئی ہوئی چیزوں کی فہرست" اسد محمد خان کا "فوک لفٹ، ۳۵۲" زاہدہ حنا کا "زرد ہوائیں، زرد آوازیں" محمد منشا یاد کا "بیک مرر" اور احمد رحمان شریف کا "فیل سوار" ایسے علامتی افسانے ہیں جنھیں نظر انداز کرنا مشکل ہو گا۔ ان افسانوں میں علامتوں کی تخلیق کا عمل شعوری نہیں۔ بلکہ فطری ہے۔ اور افسانے کے مرکزی خیال کے ساتھ علامتیں بالکل جڑی ہوئی ہیں جس سے افسانے کے اختتام تک پہونچتے پہونچتے اس کے تمام گوشے منور ہو جاتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ علامتی افسانے لکھنا ایک منفی رجحان ہے۔ اور جدید افسانہ نگاروں نے علامتی طرز اظہار کو صرف حقیقت سے فرار کے لئے اپنایا ہے۔ میرے خیال میں یہ الزام درست نہیں ہے۔ علامت نگاری تو ایک ایسا صاف اور شفاف تجربہ ہے جو اپنے اندر خود ایک حقیقت پوشیدہ رکھتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جدید افسانہ نگار اپنے گرد و پیش کی سماجی، معاشی اور سائنسی حقیقتوں کو ترقی پسند افسانہ نگار کی طرح اپنے افسانے میں نقل نہیں کرتا۔ اور نہ وہ ان کو سہارا بنا کر افسانہ بُننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تو ان حقیقتوں کی انگیٹھی سے ایک انگارہ اٹھا کر اپنے فن کی ہتھیلی پر رکھ لیتا ہے۔ اور اس عمل کے نتیجے میں اس کو جس روحانی کرب، تکلیف اور سوزش سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اظہار وہ اپنے افسانے میں کر دیتا ہے۔ مگر وہ خود کچھ نہیں بولتا اور نہ ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح آہ و بکا کرتا ہے۔ وہ تو بس ڈبڈبائی آنکھوں سے قاری کی طرف دیکھتا ہے۔ اور خموشی سے ہتھیلی کھول کر آگے کر دیتا ہے۔ جس پر انگارے سے بنا زخم کا داغ اس کے اندر کا حال سنا دیتا ہے۔ دراصل فن کی ہتھیلی کا یہ داغ ہی علامت نگاروں کا وہ جھومر ہے جو جدید افسانے کے ماتھے پر چاند کی طرح چمک رہا ہے۔

سماجی، معاشی اور سائنسی حقیقتیں آج جس ہیبتناک شکل میں سامنے آئی ہیں۔ ان کا اسی طرح سامنا کرنے کی ہمارے عہد کا قاری تاب نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی اندر سے بہت

ٹوٹا ہوا ہے۔ اگر ان حقیقتوں کی بھیانک اور ڈراؤنی شکلیں اچانک بے پردہ سامنے آجائیں تو دفعۃً چیخ اٹھے گا۔ لرز جائے گا۔ اور اس کے ذہن پر اس کا اثر منفی ہوگا۔ لہٰذا جدید افسانہ نگار اس بات پر مجبور رہے کہ وہ علامتوں کا ایک پردہ درمیان میں رکھے اس سے ایک نفسیاتی پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ جب پردے کے پیچھے چھپی شئے یا حقیقت صاف نظر نہیں آئے گی۔ تو اس کی پراسراریت میں اضافہ ہوگا۔ اور اسے دیکھنے اور جاننے کی خواہش دل میں جنم لے گی جس سے ذہن میں تجسس پیدا ہوگا۔ اور جب تھوڑی سی کوششوں کے بعد وہ علامتوں سے گذر کر اس شئے یا حقیقت تک پہونچ جائے گا تو اسے جان لینے اور پہونچ جانے کی خوشی میں وہ اس شئے یا حقیقت کی ہیبتناکی سے بچ جائے گا۔ علامتی افسانہ نگار کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ اپنے عہد کی تلخ حقیقتوں تک اپنے قاری کی رسائی بھی کرادے۔ اور اسے اس کی ہیبتناکی سے محفوظ بھی رکھے۔

کچھ سادہ لوح لوگوں کو علامتی افسانے سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ اس کا ابلاغ نہیں ہوتا۔ اگر وہ دیانت داری سے آج کے بدلے ہوئے حالات کا جائزہ لیں تو انہیں خود محسوس ہوگا کہ ابلاغ کی وہ صورت جو ترقی پسند افسانوں کے دور میں تھی آج ممکن نہیں ہے۔ اس عہد میں محرومی، ناکامی، تنہائی داخلی کرب اور عام تحفظ کے احساس نے معاشرے کے ہر فرد کے اندر ایک ان کہا کھنچاؤ (UNSPOKEN TENSION) پیدا کر دیا ہے۔ اور چونکہ افسانہ نگار اور قاری بھی اسی معاشرے کے فرد ہیں۔ لہٰذا ان کے اندر بھی یہ ان کہا کھنچاؤ موجود ہے۔ یہی ان دونوں کے درمیان ایک قدر مشترک بھی ہے۔ افسانہ کے مطالعے کے دوران قاری کا یہ کھنچاؤ جب کسی سطح پر پہونچ کر افسانہ نگار کے اندر کے کھنچاؤ سے ٹکراتا ہے تو افسانہ نگار اور قاری کے درمیان ایک اتصال قائم ہوتا ہے۔ اور ایک چنگاری سی پیدا ہوتی ہے۔ جس کی ہلکی سی روشنی میں ایک لمحے کیلئے دھندلی سی کچھ تصویریں، کچھ شکلیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہی علامتی افسانے کا ابلاغ ہے۔ اور جو اس سے زیادہ کی توقع رکھتا ہے اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ آج بھی ماضی میں زندہ ہے اور اس کا ذہن اپنے عہد تک نہیں پہونچا ہے ●

بقیہ: سخن ہائے ناگفتنی...

غرض جملہ تمام تفصیلات اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار سامنے آگئیں۔ ایسی تفصیلات جن کی روشنی میں سعادت یار خاں رنگین کا صحیح زائچہ پیدائش تک تیار کیا جا سکتا ہے یہ ایک چھوٹا سا واقعہ سہی لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اردو شعرا کی پیدائش کے سلسلے میں ایسی تفصیلات کم ملتی ہیں

حوالے:

۱ھ فہرست ہندوستانی مخطوطات، انڈیا آفس لائبریری لندن۔ بلوم ہارٹ، ص ۹۷

۲ھ لکھنؤ کا دبستان شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ص ۳۰۰

۳ھ اخبار رنگین قلمی، سعادت یار خاں رنگین۔ انڈیا آفس لائبریری۔ لندن ۸۷/ لہ

۴ھ سفر یورپ کی ادبی سوغاتیں۔ پروفیسر محمد حسن، مطبوعہ ہماری زبان، ہفتہ وار دہلی۔

۵ھ سعادت یار خاں رنگین۔ ڈاکٹر صابر علی خاں، ص ۲۶۰ تا ۲۷۰۔

۶ھ تیمور اور بابر کے دیس میں۔ رام گوپالہ

۷ھ قصہ طہماس مسکین حصہ دوم۔ ط (فارسی قلمی) سبحان اللہ شکشن علی گڑھ

۸ھ ایضاً۔ ورق ۶۶۔

عین تابش

تلاش بہاراں کی کنول کماری ٹھاکر

"شاہراہیں خاموش ہیں، کوئی صدا نہیں کوئی
خوشی نہیں، کسی کے قدموں کی چاپ سننے
کے لئے ہمہ تن گوش ہوں۔ اور پھر بھی میں سوچتا
ہوں، کسی جنم میں کسی آنے والے دور میں،
کسی دوسری دنیا کی روشنیوں میں گم ہو کر کنول
ٹھاکر کی ان سیاہ آنکھوں کو پہچان لوں گا۔
وہ آنکھیں جن میں صبح کے ستارے کی روشنی
کسی بھولے ہوئے جنم کی یادوں میں گھلی ہے
اس کے چہرے کا جادو جس کی تابانی محبت
کا راز بن کر میرے جذبات کی روشنی میں
چمک اٹھے گی"

ان سطور کے ساتھ اردو کا ایک ناول اپنے خاتمے پہ پہونچتا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ ناول اب شروع ہونے والا ہے۔ اصل قصہ کی ابتدا اب ہوگی اور کسی بھولے ہوئے جنم کی یادوں میں گھلی صبح کے ستارے کی روشنی والی آنکھیں اب اپنا سفر شروع کریں گی لیکن یہ بات کیوں وقوع پذیر ہوتی ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ناول اپنے خاتمے پر پہونچ کر اپنا آغاز بنتا ہے؟ تکنیک اور فن کے اعتبار سے کوئی ایسی گنجائش موجود نہیں ہے کہ ناول وہاں سے شروع ہو جہاں وہ ختم ہو چکا ہے۔ یا ناول وہاں ختم ہو جہاں سے اسے شروع ہونا چاہئے۔

تقسیم کے بعد ہند و پاک میں جو اردو ناول لکھے گئے ان میں "آگ کا دریا" موضوعاتی اعتبار سے وسیع ترین اور تکنیکی اعتبار سے نادر نمونہ ہے۔ دوسرا ناول "خدا کی بستی" بیانیہ انفرادیت کا حامل ہے۔ اور تکنیکی سطح پر آگ کے دریا کے پیچھے پیچھے چلتا ہے موضوع کے لحاظ سے "آنگن" قرۃ العین حیدر اور خدیجہ مستور کے درمیان ذہنی مماثلت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ پھر "علی پور کا ایلی" ہے جو موضوعاتی تنوع کا نمونہ تو ہے موضوعاتی وسعت کا نہیں جبکہ ایک اور ناول "لہو کے پھول" زندگی کے مسائل کی ایک خوبصورت پیش کش ہے۔ "میگھ ملہار" دیومالا کی بنیاد پر تعمیر ہوئی ایک پراسرار دنیا ہے جو موسموں اور دیوتاؤں کے سحر کی اسیر ہے۔ "بستی" ہجرت کا المیہ ہے۔ اور حالات کی شکست و ریخت اور ان کی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی بستی ہے۔ "اداس نسلیں" زبان، اسلوب اور موضوع کے باب میں "آگ کا دریا" کی توسیع ہے۔ اور اس کی بہترین دریافت ایک ANTI HERO کی تلاش ہے۔ اور ان سب کے ساتھ ایک اور اہم ناول یعنی "تلاش بہاراں" واقعی ایک تلاش ہے۔ جو وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ جہاں ناول اپنی سطریں ختم کرتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ

تلاش کس کی ہے اور تلاش کا محور کون ہے۔ بغیر کسی تمہید کے یہ تلاش ایک فوق البشر عورت کی ہے۔ جو کنول کماری ٹھاکر کی شکل میں اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اور ایک مکمل اور صرف اور صرف کنول کماری ٹھاکر کی شکل میں اپنی کہانی ختم کر دیتی ہے۔ اور کہانی اس طرح ختم کرتی ہے کہ اس خاتمے کے ساتھ ہی ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ جو ایک مضبوط ارادی قوت اور آہنی حوصلے والی عورت کے غیر معمولی ذہنی سفر سے عبارت ہے۔

کنول کماری ٹھاکر کا سفر اس طرح شروع ہوتا ہے کہ وہ بنگالی سمندروں پر اکیلے سفر کرنے والے ماجیل کی عبادت کرنے والی ایک بے چین روح ہے۔ جیسے کسی ایسے دیوتا کی ضرورت نہیں جو اپنی تکمیل کے لئے کسی پاربتی کے منتظر رہتے ہوں۔ اور جو عام انسانوں کی طرح زندگی اور جنم کے چکر میں پھنسے ہوئے ہوں۔ وہ ایک ایسی عورت ہے جو عام عورتوں کے خیالات، تصورات اور ان کی محسوسات سے مبرا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معمولی اور نارمل (NORMAL) عورت شروع سے اخیر تک نہیں بن پاتی ہے۔ پورے ناول میں وہ ایک عورت سے زیادہ ایک نصب العین کی علامت نظر آتی ہے۔

"گنگا شو کی جٹاؤں سے نکلی ہوئی گنگا، ہندوستان کے سینے پر پاک دودھ کی دھار کی طرح دیوتاؤں کا امرت، مگر کنول کو ان باتوں پر یقین نہیں تھا۔ وہ تو ہر بات کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ اسے تو صرف ایک بات سے عشق تھا اپنے نصب العین سے اپنی منزل سے"

کنول ٹھاکر عورت کا ایک کٹھور کردار ہے جو ایک عورت کی طرح کمزور لمحوں کی محسوسات کی گرفت میں نہیں ہے جو نہ تو جنسی خواہشات کے بہاؤ میں آتی ہے اور جو نہ کسی لمس آتشیں کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ وہ ایک خالص روایتی قسم کی فیمنسٹ (FANATIC) لڑکی نہیں ہے۔ وہ تو ایک انٹلکچول فرائیڈین (INTELLECTUAL FRENDIAN) پروڈکٹ (PRODUCT) بھی نہیں ہے۔ تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ وہ کیا ہے اور یہ سوال ناول کے مطالعے کے درمیان بار بار اٹھتا ہے اور ہمیں پریشان کرتا ہے۔

ناول میں کردار نگاری CHARACTERIZATION: ایک اہم معاملہ ہے۔ کہا گیا ہے:

"THE PLOT MAY BE FANCIFUL AND ROMANTIC BUT THE MORE REALISTIC THE CHARACTERS ARE, THE MORE INTIMATE DOES THE READER FEEL WITH THE PLOT OF A NOVEL"

تو کیا کنول کماری ٹھاکر ایک رئیلسٹک کردار ہے اور اس کے سہارے ناول کا قاری ناول کے قریب ہو پاتا ہے؟ ایک جگہ جدید ناول نگار کے حوالے سے ناول کے کردار کے بارے میں ایک اور بات کہی گئی ہے۔

"THE MENTAL ATTITUDE OF A CHARACTER MEANS TO THEM (THE MODERN NOVELISTS) THAN THE COMPLETE PERSONALITY"

کنول کماری ٹھاکر کا یہ ذہنی رویہ کیا ہے اور اس کی شخصیت کے درمیان کیا ربط ہے جو اس کی پہچان بن سکتا ہے۔ ایک بات جو بہت واضح نظر آتی

جیسے ناول کا مرکزی حصول کہا جاسکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کنول
اکیلی عورت پورے ناول کے ارتقا کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے
صرف وہ ناول کی مرکزیت کی ایسی علامت بنتی ہے جس کے
ناول ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ ناول کے کردار یا تو اپنے
المون کے ذریعہ ناول میں اپنی موجودگی کا اظہار کرتے ہیں۔
ی حرکات وسکنات کے ذریعہ۔ کنول ٹھاکر کی انفرادیت
ہے کہ وہ مکالمے اور عمل دونوں کے ذریعہ اپنا اظہار کرتی ہے۔
ن کماری ٹھاکر تلاش بہاراں کا مرکز ہے۔ جو خود ہی کردار بھی ہے
ٹ بھی اور سچویشن بھی۔ اسے ناول کی خوبی کہیں یا خامی کہ یہ مرکزی
ار ہی ناول کے پلاٹ (PLOT) کی پیدائش کا محرک معلوم ہوتا
۔ یعنی یہ بات کہیں پر ابھرتی دکھائی دیتی ہے کہ کنول ناول کے
ڈھانچے (STRUCTURE) کو جنم دیتی ہے اور پورا
ٹ اور صرف اسی کے گرد طواف کرتا ہے وہ ایک کردار ہے لیکن پلاٹ
ں میں ضم ہے۔ اور پلاٹ اس سے پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح اس
، اور ڈیفو (DEFOE) کی مول فلینڈرز (MOLL FLA
ANDE) میں بڑی گہری مماثلت ہے۔ اور دونوں یکساں طور پر
ل کی تخلیق کو اپنے وجود کا مرہون منت کرتی ہیں۔ فرق دونوں کے
رمیان آتا ہے کہ مول حالات کی پیداشدہ مخلوق ہے۔ اور بعد میں
لات اس کی موجودگی کے عادی بنتے ہیں۔ اور کنول حالات کو اپنے
م سے پہچانی جاتی ہے۔ اور حالات اس کے نام سے موسوم ہوتے ہیں
، الوکھا کردار بھی اسی لئے ہے کہ اس میں بلا کی سرکشی ہے جو اسے
مضبوط سے مضبوط ترین بناتی ہے۔ کنول ٹھاکر آگ کا دریا کی چمپا احمد
ی نہیں ہے کیونکہ کنول اور چمپا احمد کے درمیان ایک آگ کا دریا
ائل ہے جس کو عبور کرنے کے لئے کنول کو اپنے آپ کو حالات
، حوالے کرنا ہوگا جس کے لئے وہ تیار دکھائی نہیں دیتی۔ کیوں کہ
ن کے پاس زندگی کو حوصلوں اور ارادوں سے تعبیر کرنے کا ایسا
ینی فیسٹو (MANI FESTO) ہے جو چمپا احمد جیسا بھی
پیدا نہیں کر سکی۔ چمپا احمد خوابوں کی مسافر ہے۔ اور وہ کنول ٹھاکر

حقیقتوں کی متلاشی۔ اس کی یہ تلاش مصنوعی نہیں ہے بڑا خلوص اور سچائی ہے اس کی تلاش میں اور بڑی مضبوطی اور پائیداری بھی۔ کیونکہ وہ ہر جگہ ہر محفل اور مجلس میں تنہا ہے۔ اور اس کی یہ تنہائی اس کی اپنے اوپر لادی ہوئی بھی کہی جاسکتی ہے۔ اور اس کے کردار کی پہچان کے نام سے بھی یاد کی جاسکتی ہے۔ یا تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے اردگرد سے بالکل کاٹ لیا ہے اور اس لئے جس منزل پر وہ ہے بالکل تنہا ہے اور یہ اس کی انفرادی خصوصیت ہے جو ناول میں اس کے کردار کے ارتقا میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس لئے تنہا ہے کہ شعور و ادراک اور سچائیوں کو سمجھنے اور جھیلنے کی جس منزل پر وہ ہے وہاں کوئی دوسرا اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اور یہ بھی اس کی انفرادی خصوصیت ہے ہنری جیمس دی آرٹ آف فکشن (THE ART OF FICTION) میں کہتا ہے:

> "DO NOT THINK TOO
> MUCH ABOUT OPTINISM
> AND PESSIMISM,
> TRY AND CATCH THE
> COLOUR OF LIFE ITS-
> ELF"

اور زندگی کا یہ رنگ ناول میں کبھی پلاٹ کے ذریعہ ابھرا جاتا ہے کبھی کرداروں کے ذریعہ۔ اس ناول کا اکیلا اور لافانی کردار کنول کماری ٹھاکر یہی رنگ بھرنے کی کوشش میں سرگرداں ہے۔ اور اس کوشش میں وہ دیکھتے دیکھتے ایک بہت مضبوط عورت کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے جیسے ایک فوق البشر بن جاتی ہے۔

فوق البشر عورت کی شکل میں اپنا تعارف دینے والی کنول کماری ایک کنفیوژن پیدا کرتی ہے۔ اور اس کا مطالعہ کرنے والا تھوڑی دیر کے لئے الجھن میں پڑ جاتا ہے۔ کہ ٹھاکر کی

جو اپنا آئیڈیل یا جیل کو بناتی ہے۔ جو انسانی کمزوریوں سے بالاتر اور انسانی خامیوں سے بلند برفانی سمندروں پر اکیلا سفر کرتا ہے اور وہ خود اپنی ذات میں بھی انسانی کمزوریوں سے مبرا نظر آتی ہے تو کیا وہ ایک مثالی دنیا کا کردار ہے۔ جو اپنے خوابوں کے سہارے ایک (UTOPIA) کی تشکیل کرتی ہے۔ ویسے اس کے اور اس کے ناجیل کے درمیان ایک وسیع فرق یہ ہے کہ ناجیل کے یہاں محبت کا فقدان ہے اور وہ اس لئے کہ وہ سراپا محبت ہے یہاں کنول کے یہاں محبت کا فقدان نہیں ہے۔ بلکہ وہ جذبۂ محبت کے اظہار سے گریز کرتی ہے۔ یا فرار حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس کا یہ گریز اتنا خوب صورت اور جادو اثر ہے کہ جو اس سے ملتا ہے اس کی نگاہوں میں دنیا کے رنگ جاذب نظر اور گہرے ہو جاتے ہیں

"آج صبح سے میں بہت خوش رہا تھا آج میں
کنول کماری ٹھاکر سے ملکر آرہا تھا۔ اور دنیا
کی رنگ میری نگاہوں میں جاذب نظر اور
گہرے تھے۔ آج طلوعِ آفتاب سے لے کر
غروبِ آفتاب تک خوشی سے زمین کا ذرہ
ذرہ میری نگاہوں میں رقصاں رہا تھا۔"

ناول میں کردار نگاری کی ایک خوبی یہ بھی پائی جانی چاہیئے کہ ایک اہم ترین کردار کے مقابلے میں دوسرا اہم کردار موجود ہو جو مختلف مراحل پر اس کی کاٹ کر سکے یا جو اس کی تمام تر ندرت کے باوجود اس سے مرعوب ہوتا نظر آئے۔ یہ خوبی بدرجۂ اتم "آگ کا دریا" میں موجود ہے۔ آگ کا دریا میں، گوتم، چمپا احمد، کمال، ہری شنکر، اور نرملا جگہ جگہ ایک دوسرے کے مدِمقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ اور کوئی کسی کے سامنے بونا نظر نہیں آتا۔ لیکن "تلاش بہاراں" کی کنول کماری ٹھاکر کسی دوسرے کردار کو خود سے آنکھ ملانے نہیں دیتی۔ اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناول کا ڈھانچہ (STRUCTURE) ہی کچھ ایسا ہے کہ یہ ایک کردار پر مشتمل ناول ہو کر رہ گیا ہے اس طرح ناول شروع بھی کنول ٹھاکر سے ہوتا ہے اور ختم بھی اسی پر ہو جاتا ہے۔ درمیان میں بقیہ کردار آتے ہیں جاتے ہیں۔ اور ایک کرشنا کے علاوہ کوئی دوسرا کردار خاص تاثر نہیں چھوڑ پاتا۔ اور کرشنا بھی کنول کماری کے نظریات اور آئیڈیولوجی کی تصویر ہے۔ جو اکثر اوقات اس کا SHADOW بنتی نظر آتی ہے۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ کنول کماری وہ تنہا کردار ہے جسے ناول کا PIVOT کہا جاسکتا ہے۔ اور جس پر پورے ناول کا انحصار ہے آخر ایسا کیوں ہے کہ کوئی دوسرا مضبوط کردار اس کے مقابلے میں کھڑا نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ کم از کم ایک مدِمقابل کردار کی موجودگی خود کنول ٹھاکر کے کردار کو زیادہ تہہ دار بنا دیتی۔ لیکن شاید یہ تھا کہ جمیلہ ہاشمی جس عورت کو فوق البشر عورت کی شکل پیش کرنا چاہتی ہیں۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے جذبات و خواہشات کا مجموعہ کسی مکمل انسانی کردار کی موجودگی اس بت کو توڑ سکتی تھی۔ اور اس طرح ناول اپنا اولین مقصد کھو دیتا۔ حالانکہ ایک سطح پر کنول ٹھاکر اور مول فلنیڈر کے درمیان مماثلت اور مطابقت نظر آتی ہے۔ لیکن وہ صرف اس حد تک کہ کنول اور مول دونوں وقت کے حالات کے سلگتے تودے پر بیٹھی تنہا رہ گئی ہیں۔ لیکن ایک حالات کے سامنے بے بس اور دوسری حالات کو اپنے بس میں کرنے والی۔ مول اس لحاظ سے ایک مکمل کردار ہے کہ وہ سانس لینے کے عمل سے مختلف بستروں کی زینت بننے تک ایسا کردار ہے جس کے اعمال و افعال اور حرکات و سکنات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ کنول عام انسانی محسوسات و ممکنات سے الگ ایک (UTOPIA) کی تعمیر کرتی ہے۔ جس تک رسائی ناول کے قاری کے لئے کارے مشکل ہے۔

باتیں اگر پھر اسی حوالے سے آگے بڑھیں تو بہتر ہے کہ کنول ٹھاکر واقعی فوق البشر ہے یا کمزور انسانی طور اور افعال

جذبات واحساسات سے خود کو الگ رکھنے کی کوشش میں تھکی اور جھنجھلاتی ہوئی ایک برافروختہ عورت۔

"کنول ٹھاکر نے ہر ایک کو اپنے محبت میں پناہ
دی ہے اور پھر بھی اس نے کسی سے محبت نہیں
کی"

یہ وہ صورت حال ہے کہ کنول ٹھاکر کی محبت شفقت اور ماتا تو بنتی ہے محبت نہیں بن پاتی۔ وہ کسی کو اپنے قریب ہونے کا موقع ہی دیتی ہے اور نہ کسی پر کھلتی ہے۔ یہ بات چمپا احمد کے ساتھ بھی ہے لیکن چمپا کی خموشی اور اس کے ضبط میں ایسی گہری جذباتیت پوشیدہ ہے کہ وہ جس کے سامنے کھلتی ہے تو کوئی پوشیدگی نہیں رکھتی۔ جب کہ کنول ایسے لمحوں میں بھی کش مکش کا ماحول پیدا کر دیتی ہے اس کش مکش کا شکار وہ خود بھی ہے اور اپنے قاری کو بھی اس کش مکش سے دوچار کرتی ہے۔

"یقیناً میری طبیعت میں آوارگی ہے مگر انسانوں
کو پسند کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں۔ اب جو
میں نے اتنا ٹرکنفشن کیا تو اس لئے کہ تمہارا
شیشے کا گھر بھی ٹوٹ چکا ہے اسے تم نے
افسوس خود ہی مسمار کر دیا کچھ دن اور ثابت
رہ لینے دیتے اسے بڑا خوب صورت تھا
بلور کا مندر جس کے اندر گوتم سدھارتھ کی
مورتی براجمان تھی" (آگ کا دریا)

"میں گھنٹوں اس کے پاس گذارتے ہیں۔ اس
کی ہنسی میں شامل ہوا ہوں اس کی چھوٹی چھوٹی
مسرتوں میں شریک رہا ہوں وہ ہنستی بھی میری
تمہاری طرح ہی تھی۔ پھر بھی کچھ تو تھا جو کبھی
اس بات پر وثوق سے یقین کرنے کو نہیں،
کہتا تھا۔ کہ تم اس کے دماغ میں کون سے نقطے
پہ ہو وہ تمہیں کتنا چاہتی ہے تم اس کی نگاہ ہو
میں کیا درجہ رکھتے ہو" (تلاش بہاراں)

"اس نے کرسی کے پشت سے سر لگا لیا: بولی ہم
پر حق تو کسی کو بھی نہیں ہے یہ حق میں نے اپنے
باپ اور بھائی کو بھی نہیں دیا تھا۔ پھر بھی آج
جی چاہتا ہے آپ ناراض ہولیں۔ میں قصور وار
ہوں" (تلاش بہاراں)

پہلا اقتباس ایک ایسے کردار کو پیش کرتا ہے جو بڑی ہی اپنائیت کے ساتھ زندگی کی کلفتوں کو جھیلنے کا ہنر جانتا ہے جس کے دل میں چھوٹے چھوٹے جذبات بھی پلتے ہیں۔ لیکن جس کا ذہنی بلوغ اسے اس کا اظہار سے روکتا ہے۔ لیکن وہ شخص (گوتم نیلمبر) جو ان کے اس چھوٹے چھوٹے جذبات کا تقریباً محرک ہے جب وہ سامنے آتا ہے تو وہ کردار اپنے آپ کو بالکل ننگا کر دیتا ہے اور اس طرح کہ اس کا قاری جو ابھی کچھ دیر قبل تک اس کے محتاط رویے کے شانہ بہ شانہ چل رہا تھا۔ ذہنی کوفت کا شکار نہیں ہوتا۔ بلکہ رشتوں کے طلسم کے ایک انوکھے عرفان سے گذرتا ہے۔ اور پورا ماحول نکھرا یا ہوا ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ خوابوں کی مسافر اور کائنات کے اسرار سے معمور چمپا احمد شروع سے آخیر تک کوئی مثالیت پسند کردار نہیں بنتی۔ لیکن مثالی کردار ضرور بنتی ہے۔

دوسرا اقتباس ایک ایسے کردار کا اسکیچ پیش کرتا ہے جس کی قربت مثالیت پسند محبت اور اپنائیت سب کچھ غیر یقینی اور غیر زمینی نظر آتا ہے جس کے نتیجے میں وہ دوسروں کو مرعوب تو ضرور کرتا ہے۔ لیکن نہ تو وہ دوسروں کی سانسوں میں شریک ہو پاتا ہے نہ دوسرے اس کی سانسوں میں شریک ہو پاتے ہیں یہ وہ کردار ہے جو نظریوں اور اصولوں کا ایک منفرد جہان ضرور تعمیر کرتا ہے لیکن اس جہان میں وہ خود بھی پرسکون نہیں ہے۔ انسانی زندگی کے تقاضے اس کے لمس سے محروم ہیں۔ اور اس کا حاصل ان تقاضوں سے اوپر اوپر گذر جانا یا کہہ سکتے ہیں کہ فوق البشری

راستوں پر گامزن ہوتا ہے۔

لیکن تیسرا اقتباس جو اقتباس والے کردار کو ہی واضح کرتا ہے اس کے مکمل طور پر فوق البشر ہونے سے انکار کرتا ہے۔ اور اس بات کی تائید کرتا ہے کہ اس کردار نے اپنے نظریوں اور اصولوں کی سختی اور کٹھورتا کی بنا پر خود کو اس قدر تنہا اور تھکا ہوا بنا دیا ہے کہ وہ باوجود جذبات سے فرار حاصل کرنے کی کوششوں کے بعض جگہوں پر ان جذبات کے ہاتھوں کمزور ہو جاتا ہے اور اس کے اظہار سے بے بسی جھلکتی ہے۔ اور بے اطمینانی جو ایک انسانی تقاضہ ہے انسانی جذباتیت کے انضمام کے ساتھ ساتھ قوت ارادی اور ضبط کی بڑی ہی خوب صورت تصویر ہمیں "آنگن" کے عالیہ کے یہاں ملتی ہے جو ایک لمحے میں صفدر بھائی سے شادی کرنے کے بارے میں سوچتی ہے اور دوسرے ہی لمحے میں بڑی مضبوطی کے ساتھ دوسرا فیصلہ کر لیتی ہے۔ حالانکہ وہاں بھی تھوڑی دیر کے لئے آئیڈیلزم کی بات پیدا ہوتی ہے۔ کہ شاید عالیہ صفدر بھائی کو دیوتا سمجھ رہی تھی۔ آدمی نہیں۔

آگ کا دریا، آنگن، تلاش بہاراں تینوں تقریباً ایک عہد میں لکھے گئے ناول ہیں۔ اور تینوں خواتین کی تصنیف ہیں۔ اس لئے اہم کرداروں کی تخلیق ایک نفسیاتی مماثلت تینوں کے یہاں نظر آتی ہے۔ لیکن اول الذکر دو ناول اپنے کرداروں چمپا اور عالیہ کو اصول و نظریات کے بتوں کی پرستش نہیں بناتے۔ اور ان کے یہاں مثالیت پسندی کا گزر نہیں ہوتا۔ حالانکہ چمپا احمد اپنے عہد کی محسوسات سے ہم آہنگ ایک ایسا کردار ہے جو اس عہد کی کش مکشوں سے نبرد آزما بھی ہے اور ان کے سامنے سر تسلیم خم بھی نہیں کرتا۔ اور اس کے ساتھ خالص انسانی کمزوریوں، جذباتیت اور رومانی رویے سے پہچانا بھی جا سکتا ہے۔ لہٰذا وہ بڑا ہی مکمل کردار ہے۔ جس کی تخلیق اردو ناول ایک اہم معرکہ ہے۔ اسی طرح عالیہ ہے جو ایک بحرانی دور میں نشو و نما پاتی درمیانی طبقے کا ایک فرد ہے۔ بڑے ہی سادہ انداز میں زندگی شروع کرتی۔ اور ناول کے اختتام تک اسی سادگی کے ساتھ نباہ کر ڈالتی ہے ہر دو کردار کے برعکس "تلاش بہاراں" کی کنول کماری ٹھاکر کسی مخصوص عہد کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ وہ غیر مرئی اور لافانی نظریات تخیلات، قوت ارادی اور بلند حوصلگی وغیرہ سے عبارت ہے۔ جو ہر عہد کی زندہ جاوید قدروں کی تشکیل کا بیڑا اٹھاتی ہے جو ذہن کی بلندی پر واقع ہے اور دل کی نازک گتھیوں سے ناواقف اور مبرا۔ جو عشق کرتی ہے تو اپنے نصب العین سے اور پرستش کرتی ہے تو مابعد الطبعیاتی جہان میں بسنے والے لازوال اصول کے خوابوں کی۔ جس کا حوصلہ یہ ہے کہ میری زندگی کا آخری لمحہ میرے خون کا آخری قطرہ مشرق کی بھولی روایتوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور انہیں قابل عمل بنانے میں صرف ہوگا۔

"میں اپنے خیالوں سے پردہ اٹھا دوں تو کوئی
اس تلاطم کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے گا"

ناول اس نامکمل خط کے ساتھ ختم ہوتا ہے جو کنول کماری ٹھاکر اپنے بھیا کو لکھ رہی تھی۔ اور جس کے حوالے سے ناول کی مندرجہ ذیل آخری سطور میں باتیں کہی گئی ہیں۔

"نہ جانے کنول کماری ٹھاکر اپنے بھیا کو کیا لکھنا چاہتی تھی۔ اپنے اور کون سے خواب کا ذکر کرنا چاہتی تھی۔ شاید اس نے اپنے خط کو اگلی سطر بہاروں کے انتظار میں ختم نہیں کیا تھا بہار جو اس کے لئے کبھی نہ آسکی۔ بہار جو ہم سب کے لئے کبھی نہ آسکے گی۔ بہار جس کی تلاش میں قافلے سرگرداں نکلیں گے مگر اسے نہ پا سکیں گے"

ناول اپنے خاتمے پر زیادہ ہی پھیل جاتا ہے۔ اور بلاشبہ کنول کماری بیش قیمت قدروں اور روایتوں کی تلاش میں بھٹکنے والی ایسی بے چین روح بن جاتی ہے جو ہر عہد اور ہر دور میں نہ دیکھی گئی بہاروں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ زندگی کے ڈرامے کا پلاٹ ہے اور رجائیت اور قنوطیت اس کے SUB PLOTS

کنول کماری اس ڈرامے کا ایک اہم کردار ہے جو کائنات کی بلند و بالا قدروں کے حکم میں ایسا پڑتی ہے کہ جذبات و احساسات سے مبرا نہ ہوتے ہوئے بھی مبرا نظر آنے لگتی ہے۔ وہ مثالیت پسند لڑکی ایک utopia کی تشکیل کے لئے نکلتی ضرور ہے لیکن بھول جاتی ہے کہ اس سے قبل بھی کئی اس سفر پر نکلا اور دھند میں گم ہو گئے۔

باتیں شروع کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ناول جب اپنے خاتمے پر پہونچتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قصہ کی شروعات اب ہونے والی ہے دراصل ہوتا یوں ہے کہ پورا ناول شروع سے آخر تک ایسا تسلسل پیش کرتا ہے کہ قاری ناول کے اندر چھپا ہوا قصہ بھول جاتا ہے۔ اور اس طرح کنول کماری شخصیت کے سحر میں اسیر ہوتا ہے کہ اسے لگتا ہے کہ جیسے کنول کو پہچانتے پہچانتے ناول ختم ہو گیا ہو اسی بات کی تائید کے طور پر دوسری اہم بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ پورا ناول صرف کنول ٹھاکر پر مشتمل ہونے کی بنا پر ایسی یکسوئیت اور انہماک پیدا کرتا ہے کہ قصہ، پلاٹ، کلائمکس یا دوسرے کرداروں کے محاسن و نقائص کنول کے کردار کے علاوہ ناول سے برآمد دوسری پیچیدگیوں وغیرہ کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں مل پاتا ہے۔ لگتا ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ ناول کا نام ذہن سے نکل جاتا ہے۔ اور کنول کماری ٹھاکر ہی اس کا نام بن جاتا ہے۔ تو جہاں کنول کماری ٹھاکر ناول کے افق کی مہتابانی ہے وہیں ناول کے نظم و نسق کی سطح پر وہ نقصان دہ بھی ہو جاتی ہے اور اکثر غیر فلسفیانہ مزاج کا قاری بوجھل پن محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہیں رہ پاتی۔ کیونکہ ناول کی زبان میں بڑی گھلاوٹ اور چاشنی ہے۔ اور ناول نگار کے لہجے کی خطابت اسے پھر اپنے میں سمیٹ لیتی ہے اور یوں بھی کہ وہ ناول کا قاری ہے کنول کماری ٹھاکر سے بڑی ہمدردی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور یہ ہمدردی اس سوال کی دین ہے جو ناول نگار نے ہی کھڑا کیا ہے:

> "کنول کماری ٹھاکر میں ... سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم نے ایک اندھیرے ... سے اپنا سفر شروع کیا اور جب دنیا چھوڑ کر چلی گئی ہو تب بھی وہ اتنی ہی اندھیری ہے"

جوگندر پال

موجود

میں اپنے بابا کو ایک ٹک دیکھے جا رہا ہوں
جب کبھی میری نگاہ ان کی طرف اٹھتی ہے تو انہیں دیکھتا ہی چلا جاتا ہوں۔ جی بھرنے میں ہی نہیں آتا لمبی داڑھی جو برف ہو کر بھی ہر روز ذرا سی اور لمبی لگتی ہے، چٹ مونچھیں جس سے ان کے بالائی ہونٹ ناک کی دونوں صاف اطراف سے جڑ کر ان کی پہچان کو اتنا گاڑھا کئے ہوتے ہیں کہ ان کا خیال ہی آنے پر وہ خود آپ سامنے آجائیں۔ اور ان کی ٹھہری ٹھہری آنکھیں، جو اپنی تہوں میں سارے جہاں کا عکس لئے ہوتی ہیں۔ اور وہ جب بھی جس دور دراز مقام کا قصد کر لیتے ہیں اسی دم آنکھوں ہی آنکھوں میں وہاں جا پہونچتے ہیں۔ اور عین ہمارے سامنے ہوتے ہیں مگر ہمیں نظر نہیں آتے۔

ایسے موقعوں پر میں ڈر سا جاتا ہوں تو بابا مسکراتے ہوئے مجھے مخاطب کرتے ہیں۔ "میں دکھ نہیں رہا ارشد میاں؟ —— ہہ ہہ —— ہا ہہ ——" ہنستے ہنستے ان کے چہرے کے اوجھل خطوط اپنی اپنی جگہ برآمد ہونے لگتے ہیں۔ "مایوس چہروں کو اس طرح گھور گھور کر دیکھیں میاں۔ تو وہ بھوت سے معلوم ہونے لگتے ہیں۔"

"ہاں، بابا"

"ہاں، بابا کیا؟ میرے چہرے سے آنکھیں ہٹاؤ، ورنہ مجھے بھی اپنا آپ بھوت معلوم ہونے لگے گا"

بابا کو بڑی فکر تھی کہ میرے ہوش اتنے اڑے کیوں رہتے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ انہیں فرنٹ سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھائے میں گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا —— نہیں، گاڑی آپ ہی آپ چل رہی تھی۔ اور میں بابا کی باتیں سن رہا تھا۔ اس دوران میں ان کے چہرے کی طرف منہ موڑنے کو سوچتا تو وہ اسی دم مجھے ٹوک دیتے

"نہیں، ارشد میاں، راستوں پر ہمیشہ نظر رکھا کرو۔ جو نہیں تو وہ سیدھا عدم آباد جا اترتے ہیں۔ اور خدا کے نیک فرشتے بے چارے پریشان ہو جاتے ہیں۔ کہ یہ لوگ بغیر بلاوے کے کیونکر آ پہونچے ہیں —— ہہ — ہا ہہ ہہ ——"

بابا کے قہقہے سن کر مجھے لگ رہا تھا کہ سڑک پر رم جھم کا سماں بندھا ہوا ہے۔ میں نے غیر محسوس طور پر ونڈ اسکرین پر وائپرز کو چلا دیا۔

"ارے بھائی، بارش کے چھینٹے تو تمہارے ذہن میں پڑ رہے ہیں۔ گاڑی کا منہ کیوں صاف کرنے لگے ہو؟"

اسی اثنا میں نے دیکھا کہ کوئی فرلانگ بھر آگے خالی سڑک کے بائیں کنارے ایک گاڑی کھڑی ہے۔ اور کوئی شخص اس کی دائیں پشت پر لیٹے شاید پہیہ اتار رہا ہے۔ میں اس شخص کو دور سے دیکھے جا رہا تھا۔ اور سوچتے جا رہا تھا کہ ابھی اپنی گاڑی کو ایک طرف کر کے گزر جاؤں گا۔ مگر گاڑی کو ایک طرف کرنے کی بجائے میں بڑے اطمینان سے اپنی اسی سیدھ پر چلے جا رہا تھا۔ اپنے سامنے اس گاڑی کی پشت سے ٹکرا کر مجھے لگا اپنے دل و دماغ سے ہی ٹکرا —— ! —— کی آواز سنائی دی۔ اور یوں وہاں کوئی کسی ہوئی گانٹھ چٹ کر کھلی تو مجھے پتہ چلا کہ کیا ہو گیا ہے۔

"قانون تمہیں سزا دے یا چھوڑ دے، بابا نے مجھے

اپنا فیصلہ سنایا۔ "میری طرف سے آج سے تمہارا لائسنس ضبط"
"میں نے جان بوجھ کے تھوڑا ہی کیا ہے"
"جان بوجھ کے تو کوئی مجرم بھی اپنے جرم کا ارتکاب نہیں کرتا میاں" بابا مجھے سمجھانے لگے۔ "سبھوں کے حواس ہی کھوئے ہوتے ہیں" "دیکھو ارشد میاں سب کچھ کھو دو پر اپنے حواس مت کھوؤ۔"

بابا فوج میں ڈاکٹر ہوا کرتے تھے ایک بار انہوں نے اپنے ایک فوجی دوست کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ "وہ دشمن کی گولیوں سے بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا ٹھنڈا ہوئے کئی لمحے بیت چکے تھے۔ مگر میرا یار جوں کے توں آنکھیں کھولے مکرا رہا ہوشمندی کا یہ عالم تھا کہ اس وقفے کے سارے دوران موت اس کے ذہن میں رجسٹر ہی نہ ہو پائی"

"مگر یہ بھی کیا ہوشمندی ہوئی بابا کہ مرجانے کی بھی خبر نہ ہو"
"ارے ہاں یہ بات تو مجھے سوجھی ہی نہیں"

کسی برجستہ دلیل پر بابا بے جھجک ہتھیار ڈال دیتے ہیں، اور یوں ہنستے ہو کر اپنی جیت کے لئے دل کو گھیرے میں لے آتے ہیں۔

میں بدستور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ہوا ہوں اور بڑے پیار سے بابا کو دیکھے جا رہا ہوں۔

"ارے ناشتے سے ہاتھ روک کر میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"
"آپ کو بابا" میں نے بوکھلا کر جواب دیا ہے۔
"تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں اتنی محبت سے دیکھنا ہو تو بیگانوں کی طرف دیکھا کرو، جو ہمارے اپنے ہوتے ہیں میاں، وہ تو اصل میں ہم آپ ہی ہوتے ہیں"
میری سمجھ میں نہیں آیا ہے
"وہ کیسے بابا؟"

بابا نے قہقہہ لگایا ہے۔ انہیں کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے تو وہ عادتاً قہقہاتے ہوئے اس کا حل دریافت کر لیتے ہیں" "وہ ایسے میاں کہ ہمارے اپنے تو ہمارے اندر ہی ہوتے ہیں جن اپنوں کو ہم اپنے باطن سے باہر دیکھ دیکھ کر اتنا خوش ہوتے ہیں وہ وہاں کہاں ہوتے ہیں؟"

میں نے چونک کر بابا کی جانب نگاہ اٹھائی ہے۔

"ذرا غور کرو میاں، اپنی آنکھوں سے ہمیں ایک اپنا ہی چہرہ دکھائی کیوں نہیں دیتا؟ اسی لئے میرا کہنا ہے کہ جب دیکھنا ہے تو غیروں کو دیکھو اور انہیں اتنی آؤ بھگت سے آنکھوں کی چار دیواری میں لے آؤ کہ تھکے ماندے بیچارے اپنے ٹھکانے پر آ لگیں۔" بابا کے منہ میں کوئی بڑی بات آ جائے تو وہ منہ میں ڈالے ہوئے نوالے کو گلے میں سرکا کر پہلے اسے پورا کر لیتے ہیں۔ "آنکھیں بڑی نعمت ہیں ارشد میاں، کوئی دیکھنے والا ہو تو ان تیلیوں میں صرف پانچ دس لوگ ہی نہیں۔ ساری دنیا سمٹ آتی ہے"

بعض اوقات بابا میرے سامنے خاموش بیٹھے ہوتے ہیں۔ مگر مجھے معلوم ہوتا ہے میں ان سے ان کا پہلے کا سنایا ہوا کوئی واقعہ سن رہا ہوں۔

"دوسری جنگ عظیم کی آخری دنوں کی بات ہے ارشد میاں، ایک دن کوئی انگریز افسر کوئی جاپانی سپاہی کو میرے اسپتال میں چھوڑنے آیا۔ جاپانی سپاہی کا بہت سا خون خارج ہو چکا تھا اور وہ کمزوری کی شدت سے بے ہوش پڑا تھا۔ اسے اپنے چہرے کے اڑے اڑے نقوش میں کہیں موجود نہ پا کر مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنے اندر ہی اندر نہ معلوم کن سرنگوں کے راستے اپنے گھر پہونچا ہوا ہے۔ تاکہ کوچ سے پہلے وہ ایک بار بیوی بچوں سے مل آئے"

"اسے اس غیر حالت میں پا کر میں نے انگریز افسر سے پوچھا اسے میرے پاس فوراً کیوں نہیں لایا گیا؟"
"میں تو اسے اب بھی نہیں لانا چاہتا تھا ڈاکٹر" اس افسر نے اسے ٹھوکر مارنے کے انداز میں ہوا میں اپنا پیر جھٹکا

مرنے دو ملٹری اسٹریٹجی کہا جاتا ہو اس محاذ پر ہار سے پورے پچیس جوان کام آگئے ہیں۔

" اس انگریز افسر کی آنکھوں میں نفرت کے سوکھے بگولوں میں مجھے کہیں آتش زدگی کا احساس ہوا۔ اور میں اپنے آپ سے پوچھنے لگا ہم کن سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔ اور کن سے کیوں محبت؟ بے شک تو ہوتے ہیں ہم اپنی محبت کی خواہش سے مگر ناسمجھی کے باعث اپنی محبتوں کی خواہش کی شکست سے نفرت کر کے لے جاتے ہیں"

اگرچہ بابا کا عام طور پر مجھ سے ایک شفیق بزرگ کے مانند ہی پیش آتے تھے۔ تاہم ایسے بھی ہوتا ہے کہ تبول تنہاہ کے لئے وہ سب آمل اپنی بزرگی سے خالص دوستی کی سطح پر اتر آئے۔

"تم اپنی ماں کو کیا جانو ارشد میاں؟ تم ابھی پورے دو سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ چل بسی۔ ایک ہی عورت تھی مگر اتنے روپ، کہ میں دیکھتا رہ جاتا۔ اب کچھ کے قاعدے کی طرح سلیس، بے لوث اور لامحدود، مگر اتنے میں ہی اب اس قدر پیچیدہ، اور ملوث اور محدود، کہ میں چڑ جاتا۔ خدا بخشے، چڑ چڑ کر میں اس سے جھگڑنے لگتا۔ مانو محبت کے باعث ہی اس سے نفرت سی ہونے لگی ہو۔ جب آدمی جذبوں کے تخلیقی تقاضوں سے بے بہرہ ہو تو اور تو اور، اپنے محبوب کو بھی اپنے بنے آدرشوں کا اسیر بنا لینا چاہتا ہے۔ اور ایسا نہ ہو پانے پر دانت پیستا ہے۔ بولو، یہ خود پارسائی نہیں تو اور کیا ہے؟"

" مگر میں بتانا یہ چاہ رہا ہوں ارشد میاں، کوئی ایک شخص ہو، یا ساری قوم، کوئی کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ نفرت کرنے والا دراصل لاعلم ہوتے ہیں اور اپنی لاعلمی کے باعث معصوم، ذرا ذرا سوچئے تو مارنے کی خواہش کیونکر بجا ہو سکتی ہے؟ چنانچہ میں نے اس جاپانی سپاہی کو موت سے بچانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا"

" اسے خون کی فوری ضرورت تھی! مگر اس کے خون کا نمبر وہاں نایاب تھا ___ ارے! ___ میں نے! جیسے آپ کو جھنجھوڑ کر یاد کروایا ___ دشمن کا سپاہی ہے تو کیا؟ اس کے خون کا نمبر تو وہی ہے جو تمہارا ہے ___ وہ سماں آج بھی میرے سامنے ویسے ہی آباد ہے ___ وہ آنکھیں بند کئے بے ہوش پڑا ہے اور میرا خون اس کے وجود میں سرایت کر رہا ہے۔ اور ایک قالب میں دو دلوں کا سنگم ہوتے ہی اس کی مندی ہوئی آنکھیں ___ مجھے لگ رہا ہے میری ہی آنکھیں وا ہو گئی ہیں۔ اور زندگی کی فتح پر ہر طرف سے نقاروں کی صدا اٹھنے لگی ہے ___"

" کھانے کی میز کے اس کنارے پر بیٹھے میں، اس کنارے پر بابا کے چہرے پر متواتر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ انہی کا خون میرے وجود میں رقصاں ہے اور زندگی کے نقارے میرے ہی ناڑیوں میں بج رہے ہیں۔ اور ___ اور کہ ___ کہ یہاں بیٹھے بیٹھے میں کوئی اور ہو گیا ہوں شاید وہی سپاہی"

" جب سپاہی صحت مند ہو گیا" بابا اپنی کہانی کو سمیٹنے کے انداز میں گویا ہوئے ہیں۔ " تو اسپتال سے روانگی سے پہلے اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لئے اور گلوگیر آواز میں بولا۔ اب میں اپنا ایک متبرک وعدہ پورا کر سکوں گا"۔

کون سا وعدہ؟

میں نے اپنی ننھی منی بچی کو یقین دلایا تھا کہ جنگ سے زندہ لوٹ آؤں گا۔

میں نے اسے بے اختیار اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

ارشد میاں، اور میرے خدا نے مجھے بڑی محنتوں کا یہ انعام دیا کہ اس کے سینے سے لگے ہوئے میں نے بھی اس کی ننھی منی بچی کی بے کراں مسرتیں پی لیں۔ جو اپنی ذات پر ایک آپ ہی قبضہ جمائے ہوتا ہے میاں، اس موڑ کا بدن دیکھا اسی

کی تاب توں کا ایک پنجرہ سا ہے۔ بس بندی بن کے جان نکلنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ اسے کیا پتہ کہ جب ہم اپنی ذات کا حق سبھوں کو سونپ دیتے ہیں تو ہم ہر ذات میں جینے بن لگتے ہیں۔

بابا مجھے تو ہوش مندی کی تلقین کرتے رہتے ہیں مگر انہیں طویل دعریض نراں راستوں پر بھٹکتے ہوئے پاکر مجھے فکر لگی رہتی ہے کہ کسی دن وہ اپنی دھن میں کدھر کے کدھر نکل جائیں گے اور پھر کبھی دکھنے میں نہ آئیں گے۔

"گھبراتے کیوں ہو میاں؟ جو دکھنے میں نہیں آتے وہ بھی کہیں نہ کہیں بہ عافیت مقام کئے ہوتے ہیں۔ جانتے ہو کیا ـــــ؟"
میں نے کسی نہایت عجیب بات کی توقع میں کان کھڑے کر لئے۔
کل مجھے تمہارے دادا مرحوم کی یاد ستا رہی تھی۔ میں نے ان کا پسندیدہ سیتاپوری تمباکو خریدا۔ اور سیدھا ان کے پاس جا پہونچا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کلیجے سے لگا لیا۔ اور بولے مجھے بھی ادھر کئی بار تمہارا خیال آیا۔ کبھی کبھی آجایا کرو۔ پھر ہم تا دیر دو جہاں کی باتیں کرتے رہے۔ جب میں واپسی کے لئے اٹھنے لگا تو فرمایا۔ بٹیا، آدھے سے تمباکو سے کیا بنے گا؟ آئندہ آؤ تو کم سے کم دو کلو تو لاؤ۔"

"مگر بابا دادا مرحوم کے پاس آپ پہونچے کیونکر؟"
کیوں، یہی دو قدم چل کر، پڑوس میں شیخ امداد علی کے گھر، ان کے مُسن والد صاحب کو بھی ابا کے مانند سیتاپوری تمباکو بہت مرغوب ہے"

میں نے بابا کو نہایت محبت سے دیکھتے ہوئے گویا انہیں اپنی جگہ سے اٹھا کر اپنی آنکھوں میں بھر لیا ہے
"ہنیا، ارشد میاں، مٹی کی ایک ہی مورت کو اتنے دھیان سے مت دیکھو، نہیں تو سدھ بدھ کھو کے اندھے ہو جاؤ گے"

میں نے ان سے اکثر سنا ہے تمہاری ماں کی موت پر میری دنیا اندھیری ہو گئی، بیٹے میاں ـــــــ اب وہ بھلی لوگ اس دنیا میں نہیں رہی تو میں کیوں رہوں؟ ـــــــ

انہیں دنوں میری ملاقات ایک پہونچے ہوئے درویش سے ہوئی۔ انہوں نے بڑی سخت گیر آواز میں مجھ سے پوچھا۔ تمہاری بیوی کا کیا نام تھا؟"
"زرینہ" میں نے انہیں بتایا۔"
"کیا زرینہ محض اپنا نام تھی۔"
"نہیں۔"
"محض اپنی شبیہہ؟"
"نہیں۔ وہ تو ـــــ وہ تو ـــــ"
"تو پھر جو چلی گئی ہے اس کے جانے پر کیوں روتے ہو۔؟"
انہوں نے مجھے ٹوک کر پوچھا۔ جاؤ، اسے ڈھونڈو،
"کہاں؟"
اس ساری دنیا میں جو اس کے جانے کے بعد بھی جوں کی توں ہے۔ غور سے دیکھو تو بات بنے۔
غور سے دیکھنے سے بابا کی بات واقعی بن گئی۔
وہ تو خدا نے خود آپ میری مدد کر دی میاں۔ انہوں نے ساری روئداد مجھے بے تکلف سنا دی۔ اس کی مدد کے بغیر مجھ اندھے کو کیونکر یکلخت نظر آنے لگتا ـــــ ہوا یوں کہ میں اپنے بستر پر خالی دیوار کی طرف منہ موڑے تمہاری ماں کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اسی دوران دیوار پر نہایت خاموشی سے تمہاری ماں کی تصویر کھنچ آئی۔ وہ ویسے ہی دودھ کا گلاس لئے میرے سرہانے آکھڑی ہوئی تھی ـــــ تمہیں یقین نہیں آ رہا؟ بے یقینی ہی ساری خرابی کی جڑ ہے میاں۔ ایمان کھو کر ہی تو آدمی نے اپنے خدا کو کھویا ہے۔ ـــــ مگر پہلے تم اپنی ماں کا پورا قصہ سن لو ـــــ پھر یہ ہوا کہ میں نے چپکے سے تمہاری ماں کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لے لیا۔ اور اسے بڑے پیار سے اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے دودھ کا گلاس اسی کے منہ سے لگا دیا ـــــ
ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ "نا معلوم تھا با[illegible]

تھے یا ہمارے آنگن میں موسلادھار بارش ہونے لگی تھی ــــ؟
آنکھیں بند پڑی ہوں تو نظر کیسے آئے۔؟ اتنے دنوں میں بے خبری
رہا کہ تمہاری ماں اب ہمارے ماما کا روپ اختیار کئے ہوئے
ہے۔ سو ادھر میں نے یہ خبر پائی اور ادھر سلمیٰ بی سے نکاح پڑھوا لیا
اور تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی ماں دلوادی۔ ــــ ہہ ہہ ــ
ــــ ہاہہ ــــ موسلادھار بارش سے ہمارے آنگن
کے جھاڑ سرسبز ہو کر لہلہاتی صدائیں بلند کرنے لگے۔

جذبے زوال پذیر نہ ہوں۔ تو وہ خزاں کے موسم میں اولین
شکلوں کے جھڑنے پر مرجھا نہیں جاتے۔ بلکہ نت نئی شکلوں
میں بسنے کے لئے کارفرما ہو جاتے ہیں۔ اپنی بڑی عمر میں بابا کو شکلوں
کی پہچان میں اکثر دھوکا ہو جاتا مگر اس سے انہیں چنداں
کوفت نہ ہوتی۔

سن رہے ہو میاں۔؟ اس دن گھر لوٹتے ہی بابا اپنی
یہ واردات بیان کرنے لگے۔ آج بڑے پل کی طرف جاتے ہوئے
میرا خیال یوں ہی تمہاری طرف چلا گیا مگر تمہاری شکل میرے
دل و دماغ میں آ رہی تھی ــــ ہاں میاں، میں تمہاری
شکل بھول ہی گیا ــــ ہنس ڈو کو ہنس۔ آگے سنو کیا پیش
آیا؟ اسی دوران میرے قریب ایک ٹیکسی رکی اور کسی نے
پوچھا کہاں جا رہے ہیں بابا!؟ پوچھنے والا نہ جانے کون تھا
مگر میں نے اس کی طرف سر اٹھا کے جو دیکھا تو معلوم ہوا ہوبہو
تم ہی تھے۔ بے چارہ تیرا ہنیک تھا کہنے لگا آئیے بابا۔ پہلے آپ کو
چھوڑ آتا ہوں۔

"مگر وہ میں ہی تو تھا بابا"

سوال یہ نہیں کہ بابا کو اپنی اس آخری عمر میں بصارت
وسماعت کا مسئلہ درپیش تھا۔ اہم صرف ان کا وہ جذبہ ہے۔
جس کی بدولت انہیں بیگانوں کی روپ دیکھا میں بھی اپنوں
کی بو مل جاتی ہے۔ پہلے تو میں بھی ان اس خبط پر ہنس دیتا
تھا۔ لیکن ہوتے ہوتے ان کے خبط میں شریک ہو کر مجھے اپنی
ذات کے کھلتے چلے جانے کا احساس ہونے لگا۔ کوتاہ محبتیں
جہاں ہمیں باندھ کر رکھ دیتی ہیں وہاں بے لاگ محبتوں سے بندھن
ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اور آدمی ہر کسی سے فطرتاً کھلے بندوں محبت
کرنے لگتا ہے۔

بابا کی موت سے چند پل پہلے میں ان کے سرہانے بیٹھا
تھا وہ نیم بے ہوشی میں آنکھیں موندے اپنے آپ سے باتیں
کئے جا رہے تھے۔

ابھی تک لیٹے ہوئے ہو بابا۔ اتنا لمبا سفر ہے
اٹھو، چلو

کہاں بابا ــــ؟ نہیں بابا۔ مجھے کہیں نہیں جانا ہے
نہیں بابا۔ اپنے آپ کو جانے سے کوئی نہیں روک
سکتا ــــ چلو اٹھو۔

نہیں بابا۔ تم اکیلے ہی چلے جاؤ۔ مجھے یہیں رہ جانا ہے
میں بدستور اپنے بابا کو ایک ٹک دیکھے جا رہا ہوں ●

بقیہ، ان پڑھ ہوا

صاحب کیا بتاؤں۔ میری بیوی نے برتن باسن سب کچھ
فروخت کر کے آپ کی فیس کی رقم فراہم کی تھی۔ ممتا کی ماری اپنے
بچے کی شکل دیکھنے کے لئے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ اس لئے کل
رات اسے حوالات لے گیا تھا۔ تاکہ وہ اپنے لخت جگر سے
مل سکے۔ ملنے کی قیمت سو ٹکے ادا کرنا پڑی تھی۔ جبکہ جرمانہ صرف
پچاس ٹکے ادا کرنے پڑے۔

میں نے معصوم بچے کی وکالت فیس کے لئے نہیں کی۔
کیونکہ معصومیت کی کوئی فیس نہیں ہوتی۔
وکیل نے مسکرا کر کہا اور لائبریری روم کی طرف چل دیا ●

طاہر نقوی (پاکستان)

روزِ حشر

میں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر سامنے شوکیس میں رکھا۔ اور ادھر ادھر دوسرا چہرہ تلاش کرنے لگا تاکہ اسے اپنے دھڑ پر سجا لوں مگر مجھے وہ کہیں نہ ملا۔ یہ پریشانی میرے اندر سے اچک اچک کر باہر نکلنے لگی۔ کہ اب باہر کیسے نکلوں گا۔ اور سوسائٹی میں کیسے جاؤں گا اس دوسرے چہرے کو شاید کوئی اوڑا اٹھا کر لے گیا تھا جس طرح میں کسی کا چہرہ لے آیا تھا یہ سوچ کر مسکراہٹ کی آہ میرے ہونٹوں کے درمیان جگہ بناتی ہوئی سامنے رکھے ہوئے میرے اپنے اصلی چہرے کی آنکھوں میں جا گھسی۔ اور میرے دل سے نکلے ہوئے خون کے قطرے ان آنکھوں سے آنسو بن کے ٹپکنے لگے۔ علاحدہ رکھنے کے باوجود میرا اصلی چہرہ میرے اندر کی تبدیلیوں کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس احساس کے بارے میں میری یہ سوچیں میرے مساموں سے ابل ابل کر میرے چاروں طرف ناچنے لگیں اور میرے اندر سے نکلی ہوئی گھڑے کی چکنائی میرے بدن کے ان ہی مساموں سے رِس رِس کر میرے پورے بدن پر لیپ کرنے لگی۔ سامنے رکھے ہوئے میرے اصلی چہرے کی نظریں اب میرے بدن سے پھسل پھسل کر میرے پاؤں پر پڑنے لگیں۔ تو اپنے اصلی چہرے کی ان نظروں کی چوٹ سے میرے پاؤں دکھن محسوس کرنے لگے میرے پاؤں پیدل چلتے چلتے کمزور سے کمزور ہو گئے تھے لیکن تھکن سے ابھی دکھے نہیں تھے۔ اور اب یہ خود میری نظروں کے بوجھ کو نہیں سہار پا رہے تھے۔ میں نے ہیجانی کیفیت میں اپنے پاؤں کو زور زور سے

گیا

زمین پر پٹخا۔ تو میرے اصلی چہرے پر ہنسی کا رسیلا پن ابھر کر چھا گیا اور میرے تمام اعضا الگ الگ ہو کر میرے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے

اپنے ان اعضا کی غصیلی نظروں سے گھبرا کر میں نے ادھر ادھر زمین پر ہاتھ مارے۔ مگر وہ دوسرا چہرہ۔ مجھے کہیں بھی نہ ملا۔ اب آہستہ آہستہ مجھ سے بھاگے ہوئے میرے اعضا میرے اندر داخل ہونے لگے لیکن اس کے باوجود مجھ کوئی خوشی محسوس نہیں ہوئی اس لئے میں نے ان کے واپس آنے کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے اس دوسرے چہرے کی تلاش جاری رکھی۔

وہ چہرہ نہ ملا تو پھر ہو گا کیا؟

یہ سوچ کر گھٹن کے احساس کی وجہ سے میرے اعضا جن میں سے کچھ اپنی جگہ پر آ گئے تھے اور کچھ اندر سما چکے تھے اب آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ اور شوکیس میں رکھا ہوا میرا اصلی چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ مجبوری کی تھکن مجھ پر اور میرے اعضا پر گرد بن کر مسلسل تہہ جما رہی تھی۔ یہ سوچتے ہی کہ چوری چھپے باہر جا کر بازار سے ایک اور چہرہ لے آؤں میں نے فوراً اپنے قدم باہر نکالے اور بھاگتا ہوا اسی خاص بازار میں جا پہنچا۔ میری توقع کے خلاف کسی نے میری طرف کوئی دھیان نہیں دیا بلکہ سب اوپر کی طرف منہ اٹھائے طرح طرح کی آوازیں نکال رہے تھے ان کا ساتھ دینے کے لئے اور بھی برابر شریک ہوتے جا رہے تھے اس لئے ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا لیکن میں ان سے لاتعلق اپنے ہی خول میں محصور اس دکان میں داخل ہوا تو حیرت کے دلدل میں میرے قدم اچانک جا گڑے دکاندار اپنی کھلی دکان میں شوکیس پر سوراخ دار چادر اوڑھے بےخبر سو رہا تھا۔ دکان کے اندر سارے شوکیس اور شیشے کی الماریاں خالی پڑی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ ممکن ہے کہ اس نے بکاؤ چہرے کہیں اندر چھپا رکھے ہوں۔ میں نے اسے جگانے کے لئے رازدارانہ انداز میں اس کا بازو ہلایا۔ اس وقت میرے اندر سے دبی دبی اور گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ جو واپس میرے اندر ڈوبتی بھی جا رہی تھیں وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھا جیسے کسی مشین کا بٹن دب گیا ہو اب میں

حیرت کے اس دلدل میں دھنسنے لگا تھا۔ اس کا چہرہ بھی غائب تھا میرے سوال کرنے سے پہلے ہی اس نے جواب دیدیا جیسے وہ محض جواب دینے کے لئے زندہ ہو۔ سوال کرنے کا اسے کوئی حق نہ ہو۔

ایک بھی نہیں بچا۔

مہنگے ہونے کے باوجود :

ہاں باہر سے جو لوگ آتے ہیں وہ سب خرید لیتے ہیں۔

اس نے میری طرف جملہ اچھالتے ہوئے جواب دیا۔

تو پھر یہاں والوں کا کیا ہوگا۔

اس نے اپنے اندر انگلی ڈال کر ایک اور جملہ نکالا اور اسے میرے اندر چپکے سے انڈیل دیا۔

یہ چھین جھپٹ کر کام چلا لیتے ہیں۔

تمہارا ——— اور تمہارا ———

اس لمحے میں اپنے اندر سے کوئی جواب تلاش کر کے اس کے سامنے رکھنا چاہتا تھا مگر تمام جملے اور الفاظ اس وقت ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے ——— ان میں سے کوئی جملہ باہر آنے کو تیار نہ ہوا۔

اب باہر بھیجنے شروع کر دیئے ہیں۔

باہر، باہر سے تو یہ آتے ہیں۔

اس نے میرا یہ جواب سن کر گہری ہنکاری بھری اور لپیٹ کر اپنے اوپر پھر چادر تان لی۔

اب کیا ہوگا میں نے چادر سے باہر نکلے ہوئے اس کے پاؤں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا، میرے اندر اس سوال کے جواب کی بے چینی کی چنگاریاں اڑنے لگیں ——— کوئی جواب نہ پاکر میں نے اس کا شانہ دوبارہ ہلایا۔

اب کیا ہوگا آخر۔ ؟

تو اس نے اندر ہی سے کہا۔ ان کی جگہ اب نقاب آگئے ہیں۔ میں نے یہ سن کر اس پر اپنے قہقہے کے کنکر پھینکنے چاہے۔ تو اسی لمحے میرے اندر میرے اعضا آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

میں ان کے جھگڑے چکانے کی ہمت نہ ہونے کی خوف سے پر ان کی طرف جان بوجھ کر متوجہ نہیں ہونا چاہتا تھا اس لئے میں اس کے اور قریب ہو گیا وہ مجھ سے کانا پھوسی کرنے لگا۔

تمہیں برابر والی دوکان سے یہ کم قیمت پر مل جائیں گے

داہیں یا بائیں۔

دائیں بائیں دونوں طرف۔

میں نے اس کا یہ جملہ حیرت سے خود ہی دہرایا۔ مگر دکان سے باہر دیکھ کر مجھے اس سے کہیں زیادہ حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی لئے میں نے اس کے جواب کو نظر انداز کر کے اور گھبرا کر باہر دیکھا۔ جہاں چند لوگ اپنے درمیان کھڑے ہوئے کے بدن کو نوچ رہے تھے۔

یہ سامنے کیا ہو رہا ہے ؟

دکاندار نے مجھے اپنی خاموشی کا طمانچہ مارا تو میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اور اپنے قدم اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر دکان سے باہر رکھے۔ اس وقت مجھے خدشہ تھا کہ کہیں میرے نکلتے ہی یہ لوگ یہی سلوک میرے ساتھ نہ کریں۔ مگر بھانت بھانت کے لوگوں کے ہجوم کے سوا اب وہاں کچھ نہ تھا سورج کی حدت سے لوگوں کے جسموں پر چڑھی اضافی چربی کے پگھلنے سے ان کے اندر کی سڑاند فضا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سب اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے گھبرائے گھبرائے پھر رہے تھے۔ میں نے دیکھا دائیں بائیں دونوں دوکانوں پر خاصی بھیڑ تھی۔ بلکہ لوگ ہنستے ہوئے بغیر کسی جھجک کے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ میں بھی ان میں سے ایک میں گھس گیا اور بڑی تگ و دو کے بعد ایک نقاب خرید کر خوشی خوشی باہر نکلتے ہوئے میں نے یہ سوچا کہ جاتے ہی شوکیس میں رکھے ہوئے اپنے اصلی چہرے پر اسے چڑھا دوں گا۔ پھر آزادی سے ہر جگہ جاؤں گا ہر آدمی سے مل سکوں گا۔ اور کسی بھی جگہ جا کر بیٹھ سکوں گا۔

اپنے گھر کی دیواروں کے اندر داخل ہوا تو لگا جیسے کسی گہری کھڈ میں داخل ہو گیا ہوں۔ چھت، دیواریں، دروازہ اور کھڑکیاں سب اپنی اپنی جگہ موجود تھیں۔ مگر روشنی نہ تھا۔ اس

کی بجائے جگہ جگہ زمین میں گڑھے تھے میں نے سوچا یہ گڑھے تو میں نے کہیں اور کھودے تھے یہاں میرے گھر میں کیسے آ گئے۔ اور میں اس کی تبدیلی پر زیادہ غور کرنے کے بجائے شوکیس کی طرف بڑھا جہاں اپنا اصلی چہرہ کچھ دیر پہلے چھوڑ گیا تھا۔

مگر اب وہ وہاں نہ تھا۔

میں نے ساری چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر انہیں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیا۔ اس اکھاڑ پچھاڑ سے گھبرا کر حیران و پریشان میری بیوی اندر سے نکل کر میرے پاس آئی میرا اصلی چہرہ اس نے لگا رکھا تھا۔ اس پر غصے کی بجائے میں ایک بار پھر حیرت زدہ ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا جیسے میں گردن گردن دلدل میں کھڑا ہوں، خود ہی وہ بولی۔

پیچھے سے کسی نے آ کر اچانک میرا چہرہ اتار لیا۔ میں نے اسے پکڑنا چاہا مگر ———— گھبراہٹ کے عالم میں تمہاری مدد لینے کے لئے اس کمرے میں آئی تو یہاں تمہارا چہرہ رکھا تھا مجھے اس کی اس تفصیل کے اندر لپٹی ہوئی عریاں حقیقت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بازار بھی اب خالی ہو گیا ہے

تو پھر اب کیا ہو گا

پتہ نہیں کیا ہو گا

اب جو بچا ہے اس کی فکر کرو۔

ہاں اسی کے لئے ایک نقاب لے آیا ہوں

یہ سن کر وہ خاموش ہو گئی۔ پھر اس کے قہقہے بتدریج بلند ہونے لگے۔ میں نے لپک کر اس پر سے اپنا اصلی چہرہ اچک لیا۔ اور میز پر رکھ کر اس پر احتیاط سے وہی نقاب چڑھنے لگا۔ وہ پاس کھڑی دیکھتی رہی۔ لیکن اب وہ بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی گہری سوچ سے ابھر کر اس نے کہا۔

اس چہرے کو لگا کے محلے میں نکلتی ہوں کوئی چہرہ مل گیا تو جھٹکے سے اٹھا لاؤں گی۔

میں عدم اعتماد کی پھسلتی ڈھلان پر تنہا کھڑا سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ میرا اصلی چہرہ لے کر غائب ہو جائے اور پھر واپس نہ آئے۔ اسی لمحے پلک جھپکتے ہی وہ چہرہ اٹھا کر باہر بھی نکل گئی۔ میرے اندر کے تمام اعضا باہر نکل کر اس کے پیچھے ہو لئے مگر پھر دہلیز سے ہی واپس آ گئے۔ میں نے وقت کو غنیمت جانتے ہوئے سامنے میز پر انہیں سجا دیا۔ خود پلنگ پر بے فکری سے لیٹ گیا۔ اور اپنی نگاہوں کی تاریکی چاروں طرف پھیلا دی۔

چند ہی لمحے بعد باہر سے مختلف آوازیں آنا شروع ہو گئیں میں نے گھبرا کر اپنے اعضا کو اپنے اندر سمیٹا۔ اور خود ہی یہ یقین کر لینے کے بعد کہ یہ میرا کھویا ہوا چہرہ واپس کرنے آئے ہیں۔ خوشی کے عالم میں دروازے کی طرف دوڑا۔ مگر اس جگہ اب دروازہ نہ تھا میں نے چاروں طرف دیکھا، دروازہ کہیں نظر نہیں آیا۔ تو پھر میری بیوی کہاں سے نکل کر گئی تھی باہر آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو باہر تعجب خیز طور پر مختلف حلیوں میں تین آدمی کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک آواز میں کہا۔

ہمارے چہرے کہیں کھو گئے ہیں۔

لیکن تمہارے یہ چہرے تو موجود ہیں۔

وہ ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھنے لگے، پھر مل کر انہوں نے مجھے دیکھا۔

یہ دوسروں کے ہیں۔

تو یہ چہرے تم کہاں سے لائے ہو؟

انہوں نے ایک دوسرے کو اسی تعجب سے دوبارہ دیکھا اور پھر مجھے دیکھا۔

تمہیں اس سے کیا؟

جن کے یہ چہرے ہیں وہ تم سے لینے نہیں آئے۔

ان پر یہ نقاب۔

اچھا میں سمجھ گیا۔

میں نے اندر ہی اندر انہیں ویسا ہی پا کر جیسا کہ میں

سورج رہا تھا ایک انجانی خوشی محسوس کی جو بے چینی پر لپٹی ہوئی تھی۔
ہم تلاشی لیں گے، ہمیں اندر آنے کا راستہ بتاؤ۔
میں نے ان کی بات کو ان سنی اور اپنے سامنے ناچتے ہوئے بہت سے سوالیہ نشانات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
میرا چہرہ بھی تو.....
جلدی کرو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔
جلدی سے اندر آجاؤ۔
یہاں دروازہ نہیں ہے ورنہ ہم تم سے اجازت کیوں لیتے۔ مجھے یاد آیا کہ دروازہ اپنی جگہ نہیں رہا تھا۔
اب کیا ہوگا۔
کوئی راستہ بتاؤ
اس کھڑکی سے۔
نہیں یہ تو بلندی پر ہے کوئی چور دروازہ ہے ؟
یہ کہتے ہی ان کے بدن گھٹتے چلے گئے اور وہ محض بونے بن کر رہ گئے۔
سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا ہوگا ؟
یہ تو ابھی تک نہیں معلوم۔
مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دونوں پاؤں پر ورم آگیا ہو میں خود اپنی حالت پر چونک پڑا۔
یہ معلوم کر کے آؤ کہ اب ہوگا کیا ؟
یہ سن کر انہوں نے میری طرف اپنا لعاب اچھالا جو خود ان پر گرا۔
ادھر نالی کا سوراخ ہے اس سے اندر آجاؤ۔
یہ کہہ کر میں نے جلدی سے کھڑکی کے دونوں پٹ جلدی سے بند کر لئے۔ اور جیسے وہ اسی راستے کی تلاش میں تھے۔ اس راستے سے ایک کے بعد دوسرا آنے لگا۔ اصل میں ان کا ایک ایک عضو اندر داخل ہو رہا تھا۔ اندر آکر ان کے تمام اعضا ان میں واپس چلے گئے۔ اور پھر بڑی جلدی جلدی وہ گھر کی چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگے۔ جیسے کوئی ان کی تلاش میں خود ان کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آنے والا ہو۔ اس دوران میں نے ان کے چہرے غور سے دیکھے تو ان میں سے ایک کا چہرہ وہی دوسرا چہرہ تھا۔ جو میں اپنے گھر میں تلاش کر رہا تھا۔ میں نے فوراً اس پہ جھپٹتے ہوئے کہا۔
یہ چہرہ تم کہاں سے لائے ؟
وہ گھبرا گیا اور بیٹھے بیٹھے لہجے میں بولا۔
یہ تو میں نے ایک عورت سے خریدا ہے۔
عورت کے نام پر میں نے اندر سے جھرجھری لی۔ اور میرے اندر کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔ میں نے دیکھا وہ تو خود بھی اندر سے لرز رہا تھا۔ اس کا ثبوت مجھے اس کی پیشانی پر آئے ہوئے قطروں سے ملا۔ ہم دونوں اس کے بعد ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی اثنا میں میری بیوی بھی اسی نالی کے راستے اندر آگئی۔ میرا اپنا اصلی چہرہ جو وہ لگا کر گئی تھی غائب تھا۔ اور اب اس کے ہاتھ میں صرف وہی نقاب لہرا رہا تھا۔
میری بیوی اس آدمی کو دیکھتے ہی میرے آنگن میں آکر چھپ گئی۔ اس ڈر سے کہ کہیں یہ لڑکا نہ ڈھا دے اور میرے اندر کی کہانی باہر نہ پھیلا دے۔ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ وہ دھڑام سے نیچے گر پڑی اور وہاں موجود سب پریشان ہوگئے۔ اس آدمی نے چلاتے ہوئے کہا۔
یہی ہے جس نے چہرہ دیا تھا۔
یہ سن کر میری بیوی اپنے وجود کے عدم اعتماد کے اندھے پن کے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ میں نے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس سے یہ بھی پوچھا کہ میرا چہرہ کہاں گیا۔ وہ اس کثیف فضا کے بادل چھانٹنے کی کوشش میں بولی۔
تمہارا چہرہ مجھ سے زبردستی چھین لیا گیا ہے۔
یہ کہہ کر نقاب اس نے میرے اوپر اچھال دی۔ اور کمرے میں پھیلی ہوئی اداسی کو ٹٹولتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

کیا کریں، سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

کس سلسلے میں!

کسی بھی سلسلے میں۔

میں اس آدمی سے کسی طرح وہ چہرہ چھین لینا چاہتا ہوں جو میری بیوی نے اسے دے دیا تھا۔ مگر میری بیوی نے میرے ارادے کو بھانپ کر ان کے ساتھ مل کر مجھے اپنے ہی گھر سے نکال دیا۔ باہر اندھے راستوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں وہاں سے بھاگا بھاگا اپنے باپ کے پاس گیا۔ باپ بھائی اور بہنیں میرے چاروں طرف اس طرح جمع ہو گئے جیسے میرا مردہ جسم ان کے درمیان پڑا ہو۔ ان کے جسموں سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسی خالی ڈبے میں کنکر ڈال کر ہلانے سے آتی ہیں۔ مجھ سے میری کہانی سننے کی بجائے وہ الٹی اپنی اپنی داستان سنانے لگے۔ ان کے پاس صرف ایک چہرہ باقی بچا تھا جو وہ باری باری لگا لیتے تھے۔ اس لئے مجھے اپنی اپنائیت دینے کی خاطر انہوں نے اپنی اپنی نقابیں میری طرف اچھال دیں۔ میرے پاس پہلے ہی ایک نقاب تھی جسے ہاتھ میں تھامے میں وہاں سے پھر بھاگ نکلا۔ ان میں سے کسی نے مجھے نہ روکا۔ اور نہ پیچھا کیا۔ صرف میری بہن نے مجھے جاتے ہوئے کھڑکی سے میری ایک نظر دیکھا اور فوراً پردہ ڈال لیا۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن کے تمام اعضا علاحدہ ہو کر میرے ساتھ بھاگ رہے ہوں۔ راستے میں اسکول سے نکلتے ہوئے مجھے اپنے بچے نظر آئے جو اپنے چہرے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے میرے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے مجھے چنداں یہ فکر نہیں تھی کہ کہیں کوئی ان کے چہرے نہ لے اڑے۔ ان کے اندر سے بھی ایسی ہی آوازیں آ رہی تھیں جیسی میرے باپ اور بہن بھائیوں کے جسموں سے مجھے سنائی دی تھیں میں ان کے قدموں کی گرد اپنے بدن پر پڑتے محسوس کر رہا تھا۔ یہی گرد میری آنکھوں میں گھسنے لگی۔ کچھ ہی دور جا کر وہ ایک ایک کر کے مجھ سے پیچھے رہتے چلے گئے۔ اور راستے کی اڑتی ہوئی گرد میں اوجھل ہونے لگے۔ تو اس وقت میرے اعضا میرے اندر دوبارہ داخل ہو گئے۔ لیکن میں خود اب بھی ان سے علاحدہ ہو کر بھاگ رہا تھا۔

پیچھے رہتے ہوئے راستوں کی پیچھا کرتی ہوئی گرد میرے بدن میں مساموں کے راستے داخل ہونے لگی۔ لیکن میں رکا نہیں۔ حتیٰ کہ خاموشیوں کی فضا نے دفعتاً مجھے نگل لیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی بے پناہ کشش کے دائرے میں غڑاپ سے داخل ہوں۔ میرے اعضا جن پر اس کشش کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ پیچھے رہ گئے۔ مگر میرے ہاتھ اب بھی میرے ساتھ رہے جو اس نقاب کو ابھی تک مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ کائنات میں پھیلی ہوئی ایک آواز میرے اندر سے یکبارگی ابھری۔ یہ آواز ان جانی پہچانی تمام آوازوں سے قطعی مختلف تھی جو میں دور پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اس لمحے مجھے لگا جیسے میں کوشش کے باوجود آگے نہیں بڑھ پا رہا ہوں۔ اس وقت میں پورے کا پورا آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ سوا نیزے پر سورج آ جانے سے میرا بدن جھلس چکا تھا۔ اور زبان سوکھ کر باہر نکل آئی تھی۔ اب مجھے وہاں پہنچ کر پرسکون ٹھنڈے اور خوشگوار سائے کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سمیت وہ نقاب نفرت سے دور اسی جانب پھینک دیا جہاں سے میں آیا تھا۔ اسے پھینکنے کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے روشنی کے ایک ہالے نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔

میں نے دیکھا کہ میرے سامنے کعبے کی جگہ میرا اپنا اصلی چہرہ نصب تھا۔ ●

ممتاز احمد خان
(پاکستان)

دوسری ہجرت

کیمپ کے اطراف میں دیواروں کو مزید اونچا کر دیا گیا تھا۔ اور ان پر لوہے کے تاروں کی باڑھ نصب کر دی گئی تھی جس میں کرنٹ دوڑتا رہتا تھا۔ اس کیمپ میں وہ لوگ موجود تھے جو پاکستان جانے کے منتظر تھے اور جنہیں بنگلہ دیشی حکومت نے غیر ملکی قرار دیا تھا۔ کیمپ کے مشرقی حصہ میں ایک بڑا آہنی دروازہ تھا جس پر ایک کالا بھجنگ دریا نے قد والا بنگالی سنتری پہرہ دیا کرتا تھا۔ کیمپ کے سامنے بیرکیں تھیں جن میں محصورین کو پاکستان بھیجنے کا اہتمام کرنے والا عملہ متعین تھا۔ نزدیک ہی ایک بڑا سا بورڈ آویزاں تھا جس پر موٹے موٹے حروف میں ریپٹری ایشن آفس REPATRI - TION OFFICE درج تھا۔

آہنی دروازے کے اندر کی جانب نورالحق بہت دیر سے کھڑا سنتری سے کچھ کہہ رہا تھا۔ سنتری اسے غصہ اور نفرت سے دیکھتا اور سنگین تانے آگے بڑھ جاتا۔ جب کافی دیر تک سنتری نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو وہ زور سے بولا۔

"ہماری نہیں سنوگے بھیا؟"

"چپ کرو،" سنتری چیخا، "حرامی کا بچہ"

"بھیا ہماری مدد کرو،" نورالحق نے اس کی خوشامد کی "تو ہم بالکل پاگل ہے۔ روز کو روز ادھر آکر کیا کرتا تو ہم ہمارے کو بھی پاگل کرے گا"

دیکھو ہمارا خیال کرو، ہمیں یہاں سے آزادی دلاؤ۔ ہم تمہارے لئے دعا کریں گے زندگی بھر۔

نورالحق نے ملتجیانہ انداز میں کہا

سنتری نے جواب دیا، ہم ادھر گارڈ ہے ہم تمہارا کوئی مدد نہیں کرنے سکتا۔

اتنے میں بیرکس میں سے ایک اور فوجی جوان ادھر نکلا، وہ نورالحق کو دیکھ کر پہلے تو طنزیہ انداز سے ہنسا اور بولا شالا بہاری۔ ادھر موت کا روٹی کھاتا۔ اور پاکستان کا بھی بولتا۔

پھر دونوں فوجی قہقہے لگانے لگے۔

اسی اثنا میں ایک لمبی سی اسٹیشن ویگن وہاں آکر رکی۔ سنتری نے آگے بڑھ کر آہنی دروازہ کھولا۔ اسٹیشن شور مچاتی اندر کی جانب روانہ ہو گئی۔ نورالحق بھی پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے دوڑنے لگا جس جگہ ویگن جا کر رکی وہاں پہنچ کر نورالحق اس قدر ہانپ رہا تھا کہ اس کی سانس قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ریپٹری ایشن افسر بابو منیر الحسن سے کچھ گفتگو کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف بابو منیر الحسن کی پتلی دبلی چھوٹے قد کی ادھیڑ عمر بیوی اپنی کھچڑی پرانی ساڑھی کے پہلو سے چہرے پر بہتے خوشی کے آنسوؤں کو بار بار پونچھ رہی ہے۔

نورالحق کو دیکھ کر بابو صفیر الحسن بولے، بھائی تھا ہمارا این۔ او۔ سی اسلام آباد سے آگیا ہے۔ اگلے اتوار ہم اقوام متحدہ کے طیارے سے پاکستان چلے جائیں گے۔ فی الحال ہم کو ریپٹری ایشن میں شفٹ کیا جا رہا ہے۔

نورالحق کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے بمشکل تمام اندر سے لہجے میں ان کو مبارکباد دی۔ اور پھر ریپٹری ایشن افسر سے پوچھنے لگا۔ سر! کیا ہمارا این۔ او۔ سی نہیں آئے گا؟

کیا ہم یہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جائیں گے ؟ اس کے سوال کا ریپٹری ایشن افسر نے مناسب نہیں سمجھا۔ اور چند لمحوں بعد سپاہی کاغذات پر بابو صغیر الحسن سے دستخط لے کر وہ چلا گیا
بابو صغیر الحسن کی روانگی کے وقت نور الحق ان سے لپٹ کر خوب رو دیا۔ اس کی لاغر بیوی بابو صغیر الحسن کی بیوی سے مل کر اتنا روئی کہ بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑی۔ کیمپ کی دیگر عورتیں اسے اٹھا کر دوسری جگہ لے گئیں۔ اور اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگیں۔

ٹرین میں دیگر رہا شدہ لوگوں کے ساتھ روانہ ہوتے وقت بابو صغیر الحسن نے نور الحق سے وعدہ کیا۔ نور الحق بھائی، ہم کراچی پہونچ کر کوشش کریں گے کہ وہاں کے رہنے والے شخص کو اس بات کے لئے راضی کریں کہ وہ آپ کو اپنا رشتے دار ثابت کریں۔ اگر آپ کو بھی ایسا کوئی مل جائے اللہ آپ کو جزا دے گا۔ نور الحق نے بھرائی آواز میں کہا اور آسمان کو دیکھنے لگا گویا خدا سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

چند دنوں بعد نور الحق کی بیوی فاطمہ ہیضے سے مر گئی۔ اس حادثے سے وہ نیم پاگل سا ہو گیا۔ اب اس پر اپنے ۱۲ سالہ بیٹے احمد الحق کے پالنے کا بوجھ بھی آن پڑا۔ اب وہ اکثر اپنے آپ ہی سے باتیں کرتا، یا رات کو جاگ کر کیمپ کے چکر لگاتا رہتا۔ یا فاطمہ کو یاد کر کے روتا رہتا۔ اس کی طبیعت میں چڑچڑا پن بھی پیدا ہو گیا۔ کبھی کبھی وہ احمد الحق کو مارنے دوڑتا۔ جب ریپٹری ایشن افسر کو اس کی حالت کا علم ہوا تو اس نے ڈاکٹر کا انتظام کیا لیکن اس نے علاج کرانے سے انکار کر دیا۔

اسی اثنا میں ایک دن وہ جب کہ اسٹور آفس کے سامنے راشن کے لئے قطار لگائے کھڑا تھا۔ اس کے ذہن میں راشن کلرک سے لڑنے کی سوجھی۔ سورج کی تیز روشنی کی وجہ سے وہ پہلے ہی پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور اس کی باری آنے میں بھی دیر تھی۔ وہ اچانک آگے بڑھا اور چاول کا ایک پیکیٹ اٹھا کر دھاڑا۔ تم بے ایمان ہو۔ ریڈ کراس اور حکومت کے لوگ پورا راشن دیتے ہیں۔ لیکن تم لوگ پیکیٹوں میں سے چاول اور باقی دوسری چیزیں نکال لیتے ہو۔ اسی وجہ سے کیمپ کے سب لوگ سوکھے جا رہے ہیں۔

وہاں جتنے لوگ کھڑے تھے وہ نور الحق کی بے باکی اور جرأت پر بہت حیران ہوئے، ادھر اسٹور کلرک کو نور الحق کی بات سن کر اتنا غصہ آیا کہ اس نے بہت موٹی سی اسے گالی دی۔ نور الحق نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور قریب پڑے لکڑی کے ٹکڑے کو اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا جس سے اس کا سر پھٹ گیا وہاں اچھی خاصی بھگدڑ مچ گئی۔ سنتری نور الحق کو پکڑ کر ریپٹری ایشن افسر کے سامنے لے گئے۔ وہاں اس کے حکم سے سنتری لوگ نے بندوق کی بٹ اور اپنے جوتوں سے اس کی اس قدر پٹائی کی کہ وہ چکرا کر نیچے گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں اسے اس کے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا۔ کیمپ کے دیگر افراد نے اس کی ایک عرصے تک تیمار داری کی جس کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ البتہ اب اس میں یہ تبدیلی آ گئی کہ وہ خاموش ہو گیا لیکن ہر صبح وہ آہنی گیٹ تک جاتا۔ اور سنتری سے خوشامد کرتا۔ کہ اسے ریپٹری ایشن سے ملا دے۔ آخر بہت عرصے بعد اسے اس سے ملنا نصیب ہوا۔

ریپٹری ایشن افسر نے اپنے سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا نور الحق کا کوئی لیٹر آیا پاکستان سے ؟

سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔ سر! ایک لیٹر آیا ہے ادھر والا لوگ بولتا نور الحق کا ادھر کوئی ریلیٹو RELATIVE نہیں۔ اس واسطے ان کو نہیں لے سکتا البتہ دوسرا اسٹرانگ ریزن REASON مانگتا پھر غور کر سکتا۔

نور الحق کہنے لگا۔ وہاں ہمارے ایک رشتے دار تھا

کون؟ ڈیپٹی ایشن افسر نے دلچسپی سے پوچھا۔
قائداعظم محمد علی جناح ـــــ ہم نے انہیں ہمیشہ اپنا باپ سمجھا۔
لیکن وہ تو اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ ڈیپٹی ایشن افسر نے کہا۔
نورالحق بولا۔ سر آپ لکھدیں کہ ہم پاکستان کی مٹی میں دفن ہونا چاہتے ہیں۔
ونڈرفل آئیڈیا ویری اپیلنگ
ڈیپٹی ایشن افسر نے میز پر مکہ مارتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ یہی ریزن REASON دیدو۔
ٹائپسٹ مسز ڈوروتھی بہاری لال بھی وہاں موجود تھی۔ اس نے نورالحق کا فائل اٹھایا اور جانے لگی۔ نورالحق اچانک آگے بڑھا۔ اور مسز ڈوروتھی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ سسٹر! ہمارے لئے ایسا خط لکھدو کہ ہما اینا ہو سی آجائے۔
اس نے تھوڑی دیر سوچا اور بولی۔ برادر نورالحاق ہم پرامس PROMISE کرتا کہ تم کو پاکستان ضرور بھجوائیں گا۔
ڈھاکہ بشپ عزت مآب جناب فادر جوزف البرٹو REV. JOSEPH ALBERTO کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ بنگلہ دیشی وزارت داخلہ کی اجازت سے ریڈ کراس کے ایک نمائندہ سفیر کی حیثیت سے کیمپ میں آئے۔ اور مسز ڈوروتھی بہاری لال کی سفارش پر نورالحق سے بھی ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران ان کا ہاتھ مستقل احمدالحق کے سر پر رہا۔ واپسی سے قبل وہ نورالحق سے بولے قرآن حکیم کی طرح بائبل میں بھی بتایا گیا ہے کہ خداوند قدوس ہمیشہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ تمہارا امتحان ہے جو بہت جلد ختم ہو جائے گا۔

جب وہ رخصت ہوگئے۔ تو نورالحق کو بڑا تعجب ہوا کہ وہ اتنی صاف اردو بول رہے تھے
کیمپ میں یہ اس کا آخری دن تھا۔ کیونکہ بشپ جوزف البرٹو نے اس کے اور احمدالحق کے لئے دو سال کا عارضی رہائشی پرمٹ حاصل کر لیا تھا۔ جس کے تحت وہ دونوں بشپ کی فراہم کردہ اقامت گاہ میں رہ سکتے تھے۔ مگر احمدالحق مسز بنجمن کے حصے میں آیا۔ جنہوں نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ مسز بنجمن بیوہ تھیں وہ عیسائیوں کے قائم کردہ اسکول کی پرنسپل تھیں۔ اب احمدالحق انہیں کے ساتھ اسکول جاتا۔ شام کو نورالحق اس سے ملنے آیا کرتا وہ خود ایک انگریزی اسکول میں بچوں کو ٹیلرنگ سکھانے جایا کرتا تھا۔
جب دو سال ختم ہونے کو آئے تو ایک دن بشپ جوزف البرٹو نے اسے بلایا اور کہا۔ خداوند قدوس کو تمہارا صبر پسند آیا۔ اب تمہاری تکالیف ختم ہوگئیں۔
واقعی؟ نورالحق جذباتی ہوتے ہوئے بولا۔ اب میں اور احمدالحق پاکستان چلے جائیں گے نا۔
عزت مآب جوزف البرٹو چند لمحے خاموش رہے پھر کہنے لگے۔
دراصل کینیڈا کی بین الاقوامی سوسائٹی برائے بہبودی انسانیت نے میری سفارش پر تمہارے، احمدالحق اور مسز بنجمن کے لئے شہریت حاصل کرلی ہے۔ تمہارے سفری کاغذات جلد آنے والے ہیں۔ مبارک ہو۔ اب تم کینیڈا کے شہری ہو۔
اسے زبردست دھچکا لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ فادر۔ میں تو پاکستان جانے کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔ اور......
اور......
الفاظ اس کے گلے میں اٹک گئے۔
بشپ جوزف البرٹو نے اپنے خوشبودار ریشمی

رومال سے اس کے آنسو پونچھے۔ اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔
برادر سب میں تمہارے لئے اپنی ادسی حاصل کرنے میں ناکام ہوگیا
تو میں نے یہ راستہ نکالا ——— لیکن مالو تمہاری بقا کے لئے
——— دراصل میں تمہیں ایک مقدمہ گھر کریپ کا تیدی بنتے نہیں
دیکھ سکتا تھا۔

لبشپ کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے۔

نورالحق بولا۔ فادر! میں کینیڈا نہیں جاؤں گا یہیں
ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گا۔

یہ کہہ کر وہ وہاں سے پاگلوں کی طرح چیختا ہوا باہر نکل گیا
رات کو وہ اقامت خانے میں واپس نہیں آیا۔ اسی طرح
ایک ہفتہ گزر گیا۔ فادر کے لئے یہ لمحات تشویش و کرب سے بھرپور
تھے۔ انہوں نے پولس کو اس کی گمشدگی کی اطلاع دی۔ ساتویں
دن وہ اس قبرستان سے بازیاب کر لیا گیا جہاں اس کی بیوی
فاطمہ کو دفنایا گیا تھا۔ بعد میں گورکن نے بتلایا کہ وہ کتبہ سے آزاد ہر
قبر سے فاطمہ کی قبر سمجھ کر لپٹ کر رویا کرتا تھا۔

چند دنوں بعد جب اس کی حالت نارمل ہو گئی تو فادر
نے اسے کینیڈا جانے کے لئے نیم راضی کر لیا۔ اس دوران وہ زار و
قطار روتا رہا۔ فادر نے اس سے کہا۔

مجھے حیرت ہے تم رو رہے ہو۔ برادر کینیڈا اور امریکہ کی
شہریت کے لئے لوگ ترستے ہیں۔ ذرا تیسرے چھوٹے ملکوں میں
قائم ان ملکوں کے سفارت خانوں کے باہر لمبی لمبی قطاروں میں
کھڑے لوگوں کے چہرے پڑھو۔

لیکن میں وہاں کیا کروں گا؟ اس نے پوچھا۔

ایسا نہیں سوچو بے وقوف شخص۔ فادر نے پہلی بار
اسے ترشی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ اپنے مسلمان بھائیوں
کی تاریخ پڑھو۔ تمہیں پتہ چلے گا کہ وہ اپنی سرزمینوں کو چھوڑ کر
اجنبی سرزمینوں پر پہونچے، اور وہیں سکونت اختیار کر گئے۔ اور
آج دنیا کا کوئی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں مسلمان نہ پائے جاتے ہوں۔

کیا میں نے غلط کہا۔؟

تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہا اس کے ذہن میں ایک
عجیب سی کشمکش جاری ہو گئی تھی۔ اس عرصے فادر اس کا جائزہ
لیتے رہے۔ پھر وہ بڑی دیر بعد مردہ دلی سے بولا ——— میں
کینیڈا جاؤں گا۔

فادر نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور معذرت کی۔ برادر!
میرے تلخ لہجے کو نظر انداز کر دینا ——— آئی، ایم ویری سوری
اور ہاں! کینیڈا میں مسز بنجمن بھی تو ہوں گی وہاں اجر الحق ہوگا۔
اس کا شاندار مستقبل ہوگا۔ برادر! آج رات شکرانے کے دو
نفل پڑھنا نہ بھولنا۔

نورالحق نے مردہ دلی سے لبشپ سے ہاتھ ملایا اور چلا گیا

اس واقعے کے ایک طویل عرصے بعد عزت مآب لبشپ
جوزف البرٹو کو مسز بنجمن کا ایک خط ملا۔ انہوں نے اس خط کی ایک
ایک سطر دلچسپی سے پڑھی۔ اور جب آخری سطر سے ان پر انکشاف
ہوا کہ نورالحق نے ان کے مذہب کو رضاکارانہ طور سے اختیار
کر لیا ہے تو انہوں نے کئی بار اپنے گلے میں پڑی طلائی صلیب کو
کو چوما۔ اور پھر دیوار پر نصب کانسی کے بنے ہوئے مقدس مریم
کے مجسمے کے سامنے عقیدت سے سر جھکا دیا۔ ●

بقیہ :- آس پاس

آلات آسکیں۔ چنانچہ انہیں پرانے آلات کی مرمت سے کام چلایا
جاتا ہے۔ مرمت ہو کر یہ آلات چند روز تو کام کرتے ہیں پھر خراب
ہو جاتے ہیں۔ مرمت اور خرابی کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے اور
اس میں کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اگر بگڑتا ہے تو عوام کا ———
لیکن عوام کی کس کو فکر ہے سننے میں آتا ہے کہ بجلی بورڈ کا بال بال قرض
بندھا ہے پٹنہ میں واقع اس کی مرکزی عمارت تک گروی رکھی
ہوئی ہے بجلی بورڈ اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اسے اب اسے
صرف ایک ہی طاقت بچا سکتی ہے ——— خدا کی لیکن خدا کا اس

یوسف عارفی

مٹتے لمحوں کا کرب

سامنے آتی ہے تو ـــــ اپنے ساتھ سارا گرد و غبار اڑا کر لاتی ہے۔

رات جاتی ہے تو ـــــ اپنے ساتھ سارا گرد و غبار اڑا کر لے جاتی ہے۔

صبح اٹھ کر آنکھیں ملنا اور حیران کن نظروں سے چاروں طرف دیکھنا اور پھر بیچ ہو جانا اس کا معمول بن چکا ہے۔

جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کئی بار پوچھنے کے بعد وہ انتہائی سہمے سہمے لہجے میں کہتا ہے ـــــ اتنا سارا گرد و غبار نہ جانے میری اس چھوٹی سی کھوپڑی میں کہاں سے جمع ہو جاتا ہے۔ پھر اس گرد و غبار کے ننھے ننھے ذرے مجھے اس دنیا میں گھسیٹ کر لے جاتے ہیں جس میں بہت پہلے [illegible] تھا۔

"کیسے خواب دکھائی دیتے ہیں بیٹا؟"

"خواب!" وہ حیرانی کے ساتھ اپنی اصلی رنگت اور حقیقت [illegible] کی تلقین کرنے والی ماں کو دیکھتا اور کہتا ہے۔

میں نے ساری رات جاگ کر گذار دی ہے ماں ـــ اور خواب تو سونے کے بعد ہی دکھائی پڑتے ہیں ـــــ اب میں تھوڑی دیر سو لوں؟ وہ ماں سے اجازت لیتا ہے لیکن ماں اس کے سر پر بڑے شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہتی ہے ـــــ بیٹا۔ صبح کا وقت جاگنے کا وقت ہوتا ہے اور یہ جو تم جاگنے کے وقت میں سونے کا ارادہ کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ کوئی بلائے ناگہانی یا کوئی بڑی مصیبت ہم پر ٹوٹنے والی ہے۔"

وہ بمشکل نیند سے بوجھل آنکھوں کی جلن برداشت کرتا بڑبڑاتا ہے۔

سارا قصور اس گرد و غبار کا ہے جس نے نہ صرف میری آنکھوں کو بلکہ میرے ذہن کو بھی مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ اور اگر میں اس گرد و غبار کو جھٹک دوں تو ـــــ؟ اس نے بیٹھے ہی بیٹھے پلکیں بند کر لیں۔ اور خود پر غنودگی طاری کرنے کی کوشش کی۔ پھر ماتھا ٹھونک کر سوچنے لگا۔

اس گرد و غبار کو ذہن میں اکٹھا کرنا، اور جھٹک دینا اس کے بس کی بات ہرگز نہیں ہے۔ جب بھی یہ گرد و غبار اس کے ذہن میں اکٹھا ہونے لگتا ہے ـــــ وہ اس جیتی جاگتی دنیا سے یکدم دور ـــــ بہت دور ـــــ ایک ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں وسیع و عریض چار دیواری میں گھرا ایک مکان تھا۔ اور اس مکان کے بے شمار کمرے تھے اور اس سے ملحقہ آنگن تھا۔ اور پچھواڑے میں چھوٹا سا خوبصورت باغیچہ تھا۔ اور اس باغیچہ میں مختلف قسم کے پودے تھے۔ اور اس کی ایک ایک انچ زمین اس لئے بھی اہم تھی کیونکہ ساری جڑی بوٹیوں کو محفوظ کر دیا گیا تھا جن کے استعمال سے مریض صحت یاب ہو جاتے تھے۔ اور پھر دوا لینے والوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی تھی۔

"ماں ــــ" اس نے دھیرے سے سر اٹھایا۔ اور آنکھیں موندے پوچھنے لگا۔ فصیلیں اپنے آپ ڈھ گئیں یا کسی نے انہیں ڈھا دیا۔ میرا دل کہتا ہے ــــ یار و مددگار اشیا کا مقدر کسی سے ڈھکا چھپا نہیں رہتا۔ لیکن یہ آفت فصیلوں کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی ٹوٹی۔ ہمارے گھر کا وہ آنگن جہاں صبح کے وقت مریضوں کا جمگھٹا ہوتا ہے دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں ڈھیروں اناج سکھایا جاتا تھا۔ اور سہ پہر ڈھلنے لگتی تھی تو آنگن میں چھڑکاؤ کی تیاریاں ہونے لگتی تھیں۔ اور پھر سرِ شام ہم سب بھائی بہن دادی ماؤں، پھوپیوں، اور خالاؤں کے ساتھ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر ڈھولک پر گیت گاتے تھے۔ لطیفے چھوڑتے تھے۔ آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ اٹرہی تیڑی بلہ بلہ کھیل کھیلتے کھیلتے ــــ یک بیک اباجی کی آواز میں کس قدر ــــ کتنا ــــ

وہ لیٹے ہی لیٹے سیدھی کروٹ لیٹنے کی کوشش کرنے لگا جب اسے یہ اطمینان ہو گیا۔ کہ سیدھی کروٹ نہایت آرام دہ ہے تو اس نے آنکھیں موندے بڑی حسرت سے سوچا۔

اباجی کا لہجہ کتنا پر وقار تھا۔ ان کی آواز میں کتنی دلسوزی، کتنی محبت اور شفقت تھی ــــ اباجی ــــ آپ کہاں ہو ــــ اب تو آپ کے خدوخال بھی میرے ذہن سے اترنے لگے ہیں۔ اور اباجی ٹین کے بکس میں بھر کر رکھی ہوئی آپ کی وہ کرم خوردہ کتابیں جو نہ صرف آپ کو بلکہ دادا حضرت کو بہت عزیز تھیں ــــ اور جن کے بارے میں آپ نے بتایا تھا کہ یہ ہمارے بزرگوں کا سب سے قیمتی ورثہ ہے ــــ اب یہ ورثہ ہم نے کھو دیا ــــ

لیکن اس ورثہ کے کھو جانے کا دکھ مجھے کبھی نہیں ہوا۔ کہ یہ ورثہ میرے کسی کام کا نہ تھا۔

گستاخ ! اتنی غیر ذمہ دارانہ اور نامعقول بات تم نے کیسے سوچ لی۔ وہ یکایک اپنے آپ پر برس پڑا۔

اباجی ــــ آپ مجھے معاف فرمائیں ــــ آپ کے وقتوں کا بسا بسایا روشن اور زندگی سے بھرپور مہکتا لہکتا آنگن اب ویران اور خاموش ہو چکا ہے۔ لیکن یہ ویرانی میں نے نہیں لائی۔ اس نے جھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ اور پھٹی پھٹی نظروں سے اس نے دیکھا ــــ ایک بے حد مختصر کمرے میں دیوار سے استادہ ہیڈ لیمپ جل رہا تھا۔ اور کمرے میں گہری لمبی سانسوں کی پراسراریت چھائی ہوئی تھی۔

اباجی ! آج ہم اس مختصر کمرے کے مکین رہ گئے ہیں۔ اب ہمارا ایسا کوئی کمرہ نہیں کہ جس میں بیٹھ کر گھنٹوں کتابوں کے اوراق الٹائے جا سکیں۔ یا عبادت میں مشغول رہا جا سکے۔ یا کم از کم وہ قیمتی ورثہ رکھا جا سکے۔ جو ہمارے بزرگوں سے ہوتا ہوا ہم تک پہونچا تھا ــــ دراصل مجھے تو لگتا ہے یہ دل جو میرے سینے میں دھڑک رہا ہے۔ یہ بھی کافی محدود اور چھوٹا ہو چکا ہے کہ اب اس دل میں جھلاہٹ ہے بے یقینی اور بے انصافی ہے اور یہ سب کچھ میرا مقدر ہے کہ ــــ میں جو کبھی مقدر کا منہ چڑاتا تھا۔ اور آپ جو مقدر کو بے حد عزیز جانتے تھے۔

یکایک اسے نہ جانے کیا ہو گیا کہ ــــ اس نے ایک بھیانک چیخ ماری۔ اور لرزتا، کپکپاتا، آنکھیں پھاڑتا اٹھ بیٹھا اور ہیڈ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس نے دیکھا۔ پیپل کے پتے کی طرح تھرتھراتا وجود جو جھکا جھکا سا عبادت میں مشغول تھا

یہ عبادت کیا ہوتی ہے ؟۔ اس کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک حسرت بھرا سوال امنڈ آیا۔

پھر اس نے پڑوس کے مندر میں لگے لاؤڈ اسپیکر پر وہ پہلا ریکارڈ سنا جس کی زبان اس کے لئے قدرے اجنبی تھی۔ اور جب ریکارڈ ختم ہوا تو اس نے بڑی دیر تک اس زبان کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ جس کا لفظ لفظ اسے عبادت سے بھٹکنے نہ دیتا تھا ــــ اب یہ زبان یا تو قطعی بھلا دی گئی ہے یا رفتہ رفتہ بھلائی جانے لگی ہے۔ پھر اس نے لیٹے ہی لیٹے عادت کے مطابق سرہانے رکھے ٹرانسسٹر کو آن کیا ــــ

گیا

شام بارکپوری
بنگلہ دیش

ان پڑھ ہوا

کچہری میں عدالت کا کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مجسٹریٹ کرسی پر بیٹھا رومال سے اپنی عینک صاف کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ نوجوان مجسٹریٹ کی حال میں ہی ترقی ہوئی تھی۔ اس کی میز پر فائلوں کا انبار لگا تھا اس کے قریب پیشکار کھڑا کیس کی تاریخ ترتیب دے رہا تھا۔

عدالتی کاروائی شروع کی جائے۔ مجسٹریٹ آنکھوں پر عینک لگائے ہوئے پیشکار سے مخاطب ہوا۔

ملزم راجو کو حاضر کیا جائے۔ جواب میں پیشکار نے اپنے نائب سے کہا۔

تھوڑی دیر میں سپاہی نے سات برس کے راجو کی کمر میں رسی ڈالے عدالت میں پیش کیا۔ اس کمسن ملزم کو دیکھ کر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کمرے کے کونے میں راجو کی ماں بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس کا باپ خیرالدین اسے تسلی دے رہا تھا۔

ملزم کا جرم بیان کیا جائے۔ مجسٹریٹ نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے کمسن راجو پر نظر ڈالی۔

جناب عالی راجو نے ثناور صاحب کے باغ سے پھول توڑ کر جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ وکیل استغاثہ نے بیان کیا۔ ثناور صاحب یہاں کے مشہور رئیس ہیں۔ محمد پور میں ان کی عالیشان کوٹھی ہے۔ راجو ان کی کوٹھی کے قریب جھونپڑی میں رہتا ہے۔ اس نے بغیر اجازت چہار دیواری میں داخل ہو کر کیاریوں سے پھول توڑنا شروع کیا۔ اچانک مالی کی نظر اس پر پڑی۔ اور اسے پکڑ لیا۔ چوری چھپے اور اجازت کے بغیر کسی کی کوئی بھی چیز حاصل کرنا چوری ہے۔

مجھے اعتراض ہے ایک نوجوان وکیل وکالت نامہ لئے مجسٹریٹ کی طرف بڑھا۔ میں وکیل صفائی ہوں۔ اپنے وکیل کے کیس کی پیروی کرنا چاہتا ہوں۔

چوری کی واردات میں وکیل صفائی کی کیا ضرورت ہے یہ صاف چوری کا کیس ہے پولیس کی تفتیش سے یہ صاف طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ملزم چوری کی نیت سے باغ میں داخل ہوا تھا وکیل استغاثہ نے اعتراض کیا۔ پولیس نے تفتیش کے دوران ملزم کا جو بیان لیا اور مالی نے رنگے ہاتھوں چوری کرتے ہوئے پکڑا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ملزم چور ہے۔ وکیل استغاثہ نے سخت لہجے میں کہا۔

سر! میں معصوم راجو سے چند سوال کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ وکیل صفائی نے مجسٹریٹ سے درخواست کی۔ ان کی اجازت پر اس نے مقدمہ کی کاروائی شروع کی۔

راجو کٹہرے میں کھڑا سسکیاں لے رہا تھا۔ چہرے پر مردنی اور آنکھوں میں بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ سات برس کا بچہ وکیلوں کی جرح سے پریشان ہو گیا تھا۔ عدالت کا ماحول اس کے لئے اجنبی تھا۔ لوگوں کے جم غفیر سے وہ خوف زدہ تھا۔

تمہارا نام راجو ہے۔ وکیل صفائی نے اس سے پوچھا۔

جی۔ وہ معصومیت سے بولا۔

تم نے باغ میں پھول توڑا۔؟

جی، خوف سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

کیوں ؟

صاحب مجھے معلوم نہ تھا کہ پھول توڑنا چوری ہے۔

تمہارے ذہن میں پھول توڑنے کا خیال کیسے آیا؟

صاحب! میں روزانہ گیٹ پکڑے رنگ برنگے پھولوں کو دیکھا کرتا تھا۔ ان کی خوشبو۔ بے حد اچھی ہے نا۔ پھولوں کی خوشبو سے میں بے قابو ہو جاتا ہوں۔ اس دن میری خواہش ہوئی کہ میں بھی پھول توڑ کر سونگھوں۔ اس لئے باغ میں داخل ہو کر ایک پھول توڑ لیا۔ ابھی سونگھنے بھی نہ پایا تھا کہ پیچھے سے مالی نے آکر مجھے پکڑ لیا۔ وہ گھبرا گیا میں نہیں جانتا تھا کہ پھول توڑنا جرم ہے۔

اسی وقت وکیل استغاثہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

جناب کسی دوسرے کی چیز کو اجازت کے بغیر لینا چوری ہے۔ وہ مجسٹریٹ سے مخاطب ہوا۔ اسے چوری کی سزا ملنی چاہیئے

صاحب مجھے معاف کر دیجئے۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ بچہ رونے لگا۔

تم نہیں جانتے کہ کسی دوسرے کی چیز حاصل کرنے سے پہلے اجازت لینی پڑتی ہے۔ وکیل استغاثہ نے ملزم سے پوچھا۔

صاحب اگر مجھے معلوم ہوتا تو نوبت یہاں تک نہیں پہنچتی

سر! میرے موکل سے یہ حرکت غیر دانستہ طور پر ہوئی ہے وکیل صفائی نے مجسٹریٹ سے کہا۔

قانون کی نظر میں چوری بہر حال چوری ہے اس کے بیان سے صاف پتا چلتا ہے کہ پھول توڑنا ہی اس کا مقصد تھا۔ وکیل استغاثہ نے زور سے کہا۔

بچہ پھول کی طرح ہوتا ہے اسے اتنا شعور نہیں کہ کون سی چیز جائز ہے اور کون سی ناجائز۔ وہ ننھی سی خواہش پوری کرنے کے لئے ایک پھول توڑ لیتا ہے۔ اس سے وہ چور نہیں بن سکتا۔ اسے اس کی نادانی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

چوری چاہے پھول کی ہو یا روپے پیسے کی، اس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے دیدہ و دانستہ پھول چرانے کی کوشش کی۔ وکیل استغاثہ نے بڑی شان سے کہا۔

بچے کا نازک ذہن اتنی دقیق باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنی آرزو کی تکمیل کی ہے۔ اور نہ ہی وہ چوری کا عادی ہے۔ اس پر جرم عائد کرنے سے پہلے بچے کی نفسیات سمجھنی ضروری ہے۔ وکیل صفائی نے احتجاج کیا۔

اگر بچے کو اس وقت سرزنش نہیں کی گئی۔ تو وہ چور بن جائے گا پھر سن بلوغ کو پہونچتے پہونچتے ڈاکو اور قاتل بن سکتا ہے وکیل استغاثہ کا لہجہ سخت تھا۔

ہمارے معزز وکیل نے معمولی سی بات کو رائی کا پہاڑ بنا دیا ہے حالانکہ اسے ایک غلطی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ پیسے یا کوئی دوسری چیز چوری کرتا تو اسی جرم کی پاداش میں سزا مل سکتی تھی۔

قابل وکیل مقدمہ کو پیچیدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ کسی دوسرے کی ملکیت کو اس کی مرضی یا اجازت کے بغیر حاصل کرنا چوری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

چوری کے دائرے میں وہ چیزیں آتی ہیں۔ جس سے کسی کو فائدہ پہونچتا ہو۔ یہ نہیں کہ پھول سونگھنے سے وہ مجرم بن گیا۔ وکیل صفائی نے دلیل پیش کی۔ اگر کوئی شخص چاند کی روشنی اور ستاروں کی چمک سے تسکین پاتا ہے۔ سردی میں دھوپ سے اپنے جسم میں حرارت پہونچاتا ہے تو کوئی اسے مجرم نہیں گردانتا۔

یہ بات آج کے مقدمے سے بالکل غیر متعلق ہے۔ وکیل استغاثہ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

اس مقدمے سے انسانی فطرت اور جبلت کا بہت گہرا تعلق ہے۔ وکیل نے واضح الفاظ میں کہا۔ بادشاہوں کو پھولوں کا بے حد شوق تھا۔ انہوں نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے بے شمار باغ لگوائے۔ شاہ جہاں کو گلاب کا پھول بے حد پسند تھا۔ کیٹس، شیلے، عمر خیام اقبال اور ٹیگور کو پھولوں نے اتنا متاثر کیا کہ ان کی شاعری خوشبو سے رچ بس گئی۔ پھول قدرت کا عطیہ ہے۔ پھولوں کی خوشبو مٹھی میں قید نہیں کی جا سکتی اس سے ہر شخص کو محظوظ ہونے کا مساوی حق ہے۔ اس پر پابندی

لگانا قدرت کے قانون کی خلاف ورزی ہے ۔

فاضل وکیل کے دلائل ٹھوس بنیادوں پر نہیں۔ غیر ضروری باتوں سے اس مقدمہ کی حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ باغ میں پھول کو نہ چھونے کی تختی لگی ہوئی ہے۔ ملزم نے اسے نظر انداز کر کے پھول چوری کیا ہے۔ وکیل استغاثہ نے دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی۔ جناب عالی! یہ نکتہ غور طلب ہے ۔

سر! اول تو میرا موکل تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ سات برس کا بچہ اتنی جلد پڑھ لکھ کر ان باتوں کی تہہ تک نہیں پہونچ سکتا وکیل صفائی مسکرایا۔ میرے فاضل وکیل کیا یہ بتا سکتے ہیں کہ جب باد صبا مست خرامی سے چلتی ہے تو تختی پر لکھا ہوا DON'T TOUCH IT نہیں پڑھ سکتی۔ کیا ہواؤں کو سزا دی جا سکتی ہے؟۔

عدالت میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مجسٹریٹ اس طرح سر ہلا رہا تھا جیسے یہ سب انہونی باتیں ہوں ۔

جناب عالی! فاضل وکیل نظام قدرت کی سحر آگیں باتوں کا ذکر کر کے حقائق سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔

عدالت کی اجازت سے ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وکیل صفائی نے مجسٹریٹ سے کہا۔

اگر دلائل ٹھوس بنیادوں پر ہوں تو اجازت ہے ۔

سر فرض کیجئے۔ ایک شخص کا نام سلیم ہے اس کا پیاس سے برا حال ہے۔ راستہ چلتے چلتے اس نے کسی کے تالاب یا کنویں سے پانی پی لیا۔ تو قانون اسے کیا سزا دے گا۔؟

مجھے اعتراف ہے فاضل وکیل اپنی موشگافیوں سے اصل حقیقت کو نظر انداز کر گئے۔ کہ قدرتی چیزوں سے ذاتی ملکیت کا کوئی تعلق نہیں۔ باغ ثنادر صاحب کی ذاتی ملکیت ہے۔ اور پھول انہوں نے انتہائی شوق سے لگائے ہیں۔ ان کی مرضی یا اجازت کے بغیر کسی کو بھی حق نہیں پہونچتا کہ اپنی خواہش پوری کرے۔ تمام باتیں اصل موضوع سے ہٹ کر کی جا رہی ہیں۔

بے شک اس مقدمہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مجسٹریٹ وکیل صفائی کی بحث رد کر دی۔ فضول باتوں سے عدالت کا وقت ضائع نہ کیا جائے۔

سر! ان دلائل سے میرا مطلب یہ تھا کہ معصوم بچے کے ناپختہ ذہن انسانی فطرت اور قدرت کے بنائے ہوئے قانون کو فیصلہ کرتے ہوئے ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ وکیل صفائی یہ کہہ کر بیٹھ گیا۔

سر! فاضل وکیل کے دلائل تصویر کا ایک رخ ہیں۔ وہ حقیقت کو مسخ کر کے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جرم اور سزا قانون کے ضابطے ہیں۔ اگر مجرم کو سزا نہیں ملتی۔ تو ارتکاب جرم میں اضافہ ہوگا۔ وکیل استغاثہ بھی اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

مجسٹریٹ نے اپنی ساری زندگی میں ایسی محیر العقول بات آج تک نہ دیکھی نہ سنی تھی۔ وہ جلدی جلدی کاغذ پر لکھنے میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد رک کر اس نے اپنا فیصلہ سنایا۔

فریقین کی بحث سننے کے بعد عدالت اپنا فیصلہ سناتی ہے کہ ملزم راجو کی کم عمری اور ناسمجھی اور پہلی غلطی کو مد نظر رکھتے ہوئے پچاس ٹکے جرمانہ کیا جاتا ہے ۔

کمرۂ عدالت میں مدھ مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ ہونے لگی۔

عدالت کے کونے میں کھڑی ہوئی ماں کے چہرے پر بشاشت اور باپ کے چہرے پر رونق دوڑ گئی۔ انہوں نے بڑھ کر جلدی سے اپنے لخت جگر کو گلے سے لگایا۔ راجو اپنے والدین کی باہوں میں راحت افزا سکون محسوس کر رہا تھا۔

کمرۂ عدالت کے باہر خیر الدین اپنے وکیل کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

وکیل صاحب آپ کی کوشش اور مہربانی سے میرا راجو بری ہو گیا۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔ اس نے تشکر اور نمناک آنکھوں سے وکیل کی طرف دیکھا۔ آپ کی فیس کیلئے شرمندہ ہوں۔

کیوں، کیا ہوا؟

عنادوحی

وزن

شاہراہ سے متصل کانٹوں بھری پگڈنڈی پر میں نے اسے بڑی دقت سے چلتے ہوئے دیکھا۔ تو اس کی بے وقوفی پر ہنسی آئی ...... اس نے مجھے قہقہہ لگاتے ہوئے کچھ اس طرح دیکھا جیسے میں ابھی کسی پاگل خانے سے چھوٹ کر آیا ہوں ...... اس کے اس طرح دیکھنے پر میں سٹپٹا گیا۔ اور اپنی خفت مٹانے کے لئے میں نے اسے مخاطب کیا۔

اس پرخار پگڈنڈی پر اتنی دقت سے کیوں چل رہے ہو ادھر شاہراہ پر آجاؤ۔

اس نے میری بات سنی اور جواب دیئے بنا مسکرا کر آگے بڑھا۔ اس کی لاپرواہی اور اپنی سبکی پر میرا خون کھول اٹھا ...... پھر میں نے سوچا کہ بے چارہ شاہراہ کی آسودگیوں سے ناواقف ہے ...... اسی لئے پرخار بے سایہ پگڈنڈی پر دریدہ لباس اور گھسے ہوئے جوتے پہنے تپتی دھوپ میں جھلس رہا ہے ـــــــ میں نے تھوڑے توقف کے بعد اسے پھر پکارا۔

سنو تو! ...... لگتا ہے تمہاری اور میری منزل ایک ہے ...... اس طرح خاردار پگڈنڈی پر چلتے رہو گے تو اپنی منزل تک پہونچ نہ پاؤگے ...... ادھر آجاؤ ...... یہاں راستہ صاف ہے۔ شفیق پیڑوں کا سایہ ہے سفر آسانی سے کٹے گا۔

میری یہ بات سن کر وہ رک گیا۔ نرم سی مسکان ا... پپڑی زدہ ہونٹوں پر رینگ آئی۔ اور بڑے ہی شگفتہ اور پر... لہجے میں وہ گویا ہوا۔

یہ جو پگڈنڈی میرے قدموں کے نیچے بچھی ہے ... اپنے قدموں کے سلسلہ وار نشانوں سے بنی ہے ...... بار... اس پگڈنڈی پر گذر چکا ہوں ...... اور جس شاہراہ پر تم ... ہو ...... وہ تمہاری اپنی بنائی ہوئی نہیں ہے ...... اور ج... کے سائے پر تم اکڑ رہے ہو وہ جب چاہیں تم پر سے اپنی شفق... کا سایہ اٹھا سکتے ہیں ...... تم میری نہیں اپنی فکر کرو ... میں بروقت اپنی منزل پر پہونچ جاؤں گا۔

یہ کہہ کر وہ بڑی بے نیازی سے آگے بڑھا ...... میں شاہراہ پر کھڑا سوچتا رہا کہ اس سارے مکالمے کا کیا م... تھا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ وہ آگے بڑھ چکا ہے اور میں ... پرچھائیوں میں گم کھڑا رہ گیا ہوں۔ تو ہڑبڑا کے آگے بڑھا ... چند منٹ کی دوڑ نے مجھے اس تک پہونچا دیا۔ وہ اسی پگڈ... پر چل رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ نے اسے پیچھے مڑکر دی... مجبور کیا تو اس نے کسی جذبے سے عاری اپنی آنکھوں سے مجھ... لیا۔ اور اکتا کر آگے بڑھا۔

اس بار کچھ کہنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی ...... میں بھی خ... کی ردا تانے شاہراہ پر چلنے لگا۔ اچانک میری بھٹکتی نظریں پگڈ... پر ٹھٹک گئیں ...... پگڈنڈی لہولہان ہو رہی تھی ...... کے پاؤں میں پڑے گھسے ہوئے جوتوں سے گذر کر کانٹے پاؤ... میں چبھ گئے تھے۔ جن سے خون رس رس کر پگڈنڈی کو لالہ ز... رہا تھا۔

وہ اسی بے نیازی سے نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا آ... بڑھ رہا تھا۔ اس کی بے نیازی پر مجھے غصہ آگیا۔ اور میں ... چھوڑ کر پگڈنڈی پر ہولیا۔ اپنی جانب آتے ہوئے اس نے ... بڑی حیرت سے دیکھا۔ میں نے اپنے پیروں سے جوتے نکا...

اسے پہنانے چاہے تو اس نے مجھے نفرت اور حقارت سے دیکھا ..... غصہ سے سپنکارنا اور مجھے بڑی بے رحمی سے دھکا دیتا ہوا آگے بڑھ گیا ......

میں پرخار پگڈنڈی پڑا اس کے اس جارحانہ رویے پر تلملاتا رہا۔ جب وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو میں اٹھا اور واپس شاہراہ پر چل آیا ..... سورج قہر برسا رہا تھا ...... سایہ دار پیڑوں کی نرم چھاؤں کو غنیمت جان کر میں نے اپنے قدم آگے بڑھانے چاہے تو مجھے لگا کہ میرے قدم من من بھر وزنی ہو گئے ہیں ..... میں چکرا کر شاہراہ پر گر پڑا۔ اور جب مجھے ہوش آیا تو لگا میرے ذہن میں زبردست تبدیلی آگئی ہے ..... میں بصد مشکل اٹھا اور شاہراہ کو چھوڑ کر پرخار پگڈنڈی پر ہو لیا۔ پگڈنڈی پر بکھرے خون کے قطرے جب میری نظر پڑی۔ تو میری آنکھوں میں عقیدت کے موتی بکھر آئے ـــ حد نگاہ تک اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ شاید وہ اپنی منزل تک پہونچ گیا تھا۔

اپنے پاؤں سے جوتے نکال کر میں نے شاہراہ پر اچھال دیئے۔ اور ننگے پاؤں خار دار پگڈنڈی پر آگے بڑھا ایک نئی منزل کی کھوج میں۔ ●

بقیہ : مٹتے لمحوں کا کرب

شیخ فرید، گرونانک، امیر خسرو اور ـــ اللہ ہو ـــ اللہ ـــ اللہ ہو ـــ اللہ ـــ اللہ ہو ـــ اللہ ـــ دھیرے دھیرے اسے ایسا لگا کوئی اس کا سر سہلا رہا ہے تھپکیاں سا دیئے جا رہا ہے ـــ اس نے کئی بار اپنی پلکیں جھپکائیں اور انتہائی مضطرب لہجے میں کہا

ماں ـــ مجھے اس گرد و غبار کے حوالے کر دو۔ جو رات آتی ہے تو میرے ذہن میں در آتا ہے ـــ اور جسے تم خواب کا نام دیتی ہو۔ ●

طنزیہ

رؤف خوشتر

لوٹ پیچھے کی طرف

تخیلات تھے اور ہمارے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ حقیقی طور پر بھینس کی ڈکار، طائروں کی پکار، ٹیڑھے میڑھے راستوں کے غبار، اور مرغابیاں کی شکار سے محظوظ ہوں۔ اس لئے کہ اب تک دیہی زندگی کا مشاہدہ و مطالعہ بالترتیب سینما کے پردہ اور پریم چند کے ناولوں سے ہو رہا تھا۔ کافی چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ شہر سے تقریباً سو کلومیٹر پر ہمارا آبائی وطن ایک دیہات میں ہے۔ جہاں کچھ بچے کھچے رشتہ دار سکونت پذیر ہیں۔

انہیں اطلاع دی گئی کہ ہمارا گاؤں کو آنے کا مقصد کھلے آسمان (یہاں تو بجلی، ٹیلی فون، اور ٹیلی ویژن کے تاروں نے آسمان کو چھپا دیا ہے) اور کھلے انسان (یہاں تو ..... خیر جانے دیجئے) کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ فطرت سے قریب رہنا چاہتے ہیں۔ فلاں دنا فلاں بس سے آ رہے ہیں۔ انہیں پہچاننے کے لئے ایک عدد پاسپورٹ سائز فوٹو بھی بھیج دیا۔ اور یہ لکھ دیا کہ ہمیں لینے کیلئے بیل گاڑی لے آئیں۔ (زندگی جب ہچکولے کھاتی گذر رہی ہے تو پھر بیل گاڑی کے ہچکولوں کا مزہ کیوں نہ لیں) اس دور میں جبکہ لوگ دولت کے لئے بیرونی ممالک پرواز کر رہے ہیں ہم راحت کے لئے دیہات کا رُخ کر رہے ہیں

مقررہ دن دوست ہمیں رخصت کرنے کے لئے بس اسٹانڈ پہنچ گئے۔ یہاں نہ تو کوئی فرج، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکاڈر اور گھڑی فرمائش کر رہا تھا۔ بس کوئی دہی کی ہانڈی، کوئی لال املی، کوئی مکئی کے بھٹے، اور کوئی خالص شہد کی فرمائش کر رہا تھا ہم بڑی سعادت مندی سے ہر ایک کی فرمائش نوٹ کر رہے تھے۔ خیر بس چل پڑی اور ہمارا ذہن دوڑنے لگا۔ کہ صبح سویرے جاگ کر طلوع آفتاب کا نظارہ کریں گے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سنیں گے شبنمی پھولوں کو دیکھیں گے۔ بادیوں میں سارے مسائل کو ڈبو کر تیریں گے بھینس کا خالص دودھ پئیں گے۔ مکئی کے بھٹے اور گنے سے شکم سیر ہوں گے۔

بس کے ساتھ ہمیں بھی جھٹکا اس وقت لگا جب وہ رک گئی۔ ہم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر کا منظر دیکھا۔ اسے گاؤں کون کہے گا۔ پکی سڑکیں، ہوٹلیں (جن میں کیسٹ پر فلمی گیت بج رہے تھے) مٹھائیوں کی دوکانیں جن پر مٹھائیوں کی تعریف لکھی ہوئی تحریریں (جس کا ثبوت بے شمار مکھیاں تھیں) سائیکل رکشوں کی بھیڑ، (بیل گاڑیوں کا دور دور تک پتہ نہیں تھا) سینما کے پوسٹر جیسے کہہ رہے ہوں بچ کے کہاں جاؤ گے۔ یہاں بھی وہی شور جو شہروں میں سنتے ہیں اور ہم بے ساختہ کہہ اٹھے

ع بہت شور سنتے تھے دیہی سکوں کا

ٹھنڈی سانس اور سامان لے کر اپنے متوقع میزبان حنیف بھائی کو ڈھونڈنے لگے۔ ذرا آگے بڑھے تو ایک صاحب (جو بش شرٹ

اور پتلون میں ملبوس ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ
میں ہمارا فوٹو گراف (جو جگمگا رہا تھا) (ہماری تصویر کی تعریف بھی ہم ہی
کر لیتے ہیں) ملے اور کہنے لگے، ہلو بھائی صاحب آ گئے۔ چلئے کشتہ
سے گھر چلتے ہیں۔

ہم نے فرط اشتیاق سے بیل گاڑی کے متعلق دریافت کیا

حنیف ! اب کہاں بیل گاڑی۔ صرف تھوڑے سے بیل
رہ گئے ہیں جو غریب کسان اپنے یہاں رکھتے ہیں۔ اکثر لوگوں
کے پاس ٹریکٹر ہیں۔ سنتے ہیں کہ بیل شہر منتقل ہو گئے ہیں۔ وہاں
محکمہ حیوانات سے لے کر فلم والے سبھی انہیں استعمال کرتے ہیں۔

ہم ! بیل ہی دیہات چھوڑ کر شہر منتقل ہوتے ہیں جو نہیں
جانتے کہ سب سے اچھا کلچر، اگری کلچر ہے۔ دراصل ایسا شہروں میں
بیل یا بیل نما انسان ہی مزے سے رہ سکتے ہیں۔

ہم گاؤں نما شہر کو دیکھنے لگے۔ پکی عمارتیں، پکی سڑکیں،
دوکانیں جن پر انگریزی بورڈ نمایاں تھے۔ پان کی دوکانوں پر ضرورت
سے زیادہ بھیڑ تھی۔ ہم نے اس کا سبب پوچھا۔

حنیف ! یہ لوگ کرکٹ کا منٹری سن رہے ہیں۔ نتیجتاً اسکور
زیادہ اور اناج کم ہو رہا ہے

ہم ! کیا یہاں بھی اس کا شوق ہے ؟

حنیف ! اب تو یہاں گھروں میں گھر والی کی کامنٹری سننے
سے بچنے کے لئے کرکٹ کی کامنٹری سنتے ہیں۔ اور افسوس کرتے ہیں کہ
ایسے کھیل سال بھر کیوں نہیں ہوتے۔

راستہ میں بھینسوں کا غول نظر آیا جو دم ہلا ہلا کر چل رہی تھیں

حنیف ! دیکھئے بھینس دم سے اشارہ کر رہی ہیں کہ اپنا
رکشہ آگے بڑھائیے ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے ہمیں سائڈ دے
رہی ہیں۔

ان مہذب اور شائستہ بھینسوں کو دیکھ کر مجھے شہر کی
وہ عورتیں یاد آئیں۔ جو بیچ سڑکوں پر نقلی بالوں کی چوٹی لہرا کر
دندناتی پھرتی ہیں۔ اور ٹرافک میں خلل ڈالتی ہیں۔

مکان پہونچے تو وہاں بھی ٹیپ ریکارڈ بج رہا تھا
الٰہی خیر! بچوں نے کہا انکل آپ نے دیر کر دی صبح اٹھ نہ سکے۔
آٹھ بجے حنیف صاحب دروازہ کھول کر اخبار اور دودھ کی
بوتل لئے آئے۔ تو ہمیں بھینس کے خالص دودھ کا خیال جاتا رہا
باولیوں میں نہانا چاہا تو بچوں نے کہا انجن چل رہا ہے۔ خالص
دودھ اور خالص شہد تو شہروں کو جاتا ہے۔ اور یہ لوگ بھی شہر
سے شہد منگواتے ہیں۔ لال املی کے درخت کاٹ دیئے گئے تھے

غرض ہم نے جس دیہات اور اسکی امتیازی خصوصیات کا
تصور لے کر نکلے تھے وہ ٹوٹ گئے۔ اور ہم نے سوچا کہ اس سے
تو اچھا ہے کہ اپنے شہر میں ہی رہیں۔ ہم نے سامان باندھا۔

حنیف ! ارے بھائی آپ جا رہے ہیں۔ دو دن تو
رہے۔ آپ یہاں کچھ دن اور ٹھہر جائیے۔

ہم ! (فلسفیانہ انداز میں) بزرگوں سے سنتے ہیں کہ
دنیا چار دن کی ہے۔ دو دن تو آپ کے پاس رہے بقیہ دو دن
بیوی، بچوں اور دفتروں کے ساتھ گزاریں گے۔

اور صاحب شامت کے لئے نہیں عصری راحت کیلئے
ہم اپنے شہر پہونچے۔ دوست پھر ہمیں اور اپنی چیزیں لیے بس
اسٹانڈ پر موجود تھے۔

ہم ! دیکھو بھئی خالص دہی یہاں کی ڈیری میں ملتا ہے
خالص شہد بھی یہاں دوائیوں کی دوکانوں پر دستیاب ہے
لال املی کے لئے آپ لال املی سوٹ کا کپڑا خرید لیں۔ اب وہاں
کچھ بھی نہیں۔ دیہات کی چیزیں دیہات والوں کے ساتھ اب
شہروں میں آگئی ہیں۔ اب وہ دیہات دیہات نہیں شہر بن گئے
ہیں۔ وہاں کے اکثر لوگ بھی محنت سے جی چرا رہے ہیں اور کھیتوں
میں کام کرنے سے کترا رہے ہیں۔

اتنا کہا اور گھر کی راہ لی۔ اب ہمارے ہاتھ میں پریم چند کا
ناول اور ذہن میں شاعر مشرق و مغرب علامہ اقبال کا مصرعہ گونج رہا ہے

نہ لوٹ پیچھے کی طرف گردش ایام تو ●

نصر قریشی

زندہ رہو

زندہ رہنا ہے تو بے صوت و صدا زندہ رہو
بے نواؤں کی طرح خلق خدا زندہ رہو!
یہ زمیں اور آسماں بیگانے جب لگنے لگیں
آشناؤں میں بھی تم ناآشنا زندہ رہو!
خانماں برباد ہو جاؤ بھی تو کب فکر ہے
آسماں کا شامیانہ ہے کھڑا زندہ رہو
زندگی کے شہر میں جب موت ناچے کو بکو
سر کٹا کر صورت شاخ حنا زندہ رہو
دن بخیر و خوبی گذرے، تو مناؤ شب کی خیر
صبح تک مانگا کرو جاں کی دعا، زندہ رہو
آگ کا دریا ملے گا، ریگ زاروں کے قریں
پیش منظر ہے تمہارے کربلا، زندہ رہو
دست قاتل پر لہو کو ڈھونڈنا بیکار ہے
رائگاں جاتا نہیں خون وفا زندہ رہو
بپھرے طوفانوں سے ساحل کا مٹا نام و نشاں
وقت کا بہتا سمندر کب رکا، زندہ رہو
حادثے اور سانحے اس دور کی تقدیر ہیں
نصر تم بھی سانحا در سانحا زندہ رہو

احمد سعدی (بنگلہ دیش)

جشن بہار

(سانیٹ)

اب نہ وہ وحشت جنوں ہے نہ ہی تار داماں
آبلہ پا ہی کوئی ہے، نہ ہی سودائی ہے
کوئی غنچہ ہے نہ گل صحن چمن میں اب کے
لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے
راہ سنسان، سکوت شب ہجراں کی طرح
نیند میں سوئے ہوئے کوچہ و بازار سبھی
کوئی دستک ہے نہ زنجیر کے ہلنے کی صدا
غم کی تصویر بنے ہیں در و دیوار سبھی
دل کی دھڑکن بھی نہیں، سانس کی خوشبو بھی نہیں
لب بھی خاموش، کوئی حیلہ طرحدار نہیں
ہر طرف چھائی ہوئی غم کی سیاہی کے سوا
بجھتی آنکھوں میں کوئی لمحہ بیدار نہیں
زندگی ایسے ہی خاموش تماشائی ہے
پھر کسی صبح درخشاں کی تمنائی ہے

راشد جمال فاروقی

سفر

گھاس پامال تھی
میرے پیروں تلے
میں جو گزرا
تو بانسوں کے جنگل کی سرگوشیاں تھیں
اور عجب سبز خوشبو
دھواں، خامشی، بے جہت راستے، خوف، بیچارگی
اور آگے بڑھا
تو بلکتے ہوئے آبشاروں کو پایا
دلدلوں ریتیوں سے اُٹھتے ہوئے
اور نشیبوں میں بے جان پتھر
جھاگ ہی جھاگ پیہم اگلتے ہوئے
جیسے مرگی کے دورے میں بے ہوش اوندھے پڑے ہوں
مری ٹھوکروں سے نہ جاگے
خوں چکاں پاؤں آگے بڑھے
گھاس کی نوک پہ ارغواں پھول کھل کھل گئے
خوں چکاں پاؤں تھے
پھول ہی پھول تھے
گھاس پامال تھی
میرے پیروں تلے۔

حمید الماس

اندازِ دگر

آج تو موجِ ہوا کا تھا کچھ انداز جدا۔
جھوم کر آئی کہیں سے
وہ مجھے
لے کے باہوں میں چلی

اور پھر
چھوڑ کے تنہا خسیلو
گھومتی پھرتی ہے، آزردہ، اداس

آس نراس

اسی دھن میں
مرے پروردہ شجر کی شاخیں
شام ہوتے ہی لٹکتی ہیں خلا میں
کوئی منتشر باد کا پیغام ملے

اور پھر
خود ہی پشیماں ہو کر
مسکراتی ہیں دکھاوے کے لیے

بدر اورنگ آبادی

گوشوارہ

اس ہیولیٰ کو تو پہچانتا ہوں میں
اس کی رگ رگ سے خوب واقف ہوں
یہی تو ہے جس نے
زندگی کو فریب دے کر اوڑھ لی تھی اک نقاب
لیکن ....
مسدود راہیں دیکھ کر وہ ہو گیا تھا مطمئن
اور زچ ہو کر سمیٹ لیے تھے اس نے
کچھ ٹوٹے ہوئے خواب
ادھ جلی قندیلیں اور منصوبے
اور ایک جگنو کی چمک
میں نے ٹوکا تھا تو غرّایا تھا وہ
غصہ ور بھی تو ہے
اور آج موقع ملا ہے مجھکو
قہقہے لگانے کا
نقاب اس کی سرک گئی ہے
اس کی رگ رگ سے خوب واقف ہوں
اس ہیولیٰ کو تو پہچانتا ہوں میں۔

بسمل نقشبندی رتلامی

صبح امیّد

ہم مسیاؤں کی تپتی ہوئی بھٹّی کے قریب
حرص کی برف سے ٹھٹھرے ہوئے
ہاتھوں کو تپائیں
روح
سردی سے جو لرزاں ہے بدن کے اندر
اس کو
منصوبوں کے انگاروں کی گرمی پہونچائیں۔
بس
اسی شغل میں
یہ رات بتانی ہے ہمیں
کیونکہ
اس رات کے بعد آئے گی
صبح امیّد ...

جلائے شہکار

میرے جذبات
میرے نیر احساس کی دھوپ
تیز ہے
تیز بھی ہو جائے گی
اس وقت کے ساتھ
اور
اس دھوپ میں
تپ تپ کے نکھر جائے گا۔
تجھ میں پوشیدہ
جو فنکار ہے
اس کا شہکار !!!

فضا ابن فیضی

زمیں کی بات نہ تھی اور آسماں غلط نکلا
ہمارے بارے میں اس کا گماں غلط نکلا!

ہمیں درختوں سے کب چھاؤں کی توقع تھی
جواب یہ دکھ ہو کہ ہر سائباں غلط نکلا

فضا ہو کوئی، وہی درد، ہجر کا موسم
تمام فرقِ بہار و خزاں غلط نکلا

کچھ اور بھی ہیں تقاضے دلی رفاقت کے
وہ مہرباں ہو کہ نامہرباں غلط نکلا!

بڑے ہی پرامن ہیں ہم ملکِ سخن کے شہری
یہ حادثہ ہے کہ خود حکمراں غلط نکلا!

گلہ طراز نہیں تجھ سے نارسائی کا!
کہ تھا جو تیر، وہی اے کماں غلط نکلا

عجب ہے سانحہ جس شہر کی شناخت تھے ہم
وہاں ہمارا ہی نام و نشاں غلط نکلا

چلو کہ کوئی نیا مکتبِ ہنر ڈھونڈیں
وہ لفظ تھا جو سرِ لوحِ جاں غلط نکلا

نتیجہ کچھ ہو، مقدمے کی پیروی سے غرض
خود اپنے حق میں فضا کا بیاں غلط نکلا

خورشید طلبؔ

ی کی فطرت میں تصنّع تھا نہ جھوٹی شان تھی
ہر میں سب سے الگ اس شخص کی پہچان تھی

اپنے گرد و پیش کے حالات سے انجان تھی
خوب صورت تھی مگر وہ مورتی بے جان تھی

ح ہوتے ہی مری آنکھوں سے رخصت ہو گئی
ند بھی اس کی طرح بس رات کی مہمان تھی

عمر بھر میں خواہشوں کی آگ میں جلتا رہا
میرے سینے میں دبی اک آتشی چٹان تھی

ب مسافر چھپ گئے تھے حادثوں کے غار میں
ندر شہر خموشاں کی طرح ویران تھی

میں ہی تنہا یکسانیت کی دھوپ میں تنہا شجر
ہر نظر اٹھتی ہوئی میری طرف حیران تھی

کر اپنے کھلونے خوش بہت ہوتا تھا میں
پہ بچپن سے مری زندہ دلی قربان تھی

عمر بھر مجھ میں طلبؔ کسی کا زیاں ہوتا رہا
میری اپنی زندگی تو بے سر و سامان تھی

شمس تبریزی

کچھ یوں ہوا ہے دل پہ اثر اس کی بات کا
اک سلسلہ بسا ذہن میں ہے واقعات کا

خوشبو مرے قریب سے گذری تھی ایکبار
ہے آج تک حسین وہ منظر حیات کا

کچھ اس طرح سے ہند کی حالت ہے دوستو!
جیسے کہ لٹ گیا ہو مسافر برات کا

جو شمع روشنی دے زمانے کو، خود جلے
بس اس کی زندگی کا سفر ایک رات کا

اپنے ہی مسئلوں سے نہ فرصت ہوئی کبھی
حل ڈھونڈنا تھا جبکہ ہمیں کائنات کا

شمسؔ اپنی زندگی میں کوئی نیک کام بھی
جس سے نکل سکے کوئی رستہ نجات کا

نازؔ قادری

زمیں پاؤں تلے سر پہ آسماں بھی نہیں
تمہارے بعد کہیں گوشۂ اماں بھی نہیں
سکوت ایسا تو [illegible] ہوا ہی نہ تھا
ہمارے شہر میں اب غمزہ گساں بھی نہیں
رگوں میں گرمیٔ خوں ہے نہ اشک آنکھوں میں
یہ کیسا وقت پڑا ہے چراغِ جاں بھی نہیں
کہاں کہاں لٹی، کتنی لٹی، متاعِ حیات
کہ اس سفر میں کچھ اندازۂ زیاں بھی نہیں
یہ کیا ہوا کہ ہمیں چپ سی لگ گئی، یعنی
ہمارے سینے میں اب آتشِ فغاں بھی نہیں
پھر آئے گا کبھی سر پہ ہمارے ابرِ شفیق!
یقیں تو دور ہے اس کا ہمیں گماں بھی نہیں
شکایتیں ہیں بہت پھر بھی کچھ نہیں کہتے
یہ اور بات کہ ہم اتنے بے زباں بھی نہیں
عجیب کوہِ الم سر پہ آ پڑا اب کے
کہ اس سے بڑھ کے کوئی سخت امتحاں بھی نہیں
یہ کیسا موسمِ سفّاک روبرو ہے نازؔ!
بہار کیسی کہیں وحشتِ خزاں بھی نہیں!

محبوبؔ شیدائی

بنگلہ دیش

اڑتی تھی جہاں گرد وہاں کائی ہے اب کے
برسات نیا رنگ لئے آئی ہے اب کے
پُردرد دلوں کی بڑی تنہائی ہے اب کے
آوارہ مرے شہر کی پُروائی ہے اب کے
ہم چاک گریباں سے اجاڑیں گے گریباں
اربابِ جنوں نے یہ قسم کھائی ہے اب کے
انسان کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا ہے
افواہ زمانے نے یہ پھیلائی ہے اب کے
اک آگ لگا دی ہے زمانے کی ہوا نے
یہ کون سے موسم کی نمی لائی ہے اب کے
جاگا ہے کوئی زیرِ زمیں کالا سمندر
مٹی مرے قدموں کی جو کجلائی ہے اب کے
شاید کہ بدلنے لگے فطرت کے تقاضے
محبوبؔ بھی محبوب کا شیدائی ہے اب کے

قاضی انصار

پل پل پہ امتحان تھا میں بے قرار تھا
کیا مہربان دوستو ! پروردگار تھا

حیرت نہیں لباس اگر تار تار تھا
اس کا شکار میں تھا وہ میرا شکار تھا

چشمہ اتار کر ذرا ماضی میں جھانکیے
پہچانئے گا آپ یہی، خاکسار تھا

مدت کے بعد ہم کو نیا پیرہن ملا
پت جھڑ کے موسموں کا بہت انتظار تھا

وہ طفل تو نہیں تھا جو گھٹنوں کے بل گرا
زخموں سے چور چور کوئی شہسوار تھا

انصار اعتقادِ ضعیفی کا کیا کریں
مانگی جہاں مراد وہ خالی مزار تھا

نجم عثمانی

اے دیوانو! کبھی یہ بھی تماشا دیکھ لینا تھا
اتر کر اپنے اندر اس کا جائزہ دیکھ لینا تھا

ہمیں بس اک، نظر کردار اپنا دیکھ لینا تھا
خود اپنے دل کے آئینے میں چہرہ دیکھ لینا تھا

تمہیں خلوت نشینی کا سبب معلوم ہو جاتا
مری کھڑکی سے باہر کا نظارہ دیکھ لینا تھا

گزرنا تھا ہمارے شہر سے آنکھیں کھلی رکھ کر
تمہیں بس ایک پل خونی ڈرامہ دیکھ لینا تھا

بلا سے نجم قسمت میں نہ تھا منزل کا نظارہ
جو منزل کی طرف جاتا ہے رستہ دیکھ لینا تھا

مجید مرزا تاباں

زمینوں پہ منظر کی جنگل اٹھا
ہوئے رنگ بیکار کاجل اٹھا

کہیں بھیڑ میں میرا چہرہ نہیں
لئے آئینہ ایک پاگل اٹھا

نہ اونچی ہواؤں پہ بانہیں اڑا
سمندر اگر ہے تو بادل اٹھا

کہیں لال پانی نہ ہو ناک میں
ہرے کھیت سے یوں نہ چاول اٹھا

وہی بلّیاں اور جھگڑا وہی!
ترازو کے پلڑوں میں دلدل اٹھا

کہیں تو پتہ زندگی کا ملے
جدا بھیڑ موسم سے اک پل اٹھا

تہیں برف دوری کی پتھرا گئیں
کبھی پاس آ، مجھ میں ہلچل اٹھا

نثار محمد نثار

سعودی عربیہ

کھرا ساکت ہے کھوٹا چل رہا ہے
برابر کارِ دنیا چل رہا ہے

ذرا دھیمی کرو لے گفتگو کی !
پسِ دیوار سایا چل رہا ہے!

سفر تو دیکھ ہم اہلِ جنوں کا
ہمارے ساتھ صحرا چل رہا ہے

مری پلکوں کی چلمن کے سہارے!
سحر کا ایک تارا چل رہا ہے

خبر یہ بھی نہیں ہے ناخدا کو
یہ کشتی ہے کہ دریا چل رہا ہے

چلے گی بعد اس کے کشتیٔ دل
نثارؔ اب تو کنارا چل رہا ہے

جعفر عسکری

نوکِ خامہ سے حروفِ خونچکاں لکھتے رہو
یعنی اپنے عہد کی سفاکیاں لکھتے رہو
آنکھ میں منظر ہے جبتک مقتلِ بیروت کا
اہلِ اسرائیل کی خونخواریاں لکھتے رہو
بس تقاضا ہے یہی اس عہدِ پُر آشوب کا
غم زدہ، زخمی دلوں کی داستاں لکھتے رہو
کر رہے ہیں سب یہاں اپنی شکستوں کا شمار
تم مگر احوالِ آشوبِ جہاں لکھتے رہو
پاؤں ہیں جبتک زمیں پر اور تخیل عرش پر
بس حکایاتِ زمین و آسماں لکھتے رہو
ایک قطرہ ہے لہو کی روشنائی کا بہت
صفحۂ جاں پر حدیثِ دلبراں لکھتے رہو
خوں رلاتی ہے بہت ناقدریٔ اہلِ ہنر
ہو کے بے پروا مگر اے مہرباں لکھتے رہو
دست و پا جعفر قلم ہوں یا کٹے سر تک مگر
تم بلاخوف و خطر اے جانِ جاں لکھتے رہو

پرکاش تیواری

حادثوں کی سیہ دوپہر تھا
زندگی کا ہر اک پل شرر تھا
جل گیا باغ کا پتہ پتہ
وقت شعلہ فشاں کس قدر تھا
عمر ساری امیدوں میں گزری
میرا جیون انوکھا سفر تھا
لٹنے کا قصہ کس کو سنانا
راہ زن ہی مرا راہبر تھا
تیرے ہی ربط سے ہے مری ذات
ورنہ میں واقعی اک صفر تھا
چاند کہتا تھا جس کو زمانہ
ہم نے دیکھا کہ وہ اک کھنڈر تھا
آ گئی عقل، دولت جو آئی
بے زری میں ہر اک بے ہنر تھا
رنگ افشاں فضائیں تھیں لیکن
شوق پرواز بے بال و پر تھا
تھا ستاروں کو پرکاش کب تک
باڑھ کے رخ پہ مٹی کا گھر تھا

یاور ارمان

صیدِ زمیں اسیرِ زمانہ نہ پاؤ گے!
مجھکو فلک زدوں کا نشانہ نہ پاؤ گے!
ابھروں گا ڈوب ڈوب کے ساحل کے آس پاس
سطحِ رواں پہ میرا ٹھکانہ نہ پاؤ گے!
آنکھوں کی مشعلیں بھی نہ کچھ کام آئیں گی
زنداں میں روشنی کا خزانہ نہ پاؤ گے
سنتے رہو گے اپنی صداؤں کی بازگشت
گنبد میں دوسروں کا فسانہ نہ پاؤ گے
آنکھیں دکھا رہی ہیں مناظر نئے نئے
اس عہدِ نو میں عکس پرانا نہ پاؤ گے
جب تک رہے گا ذہن پہ چھایا یہ آسماں
زیرِ فلک کہیں بھی ٹھکانہ نہ پاؤ گے
دیوار و در سے کرتے رہو گفتگو ارآں
سرگوشیوں کا پھر یہ زمانہ نہ پاؤ گے

فریاد آذر

حدِ نظر تک اپنے سوا کچھ وہاں نہ تھا
میں وہ زمیں جس کا کوئی آسماں نہ تھا
سب میں کرائے داروں کے پائے گئے نشاں
جسموں کے شہر میں کوئی خالی مکاں نہ تھا
بچپن کے ساتھ ہو گئے بوڑھے تمام ذہن
ہم مفلسوں کے گھر میں کوئی نوجواں نہ تھا
چہرے سبھی کے لگتے تھے مہمانوں سے مگر
ہم مفلسوں کے گھر میں کوئی نوجواں نہ تھا
سب بیسویں صدی کی اداؤں میں کھو گئے
چلمن سے کوئی جھانکنے والا وہاں نہ تھا
لمحہ بہ لمحہ ڈستا رہا عمر بھر مجھے
مجھ پر مرا ضمیر کبھی مہرباں نہ تھا
سب اسکو پڑھ سکیں یہ ضروری نہیں مگر
تھا کون جسم جس کے اشاروں میں ہاں نہ تھا
لذت نہ مل سکی مری تخیل کو کبھی
ورنہ مرے گناہ کا موسم کہاں نہ تھا
شاید اسی لئے اسے منزل بھی مل گئی
آذر کے آس پاس کوئی کارواں نہ تھا


بیس نکات کا یہ مقصود
کنبہ ہو سب کا محدود

Regd 4253/64
Regd No. Gy.7
-432

The AAHANG Urdu Monthly
BAIRAGI, GAYA

۔ تنقیدی مضامین

کلام حیدری

PRICE Rs 20/-

THE
LTURAL ACADEMY, GAYA